علی عبّاس حُسینی کی کہانیاں
(کلّیات حصّہ دوم)
مُرتّب:
نند کشور وِکرم

علی عبّاس حسینی کی کہانیاں

(کلیات حصہ دوم)

مرتبہ

نند کشور وکرم

تقسیم کار

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی

ISBN 978-81-88298-39-6

Ali Abbas Hussaini Ki Kahaniyan

(Kuliyat Part-II)

Editor : Nand Kishore Vikram
Publisher : Nand Kishore Vikram
Year : October 2016
Price : Rs./-374

علی عباس حسینی کی کہانیاں

(کلیات حصہ دوم)

مرتبہ : نند کشور وکرم

ناشر : نند کشور وکرم

قیمت : ۳۷۴روپے

سنِ اشاعت : اکتوبر۲۰۱۶ء

تقسیم کار : پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، ایف۲۱/۱۴ کرشن نگر دہلی۔۱۱۰۰۵۱

یہ کتاب

قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ نیز شائع شدہ مواد سے اُردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

محترم پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نذر

جو

اُردو کی واحد

عالمی شخصیت

ہیں

نند کشور وکرم

ترتیب

پیش لفظ

کہانی نویس: علی عباس حسینی

پریم چند بیسویں صدی کے آغاز میں کہانی کی دنیا میں نمودار ہوئے اور جلد ہی اُن کی کہانیوں کو ملک گیر تشہیر و مقبولیت حاصل ہوگئی جن سے متاثر ہوکر دو کہانی نویس اُردو فکشن کے میدان میں وارد ہوئے، جن میں ایک تھے سدرشن (۱۸۹۶ء سیالکوٹ۔ وفات ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۷، ممبئی) جنھیں مہاشہ سدرشن اور پنڈت سدرشن کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور دوسرے علی عباس حسینی (۳ر فروری ۱۸۹۷ء پارہ ضلع غازی پور۔ ۲۷ر ستمبر ۱۹۶۹ء لکھنؤ)۔ سدرشن علی عباس حسینی سے کچھ پہلے آسمان ادب پر نمودار ہوئے اور بحیثیت کہانی نویس انھوں نے بڑی شہرت پائی، حتا کہ جس طرح بنگلہ میں رابندر ناتھ ٹیگور اور شرت چندر کا مقابلہ کیا جاتا ہے اسی طرح اُردو میں پریم چند اور سدرشن کا بھی مقابلہ کیا جاتا رہا۔ مگر بعد ازاں یہ طلسم ٹوٹ گیا کیونکہ سدرشن جلد ہی اس میدان سے ہٹ گئے اور وہ فلمی دنیا سے منسلک ہو گئے اور اُردو والے انھیں بھول سے گئے اور اب حالت یہ ہے کہ اُردو والے کہیں اُن کا حوالہ تک نہیں دیتے۔ وہ پریم چند کی کہانیوں سے بے حد متاثر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کی ایک کہانی ''وکرمادتیہ کا تیغا'' کو منشی دیا نرائن نگم کے مشہور ماہنامہ ''زمانہ'' میں پڑھ کر سدرشن اتنے متاثر ہوئے کہ دل ہی دل میں وہ اُن کے شاگرد بن گئے اور پھر ایک دن مذکورہ کہانی سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک کہانی لکھی، اور اشاعت کے لئے ''زمانہ'' کانپور کو ارسال کردی جو مدیر دیا نرائن نگم کو بڑی پسند آئی اور اسے انھوں نے اپنے آئندہ شمارے میں شائع کردیا۔ اس کہانی کو پڑھ کر پریم چند حیرت میں پڑ گئے انھیں یقین نہیں آتا تھا کہ

یہ کہانی سدرشن جی کی لکھی ہوئی ہے کیونکہ اسلوب و انداز میں وہ اُن ہی کی لکھی ہوئی کہانی معلوم ہوتی تھی۔ تب انہوں نے سدرشن جی کو ایک خط میں تحریر کیا۔:

''بھائی سدرشن تمہاری کہانی مَیں نے پڑھی ہے۔ اُسے پڑھ کر مجھے شبہ ہوا کہ یہ کہانی مَیں نے لکھی ہے۔ سارا کا سارا ''اسٹائیل''، سارا رنگ میرا ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے یہ کہانی کیسے لکھی؟ بہر حال مَیں آپ کو مبارباد دیتا ہوں۔'' (شری سدرشن، سرجن کی منوبھوی از ڈاکٹر زبیر راگر صفحہ ۲۳)

اسی طرح علی عباس حسینی بھی پریم چند سے کافی حد تک متاثر تھے اور انہوں نے اپنی پہلی کہانی ''پژمردہ کلیاں'' بھی ایک لحاظ سے پریم چند کی کہانیوں کے جواب میں ہی لکھی تھی بقول اُن کے:

''مَیں نے ۱۹۱۸ء میں سب سے پہلا افسانہ لکھا۔ یہ حادثہ بھی پٹنہ ہی میں پیش آیا تھا۔ ۱۹۱۵ء سے مَیں نے اپنا یہ معمول بنالیا تھا کہ گرمیوں کی تعطیل کا بڑا حصہ پٹنہ ہی میں گزارتا تھا، چنانچہ بی اے کے پہلے سال کے امتحانات سے فارغ ہو کر میں پارہ سے ہوتا ہوا اپنے ''پیارے بھائی'' کے پاس پہونچ گیا ......ایک دن طے ہوا کہ ''بادشاہ منزل'' کی پوری سہ منزلہ عمارت خالی پڑی ہے اس کا فرش سنگ مرمر و سنگ موسیٰ کا ہے۔ اور سب سے نیچے والا حصہ خاصا ٹھنڈا ہے۔ وہیں کیوں نہ دوپہر کاٹی جائے۔ فوراً پوری ''چنڈال چوکڑی'' بھائی قمرالدین صاحب مرحوم (میرے پھوپھی زاد بھائی) قیصر نواب واصغر نواب (نواب زادہ کے رشتے کے بھانجے)۔ حسن مہدی (چچازاد بھائی) نواب زادہ اور مَیں بادشاہ منزل میں چلے گئے۔ سنگ مرمر کے فرش کو ملازموں نے جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ ایک بڑی سی چاندنی اس پر بچھادی۔ دو تین گاؤ اور تکیے لاکر رکھ دیئے۔ اور ہم لوگ ہمیشہ کی طرح گپیں لڑانے اور بحثیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔ سلسلۂ گفتگو میں پریم چند کے کسی افسانے پر بحث ہونے لگی۔ دو پارٹیاں ہو گئیں۔ ایک ان کی ہر تخلیق کو ترشا ہوا نگینہ قرار دیتی، دوسری ان کے یہاں

زبان وبیان کی خامیوں پر زور دیتی۔ان کی عینیت پسندی کا مضحکہ کرتی اوراس
پر اصرار کرتی کہ وہ علم النفس سے بہت کم واقف تھے۔مَیں اس زمانے میں
انگریزی اور فرانسیسی افسانوں اور ناولوں کا بڑے زور وشور سے مطالعہ کررہا تھا۔
اس لئے مَیں نے بھی دوسری ہی جماعت کی اس معاملۂ خاص میں ہاں میں ہاں
ملائی۔بس چیلنج کی نوبت آگئی۔میں ایک کمرے میں کاغذ پنسل دے کر بند کردیا
گیا کہ ''شام تک ایک افسانہ لکھ کر پیش کرو ورنہ یہیں حبس دوام بھگتو!''غرض
مجبوراً وہ افسانہ لکھنا پڑا جو'باسی پھول' کا پہلا جزو ہے اور جس کی سرخی ہے
''پژمردہ کلیاں۔''

مگر انہیں اس کہانی کو کسی رسالے میں بھیجنے کی ہمت نہ ہوئی۔بعد ازاں انہوں نے ۱۹۲۵ء
میں جب وہ گرمیوں کی تعطیل میں ڈائرکٹر تعلیمات سے ملنے نینی تال گئے ہوئے تھے تو فرصت کے
اوقات میں انہوں نے ''جذبِ کامل'' نامی کہانی لکھی اور رائے بریلی پلٹنے پر جہاں وہ اس زمانے میں
بسلسلہ ملازمت متعین تھے،مذکورہ کہانی پر نظر ثانی کر کے اور ہمت جٹا کر زمانہ کانپور میں اشاعت
کے لئے بھیج دی۔منشی دیانراین نگم کو یہ کہانی بے حد پسند آئی اور انہوں نے اسے زمانہ کے ستمبر ۱۹۲۵ء
کے شمارے میں شائع کردیا اور ساتھ ہی کوئی اور کہانی بھیجنے کی فرمایش بھی کردی جس پر انہوں نے
اپنا پہلی تحریر کردہ کہانی ''پژمردہ کلیاں'' انہیں ارسال کردی اور وہ زمانہ میں شائع ہوگئی۔

ابتدائی دَور کے افسانہ نگاروں میں حسینی اور سدرشن صحیح معنوں میں پریم چند کے بعد وارد
ہونے والے افسانہ نگاروں میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔بعد ازاں علی عباس حسینی فکشن نگاری میں
بہت آگے بڑھ گئے کیونکہ سدرشن نے ہندی زبان وادب میں شہرت پانے اور فلمی دنیا میں کامیابی
اور پیسے کی ریل پیل سے دوچار ہونے کے بعد اُردو کی جانب توجہ کم کردی جس کے نتیجے میں
آزادی کے بعد سدرشن اُردو دنیا سے غائب سے ہوکر رہ گئے مگر علی عباس حسینی آخر دم تک اُردو
فکشن کی خدمت میں جٹے رہے اور انہوں نے ہمیں کئی بیش قیمت افسانے عطا کئے جن کی بنا پر ہم
کہہ سکتے ہیں کہ وہ پریم چند کے بعد ایک اہم اور عظیم المرتبت افسانہ نگار تھے جنہیں اُردو کے
فسانوی ادب وتاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

حسینی صاحب نے زیادہ مدت پریم چند کے رنگ و اسلوب کی تقلید نہیں کی اور انہوں نے اپنی الگ ڈگر اختیار کر لی۔ حالانکہ اُن کی ابتدائی کہانیوں میں پریم چند کی طرح مشرقی اُتر پردیش کی دیہی زندگی کی دلکش تصویر کشی کی گئی ہے۔ انہوں نے ان کہانیوں میں زمینداروں، کسانوں، کھیت مزدوروں، ٹھاکروں، سیدوں پٹھانوں اور اہیروں کی زندگی کو ایسے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ دیہی عوام کی حقیقی زندگی کے مناظر اُن کی بود و باش، میل جول اور پیار محبت اور باہمی تنازعوں نے قاری کو اپنی گرفت میں ایسا جکڑا کہ وہ ان کہانیوں میں کھو گئے۔ تاہم اُن کی ابتدائی کہانیوں میں پریم چند کے انداز و اسلوب کی جھلک جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ بقول معروف نقاد شمیم حنفی صاحب:

''پریم چند کی قابل احترام بے باکی، جرأتِ اظہار، روشن ضمیری، سچائی خلوص، صداقت اور محبت، پیار، زندگی کے خوبصورت نظریے اور مستقبل کی ایک بے حد تابناک تصور نے دوسروں کے لئے ایک مینارۂ نور کا کام دیا اور جن لوگوں نے زیادہ سے زیادہ ذہانت اور فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ اس روشنی سے اکتسابِ فیض کیا اور اسے اپنے لئے مشعلِ راہ بنایا، اُن میں علی عباس حسینی نمایاں مقام رکھتے ہیں''۔

بلا شبہ حسینی نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا اور انہوں نے بھی مشرقی اُتر پردیش کی دیہی زندگی کو اپنی کہانیوں میں بڑھ دلکش پیرائے میں پیش کیا۔ انہوں نے بھی پریم چند کی طرح کسانوں کی معاشی بدحالی، مفلسی اور ناگفتہ بہ حالت اور زمینداروں اور جاگیرداروں کے ظلم و ستم اور اور اُن کی چیرہ دستیوں پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ اور گاؤں کے محنت کش مگر مفلس اور نادار مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کے حق میں اپنی آواز بلند کی ہے۔ وہ چھوت چھات اور ذات پات کے سخت مخالف تھے اور انہوں نے اپنے افسانوں میں ان کے خلاف آواز بلند کی ہے اور اپنی کئی کہانیوں میں اپنے اس نظریے کی بڑے دلکش انداز میں ترجمانی کی ہے۔ وہ اُونچ نیچ اور ذات پات کو انسانیت کے دامن پر ایک بدنما دھبہ سمجھتے تھے۔ ''گونگا ہری'' نامی کہانی میں انہوں نے اس مسئلے پر کھل کر بحث کی ہے۔ ملاحظہ کریں:

''بالآخر مونی بابو سے ایک دن چائے پر بلا کر، پوچھ بیٹھے کہ ''ہری کون ہے، کیا

ذات پات ہے" انھوں نے کہا: "میں ذات پات کچھ نہیں جانتا، ایک سنگ تراش کے بھیس میں آیا تھا، میری دانست میں تو کرشن نے نیا رُوپ لیا ہے، اُن کے سوا دیوتاؤں میں بھی کوئی فنونِ لطیفہ کا اتنا ماہر نہیں!"

ٹھاکر صاحب ذرا چراغ پا ہوئے، راکھ کے ڈھیر میں ابھی چنگاری باقی تھی۔ بولے "بابو صاحب ہم راجپوت ہیں، ایسے ویسوں کو بیٹی بہن نہیں دیتے۔ آپ کی بات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شودر ہے؟"

موتی بابو بھی جھلا گئے۔ پاؤں کے نیچے دبنے پر چیونٹی بھی کاٹتی ہے، وہ بولے۔ "ٹھاکر صاحب شودر اور چھتری، اچھوت اور چھوت سب پرمیشر ہی کے بنائے ہوئے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں سے ایک صدیوں کا مظلوم ہے اور دوسرا صدیوں کا ظالم، ایک کمزور تھا دوسرے نے دبالیا۔ اب اس صدی میں یہ زور و ظلم نہیں چلنے کا۔"

ٹھاکر صاحب کھڑے ہو گئے۔ بولے: "میں اپنی لڑکی کا اپنے ہاتھ سے گلا گھونٹ دوں گا۔ مگر اسے کسی بدقومے کمینے سے بیاہ نہ کرنے دوں گا۔ "موتی بابو نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ "ٹھاکر صاحب ہری آپ کی لڑکی کو تو کیا؟ اندرلوک کی اپسرا کو بیاہ سکتا ہے، آپ کو اپنی شرافت مبارک، آپ سوکھی ہوئی ہڈیاں چچوڑیئے۔ علم و ہنر کے بادہ خوار جسے اپنے پہلو میں بٹھالیں، برہمنیاں اور راجپوتنیاں اُن کے پاؤں نہیں چھو سکتیں!" غرض محلّے میں رہنے والے دو مرغوں کی طرح دونوں نے ایک دوسرے کو خوب خوب زخم دہاں دیئے اور اپنی اپنی جگہ گردن پھلا پھلا کر چلے آئے۔"

چھوت چھات اور ذات پات کے مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ حسینی ایک حب الوطن اور سیکولر نظریات کے حامل شخص تھے۔ وہ مذہب کے فرسودہ خیالات و نظریات کی ہمیشہ مخالفت کرتے رہے اور ہمیشہ مذہبی عصبیت کے خلاف پرچم بلند کیے رہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کے نظریے میں یقین و اعتقاد رکھتے تھے اور فرقہ واریت سے انہیں سخت نفرت تھی۔ وہ ملک میں

آزادی کا پرچم لہراتا دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن سرکاری ملازمت کی وجہ سے وہ بڑے محتاط انداز سے اپنی کہانیوں میں اس کی عکاسی کرتے تھے۔ وہ گاندھی جی کے فلسفے ''عدم تشدد'' میں دل سے اعتقاد وایقان رکھتے تھے اور اس کی تقلید بھی کرتے تھے جن کی جھلکیاں اُن کے مختلف افسانوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں اور وہ اُن سے اتنے متاثر تھے کہ انھوں نے اُن کی شہادت پر ''شیر کا باغ'' نامی کہانی قلمبند کر کے انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا اور اپنے دلی جذبات وخیالات کا اظہار کیا۔

انھوں نے اپنے افسانوں میں اُتر پردیش کے گاوؤں کی منظر کشی کرنے میں کمال کر دیا اور ایسی تصاویر پیش کیں کہ گاؤں کے منظر ہماری نگاہوں کے سامنے بائیسکوپ کی تصویروں کی مانند ہماری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''لیڈر'' میں ایک جلسے کا یہ دلکش منظر ملاحظہ کریں۔

> ...... ''بہرام نگر کا سب سے بڑا میدان آدمیوں سے بھرا پڑا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں کسان جمع تھے۔ ہفتوں سے بیل گاڑیوں، ٹٹوؤں اور بہلیوں کا تانتا بندھا تھا، ہزاروں آدمی پچیس پچیس، بیس بیس، کوس سے پیدل آئے تھے۔ ان میں بوڑھے بھی تھے، جوان بھی، بچّے بھی تھے، اور عورتیں بھی۔ بعض کسان اتنے خوشحال تھے کہ اُن کے گلوں میں سونے کے کنٹھے اور کانوں میں ''مُرلیاں'' پڑی تھیں۔ لیکن زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی کہ جن کے جسم پر ایک پھٹی پُرانی دھوتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ عورتوں میں کچھ تو سُرخ شہانی ساڑیاں اور بھدیسل دیہاتی زیور پہنے تھیں۔ کچھ سپید صاف ستھری کنارے دار ساڑیاں زیبِ جسم کیے تھیں، لیکن اکثر کا صندلی رنگ اُنہیں کے ہاتھ کی دھوئی اور رنگی ہوئی گاڑھے کی ساڑی میں روپوش ہو کر افلاس ومعصومیت کا دادخواہ تھا۔ بچوں میں بعض کے جسم پر کُرتہ اور دھوتی دونوں چیزیں تھیں، مگر اکثر کے لیے صرف دھوتی ہی ستر پوش تھی، چھوٹے ننھے معصوموں کے لیے تو ان جھگڑوں کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ فطرتِ عریاں کی مکمل تصویریں تھے۔

اسی طرح کہانی ''اڈہ'' میں گاؤں کی تصویر اس حقیقت پسندانہ انداز

میں پیش کی گئی ہے کہ اس میں کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا بلکہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے ہو بہو ہمارے سامنے حقیقی منظر پیش کر دیا ہے۔

جیران پور کا قصبہ نہ زیادہ چھوٹا تھا نہ بہت بڑا۔ تقریباً پانچ ہزار کی آبادی تھی۔ زمیندار مسلمان شیوخ تھے، رعایا میں ہر قوم اور ہر پیشے کے لوگ تھے، اور ان میں سے اکثر کے الگ الگ محلے تھے۔ ٹھکرانا، گھوسیانا، کوری ٹولہ، حلوائی بازار، کنجڑا محال اور چمار ٹولی۔ محلوں کے نام سے پتہ چلتا تھا کہ جیران پور کے بسانے والے کے دماغ میں کسی بڑے شہر کا خاکہ تھا اور یہ قصبہ سلطنت مغلیہ کے زمانے میں وجود میں آیا، جب جاگیرداری نظام رعایا اور راعی، حاکم و محکوم کے مکانات ایک دوسرے کی بغل میں بنانے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ خود زمینداروں کا محلہ شیخ پورہ، شیخانا یا شیخ باڑانہ کہلاتا تھا بلکہ قلعہ معلّٰی کے ڈھنگ پر گڑھی کے نام سے موسوم تھا اور اس کے ہر مکان میں دربار کے لیے کوئی کمرہ یا دالان مخصوص تھا۔ اس میں زمیندار کے لیے ایک کرسی رہتی تھی، راجپوتوں برہمنوں کے لیے ایک بنچ، کارندوں اور مسلمان رعایا کے لیے چٹائیاں اور بقیہ رعایا پرجا کے لیے دھرتی ماتا کا مسطح سینہ۔ مکانوں کی ساخت میں بھی فرق تھا۔ زمینداروں کے مکانات پختہ لکھوری اینٹوں کے تھے، بڑے پھاٹک، محرابی دروازے، بلند شہ نشین، کشادہ صحن، دومنزلے، سہ منزلے، برجیاں بھی، تہہ خانے بھی اور چور دروازے بھی۔ ٹھاکروں اور مہاجنوں کے مکان کچے، کھپریل سے چھائے ہوئے، بقیہ رعایا کے لیے جھونپڑے تھے، تاریک تنگ، پھوس سے ڈھکے ہوئے۔ قصبہ میں کوئی ٹاؤن ایریا نہ تھا، اس لیے نہ تو صفائی کا انتظام تھا، نہ گلیاں ہموار تھیں۔ اکثر مقامات پر گھروں کا بدبودار سڑا ہوا پانی راستے کی خاک کو کیچڑ میں تبدیل کر دیتا تھا اور آتی جاتی بیل گاڑیاں موٹر اور یکے اس کی مدد سے راہ چلتوں کے کپڑوں پر گلکاریاں کر دیتے تھے۔ مغربی تعلیم یافتہ حضرات ایسے مقامات سے ناک پر رومال رکھے لپ جھپ گزر جاتے،

لیکن پھونس کی جھونپڑیوں میں زائیدہ بچّے اسی فضا میں کھیلتے، کلکاریاں مارتے اور وباؤں سے جو بچ جاتے وہ جوان ہو کر ان گندگیوں میں رینگنے والے دوسرے کیڑے پیدا کرتے رہتے تھے۔''

انہیں قدرتی مناظر پیش کرنے میں بھی ایسی مشاقی حاصل تھی جیسے کسی مصور کو تصویر کشی میں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ہاتھوں میں قلم نہیں مصور کا موقلم ہے جس سے وہ تصویریں بنا رہے ہیں۔ کھیت کھلیانوں میں موسمِ برسات اور موسمِ گرما اور کسی حادثے کی منظر کشی میں ایک زندہ جاوید تصویر پیش کر دیتے تھے۔ جیسے میلہ گھومنی میں شامل افسانے ''کھیت'' میں موسم گرما میں برسات کے منتظر گاؤں کی حسین و دلکش تصویر کشی کی ہے:

''......جون کی چودہ تھی کہ ایک بار بادل منڈلاتے، جھومتے اُتر پورب کے کونے سے آئے۔ آفتاب کا چہرہ چھپتے ہی ہوا بند ہو گئی۔ پہلے جو جسم پانی سے تر کرنے پر بھی چند منٹ میں خشک ہو جاتا اور جلنے لگتا تھا، وہ اب پسینہ سے تر تھا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں پنکھا تھا، بچے ننگے ہو گئے تھے۔ مردوں نے کرتے اُتار اُتار کر پھینک دیئے تھے، اب صرف ایک دھوتی یا تہمد جسم پر تھی۔ اور ہر ایک آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کے کہتا تھا، ......''برسو بھگوان برسو'' لونڈوں نے چیخنا شروع کیا۔ ''میگھا سارے پانی دے! میگھا سارے پانی دے!'' کہ دفعتاً ہوا سرسرائی، معلوم ہوا جان میں جان آئی، خشک چہروں پر مسکراہٹ دوڑی، بجلی کوندی ایک تڑاخا ہوا اور بوندیں چلیں۔ لڑکوں نے ناچنا شروع کیا۔......پانی بڑھنا شروع ہوا اب چادر گرنے لگی۔ مینڈکوں نے غیں غیں کرنا شروع کیا۔ لونڈوں نے قلقاریاں ماریں، کیچڑ اُچھالی اور گاتے اور ایک دوسرے کا پیچھا کرتے باہر نکل گئے۔''

حسینی کی ولادت ایک شیعہ مذہبی گھرانے میں ہوئی اور مسعود غازی الحسینی الترمذی السھوانی اُن کے مورث اعلیٰ تھے جنہوں نے غازی پور شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ مگر روضے نماز کے پابند ہونے کے باوجود اُن میں کٹر تا نہیں تھی اور وہ نظریاتی طور پر سیکولر نظریات کے حامی تھے۔ انہوں نے کبھی کسی

سیاسی جماعت، مذہب یا فرقے کے خیالات وافکار کی اندھی تقلید نہیں کی۔ انہیں جو بھی نظریہ یا فلسفہ اچھا لگتا وہ اسے اپنا لیتے تھے؛ وہ گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد کو پسند کرتے تھے مگر عیسیٰ کے اس فلسفے کو ناپسند کرتے تھے کہ اگر کوئی انہیں ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا پیش کردیں۔ وہ مارکس کے اقتصادی نظام کو پسند کرنے کے باوجود فلسفہ مادیت کو تسلیم نہیں کرتے۔

علی عباس حسینی کی ابتدائی کی کہانیوں میں اُس دور کی عام کہانیوں کی طرح قصہ گوئی اور داستان گوئی کا رنگ جھلکنے کے ساتھ ساتھ اس میں جذباتیت اور حقیقت پسندی بھی پائی جاتی ہے۔ پژمردہ کلیاں، باسی پھول، بہو کی ہنسی، عورت، نبردِ عشق وغیرہ رومانی کہانیاں ہیں۔ ان میں عورت کی تصویر کشی اس انداز سے کی گئی ہے کہ وہ ہم پر گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔

وہ ایک باشعور، دانشور اور ایک سیکولر مزاج کی شخصیت تھے اور انہیں فرقہ واریت سے سخت نفرت تھی اور انہوں نے اپنے کئی افسانے میں فرقہ واریت کے خلاف آواز بلند کی تھی وہ ملک میں امن وامان اور ہم آہنگی چاہتے تھے۔ اُن کے خیال میں فرقہ واریت ملک کے لئے بے حد خطرناک جذبہ ہے جو ملک وقوم کی بنیادیں ہلا دیتا ہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور انہوں نے اس سلسلے میں کئی یادگار موثر افسانے لکھے، جن میں دیس دھرم، ایک ماں کے دو بچے، حاجی بابا، جال پری نور ونار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

رفیقِ تنہائی اُن کا ایک ایسا افسانہ ہے جسے قارئین نے ہی نہیں بلکہ ناقدین نے بھی بیحد پسند کیا اور یہیں سے پرانی داستان گوئی والی ڈگر سے ہٹ کر انہوں نے افسانے کی جدید تکنیک کی جانب رجوع کیا اور اس کے بعد آئی سی ایس وغیرہ تکنیکی اعتبار سے افسانے کے زیادہ قریب تھے ورنہ اس سے پیشتر اُن کا انداز 'داستان گوئی اور قصہ گوئی' کے زیادہ قرب تھا۔

اپنی کہانیوں میں حسینی نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی قومی یکجہتی، بھائی چارے، حب الوطنی، انسانیت نوازی کا پیغام دیا ہے اور اُن کی کہانیاں حقیقت پسندی پر مبنی ہیں اور وہ ان میں کسی مبالغہ آمیزی یا تصنع سے کام نہیں لیتے بلکہ وہ زندگی کی صحیح تصویر کشی کرتے ہیں۔ اور قاری پر اپنا گہرا نقش چھوڑتے ہیں کہ قاری اُن کی کہانیوں کی گرفت سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ بقول اُن کے:

"میں افسانوں کو زندگی کا ترجمان بنانے کا قائل ہوں۔ بھوک ہو یا جنس

زندگی کے عناصر ترکیبی ہیں۔ایک کے پیٹ سے تمدن وتہذیب یعنی سیاست نکلتی ہے دوسرے کے بطن سے اس سیاست کے برتنے والے ہم انسان۔اس لئے جب بھی زندگی کی مرقع کشی کی جائے گی سیاست اور جنس کی جھلک اُن میں ضرور آئے گی مگراس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ادب وشعر کو سیاسی نظریات کے پروپیگنڈے اور ترویج کا ذریعہ بنایا جائے۔میرے نزدیک یہ اصول فن کے منافی ہے۔اسی طرح جنس یقینی زندگی کا اہم ترین جزو ہے مگر میں جنس کے بیان میں لذتیت پیدا کرنے کا سختی سے مخالف ہوں اوراسے بھی فن کا خون سمجھتا ہوں۔ ''لحاف'' ...... ''پھسلن'' ...... ''بو'' ...... ''ٹھنڈا گوشت'' جیسی کہانیوں میں یہی عیب ہے۔ان میں جنسی تلذذ کے بیان پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اصل مقصد کو کھو بیٹھی ہیں۔میں نے خود بھی سیاسی کہانیاں لکھی ہیں اور جنس کے موضوع پر بھی لکھا ہے۔گاندھی جی کی زندگی میں اُن کی اہنسا اور ان کے دوسرے نظریات کی حمایت میں کہانیاں لکھیں مثلاً مانجھی۔اڈا۔ ہمارا گاؤں وغیرہ۔ان کی موت پر ''شیو کا باغ'' لکھا اور اس وقت لکھا جبکہ اُردو۔ہندی۔انگریزی زبانوں میں نہ ان پر کوئی نظم لکھی گئی تھی اور نہ کوئی افسانہ۔ادھر بہت سے سیاسی افسانے لکھے ہیں جن میں ہمارا گھر۔قابیلی تجربے۔پچھمی کا عجائب گھر۔ڈھال یا تلوار،ٹھاکروں کی ٹھکرائیاں۔وطن کی پاک مٹی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔لیکن ہر جگہ اس کا خیال رکھا ہے کہ نظریات کے ہاتھوں فن کا خون نہ ہونے پائے۔جنس کے موضوع پر ''میلہ گھومنی'' اس کی شاہد ہے کہ عورت ومرد کے فطری تعلق پر سب کچھ لذتیت پیدا کئے بغیر بھی کہا جا سکتا ہے۔ ''سیلاب کی راتیں'' کی ہیروئن باوجود عریاں ہونے کے نہ آرٹسٹ کی نظروں میں عریاں ہوتی ہے اور نہ کہانی کے ناظر کی۔''ایک غسل خانے میں ....''سب ہی ننگے ہیں مگراسے بھی عریانی وفحاشی سے کوئی مناسبت نہیں۔''

حسینی صاحب ادب برائے زندگی میں اعتقادوایقان رکھتے تھے۔وہ صحیح معنوں میں ایک

حقیقت پسند افسانہ نگار تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ اصلاح پسند بھی تھے۔ان کی کہانیوں کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی مقصد پنہاں ہوتا تھا اور قاری کے لئے کوئی نہ پیغام۔اُنہوں نے معاشرے میں تبدیلی لانے کو اپنا منتہائے مقصود بنایا تھا۔وہ ملک میں معاشرتی غریبی مفلسی،معاشرتی ناہمواری کوختم کرنا چاہتے تھے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں ان مفلس اور مظلوم لوگوں کے خلاف ہونے والی زیادتیوں اور مظالم کو اس انداز سے پیش کیا کہ عوام کے دلوں میں ان مظلوم پسماندہ لوگوں کے تئیں جذبہ ہمدردی پیدا ہوسکے۔بقول حسینی صاحب:

"مَیں آرٹسٹ کا کام مصوری اور دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھ دینا سمجھتا ہوں۔نظریات کا پرچار مبلغ کا کام ہے اور اُن کو عملی جامہ دینا مقنن کا۔مَیں اس سے واقف ہوں مجھ پر یہ الزام ہے کہ میرے افسانوں میں ''حرکت'' نہیں ہے اور میری ذہنیت مصلحانہ ہے۔لیکن مَیں مجبور ہوں، جتنا پڑھتا ہوں،اُتنی تشکیک بڑھتی جاتی ہے۔ جتنا غور کرتا ہوں اُتنا ہی عدم تیقن میں اضافہ ہوتا ہے۔غالبا! ان تمام چیزوں کی ذمہ دار پچھلی تربیت و تعلیم ،ملازمت کی زنجیریں،عمر کی اور تجربے کی زیادتی ہے۔مَیں آپ سے نوجوانوں کی طرح یقین واثق کہاں سے لاؤں۔اگر آپ نے ہمپلسن کا ''اِف ونٹر کمز (If Winter Comes) پڑھا ہوتو آپ کو اُس کے ہیرو کا کیریکٹر یاد ہوگا۔وہ غریب اپنے مخالف کے نظریہ میں بھی بہت حد تک صداقت کی جھلک دیکھ لیتا تھا۔مَیں بھی اس مرض میں گرفتار ہوں۔میرے لئے یہ ناممکن سا ہوگیا ہے کہ جو کچھ مَیں کہہ رہا ہوں وہی صحیح ہے اور جو کچھ دوسرے کہتے ہیں وہ سراسر غلط ہے۔غرض یہ ہیں میرے نظریے، حالات،افکار،آلام، پابندیاں،آپ خود نقد کا بار اپنے سر کیوں نہیں لیتے۔یہ بیچارے مصنفوں کو کیوں پریشان کرتے ہیں،میرے بارے میں یقین رکھئے کہ مَیں بہت ہی 'میاں' قسم کا آدمی ہوں۔ اور میرے ہاں بہت کافی Inferiority complex ہے۔بہر حال اب می سرایم۔''

گویا حسینی نے ابتداء میں پریم چند کی تقلید لیکن بعدازاں اپنا منفرد انداز واسلوب اختیار کیا۔ انہوں نے مشرقی اُترپردیش کے ماحول کی لائق تحسین منظرکشی کی، انہوں نے مظلوموں، غریبوں اور پسماندہ طبقوں کے حق میں آواز بلند کی اور زمینداروں اور جاگیرداروں کے ظلم وستم کی بھرپور مذمت کی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں حب الوطنی، سیکولرازم، انسانیت نوازی کی حمایت کی اور اُردو کہانی کے پیش قدمی میں غیر معمولی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

☆☆

حسینی صاحب کی تحریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کوئی دوسو کے قریب افسانے لکھے لیکن انتہائی تلاش کے باوجود اُن کے کئی افسانے دستیاب نہیں ہو سکے۔ اُن کی جتنے بھی افسانے دستیاب ہوئے وہ ہم نے حصہ دوم میں شامل کردیئے ہیں ان میں سے کچھ مسودات کی صورت میں ہمیں اُن کے بھتیجے معصوم حسینی (احمد عباس حسینی) کی معرفت حاصل ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض ادھورے، کٹے پھٹے تھے لہذا ان میں سے مکمل افسانوں کو اس میں شامل کردیا گیا۔ علاوہ ازیں دو افسانوی مجموعے حسینی صاحب کی بیٹی گیتی ابرار نے کراچی سے ارسال کئے تھے ہم ان دونوں کے بے حد شکر گزار ہیں۔ کئی جگہ کچھ افسانوں کا ذکر ملتا ہے مگر انتہائی کوشش کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکے جیسے بوڑھا اور بالا وغیرہ۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد جو بھی مزید افسانہ ملے گا اسے ہم اس کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں شائع کردیں گے اور زیادہ ہونے کی صورت میں تیسری جلد مرتب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

نند کشور وکرم

۲۰/اکتوبر ۲۰۱۶ء دہلی

علی عباس حسینی

سوانحی اشارے

نام : علی عباس حسینی

ولادت : ۳رفروری ۱۸۹۷ء (تذکرۂ ماہ وسال از مالک رام) موضع پارہ ضلع غازی پور (اُترپردیش)

والد : سید محمد صالح (والد)

دادا : مولانا سید حسین اصغر

نانا : سید جعفر علی

وفات : ۲۷رستمبر ۱۹۶۹ء

تعلیم : ایم اے تاریخ (۱۹۲۴ء)۔ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ میں عربی اور دینیات کی تعلیم پائی، پھر محمڈن اسکول پٹنہ کے چھٹے درجے میں داخل کرادیا گیا۔ بیمار پڑنے پر غازی پور چلے گئے اور وہاں جرمن مشن اسکول میں ساتویں درجے میں داخل ہوئے بعدازاں الہ آباد میں دوسال تک تعلیم پانے کے بعد ۱۹۱۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۷ء میں کرسچین کالج سے انٹرمیڈیٹ کے بعد ۱۹۱۹ء میں کیننگ کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں ٹیچرز ٹریننگ کالج الہ آباد سے ایل۔ ٹی کیا اور ۱۹۲۴ء میں تاریخ میں ایم اے (تاریخ) کی ڈگری حاصل کی۔

ازدواجی زندگی: دو شادیاں ہوئیں پہلی شادی چچازاد بہن سے کی جن کی چھ برس بعد وفات

ہوگئی۔ان کی نشانی مرحوم مہدی عباس حسینی (سابق ایڈیٹر ماہنامہ ''آج کل'' نئی دہلی) تھے دوسری شادی معروف عربی عالم علامہ سید محمد مرتضٰی نونہروی کی پوتی سے ہوئی۔جن سے پانچ اولادیں ہوئیں۔دو بیٹے اور تین بیٹیاں۔ بڑی بیٹی مشہور افسانہ نگار کشور زیدی (کشور سلطان سابق ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو گورکھپور تھیں جن کا انتقال ہو چکا ہے) دوسرے بیٹے باقر عباس حسینی کیلیفورنیا [امریکہ] میں مقیم ہیں) تیسرے بیٹے اصغر عباس طالب حسینی تھے جو بمبئ میں فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔۱۹۹۱ء میں اُن کا انتقال ہوگیا) دوسری بیٹی گیتی ابرار کراچی میں مقیم ہیں۔سب سے چھوٹی بیٹی نازش حسینی ہیں جو دوردرشن دہلی میں سابق ڈائرکٹر کنٹرولر آف پروگرام تھیں۔اب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں)

مشاغل : ۱۹۵۴ء میں پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

پہلی کہانی : پہلی کہانی 'پژمردہ کلیاں'' 1918ء لکھی

پہلی مطبوعہ کہانی : پہلی کہانی ''جذبِ کامل'' ستمبر ۱۹۲۵ء میں ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور میں شائع ہوئی۔

پہلا ناول : سرسید احمد پاشا کے نام سے پہلا رومانی ناول لکھا۔

مطبوعات :

ناول:

۱۔ سرسید احمد پاشا عرف ''قاف کی پری؛ بھارگو بک ڈپو،لکھنؤ۔۱۹۴۱ء

۲۔ شاید کہ بہار آئی۔اردو کتاب گھر کراچی (پاکستان)

۳۔زیتون کا بادشاہ عرف حکیم بانا۔مارچ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

۴۔ندیا کنارے پبلی کیشنز ڈیژن،نئی دہلی۔۱۹۶۴ء

افسانے:

۱۔ آئی سی ایس اور دوسرے افسانے:انڈین پریس،الہ آباد ۱۹۴۰ء [آئی سی ایس۔شینخو چچا۔جھوٹ۔دو شریفوں کا مقابلہ،ملکِ خدا تنگ نیست۔ بیلوں کی جوڑی۔قانون باطن۔بختیارک کا نسخہ۔ملاپ۔شیخ کریم کی نفرت۔سماج کی بھینٹ،شریف مزدور۔دل کی آگ۔اور پیاسی جوگن۔چودہ افسانے]

۲۔ رفیقِ تنہائی۔مکتبہ اُردو، لاہور ۱۹۴۲ء۔صفحات ۲۶۴

۳۔ باسی پھول: مکتبہ اُردو، لاہور۔۱۹۳۹ء، (کل چودہ افسانے)[باسی پھول (۱۹۲۸) گونگاہری (۱۹۳۴ء) بیوی (۱۹۲۹ء) نئی ہمسائی (۱۹۳۳ء) عدیا تنبولن (۱۹۳۳ء) کہے کا بھوگ (۱۹۲۹ء) عدالت (۱۹۲۹ء) آم کا پھل (۱۹۲۹ء) امتحانِ قدرت (۱۹۳۰ء) شکاریا شکاری (۱۹۳۰ء) خوش قسمت لڑکا) (۱۹۳۹ء) حقِ نمک (۱۹۳۹ء) کیا کیا جائے (۱۹۳۸ء)]

۴۔ کانٹوں میں پھل: اُردو اکادمی سندھ، کراچی (پاکستان)

۵۔ میلہ گھومنی: مکتبہ اُردو، لاہور (بیس افسانے)[وکیل اور منشی، جھبو کا ہیرو، طمانچہ، کنجی، ولی عہد، بدلہ، پہریدار، کھیت، ہٹی، بھکاری، حسنِ رہگزر، پیاسا، عملِ خیر، خالی گود، میلہ گھومنی، کفن، کلی، بجھنم، بیگار، میخانہ۔]

۶۔ ایک حمام میں: (۱۳۔افسانے)[عید پیچھے ٹر، عزت، نبی بخش، دیہاتی، اندھیرا اُجالا، اپریل فول، جن کا سایہ، کانٹوں میں پھل، ایک عورت ہزار جلوے، ہنستی چنگاری، چور لڑائی، کچھ لالہ و گل، ایک حمام میں]

۷۔ اُلجھے دھاگے

۸۔ ہمارا گاؤں اور دوسرے افسانے: اورینٹل پبلشنگ ہاؤس، امین آباد، لکھنؤ: ۱۹۵۶ء (دس اافسانے)[ہمارا گاؤں۔گاؤں کی لاج۔لاٹھی پوجا۔ چناؤ۔بے وقوف۔نورونار۔دوددا، حاجی بابا، پوتر سیندور، جل پری]

۹۔ یہ کچھ ہنسی نہیں ہے۔انڈین پریس الہ آباد

۱۰۔ حکیم بانماز (مزاحیہ کہانیاں)

ڈرامے: ۱۔نورتن یا ایک ایکٹ کے ڈرامے: مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔۱۹۴۳ء

۲۔ امیر خسرو، پنجابی پستک بھنڈار۔دہلی ۱۹۶۸ء

تنقید:

۱۔ عروسِ ادب: ساقی بک ڈپو، دہلی۔۱۹۴۴ء سے قبل

۲۔ اُردو ناول کی تاریخ و تنقید: انڈین بک ڈپو، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی

گڑھ ۱۹۸۷ء

۳۔تذکرہ اور اُردو مرثیہ اُردو پبلشرز، لکھنؤ

۴۔ہماری اُردو شاعری (اعتراضات ومعروضات) غیر مطبوعہ

علی عباس حسینی پر تحقیقی کام:

۱۔علی عباس حسینی: حیات اور کارنامے ڈاکٹر تہمینہ اختر

۲۔علی عباس حسینی شخصیت اور فن: ڈاکٹر محمد اسلم حیات، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان ۱۹۸۳ء، صفحات ۶۴۸ نگران ڈاکٹر سلیم اختر)

علی عباس کی کہانیاں (حصہ اول) مرتبہ نند کشور وکرم

ہندی کتابیں:

۱۔کومل نگری (شاید کے بہار آئی' کا ترجمہ)

۲۔پھولوں کی چھڑ ی......

۳۔گائے اماں وغیرہ

ساغر نظامی

علی عباس حسینی سے انٹرویو

حُسینی : ساغر صاحب، آپ تو خود بھی ایک فنکار ہیں، ایک افسانہ نویس سے اس کی داستانِ حیات کیا پوچھتے ہیں۔ فنکار اکیلی شخصیت نہیں ہوتا، اس کی ایک ہستی میں ہزاروں ہستیاں پوشیدہ رہتی ہیں جو اس کی تخلیقات کے رُوپ میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ آپ افسانہ نگار کے پیش کیے ہوئے کرداروں میں سے کسی ایک کو لے کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے مصنف کی شخصیت یا کردار یہی ہے۔ بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ ''یہ بھی ہے۔''

ساغر : بجا فرمایا حسینی صاحب، مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ بے شک افسانہ نویسی اور شاعری میں زیادہ فرق نہیں، دونوں تخلیقی فن ہیں اور دونوں کے خالق ہمہ گیر شخصیتیں رکھتے ہیں۔ پھر بھی ہمہ رنگ شخصیت جسم کی ایک ہی بوتل میں بند ہوتی ہے۔ اور یہ تو بتایا ہی جاسکتا ہے یہ مرکب عطر کس کارخانے میں کھینچا، اور اس کی تیاری میں کیسی کیسی جانفشانیاں کی گئیں۔

حُسینی : اچھا، تو پھر آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ منکہ علی عباس حسینی ولد محمد صالح حسینی مرحوم ہوں، ۱۸۹۹ء (صحیح تاریخ ۳ر فروری ۱۸۹۷ء) میں موضع پارہ، ضلع غازی پور، یو پی میں پیدا ہوا۔ باپ دادا چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ مگر زمینداری سے زیادہ اپنے علم کی بنا پر مشہور تھے۔ ہم لوگ مولویوں کے گھرانے والے تھے۔ خاندان کی روایت کے مطابق فارسی کی ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھیں، پھر تین

برس مدرسہ سلیمانیہ میں عربی کی تعلیم حاصل کی۔ بزرگوں کو خیال رہا مجھ میں زمینداری سے زیادہ دنیاداری کا مادّہ ہے۔ اس لیے عربی مدرسہ سے نکال کر انگریزی اسکول میں بھیج دیا۔ اور پٹنہ سے پارہ چلا آیا۔ یہ غازی پور سے سات میل کے فاصلے پر ہے۔ میں نے ساتویں آٹھویں درجوں میں اس مسافت کو روزانہ پیدل چل کر طے کیا ہے۔ یعنی آنا جانا دونوں ملا کر چودہ میل روزانہ چلتا تھا۔

ساغر : ہاں صاحب، یہ اصلی گھی کھانے والے ہی کر سکتے تھے۔

حُسینی : جی، اس وقت ہمارے گاؤں میں پونے دو سیر کا خالص گھی ملتا تھا۔ یقیناً اسی کا زور تھا کہ چودہ میل چلتا ہی نہ تھا بلکہ روزانہ شام کو یہ مزید حرکت ہوتی کہ پانچ ساڑھے پانچ بجے تک گھر پہنچا کچھ ناشتہ کیا اور پلنگ کی ہٹی کا بلاّ اور کپڑے کے گیند لے کر یاروں کے ساتھ کرکٹ پر چل پڑا۔

ساغر : یہ کپڑے کے گیند بھلا کیا کام دیتی ہوگی!

حُسینی : اسے نہ پوچھیے، بیچ میں ایک چھوٹا کنکر یا پتھر رکھا جاتا تھا۔ اس کے گرد چیتھڑے خوب کس کے لپیٹے جاتے تھے، اس پر گھر کی بڑی بوڑھیاں یا بہنیں نئی نئی ڈیزائنیں بناتی تھیں۔ اتنی سخت گیند ہوتی تھی کہ پوری ہٹ کسی کے سینے پر پڑ جاتی تھی تو وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا۔

ساغر : تو آپ کرکٹ کے تو اچھے کھلاڑی رہے ہوں گے۔

حُسینی : اجی میں کھلاڑی کسی چیز کا بھی اچھا نہ تھا۔ کسی چیز میں بھی مہارت حاصل کرنے کے لیے بڑے استقلال، بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں کھیل محض کھیل کے لیے ہوتا تھا۔ اس کی باریکیوں پر حاوی ہونے کی کبھی کوشش نہ کی۔ پڑھنے سے نسبتاً زیادہ شوق تھا۔ مگر درسی کتابوں کا نہیں بلکہ ناولوں، قصوں، کہانیوں میں بڑی دلچسپی تھی۔ عبدالحلیم شرر اور محمد علی طیب کا اُس زمانے میں بڑا زور تھا۔ والد مرحوم کے پاس 'دلگداز' اور 'مرقع عالم' دونوں آتے تھے۔ گھر میں ان کی تصنیفات بھی موجود تھیں۔ چھپا چھپا کر سب پڑھ ڈالیں۔ انگریزی کے نویں ہی درجے میں تھا کہ اسکاٹ اور اینی ٹوس کے ناول پڑھنے کو مل گئے۔ میٹریکولیشن

پاس کرنے تک انھیں پھانک ڈالا۔

ساغر : تو آپ نے میٹریکولیشن غازی پور سے کیا۔

حُسینی : جی نہیں۔ ۱۹۱۵ء میں مَیں نے میٹریکولیشن جمنا مشن اسکول الٰہ آباد سے کیا۔ ۱۹۱۷ء میں ایف اے ریڈ کرسچین کالج لکھنؤ سے، وہیں سے جہاں ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا پڑھاتے تھے۔ بی اے ۱۹۱۹ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے پاس کیا۔ چھ مہینے محمّڈن اینگلو عربک کالج علی گڑھ میں ہی انگریزی کے ایم اے اور ایل ایل بی کے درجوں میں حاضری دی۔ پھر صحت کی خرابی کی وجہ سے وہاں سے چلا آیا اور ۱۹۲۱ء میں ایل ٹی کر کے گورنمنٹ اسکول رائے بریلی میں مدرّس ہو گیا۔ وہیں سے ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں تاریخ میں ایم اے پریویس اور فائنل کے امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کیے۔

ساغر : حُسینی صاحب، آپ لکھنؤ کس سن میں تشریف لائے؟

حُسینی : مَیں.........مَیں لکھنؤ آیا اور ریڈ کرسچین کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا۔

ساغر : ذرا اپنے زمانے کے لکھنؤ کی کچھ باتیں سنائیے۔ ہر چند کہ میں جانتا ہوں کہ یہ بڑا ہی سخت فریضہ ہے۔

حُسینی : ساغر صاحب، ہائے کیا یاد دلا دیا آپ نے! ایک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے۔ اُس وقت کے مٹتے ہوئے لکھنؤ میں ایک بانکپن تھا، ایک نکھار تھا، ایک ستھراپن تھا جو اب خواب وخیال میں بھی نہیں آ سکتا۔ لکھنؤ پارکوں اور لانوں کا شہر تھا، جہاں ہر شام کو ایک میلے کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ مختلف خونچے والے اپنے اپنے سودے کے لیے نئی نئی آوازیں لگا رہے ہیں۔ گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں، اُن میں سے ایک صدا تو ایسی کان میں رچ بس گئی ہے کہ اب تک نہیں بھولتی۔ وہ تھی ”میاں بیجوں کی پڑیا، پیسے میں دو!“

ساغر : بیجوں کی پڑیا کیا بلا تھی؟

حُسینی : جی جناب، یہ خربوزے کے بیج ہوتے تھے جو چھیل کر، شکر میں پاگ کر اس طرح بیچے جاتے تھے۔

ساغر : ایں، اتنے سستے!

حُسینی : اجی، وہ سستی کا سے ہی تھا۔ بس اسی سے سمجھئے کہ میں فرنگی محل سے قریب سوداگر کے امام باڑے میں رہتا تھا، اور پاٹا نالہ کے ایک باورچی کے ہاں سے میرے لیے کھانا آتا تھا۔ پانچ چپاتیاں، ایک پلیٹ میں خشکہ، ایک پیالے میں دال، ایک میں قورمہ، ایک طشتری میں ایک شامی کباب، ایک میں چٹنی، ایک لڑکا دونوں وقت یہ سینی میں لگا کر لاتا اور مجھے کھانا کھلا کر برتن واپس لے جاتا اور مہینے بھر کی اس تواضع کے بعد مجھے دینا پڑتا تھا ساڑھے چار روپے۔

ساغر : ساڑھے چار روپے! حیرت ہے!!

حُسینی : جی ہاں، اِس زمانے میں ۴۵ روپیہ بھی دو وقت کے کھانے کے کم ہیں۔

ساغر : جی ہاں، تقریباً آٹھ گنے کا فرق ہے۔ آج تو روٹی اور آدمی دونوں کا کال ہے۔

حُسینی : ساغر صاحب، مجھے زبان سیکھنے اور مشاعروں میں شرکت کا شوق تھا۔ ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسؔوا تو استاد ہی تھے۔ تین برس اُن کے فارسی کے کلاس میں برابر حاضر ہوتا رہا۔ وہ صحیح معنوں میں حکیم تھے۔ پوری درجن بھر زبانوں سے واقف۔ ریاضی، طبیعات، کیمیا، ایمیا، سیمیا، نجوم، ہیئت، موسیقی، منطق، فلسفہ کے عالم۔ اُردو شارٹ ہینڈ کے موجد، شاعر و نثر نگار، مؤلف و مترجم، مصنف و فنکار۔ اُن کی رنگین زندگی مولوی و عالم ہونے پر بھی اُن کے مزاج کا بانکپن، ان کی جرأت، اُن کی دلیری، اُن کی صداقت، اُن کی مردانگی۔

ساغر : یہ تمام صفات تو یقینی اُن کی بے تصنع ذات کو ہندوستانی سے زیادہ یونانی کہلانے کا مستحق بناتی ہیں۔

حُسینی : اس میں کوئی شک نہیں۔ ان مرزا رسؔوا کے علاوہ جن باکمال شعرا کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا، وہ تھے صفؔی، ثابتؔ، عزیزؔ، ناطقؔ، بیخودؔ، یاسؔ و آرزوؔ۔

ساغر : اور مرثیہ گو شعرا میں کس کس سے ملاقات تھی آپ کی؟

حُسینی : شیدا صاحب، دولہ صاحب، فائق صاحب، اور منے صاحب ذکی، ان حضرات کا دَور دَورہ تھا۔ مرزا اوجؔ کی خدمت میں بھی حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ مگر صرف زبان کے طالب علم کی حیثیت سے۔ ہم سب خاندانی طور پر ''انیسیے'' ہیں۔

ساغر : خوب! نثر نگاروں میں کون کون حضرات اس زمانے میں موجود تھے؟

حُسینی : جی، سب سے بڑے تو استاد مرحوم مرزا رسوا تھے، پھر مولانا عبدالحلیم شرر، مرزا عباس حسین ریش، شیخ ممتاز حسین عثمانی، مرزا عسکری بی اے، ظفر الملک علوی وغیرہ وغیرہ، نہ جانے کتنے تھے۔ سوائے مولانا شرر کے مجھے تمام ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔

ساغر : چکبست بھی تو اُس زمانے میں تھے؟

حُسینی : جی ہاں، مجھے چکبست سے بھی نیاز حاصل تھا۔ ایک بار تو اسی زمانۂ طالب علمی میں ملا، اور رائے بریلی اسٹیشن پر ان کے تنِ مردہ کی زیارت کی۔ میں اُس وقت رائے بریلی میں ٹیچر تھا۔ وہ کسی مقدمے کے سلسلے میں وہیں آئے تھے اور واپسی میں قلبی دَورہ پڑنے پر ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں اچانک انتقال کیا، مجھے یاد آیا، مجھے کیا سب ہی دیکھنے والے سوگواروں کو ان کا مشہور شعر بار بار یاد آتا تھا:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

ساغر : ہاں صاحب سچ ہے۔ زندگی کا کیا ٹھکانہ۔ ہر شخص کو موت کا کڑوا گھونٹ ایک دن حلق سے اُتارنا ہے، لیکن باکمال مرتے نہیں ہیں، چکبست بھی اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اچھا، یہ تو فرمائیے کہ آپ علی گڑھ کب گئے اور وہاں کن کن سے ملاقات ہوئی؟

حُسینی : جی ۱۹۱۹ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد۔ اُس وقت ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب پرنسپل تھے۔ چونکہ بی اے مَیں نے اچھے ڈویژن میں پاس کیا تھا، اس لیے انھوں نے بڑے اصرار سے طلب فرمایا۔ وہاں جا کر جب اُن سے ملا تو انہیں نہ اپنا خط یاد تھا نہ اپنے وعدے۔ کوئی پندرہ سولہ بار اُن سے اُن کے دفتر میں ملا، اور ہر بار میرا نام اور میرا کام پوچھتے تھے۔ تین قابلِ ذکر ہستیاں اُس وقت محمڈن کالج میں موجود تھیں۔ رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور تیسرے خواجہ غلام السیدین۔ پہلے دونوں حضرات تو میری طرح ایم اے کے طالب علم تھے، لیکن خواجہ صاحب نے اسی سال ایف اے میں داخلہ لیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں اوّل آئے تھے اور پندرہ برس سے بھی کم سن تھا اس لیے سن کی قید سے مستثنیٰ کر دیے

گئے تھے۔ ذاکر صاحب اور سیّدین صاحب کی اُس وقت بھی یہ حالت تھی کہ:

بر سرش ز ہوشمندی   می تافت ستارہ بلندی

ساغر : جی ہاں، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اچھا، یہ تو فرمایئے کہ مدرّسی کے پیشے کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں؟

حُسینی : ساغر صاحب، ۱۹۵۴ء میں جب میں تیس اور تین برس کی مدرّسی کے بعد ریٹائر ہوا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کسی تنفس سے آزادی نصیب ہوئی۔

ساغر : تو کیا آپ کو مدرّسی کا پیشہ ناپسند تھا۔ میرے خیال سے مدرّسی کرنا تو حکومت کرنا ہے۔

حُسینی : نہیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ میں معلّمی کے پیشے کو بُرا سمجھتا ہوں یا میں بُرا اُستاد تھا یا مجھے اپنے شاگردوں میں دلچسپی نہیں تھی۔ میرے افسران محکمہ، میرے ساتھی، میرے بچے مجھ سے ہمیشہ خوش رہے۔ میرا خیال ہے کہ استاد پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جا سکتا۔

ساغر : افسانہ نویس بھی پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا۔

حُسینی : جی ہاں، اُستاد ہونے کے ساتھ میری بدنصیبی کہ مَیں فطری طور پر اس کام کے لیے بہت مناسب تھا، لیکن اسی کے ساتھ ایک فنکار بھی تو تھا۔ فنکار اور مصنف آزادی چاہتا ہے، اندازِ فکر کی، اظہارِ خیال کی۔

ساغر : اور سرکاری ملازمت کی وجہ سے قلم پر پابندیاں ہوں گی، مدرّسی کی وجہ سے زبان بندی۔

حُسینی : جی ہاں۔ کوئی ایسی بات نہ لکھ جاؤں جس کی وجہ سے انگریز حاکم آنکھ دِکھائے، کوئی بات زبان سے ایسی نہ نکلے کہ چیلے گرو جی پر ہنسیں۔ مجھ میں شروع ہی سے حب الوطنی کا جذبہ ضرورت سے زیادہ تھا، لہٰذا اس دَورِ غلامی میں بھی جنگ آزادی کے بارے میں لکھنے سے باز نہ آتا تھا، لیکن ہاتھ پاؤں بچا کر لکھنا پڑتا تھا اور یہ احساسِ پابندی کھلتا تھا۔

ساغر : پریم چند کو بھی یہی اُلجھنیں پیش آئی تھیں۔

حُسینی : جی ہاں، انھوں نے سرکاری نوکری کو لات ماردی، مجھ سے یہ نہ ہو سکا۔

ساغر : حسینی صاحب، کچھ لوگ آپ کو پریم چند کا ہم عصر کہتے ہیں، یہ کہاں تک صحیح ہے؟

حُسینی : میں پریم چند کا اسی حیثیت سے ہم عصر ہوں جس حیثیت سے کہ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور خواجہ احمد عباس میرے ہیں۔

ساغر : آپ کا سب سے پہلا افسانہ کب شائع ہوا؟

حُسینی : ۱۹۲۴ء میں میرا سب سے پہلا افسانہ 'جذب کامل' زمانہ کانپور میں شائع ہوا۔ اُس وقت تک پریم چند مشہور افسانہ نویس بن چکے تھے، بلکہ اُن کے دو تین ناول بھی شائع ہو چکے تھے۔ مجھے اُن کی عینیت پسندی میں ملی جلی حقیقت پسندی پسند تھی۔ ساتھ ہی دیہاتی زندگی کے جو مرقعے اُنھوں نے پیش کیے وہ میرے دل کو بہت بھائے۔ ہندوستان کاشتکاروں اور دیہاتوں کا ملک ہے۔ مَیں بھی دیہاتی تھا، اس لیے مَیں نے بھی زیادہ تر اپنے دیہاتوں ہی کی زندگی بیان کی۔ مَیں نے اپنے افسانوں کا سب سے پہلا مجموعہ 'رفیقِ تنہائی' خود اپنے خرچ سے شائع کیا۔

ساغر : اس پر تو آپ کو ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد نے پانچ سو کا انعام دیا تھا۔

حُسینی : جی ہاں، خیریت ہوئی ورنہ نسخہ مہنگا پڑتا۔ یہ انعام مجھ سے پہلے پریم چند جی کو مل چکا تھا۔ غالباً ۱۹۲۶ء میں۔ یوں تو اس کے بعد سے مجھے تین بار اور بھی کہانیوں ہی پر انعامات مل چکے ہیں، مگر ساغر صاحب جیسی خوشی اس پہلے انعام کے ملنے پر ہوئی تھی، پھر کبھی نہ محسوس ہوئی۔

ساغر : موجودہ دَور کے افسانہ نویسوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

حُسینی : موجودہ دَور کے ہندوستانی افسانہ نویسوں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی خاص طور پر ممتاز ہیں۔ میری نظر میں اِن میں بیدی سب سے اچھے فنکار ہیں، کرشن چندر کی طرز میں بڑی حلاوت اور شیرینی ہے، خواجہ احمد عباس حقائق کے بیان میں بڑی لطافتِ حس سے کام لیتے ہیں اور عصمت کے قلم میں بڑی نشتریت اور زہر ہے۔ ان چند ناموروں کے پیچھے پیچھے اور ساتھ ساتھ بیسیوں اور بھی اچھے لکھنے والے ہیں، جنھوں نے اُردو افسانہ نویسی کا معیار اتنا بلند کر دیا ہے کہ وہ اس صنفِ ادب میں بین الاقوامی کرسی کے مستحق بن گئے ہیں۔

ساغر : کیا ناول مختصر کہانی کو پھلانگ جائے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے ناول کا ارتقا افسانہ نگاری کے زوال کا باعث بنے گا؟

حُسینی : ناول نویسی کا جہاں تک تعلق ہے، ہم ابھی بہت پیچھے ہیں۔

ساغر : تو اب تو آپ ریٹائر ہو چکے ہیں، سرکاری نوکری کی قید و بند ہے اور نہ معلّمی و مدرسی کی زباں بندی۔ اب آپ اس طرف کیوں نہیں توجہ کرتے ؟

حُسینی : ہاں ارادہ تو ہے، لیکن فکرِ معاش اب بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتی، اور جب تک دماغی سکون نہ ہو کوئی پائیدار تخلیقی کام نہیں ہو سکتا۔ کم سے کم میری تو یہی حالت ہے۔

ساغر : بہت بہت شکریہ کہ آپ نے اپنی سوانح اور خیالات سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔

حُسینی : ہاں مگر بات ادھوری ہی رہی۔ بقول شادؔ مرحوم:

سنا فسانۂ ہستی تو درمیاں سے سنا
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

آم کا پھل

ساون کا مہینہ تھا۔ کالی کالی گھٹائیں جھوم جھوم کے اُٹھتی اور ٹوٹ ٹوٹ کے برستی تھیں۔ ٹھاکر صاحب کے آموں کے باغ میں ٹپکا لگا تھا۔ لڑکے لڑکیاں اسی تاک میں رہتے کہ رحیمن کھٹک کی آنکھ بچے اور آم لے اُڑیں۔ مگر وہ ستر ابہترا ہونے پر بھی اتنا ٹانٹھا تھا کہ اپنے ایک پلیا چھوٹے چھپر میں بیٹھا، وہ ڈانٹ بتاتا کہ لونڈوں کے اوسان خطا ہوتے تھے اور ان کو بھاگتے ہی بن پڑتی تھی۔ اگر کوئی لڑکا کسی طرح اس کی آنکھیں بچا کر ایک آدھ زمین پر پڑے ہوئے پھل اُٹھا لینے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو کبڑیے کا کتا اس کی ٹانگیں لیتا تھا۔ یہ پاجی اپنے مالک سے بھی زیادہ ایک ایک آم کی رکھوالی کرتا تھا اُس نے لڑکوں کا ناک میں دَم کر رکھا تھا۔ گاؤں بھر میں سب سے اچھے اور میٹھے آم، اور کوئی بغیر پیسہ خرچ کیے انھیں کھا نہ سکے! اور پیسہ اُن کے ماں باپ کے پاس نہیں! کسانوں کے گھر میں دو چار من غلّہ تو پڑا رہ سکتا ہے، مگر نقدی علیہ السلام زرد و سپید رہ سکے، ان کا وہاں کہاں گزر؟ اس لیے اُچک لینے اور چوری کرنے کو جی کیوں نہ چاہے؟ اور وہ بھی ایسے زمانے میں جبکہ سوائے اس باغ کے گاؤں میں کہیں اور آم نہ رہ گیا ہو۔

چنانچہ اِن آموں کے حاصل کرنے کی تدبیروں پر غور کرنے کے لیے سبھائیں ہوتیں جلسے کیے جاتے اور تجویزیں پاس ہوتیں۔ ان پھلوں کے چرالانے کے لیے بازیاں لگتیں اور انعام مقرر ہوتے، اور کبھی کبھی تو ان دو چار گرے پڑے آموں کے لا دینے پر وہ کچھ مل جاتا جو مجنوں کو جنگلوں کی خاک چھاننے اور فرہاد کو پہاڑ کی چٹانیں کاٹنے کے بعد بھی نہ مل سکا تھا!

چندی جو اس باغ میں ایک اندھیری رات میں گھسا تھا وہ اسی غرض سے۔ اُس کے بچپن ہی میں ماں باپ مر گئے تھے۔ برادری والوں نے اس کے سارے کھیتوں پر قبضہ کر کے اُسے

اس طرح بے سہارا کر دیا تھا کہ وہ چوری کرنے اور ڈاکہ ڈالنے کا عادی سا ہو گیا تھا۔ پہلے یہ حرکتیں مدافعانہ تھیں۔ اُسے زندہ رہنا تھا اور اس کے لیے جنگ ضروری تھی، لیکن جیسے جیسے وہ بڑھتا گیا اور اس کے بازوؤں میں قوت اور دماغ میں عقل آتی گئی، اس کی دفاعی تدبیریں جارحانہ کارروائیوں کی صورت اختیار کرتی گئیں۔ وہ ایک پیشہ ور فسادی چور اور ڈاکو بن گیا۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے وہ بدچلنی کے سلسلے میں محض شبہ پر ایک سال کی سزا کاٹ کر چھوٹا تھا۔ مگر جیل ہو آنے سے اس کی ''مذموم صفتیں'' اس میں اور راسخ ہو گئی تھیں۔ جیل کی نامعلوم سختیاں ڈراؤنی نہ رہ گئی تھیں۔ بھوکے کے لیے گاؤں سے زیادہ قیدخانے میں راحت تھی، اسی لیے اب اس کی قطع اس سانڈ کی تھی، جو داغ کر چھوڑ دیا گیا ہو اور جو یہ سمجھنے لگا ہو کہ اُسے اس کا فطری حق ہے کہ وہ ہر ایک ہرے بھرے کھیت کو چر ڈالے۔

مگر آج اس اندھیری رات اور موسلا دھار بارش میں، چندی کو بھوک اس باغ میں نہ لائی تھی۔ اس کی غرض اپنے لیے آم چرانا نہ تھی، اُس کا مقصد ان آموں کو دل کی دیوی کی بھینٹ چڑھانا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی اپنے 'انگوچھے' کے ایک کونے میں گرہ دی، اور اسے تھیلے کی شکل کا بنا لیا، پھر آہستہ آہستہ بلّی کی چال چل کر اس نے دس بارہ آم مختلف تھالوں سے اُٹھا کر اس تھیلے میں رکھے۔ اس شاطر نے یہ کام کچھ اس صفائی اور احتیاط سے کیا کہ نہ تو کھٹک جاگا اور نہ کتّے کو خبر ہوئی، پھر وہ اپنا یہ 'پرشاد' لے کر اس طرف روانہ ہو گیا جدھر بدلیا رہتی تھی۔

بدلیا اسی کی ذات برادری کی ایک چمارن تھی۔ اپریل میں 'گونا' کرا کے سسرال آئی۔ اور جون میں ٹھاکر کی بیگار نے اُسے دُلہن کی جگہ بیوہ بنا دیا تھا۔ پتی کو چھ کوس ٹھیک دوپہر میں شہر تک ننگے پاؤں جانا پڑا۔ زمیندار کا حکم موت کی طرح ٹالا نہ جا سکتا تھا۔ پلٹتیوں میں لُو لگی اور گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی جلتی بھنتی زمین پر گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ بدلیا نے مانگ کا سیندور دھو ڈالا۔ رنگین ساری اُتار کر وہ پھٹی پُرانی ساری پہن لی، جس کے سوا اُس کے پاس جسم ڈھانکنے کو اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ اور کئی وقت مارے رنج کے ایک دانہ تک منہ میں نہ ڈالا۔ لیکن اس سوگ منانے سے ساس نندوں کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ انھوں نے اسے 'ڈائن' گھر اُجاڑن، اور 'دکھن پھیری' ٹھہرا دیا اور اُسے اپنے پھوس کے محل سے نکال کر بیلوں کے چھپر میں جگہ دی، تاکہ اس کا منحوس سایہ ان کی 'پوتر' دہلیز پر نہ پڑے۔ یہیں ایک کھرے کھاٹ پر بدلیا پڑی رہتی تھی، دن رات میں ساس نندوں میں سے کسی کا اگر جی چاہتا تو وہ اسے تھوڑا سا ستو، مٹھی بھر چنا، یا تھوڑی

سی مڑ دے جاتی تھیں، ورنہ وہ تھی بیل تھے، مچھر تھے، گوبر تھا اور سڑے ہوئے بھوسے کی بوُ!

گاؤں کی چھر ٹولی، بہت چھوٹی سی جگہ ہوتی ہے، وہاں ایک دل کے دھڑ کنے کی آواز دوسرے دل آسانی سے سن لیتے ہیں۔ وہاں کوئی کام راز میں نہیں رہ سکتا ہر بات پھوٹ نکلتی ہے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن اس ''گھر نکالا'' اور نئی سزا کی خبر سب کو مل گئی۔

بڑے بوڑھے تو سر ہلا کر چپ رہے۔ لیکن لڑکوں اور نوجوانوں میں ہمدردی کی ایک لہر دوڑ گئی، ہر ایک نے بدلیا کی مدد اپنے اُوپر فرض کر لی، کوئی لڑکا بڑوں کی آنکھیں بچا کر اپنے گھر سے گڑ کا ٹکڑا اُڑا دیتا اور اُس میں سے اپنا حصّہ نکال کر بدلیا کو دے آتا۔ کوئی اپنے حصّہ کا ستو ختم کر کے اپنے کسی بھائی یا بہن کا ستو گھما دیتا۔ اور اسے نئی بھوجی تک پہنچا آتا۔ کوئی دوسرے لڑکوں کی کوئی کھانے کی چیز چرا لیتا۔ اور اُسے اس دُکھ کی دیوی کے چرنوں میں چڑھا آتا تھا۔

نوجوان ادھر سے گنگناتے نکلتے 'بھوجی' کہہ کے بدلیا کو متوجہ کرتے اور دوسروں کی نظریں بچا کر ایک آدھ آم، یا دو ایک اَمرود پھینک آتے تھے۔

چندی بھی اس چھپر کے کئی پھیرے لگا چکا تھا۔ وہ اپنے کرتوتوں سے اب تک کنوارا تھا اسی لیے دوسروں کی نسبت اس کی ہمدردی بھی زیادہ تھی۔ مگر بدلیا اس کی صورت سے ویسا ہی سہم جاتی تھی۔ جیسے کبوتر بحری کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے۔

اس لیے رات کی ڈراؤنی تاریکی میں جب وہ تنہائی، گرج اور چمک سے گھبرا گھبرا کر کروٹیں لے رہی تھی، چندی کا دَبے پاؤں اس کے چھپر میں آنا اس کے لیے کسی طرح وجہ تسکین دل نہیں ہو سکتا تھا۔ یقینی اکیلے میں ساتھی کی بڑی خواہش بڑھ جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کوئی ہمدرد پہلو میں ہوتا۔ اس سے مل کر بیٹھتے، اپنی بیتی کہتے، پرائی بیتی سنتے، پر یہ باتیں ہم جنسوں سے ممکن ہیں۔ بھیڑ اور بھیڑیئے یا چڑیا اور شکرے میں نہیں ہو سکتی ہیں۔

بدلیا، اسی لیے چندی کو پہچانتے ہی، گھبرا کر کھاٹ پر اُٹھ بیٹھی اور اس نے بڑا سا گھونگھٹ نکال لیا۔

چندی مسکرا کر بولا۔ ''لو بھوجی، تمھارے لیے ٹھاکر کے باغ کے آم لایا ہوں۔'' یہ کہتے کہتے اس نے انگوچھے کی گرہ کھول کے، بالکل ایک پونجی پتی کے انداز سے کھاٹ پر آم ڈھیر کر دیئے۔ لنگڑے، دسہری، سفیدے کے پھل، ڈال پر پکے ہوئے، پورے رس پر! وہ خوشبو پھیلی کہ جگالی کرتے ہوئے بیلوں نے بھی بند آنکھیں کھول دیں اور شیشے کی طرح چمکتی

آنکھوں سے اُن کی طرف تکنے لگے، بدلیا جانتی تھی کہ چندی کا یہ تحفہ بے غرض نہیں ہے مگر آموں کو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ پھر بھی چندی کا ڈر غالب تھا۔ اس لیے اُس نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا۔ چندی نے اتنی دیر میں انگوچھے کو نچوڑ کر اس سے بھیگا ہوا جسم پونچھا پھر اسے باندھ کر گیلی دھوتی اُتار کر نچوڑی اور باندھ لی۔

بدلیا کا دھڑکتا ہوا دل ذرا ٹھہرا ہی تھا کہ چندی اس کام سے فراغت کر کے بڑی بے تکلفی سے کھاٹ کے پائینتی بیٹھ گیا۔ بدلیا فوراً کھاٹ سے اُتر کر اس طرف زمین پر بیٹھ گئی، جدھر بیل بندھے تھے، پاس والے بیل نے دو مرتبہ 'فوں، فوں' کر کے اس کی اس حرکت پر اپنا تعجب ظاہر کیا، مگر اس کی مانوس بو سونگھ کر پھر جگالی کرنے لگا۔ چندی بدلیا کے اس پیترے پر ذرا ہنسا۔ بولا۔

''ہم کاٹ نہ لیں گے بھوجی، ہم تو تم سے یہ کہنے آئے ہیں کہ ہماری تمھاری جوڑی اچھی رہے گی۔''

بدلیا کے ہاں گھرے کُہرے کی طرح سکوت چھایا رہا۔ چندی سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''میرا جھونپڑا بن گھر والی کے سونا لگتا ہے، اور تم بن مرد کے دُکھی ہو۔''

مگر گویا بدلیا گونگی تھی، اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چندی نے آدھے دھڑ سے کھاٹ پر لیٹ کے اس کی ٹھوڑی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''بولتی کیوں نہیں بدلی؟''

وہ ہاتھ جھٹک کے آہستہ سے بولی۔ ''ہمیں ایسی باتیں ناپسند ہیں! تم یہاں سے چلے جاؤ!'' چندی پر اس جھڑکی کا اُلٹا اثر ہوا۔ وہ کھاٹ پر گھوم کر اس طرف پاؤں لٹکا کے بیٹھا جدھر بدلیا تھی، وہ سہم کر پیچھے ہٹی۔ چندی پھر ہنسا۔ اس نے اچانک جھک کر بدلیا کی کلائی پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا، بدلیا چیخ پڑی۔ وہ اتنے زور سے چیخی کہ بیٹھے ہوئے بیل پھپکاریاں مارتے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بدلیا کی ساس نندیں جاگ اُٹھیں۔

چندی نے بدلیا کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اور گھبرا کر کہا۔ ''اچھا، اچھا، چیخ مت، لے ہم جاتے ہیں پر دیکھ آم ضرور کھا لینا۔'' یہ کہہ کر وہ جھپٹ کر باہر نکل گیا۔ مگر ویسے ہی بدلیا کی ساس جھونپڑے میں ''ارے کیا ہے ڈائن؟'' کہتی ہوئی داخل ہوئی۔ اسے کسی کے بھاگنے کی آہٹ مل ہی چکی تھی۔ اب جو دیا جلا کر اُس نے دیکھا تو یہ سماں نظر آیا کہ بدلیا کھاٹ سے الگ کھڑی، بڑے بڑے دیدے نکالے، ڈری سہمی اُسے دیکھ رہی ہے۔ اور کھاٹ پر اچھے اچھے آم ڈھیر

ہیں۔ بس برس پڑی۔ ”ڈائن، بیسوا، ہرجائی، میرے کلوا کو کھا کر اب یار بلاتی ہے، رہ تو جا، سویرا ہونے دے، برادری بھر کے سامنے تیری مانگ نہ مونڈ دی تو اپنے باپ کی جنی نہ کہنا۔“

اتنے میں نندیں بھی اپنے اپنے بچے بغلوں میں دبائے آ پہنچیں، وہ بھی ماں کے ساتھ مل کے بھِن بھنانے لگیں۔ پھوس کے چھپروں میں رہنے والی چمر ٹولی یوں ہی مینہ برسنے اور چھپر کے ٹپکنے سے جاگ رہی تھی۔ یہ شور سن کے دوڑ پڑی، پانی تھم گیا تھا، اس ہنگامے کی آواز دُور تک بآسانی پہنچی۔ بارے بڑی دیر جھک جھک بک بک کے بعد طے ہوا کہ صبح پر معاملہ اُٹھا رکھا جائے، اور اس وقت پوری تفتیش کر کے برادری سزا دے۔ اس فیصلہ کے بعد اور سب تو چندی کے لائے ہوئے آموں پر حسرت بھری نگاہ ڈالتے گھر سدھارے، مگر چھوٹی نند نے ٹھٹک کے اس ڈھیر سے چن کے چار آم اُٹھائے، پھر وہ ایک کو دانت سے چھیلتی چل دی۔

بدلیا نے وہی اطمینان محسوس کیا، جو بحری مسافر، طوفان کے بخیر و خوبی ختم ہو جانے پر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اس اطمینان سے اُسے کسی قسم کی خوشی نہیں ہوئی، بلکہ رنج کا احساس اور زیادہ ہوا۔ وہ تھوڑی دیر تو بیٹھی اپنی پھوٹی تقدیر پر روتی رہی۔ پھر وہ اُٹھی اور اُس نے جھپٹ کر ایک ایک کر کے آم اُٹھائے، اور انھیں چھپر کے باہر پھینکنا شروع کیا۔ دو تین پھل غصّے میں پھینکے تھے کہ ایک دسہری ہاتھ میں آ گئی، وہ خوشبو، وہ رائحہ، وہ نرم نرم پھسلتی ہوئی جلد کہ توبہ ہی بھلی! پھینکنے کے لیے اُٹھا ہوا ہاتھ رُک گیا۔ اُس نے بیساختہ اُسے ناک کے قریب لے جا کر سونگھا۔ معلوم ہوا جیسے بپھری ہوئی ناگن کو جڑی سونگھا دی گئی ہو جھومنے لگی۔ اُس نے دو ایک بار زبان کا سرا ہونٹوں پر پھرایا۔ پھر 'اُنھ' کر کے زمین پر اکڑوں بیٹھ کے اُسے دانت سے چھیل کر کھانے لگی۔ چھپر میں بڑی دیر تک بیلوں کی جگالی اور بدلیا کے چٹخاروں کی آواز میں مقابلہ ہوتا رہا۔ البتہ یہ چٹخارے درمیان میں صرف اتنی دیر تک رُکتے تھے جتنی دیر کو اپنے پھینکے ہوئے آموں کو پھر سے چن کر لانے میں لگتی تھی... پھر تو بیلوں کو مینڈکوں کی غرغراہٹ ہی نہ سننا پڑی بلکہ بدلیا کے خرّاٹے بھی! اور انھوں نے جگالی کر کے یہ سب انگیز کیا۔

دوسرے دن صبح سویرے 'جنگل' سے پلٹتے ہی ساس نندوں نے مرے ہوئے بیٹے بھائی کا نام لے لے کر وہ کوا گہار' مچائی کہ برادری کی چمارنیں اکٹھا ہو گئیں۔ بدلیا خمار آلود آنکھیں لیے، ان کے بیچ میں چپ بیٹھی رہی۔ بار بار پوچھنے پر اُس نے گنّو کی سوگند کھائی کہ اس کا کوئی

یار نہیں ہے، اور نہ اُس نے کسی سے کہہ کے آم منگائے تھے۔" "تو یہ کیوں نہیں بتاتی کہ کون لایا تھا۔" ساس نے چمک کر کہا۔

بدلیا نے آہستہ سے کہا۔ "چندی آم لائے اور ہم پر ہاتھ ڈالا ہم چیخے، وہ بھاگ گئے ساس آگئیں۔"

چھوٹی نند جس سے چندی سے ایک زمانے میں دوستی رہ چکی تھی، کولھے پر ہاتھ رکھ کے بولی۔ "پرائے گھر میں جب تک کوئی بلایا نہ جائے، آئے گا کاہے کو۔"

ایک چمارن بولی۔ "ارے نہیں وہ بڑا پاجی ہے۔"

دوسرے نے کہا: "پر یہ بھی سچ ہے، کہ اس میں کلوا بہو کا بھی دوش ہے۔"

ساس چیخی۔ "دوش سا دوش ہے، ارے لوگو! اس ڈائن نے میرے کلوا کو کھالیا! اب یہ یار ڈھونڈھتی ہے۔ چوری کا مال اُڑاتی ہے، ارے یہ ہم لوگوں کی ناک ہی نہ کٹوائے گی یہ ہم لوگوں کو جیل بھجوائے گی جیل!"

بڑی نند نے بدلیا کی طرف جھپٹتے ہوئے کہا۔ "تو مار کے نکال دو اس پاجن کو، اور یہ کہتے کہتے اس نے بدلیا کو ایک طمانچہ رسید ہی تو کر دیا۔ بدلیا بوکھلا گئی۔ مگر قبل اس کے کہ اپنے کو بچانے کی کوئی تدبیر کر سکے، چھوٹی نے بڑھ کر ایک دھول رسید کر دی، اب تو ساری چمر ٹولی پل پڑی۔ کوئی چمارن کو کوس رہی ہے، کوئی بال نوچ رہی ہے، بدلیا نے جب جان بچتی نہ دیکھی، تو اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور موقع پاتے ہی مجمع سے نکل کر دیوانہ وار بھاگی، اس کا سانولا چہرہ پختہ اینٹ کی طرح سُرخ تھا، اُس کے بال کی لٹیں سوار کی طرح اُلجھی ہوئی۔ بے قرینہ، منہ اور کندھوں پر پڑی ہوئی تھیں۔ اور اس کا جسم رہ رہ کر اس طرح کانپ اٹھتا تھا جس طرح زلزلہ کے ہر جھٹکے میں مکان اور درخت ہل جاتے ہیں۔ اُس کے نتھنوں سے گرم گرم سانس نکل رہی تھی، اس کا حلق بالکل خشک تھا۔ اور اس کی آنکھیں سامنے کے راستہ کو نہ دیکھتی تھیں، بلکہ بہت دُور کسی منزل کی جستجو میں تھیں، وہ اسی طرح بدحواس پکّو کے درخت تک پہنچی، جو چمر ٹولی کے قریب ہی تھا۔ اس نے اس کی اُبھری ہوئی جڑ سے ٹھوکر کھائی، اور منہ کے بل زمین پر گر پڑی۔

اس اچانک گرنے نے دل میں بھری ہوئی ساری تکلیفوں کو ایک لڑی میں گوندھ دیا، اور وہ زمین پر منہ رکھے سسک سسک کر رونے لگی۔ گویا زمین نہ تھی۔ بلکہ ماں کا سینہ تھا، جس سے سر لگا کر رو لینے میں آرام ملتا ہے۔ وہ یوں ہی پڑی سسک رہی تھی کہ پتوں میں کھڑکھڑاہٹ

ہوئی اور چندی پکڑ کی موٹی موٹی شاخوں سے اترتا ہوا زمین پر مع اپنی لاٹھی کے دھم سے کودا۔ بدلیا اس دھماکے پر ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اُٹھ بیٹھی، ایک نامعلوم خطرے کے خیال نے اس کے دل میں حد درجہ ڈر پیدا کر دیا، اس کے دماغ نے چندی کو ایک نئے حملہ آور کی شکل میں پیش کیا، وہ جلد سے اُٹھ کر پھر بے تحاشا بھاگی اس کی قطع اس پانی سے بھری صراحی کی تھی، جو کسی ڈھالواں مقام پر لڑھکا دی جائے۔ صراحی کی طرح اُس کے منہ سے کف جاری تھا۔ اُس کے حلق سے آواز نکلتی جاتی تھی اور اس کی چال کا واک اور ٹیڑھی تھی۔

چندی چند سکنڈ بدلیا کے اچانک بھاگنے پر اُسے منہ کھولے دیکھا کیا۔ پھر وہ اس کے پیچھے اس طرح دوڑا جس طرح شکاری کسی چڑیا کو زخمی کر کے پکڑنے دوڑتا ہے، بدلیا لڑکھڑاتی، بلکتی، سسکتی، پاس والے تخمی آموں کے باغ تک دوڑی، پھر اُسے چکّر سا آنے لگا اور باغ لٹو کی طرح گھومنے لگا۔ وہ لپک کر سب سے پہلے درخت کے تنے سے اس طرح جا کر چمٹ گئی جس طرح بچے کسی اجنبی سے ڈر کر باپ کی ٹانگوں سے لپٹ جاتے ہیں۔

چندی قریب پہنچ کر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دلاسا دینے والے انداز میں کہا۔

''ارے کہاں جاتی ہے بدلی؟ کیا میکے میں ساس نندیں تجھ کو رہنے دیں گی، انہوں نے تجھ کو اپنے گھر سے نکال دیا، وہ تجھ کو وہاں سے بھی بدنام کر کے نکلوا دیں گی، ارے پگلی کہنا مان، دوسرا گھر بنا!''

بدلیا بھد سے زمین پر بیٹھ گئی، اور بڑی بے بسی سے رونے لگی، چندی اُسے سمجھاتا رہا۔ مگر ہمدردی کی آواز تازیانہ کا کام دیتی رہی۔ گویا چندی کے الفاظ نہ تھے بلکہ ڈاکٹر کا نشتر تھا، جو جگر کے ناسور کو پھیلا اور بڑھا کر مواد کے نکلنے میں مدد دے رہا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ بے کسی و ناکسی کا طوفانی احساس کم ہونا شروع ہوا۔ مد کی جگہ جزر نے لے لی۔

چندی نے قریب کھسک کر کہا۔ ''ارے بدلی اس رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تو ہمارے ساتھ چل کے رہ، پھر کسی کی اتنی ہمت نہ پڑے گی کہ تجھے کوئی آدمی بات بھی کہہ سکے۔''

بدلیا نے ایک دُزدیدہ نگاہ چندی پر ڈالی۔ اچھا خاصا جوان تھا۔ عام چماروں کی طرح سوکھا، لاغر، بھوکا نہیں معلوم ہوتا تھا، صورت شکل بھی بُری نہ تھی، چہرے سے جرأت اور نڈرتا کے آثار نمایاں تھے، آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک پیدا ہوئی اُس نے جلدی سے

سر جھکالیا، چندی مسکرایا۔

''ارے پگلی، جب سب تجھ کو دوش ہی لگاتے ہیں۔ تو پھر کر کے کیوں نہ دکھادے؟ کسی کا دیا کھاتے ہیں کہ ڈر ہے؟''

بدلیا نے اور گردن جھکالی۔ چندی نے آگے بڑھ کر ٹھوڑی میں ہاتھ دے کے جھکے سر کو اُٹھالیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورا، اُس نظر میں خوشامد بھی تھی، ہمدردی بھی تھی۔ اور دنیا بھر سے بدلیا کے لیے لڑ جانے والا ارادہ بھی تھا۔ پھر بدلیا کی بھیگی ہوئی پلکیں اس کے آنچل سے پونچھ کر بولا۔ ''لے اب اُٹھ گھر چل۔''

وہ کاندھے پر لاٹھی رکھے آگے آگے چلا، بدلیا گھونگھٹ نکالے اس کے پیچھے پیچھے ہولی، جب دونوں چمرٹولی سے ہو کر گزرے، تو بدلیا کی ساس اور بڑی نند نے راستہ روکا۔ وہ جھڑک کر بولا۔

''ہٹ جاؤ راستہ سے نہیں تو سر پھوڑ دیں گے؟''

وہ ڈر کے پیچھے ہٹیں، تو چھوٹی ہاتھ چمکا کر بولی۔ ''ارے یہی رات کو آم لایا تھا۔''

چندی پلٹ پڑا، اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ ''ہاں! ہاں! ہمیں لائے تھے۔ وہ رات کی چوری تھی ٹھاکر کے باغ کی! یہ دن کا ڈاکہ ہے۔ تمھارے گھر کا!''

بڑی نند نے کہا۔ ''وہ ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ یہ ڈائن ناک کٹوا کے چھوڑے گی۔''

چندی نے کندھے پر رکھی ہوئی لاٹھی زمین پر زور سے کھینچ ماری، تینوں عورتیں جلدی سے چھپر میں گھس کر دروازے سے جھانکنے لگیں، چندی نے ڈانٹ کر کہا۔

''خبردار جو کبھی ڈائن کہا، یہ اب ہماری مہریا ہے۔''

پھر ایک بار لاٹھی گھمادی۔ تینوں نے جلدی سے اپنے سر اندر کر لیے... اور یہ سپیرا مع اپنی نئی ناگن کے مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

(باسی پھول)

✡✡

اچھوت برہمن

آگرہ کا اسٹیشن، گرمیوں کا زمانہ، مسافروں کا ہجوم، اس پر انٹر درجے کا ٹکٹ۔ اگر مَیں گھبرایا ہوا تھا تو کوئی جائے تعجب نہیں۔ ڈر تھا کہ گاڑی بھری ہوئی آئے گی۔ اطمینان سے لیٹنے بیٹھنے کی جگہ نہ ملے گی۔ راستے بھر ہنگامہ، شور وشغب رہے گا۔ اور نہ معلوم کتنی قسم کی نئی بیڑیوں کے متعفن دھوئیں کو انگیز کرنا پڑے گا۔ مَیں نے اسی لیے اُس دن کا لیڈر، پوائنیر، اسٹیٹس مین اور ہندوستان ٹائمز خرید لیا۔ پھر وہیلر کے کتاب گھر سے 'اوپنہم' کا ایک تازہ ترین ناول خریدا۔ میری رائے میں انگریزی مصنفین میں 'ویلس' اور 'وڈہاؤس' کی طرح 'اوپنہم' کی کتابیں بھی ریل کا سفر کاٹنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اس مصنف میں 'شرلاک ہومس' کے مصنف کی طرح قوتِ استقراء تو نہیں ہے، لیکن وہ 'نیلی چھتری' کے مترجم سے کہیں زیادہ قرین عقل پیچیدگیاں، اُلجھاوے اور اسرار اپنے پلاٹ میں سمو دیتا ہے۔ پھر اس میں جو ایک نہفتہ ظرافت ہوتی ہے وہ بجائے خود ایک ایسی چیز ہے جو مہذب و متین طبائع کو مرغوب ہے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ مَیں نے جیسا عرض کیا۔ اخباروں کے ساتھ ساتھ میں نے 'اوپنہم' کا ایک پھڑکتا ہوا ناول بھی خریدا۔ اور اب گویا پوری طرح مسلح ہو کر اپنے آرام واطمینان سے دُشمن بی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔

بارے بی صاحبہ آئیں، خراماں خراماں، بل کھاتی، انگڑائیاں لیتی آئیں اور مسافروں کا ٹڈی دَل اُن پر ٹوٹا۔ اُترنے والے مسافر ڈبوں میں کھڑے ہیں۔ قلی اُن کے سامان اُتارنے کی فکر میں منہمک ہیں۔ مگر جانے والے مسافروں کے قلی اُن پر اس طرح غرّا رہے ہیں جس طرح کوئی کتا اپنے گھر میں اپنے کسی اجنبی ہم جنس کو دیکھ کر غرّاتا ہے۔ اس عجلت اور جھلاہٹ

کے دو سبب ہیں۔ ایک تو اپنے مسافر کے ساتھ ہمدردی جتا کر اُس سے مقررہ وموعودہ مزدوری کے علاوہ انعام لینے کا بہانہ۔ دوسرے اپنے بابوجی کو ٹھکانے لگانے کے بعد اُترنے والے مسافروں میں سے کسی کا اسباب اُٹھائے جانے کی اُمید۔ چنانچہ میرا قلی بھی نہ معلوم کتنے قلیوں کو جھڑ کتا، اور بیسیوں مسافروں کو دھکیلتا میرے اسباب لیے ایک ڈبے میں گھس ہی گیا، اور میرا بکس اور بستر ایک برتھ پر رکھ کر ایک اُترنے والے مسافر سے اپنے لیے مزدوری چکانے لگا۔ مجھے بھی اپنے اسباب کی خاطر مع اخباروں اور ناول کے بنڈل کے اسی کشمکش سے گزر کر ڈبے میں داخل ہونا ہی پڑا۔ اور مَیں نے جھٹ پٹ اپنا بستر اکھول کر پورے برتھ پر قبضہ کر لیا۔

یہ سارا ہنگامہ چند ہی منٹ کا تھا۔ اس لیے کہ پورا ڈبّہ اس اسٹیشن پر خالی ہو گیا اور اب مَیں ’سکندر سالکرک‘ کی طرح جو کچھ نظر آتا تھا سب کا مالک ومختار تھا۔ چنانچہ مَیں نے جلدی سے شیروانی اُتار کر اپنی بنچ سے قریب والی کھونٹی پر لٹکائی۔ پان اور سگریٹ کی ڈبیاں سرہانے تکیے کے نیچے رکھیں، پرس کُرتے کی جیب میں ڈال لی اور سارے اخبار ورسائل پہلو میں رکھ کر بنچ پر دراز ہو گیا۔

مگر گرمی تھی کہ الاماں والحفیظ۔ نہ معلوم آگرے کی سرزمین میں اس بلا کی حدت کہاں سے آگئی ہے۔ شاید یہ ہزار ہا کشتگانِ ناحق کے خون کی حرارت ہے، جس سے آگرہ کی مٹی کا خمیر بنا ہے، یا اُس سوزشِ قلب کا نتیجہ ہے جس نے شاہجہاں کو تاج محل سا مقبرہ بنوانے پر بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ بہر نوع وجوہ خواہ جذباتی ہوں یا کیمیائی، جغرافیائی ہوں یا شاعرانہ، ہے یہی کہ آگرے سا جلتا بھنتا شہر ہندوستان میں کم ہی نکلے گا۔ مَیں نے اس لیے ’پوائنیر‘ سے وہی کام لینا شروع کیا جو آپ کو اس اخبار کے اشتہار کے سلسلے میں چند وچوکیدار لیتا دکھائی دے گا۔ یعنی اسے بجائے پڑھنے کے اس سے پنکھا جھلنا شروع کیا۔

ابھی پسینہ خشک بھی نہ ہونے پایا تھا اور میں اشتہار کے اُس ٹکڑے پر کہ ”تم اسے پڑھ بھی سکتے ہو“ عمل پیرا نہ ہو سکا تھا کہ دفعتاً گاڑی کا بند دروازہ کھلا اور ایک بابوجی داخل ہوئے۔ یہی کوئی پچیس تیس برس کے رہے ہوں گے۔ ننگے سر، بال چھوٹے چھوٹے، مشین سے کٹے ہوئے، چٹیا ذرا نمایاں، پیشانی پر قشقہ، قمیض دھوتی اور چپل پہنے، ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اٹیچی، ایک میں ایک کمبل میں تکیہ لپٹا ہوا، آئے اور برابر والے برتھ پر کمبل بچھا اور تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ اٹیچی اُنہوں نے سامنے اس طرح رکھ لی جس طرح پان بنانے والیاں پاندان سامنے رکھتی ہیں۔

مَیں نے اُن کی صورت شکل کا اخبار کے پیچھے سے جائزہ لیا، تو چہرے مہرے سے خاصے تیز اور پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ پیشانی بڑی اور چمکتی ہوئی، آنکھیں اوسط درجے کی مگر بھوری، کلّا چوڑا، دانت سپید چمکتے ہوئے۔ داڑھی مونچھ دونوں صاف، ٹھوڑی بڑی تھی اور بیچ میں ذرا دَبی ہوئی۔ قد و قامت اوسط درجے کا تھا اور جسم خاصا سڈول تھا۔

بابو جی نے اپنی اٹیچی کھولی اور اس میں سے اُوپر ہی رکھا ہوا تولیہ نکالا اپنے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھا۔ پھر میری طرف مڑ پڑے۔

انہوں نے پوچھا: ''آپ کہاں تشریف لے جائیں گے؟''

مَیں نے کہا: ''لکھنؤ!''

''کیا وہیں دولت خانہ ہے؟''

مَیں نے کہا: ''جی نہیں۔ دو ایک دن کے لیے وہاں قیام کر کے دوستوں سے ملنا ہے۔''

بولے: ''اچھا!''

مَیں نے سوچا کون زیادہ وقت ضائع کرے اخبار اور ناول پڑھنا ہے۔ جلدی سے اُن کی طرف لیڈر بڑھا کر کہا: ''لیجیے آج کا اخبار دیکھیے گا؟

اُنھوں نے: 'شکریہ' کہا اور لیڈر میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اتنے میں انجن نے سیٹی دی اور گاڑی رینگ چلی۔ مَیں اخبار دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ مگر مَیں نے یہ محسوس کیا کہ جس جس طرح ریل پٹریاں بدل رہی تھی، اُسی طرح میرے ساتھی بھی پہلو بدل رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی اخبار کے سارے ورق اُلٹ گئے۔ پھر انہوں نے کھڑکیوں سے جھانکنا شروع کیا، پھر سیٹی بجانے لگے۔ پھر اٹیچی کھولی، اُس سے کچھ کاغدات نکالے، اُن کو اُلٹے پلٹتے رہے۔ مَیں نے اُن کی بے چینی سے متاثر ہو کر بالآخر اخبار رکھ دیا، اور اُن سے کہا:

''کیوں کیا کوئی دوسرا اخبار دوں؟''

وہ عجیب طرح مسکرا کر بولے: ''جی نہیں، مَیں نے ابھی یہی نہیں پڑھا۔''

مَیں نے پھر اپنا اخبار اُٹھایا، وہ فریادیوں کی طرح ہاتھ پھیلا کے بولے۔ ''اگر آپ بُرا نہ مانیں تو مَیں عرض کروں گا کہ آپ بھی اخبار نہ پڑھیں۔ مَیں نے انھیں ذرا چیں بجبیں ہو کر دیکھا، وہ جلدی سے بولے ''میرا یہ مطلب ہے کہ بجائے اس کے ہم کچھ باتیں کریں۔''

مَیں اِس عجیب وغریب فرمائش پر یقیناً کوئی سخت جواب دیتا، مگر مَیں اُن کی ملتجی صورت اور اُن کے حسرت بھرے لہجے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ شخص انسانی ہمدردی کا بھوکا ہے۔ اس کے دل پر کسی اہم راز کا بوجھ ہے جسے وہ کسی اجنبی سے کہہ کر ہلکا کرنا چاہتا ہے۔

مَیں نے اخبار رکھ دیا، اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُن کی طرف سگریٹ کی ڈبیا بڑھا کر کہا: ''بسم اللہ شوق کیجیے۔'' انھوں نے تسلیم کر کے اس مَیں سے ایک سگریٹ نکال لی۔ پھر میری طرف اُسی کو بڑھا کر کہا: ''اب آپ میری جانب سے اسی سگریٹ کو پیجیے۔'' مَیں نے انھیں پھر حیرت سے دیکھا۔ وہ بولے: ''جی میں اس نعمت سے محروم ہوں۔''

مَیں نے گھبرا کر اُن سے پوچھا ''کیا دولت خانہ لکھنؤ ہے؟''

انھوں نے مجھے استعجاب سے دیکھ کر پوچھا ''جی، آپ نے یہ کیونکر جانا؟''

مَیں نے کہا: ''آپ کی گفتگو اور تہذیب سے۔''

وہ بولے: ''جی ہاں، غریب خانہ وہیں ہے۔ مَیں پنڈتوں اور بڑے کٹر طرح کے برہمنوں کے خاندان سے ہوں، اس لیے اس طرح کی کوئی چیز کبھی استعمال نہیں کر سکا۔''

مَیں نے کہا: ''تو آپ بڑے خوش قسمتوں میں سے ہیں۔ ہم لوگ خواہ مخواہ پیسے بھی ضائع کرتے ہیں اور صحت بھی برباد کرتے ہیں۔''

کہنے لگے۔ ''جی، آپ کا ارشاد بجا اور درست ہے، مگر یہ بھی ضرور ہے کہ لطفِ صحبت بغیر ان چیزوں کے حاصل نہیں ہوتا۔''

مَیں نے کہا: ''خیر یہ تو آپ میرے خیال اور میری خاطر سے کہہ رہے ہیں، لیکن اتنا ضرور سچ ہے کہ بعض وقت اس سگریٹ سے غم غلط کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

میری زبان سے 'غم غلط' کا لفظ نکلتے ہی اُن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُنھوں نے جلدی سے میرے ہاتھ سے سگریٹ لے کر منہ میں لگالی، مَیں نے دیکھا اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مَیں نے اُن کی طرف دیا سلائی بڑھا دی۔ اُنھوں نے بالکل ایک نئے سگریٹ پینے والے کی طرح سگریٹ جلائی۔ جلدی جلدی اُس کے دو تین کش کھینچے اور کھانسنے لگے۔ اُن کے آنسو آنکھوں سے بہہ کر گالوں پر آ گئے۔ مَیں نے گھبرا کر کہا:

''اجی اسے پھینک بھی دیجیے۔ آپ عادی نہیں، چکّر آجائے گا۔''

اُنھوں نے سگریٹ پھینک دی، پھر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر سسک سسک کر رونے لگے۔ مَیں گھبرا کر اپنی سیٹ سے اُٹھا اور اُن کی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ میری قربت محسوس کر کے اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

اب ذرا آپ میری بے بسی کو محسوس کیجیے۔ ایکسپریس پوری رفتار سے چلی جا رہی ہے، پورے ڈبّے میں ہم دو آدمی ہیں۔ دونوں اجنبی ضرور ہیں، مگر دونوں پڑھے لکھے بھلے مانس ہیں، آپس میں اب تک جتنی باتیں ہوئیں وہ بھی خلوص و ہمدردی، تہذیب و شائستگی کی۔ ان میں سے ایک اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے، دفعتاً پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔ دوسرا سوائے اس کے اور کیا کر سکتا ہے کہ وہ اخباروں اور ناولوں کو چھوڑ کر اپنے ہمراہی کی دل دہی کرے اور اس کے غم و رنج کا سبب دریافت کر کے اس سے ہمدردی کرے؟ یہی انسانیت کا تقاضا ہے اور یہی فطرت و بشریت کا اقتضا۔ مَیں نے اُن کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''پنڈت جی، یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ اس طرح کا رونا تو مردوں کو زیب نہیں دیتا۔''

وہ سسکتے ہوئے بولے: ''مگر جس طرح کا غم مجھ پر پڑا ہے، اگر پہاڑ پر بھی پڑتا تو وہ بھی پانی ہو کر بہہ جاتا۔ مَیں تو پھر انسان ہی ہوں۔''

مَیں نے کہا: ''تو آپ مجھ سے بیان کر ڈالیے۔ اس سے دل کی بھڑاس نکل جائے گی اور طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔''

اُنھوں نے اپنے تولیے سے آنسو پوچھ ڈالے۔ مَیں نے اپنی جیب سے نکال کر اُنھیں چند اِلائچیاں دیں۔ وہ اُنھوں نے چبائیں، پھر بولے۔ ''آپ نے سچ کہا، مجھے زیادہ تکلیف شاید اسی لیے ہے کہ میں نے آج تک کسی سے اس قصّے کو بیان نہیں کیا۔ مجھے خاندان کے نام کی بڑی لاج تھی۔ آپ اجنبی ہیں، ریل کا ساتھ ہے۔ خدا جانے آپ سے پھر کبھی اس جنم میں ملاقات ہو یا نہ ہو، مَیں سمجھتا ہوں آپ سے کہہ ڈالنے میں کوئی ہرج نہیں۔''

مَیں نے کہا: ''آپ اطمینان رکھیں، مَیں بھی اسے کبھی زبان پر نہ لاؤں گا۔''

وہ میری طرف مُڑ کر بولے: ''اچھا تو سنیے۔ مَیں نے جیسا آپ سے عرض کیا۔ میں برہمن ہوں اور میرا خاندان بڑا کٹّر ہے۔ بس اسی سے سمجھ لیجیے کہ میں اپنے گھر میں پہلا آدمی

ہوں جس نے انگریزی پڑھی، ورنہ کسی نے سوائے سنسکرت کے کوئی دوسری زبان پڑھی ہی نہیں۔ سب ہمیشہ ہندو تعلق داروں کے خاندانی پروہت رہے۔ میرے متعلق بھی یہی خیال تھا کہ میں بھی خالی سنسکرت پڑھایا جاؤں۔ مگر میرے والد نے مجھے غیر معمولی طور پر تیز دیکھ کر، دوستوں اور ملنے والوں کے کہنے پر انگریزی اسکول میں داخل کرایا۔ سارا خاندان اسی پر اُن سے خفا ہو گیا۔ دو چار نے تو کھانا پینا، آنا جانا بند کر دیا۔ مگر وہ بھی اپنی ضد پر قائم رہے اور میں انگریزی پڑھتا ہی رہا۔ بس اُنھوں نے اتنا ضرور کیا کہ مجھے انگریزی کے ساتھ ساتھ اپنی آبائی زبان سنسکرت بھی پڑھاتے رہے۔ مَیں تمام امتحانات میں ہمیشہ اوّل آتا رہا۔ بلکہ دو چار درجوں میں مَیں نے انعامات بھی حاصل کیے۔ یہ دیکھ کر اُن کے حوصلے اور بھی بڑھے اور اُنھوں نے طے کر لیا کہ وہ مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائیں گے۔ جس سال مَیں نے انٹرنس کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا، اُن کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اُنھوں نے مجھے خبر بھی نہ دی اور اپنے امیر عزیزوں سے قرض لے کر ایک بہت بڑا ہوَن کیا اور برادری بھر میں مٹھائیاں تقسیم کیں۔ ایف۔اے۔ کی تعلیم کا اُنھوں نے کیونکر انتظام کیا، اسے بھگوان جانے۔ مگر کتابوں کے دام دیتے وقت ماتا جی نے صرف اتنا کہا کہ ''بیٹا، خوب جی لگا کر پڑھنا اور ایسا کرنا کہ برادری بھر میں ہماری ناک اُونچی رہے۔'' مَیں نے اُن سے وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ مَیں نے کیننگ کالج میں نام لکھوایا اور پڑھنے لگا۔ وہاں تعلقہ داروں کے لڑکوں کا ساتھ، پڑھنا اور اُن سے ملنا جلنا، خواہ مخواہ ٹھاٹ باٹ پر مجبور کرتا تھا۔ ماں باپ کا یہ حال کہ میں جو کچھ کہتا وہ پورا کرتے۔ سائیکل لے دی، سوٹ بنوا دیے، فاؤنٹین پن خرید دیے، اور ان تمام خرچوں کے علاوہ دس روپیہ ماہوار مجھے جیب خرچ کے طور پر دیتے تھے۔ یہاں یہ حالت کہ یہ تو روزانہ کی چاٹ کے لیے کافی نہ ہوتا تھا۔ پھر سینما کا بھی شوق ہو گیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ گھر کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی، اور میرا فیشن بڑھتا ہی گیا۔ لیکن مَیں بابو جی اور ماتا جی کے دل کی کہتا ہوں کہ اُن کے چہرے پر مَیل نہیں آیا۔ لوگ ان سے میری شکایت کرتے، میری فیشن پرستی اور فضول خرچیوں کی کتھا بیان کرتے، مگر وہ نہ مجھے ڈانٹتے، نہ روکتے۔ اُن کو مجھ پر پورا بھروسا تھا... بہرحال ایف۔اے کا امتحان آیا اور اس میں مَیں بیٹھا۔ مَیں نے اس کے لیے محنت تو بہت کی تھی، مگر وہی آخری وقت، جب نتیجہ نکلا تو میں پاس ہوا مگر تیسرے درجے میں۔ بابو جی کو اتنا رنج ہوا کہ وہ

بیمار ہو گئے۔ اُنھیں دل کی بیماری پہلے ہی سے تھی۔ میرے تیسرے درجے میں پاس ہونے سے زیادہ ہم چشموں کے طعنے اور برادری والوں کے ہنسنے نے اُن کے ساتھ وہی کیا جو ٹمٹماتے ہوئے دِیا کے ساتھ ہَوا کا تیز جھونکا کرتا ہے۔ اُن کی آتما تو دوسرے جنم کی تیاریوں میں مشغول ہو گئی اور میرے لیے ساری دنیا اندھیری رات بن گئی۔

پتا جی کی موت اور اُس کی رسمیں جیسے بنیں، کی گئیں۔ اس میں ماتا جی کی سونے کی ہنسلی، ہاتھوں کے کڑے اور کچھ چھوٹے زیور بیچ ڈالنے پڑے۔ اب آپ ہی سمجھئے، مَیں اچھا خاصا ہٹا کٹا جوان، ایف۔ اے پاس، مگر بجائے اس کے کہ ماں کو کما کر کھلاتا، اُن کو ڈھارس دیتا، بیکاروں کی فہرست میں نام لکھوائے بیٹھا تھا اور ماں کے کریا کرم کے لیے ماں کے زیور سناروں کے ہاتھ بیچ رہا تھا۔ میرے دل پر جو کچھ گزرتی تھی وہ آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مگر اس طرح کی زندگی کتنے دِنوں بسر ہو سکتی تھی؟ مَیں نے اب نوکری ڈھونڈھنا شروع کی۔ مگر نوکری تلاش کر لینا آج کل اتنا ہی آسان کام ہے جتنا کہ پیال سے بھری ہوئی بیل گاڑی میں زعفران کے بیج تلاش کر لینے کا۔ ایک دفتر سے دوسرے دفتر، ایک دُکان سے دوسری دُکان کا پھیرا کرتے کرتے پاؤں دُکھنے لگتے، جوتے کا تلا گھس جاتا، مگر نوکری کی صورت خواب میں بھی دِکھائی نہ دیتی تھی۔ یہ مصیبت تو خیر ہر نوجوان کو جھیلنا پڑتی ہے۔ میرے معاملے میں جو بُری بات ہوئی وہ یہ تھی کہ جس جس طرح میں ناکامیاب ہوتا جاتا تھا ویسے ہی ویسے مجھ میں جھلاّہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ نہ کوئی بہن تھی نہ بھائی تھا اور نہ اب کوئی نوکر چاکر کہ اس پر یہ غصّہ نکلتا، بس ماتا جی تھیں اور مَیں تھا، اور ساری جھلاہٹ اُنہیں کے بوڑھے چونٹوں کے سر جاتی۔ وہ سیدھی بات بھی کہیں، تو میرے مرچیں سی لگ جاتیں، اُن کی ہمدردی دُشمنی معلوم ہوتی اور اُن کی ممتا بالکل مکّاری اور خود غرضی!“

مَیں سگریٹ جلانے لگا تو اُنھوں نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا۔ مَیں نے پھر ایک سگریٹ کا خون کیا، اُنھوں نے اُسے ’کانا‘ جلایا۔ جلدی جلدی دو تین کش اس طرح کھینچے کہ کھانسنے لگے۔ اور غصّہ میں اسے چٹکیوں میں مسل کر پھینک دیا۔ پھر وہ بولے۔ ”بھگوان ہی جانے کہ اگر بابو بچھی پرشاد نہ آ گئے ہوتے تو میری کیا دَشا ہوتی۔ میں کسی دن ماتا جی اور اپنے کو جان سے مار کر اس جھگڑے ہی کو چکا دیتا، یا پھر پاگلوں کی طرح کہیں گلیوں میں تنکے چنتا ہوتا۔ بابو بچھی

پرشادجی گرمی تھے، آریہ تھے، پتاجی کے بڑے ماننے والوں میں تھے اور متھرا سے ایک ہندی اخبار نکالتے تھے۔ لکھنؤ کسی ضرورت سے آئے تو بابوجی کے مرنے کی خبر معلوم کرتے ہی ہمارے یہاں پہنچے۔ ماتاجی اُن کو آوازسناتی تھیں، اُنہوں نے رورو کر اُن سے اپنا سارا دُکھ درد کہہ ڈالا۔ پچھمی پرشادجی پر بڑا اثر ہوا اور اُنہوں نے مجھ سے اپنے ساتھ متھرا چلنے کو کہا۔ ماتاجی بھی راضی ہوگئیں اور مَیں بھی اُن کی انسانیت اور اُن کی ہمدردی سے مجبور ہو کر اُن کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگیا۔''

وہ تھوڑی دیر چپ رہے، پھر بولے: ''متھرا پہنچتے ہی میری زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب ہوگیا۔ پچھمی پرشادجی کی بڑی کوٹھی میں قیام، اچھے سے اچھا کھانے کے لیے، ایک علیحدہ ؔباورچی خانہ اور کہار، اور اُنہیں کے دفتر میں ملازمت۔ مگر ان سب سے زیادہ جس چیز کا سب سے گہرا اثر مجھ پر ہوا وہ ان کی تیرہ چودہ سال کی لڑکی رمّو تھی۔ مَیں اُس کی صورت شکل آپ سے کیا بیان کروں۔ ایک ٹھنگنے قد کی دُبلی پتلی لڑکی، گندمی رنگ، ہنس مکھ چہرہ، آنکھیں بڑی، شرارت سے بھری ہوئی۔ ہروقت ہنستی اور چھیڑ چھیڑ کر ہنساتی تھی۔ ایک سیکنڈ اس سے نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا۔ کبھی گارہی ہے، کبھی نوکروں کو بنارہی ہے، کبھی بابوجی کی کتابیں اُلٹ پلٹ رہی ہے، اور کبھی میرا منہ چڑارہی ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ آپ اُس کے پاس بیٹھے ہوں اور پھر آپ کے چہرے پرشکن دکھائی دے۔ آپ کو کسی اَمر کا غم بھی ہو، یا آپ کسی بات کی فکر بھی کرسکیں۔ اگر آپ بابوجی کے سنوں کے ہوں گے تو آپ علیحدہ بیٹھے ہنستے ہوں گے، لیکن اگر کہیں آپ نوجوان ہیں، بیس کے اندر ہی عمر والوں میں ہیں تو پھر آپ بھی تھوڑی دیر کے لیے رمّو کی شرارتوں میں شریک ہوں گے اور عجب نہیں کہ اس کے ساتھ فرش پر قلابازیاں کھاتے ہوں گے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ رمّو کوئی بے وقوف مسخری لڑکی تھی۔ جی نہیں، وہ بلا کی ذہین بھی تھی اور اس کا جیسا حافظہ تو شاید ہی کسی کو ملا ہوگا۔ وہ جس کتاب کو ایک بار پڑھ لیتی وہ اسے حرف بحرف یاد ہو جاتی۔ بس اسی سے سمجھئے کہ بابوجی کا پورا پورا ایڈیٹوریل وہ ہرروز اخبار دیکھتے ہی اُن کے سامنے دُہرادیتی، اور پھر باپ کے سامنے ہی انھیں کے کسی لفظ یا کسی فقرے کو لے کر ایسے ایسے جملے تراشتی، ایسی ایسی پھبتیاں کستی، کہ وہ بھی ہنسی سے بیتاب ہو جاتے۔ اس ذہانت اور اس حافظے کے بعد یہ کہنا کہ وہ اپنے درجے میں برابر اوّل آتی تھی اور اپنی پرنسپل اور

اُستانیوں کی لاڈلی تھی، ایک بیکار ہی سی بات ہو گی۔

مَیں جب متھرا پہنچا ہوں تو وہ نویں درجے میں تھی اور گھر پر گانا اور ناچنا سکھائی جا رہی تھی۔ چونکہ مَیں نے ایف.اے ریاضی میں پاس کیا تھا۔ اس لیے بابو جی نے مجھ سے کہا کہ رمّو کی ریاضی کی طرف ذرا خاص خیال رکھنا۔ رمّو اس مضمون میں دوسرے مضامین سے نسبتاً کمزور تھی۔ اس کی وجہ بھی ظاہر تھی۔ وہ کسی مضمون پر جم کر کئی گھنٹے محنت نہیں کر سکتی تھی اور ریاضی بغیر اس کے آتی ہی نہیں۔ بہر حال مجھے رمّو کی ریاضی کی ماسٹری بھی سپرد ہوئی۔

مگر پہلے ہی دن سے رمّو نے بجائے ایک اُستاد کی طرح عزّت کرنے کے مجھ سے ایک کھلونے کی طرح کھیلنا شروع کر دیا۔ بہت دنوں کے بعد اسے ایک ایسا ساتھی ملا تھا، جو ایک حد تک اس کا ہم عمر بھی تھا، اور اسی کے گھر میں رہتا بھی تھا۔"

ہم عمری کا لفظ مجھے کچھ دل میں کھٹکا سا تھا۔ اِس لیے کہ بابو صاحب مجھ سے بتا چکے تھے کہ وہ اس وقت اُنیس بیس برس کے تھے اور خود رمّو کا سن تیرہ چودہ برس کا تھا۔ گویا خاصا پانچ چھ سال کا فرق تھا۔ مگر مَیں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ شاید میرے چہرے سے سمجھ گئے کہ مجھے اُن کے اس فقرے پر اعتراض سا ہے۔ اس لیے وہ رُک کر کہنے لگے۔ "شاید آپ نے پانچ چھ برس کے فرق کو عورت مرد کی ہم عمری کے خلاف سمجھا ہے، مگر ایسا نہیں ہے۔ پھر رمّو معمولی لڑکیوں سے بالکل ہی مختلف تھی۔ وہ جتنی شریر، شوخ، چنچل اور تیز تھی، اُتنی ہی سمجھ دار اور ذی فہم بھی تھی۔ اِس میں یہ خاص بات تھی کہ وہ ایک منٹ پہلے اگر آپ کو تیرہ برس کی لڑکی محسوس ہو گی تو دوسرے ہی منٹ میں ایک مکمل عورت۔ مزاج کیا تھا برسات کی رُت۔ ابھی اَبر کا ٹکڑا ہٹا تو وہ تیز دُھوپ کہ سارا نگر جل اُٹھا۔ ابھی ابھی کالا بادل جھوم کے برسا تو وہ ٹھنڈک، وہ آرام کہ بے ارادہ آنکھ بند ہوئی جا رہی ہے۔ ایسے سمے میں باتیں بھی ایسی پیاری کرتی کہ معلوم ہوتا بجلی گرانے والی رمّو نہیں بول رہی ہے، بلکہ ماں ہمیں پالنے میں لٹائے لوری دے رہی ہے۔ آپ یوں بظاہر چاہے جاگتے ہی رہیں، اور بھلا رمّو کے پاس بیٹھ کر کس کی شامت آئی ہے کہ وہ سو جائے۔ مگر آپ کی عقل، آپ کی خودداری، آپ کی آزادی رائے، سب کچھ سو جائے گی۔ آپ کی حالت بالکل ہی مسمریزم سے معمول کیے انسان کی ہو جائے گی۔"

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ ایک اُنیس بیس برس کا نوجوان مرد، اور ایک اس طرح

کی چنچل لڑکی، رات دن کا ساتھ، تخلیے کی کوئی کمی نہیں، پڑھنے اور پڑھانے کا بہانہ، بڑا بوڑھا کوئی روکنے والا نہیں، پھر اگر میں یہ بھول گیا کہ میں برہمن ہوں اور رمّو ایک شودر، تو کون سی تعجب کی بات ہے؟ میری باتوں سے تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ رمّو میں تمام وہ خوبیاں، وہ صفتیں موجود تھیں جن کی ایک معشوقہ، یا ایک بیوی میں تلاش ہوتی ہے۔ وہ جس گھر میں بھی بیاہ کے جاتی وہاں راج کرتی، شوہر کے دل کی مالک بنتی، ساس سسرے کے دل میں ٹھنڈک ڈالتی اور اپنوں پرایوں کا من موہ لیتی۔ مگر مَیں نے شاید آپ سے یہ نہیں کہا کہ انشا پردازی سے اُسے ایک فطری لگاؤ تھا اور آپ کا یہ خادم بھی اس فن سے خاص مناسبت رکھتا ہے۔ چنانچہ بابو جی کی نگرانی میں چند ہی دِنوں میں مَیں نے اخبار کے ادبی حصّہ' نظم و نثر کو ایڈٹ کر کے اس میں چار چاند لگا دیے۔ خود میرے مضامین اور نوٹ کی پبلک میں دھوم مچ گئی اور رمّو کی یہ حالت تھی کہ وہ تعریف کرتے کرتے چشم پُر آب ہو جاتی تھی... اُف!

بھائی صاحب دُنیا میں مصنف، شاعر مضمون نگار سے زیادہ چاپلوسی اور تعریف کا بھوکا کوئی رئیس اور بادشاہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہم مصنفوں نے ہی اپنی کمزوری بادشاہوں اور ڈکٹیٹروں کے سر منڈھ دی ہے۔ بادشاہ اپنی طاقت، اپنی حکومت، اپنے اختیارات کی وسعت پر اگر گھمنڈ کرے اور ایسوں کی چاپلوسی سے خوش ہو جن کی جان و عزّت، آبرو اس کے قبضہء قدرت میں ہو، تو کوئی جائے تعجب نہیں، لیکن ہم مصنّفین، انشا پرداز اور شاعر جن کے قبضے میں سوائے ایک ٹوٹے سے قلم اور ایک ورق کاغذ کے کچھ نہیں ہوتا، چند ٹیڑھے ترچھے نشانات بنا کر اتنا گھمنڈ کرتے ہیں کہ ضحّاک و افراسیاب، دریودھن اور راون کا غرور بھی اس کے سامنے شرماتا ہے۔ پھر اگر کہیں تعریف کرنے والے بھی مل گئے، تو ہم میں سے ہر ایک گدائے متکبر' ہی نہیں بن جاتا ہے بلکہ مرکز و منبع صد تجر و افتخار بن جاتا ہے۔ میرے معاملے میں تو مجھے رمّو کی چُپڑ نے مارا۔ اس کے تعریف کرتے ہوئے چمکتے چہرے اور اُس کی نم آلود غزالی آنکھوں نے اس طرح بیخود و بدحواس بنا دیا کہ مَیں اپنی اصل اور اُس کی نسل سب کچھ بھول گیا... ہائے اِس بھول جانے میں کیسا امن، کیسا اطمینان اور کیسا رس تھا! بس اسی سلسلے کا ایک واقعہ مثال کے طور پر بیان کر دوں۔ مَیں آپ کو زیادہ زحمت تو نہیں دے رہا ہوں؟"

مَیں نے جلدی سے کہا: "نہیں! نہیں! مَیں بڑی دلچسپی سے سن رہا ہوں!" اُنہوں نے

خود بڑھ کر میرے سامنے رکھی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا اُٹھالی اور پھر ایک سگریٹ نکال کر جلائی، پھر دُھواں اندر کھینچتے ہی کھانسنے لگے اور پھر اُنہوں نے اُسے جلدی سے کھڑکی سے پھینک دیا۔ میرے مسکرا دینے پر وہ ذرا سے چونکے۔ گھبرا کر بولے۔ ''بھائی صاحب مجھے معاف کیجیے گا۔ مَیں نے بغیر اجازت لیے پھر آپ کی ایک سگریٹ کا خون کیا۔''

مَیں نے کہا: ''پنڈت جی اب تو ہمارے آپ کے تعلقات ان تکلّفات سے بالاتر ہو چکے ہیں۔'' اُنھوں نے ہاتھ جوڑ کر بڑے خلوص سے مجھے سلام کیا۔ پھر بولے۔

''واقعی آپ بڑے شریف اور نیک ہیں... ہاں تو مَیں آپ سے ایک چھوٹا سا واقعہ رمّو کی قدر دانی کا بیان کرنے جا رہا تھا۔ آپ اسی سے سمجھ لیں گے کہ اس چھوٹی سی لڑکی کی تعریف میں کیسا جادو بھرا تھا۔ ایک دن مَیں نے عشق مجازی و حقیقی سے بحث کرتے ہوئے اخبار میں لکھا —پریمی مدن کے بان کا شکار ہوتا ہے، مگر گیانی اِن بان کا نشانہ بنتا ہے جس نے مدن کو پریم کا دیوتا بنا دیا— مَیں اس فقرے کے لکھنے پر خود بھی خوش تھا لیکن جب میں اخبار نکلنے پر گھر پہنچا تو مَیں نے دیکھا تازہ اخبار ہاتھ میں لیے رمّو پھاٹک پر منتظر کھڑی ہے، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ وہ دیکھتے ہی میری طرف جھپٹی، اور اس نے میرا داہنا ہاتھ اپنے کنول سے ہاتھوں میں لے کر اپنی ہرنی کی سی آنکھوں سے لگا لیا۔ اور یہ سب اس قدر سُرعت، بیساختگی اور خلوص سے کہ مَیں ایک لفظ بھی زبان سے نکال نہ سکا، اور یہ اظہارِ عقیدت مندی انجام پا گیا! مَیں نے کوئی نصف منٹ بعد اُس بظاہر دلربا مگر بہ باطن صاعقہ گرانے والی بلا سے پوچھا تو اُس نے ایک جوہی کی ٹہنی سے زیادہ نازک اُنگلی، گلاب کی پنکھڑی ایسے ہونٹ پر رکھ کر اشاروں میں خاموش رہنے کا حکم دیا، اور ہاتھ پکڑے مجھے میرے کمرے میں لائی۔ وہاں مَیں نے سناتن دھرمی ہونے کی وجہ سے ایک چھوٹی سی مورتی پیتل کی رکھ چھوڑی تھی، مَیں نے دیکھا تو آج اس مورتی کے سامنے کچھ پھول اور مٹھائی رکھی ہے اور ایک بتی جل رہی ہے۔ مجھے کھینچتی ہوئی مورتی کے سامنے لائی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''اے بھگوان تو سدا ان ہاتھوں کو اور اس میں رہنے والے قلم کو اپنے شرن میں رکھیو!'' پھر مورتی کے سامنے رکھے ہوئے ہار اُٹھا کر میرے گلے میں ڈال دیے میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''ارے یہ کیا کر رہی ہو رمّو۔ تم کو آج کیا ہو گیا ہے۔'' تو وہ ہر لحہ ہنسنے والی آنکھوں میں

آنسو ڈبڈبا کے بولی:

''مدن کے بان کے شکار خود ان کو شکار کرنے والے کی یونہی پوجا کرتے ہیں! اُف! کیسی من موہنی گھڑی تھی!''

اور پھر میرے ایک سگریٹ کا خون ہوا۔ پھر میری طرف دیکھ کر معافی مانگنے والے انداز سے اُنہوں نے دیکھا۔ پھر وہ خاموش ہو رہے اور بہت آہستہ آہستہ بولے۔ ''غرض ان دو برسوں میں مَیں صرف ایک ایڈیٹر اور ایک ماسٹر ہی نہ رہا۔ بلکہ ایک دیوتا اور ایک پجاری بھی بن گیا!''

ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی رُکی، دو ایک نئے مسافر ہماری گاڑی میں بھی سوار ہوئے۔ مَیں نے دیکھا بابو جی تخلیہ نہ باقی رہنے اور آپ بیتی کے ناتمام رہ جانے سے پہلو بدلنے لگے۔ خود میرے یہاں اختتام سننے کے لیے دل بیچین تھا، پنکھے لگے تھے۔ مَیں نے اُن سے کہا ''میری ہی سیٹ پر چلے آیئے۔'' وہ مع اپنے سوٹ کیس کے میرے ہی برتھ پر آ بیٹھے، اور گاڑی کے روانہ ہونے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ بالآخر گاڑی چلی۔ مَیں نے پوچھا ''پھر کیا ہوا؟''

وہ آہستہ سے بولے ''مَیں جال میں نئی پھنسی ہوئی چڑیا کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ ماں کا ڈر، وہ کٹّر سناتنی، بڑے خاندان کی برہمنی، رمّو شودر، پھر آریہ سماجی میں کسی کو چھوڑ نہیں سکتا تھا، ماں بوڑھی بیکس کیا کرتی۔ مَیں ہی تو اُس کا آسرا، اُس کا سب کچھ تھا۔ ہنسوڑ رمّو آپے سے گزرتی جاتی تھی۔ میرے محسن کی لڑکی تھی۔ ایسے آدمی کی، جو مجھ ڈوبتے کے لیے کنارہ لگنے کا سہارا بنا، جس نے مجھے صرف میری پسند کا کام ہی نہ دے دیا بلکہ اپنی کوٹھی میں جگہ دی، تن کو وستر اور کھانے کو بھوجن دِیا۔ جو مجھ سے رمّو سے کچھ ہی کم پریم کرتا تھا۔ اس کی رمّو اِکلوتی، چہیتی، لاکھوں میں ایک بیٹی، مجھ سے پریم کرتی۔ میرے ایک ایک لفظ پر جھومتی اور ایک ایک مضمون کو سَو سَو بار دُہراتی، بس یہ ٹوٹی ہوئی ناؤ پریم ساگر میں بہہ چلی! نہ طوفانی جھونکوں کا ڈر اور نہ کنارے لگنے کی آس! نہ جانے کیا ہوتا، کہاں پہنچتا، کہ دفعتاً ماں کی چٹھی ملی۔ ''تمھارے لیے کنیا ڈھونڈھ نکالی ہے، تم جلد آؤ، تو میں چاندسی بہو گھر میں لاکر اپنے کھنڈر کو اُجالا کروں۔'' سچ مانئے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ معلوم ہوا سوتے میں جیسے کسی نے فاختہ اُڑادی ہو۔ سکھ

آنند کی نیند سے چیختا ہوا جاگا۔ رمّو چہرے مہرے سے بھانپ گئی۔ ہزاروں سوگند دے کر مجھ سے خط لے کر اُس نے پڑھ ڈالا۔ بس اسی سے سمجھئے کہ رمّو کس طرح کی اِستری ہے کہ وہ اس خط کو دیکھ کر نہ روئی، نہ اُس نے کوئی رنج ظاہر کیا، بلکہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مَیں نے جب اُسے ذرا غصّے اور تعجب سے دیکھا تو وہ بولی:

''اس چٹھی میں کون سی نئی بات لکھی ہے جس پر اتنا لمبا چہرہ بنایا جاتا ہے۔ یہ تو ہنسنے کی بات ہے۔ تمھیں ایک کی جگہ دو داسیں مل جاتی ہیں۔ ایک تو خود سے تیار ہے، دوسری کو ماتا جی اپنی خوشی سے لاتی ہیں۔''

مَیں نے جھلّا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: ''کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمھارے پریم میں کسی اور کو بھی شریک کر سکتا ہوں؟''

وہ مسکرائی اور بولی: ''نہیں اسی کا تو ڈر نہیں۔ اسی لیے تو ہنسنے کو کہتی ہوں۔''

مَیں نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر کہا ''تم پریم کو بچوں کا کھیل سمجھتی ہو؟''

وہ لپکی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی اور چند منٹ بعد بابو جی کو ساتھ لیے آ پہنچی۔ مَیں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی کچھ گھبرائے ہوئے آئے تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ رمّو نے جھپٹ کر کرشن جی کی مورتی ہمارے درمیان والی میز پر رکھ دی۔ اور بابو جی کو مخاطب کر کے بولی: ''بابو جی آپ میرے دیوتا ہیں اور ان کے دیوتا کی مورتی ان کے سامنے رکھی ہے۔ مَیں دونوں دیوتاؤں کے سامنے سوگند کھاتی ہوں کہ مَیں اس جنم میں اور ہر جنم میں، بس انھیں کی داسی بن کر رہوں گی۔ چاہے اِس میں آپ ناخوش ہوں، چاہے اس میں بھگوان ناخوش ہوں، مگر آپ کی رمّو دل سے انہیں کی ہے، اور انہیں کی رہنے میں اپنے لیے نِروان اور مکتی سمجھتی ہے اور رہے گی!''

بابو جی گھبرا کر ''رمّو، رمّو، کیا کہتی ہے، ارے تجھے کیا ہوا بیٹی!'' کہتے رہے، مگر اُس نے جب تک سوگندھ نہ کھالی، نہ رُکی۔ مَیں سر پکڑے بیٹھا رہا۔ مَیں چاہتا تھا بابو جی مجھ کو دغاباز، پاجی، کمینہ کہہ کر جوتوں، ڈنڈوں اور ڈھیلوں سے مار کر گھر سے نکال دیں۔ مَیں احسان فراموش، محسن کش تھا، مَیں نے جس برتن میں کھایا تھا اُسی میں چھید کیا تھا۔ جس شاخ پر بیٹھا تھا اُسی کو کاٹ کر ڈھا دیا تھا۔ مگر وہ خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے۔ اُنہوں نے دو مرتبہ کرسی سے

اُٹھنے کی کوشش کی مگر وہ نہ اُٹھ سکے۔ آخرانھوں نے مجھے بڑی حسرت سے دیکھا۔ میاں صاحب میں بیان نہیں کرسکتا کہ اس نظر میں کتنی شکایت، کتنی اُمید کتنی تمنا کتنا ڈر ایک ساتھ سمویا ہوا تھا! مَیں کانپنے لگا۔ مَیں نے ہاتھ جوڑ کر کہا: ''بابو جی مَیں رمّو کو اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہوں اور اُس کی دیویوں سے زیادہ عزّت کرتا ہوں۔ ہم دونوں پریمی ہیں، پاپی نہیں ہیں!''

مَیں نے دیکھا کہ اُن کے چہرے سے وہ تناؤ، وہ خشکی اور وہ روکھا پن کم ہوگیا، جو اس پر رمّو کی باتوں کے بعد پیدا ہوگیا تھا، انہوں نے دو مرتبہ آہستہ آہستہ کہا: ''شکر ہے! شکر ہے!''

مَیں نے ان کی طرف وہ خط بڑھا دیا، جو ہمارے دل کی دَبی ہوئی آہوں کو بھڑکانے والا ثابت ہوا تھا۔ اُنہوں نے اُسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ رمّو جو میری گفتگو کے وقت ایک ملتجی، معافی مانگنے والے گنہگار کی طرح اُن کے سامنے کھڑی تھی، اب اُن کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہوگئی تھی۔ اُس نے بابو جی کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے۔ وہ بابو جی کے خط ختم کرتے ہی بولی: ''بابو جی بس اتنی سی بات کے لیے یہ دل کُڑھاتے ہیں۔ مَیں نے ان سے کہا، دیوتاؤں کے سینکڑوں داس اور داسیاں ہوتی ہیں۔ میرے دیوتا کے بھی اگر ایک کی جگہ دو داسیں ہوں گی تو میرا دل کیوں کڑھے گا؟ مَیں تو خوش ہوں گی کہ جس سے مَیں پریم کرتی ہوں، وہ میری دوسری بہن کی نظر میں بھی پوجے جانے کے لائق ہے!''

بابو جی نے مُڑ کر بیٹی کو دیکھا، اُن کی آنکھیں اُس کی ان باتوں سے خوشی میں چمک رہی تھیں، لیکن وہ اسے شاباشی دینے کی جگہ بولے: ''یہ ساری بچپنے کی باتیں ہیں رمّو۔ مَیں تم دونوں کی شادی کی اجازت دے سکتا ہوں، مگر تمھارے لیے سوکن لانے کی نہیں!''

وہ مچل کر بولی: ''کیوں بابو جی، جب میں خود راضی خوشی سے اُس کے لیے تیار ہوں تو آپ کو اس میں کاہے کا سوچ!''

اُنھوں نے ذرا جھنجھلا کر کہا: ''تم لاکھ پڑھی لکھی سہی، مگر تم سوکنوں کے جلاپے، آپس کی تُو تُو مَیں مَیں کو کیا سمجھو... پھر وہ برہمنی ہوگی۔ کسی پُرانے گھر کی۔ تم سے ذات میں بڑی۔ وہ تم کو شودر کہہ کر گھر سے کھڑے نکال دے گی!''

وہ ہنس کر بولی: ''مَیں اُن کے محل کے پاس پھوس کا جھونپڑا ڈال کے اُس میں رہنے لگوں گی!''

اُنھوں نے بیٹی کی طرف حسرت سے دیکھا۔ مَیں نے کہا۔ ''بابو جی مَیں اتنے پریم کا جواب ان کے سوا کسی دوسرے سے شادی کر کے نہیں دے سکتا۔ میں تو رمّو کے سوا کسی اور کو اپنے گھر کا مالک سوچ بھی نہیں سکتا!''

وہ متین ہو کر بولی۔ ''یہ سچ سہی۔ پر آپ شاید اپنی ماتا کو بھول گئے۔ اُنھوں نے آپ کو کتنے پریم سے، کیسے کیسے دُکھ سہہ کے پالا ہے! وہ تو شاید رمّو کو اپنی بہو کی حیثیت سے سوچ بھی نہ سکیں گی! کیوں بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں! ایسی بات کیجیے کہ ان کا دل بھی نہ دُکھے!''

بابو جی نے گھبرا کر کہا: ''اچھا بھئی تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ مَیں موہن جی سے اکیلے میں باتیں کروں گا۔''

رمّو کی زندگی میں پہلی دفعہ اس سے بابو جی نے کسی بات کے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ شاید کوئی اور موقع ہوتا تو وہ باپ سے لڑ پڑتی۔ مگر وہ اس وقت چپکی کمرے سے باہر کی طرف چلی۔ دروازے کے پاس ٹھٹکی۔ مُڑ کر بولی۔ ''بابو جی آپ دونوں میرے لیے جو چاہیں فیصلہ کریں، پر اتنا دھیان رہے کہ رمّو ان سے بیاہ اسی شرط پر کرے گی کہ یہ اپنی ماتا کو ناخوش نہ کریں، اور اپنی ذات برادری کی اِستری بیاہ لائیں!'' وہ یہ کہتی ہوئی چمک کر کمرے کے باہر چلی گئی۔ بابو جی جھلا کر کُرسی سے اُٹھ کھڑے ہو گئے۔ وہ بولے۔ ''تم دونوں نے مل کر مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ خیر وہ تو بچی ہے، لڑکی ہے، تم کو کیا ہوا تھا؟ تم نے چپکے چپکے ہنڈیا پکا لی، اُس کا دل چھین لیا، اسے بالکل اپنے بس میں کر لیا تو آج جا کر مجھ پر بھید کھلا...!

مَیں نے بات کاٹ کر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''بابو جی، مَیں اپنے قصور کا اقرار کرتا ہوں، مگر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سوائے آج کے ہم میں کبھی پریم کے بارے میں بات چیت بھی نہیں ہوئی...''

وہ بولے: ''یہ سب سہی، پر تم کو اپنے دل کی حالت تو معلوم تھی، تم خود رمّو کی حالت تو دیکھ رہے تھے۔ میرے ہی گھر میں بیٹھے پینگ بڑھاتے رہے...!''

مَیں نے اُن کا پاؤں چھو کر کہا: ''آپ میرے باپ کی جگہ ہیں، مجھ سے چوک ہوئی، مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھے آپ ہر طرح کی سزا دے سکتے ہیں...''

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے: ''اب مَیں تمھیں سزا دے کر کیا پاؤں گا؟ رمّو قسم کھاتی

ہے کہ وہ سوائے تمھارے کسی سے شادی نہ کرے گی۔ پھر اس بات پر اڑی ہے کہ تم سے شادی جب ہی کرے گی جب تم ایک برہمنی بیاہ کے لا چکو گے۔ تم کہتے ہو کہ سوائے اس کے کسی سے بیاہ نہ کرو گے۔ مَیں چاہے کچھ ہو جائے، سوکن ہوتے ہوئے اسے تم سے نہ بیاہوں گا۔ پھر تمھاری ماں موجود ہیں۔ وہ کٹّر سناتن دھرمی، پُرانے ڈھنگ کی، وہ اپنی برادری ہی میں برابر والوں میں شادی کریں گی۔ تم کو رمّو جیسی گُرمن سے تو کسی طرح بیاہ کرنے نہ دیں گی... تم کہتے ہو چوک ہوئی، بھول ہوئی، یہاں اتنی سی بات میں وہ گتھی پڑ گئی کہ جس میں چار پانچ زندگیاں برباد جاتی نظر آتی ہیں... تمھاری ماں کی، میری، خود تمھاری اور ان سب سے زیادہ رمّو کی... اے بھگوان میں کیا کروں؟''

مَیں نے کہا: ''اچھا تو مَیں آج ہی ماتا جی کے پاس جاتا ہوں، ممکن ہے وہ مان جائیں!''

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے ''اچھا تم اپنی سی کر دیکھو، پر مجھے اس بات کا یقین ہے کہ وہ نہ مانیں گی!''

لکھنؤ کے لیے ایک ہی گھنٹے میں گاڑی روانہ ہوتی تھی۔ اِس لیے مَیں نے اُنھیں کے سامنے جھٹ پٹ اپنا سامان درست کیا اور رمّو سے بغیر ملے اسٹیشن کے لیے چل کھڑا ہوا۔ راستہ بھر ماتا کی ناخوشی سے زیادہ، اسی کا خیال رہا کہ رمّو اپنے دل میں کیا کہتی ہوگی، کہ مَیں اس سے ملے بغیر اس طرح بھاگ آیا۔ اور پھر مَیں نے اُسے جن جن رُوپوں میں اُس دن دیکھا تھا وہ بار بار آنکھوں کے سامنے پھرتے تھے۔ اور ہر ایک میں ایسا پیارا تھا کہ جی چاہتا تھا بس اسی طرح دیکھے جاؤ... اُف!'' وہ ذرا رُکے تو مَیں نے اُن کی طرف سگریٹ کی ڈبیا بڑھا دی۔ اُنھوں نے ایک سگریٹ جلائی۔ اسی طرح گھبرا گھبرا کر کش کھینچے۔ تمباکو سے زیادہ سگریٹ کا کاغذ جل گیا۔ پھر کھانسی آئی پھر سگریٹ پھینک دی گئی۔ پھر وہ بولے:

''جب مَیں گھر پہنچا تو مَیں نے دیکھا ماتا جی نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کے سارے سامان کر رکھے ہیں۔ پرتاب گڑھ میں ایک مشہور شاستری جی تھے، اُن کے لڑکی تھی۔ ماتا جی خود لڑکی کو جا کر دیکھ آئی تھیں، اور وہ اُنھیں دل و جان سے پسند تھی۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے اُس کی تعریف میں قصیدے پڑھنا شروع کر دیے۔ اب ذرا میری مشکل کو خیال کیجیے، وہ تو اُدھر ہونے والی بہو کے گن گا رہی ہیں، اور مَیں اِدھر پہلو بدل رہا ہوں کہ یہ کسی طرح چپ ہوں تو

مَیں اپنی رام کہانی سناؤں، مگر وہ کہاں چپ ہونے والی تھیں۔ ایک دریا تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا۔ آخر مَیں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”ماتا جی ذرا میری بھی بات سن لیجیے۔“ اوران کے کچھ متعجب اور خفا ہو کر چپ ہو جانے پر مَیں نے گردن جھکا کر ساری کتھا کہہ ڈالی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اُنھیں سکتہ سا ہو گیا۔ وہ چپ میری ساری باتیں سنا کیں۔ جب مَیں نے اِس جملے پر ختم کیا کہ ”ماتا جی رمّو شودر سہی، مگر ایسی اچھی کنیا تو اس لوک اور پرلوک میں مجھے نہیں مل سکتی، اور میں تو اگر بیاہ کروں گا تو اسی سے!“

تب وہ چونک کر ایک بار بولیں۔ ”ارے تو کیوں ہندو دھرم کو بدنام کرتا ہے؟ پاپی! جو شودرن سے بیاہ کرے گا اُسے مکتی کہاں نصیب!“

مَیں نے کہا: ”بھگوان اتنا ظالم نہیں ہو سکتا کہ خود ہی تو دِلوں میں پریم ڈالے اور خود ہی پھر اتنی سخت سزا دی!“

وہ جھڑک کر بولیں۔ ”چل چل! تو بڑا بھگوان کا چاہنے والا آیا۔ کرمن سے آشنائی کرے گا.............“

بس وہ اتنا کہنے پائی تھیں کہ مجھے ایسا جان پڑا کہ ایک لُوکا سا اُٹھا اور میرے سارے جسم کو بھسم کر گیا۔ مَیں نے اندھے پن سے ماتا کے منہ پر طمانچہ مار دیا۔ وہ بھوچکّی ہو کر تھوڑی دیر تو میرا منہ تکتی رہیں، پھر اپنا گلا سہلا کر آنسو ڈبڈباتے بولیں۔ ”اگر مَیں نے تجھے جنا نہ ہوتا تو آج میں تجھے ایسا سراپ دیتی کہ تو ستّر جنم تک اس کا پاپ جھیلتا۔ لیکن میری ماما سے نہیں ہوتا۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گی کہ تو اپنی کرمن کو اس گھر میں میرے مرنے سے پہلے نہیں لا سکتا۔ پہلے میرا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ دے پھر تیرا جو جی چاہے کر!“

ماتا جی تو اسی طرح کوستی اور بُرا بھلا کہتی رہیں۔ لیکن میری یہ حالت تھی کہ میں اُنہیں طمانچہ مارتے ہی کانپنے لگا، میری آنکھیں کھل گئیں۔ مَیں نے آج اِس پریم کے کرتوتوں اپنی ماتا پر ہاتھ اُٹھایا۔ ہائے میں کتنا نیچ، کتنا کمینہ ہو گیا تھا! پریم اگر انسان کو اس طرح اندھا بنا دیتا ہے، تو لوگ بے پریم ہی کے اچھے! مَیں نے دوڑ کر اُن کے چرنوں میں سر ڈال دیا اور اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ بھی اس وقت بڑی کٹھور بن گئیں اور اُنہوں نے مجھے ٹھوکر ماردی۔ مَیں زمین پر گر پڑا۔ وہ یہ کہتی ہوئی کہ ”مجھے نہ چھو پاپی!“ دوسرے کمرے میں چلی

گئیں۔"

پنڈت جی نے مجھ سے ایک اِلا ئچی مانگ کر بغیر چھیلے منہ میں رکھ لی۔ بڑے زور زور سے دانتوں سے کچلی۔ پھر کچھ عجیب طرح کا منہ بنا کر کھڑکی سے منہ نکال کر تھوک دی۔ مَیں نے کہا "کیا خراب تھی؟ دوسری دوں؟"

وہ بڑی مایوسی سے بولے۔ "نہیں اِس وقت اُمرت بھی زہر معلوم ہوگا، منہ کا مزا ہی کڑوا ہے!"

مَیں خاموش ہوگیا۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد بولے: "ماتا جی سے مجھ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ دوسرے دن صبح تک اس کمرے سے نہ نکلیں، مَیں دوسرے ہی دن متھرا بھاگ آیا۔

یہاں آنے پر مجھے معلوم ہوا کہ بابو جی نے رمّو کو سمجھا بجھا کر دو تین ہفتے کے لیے الٰہ آباد اپنے ایک عزیز کے یہاں بھیج دیا ہے۔ مَیں نے ان سے جب ماتا جی کی باتیں دُہرائیں تو وہ صرف اتنا بولے کہ "مَیں تو یہ پہلے ہی سے جانتا تھا۔" مَیں نے اُسی دن اُن کی کوٹھی چھوڑ دی اور دفتر سے قریب شہر میں ایک چھوٹا سا مکان لے کر اُس میں اُٹھ آیا۔ وہ منع کرتے ہی رہے مگر مَیں نے کہا "کافی نمک حرامی ہوچکی، اب اس سے زیادہ ممکن نہیں!"

نئے مکان میں رہتے ہوئے کوئی ایک ہفتہ ہوا تھا کہ ایک دن مجھے رمّو کا ایک لمبا چوڑا خط ملا۔ اس نے کوٹھی چھوڑ دینے اور نئے مکان میں کرایہ پر رہنے کی شکایت کی تھی، اور یہ لکھا تھا کہ وہ خود ماتا جی سے ملنے لکھنؤ جا رہی تھی۔ مَیں یہ پڑھتے ہی گھبرا گیا۔ میں ماتا جی کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ مَیں جانتا تھا کہ وہ رمّو کو دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو جائیں گی اور وہ اس کے ساتھ وہی سلوک کریں گی جو 'منوٗ' کے زمانے میں برہمن شودر سے کرتے تھے۔ مَیں گھبرایا ہوا بابو جی کے پاس پہنچا۔ وہ بھی پریشان ہوگئے۔ اُنہوں نے طے کیا کہ ایسے موقع پر اُن کا بھی بیٹی کے پاس پہنچ جانا ہی بہتر ہے۔ وہ سیدھے لکھنؤ گئے۔ مگر وہاں اُس وقت پہنچے جبکہ میری ڈائن ماں رمّو کو ہزاروں گالیاں دے کر رسوئی کی جلتی ہوئی لکڑی سے مار مار کر نکال رہی تھیں۔ بابو جی نے اپنی ناز سے پلی ہوئی رمّو کو گود میں اُٹھا لیا، اور ٹانگے پر لاد کر اسٹیشن لائے اور وہاں سے سیدھے متھرا۔"

پنڈت جی نے رُک کر سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا، مَیں نے جلدی سے سگریٹ نکال

کر پیش کی۔ انہوں نے اسے جلایا، دو کش کھینچے، کھانسے اور کہا ''ماتاجی کی اِن باتوں نے رمّو کو اتنا صدمہ پہنچایا کہ وہ گاڑی ہی سے بیمار ہوئی، سخت بخار آیا، سرسام ہوگیا، سرسامی حالت میں برابر یہی کہتی رہی۔ ''مَیں شودرن ہوں، بیسوا ہوں، پاپن ہوں۔ مَیں نے ایک برہمن لڑکے کو پھنسالیا۔ اُسے بے دھرم کیا! ارے ماتاجی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ارے چپ رے ڈائن، نکمّی، نیچ، کمینی!''

وہ پھر چپ رہے۔ ان کے ہونٹ کانپتے رہے۔ گاڑی کانپور اسٹیشن پر رُکنے کے لیے پٹری بدل رہی تھی، مَیں نے اس دردبھری کہانی کا انجام سننے کے لیے پوچھا ''تواب تو وہ اچھی ہیں؟'' اُنھوں نے مجھ کو پاگلوں کی طرح گھبرا کر دیکھا۔

''جی، پرسوں شام کو وہ اچھوت لڑکی ایسی جگہ چلی گئی جہاں نہ میری ماں کی سی تہمت لگانے والی اِستریاں ہیں اور نہ مجھ سے ڈال کے ٹوٹے برہمن! مَیں نے کل شام کو اُس کی چتا اپنی آنکھوں سے جلتی دیکھی!''

اِس ملاقات کے تیسرے دن میں نے پوائنیر اخبار میں ایک خبر پڑھی:

''کل گنیش گنج میں دو حد درجہ دردناک قتل ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پنڈت ترلوکی موہن جو متھرا میں کسی ہندی اخبار کے ایڈیٹر تھے، اپنی ماں کے قریب زخمی تڑپتے ہوئے پائے گئے۔ ان کے پاس ہی دونالی بندوق پڑی تھی۔ محلّہ والوں کا بیان ہے کہ وہ جب فائر کی آواز سن کر اندر داخل ہوئے تو پنڈت جی کی ماں کی زبان کٹی پڑی تھی اور گولی اُن کے سینے کے پار تھی۔ پنڈت جی نے شاید اس قتل کے بعد اپنے سر پر گولی لگائی، اِس لیے کہ ان کا پورا آدھا جبڑا اُڑ گیا تھا۔ وہ بیہوشی کی حالت میں میڈیکل کالج پہنچائے گئے، جہاں ایک گھنٹہ بعد وہ مرگئے۔ پنڈت جی مرنے سے پہلے صرف آدھے منٹ کے لیے ہوش میں آئے تھے اور اُنھوں نے صرف تین مرتبہ ''رمّو! رمّو! رمّو!'' کے الفاظ دُہرائے۔

پولیس تفتیش کر رہی ہے... اِس قتل وخودکشی کے وجوہ کا اب تک کوئی سُراغ نہیں لگا ہے۔ البتہ پنڈت جی کے کمرے میں مختلف طرح کے سگریٹوں کے بہت سے ٹکڑے پائے گئے ہیں۔

✿✿

اڈّا

جیران پور کا قصبہ نہ زیادہ چھوٹا تھا نہ بہت بڑا۔ تقریباً پانچ ہزار کی آبادی تھی۔ زمیندار مسلمان شیوخ تھے، رعایا میں ہر قوم اور ہر پیشے کے لوگ تھے، اور ان میں سے اکثر کے الگ الگ محلے تھے۔ ٹھکرانا، گھوسیانا، کوری ٹولہ، حلوائی بازار، کنجڑا محال اور چمار ٹولی۔ محلوں کے نام سے پتہ چلتا تھا کہ جیران پور کے بسانے والے کے دماغ میں کسی بڑے شہر کا خاکہ تھا اور یہ قصبہ سلطنت مغلیہ کے زمانے میں وجود میں آیا، جب جاگیرداری نظام رعایا اور راعی، حاکم ومحکوم کے مکانات ایک دوسرے کی بغل میں بنانے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ خود زمینداروں کا محلہ شیخ پورہ، شیخانا یا شیخ باڑانہ کہلاتا تھا بلکہ قلعہ معلّیٰ کے ڈھنگ پر گڑھی کے نام سے موسوم تھا اور اس کے ہر مکان میں دربار کے لیے کوئی کمرہ یا دالان مخصوص تھا۔ اس میں زمیندار کے لیے ایک کرسی رہتی تھی، راجپوتوں برہمنوں کے لیے ایک بنچ، کارندوں اور مسلمان رعایا کے لیے چٹائیاں اور بقیہ رعایا پرجا کے لیے دھرتی ماتا کا مسطح سینہ۔ مکانوں کی ساخت میں بھی فرق تھا۔ زمینداروں کے مکانات پختہ لکھوری اینٹوں کے تھے، بڑے پھاٹک، محرابی دروازے، بلند شہ نشین، کشادہ صحن، دومنزلے، سہ منزلے، برجیاں بھی، تہہ خانے بھی اور چور دروازے بھی۔ ٹھاکروں اور مہاجنوں کے مکان کچے، کھپریل سے چھائے ہوئے، بقیہ رعایا کے لیے جھونپڑے تھے، تاریک تنگ، پھوس سے ڈھکے ہوئے۔ قصبہ میں کوئی ٹاؤن ایریا نہ تھا، اس لیے نہ تو صفائی کا انتظام تھا، نہ گلیاں ہموار تھیں۔ اکثر مقامات پر گھروں کا بدبودار سڑا ہوا پانی راستے کی خاک کو کیچڑ میں تبدیل کر دیتا تھا اور آتی جاتی بیل گاڑیاں موٹر اور یکّے اس کی مدد سے راہ چلتوں کے کپڑوں پر گلکاریاں کر دیتے تھے۔ مغربی تعلیم یافتہ حضرات ایسے مقامات سے ناک پر رومال رکھے لپ جھپ گزر جاتے، لیکن پھونس کی جھونپڑیوں میں زائیدہ بچّے اسی فضا

میں کھیلتے، کلکاریاں مارتے اور وباؤں سے جو بچ جاتے وہ جوان ہو کر ان گندگیوں میں رینگنے والے دوسرے کیڑے پیدا کرتے رہتے تھے۔

جیران پور دو چیزوں کے لیے مشہور تھا۔ ایک تو پیڑے کے لیے دوسرے شیر مال کے لیے۔ پیڑوں کی شہرت کا سبب تو گھوسیانہ تھا، جہاں گھوسیوں کا پورا محلہ آباد ہو گا وہاں کھوئے کی کیا کمی، اور جہاں کھویا افراط سے ملے گا وہاں کے پیڑے یقینی اچھے ہوں گے، مگر شیر مال کی شہرت کی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں نے ایک دن ناصر سے اس کا راز دریافت کیا۔ وہ بولے: ''شیر مال کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں، عمدہ دودھ، عمدہ گھی اور عمدہ آٹا۔ دودھ یہاں اچھے سے اچھا ملتا ہے، گھی کی بھی وہی حالت ہے، رہا آٹا تو یہاں مشین نہیں چلتی بلکہ چکی میں گھروں پر پیسا جاتا ہے۔''

میں نے شہری ہونے کی حیثیت سے ذرا منہ بنا کر پوچھا ''تو موٹا ہوتا ہوگا؟''

وہ بولے: ''جی ہاں، موٹا تو یقینی ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں کہ آپ کے حلق میں خراش پڑ جائے۔ انسانی ہاتھوں میں مشین کی طرح باریک پیسنے کی طاقت کہاں لیکن اسی کی وجہ سے گیہوں کی اصل طاقت بھی قائم رہتی ہے اور اس آٹے کی روٹیاں نرم بھی ہوتی ہیں اور زود ہضم بھی۔ ان میں مشین کے میدے کا چمڑا پن نہیں ہوتا۔''

میں نے اپنی جگہ غور کیا تو واقعی میں ناصر کے ہاں جب بھی آتا تو ایسی تمام چیزیں خوش ذائقہ معلوم ہوتیں، جن میں آٹا ملا ہوتا تھا۔ پھر میری خوراک بھی شہر سے دُگنی ہو جاتی تھی۔ پھر بھی میں نے شرارت سے کہا: ''یہ محض آپ کا حسنِ ظن ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ اپنا قیمتی وقت ہاتھ سے آٹا پیسنے میں صرف کرتے ہیں۔ ایک آٹا مل کھول دی جائے تو کتنا فائدہ ہو۔''

معلوم ہوا جیسے ناصر کے تن بدن میں کسی نے مرچیں لگا دیں۔ وہ تلملا کے بولے: ''جی ہاں بڑا فائدہ ہو۔ جو عورتیں اپنے ہاتھ سے آٹا پیس لیتی ہیں اُن کی ورزش جاتی رہی، صحت خراب ہو، یا بیمار پڑیں، جو پیسنے والیاں اسی ذریعہ اپنا پیٹ پالتی ہیں، وہ بھوکوں مریں یا شہروں میں جا کر عصمت فروشی کریں!''

میں نے مسکرا کر کہا: ''کیوں شہر جائیں۔ آپ کے دیہات ہی میں رہیں لیکن میاں کی کمائی کھائیں۔''

انھوں نے کہا: ''جی ان کے شوہر زندہ ہوتے تو وہ اس کام کو کرتیں ہی کیوں۔ وہ چاروں عورتیں جن کا آٹا پیسنا اور دال دَلنا پیشہ ہے بیوائیں ہیں، تلسیاں چمارن، رام پتیا کہارن، رام

دسیا اہیرن اور مجیدن جولاہن۔"

نہ جانے کیوں میرے تخیل نے میرے سامنے ایک تصویر پیش کردی۔ چکی چل رہی ہے، اس کے گرد پسینے میں بھیگی ہوئی دو گداز ٹانگیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ساڑی ران تک سمٹی ہوئی ہے اور پیسنے والی چکی کی موٹھ (جوا) ہاتھ میں لیے آگے جھکتی ہے، پیچھے جھکتی ہے، داہنی طرف جھکتی ہے، بائیں طرف جھکتی ہے اور لہک لہک کے گا رہی ہے:

چکیا نہ ڈولے منوا کی کلیا نہ ڈولے

جوا پکڑ کے روئیں رم پیتا رم دسیا

میں اپنے تخیل کی بے لگامی پر مسکرادیا۔ میں نے کہا "اس محنت سے بیواؤں کو جنسی تسکین تو ضرور ہوتی ہوگی لیکن اُن کا پیٹ ہرگز نہ بھرتا ہوگا۔"

ناصر جاگیردارانہ انداز سے بگڑ کر بولے "پیٹ کیوں نہیں بھرتا۔ دن میں ڈھائی تین سیر آٹا اور تین چار سیر دال دَل لیتی ہیں، اُن کے کھانے بھر کو آٹا تو گرا پڑا مل جاتا ہے، پھر ایک آنہ سیر پیسنے دَلنے کا ملتا ہے۔ سات آٹھ آنے روزانہ مفت ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ اب کیا چاہیے قارون کا خزانہ؟"

میں نے ان کا غصہ آخری ڈِگری تک پہنچادیا۔ بھیگی بلّی بن کر عرض کیا "اگر ان میں سے کوئی جوان ہے تو اس سے کہیں...." وہ پھولے ہوئے نتھنوں سے گرم گرم سانسیں نکال کر بولے: "جناب! یہ آپ کا شہر نہیں ہے، یہاں کے مرد عورت تہذیب یافتہ نہیں ہیں۔ یہاں عورت و مرد میں تعلقات تفریحی اور وقتی نہیں ہوتے۔ ان کی غرض گھر بسانا ہوتی ہے۔ ان عورتوں کا گھر بس کر اُجڑ چکا۔ آپ کی ہمدردی کی انھیں ضرورت نہیں۔ وہ عزت آبرو سے اپنی گزر بسر کر لیتی ہیں!"

میں نے اس پر بھی بس نہ کیا۔ "آپ جتنی بھی تعریف کریں ان کا معیارِ زندگی زیادہ بلند نہیں کیا جاسکتا۔"

ناصر بڑے زور سے "ہونہہ" کہہ کے پاؤں پٹکتے اندر چلے گئے۔

یہ قصہ تھا ۱۹۳۸ء کا۔ کئی سال میں جیران پور نہ جاسکا۔ ۱۹۴۴ء میں ناصر نے اپنے لڑکے اسلم کی شادی ٹھان دی۔ اب تو جانا ہی پڑا۔ قصبہ اسٹیشن سے چار فرلانگ پر تھا اور راستہ عام طور

سے بہت ناہموار۔ میں نے اسی لیے ناصر کو پہلے ہی سے اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ اسٹیشن پر ان کا آدمی بھی تھا اور سواری بھی تھی۔ میں نے گاڑی سے اُترتے ہی اسٹیشن پر ایک خاص قسم کی چہل پہل دیکھی۔ دو ایک ٹامی بھی ٹہل رہے تھے، پانچ چار پنجابی بھی زلفیں رکھائے، پٹے کٹائے وردیاں پہنے باتیں کر رہے تھے۔ پھل بھی بک رہا تھا، مٹھائی بھی تھی اور بیرے بکلس لگائے، ہاتھوں پر چائے کا سامان رکھے، چائے ''چائے صاحب، چائے صاحب'' کہتے چلے آ رہے تھے۔ باہر نکلا تو سڑک بھی حد نظر تک درست دِکھائی دی۔ مجھے محسوس ہونے لگا میں کسی نئی جگہ، اجنبی دیس میں جا رہا ہوں۔ ناصر صاحب کے گھر تک پہنچتے پہنچتے جو راستہ کاٹے نہ کٹتا تھا چشم زدن میں طے ہو گیا۔ نئی نئی عمارتیں تھیں، نئے نئے موڑ تھے، باغ کی جگہ چٹیل میدان تھے، جنگل کی جگہ ہموار سبزہ زار تھا۔ پھر اتنا ہی راستہ طے کرنے میں چار ٹرک ملے اور دو تین جیپ گاڑیاں بغل سے گزر گئیں۔

ناصر اپنے پچھلے سے تپاک سے ملے۔ میں نے دیکھا ان کی گڑھی کچھ بوسیدہ سی ہو رہی ہے، کچھ حصے گر پڑ گئے ہیں، کچھ بے قلعی پڑے ہیں۔ مجھے تعجب سا ہوا کہ ناصر سا منتظم اور خوش سلیقہ آدمی اور مکان کی یہ حالت۔ بیٹے کی شادی ٹھان دی اور مرمت تک نہ کرائی۔ ملاقات ہوتے ہی تو یہ بات پوچھنے کی نہ تھی اس لیے اس وقت تو چپ ہو رہا لیکن دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد جب ہم دونوں تنہا رہ گئے تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔

میں نے پوچھا: ''کیوں جی بھلے مانس، یہ تم نے گھر کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ اُتر والا کمرہ مزار کے لیے جگہ ڈھونڈ رہا ہے۔ دکھن والا دالان دیدۂ بے نور کی طرح اپنی ساری چمک کھو چکا ہے۔ سیدھے رُخ کی دیوار کی اینٹیں بوڑھے کے دانتوں کی طرح گھس بھی گئی ہیں اور گر بھی رہی ہیں۔ آخر بیٹے کی شادی کر رہے ہو، کچھ تو لیپ پوت کرائی ہوتی؟''

ناصر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''میاں تم شاید کسی ہوائی اڈے کے قریب نہیں رہتے۔ ۱۹۴۰ء میں سرکاری حکم ہوا، جیران پور میں آڈا بنے گا۔ قصبہ کا سارا چونا، سارا کوئلہ، ساری اینٹیں، سارے درخت چشم زدن میں حکومت نے لے لیے۔ گاؤں کے سارے محنت مزدوری کرنے والے، چمار، اہیر، پاسی، جولاہے، پٹھان، ٹھاکر، برہمن، ڈیڑھ روپے، دو روپے، تین روپے روز پر بلائے گئے۔ انھوں نے عمر میں اتنا نہ کمایا تھا، ان کی عقلیں ماری گئیں۔ آہستہ آہستہ سب کے سب باہر بھیج دیئے گئے۔ کوئی برما گیا، کوئی آسام، کوئی ایران گیا، کوئی مصر۔ بعض ان میں سے وہیں مر کھپ گئے۔ کچھ ہاتھ پاؤں کٹا کر واپس آئے۔ کچھ اب تک فوج

میں کام کر رہے ہیں۔ راستے میں جو نئے مکانات تم نے دیکھے ہیں وہ انھیں نو دولتیوں کے ہیں۔ پورے قصبے میں اب صرف ڈیڑھ یا ڈھائی مزدور ہیں۔ بانچو چمار، بکسی حجام اور تلسیا چمارن۔"

میں نے کہا: "تو یہ تو تین ہوئے، ڈھائی ڈیڑھ کیسے؟"

وہ بولے: "تلسیا عورت ہے، اسلامی قاعدے سے عورتوں کا حصہ مرد کے آدھا ہوتا ہے۔ یوں اگر مانو تو ڈھائی ہوئی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تینوں ملا کر ڈیڑھ سے کسی طرح زیادہ نہیں۔ بانچو فوج سے ایک ٹانگ اور بکسی ایک ہاتھ کھو کر پلٹا ہے، اور تلسیا فاقہ کرتے کرتے اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ اس کے ہاتھ بھی ہلتے ہیں، گردن بھی ہلتی ہے اور آنکھوں سے بھی کم سوجھتا ہے....."

مجھے تلسیاں کا نام پہچانا ہوا معلوم ہوا۔ مَیں نے کہا: "یہ وہی تلسیا تو نہیں جو پسائی کا کام کرتی تھی؟"

کہنے لگے: "جی ہاں، اچھی خاصی تندرست عورت تھی۔ ڈھائی تین سیر روزانہ آٹا پیستی، تین چار سیر دال دَل لیتی، لیکن شامتِ اعمال رامو سیٹھ نے آٹے کی مشین لگالی، بس سارا قصبہ اُدھر جھک پڑا۔ چاروں پیسنے والیاں فاقہ کرنے لگیں۔ رام دسیا بھیک مانگ کر مر گئی۔ تلسیا ابھی تک زندہ ہے۔ اور ہم لوگ جو اسے مزدوری پر لگا لیتے ہیں تو اسی خیال سے کہ کسی طرح کمبخت کو پیٹ بھرنے کو چار روٹیاں مل جائیں۔" وہ کچھ سوچنے لگے۔

میں نے پوچھا: "اور وہ دونوں جو جوان تھیں؟"

ڈیوڑھی پر سے ماما ظہورن نے پکارا: "حضور اندر بلایا جا رہا ہے۔" ناصر یہ کہتے ہوئے اندر چلے گئے کہ "پھر کبھی باتیں ہوں گی۔"

شام کو تقریباً چھ بجے ناصر نے اپنی فٹن گاڑی منگوائی۔ خاصے بڑے رئیس تھے۔ موٹر یقینی لے سکتے تھے مگر شدائد کا اتنا شدید ان پر اثر تھا کہ باپ دادا کے چلن سے ایک قدم ہٹنا پسند نہ کرتے تھے۔ اسپرنگ اچھی تھی، ربڑ نیا تھا اور گھوڑا بہت ہی سبک خرام۔ ہم لوگ جس طرف جا رہے تھے دو رویہ بڑے بڑے پکڑ اور اِملی کے درخت تھے۔ کہیں کہیں تو ان کی گھنی شاخوں کی محراب سے نکلتی ہوئی سیمنٹ کی سڑک شب تار میں ہلال کی طرح چمک اُٹھتی تھی۔ ہوا میں ایک ہلکی سی طراوت تھی جیسے وہ کہیں پاس ہی کے کسی تالاب میں غوطہ لگا کر آئی ہو۔ اس پُر لطف فضا میں گھوڑے کی ہموار چال ویسی ہی اچھی معلوم ہوتی جیسے تنہائی میں کوئی بیٹھا طبلے سے شغل کرے۔ سڑک پر بالکل سناٹا تھا، نہ یکہ، نہ گاڑی، نہ ٹرک، نہ لاری، نہ جانور نہ آدمی۔

مَیں نے اس مترنم سکوت کو ایک سوال سے توڑا۔ "یہ آخر اِدھر اتنا سناٹا کیوں ہے؟"

ناصر نے کہا: ''یہ سڑک خاص طور سے پٹرول ٹنکی کو جاتی ہے۔اس پر سورج ڈوبتے ہی کوئی نہیں چلتا۔فوج والوں سے ہر ایک ڈرتا ہے۔''

فوجیوں سے ڈرنے کے اسباب پر میں غور ہی کر رہا تھا کہ مجھے ایک نیا کچا مکان دِکھائی دیا۔دومنزلہ،خوبصورت سا،اس کے سامنے ایک فوجی ٹرک کھڑی تھی اور دس کے قریب ہندوستانی سپاہی باہر کھڑے سگریٹ پی رہے تھے،باتیں کر رہے تھے،ٹھٹھے مار رہے تھے۔

میں نے سمجھا کسی افسر کے ٹھہرنے کی جگہ ہوگی۔پھر بھی اس پر تعجب تھا کہ لڑائی کے زمانہ میں ڈسپلن اتنا خراب کہ افسر کے بنگلے کے سامنے کھڑے ہیں اور فوجی بے ترتیبی ہی سے نہیں کھڑے ہیں بلکہ ہنس رہے ہیں،شور مچا رہے ہیں۔میں ابھی اسی پر غور کر رہا تھا کہ دوسرا چھوٹا سا احاطہ دِکھائی دیا اور اس کے بیچ میں ایک بنگلہ۔پھاٹک پر سڑک کے سامنے ہی ایک عورت اور فوجی میں تفریحی چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔عورت جیسے ناصر کے گھوڑے کی ٹاپ پہچانتی تھی۔فٹن کے مقابل آتے ہی وہ جھپٹ کر الگ ہوگئی اور اُس نے ناصر کو جھک کر سلام کیا۔

ناصر نے جواب دینے کی جگہ گھوڑے کو چابک ماری۔وہ فٹن لے کر بھاگا۔ناصر نے پوری قوت صَرف کر کے اس بپھرے جانور کو ایک فرلانگ پر جا کر روکا اور پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا: ''حرام زادی!''

میں نے مسکرا کر کہا: ''جی گھوڑا مذکر ہے....''

وہ ہنس دیئے۔''اتنا میں بھی جانتا ہوں،لیکن میں نے گالی سلام کرنے والی کو دی تھی۔

میں نے پوچھا: ''وہ کون ہے؟''

وہ میری طرف اس طرح مڑ پڑے جیسے اس پورے قصے میں ساری شیطنت میری ہی تھی۔

''جی،وہ پہلا بنگلہ رم پیتا کا ہے اور دوسرا مجیدن کا۔''

میں نے تعجب سے کہا: ''وہی قصبہ میں آٹا پیسنے والیاں؟''

وہ بگڑ کر بولے: ''جی ہاں۔پہلے وہ قصبہ میں آٹا پیستی تھیں،وہاں سیٹھ کی مشین آ گئی۔انھوں نے بھی پیٹ بھرنے کے لیے اپنی مشین چلائی۔اُن کا معیارِ زندگی برابر بڑھتا ہی گیا۔اب وہ تہذیب وترقی کی چوٹی پر ہیں۔اڈّے والیاں!لائسنس دار طوائفیں!''

(ماہنامہ آج کل،دہلی،یکم جون ۱۹۴۷ء)

✿✿

ازالۂ غلط فہمی

داروغہ امیر احمد اپنی حد درجہ خوش قسمتی سمجھے کہ بیگم صاحبہ نے اپنی منہ بولی بہن کی لڑکی اُن سے منسوب کردی۔ تیس برس کے سِن میں یہی کیا کم تھا کہ بیگم صاحبہ کی سی رئیس زادی کے داروغہ بن بیٹھے تھے۔ پوری جائداد کی آمدنی، تمام مکانات کا کرایہ، اور سال بھر کا پورا وثیقہ انھیں کے ہاتھ خرچ ہوتا تھا۔ سیاہ وسپید کے مالک تھے، جو چاہتے انتظام کرتے، جس سے چاہتے سختی برتتے، جس سے چاہتے نرمی کرتے۔ نہ بیگم صاحبہ اتنی مہربان ہوں کہ اپنی بھانجی کے ساتھ، وہ منہ بولی ہی سہی، ان کا عقد کردیں۔ پھولے نہ سماتے۔ محاورے کے لحاظ سے نہیں بلکہ حقیقتاً جب سے قمر بانو سے شادی ہوئی تھی پچھلی شیروانیاں تنگ ہوگئی تھیں اور داروغہ جی کا وزن دُگنا ہو گیا تھا۔

بیوی خوبصورت بھی تھی، مطیع بھی اور خوش سلیقہ بھی۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد جب داروغہ جی گھر واپس آتے تو وہ پھول کی طرح کھل جاتی۔ خود اُن کے منہ ہاتھ دھلانے کا انتظام کرتی۔ خود ہی جلدی سے چائے ناشتہ لاکر سامنے رکھتی، اور اصرار کر کے اُنھیں ایک کی جگہ چار پوریاں کھلا دیتی۔

اتنا ہی نہیں بلکہ گھر میں ہر چیز سلیقہ سے اپنی جگہ صاف شفاف آئینہ سی چمکتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ کبھی یہ نہ معلوم ہوتا کہ معمولی اوسط درجے کی آمدنی والے کا گھر ہے، یا یہ کہ ان داروغہ جی کا گھر ہے جو رشوت اور تنخواہ ملا کر سوسوا سو مہینہ پیدا کر لیتے ہیں، بلکہ ایسا محسوس ہوتا کہ کسی ہزار ڈیڑھ ہزار کمانے والے کی کوٹھی ہے۔ خود قمر بانو کی صفائی کی یہ حالت کہ ہر روز کپڑا بدلنا ضروری تھا۔ ہر وقت حسن کے تمام اسلحوں سے آراستہ رہتی تھی۔ جب داروغہ جی دیکھتے دل بے اختیار چاہتا کلیجے میں بھر لو۔ چنانچہ دونوں حد درجہ خوشی اور مسرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔

داروغہ جی کو قمر بانو میں سوائے دو باتوں کے کوئی ایسی بات نہ ملی جو ذرا بھی ان کے مزاج کے خلاف ہوتی۔ مگر یہ باتیں بھی معمولی تھیں۔ اوّل تو وہ ہر دوسری تیسری شام کو کسی نہ کسی سکھی سے ملنے ضرور جاتی، اور دوسرے وہ جواہر نگار زیورات کی بے حد شائق تھی۔ شروع شروع میں تو وہ ذرا اس کے آنے جانے میں روک تھام کرتے رہے، پھر انھوں نے اس کی صحت کے خیال سے یہ بھی ترک کر دیا۔ دل میں کہتے غریب دن بھر گھر میں بند رہتی ہے۔ دم اُلجھتا ہوگا۔ شام کو ذرا اِدھر اُدھر ہو آئی، تفریح ہو گئی۔ پھر ماشاء اللہ شہر کے ہر محلے میں اُس کے عزیز و اقارب ہیں، نہ ملے گی تو کیا کرے گی۔ بیوی جو اتنی خدمت کرے، اتنی مطیع ہو، اتنی نیک ہو، وہ اتنی آزادی کی بھی مستحق نہیں کہ وہ ہفتہ میں دو ایک بار اپنی سہیلیوں اور عزیزوں سے مل آئے۔

دوسری بات جو شروع شروع میں داروغہ جی کو کھٹکی وہ قمر بانو کا جواہر نگار زیورات کا شوق تھا۔ کوئی مہینہ ایسا نہ خالی جاتا جس میں وہ کوئی نہ کوئی ایسی چیز پھیری والے سے نہ خرید لیتی تھی۔ یہ کہتے ”بھئی اس طرح پیسے پھینکنے کا کیا نتیجہ۔ جب اللہ نے ہمیں اتنا نہیں دیا کہ تم سچے جواہرات پہن سکو، تو یہ جھوٹے نگ، جھوٹے موتی، شیشہ اور ایمی ٹیشن پہننے کا کیا نتیجہ؟ ماشاء اللہ تمھاری عصمت تمھارے حسن کو یونہی چار چاند لگائے ہوئے ہے۔ ان جھوٹے شیشوں کی کیا حاجت ہے؟“

وہ اِس پر مسکرا کر کہتی ”صاحب میں کیا کروں۔ مجھے جواہرات سے عشق ہے، سچّے نہ سہی جھوٹے ہی سہی۔ مَیں اپنی فطرت کیسے بدل دوں۔

یہ کہتی جاتی اور اُس ہار سے کھیلتی بھی جاتی، جس میں بڑے موتی اس طرح کے آویزاں تھے کہ ہر ایک ہزار ہزار روپے سے کم کا نہ معلوم ہوتا۔ پھر نہایت سادگی سے کہتی ”دیکھیے یہ کتنے خوبصورت ہیں۔ بالکل اس طرح کا آب ہے، جیسے سچے ہی ہیں۔“

داروغہ جی اس دوہرے وار کا جواب سوائے مسکرانے کے اور کیا دے سکتے تھے؟ چپ ہو جاتے۔ اور اگر انہوں نے کبھی کچھ کہا بھی تو اپنے دل ہی سے ”بھئی بچپنا مزاج میں کوٹ کر بھرا ہے۔ نہیں مانتی۔ کیا کریں۔ اور بھئی اگر عورت میں اتنا بچپنا بھی نہ ہو تو وہ محبت کرنے کے قابل ہی نہیں۔“

کبھی کبھی شام کو وہ بڑے احتیاط سے اپنے انھیں جواہرات کا صندوقچہ اُٹھا لاتی۔ اور کبھی سُرخ عقیق کا گلوبند نکالتی۔ کبھی زمرد کی انگوٹھیاں، کبھی ہیرے کی چوڑیاں۔ اور انہیں روشنی میں چمکا کر اُن کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دیتی اور خوب کھلکھلا کر ہنستی۔ پھر کمر لچکا کر آگے

بڑھتی اور اپنے نازک نازک ہاتھوں سے انہیں کی پیشانی پر ٹیکہ لٹکا کر موتیوں کی لڑی ان کے بڑے بڑے بالوں میں پھنسا دیتی، پھر دونوں کانوں میں بندے لٹکا کر خوب ہنستی۔ اور کہتی "اِس داڑھی مونچھ پر اور یہ زیور! کیا صورت ہوگئی ہے، واہ واہ واہ!" اور جب یہ چیں بجبیں ہوتے تو ان زیوروں کو اُتارتے اُتارتے گود میں بیٹھ جاتی اور گلے میں بانہیں آویزاں کردیتی۔ اب داروغہ جی مسکراتے نہ تو کیا کرتے؟

غرض یہ قمر بانو کو باوجود اس کے ان دو کمزوریوں کے دل سے پیار کرتے اور روز روزان کی محبت بڑھتی جاتی، کہ ایک روز شام کو دسمبر کے مہینہ میں وہ کسی کے یہاں ملنے گئی۔ تھوڑی دیر میں گھنگھور گھٹا آئی اور چمک اور گرج کے ساتھ آئی۔ مینہ برسا اور جم کر برسا۔ کئی گھنٹے کے بعد جو ذرا بوندیں کم ہوئیں تو بیگم صاحبہ کے یہاں سے لپکے ہوئے سردی سے ٹھٹھرتے گھر پہنچے۔ وہاں دیکھا تو بیوی ابھی تک واپس نہیں آئی، سخت پریشان ہوئے۔ نہ معلوم کہاں گئی، کس حالت میں ہے۔ کہیں بھیگی نہ ہو۔ اگر یہ جانتے کہ کس کے یہاں گئی ہے تو کہلا بھیجتے "وہیں رُک جاؤ۔" عجیب بے بسی تھی اور عجیب پریشانی کہ پانی پھر بڑھا۔ اب کی اولے بھی پڑنے لگے۔ خداوند تُو رحم کرنا۔ تُو ہی اسے عقل دینا کہ اس آفت میں گھر سے نہ نکلے۔ دعا ہی مانگ رہے تھے کہ کہار ڈولی لے کر پہنچے۔ اُتری تو دیکھا کہ سر سے پاؤں تک بھیگی ہوئی ہے۔ پانی سے شرابور، سردی سے یہ حالت کہ دانت بول رہے ہیں۔

خفا ہو کر پوچھا "اِس آفت میں آنا ہی کیا ضرور تھا، وہیں رُک جاتیں۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "اور آپ جو پریشان ہوتے؟"

بس سارا غصّہ دُھل گیا۔ جلدی جلدی کپڑے بدلوائے۔ رضائی خود ہی جلد جلد اُڑھائی، انگیٹھی میں آگ پلنگ کے قریب رکھوائی۔ مگر دونوں مل کر بھی فطرت سے جنگ میں کامیاب نہ ہوئے۔ دھان پان تو تھی ہی۔ دسمبر کی سردی اور اولے اپنا بھرپور وار کر گئے۔ تھوڑی دیر میں بخار چڑھ آیا۔ بلغم نے سینے میں گھر کیا، اور ایک ہفتہ میں قمر بانو داروغہ جی کا نرم نرم بستر اور اپنے چمکتے جواہرات سب کچھ چھوڑ کر خاک میں سو رہی۔

داروغہ جی نے حد سے زائد رنج کیا۔ مہینوں ایسا ہوا کہ تین تین وقت کھانا نہ کھایا، ہر وقت روتے رہے۔ بیگم صاحبہ کے یہاں کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ کام کاج، ملنا جلنا سب کچھ ترک کیا۔ بیوی کی تمام چیزیں ایک علیحدہ کمرے میں بند کر دیں۔ صبح اُٹھ کر خدا اور رسول کو یاد کرنے کی جگہ اسی کمرے میں جا کر بیٹھتے۔ خوب آنسوؤں سے منہ دھوتے۔ پھر بیوی کی قبر پر چلے

جاتے۔ وہاں بیٹھے رہتے۔ دوپہر تک وہاں سے واپس آتے۔ گھر پہنچ کر منہ لپیٹ کر پڑے رہتے۔ نوکروں میں سے کسی نے اگر بے حد خوشامد کی تو تھوڑا بہت کھالیا ورنہ وہ بھی نہیں۔

لیکن اس طرح کی زندگی وہی بسر کرسکتا ہے جس کے یہاں خزانہ دفن ہو، یا بینک میں بہت سا جمع ہو۔ ان کے یہاں تھا ہی کیا۔ بس نوکری کا سہارا تھا، وہ بھی چھوڑ دی تھی۔ ایک مہینہ ہی میں گھر کا اثاثہ بکنے لگا۔ آہستہ آہستہ نوکر بھی کھسکنے لگے۔ ماما، دائیوں نے بھی اپنے اپنے گھر کی سدھ بھری۔ وفا پیٹ بھروں سے ہوسکتی ہے، مزدور بھلا کیا کریں گے؟ ہر ایک نے اپنا اپنا ٹھکانا ڈھونڈا۔ اب یہ بالکل اکیلے دَم رہ گئے۔ مگر پھر بھی سینکڑوں روپے ماہوار خرچ کرنے کے عادی تھے، ساری چیزیں ایک ایک کر کے بیچ ڈالیں۔ البتہ قمر بانو کے کمرے میں ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ جب فاقے ہونے لگے اور وفورِ غم گھٹا تو اُس کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ اس کی یادگاریں بھی فروخت کرنے لگے۔ تھوڑے دِنوں ان کے سہارے بسر ہوئی۔ اب کچھ نہ رہ گیا۔ صرف وہ بکس تھا جس میں وہ جھوٹے موتیوں والا ہار، وہ شیشے والے زیورات رکھے تھے۔ حسرت سے دیکھتے اور دل ہی دل میں کہتے ''کاش ان میں سے کوئی شے اس عصمت مآب نے سچی خریدی ہوتی!''

ایک دن، جبکہ دو وقت ہو چکے تھے کہ ایک چاول بھی اُڑ کر ان کے منہ میں نہ پہنچا تھا، انھوں نے اس صندوقچے کو کھولا، اور اُس میں سے موتیوں کا ہار نکالا۔ سوچا کہ چلو کسی کو دکھائیں۔ پانچ سات روپے کی چیز ہوگی، ایک آدھ مل ہی رہیں گے۔ ایک جوہری کی دُکان پر پہنچے، ڈرتے ڈرتے پہلے رومال سے ہار نکالا اور اُسے دکھایا۔ اُس نے ان کی پھٹی حالت دیکھی، ہار کو دیکھا پھر سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں صاحب میں نہ لوں گا۔''

اُنھوں نے کہا ''بھئی اس کی قیمت تو آنک دو!''

اُس نے پھر ہار کو اُٹھا کر دیکھا، اور بولا ''پندرہ ہزار!''

ایسا معلوم ہوا پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ شاید ان سے مذاق کر رہا تھا۔ دل میں کبیدہ ہوئے۔ ہار اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ مگر بھوک ضبط سے باہر تھی۔ قیمتی ہو یا معمولی بیچنا ضروری تھا، شہر کے سب سے بڑے جوہری کے پاس پہنچے۔ اس نے ہار دیکھتے ہی کہا ''یہ تو میری ہی دُکان سے خریدا گیا تھا۔''

ان کو اب اس کے قیمتی ہونے کا یقین آ گیا۔ مگر یقین آتے ہی عرق عرق ہو گئے۔ نیچی نگاہیں کر کے پوچھا۔ ''کتنے کا ہے؟''

اس نے رجسٹر منگوایا۔ ڈھونڈھ کر نکالا۔ بولا۔ ''بیس ہزار کا ہے...اب موتیوں کا بھاؤ

گھٹ گیا ہے۔اس وقت اٹھارہ ہزار کی مالیت ہے۔''

اُنھوں نے خشک لب چاٹے، پھر بولے۔''مَیں بیچنا چاہتا ہوں۔''

اُس نے رجسٹر پھر بغور دیکھا اور پوچھا''آپ کو کیسے ملا؟''

اُنھوں نے آہستہ آہستہ رُک رُک کر اس طرح جواب دیا، جس طرح مجرم اقرارِ جرم کرتا ہے۔''یہ میری بیوی قمر بانو کا ہے۔وہ مرگئیں!''

اس نے سر ہلا کر کہا۔''ہاں انھیں کے لیے خریدا گیا تھا..تو اگر آپ بیچنا چاہتے ہیں تو دو گھنٹہ بعد آیئے۔میں ذرا تحقیق کرلوں...اور ہار یہیں چھوڑ جایئے۔''

اُنھوں نے رسید لے لی اور دُکان سے باہر چلے آئے۔دنیا آنکھوں میں تاریک تھی۔جس کی عصمت کی قسم کھا سکتے تھے، جو مجسمۂ عفت تھی وہ اِس طرح کی...چکّر آنے لگا اور ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی دَم گھوٹے دیتا ہے۔غش کھا کر گر پڑے۔

ہوش آیا تو خود کو ایک انگریزی دواخانے میں بنچ پر لیٹا پایا۔ڈاکٹر نے نبض دیکھ کر نقاہت اور کمزوری کے رفع کرنے کے لیے دوا پلا دی۔عادتاً جو جیب میں دام دینے کے لیے ہاتھ گیا تو وہاں پیسہ کہاں؟ بڑی تکلیف ہوئی۔معاً ہار یاد آیا۔اور بیوی...مسکرانے اور شکریہ ادا کرکے لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے۔پھر جوہری کے یہاں پہنچے۔اُس نے ان پر ایک تیز نظر ڈالی۔پھر بولا۔''میں نے دریافت کرلیا۔کیا آپ اُسے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔''

اُنھوں نے سر ہلا کر کہا''ہاں!''

اُس نے تجوری کھولی،اور اٹھارہ ہزار کے نوٹ انھیں گن دیے۔یہ نوٹ جب جیب میں رکھ چکے تو نظر فرش پر جمائے اس طرح بولے''ان کے اور بھی جواہرات ہیں...لے آؤں۔''

اُس نے کہا:''ہاں،ہاں،خوشی سے!''

دوسرے دن پورا صندوقچہ اُٹھالائے۔ساری چیزیں دکھائیں۔ہر چیز قیمتی تھی۔کل ایک لاکھ سے زیادہ کی مالیت نکلی۔انھوں نے سب کی سب خرچ کر ڈالیں۔

اُس روز شب میں پہلی دفعہ گھر کے باہر ایک غیر عورت کے پہلو میں سوئے۔شب بھر موقع بے موقع کھلکھلا کر ہنس پڑتے تھے۔سوال پر ہمیشہ یہی جواب دیتے تھے۔''غلط فہمی، غلط فہمی! لیکن ازالۂ غلط فہمی کی قیمت سوا لاکھ!'' اور ہر مرتبہ اس طرح کی بھیانک ہنسی ہنستے تھے کہ پوچھنے والی کو ان کے توازنِ دماغی کے بارے میں شبہ ہونے لگتا تھا! (کچھ ہنسی نہیں اور......۱۹۳۲ء)

❀❀

امتحانِ قدرت

نعیم اور محمود کی ملاقات کچھ آج کی نہ تھی۔ تقریباً پندرہ برس سے دونوں میں بے تکلفی کی دوستی تھی۔ تعارف کا ذریعہ نواب احسان علی خاں بنے تھے۔ محمود اُس زمانے میں اُن کی مصاحبت کے فرائض انجام دیتا تھا اور اصل میں اُن کا درباری مسخرہ تھا۔ یہ بھی عجیب وغریب پیشہ ہے۔ اس کی انجام دہی انسان کو ذلیل ترین حرکات کرنے پر اس لیے مجبور کرتی ہے تاکہ اس کے ولی نعمت کے کریہہ چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دے۔ پیٹ کا مارا محمود کبھی گدھا بنتا، کبھی خچر، کبھی طرح طرح کی چڑیوں کی بولی بولتا۔ دن رات نئے نئے فقرے تراشتا، نئی نئی پھبتیاں سوچتا۔ اسی پر اکتفا نہ ہوتی، بلکہ جہاں ولی نعمت اور ولی نعمت کے ساتھیوں کا ہنسانا فرض تھا، وہاں ولی نعمت کے بے نمک فقروں پر ہنسنا اور اکثر جھینپنا بھی ضروری تھا۔

ہندوستانی امیروں کا دربار فحش بازی کے لیے مشہور ہے۔ اُن کے ہاں مزاح کے معنی مذاق اور مذاق کے معنی گالیاں ہیں۔ محمود کو مسخرگی کی بدولت دن رات میں سینکڑوں گالیاں سننا پڑتیں اور ہزاروں پھبتیاں، پھر اسی کے ساتھ یہ بھی خیال کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ نواب کو کوئی بات ناگوار گزرے اور روٹیوں کا سہارا بھی جاتا رہے۔ لوگ کہتے محمود چکنا گھڑا ہے، اس پر کسی فقرے کا بھلا اثر ہوتا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ خاکستر میں چنگاریاں بعض وقت دَبی ہوتی ہیں اور گرد میں سوار، اور گدڑی میں لعل بھی ہوتے ہیں۔

نعیم صاحب نے پہلے ہی دن کی ملاقات میں محمود کی آنکھوں کا درد دیکھ لیا انہوں نے محسوس کرلیا کہ محمود کی ہنسی کے اجزائے ترکیبی میں نالہ ہائے نیم شبی بھی داخل ہیں۔ اسی لیے انہوں نے پہلے ہی دن سے محمود سے قدرے خلوص برتا اور اس کی دستگیری اپنا شعار بنالیا۔

محمود کو اس دستگیری کی ضرورت بھی تھی۔ دس روپیہ کا ملازم سرائے میں قیام، بی بھٹیارن

نئے نئے طریقوں سے اس سے موعود مقدار سے کہیں زیادہ پیسے وصول کرلیتی تھیں۔ کھانے کا چار روپیہ مہینہ اور کمرے کا ایک روپیہ ماہوار طے تھا۔ لیکن بی بھٹیارن کے یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی ایسا حادثہ پیش آجاتا کہ محمود کو اُن کی مدد کرنا پڑتی۔ کبھی کوئی عزیز قریب مرجاتا اور غمی میں شرکت کے لیے اُن کے پاس یکہ کے کرایہ کے پیسے نہ ہوتے۔ کبھی کوئی بدمعاش اُن کی ٹوٹی پتیلیوں میں سے ایک کھسکا دیتا۔ غرض طرح طرح کی آفتیں آتی رہتی تھیں اور محمود کا نرم دل ایک عورت کو ان آلام میں گرفتار نہ دیکھ سکتا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ پانچ روپیہ میں مٹی کا تیل، دھوبی کی دُھلائی ملنے والوں کے لیے پان تمباکو پھر اس پر حقوق ہمسایہ کتنے کام انجام پاسکتے تھے؟ چنانچہ غریب محمود اکثر مقروض رہتا تھا۔

مگر یہ عجیب بات تھی کہ جتنی پریشانیاں بڑھتیں، اتنی ہی محمود کی ہنسی بڑھتی۔ جب اطمینان ہوتا تو مسکراہٹ متانت کے ساتھ خراماں خراماں چہرے پر آتی، لیکن جب جیب خالی ہوتی تو ہنسی چہرے پر دوڑتی پھرتی۔ نعیم کو اُس کی یہ ادا خاص طور سے پسند تھی۔ جہاں وہ زیادہ ہنسنا شروع کرتا یہ تاڑ جاتے۔ طرح طرح کی خاطریں کرتے۔ نواب کے یہاں سے کسی نہ کسی بہانے سے اُٹھا لاتے اور بڑے اصرار سے اپنے ساتھ کھانا کھلاتے۔ چلتے وقت چپکے سے ایک آدھ روپیہ جیب میں ڈال دیتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ محمود نعیم کی اس شرافت اور محبت پر ہنسنے کی جگہ رونے لگتا۔ لیکن نعیم نے ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا۔ ”بھائی محمود اگر اتنی سی بات میں بھی غیریت برتو گے تو دوستی کیسی؟ ارے میاں آج میں تمھاری خدمت کرسکتا ہوں، ممکن ہے کہ کل مجھ پر کوئی آفت آئے اور تم کام آسکو!“

محمود اس گفتگو پر ’شیر اور چوہے‘ والا قصہ یاد کرکے رونے میں بالکل اسی طرح ہنس دیتا جیسے پانی برسنے میں دُھوپ نکل آئے!

محمود کو پٹنہ چھوڑے ہوئے آٹھ دس برس ہوچکے تھے۔ اس زمانہ میں وہ معلوم کہاں کہاں کی خاک چھان چکا تھا، کلکتہ، بمبئی، مدراس، راجپوتانہ، کشمیر، ہندوستان، کے ہر گوشے میں ٹھوکریں کھائیں سینکڑوں نوکریاں اور صدہا پیشے کیے۔ کبھی ٹریم پر ٹکٹ کلکٹری کی تو کبھی موٹر پر صفائی کا کام، کہیں بچوں کی اتالیقی کرنا پڑی تو کہیں پر بیڑی سگریٹ بیچ کر گزرِ اوقات کا وسیلہ ہاتھ آیا۔ غرض بیس برس بعد لکھنؤ اپنے وطن پلٹنا نصیب ہوا۔

جس شخص نے دنیا کا اس قدر سرد و گرم دیکھا ہو، جو ملک کے بڑے سے بڑے امراء و رؤسا کے درباروں میں بیٹھا ہو، جس نے ملک کے بدمعاش ترین خطّہ کے ساتھ عمر کا خاصا حصّہ کاٹا ہو، اُس کے متعلق یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بہت ہی نیک آدمی تھا۔ نہ کبھی اُس نے جھوٹ بولا، اور نہ کبھی بے ایمانی کی۔ محمود کے متعلق جو دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ وہ صرف اتنا ہے کہ وہ انسان تھا اور باوجود مختلف طرح کی کمزوریوں کے اس میں بہت کچھ حمیت تھی، بہت کچھ شرافت تھی اور سب سے بڑی بات، اس کے دل میں بہت سا درد تھا۔

وہ اس حقیقت سے خوب آگاہ ہو چکا تھا کہ آج کل کی دنیا میں نہ تو فرشتے ہوتے ہیں اور نہ مجسم شیطان، پاجی سے پاجی آدمی میں شرافت کی جھلک ہوتی ہے اور نیک سے نیک لوگوں میں بُرائی کا شائبہ۔ اُس کے لیے پتھر میں ہیرا اور سیب میں کیڑا کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں کی پروا نہ کرتا، بلکہ ان کے نفس اور ان کی طینت پر نگاہ رکھتا۔

نعیم کے متعلق وہ اتنا جانتا تھا کہ پٹنہ میں اگر کوئی ایسا شخص ہے جس نے اُسے انسان سمجھا تو وہ صرف ایک وہی ہے۔ وہ اِس سے واقف تھا کہ نعیم قدرے منچلا ہے۔ اسے حسنِ نسوانی کی کشش مجنوں بنا دیتی ہے اور اس کی صحبت زیادہ تر رنگین ہے لیکن وہ ان تمام اُمور کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتا اور صرف اتنا یاد رکھتا کہ نعیم نے اس پر ہمیشہ احسان کیا، اور باوجود ایک متمول رئیس ہونے کے اس سے بھائیوں کا سا برتاؤ کیا پھر بھی محمود اپنی حیثیت سے واقف تھا۔ اور محسن و احسان مند کے تفاوت کو جانتا تھا۔

اسی بنا پر جب اُس نے اپنے محسن کو بالکل ایک جنٹل مین کی طرح ایک ہندوستانی عورت کے ساتھ بیلی گارڈ میں ٹہلتے دیکھا تو اس نے صرف ایک گائڈ کی حیثیت سے سلام کرنے پر اکتفا کی۔ دل میں خیال تھا۔ نعیم صاحب اگر مناسب سمجھیں گے تو پہچانیں گے۔ ورنہ دوستی کی گرم جوشی کی جگہ رہنمائی کے خشک غیر جذباتی فرائض سہی، لیکن نعیم صاحب اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر بولے۔ ”بھئی محمود خوب ملے۔ کیا آج کل یہاں بیلی گارڈ میں رہنمائی کرتے ہو؟“

محمود نے مسرور ہو کر جواب دیا۔ ”جی ہاں آج کل یہیں ہوں۔“

نعیم نے کہا۔ ”یار، تم خوب ملے۔ ہم لوگ بھی لکھنؤ گھومنے ہی آئے ہیں۔“

محمود بھلا اب کہاں چپ رہنے والا تھا، جذبات کی موجوں میں زبان چھوٹی سی کشتی کی طرح بہ چلی۔تو بھلا مجھ سے بہتر اس کام کو کون انجام دے سکتا ہے۔آصف الدولہ کا امام باڑہ حسین آباد گھنٹہ گھر، کمپنی باغ، لوہے کا پل، چھتر منزل، قیصر باغ، حضرت گنج سکندر باغ، کون ایسا مقام ہے جس کے کونے کونے سے میں واقف نہیں ہوں۔شام اودھ دیکھنا ہو تو اکبری دروازے سے چوک میں داخل ہو جیے۔تماشائیوں کی چہل پہل دیکھیے۔جاڑوں میں شالی چادریں کندھوں پر پڑی ہوئی، لوگ بانکے بنے چلے آرہے ہیں۔چائے کی دُکانیں سجی ہوئی ہیں۔سپید سپید پیالیوں میں عنابی رنگ کی چائے اُس پر بالائی پڑی ہوئی۔گرم اتنی کہ ایک گھونٹ پینے میں جہنم کے فرشتوں کے ہونٹ جلیں، گرمیوں میں اُنہیا نہیں دُکانوں پر شربت و فالودہ۔ہر ایک پیالہ اتنا یخ کہ کرۂ زمہریر کے رہنے والے چھوتے ہی ٹھنڈے ہو جائیں پھر سرد۔ ہمسایہ مفت کا پریوں کا نظارہ دکھاتے ہیں! اگر جدت پسندوں کی تراش خراش، کوٹ پتلون کی نوک پلک دیکھنا ہو تو امین آباد اور حضرت گنج کی سیر کیجیے۔موٹروں کی وہ افراط کہ الامان والحفیظ! جسے دیکھیے کالا ہو یا گورا، ایک پٹے کٹی بغل میں بٹھائے لیے اُڑا جاتا ہے۔پھر سینما میں 'پرنس آف ویلز' پلازا کیپٹل 'الفنسٹن'، 'رائل یونیورسل' کبھی لاری میں اشتہارات تقسیم ہو رہے ہیں، تو کبھی مسخروں کی برات کی شکل میں۔کہیں پر مس فیروزہ ناچتی ہیں تو کہیں پر مس گلزار۔غرض کیا بتاؤں۔لکھنؤ سی جگہ آپ سا دیکھنے والا، مجھ سا دکھانے والا، واللہ ایسی ایسی چیزیں دکھاؤں کہ یہ نہ معلوم ہو کہ دن کب تمام ہوا، اور رات کب ختم ہوئی!"

نعیم ہنس کر بولے۔"یاران چیزوں کے دیکھنے سے زیادہ تو تمھاری باتوں میں مزہ آ گیا۔بس اب لکھنؤ کی سیر تمھارے ساتھ ہی ساتھ ہو گی۔"

وہ عورت جو نعیم کے ساتھ تھی۔چپکی کھڑی مسکرایا کی محمود بھی نثر میں شاعری کرتا جاتا اور اسے کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔اگر اسی کے الفاظ میں اس کی تصویر کشی کی جائے تو وہ معمولی انسانوں کی صفوں سے نکل کر قاف کی پریوں میں شامل ہو جائے گی اس کا بیان ہے کہ گلاب کی پنکھڑیوں کو نچوڑ کر سونے میں ملایا تھا۔اس میں ہلکا سا شہاب شامل کر کے ایک خاص رنگ تیار کیا تھا، جس سے اس کے گال بنائے تھے۔اسی لیے ان میں کندن کی زردی بھی تھی اور گلاب کی سُرخی بھی۔پھر گیں تھیں یا زمرد کی قلمیں، آنکھیں غزالوں کی طرح بڑی تھیں۔لیکن ان میں

چمک ویسی تھی جیسے گل بنفشہ پر شبنم کا قطرہ جو سورج کی اوّلیں شعاعوں میں درخشاں ہو۔اس کے ہونٹوں کی کیفیت اور تکلّم میں ان کی حالت اس شخص کے فہم سے باہر ہے۔جس نے گلاب کی کلی کو اپنی آنکھوں سے کھلتے نہ دیکھا ہو۔اس کی چال میں کبک خرامی کے ساتھ ساتھ رم بھی تھا اور جسم میں سرو کی استقامت کے ساتھ بید کی لچک بھی۔جب محمود سے لسان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ کم ہو جاتا تو وہ جھوم جھوم کر کہتا:

گل رخش، سرو قدش، غنچہ لبش، نرگسِ چشم

از بہار آنچہ بجا ماند، تنے ساختہ اند

محمود نے سلسلہ گفتگو ختم ہونے پر اس حسن کے مجسمہ کو نگاہ غلط انداز سے دیکھا۔پھر نعیم پر سوالیہ انداز سے نظر کی۔انھوں نے کچھ گھبرائی ہوئی آواز میں کہا: ''یہ...ایں...ایں...تمھاری نئی بھابھی ہیں!''

محمود نے کچھ جھینپ کر 'نئی بھابھی' کو سلام کیا۔انھوں نے شرما کر جواب دیا۔نعیم مسکرائے پھر بولے۔''اچھا میاں محمود تو آج تو تم ہم لوگوں کو بیلی گارڈ کی سیر کراؤ۔پھر شام کو ہوٹل میں ملو اور وہیں ہفتہ بھر کی سیر کا پروگرام تیار ہوگا۔

اُس دن ایک گھنٹہ سے زیادہ محمود ریزیڈنسی کا چپہ چپہ دکھاتا رہا اور اس نے نہ معلوم کتنے سچّے جھوٹے قصّے نعیم صاحب اور ''نئی بھابھی'' کو سنا ڈالے۔وہ فطرتاً نثر کا 'بدیہہ گو' تھا۔جب اِس طرح کا زریں موقع ہاتھ آئے تو پھر زبان قینچی کی طرح کیوں نہ چلے اور اشعار منثور کی سینکڑوں لڑیاں کیوں نہ تیار ہو جائیں؟

ایک ہفتہ نعیم صاحب کا قریب قریب رات دن ساتھ رہا۔بھلا اس یار باشی میں ریذیڈنسی کی رہنمائی کے فرائض کب یاد رہ سکتے تھے! اس لیے وہاں سے ''فرانسیسی چھٹی'' لے لی۔نعیم صاحب کو لکھنؤ کا گوشہ گوشہ دکھا ڈالا۔نئی بھابھی سے پہلے بے تکلفی ہوئی پھر اختلاط بڑھا۔پھر اختلاط نے کشش کی صورت اختیار کی، وہ جذبہ میں منتقل ہوئی اور بالآخر اس جذبہ کی وسعت وعمق کی سرحدیں عشق کے لامحدود دائرے میں منتقل ہو گئیں۔

لیکن وہی خاکستر میں دبی ہوئی چنگاری، وہی مبالغہ، جھوٹ اور ریا میں چھپی ہوئی حمیت آڑے آئی۔وہ جانتا تھا کہ صفیہ نعیم صاحب کی کس طرح کی بیوی ہے۔وہ ان کی خاندانی

روایات اور طرزِ معاشرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ لیکن جب وہ صفیہ کو بالا علان 'اپنی بیوی' کہتے تھے تو پھر محمود کو اس کا کیا حق تھا کہ وہ اُسے اپنے محسن نعیم کی ناموس نہ سمجھے؟ چنانچہ محبت دل ہی دل میں بڑھتی رہی، آگ اندر ہی اندر سلگا کی، لیکن محمود نے خود اپنے دل سے اس جذبہ کے وجود کا اقرار نہ کیا اور اپنے افعال و حرکات سے کسی کو کسی عنوان مشتبہ نہ ہونے دیا۔

ایک روز صبح کو وہ حسبِ معمول ہوٹل پہنچا تو نعیم صاحب نے بہت لمبا چہرہ بنا کر اس سے کہا۔ ''یار محمود کیا کہوں کل بمبئی سے تار آیا ہے کہ میرے ایک عزیز قریب وہاں بیمار ہیں۔ مجھے جلد سے جلد وہاں پہنچنا چاہیے۔

محمود نے کہا۔ ''ہاں ہاں، یقینی تو اسباب باندھا جائے؟''

نعیم نے کہا۔ ''ہاں جی وہ تو باندھا بھی جائے گا۔ دقت یہ ہے کہ مَیں تمھاری بھابھی کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ بیماری کا معاملہ ہے۔ خدا جانے کیا مصیبت پڑے کیا نہ پڑے۔''

محمود نے کہا: ''تو کیا انھیں پٹنہ پہنچا آؤں؟''

نعیم تھوڑی دیر سر کھجایا کیے پھر بولے۔ ''نہیں یار! ان کا تمھارے ساتھ جانا اچھا نہیں، مَیں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ انھیں یہیں تمھاری حفاظت میں چھوڑ جاؤں۔''

محمود نے اپنے استعجاب کو چھپا کر جلدی سے کہا۔ ''تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں... شاید آپ کے دل میں کوئی اور خیال... ہو تو میں آپ سے یہ قسم کہتا ہوں کہ میں اُن سے اسی طرح... پیش آؤں گا جس طرح اپنی حقیقی بہن سے...''

نعیم نے بات کاٹ کر کہا۔ ارے یار بیکار کی قسمیں کیوں کھا رہے ہو۔ تم پر شک کس مردود کو ہے۔ میں تمھاری طبیعت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مجھے ان باتوں کا مطلقاً خیال نہیں، مجھے جس اَمر کی فکر ہے وہ یہ ہے کہ میرے پاس اس وقت اتنے روپے نہیں کہ اُن کے لیے کافی خرچ دے جاؤں۔''

محمود نہایت بے پروائی سے بولا۔ ''اونھ روپیہ پیسے کی کیا فکر۔ مَیں موجود ہی ہوں سب انتظام ہو جائے گا۔ آپ مطمئن رہیں۔''

غرض اسی دن شام تک کرایہ کا ایک مکان لے لیا گیا۔ ایک بوڑھی ماما ڈھونڈھ لی گئی اور صفیہ نئے مکان میں اُٹھ آئی۔ دس بجے شب کی گاڑی سے نعیم صاحب بمبئی میل پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن تک محمود اور صفیہ بھی گئے تھے۔ صفیہ کی حالت دن ہی سے قابلِ افسوس تھی۔ چہرہ

زرد آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے، بات بات پر آنسو نکلے پڑتے تھے، اسٹیشن سے واپسی پر محمود نے پچیسیوں فقرے چست کیے اور بیسیوں لطیفے بیان کیے تب جا کر صفیہ کے چہرے پر قدرے مسکراہٹ دکھائی دی پھر بھی غم کی گھٹا اتنی تاریک تھی کہ یہ مسکراہٹ بھی محض ایک لمحہ کے لیے چہرے کو چمکا سکی۔ محمود کی یہ حالت کہ جتنا ادھر اضمحلال بڑھتا اور افسردگی میں اضافہ ہوتا اتنا ہی اُسے اس اَمر کا احساس ہوتا کہ صفیہ اور نعیم کی محبت معمولی نہیں۔ جدائی کی چند گھڑیاں بھی سخت ترین مصیبت بن گئی تھیں۔ اسی کے ساتھ اس کی ذمہ داری اور اس کے وعدہ کا ایفا دونوں حد درجہ اہم ہو گئے تھے۔ قدم ڈگمگا رہے تھے، پاؤں کے نیچے کی زمین نکلی جا رہی تھی، امتحان سخت تھا۔ سہارا صرف دنیا کی برائیوں میں دَبی ہوئی حمیّت کا! بس خدا ہی یہ کام انجام تک پہنچائے!

نعیم صاحب کو گئے ہوئے دو ماہ سے زیادہ گزر گئے۔ صفیہ کی افسردگی نے مستقل صورت اختیار کر لی۔ غم سے روز بروز گھلنے لگی۔ کھلتی ہوئی کلی مرجھانے لگی۔ محمود صبح و شام دل بہلانے جاتا۔ کبھی دیو پریوں کا قصہ کہتا۔ کبھی ظریفانہ چٹکلے بیان کرتا۔ کبھی مختلف جانوروں کی بولیاں بولتا۔ کبھی ان کے حرکات کی نقلیں کرتا۔ لیکن صفیہ اس پودے کی طرح جو ایک جگہ سے دوسری جگہ بے احتیاطی سے منتقل کیا گیا ہو سوکھنے لگی۔ ایک تو یوں ہی دھان پان، پھر غم کا بوجھ صحت خراب ہوئی، لکھنؤ کا تحفہ ملا، حرارت اور کھانسی شروع ہو گئی۔ محمود نے طبیبوں اور ڈاکٹروں کے پاس دوڑنا شروع کیا، نسخے لکھوانا دوائیں لانا، خود ہی کوٹ پیس کر تیار کرنا، پھر ہزار بہانوں سے پلانا روزانہ کے فرائض بنے۔

ایک دن جبکہ وہ معدن الادویہ سے دوا لے کر واپس آیا تو صفیہ سست پلنگ پر پڑی تھی۔ کلیجے پر تو تیر سا لگا لیکن ظاہر میں ہنس کر بولا۔ حکیم صاحب تو بہ قسم کہتے ہیں کہ اس دوا کی تین خوراک پیتے ہی ہنسنے لگیں گی، اور آپ ہیں کہ خواہ مخواہ کئی گز لمبا چہرہ بنا کر مجھے ڈرائے دیتے ہیں۔ واہ بھابھی واہ! کہیں بھائی صاحب ایسی حالت میں دیکھ لیں تو میں کہیں کا نہ رہوں!''

صفیہ بجائے اس کے کہ اس فقرے پر ہنسے یا مسکرائے رو دی۔ اور یہ جتنا اس کے ہنسانے کی کوشش کرتا رہا اتنا وہ روتی ہی گئی۔ بالآخر بولی۔ ''محمود میاں میں تمھاری سب باتیں سمجھتی ہوں۔ لیکن میں کمزور عورت ذات، بے بس ہوں کیا کروں۔''

محمود نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیوں بھابھی کیا ہوا۔ میں نے کون سا قصور کیا؟''

وہ بولی۔ ''کیوں میاں یہ تم دوا کہاں سے لاتے ہو؟ تم کو کس نے پیسے دیئے؟ تم دو مہینے سے جو میرا خرچ اُٹھائے ہوئے ہو تو یہ کیوں؟''

سوال سخت تھا۔ لیکن محمود گرگِ باراں دیدہ تھا۔ فوراً دروغ بیانی کی۔ بولا۔ ''آپ یہ کیا فرما رہی ہیں۔ مجھ بیچارے کے پاس اتنے پیسے کہاں؟ بھائی صاحب جاتے وقت روپے دے گئے تھے۔ وہی خرچ ہو رہے ہیں... کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے۔ آپ بتائیں میں لا دوں۔''

صفیہ نے چشم پُرنم سے کہا: ''میں خوب سمجھتی ہوں۔ نہ اب وہ آئیں گے اور نہ انھوں نے روپیہ دیا۔ آپ جی بھر کر جھوٹ بولیے۔''

محمود نے ذرا متین بن کر قسمیں کھانا شروع کیں، وہ چپ اُن کی صورت دیکھا کی۔ اصرار پر دوا بھی پی لی۔ جب جانے لگا۔ تو ایک خاص انداز سے پوچھا۔ ''آپ کو اُن کا پتہ معلوم ہے؟''

ذرا سر کھجا کر بولا۔ ''نہیں... لیکن مجھے یقین ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ دو تین روز میں اُن کا خط آیا ہی چاہتا ہے۔'' اُس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر منہ پھیر لیا۔ محمود نے پھر قسمیں کھانا شروع کر دیں۔ ''واللہ غلط نہیں ہو سکتا۔ بھابھی اپنے سر کی قسم جو جھوٹ کہتا ہوں۔''

اس نے صرف ایک فقرہ کہا اور پھر نہ بولی۔ ''جھوٹی قسمیں نہ کھاؤ۔ تمھاری جان ایسی تمام چیزوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔''

محمود نے سینکڑوں بار اس طرح کے جملے سُنے تھے، لیکن صفیہ نے آج جس انداز سے یہ فقرہ کہا تھا اس نے اُسے گونگا بنا دیا، وہ اپنے دِلی ہیجان سے اِس طرح گھبرایا کہ سوائے بھاگ آنے کے کوئی بات اُس کی سمجھ میں نہ آئی۔

راستہ بھر دل میں نعیم کو کوستا رہا۔ دماغ صفیہ کے خوش کرنے کی صورتیں سوچتا رہا، حکیم صاحب کی ملاقات نے اور پریشانیوں میں اضافہ کر دیا۔ وہ تانگہ پر کسی مریض کو دیکھنے جا رہے تھے۔ اسے دیکھ کر تانگہ رُکوایا اور قریب بلا کر کہنے لگے۔ ''بھئی محمود میں جتنا ہی مریضہ کی حالت پر غور کرتا ہوں، اتنا ہی مجھے اس اَمر کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ وہ کسی کی محبت میں گھلی جاتی ہے۔ وہ اِن عورتوں میں سے ہے جن کی زندگی پیار محبت، خوشی و مسرّت پر منحصر ہے۔ اس کی جان اگر بچانا چاہتے ہو تو اُسے خوش کرنے کی فکر کرو ورنہ دوا بیکار ہے!''

حکیم صاحب تو یہ نسخہ بتا کر چل دیئے، لیکن غریب محمود کو یہ دوا ملے کہاں؟ خوشی نہ تو کسی عطار کے یہاں ملتی ہے اور نہ کسی 'کمیسٹ ڈرگسٹ' کی دُکان پر! علاوہ بریں صفیہ کی خوشی صرف نعیم سے ملنے پر منحصر تھی۔ ان کا بلا لینا انسانی اختیار سے باہر۔ ہاں خط وسیلہ اور ذریعہ ہو سکتا تھا۔ اسے کہاں بھیجا جائے؟ عجیب مصیبت تھی۔ دل و جان سے زیادہ قیمتی صفیہ موت سے روز بروز قریب تر ہوتی جاتی تھی اور محمود بے بس!

اسی اُدھیڑ بن میں بیڑی کے لیے جو جیب میں ہاتھ ڈالا تو بیڑی ندارد۔ پان والے کی دُکان پر کچھ ایسے لفافے دکھائی دیئے۔ جن پر عراق و عرب کے ٹکٹ چسپاں تھے۔ چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ بیڑی نہ خریدی بلکہ جیب کے سارے پیسے دوسرے دُکاندار کی نذر کیے اور بڑی خوشامدوں سے استعمال شدہ ٹکٹ خرید لائے۔

گھر پہنچ کر لکھنے کی کوشش ہونے لگی۔ نعیم کے حرف سے حرف ملانے کی فکر علیحدہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کے بارہ بجے تک نہ معلوم کتنے خط لکھے اور پھاڑے گئے۔ بالآخر ایک مسودہ ہر صورت سے پسند آیا اور اسی وقت لفافہ میں لکھ کر بند کیا گیا۔ پھر لفافہ خاک میں بھرا گیا تا کہ ایسا محسوس ہو کہ بہت دنوں کا چلا ہوا ہے اور بہت دُور سے آیا ہے۔

صبح سویرے ہی صفیہ کے مکان کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ اندر سے ماما نے پوچھا کون؟ وہ آواز بدل کر بولے۔ 'ڈاکیہ' اور جلدی سے لفافہ ڈیوڑھی میں پھینک کے بھاگ آیا۔ تھوڑی دیر میں متین و سنجیدہ بن کر گھر میں گیا۔ ماما نے خبر دی، میاں کا خط آیا ہے پھر کیا تھا صفیہ سے مٹھائی مانگنے لگا۔ ''بس منہ میٹھا کیجیے۔ میں نہ کہتا تھا کہ خط آیا ہی چاہتا ہے!'' وہ ذرا مسکرائی اور اس کے گال گلابی ہو گئے۔ محمود بھی بلبل کی طرح چہکنے لگا۔ فقرے بھی چست ہوئے، جملوں کی روانی اور زبان کی طراری بھی عود کر آئی۔ بات بات پر ہنسی پھوٹ پڑی۔ اور موقع بے موقع دانت نکل پڑے۔ وہ مسکرا کر سب کچھ سنا کی۔ جب محمود چلنے لگا تو بولی۔ ''اس خط میں کہیں پتہ نہیں لکھا ہے۔ آپ کو معلوم ہے؟''

اب کی پہلے ہی سوچ بیٹھا تھا۔ ''ہاں ہاں'' آپ خط لکھ ڈالیں میں بھیج دوں گا۔

دوسرے دن صفیہ نے خط لکھ کر ایک سادہ لفافہ میں بند کر کے اسے دیا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ''بس اس خط کے پاتے ہی سرپٹ بھاگتے چلے آئیں گے۔ کیا مجال جو ایک منٹ رُکیں۔''

صفیہ نے محمود کی صورت مایوسی سے دیکھی اور منہ پھیر لیا۔ وہ بیٹھا تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی گپ لڑایا کیا۔ پھر اُٹھ کر چلا آیا۔

گھر آکر اسی سوچ میں پڑ گیا۔ کہ اس خط کا کیا حشر کیا جائے۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ کھول کر پڑھ ڈالیں لیکن یہ خیال کہ اِس میں نعیم سے اظہارِ محبت کے سوا اور لکھا ہی کیا ہوگا۔ مانع ہوا۔ علاوہ بریں دوسرے کے نام کا خط پڑھ لینا کوئی اچھی بات بھی نہ تھی۔ لہٰذا اسی طرح بند خط بستر کے نیچے پلنگ پر سرہانے کی طرف ڈال دیا گیا۔

دو تین روز عمداً جواب نہیں لکھا۔ پھر نعیم کی طرف سے جواب لکھا اور اسی طرح ڈاکیہ بن کر صفیہ کے مکان میں پھینک آیا۔ غرض اب خطوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے تو پوری زبان کا خیال اور دوسرے کے جذبات کی ترجمانی کا دھیان رہا۔ لیکن چند خطوں کے بعد قلم بھاگنے لگا۔ نعیم کے نام سے خود اپنے دلی جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ موجوں کے تلاطم سے بند ٹوٹا۔ مہینوں سے جو درد دل میں چھپا تھا، جس کے اظہار سے زبان جلتی تھی، وہ قلم نے صفحۂ کاغذ پر خونِ جگر سے لکھنا شروع کر دیا، اور ہر خط میں 'دلِ صد پارہ' کے لخت دکھائی دینے لگے۔

صفیہ نے بھی کئی ہفتہ خطوں کے لکھنے میں کوتاہی نہ کی۔ اور ہر خط کے جواب کا انتظار بڑے اشتیاق سے کرتی۔ لیکن یہ عجیب بات محمود کو محسوس ہوئی جب خط آتا تو اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا کہ جو بات اس نے پوچھی تھی اس کا جواب نہ ملا۔ جو چیز اُس نے مانگی تھی اُسے نہ ملی۔

ایک روز محمود سے کچھ شرمائی شرمائی کہنے لگی۔ ''مجھے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے مَیں اپنے خیالات کا صحیح طور پر اظہار نہیں کر سکتی۔ ذرا آپ میرے خطوں کو دیکھ لیا کریں۔ ممکن ہے کہ زبان کی غلطیاں ہوں۔ آپ انھیں صحیح کر دیا کریں۔

یہ کہہ کے اُس نے کھلا ہوا لفافہ بڑھا دیا۔ محمود کے دل سے نہ ہوا کہ وہ نعیم کے ساتھ اظہارِ عشق پر مشتمل خط پڑھے۔ اس نے بات بنائی اور ہنس کر کہا۔ ''بھابھی عشق و محبت کی زبان لکھنؤ اور دلّی کے محاوروں کی پابند نہیں۔ وہ تو صرف ونحو، علم معنی و بیان سب کے قواعد سے کہیں بلند ہے۔ آپ کے دل کی نکلی ہوئی بات بھائی صاحب نہ سمجھیں۔ ناممکن ہے بھلا اِس طرح کے خط پر بھی اصلاح دی جا سکتی ہے۔'' یہ کہہ کر ہنسا اور لفافہ کے گوند لگے ہوئے حاشیوں کو نم کر کے چپکا دیا۔ صفیہ نے ایک لمبی سانس لی اور کروٹ لے کر منہ پھیر لیا۔

اس واقعہ کے بعد سے صفیہ کی ناطاقتی اتنی بڑھ گئی کہ وہ پھر بستر سے نہ اُٹھی۔ حرارت اور کھانسی میں روز افزوں ترقی ہی ہوتی گئی۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دن اور ساعت کا انتظار ہونے لگا۔

ایک دن علی الصباح جب محمود آیا تو اس نے قریب بلایا، بڑی حسرت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے دیکھا کی۔ محمود ہنسوڑ محمود، لاکھ ضبط کرنے پر رونے لگا۔ اُس نے سر جھکانے کو اشارہ کیا۔ جب یہ بالکل منہ کے قریب کان لے گیا تو آہستہ سے بولی۔ ''روئیے نہیں، مجھے تکلیف ہوتی ہے... اگر ہنستے رہیے تو دم نکلنے میں... آسانی ہو!''

محمود نے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ صفیہ کا حکم تھا۔ کوئی مرچیں بھی آنکھوں میں لگا دیتا تو آنسو نہ نکلتے، خواہ مخواہ ہنسی بلائی گئی۔ لیکن وہ بھی روٹھے ہوئے بچوں کی طرح آغوش لب تک مچل مچل کر آئی، مرنے والی بھی مسکرادی، آنکھوں نے نہ معلوم کیا کیا ایک ہی نظر میں کہہ ڈالا۔ یکبارگی دیدے پھیلے اور پلکوں نے آہستہ آہستہ انھیں غلاف پوش کرنا شروع کیا۔ محمود کی ہنسی پھر بچّے کی طرح روٹھ گئی وہ گھبرا کر منہ کے قریب منہ لے جا کر دیکھنے لگا۔ لبِ لعلیں کھلے ہلکی سی آواز آئی۔ ''پیار... خط!''

پھر پھول کے سے ہاتھ پاؤں سُوکھے پان کی طرح اکڑ گئے۔ جسم میں اس طرح کی حرکت ہوئی جیسے خزاں دیدہ پتیوں میں نسیم کے جھونکے سے ہوتی ہے، ایک منٹ بعد حباب دریا سے ہم آغوش ہوگیا! گلاب کی بوند دوش ہوا پر کہیں سے کہیں جا پہنچی، اور اشہبِ زمانہ کی اڑائی ہوئی گرد کا ذرّہ خاک نشین ہوگیا۔

محمود نے جب اپنا بہت سا اساسہ رہن رکھ کر صفیہ کے کفن دفن سے فراغت پائی۔ اور بیمار صد سالہ کی طرح نیم جان گھر پلٹا تو دروازے پر ڈاکیہ ملا۔ نعیم صاحب کا خط تھا، لکھا تھا:

''پیارے محمود! صفیہ میری بیوی نہیں ہے۔ کلکتہ کی ایک یتیمہ، تعلیم یافتہ پڑھی لکھی ہے۔ اپنی زندگی سے اس قدر عاجز تھی کہ میرے ساتھ لکھنؤ چلی آنے پر راضی ہوگئی میں جن صاحب کی عیادت کو بمبئی آیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ عراق لیتے آئے۔ اگر ہو سکے تو تم صفیہ کے لیے کوئی بندوبست کردو۔ عورت بُری نہیں۔ نعیم۔''

محمود نے خط پڑھا۔ نعیم کو گالیاں دیں۔ اپنے کو بہت سا کوسا اور دیوانہ وار پلنگ پر جا کر گر پڑا، دری کے نیچے کاغذات کھڑکھڑائے۔ صفیہ کے بند خطوط نکالے۔ انھیں ایک ایک

کر کے گنا، تعداد میں سترہ تھے، خیال آیا، اس غریب کو دیکھو، کتنی محبت کرتی تھی۔ پھر بھی بیوفا لکھتا ہے۔ ''عورت بُری نہیں۔'' پھر آخر مجھ سے وعدہ کیوں لیا؟ پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا؟ ایسے بے وفا کے ساتھ اس طرح کی محبت؟ معلوم ہوا خط کی جگہ ہاتھوں میں چنگاریاں ہیں۔ انگلیاں جلنے لگیں۔ جھلا کر خط چاک کرنے لگے۔ پہلا ہی خط وہ تھا جسے صفیہ نے سب سے آخر میں دیا تھا اور جس کے پڑھ لینے پر مصر تھی۔ کاغذ کے دو ٹکڑے ہو کر جب زمین پر گرے تو ایک سطر پر نظر پڑی۔ لکھا تھا۔ ''مجھے نعیم سے محبت نہیں ہے۔'' حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کانپتے ہاتھوں سے دونوں ٹکڑے اٹھا لیے۔ شروع سے آخر تک پورا خط پڑھ ڈالا۔ نعیم کی جگہ اپنی فردِ جرم نکلی۔ صفیہ نے صاف صاف اقرار کیا تھا کہ وہ نعیم سے محبت نہیں کرتی تھی، بلکہ اِس دیوانے محمود سے اور اسی کی محبت میں جان دے رہی تھی! جلدی جلدی سارے خط پڑھ ڈالے۔ سب میں اپنی دُکھ بھری داستان بیان کی تھی۔ کسمپرسی کی یتیمانہ زندگی، متمول عزیزوں کا کنیزوں سے بر تر برتاؤ، نعیم صاحب سے اتفاقیہ ملاقات اُن کی چکنی چپڑی باتیں، اُن کا دھوکا، پھر محمود سے اقرارِ محبت عورت تھی۔ سب کچھ جانتی اور سمجھتی تھی۔ یہ دوست کی پاسداری میں اس کے خطوط پڑھ لینا حرام جانتے، وہاں جواب نہ ملنے سے اضمحلال بڑھتا، حرارت بڑھتی، خوشی اس کی زندگی تھی وہ نہ ملی تو ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر 'خط! خط!' کہتی دنیا سے سدھاری!

محمود کی آنکھوں میں دُنیا تاریک ہوگئی۔ اس نے دیوانہ وار قمیص کا گریبان ہاتھ میں پکڑا اور اتنا سخت جھٹکا دیا کہ دامن تک چاک ہوگیا۔ پھر مینا کی طرح بے یک وقت ہنستا اور روتا گھر سے نکل گیا۔ تین دن اور رات نہ معلوم کہاں کہاں مارا مارا پھرا، چوتھے روز بڑی تلاش کے بعد صفیہ کی تازہ قبر پر بیٹھا دکھائی دیا۔ کبھی روتا تھا۔ کبھی ہنستا تھا اور آسمان کی طرف دیکھ کر مولانائے بیخود کا یہ شعر پڑھتا تھا:

امتحانِ قدرتت خواہم در ایجاب و عذاب
دستِ من رنگیں زخونِ قلب و خونِ دلبر است

(باسی پھول)

انتقام

سکھیا چمارن نے ٹھلیا بھر کے کنویں کی 'جگت' پر رکھی اور 'بابو جی' کو بغور دیکھا۔ وہ مردانگی کے سارے جوہروں سے آراستہ تھے۔ جوان تھے، خوبصورت تھے۔ قوی ہیکل تھے۔ رُعب داب والے تھے۔ اگر باوجود ان باتوں کے وہ سکھیا سے ہنس بول لیتے تھے تو اس کے یہ معنی کیوں ہوں کہ ان کی نیت خراب تھی۔ سکھیا گاؤں کی بہو تھی۔ ابھی نئی نئی 'گونا' کرا کے آئی تھی۔ سب ہی دو گال ہنس بول لیتے تھے۔ 'بابو جی' کے دل لگی کرنے میں کون سی بُرائی تھی؟ پھر بھی اتنا فرق سکھیا ضرور محسوس کرتی تھی کہ 'بابو جی' کی نظر اس پر اس طرح کی نہ پڑتی تھی جس طرح اور مردوں کی۔ اُن کی آنکھوں میں تو لالچ دکھائی دیتا ہے۔ بالکل اس طرح کا لالچ جس طرح کہ گیدڑ کی نظر میں درخت پر پکا ہوا آم دیکھ کے جھلکتا ہے۔ وہ سکھیا سے ہنسی بھی کرتے تھے تو دوسروں کی طرح سب کے سامنے نہیں بلکہ نظر بچا کے۔ پھر دانت بھینچ کے منہ ہی منہ میں نہ معلوم کیا کیا کہہ ڈالتے تھے۔ یوں کہتے تھے کہ خود سکھیا بھی اُن کے الفاظ کو صاف صاف نہ سن سکتی تھی۔ البتہ اُن کے تیور اور اُن کے چہرے سے بہت کچھ مطلب سمجھ میں آ جاتا تھا۔

اسی لیے اس وقت شام کو جبکہ سکھیا کنویں پر بیلوں کی تاند میں پانی ڈالنے کے لیے اکیلی پانی بھرنے آئی تھی تو وہ 'بابو جی' کو اپنے قریب دیکھ کر گھبرا گئی۔ مگر اپنی صنفی فطرت سے اس نے فائدہ اُٹھا کے 'بابو جی' پر اپنا اضطراب ظاہر ہونے نہ دیا۔ اس نے اُن پر بالکل اسی طرح کی نظر غلط انداز ڈالی جس طرح وہ گاؤں کے کسی بوڑھے مرد پر ڈالتی۔ وہ خاموشی اور اطمینان سے کنویں کی 'جگت' پر چڑھ گئی۔ اُس نے ڈور میں ٹھلیا پھنسائی اور کنویں میں لٹکا دی۔

مگر 'بابو جی' کی یہ حالت تھی کہ وہ اس کی پتلی کمر اور بھرے بھرے بازو دیکھنے اور

چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اور بازو بند کی جھنجھناہٹ سننے کے بعد اپنے ہوش ہی میں نہ تھے۔ صنفی لذات کا مجموعہ سامنے تھا۔ تصور نے اس میں نمک مرچ ملا کے عجیب طرح کی چاشنی ان کے کام و دہن میں پیدا کر دی تھی۔ وہ جیسے جیسے قریب آتے جاتے تھے ان کا چہرہ سُرخ ہوتا جاتا تھا، اُن کی کنپٹی کی رگیں پھولتی جاتی تھیں اور ان کے تنفس میں سرعت پیدا ہوتی جاتی تھی۔

جب سکھیا نے بار آور شاخ کی طرح جھک کے بھری ٹھلیا 'جگت' پر رکھی تو وہ اُس کے منہ کے قریب منہ لے جا کے بڑی لجاجت سے بولے "آخر ہم کب تک تڑپیں؟"

سکھیا نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جھونپڑی دُور تھی۔ گاؤں کئی قدم کے فاصلے پر تھا۔ دِیا جلانے کا سمے تھا، مکان دُھندلے دُھندلے دِکھائی پڑتے تھے۔ قریب والے امرود کے باغ کے درخت ہرے کی جگہ کالا ہی بلکہ قریب قریب سیاہ نظر آتے تھے۔ چڑیاں اپنے اپنے گھونسلوں میں جا چکی تھیں۔ البتہ بڑے چمگادڑ جھنڈ کے جھنڈ اُڑتے دکھائی دیتے تھے، اور دُور سے کبھی کبھی گائے کے بچھڑے کے بولنے کی ہلکی آواز آتی تھی۔

سکھیا نے ایک ہی نظر میں موقع کی نزاکت کو سمجھ لیا۔ بابو جی بہت دِنوں سے جس موقع کی تاک میں تھے، وہ آج تاریکی اور تنہائی کے چلتے اُنھیں مل گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ زمیندار کے جبر کے آگے ایک نہ چلے گی۔ وہ ٹھاکر تھے، اُن کے سامنے چمارن کی کوئی نہ سنے گا۔ اکیلی وہ ہاتھا پائی میں جیت نہ سکے گی۔ چیخنے چلاّنے میں بدنامی اور رُسوائی ضرور ہوگی۔ اسی لیے وہ بہت جلد اس نتیجے پر پہنچی کہ لڑائی سے صلح بہتر ہے۔

وہ جگت پر سیدھی کھڑی ہو کے بولی "بابو جی، آپ ٹھاکر ہیں، اور ہم پرجا۔ ایسی بُری بُری بات کاہے منہ سے نکالیے؟"

انھوں نے والہانہ انداز سے کہا: "جب سے تجھے دیکھا ہے، نہ کھانا اچھا جان پڑتا ہے نہ پانی، سچ کہوں 'جل کھاتا ہوں' تو جان پڑتا ہے نیم کا رَس ہے۔ اور روٹی ایسی ہے کہ جیسے 'چام' دانت سے نوچ نوچ کھا رہا ہوں۔ اب تو میں تیرے بنا نہ جیوں گا!"

سکھیا بہت اطمینان سے وہیں 'جگت' پر کنویں میں پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی اور اُس کی ٹانگیں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے اس کے دل کی حرکت میں نہ کوئی خاص سُرعت ہے اور نہ دماغ میں کسی خطرناک بات کا خیال ہے بلکہ وہ اپنی 'سکھیوں' کے ساتھ میٹھی میٹھی باتوں اور ہنسی ٹھٹھول میں مشغول ہے۔ وہ ٹھاکر صاحب سے بولی "تو بابو جی، آپ کیا چاہتے ہیں؟"

انھوں نے دانت نکال کر کہا۔ ’’ کچھ نہیں۔ یہ جوتن بدن میں آگ لگی ہے۔ بس اُسے بجھادے۔‘‘

سکھیا نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ’’آگ پانی ڈالنے سے بجھتی ہے، پر تیل سے بھڑکتی ہے۔ آپ جو بات کہتے ہیں وہ تیل ہے پانی نہیں ہے!‘‘

اُنھوں نے بڑے اصرار سے کہا۔ ’’نہیں نہیں بجھ جائے گی!‘‘

اس نے کنویں میں جھانک کر دیکھا۔ پھر مُڑ کے کہا۔ ’’آپ سوچیں تو۔ مَیں آپ کے چمار کی استری ہوں، آپ کی چھاتی سے لگوں، پھر اُس کی چھاتی سے لگوں، آگ لگے گی کہ بجھے گی؟‘‘

وہ بڑی تمکنت سے بولے: ’’اونہہ، اسے چھوڑ دے۔ ہم زندگی بھر نباہ دیں گے!‘‘

اس نے بات بنائی۔ ’’اچھا تو پھر سوچنے دیجیے۔ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔ وہ بیاہ کے لایا ہے اُس کے چھوڑنے میں کچھ سمے لگے گا۔‘‘

ٹھاکر صاحب نے بہت جبر کیا۔ ممکن ہے کہ کچھ اور کہتے۔ مگر عین اسی موقع پر سکھیا کے شوہر ’نرپتیا‘ نے جھونپڑی سے آواز دی ’’ارے ناند سوکھی ہے، پانی لائے گی یا کنواں پر ہی مرے گی!‘‘

سکھیا نے جلدی سے کھڑے ہو کے کہا ’’آوت ہن‘‘ اور پھرتی سے گھڑا اُٹھا کے وہ جھونپڑی کی طرف چل دی۔‘‘

اِس گفتگو کو دو ہفتہ ہوگیا سکھیا یہی سوچتی رہی کہ نرپتیا سے اُسے دُہرائے یا نہیں۔ جانتی تھی کہ اس کا مزاج تیکھا ہے۔ ذرا سی بات میں بگڑ اُٹھتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ بات اور بڑھ جائے، ہمّت نہ پڑی۔ منہ سی کر بیٹھ رہی۔ مگر ’بابو جی‘ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔ اُنھوں نے اس درمیان میں ’چمر ٹولی‘ کے کئی پھیرے کیے۔ شام صبح کنویں پر ضرور آتے۔ اور گو سکھیاں سکھیا کے ساتھ ہوتیں۔ مگر وہ گھورنے اور ٹھنڈی آہیں بھرنے سے نہ رُکتے تھے۔ جہاندیدہ بڑی بوڑھیاں جنھیں زمینداروں سے اپنے اپنے عہد شباب میں سابقہ پڑ چکا تھا، ذاتی تجربوں کی بنا پر معاملے کو بھانپ گئیں۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ شدہ شدہ نرپتیا اس کے شوہر کو بھی معلوم ہو ہی گیا۔

اس نے اس جہالت سے کام لیا جس کے مرد اکثر شکار ہوتے ہیں اور بجائے اس کے وہ بیوی کی محبت پر بھروسا کر کے ان باتوں سے اثر نہ لے، وہ سکھیا پر طرح طرح سے غصہ کرنے لگا۔ کہتا ”زمیندار کو تیری باتوں سے اُمید ہوگئی، جب ہی وہ اِس طرح منڈلاتا ہے۔“ کبھی کہتا ”اگر مَیں نے تجھے اُن سے ہنستے یا بولتے دیکھ لیا تو مار ہی ڈالوں گا، جان دے دوں گا اور جان لے لوں گا۔“

وہ پہلے تو سمجھاتی رہی، پھر اُس کے دل میں بھی کدورت بڑھنے لگی۔ اُس نے ایک دن شوہر کی باتوں سے جل کر کہا ”تم نے وہ مثل نہیں سُنی؟ عورت رہے تو آپ سے، نہیں تو جائے سگے باپ سے۔ اگر میں ایسی ہوتی تو بیٹھی نہ رہتی۔“

وہ اِس وقت تو قائل ہو کر چپ ہو رہا، لیکن شبہ دل سے نہ گیا۔ اور جاتا بھی کیسے، اس نے خود ہی بیج بوئے تھے۔ خود ہی سوچ سوچ کر اُن کی آبیاری کرتا اور خود ہی اُن کے نمو اور شادابی سے گھلتا۔ دُنیا میں اِس بے وقوف سے زیادہ احمق نہیں جو خود اپنے کو احمق بنائے!

ایک دن ٹھاکر کے یہاں کام تھا، دھان کٹ کے اور ’اُسا کے‘ آ گیا تھا۔ چاول کوٹنا تھے۔ گاؤں کی چمارنیں بلائی گئیں۔ سکھیا بھی گئی۔ اور سب تو اوکھلی اور موسل لے کر بیٹھ گئیں، لیکن اسے ٹھکرائن نے دالان اور کمرہ لیپنے کا کام سپرد کیا۔ یہ دروازے سے جا کر گوبر اکٹھا کر لائی اور اُسے ایک جھوے میں لیے کمرہ میں پہنچی۔ جیسے ہی اس نے جھک کر گوبر کا جھوا رکھا، ٹھاکر صاحب نے آ کر پیچھے سے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

ٹھکرائن بھی ٹھیک اُسی وقت آ گئیں اور بے قصور چمارن کو جرم میں شریک سمجھ کر برس پڑیں۔ ٹھاکر صاحب تو بیوی کی صورت دیکھتے ہی کچھ جھینپ کر باہر بھاگ گئے۔ لیکن سکھیا کی شامت آ گئی۔ ٹھکرائن نے ہزاروں گالیاں دے کر اُس کے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑے اور کھینچتی ہوئی باہر لائیں۔ دوسری چمارنیں بھی آ کر جمع ہو گئیں، مالکن کا بدلا ہوا رُخ دیکھ کر سب کی سب اس کے خلاف ہو گئیں۔ کوئی کہتی ”ارے ٹھکرائن، اِی بڑی پاجن ہے۔ جس دن سے گاؤں ماں آئی ہے بس مَردن کے پیچھے دوانی ہے۔“ کوئی کہتی ”ہا، ہا، رام رام کا ہیکا کوئی ایسا کرم کرے۔ گاؤں کا ٹھاکر پر نگاہ ڈالے، پھر اُنھیں کی مہریا کے سامنے! رام، رام!“ کوئی بولی ”پوری چمر ٹولی کی ناک کٹوا دی۔ رہ جاؤ، چلے دو۔ ابھی پوری برادری بلا کے سب کے سامنے

ٹاٹ باہر کرا کے دم لوں گی۔"

غرض جتنے منہ اُتنی زبانیں۔اور ٹھکرائن کی یہ حالت کہ ایک سانس میں ہزاروں گالیاں دیتیں۔سکھیا غریب گھبرائی ہوئی ہر ایک کا منہ دیکھتی! اگر تجربہ کار ہوتی، اپنی بے قصوری پر ہزاروں قسمیں کھاتی۔لیکن نا تجربہ کار پہلی مرتبہ اچانک ایک اجنبی مرد نے اس کو گلے سے لگایا۔ وہ اپنے احساسات وجذبات ہی کا اندازہ نہ کرسکتی تھی کہ بلائے ناگہانی کی طرح ٹھکرائن آئیں اور آتے ہی اس طرح برسیں کہ اللہ تیری پناہ۔ چمارنوں نے جن سے ہمدردی کی اُمید ہو سکتی تھی اُنھیں کی ہاں میں ہاں ملائی۔کوئی سنے تو وہ کہے،کوئی بولنے دے تو وہ بولے۔

اِس ہنگامہ میں اس کے سوا اور کچھ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ٹھکرائن کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوتے ہی بھاگ نکلے۔ چنانچہ موقع پاتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔اور ٹھاکر کے گھر سے باہر نکل کر اس نے دَم لیا۔ پہلے تو بھاگی ہوئی چمر ٹولی کی طرف چلی۔ جب جھونپڑی کوئی پانچ سو قدم رہ گئی،دفعتاً ٹھٹک گئی۔اب تو جھونپڑی میں جائے پناہ نہ تھی بلکہ وہاں میاں بیٹھا ہوگا۔وہی جو عہد کر چکا تھا کہ ذرا سی بدنامی ہوئی اور جان لے گا اور جان دے گا۔دوسرے چمارنیں بھی تھوڑی دیر میں 'پانی پینے' کی چھٹی پائیں گی اور آتے ہی برادری بھر میں یہ بات مشہور ہو جائے گی۔

گھر کی طرف سے رُخ پلٹ گیا۔کھیتوں کی طرف چلی۔ہانپ رہی تھی۔خشک سسکیاں آرہی تھیں اور آنکھوں کے نیچے بار بار اندھیرا ہو جاتا تھا۔کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ بس چلی جارہی تھی کہ دفعتاً اپنے کھیت کی مینڈ دکھائی دی۔ایسا محسوس ہوا کہ کوئی دوست مل گیا۔ بھد سے کنارے پر بیٹھ گئی۔ پہلے شغلاً حواس درست کرنے کے لیے کھیت سے مٹّی اُٹھا اُٹھا کر ہاتھوں میں ملتی رہی۔شاید اس سے بوئے محبت آئی۔اس لیے کہ ضبط کا قلعہ آہستہ آہستہ ٹوٹا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔گھٹنوں پر سر رکھ لیا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔

کوئی گھنٹہ بھر تک وہ اسی طرح اپنی حالت پر روتی رہی۔پھر اُٹھی اور اُس طرف چلی جدھر اُس کا میکا تھا۔ماں،باپ مر چکے تھے،بھائی تھا،شاید وہ آڑے وقتوں کام آئے۔

نر پتیا نے چمارنوں کی زبانی یہ واقعہ سُنا۔خاصا بھوت اُس پر سوار ہو گیا۔لاٹھی کاندھے پر رکھ کر وہ بیوی کو تلاش کرنے نکلا۔پوچھتا ہوا کھیت پر آیا۔وہاں بھی نہ ملی۔سوچا "ہونہ ہو وہ

میکے گئی ہو۔'' اور غصہ بڑھا۔ ''ہم کا جلیل کر کے گھر بھائی کے پاس چلی، تب تو سہی کہ راستا ہی ماں نہ روکوں۔'' ڈلکی اس راہ پر ہولیا جو سسرال جاتی تھی۔ دو کوس جانے پر وہ جاتی ہوئی دکھائی دی۔ سر جھکائے ہوئے میانہ روی سے چلی جا رہی تھی۔ لیکن چال سے آثارِ غم نمایاں تھے۔ نرپتیا کو بھلا یہ سب کہاں بجھائی دیتا تھا، وہ غصّے سے اندھا ہو رہا تھا۔ اُس نے وہیں سے پکارا ''ٹھہر جا، کہاں جاتی ہے؟'' سکھیا کے لیے شوہر کی آواز 'سمندِ ناز کے لیے تازیانہ' بنی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ چال ڈھال، وضع قطع سے محسوس ہوتا تھا سر پر خون سوار ہے، بے تحاشا بھاگی۔ میاں بیوی میں دَوڑ ہونے لگی۔ راہ چلتے گھبرا کر رُک پڑتے۔ مگر ان دونوں کے نتھنوں سے گرم گرم بھاپ نکل رہی تھی اور دوڑ جاری تھی۔ پھر بھی کہاں تک؟ صنفِ نازک لاکھ صحیح و تندرست و توانا سہی، مگر جسمانی حیثیت سے مرد کا مقابلہ مشکل ہے۔ پھر نرپتیا بھی کوئی کمزور مرد نہ تھا۔ دیہاتی، کسان، محنت مزدوری کا عادی۔ اُس نے بیوی کو پکڑ ہی لیا، اور برابر آتے ہی اُس کا چونٹا کھینچ کے اس زور سے جھٹکا دیا کہ سکھیا 'آہ' کر کے چاروں شانے چت زمین پر گر پڑی۔ لاتوں اور گالیوں کی بارش ہونے لگی۔ سکھیا درد اور تکلیف سے چیخنے لگی۔ شور و غل سن کے دو چار آدمی جو پاس کے کھیتوں میں اپنے اپنے کام میں لگے تھے جمع ہو گئے۔ سب نے مل کے سکھیا کو چھڑایا۔ واقعہ پوچھا۔ نرپتیا غصّے سے بولا ''یہ... گاؤں کا ٹھاکر سے پھنسی ہے!'' اور پھر پل پڑا۔ لوگوں نے بیچ میں آ کے کہا۔ ''تو گھر لے جاؤ۔ وہاں مارو پیٹو۔ جو جی چاہے کرو۔ یہاں رستے میں یہ بات اچھی نہیں۔''

غرض نرپتیا اسے گرفتار کر کے لایا۔ اپنی جھونپڑی کی صورت دیکھ کے غصہ اور بھڑک اُٹھا۔ لاٹھی کے 'ہُورے' سے اُسے مار مار کے گھر کے اندر دھکیلا۔ سکھیا رو رو کے جس قدر اپنی بے قصوری کا اظہار کرتی تھی وہ اسی قدر خفا ہوتا تھا۔ اتنا ہی اسے بیوی کے جرم کا یقین آتا جاتا تھا۔ وہ بھی مار کھاتے کھاتے تھک کے خاموش ہو رہی اور دیہاتی جاہل عورتوں کی طرح اس نے اپنے دل میں کچھ ٹھان لی۔

شب میں یوں ہی منہ لپیٹے پڑی رہی۔ نرپتیا تھوڑی دیر تو بیٹھا 'نریل' پیا کیا، پھر غصہ کی آگ بجھانے تاڑی خانہ چلا گیا۔ وہاں اُس نے اتنی چڑھائی کہ مشکل سے دس گیارہ بجے گھر آ سکا۔ اور آتے ہی کھرّے پلنگ پر پڑ کے سو رہا۔ قریب ایک بجے رات کے سکھیا اُٹھی، اُس نے نرپتیا کے چہرے کو بغور دیکھا، وہ بدمست پڑا خرّاٹے لے رہا تھا۔ وہ پھر اس کونے میں گئی جہاں چولہا تھا اور برتن باسن کے ساتھ غلّہ اور دوسری چیزیں رکھی تھیں۔ اُس نے آہستہ سے

چولہا روشن کیا۔ تھوڑا سا کڑوا تیل ایک پیالے میں گرم کیا اور ہانڈی میں سے افیون نکال کر اُس میں ڈال دی۔ جب گرم تیل میں افیون خوب مل گئی تو وہ گرم ہی گرم پورا پیالہ پی گئی۔ پھر چپکی اُٹھی، کلّی کی، آگ بجھائی اور نرپتیا کے قریب آ کر لیٹ رہی!

صبح کو نرپتیا باوجود خمار کے بیوی کے کراہنے اور تڑپنے کی آواز سن کر اُٹھ بیٹھا۔ گالی دے کر پوچھا "کیا ہے رے؟" وہ اسی طرح کراہتی اور تڑپتی رہی۔ وہ جھلا کر اُٹھا۔ زور زور سے جھنجھوڑ کر پوچھا "کیا ہے رے؟" وہاں ہوش وحواس درست ہوتے تو جواب ملتا۔ اس کا غصّہ اور بڑھا۔ سارے قصور ایک ایک کر کے یاد آتے گئے۔ سمجھا بنتی ہے۔ دو طمانچے کس کس کے سکھیا کے منہ پر رسید کیے۔ اُنگلیوں کے گال پر نشان اُبھر آئے، مگر نہ وہ سر سے کھیلی اور نہ منہ سے بولی۔ اب تو اس کے دل میں ڈر پیدا ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ جلدی سے دِیا سلائی ٹٹول کر اُٹھائی اور مٹّی کا دِیا جلایا۔ بیوی کا چہرہ دیکھتے ہی کانپنے لگا۔ 'کافر جوانی' کے جوش کی جگہ موت کے علامات تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقہ، چہرہ مٹّی کے رنگ کا، باچھوں میں خون بھرا ہوا اور حلق سے کھرکھراہٹ کی آواز، جلدی سے دِیا سلائی ہاتھ سے رکھی، لوٹے میں جل لایا اور چلّو میں لے کر منہ پر چھڑکا، جھنجھوڑا، پکارا، جب سوائے کراہ کے کوئی جواب نہ ملا تو یقین آ گیا کہ اس نے کچھ کھا لیا۔ جھونپڑی سے دیوانہ وار نکلا، عزیزوں کو وہیں سے کھڑے ہو کر آوازیں دیں۔ سب جلدی جلدی وہاں آئے، اور ان میں سے ایک جہاندیدہ نے گھر کا جائزہ لے کر بتایا کہ افیون کا اثر ہے اور جان بچنا مشکل۔

نرپتیا کے دل سے سارے شبہات بیوی کو مرتا دیکھ کر جاتے رہے۔ اِسے سکھیا کی عصمت مآبی کا یقین آ گیا۔ ساتھ ہی زمیندار کی طرف سے نفرت وغصّہ بھی بڑھا۔ لوگوں نے کہا "جاؤ زمیندار سے کہو، وہ چوکیدار کو ساتھ کر دیں گے، اسپتال لے جاؤ۔ شاید بچ جائے۔" نرپتیا کا منہ زمیندار کا نام سنتے ہی سُرخ ہو گیا۔ چیخ کر بولا۔ "اُسی کا تو یہ کرتوت ہے! اسی نے ہماری مہریا کی جان لی ہے!" نوجوان چماروں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "چلو ابھی مار کے گرا دیں، ابھی اُس کو بھی پھونک دیں" کی آوازیں بلند ہونے لگیں، مگر دو چار بوڑھے بھی ان میں تھے، اُنھوں نے ان لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے چپ کیا۔ "زمیندار کو ماریں گے! بڑا گھمنڈ ہو گیا ہے، منئی ایسی بات کا ہے کہے کہ جو نہ کر سکے!" اور سب تو چپ ہو رہے، مگر نرپتیا گڑانسی اُٹھا لایا۔ اس پر خاصا بھوت سوار تھا۔ بولا، "اچھا، اچھا تم سب لوگ یہیں بیٹھے رہو، ہم اُس سسرے کو مار آتے

ہیں!'' دو تین چمار لپٹ گئے اور اُس سے گڑانسی چھین لی۔

اتنے میں سکھیا تڑپ کے اُٹھی۔ دوسری چمارنوں نے جلدی سے اُسے سنبھالا، مگر وہ ایک طرف جھک گئی۔ اور اُس نے تڑپ تڑپ کے اور چیخ چیخ کے خون کی قے کی۔ پھر قبل اس کے کہ چمارنیں اس کا منہ دُھلا سکیں اس کا سر ڈھل گیا، اور اس کے ہاتھ پاؤں اینٹھ کے رہ گئے۔

نرپتیا جب مرگھٹ سے واپس آیا تو وہ سیدھا نائی کے گھر گیا۔ اس نے سر، داڑھی اور مونچھیں منڈوا ڈالیں۔ پھر گاؤں کے بزاز کے یہاں گیا۔ اُس سے اُس نے دو گز مارکین لی، پھر کمہار کے یہاں گیا۔ وہاں سے اُس نے مٹّی کی ایک ہانڈی خریدی، پھر گھر آیا۔ وہاں سے اُس نے تھوڑا سا نیا سَن لیا اور ایک ٹین کا کنستر۔ اور یہ سب چیزیں لے کے وہ تالاب گیا۔ وہاں اُس نے اشنان کیا۔ دو گز مارکین تہمد کی طرح باندھی، پھر سَن پانی میں بھگو بھگو کے اُس کی رسّی بٹی۔ ایک سرا اُس کا مٹّی کی ہانڈی میں باندھا، دوسرا ہاتھ میں لیا۔ اس ہانڈی کو پھر اسی طرح لٹکا کے تالاب سے پانی بھرا اور جو سرا ہاتھ میں تھا اپنی گردن میں باندھ لیا۔ اب وہاں سے کنستر پیٹتا ہوا چیختا چلا۔

''دُہائی کالی مائی کی، دُہائی گنگا مائی کی! ہم جمیندار پر بھوت بلائب (بلائیں گے) ہم جمیندار پر مسان ہنکائب (ہنکائیں گے) ہم جمیندار پر بھوت بلائب۔ گاؤں کا عورت مرد، بوڑھا بالک سب لوگ سن لیں، ہمار سامنا سے سب ہٹ جائے۔ ہم جمیندار پر بھوت ہنکائب، ہم جمیندار پر بھوت بلائب!''

گاؤں میں جو بھی اس کی یہ آواز سن لیتا اس کے راستے سے ہٹ جاتا۔ لڑکے ڈر کے گوشوں میں چھپ جاتے۔ عورتیں گھروں میں پلٹ جاتیں اور بڑے بوڑھے ایک دوسرے کو دیکھ کے سر ہلانے لگتے تھے۔ وہ اسی طرح کنستر پیٹتا اور چیختا ہوا زمیندار کے گھر کے چاروں طرف پھرا، پھر اُن کے مکان کے سامنے جو پکڑیا کا درخت تھا اس پر اس نے ہانڈی کو لے جا کے لٹکا دیا، اور خود اپنی گردن میں اسی رسّی کا ایک سرا باندھ کے زمین پر بیٹھ گیا۔ ہر پانچ منٹ کے بعد کنستر پیٹتا اور یہی چیختا تھا۔ ''دُہائی پنچوں کی! دُہائی ہمارے بھائیوں کی! دُہائی ہندو مسلمانوں کی! جمیندار ہمارا استری کی اِجت بگاڑس ہے (زمیندار نے میری بیوی کی عزّت لی ہے) جمیندار ہماری مہریا کی جان لی ہس ہے! ہم جمیندار پر بھوت بلائب۔ ہم اُہ پر مسان ہنکائب! کوئی ہم کا نہ روکے! جِہ کا پوت پیارا ہو، ہم سا دُور رہے۔ جِہ کا آپن پران نہ دینا ہو

ہمارے پاس نہ آوے! دُہائی کالی مائی کی! مسان بھیجو۔ ابھن جمیندار کا سرا پر بھیجو۔ ابہی بابو پر بھیجو۔ ابہی ٹھاکر پر بھیجو۔ ہے رام! ہے لچھمن! ہے بھگوان! توں ہی بھیجو۔ ابھن بھیجو! آج بھیجو! دُہائی کالی مائی کی! دُہائی کالی مائی کی! توں ہی بھیجو۔ ابہی گھڑی بھیجو!''

ٹھاکر صاحب، بیوی کے کمرے میں اچانک آ جانے کی وجہ سے گھر سے سراسیمہ ہو کے بھاگے تھے۔ چوری کرتے دیکھ لیے گئے تھے۔ اپنے کیے پر خجل و منفعل تو تھے ہی، سکھیا کے پیٹے جانے کی خبر نے شرمندگی میں اور زیادتی کر دی تھی۔ شب کو بیوی کے پاس جب اندر گئے تو دل میں بے حد سہمے ہوئے تھے۔ رات بڑی بے چینی اور بدمزگی سے کٹی۔ صبح ہوتے ہی سکھیا کی خود کشی کی خبر ملی۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر گاؤں کے مکھیا بھی تھے۔ چوکیدار کو بلا کے اُس کے ہاتھ گرمائے اور اُسے سمجھا دیا کہ بات تھانے اور کچہری تک نہ پہنچنے پائے۔ اُس نے چماروں کو ڈرا دھمکا کے ٹھاکر صاحب کے پاس آنے سے روکا اور لاش مرگھٹ پہنچوا دی۔

ٹھاکر صاحب نے ذرا اطمینان کی سانس لی ہی تھی کہ شام کو نرپتیا نے یہ روپ بھرا۔ اب تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے سارے جسم کی جان ہی نکل گئی۔ بڑے بوڑھوں سے چماروں کے بھوت بلانے کا حال سن چکے تھے۔ یقین ہو گیا کہ اب خیریت نہیں ہے۔ گھبرائے ہوئے ٹھکرائن کے پاس پہنچے۔ وہ مہری کے ذریعے پہلے ہی سب کچھ سن چکی تھیں اور شوہر پر غصہ کرنا بھول کے اُن کی جان کے ڈر سے بیٹھی کانپ رہی تھیں۔ ان کو جو دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ یہ انھیں سمجھا بجھا کے گھبرائے ہوئے باہر آئے۔ وہاں نوکر چاکر سب موجود تھے، مگر سب توہم پرست دیہاتی تھے۔ کسی نے آج تک یہ نہیں دیکھا کہ چمار کا مسان بلایا ہوا کبھی پٹ پڑا ہو۔ کسی کے کوئی بات سمجھ میں نہ آتی۔ اُنھوں نے جو ہر ایک کو حسرت سے دیکھنا شروع کیا تو ایک نے آگے بڑھ کر کہا ''بابو جی کہیے تو پنڈت جی کو بلا لائیں۔'' ایسا معلوم ہوا کہ جیسے سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ جلدی سے بولے ''ہاں ہاں اُنھیں کو بلا لاؤ۔''

پنڈت جی آئے۔ وہ بھی ساری روداد سے واقف تھے۔ مگر خود بھی جاہل ہونے کی وجہ سے اِنہی توہمات میں گرفتار تھے۔ پھر بھی پشتہا پشت سے گاؤں کے پروہت تھے۔ اپنی معذوری کا اقرار کر کے ساکھ کیسے کھوتے۔ راستے بھر سوچتے آئے تھے کہ کون سی شرط ایسی لگائی جائے کہ بات نہ جانے پائے، چاہے اور کچھ ہو یا نہ ہو۔

براجمان ہونے پر بڑی دیر تک پوتھی بچارتے رہے۔ پھر بولے ''ہاں بس اس کی ایک

روک ہے، آج آدھی رات تک ایک ایسا بکرا کالی مائی کو چڑھایا جائے جو منگل کے دن پیدا ہوا ہو، سال بھر کا ہو، سارے جسم سے کالا ہو، پیشانی پر اس کے چندر ماں سی سپیدی ہو۔"

ٹھاکر صاحب نے گھبرا کر ملازموں کی طرف دیکھا۔ ہر ایک نے کہا۔ "گاؤں میں ایسا بکرا تو کہیں نہیں ہے!"

پنڈت جی نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔ "تو ڈھونڈھ کے دوسرے گاؤں سے لے آؤ!"

ٹھاکر صاحب نے کہا: "ہاں ہاں! گڈریوں سے کہو، جہاں سے ہو ایسا بکرا ڈھونڈ لاؤ۔"

ٹھاکر صاحب نے اِس شب میں بھوجن نہیں کیا۔ ٹھکرائن بھی یونہی بھوکی رہیں۔ رات کی سیاہی جیسے جیسے پھیلتی جاتی تھی ٹھاکر صاحب کا خوف بڑھتا جاتا تھا۔ گھر کے گوشہ گوشہ سے سکھیا کی بھیانک صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ بیوی سے ڈر کا حال کہتے شرم معلوم ہوتی تھی، مگر جان پر بنی تھی، پھر اس پر ہر پانچ منٹ کے بعد اس دُہائی کی آواز سنائی دیتی۔ ہر بار یہی معلوم ہوتا کہ موت آیا ہی چاہتی ہے۔ اسی اضطراب میں ٹھکرائن کی نظر بچا کے اُٹھے۔ طاق پر 'گئو ماتا' کی مورتی رکھی تھی، اُسے اُٹھا لائے۔ چادر سر سے پاؤں تک اوڑھ لیا۔ ماتا سے خوب گڑگڑا کے دعائیں مانگیں، توبہ کی، روئے، پناہ مانگی۔ تھوڑی بہت تسکین سی محسوس کی، اور سو گئے۔ بارہ بجے کے قریب آنکھ کھلی، گھر بھر میں اندھیرا تھا، صرف ایک گوشے میں لالٹین حد درجہ دھیمی کر کے رکھی تھی۔ پاس ہی پلنگ پر بیوی سوئی تھیں۔ ان کا خوف سے بند بند کانپ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا انھیں جگا دیں۔ مگر شرم سے ہاتھ نہ اُٹھتا تھا کہ دفعتاً کان میں نرپتیا کی آواز آئی "دُہائی کالی مائی کی! دُہائی کالی مائی کی! جلد مسان بھیج، جلد بھوت بھیج! ابہی جمیندار پر! ابہی جمیندار کا اوپر!"

انھیں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی ان کے گلے میں پھندا ڈال کے کھینچ رہا ہے۔ اپنی قوتِ آزادی سے کام لے کر اِس سے بہت لڑے۔ مگر جیسے دل کہتا "سب بیکار ہے، اُٹھ چل!" آخر اسی طرح کانپتے ہوئے اُٹھے۔ ایک دُھندلا سا سایہ آگے آگے چلتا ہوا دکھائی دیا۔ ایسا محسوس ہوتا "سکھیا چلی جا رہی ہے۔" ٹھاکر کو اب کوئی بات محسوس نہ ہوئی۔ اب دماغ کی ساری قوتیں اسی دُھندلے مجسمہ پر جمی ہوئی تھیں۔ دل کہتا اسی کے پیچھے چلو۔ اسی کے ساتھ ہو لو۔ خود ہی اُنھوں نے کنڈی کھولی، زنانہ خانے سے مردانے مکان میں پہنچے۔ ان کو اس کا احساس نہ تھا کہ یہ کہاں ہیں، اور کس کے مکان میں ہیں۔ یہ تھے اور بس وہ دُھندلی تصویر۔ وہ اپنے مکان کے مردانے حصّے سے نکل کے سیدھے پکڑیا کے درخت کی طرف چلے، جہاں نرپتیا

گردن میں رسّی باندھے دُہائی دے رہا تھا۔ سایہ اُسی جانب جارہا تھا، ان کا دم اسی کے ساتھ تھا۔ یہ بھی ادھر ہی جارہے تھے۔ ان کا ہاتھ کسی نے پیچھے سے پکڑ کے انھیں روکنا چاہا۔ اُنھوں نے ہاتھ جھٹک دیا۔ یہ مدہوش تھے۔ ان سے سوچنے، سمجھنے اور سننے کی ساری قوتیں سلب تھیں۔ بس انھیں اگر کوئی چیز سجھائی دیتی تھی تو وہی سایہ، اور کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو وہی نرپتیا کی آواز!

پکڑیا کا درخت قریب ہوا، اور قریب ہوا۔ نرپتیا دُہائی دیتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ اس نے ان کو دیکھ لیا۔ اس نے ہانڈی جلدی جلدی درخت سے کھول لی۔ اِس نے رسّی اپنی گردن سے کھولی۔ اِس نے اس کا ایک بڑا پھندا بنایا۔ اُس نے وہ پھندا اُن کی گردن کی جانب پھینکا۔ اُنھوں نے تاریکی اور بدحواسی میں درخت کی اُبھری ہوئی جڑ سے ٹھوکر کھائی اور قبل اس کے کہ پھندا ان کی گردن میں پڑے یہ منہ کے بل گر پڑے!

ٹھکرائن اپنے ڈر کو دل میں چھپائے شوہر کی حالت کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ عورت تھی۔ اُس کا دل نازک تھا۔ وہ اُن کے افعال و حرکات سے خوش نہ تھی۔ مگر ہندو عورت شوہر کو دیوتا کی طرح پوجتی ہے۔ وہ بُرا ہی یا بھلا اُس کا ہی تھا۔ اُس کا سہاگ اسی سے ہے۔ اس کی مسّی، اس کی چوڑی، اس کی نتھ اس کے سر کا سیندور، سب کچھ اسی ایک دم کے ساتھ ہے۔ وہ جان پر کھیلنے کے لیے تیار تھی۔ وہ اس کے لیے آمادہ تھی کہ نرپتیا کی کالی مائی پر اگر کوئی بھینٹ چڑھے تو وہ اُس کی ذات ہو، نہ کہ اُس کے سرتاج کی۔

وہ سارے دن دیوی جی سے یہی دُعا کرتی رہی۔ رات کو جب یہ منہ لپیٹ کے سو رہے تو وہ بڑی دیر تک اُن کو محبت اور پریم سے دیکھا کی پھر اُن کے سینے سے 'گئوماتا' کی مورتی لپٹی دیکھ کے اور اُنھیں آرام کی نیند سوئے پا کے اُس کی بھی آنکھ لگ گئی۔ مگر جب یہ پلنگ سے اُٹھے اور بُت کی طرح خاموش کنڈی کھول کے باہر جانے لگے تو وہ جلدی سے پلنگ سے اُٹھی اور ننگے پاؤں ان کے پیچھے پیچھے لپکی۔ اس نے کوئی سایہ اور تصویر نہ دیکھی۔ صرف اُن کی بدحواسی اور اُن کی مدہوشی محسوس کی۔ اس نے جلدی جلدی اور قدم بڑھائے اور پکڑیا تک پہنچنے سے پہلے اس نے ٹھاکر کا ہاتھ پکڑ کے روکنا چاہا۔ مگر وہ اُس کو دھکیل کے آگے بڑھ گئے۔ وہ صرف ایک لمحہ جھجکی، اور پھر اُن کے ساتھ ہولی۔ اور اُن کے گرتے ہی جیسے نرپتیا نے رسّی ہاتھ سے پھینک کے یہ چاہا کہ وہ پانی کی ہانڈی اُن کے سر پر دے مارے، اُس نے بڑھ کر اِس چمار کا ہاتھ پکڑ لیا۔ چمار لاکھ آپے سے باہر ہوا! مگر وہ عورت کو دیکھ کے ٹھہر گیا۔ اُس نے جھلاّ کے پوچھا

''کون ہے رے؟''

ٹھکرائن نے کہا: ''بھیّا میں ہوں ٹھکرائن۔''

نرپتیا گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔ صدیوں سے محکوم رہنے والا خون ٹھکرائن کا نام سنتے ہی سرد پڑ گیا۔ بولا ''ای ہماری مہریا کا بے اجت کہن، اِی اُہکا مار ڈارلن!''

ٹھکرائن نے اُس کا ہاتھ تو چھوڑ دیا، مگر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کے بولی ''بھیّا تمھاری بیوی کو مَیں نے مارا، اُنھوں نے مارا اور تم نے بھی مارا۔ یہی قصوروار کیوں ہیں؟''

نرپتیا کا غصّہ اس سُریلی آواز کے اثر سے اسی طرح اُترنے لگا جس طرح کالے کا غصّہ سپیرے کی بین کی آواز سُن کے۔ اُس نے دھیمی آواز سے کہا: ''ناہیں، اِہی مارن۔ ایہے اُہ کا تنگ کیہن۔ ایہے اُہکا پیچھے پیچھے چرتولی، کھیت، کھلیان، ہر جاگہ گھومت رہن!''

ٹھکرائن نے کہا: ''نہیں نہیں۔ اُنھوں نے صرف بُری نیت سے دیکھا مگر مَیں نے اس کو بُرا سمجھ کے اُسے جھونٹا پکڑ کے گھر سے باہر نکالا، اور تم نے اسے ڈنڈوں سے مار مار کے یہ یقین دلا دیا کہ تم اسے بے عصمت سمجھتے ہو۔ مَیں نے بھی اس کی جان لی اور تم نے بھی۔''

نرپتیا اس نئی منطق پر گھبرا گیا۔ اُس نے شب سے کچھ نہ کھایا تھا۔ چوبیس گھنٹے کے فاقے نے اسے حد درجہ کمزور کر دیا تھا۔ محض بدلہ لینے کی خواہش اب تک اسے دُہائی دینے اور مسان ہنکانے پر آمادہ کیے ہوئے تھی۔ اس طرح اپنے خیالات پریشان ہوتے دیکھ کر وہ اپنے میں عجیب طرح کی کمزوری محسوس کرنے لگا اور وہ زمین پر ہانڈی رکھ کے تھرّا کے بیٹھ گیا۔

ٹھکرائن نے اس چمار کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ ''بھیّا اب اس کی جان گئی۔ ان کی جان نہ لو۔ بھوت نہ ہنکاؤ۔ میں تمھاری ٹھکرائن ہوں، مجھے ان کی جان بھیک دے دو!''

نرپتیا نے کانپ کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ ٹھکرائن نے اُس کے پاس رکھی ہوئی ہانڈی کو اُٹھا لیا اور شوہر کے منہ پر پانی کے چھینٹے دینے شروع کیے۔ نرپتیا لڑکھڑاتا اُٹھا اور وہ ٹھاکر کے مکان کے دروازے پر آ کر اُن کے نوکروں کے نام لے لے کے پکارنے لگا! ٹھکرائن کے میٹھے بول نے جلاد کو مسیحا بنا دیا تھا، اس کے پاس ان منتروں کا توڑ نہ تھا!

یہ نیا انتقام تھا!

(کچھ ہنسی نہیں ہے۔ ۱۹۳۱ء)

❁❁

اندھی جوانی

مُنیا اندھی تھی۔ چار ہی برس کی تھی کہ چیچک ماتا آئیں اور اُس کے باپ کی جان کے ساتھ ساتھ اُس کی آنکھیں بھی لے گئیں۔ ایک دُکھیاری ماں تھی اور گاؤں میں کچھ اس کے باپ کی جوت کے کھیت۔ اس کا باپ جب تک جیتا تھا وہ زمیندار کا کڑا لگان دینے پر بھی اِن کھیتوں میں اتنا پیدا کر لیتا تھا کہ تین جانیں ایک وقت روکھا سوکھا کھا کر گزر بسر کر لیتیں۔ پر جب سے وہ مَرا یہ سہارا بھی چھوٹا، یہ آسرا بھی ٹوٹا، مُنیا کی ماں خود ہل چلانے سے رہی۔ ساجھی کی ضرورت ہوئی۔ اُس نے بھی جُل دیا۔ جتنا پیدا ہوا سب کھا گیا، نہ انہیں کچھ دیا اور نہ زمیندار کا لگان ادا کیا۔ نالش، مقدمے کی نوبت آئی اور مُنیا کے خاندانی جوت کے کھیت دو ہی ایک برس میں نکل گئے۔

مُنیا کی ماں نے اب کیونکر بسر کی، اُسے مُنیا نہ جانتی تھی، پر گاؤں بھر جانتا تھا کون تھا جو گنگا نہیں نہایا تھا، اور کس نے دو چار پیسے دے کر جھوٹی ہانڈی کتّوں کی طرح نہ چاٹی تھی؟

مُنیا ان ساری باتوں سے بے خبر، دُھول میں لوٹ پوٹ کے بڑھتی رہی، بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ جوان ہوگئی۔ وہ آنکھ سے تو دیکھ نہیں سکتی تھی۔ پر ہاتھ سے ٹٹول کے اُس نے یہ بات جان لی تھی کہ اب اس کا جسم پہلے کا سا نہ تھا۔ وہ کچھ بدل سا گیا تھا، کہیں سے دَب گیا تھا۔ کہیں کہیں سے اُبھر آیا تھا اور کچھ اس طرح چکنا ہوگیا تھا کہ اسے خود ہاتھ پھیرتے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اسے رہ رہ کے ایک جھرجھری سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بیٹھی بیٹھی آپ ہی آپ مسکرانے لگتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اندر ہی اندر اس کو چھیڑتا ہے۔ کہتا ہے تو گاتی کیوں نہیں؟ تو اُچھلتی کیوں نہیں؟ تو ہنستی کیوں نہیں؟ اسی کے ساتھ اسے اب عورتوں کی پتلی اور سُریلی آواز کی جگہ مردوں کی موٹی اور بھدّی آواز بھلی معلوم ہونے لگی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ جب تڑکے

اُٹھ کے جنگل جاتی تو اُس کے ساتھ نہ پلٹتی۔ کسی نہ کسی بہانے سے ضرور رُک جاتی۔ وہ کسی کھیت کی مینڈھ پر اِس لیے کان لگائے بیٹھی رہتی کہ کوئی 'ہلواہا' اُدھر سے اپنے بیلوں کو للکارتا، چمکارتا نکلے۔ جب کبھی ایسا ہوتا تو وہ اپنی پھوٹی آنکھوں سے اس طرح گھور گھور کر دیکھتی جیسے وہ اسے دیدوں کی جگہ نینوں میں رکھ لینا چاہتی ہے۔

وہ یہ نہ جانتی تھی کہ ہر گزرنے والا اس کی جھلک دیکھتے ہی منہ پھیر لیتا تھا کہ صبح صبح اندھی کا چہرہ کون دیکھے۔ جب دو ایک مرد اس طرح گزر لیتے تھے تو مُنیا اپنے دل میں خوشیوں کا سمندر لیے گھر پلٹتی تھی۔ اور ماں کی گھڑکی اِس طرح چپکی سن لیتی تھی جیسے وہ اندھی ہی نہ تھی بلکہ بہری بھی!

مُنیا کی ماں بھی بڑبڑا کے چپ ہو جاتی۔ کیا کرتی؟ دیکھتی تھی لڑکی سیانی ہو گئی۔ اِس سے کہیں چھوٹی بچیوں کی سگائی ہوتی تھی، بیاہ ہوتا تھا، گونا ہوتا تھا، بچّے بھی ہوتے تھے، پر مُنیا کو کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ اس کے پاس دھرا ہی کیا تھا کہ کوئی اس کی بیٹی سے بیاہ کرنے کی خواہش کرتا؟ ننگی بھوکی، نہ رہنے کی جگہ، نہ جوت کے کھیت، نہ کھانے کے برتن، نہ پہننے کے کپڑے؟ اس غریبی پر بھی ہوسکتا تھا کہ ذات برادری میں، کہہ سن کے کوئی اسی کا سا ننگا بھوکا مل جاتا، پر مُنیا میں ایسا عیب تھا کہ کوئی مفت بھی نہ پوچھتا۔ اندھی کون بیاہیگا، جی کا جنجال!

وہ کبھی جب بہت گھٹتی تو کسی یار آشنا سے کہتی "میری سُوریا کا کہیں ٹھکانا لگاوٗ۔" وہ مُنیا کو بلا کر دیکھتا۔ عورت کیا تھی شروع برسات کی جامن۔ اتنی ہی کالی کلوٹی۔ پر اس کالے رنگ کی تہہ میں جوانی کی سُرخی بھی دَوڑ رہی تھی۔ یہ سُرخی کچھ اِس بلا کی تھی کہ وہ ان ہر دیگی چمچوں کا منہ لال کر دیتی تھی۔ وہ اسے اس طرح دیکھنے لگتے تھے کہ مُنیا کی ماں اُن کے سامنے سے ہٹ جانے کے لیے بیٹی کو ڈانٹ دیتی تھی۔

اِس طرح مُنیا کا وہ سن گزر گیا جو ہندوستان میں اُمنگوں کا دن کہلاتا ہے، اس نے سترھویں میں قدم رکھے ہی تھے کہ ایک دن اَرہر کے کٹے ہوئے کھیت سے بوجھ لانے کے سلسلے میں اس کا بدن 'میکو' سے چھو گیا۔ مٹّی کے تیل میں چنگاری اور پسی ہوئی بارود میں جلتی دِیا سلائی لگی۔ مُنیا کو ایسا جان پڑا جیسے کسی نے اس کے دل کو چٹکیوں سے پکڑ کر لٹّو کی طرح گھما دیا۔ وہ تتلی کی طرح تھرّا کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

میکو کوئی نوجوان نہ تھا، اس کا سن پچاس سے زیادہ تھا۔ وہ دو بیویوں کو مار چکا تھا۔ وہ

آٹھ بچوں کا باپ تھا۔ وہ انجان، انیلا نہ تھا۔ پر وہ بھی مُنیا کے اس طرح زمین پر بھد سے بیٹھ جانے پر گھبرا گیا۔ وہ سمجھا اس اندھی کو کہیں چوٹ آ گئی۔

اُس نے پوچھا "کیا ہے رے؟"

مُنیا خود نہ جانتی تھی کہ کیا ہے، وہ کیا بتاتی۔ وہ صرف بن دیدوں والی آنکھیں پھاڑے منہ کھولے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ البتہ اس نے اَرہر کے گٹھر کو اس طرح زور سے چمٹا لیا جیسے کوئی ماں مدتوں سے گم بچے کو مل جانے پر کلیجے سے لگا لیتی ہے۔ تجربہ کار میکو سمجھ گیا، وہ مسکرایا، آگے بڑھا، اور مُنیا کی دونوں بغلوں میں ہاتھ دے کے بولا۔

"اُٹھ رے اندھی۔ اب تو جوان ہو گئی، تو کیا دن دہاڑے سڑک پر لیٹ جائے گی؟" مُنیا کو اس کی بات بہت بُری لگی۔ پھر میکو کے ہاتھ شرارت کر رہے تھے۔ وہ اُلجھی، گھبرائی، سمٹی، جھجکی، جھومی، پھر اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میکو نے مسکراتے ہوئے اَرہر کا گٹھر اُٹھا کر اُس کے سر پر رکھ دیا۔ پھر اُس کا شانہ ہلا کر بولا۔ "آج شام کو پاس والے باغ میں آنا۔ ہم تمھیں بہت اچھا اچھا گانا سنائیں گے!"

مُنیا لجا کے چپ رہی۔ اس نے چٹکی لی اور کہا۔ "سمجھی؟" مُنیا نے سر ہلا کر ہامی بھری اور اپنا بوجھ سنبھالتی جلدی جلدی چوپال کی طرف چلی گئی۔ یہ اسی وعدے کا نتیجہ تھا کہ مُنیا میکو کے ساتھ پکڑی گئی۔

پر وہ اپنا سب کچھ کھو کر بھی خوش تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس خزانے کو وہ زندگی بھر ڈھونڈھتی رہی تھی آج اس کی کنجی مل گئی تھی۔ آج پہلے پہل ایک مرد نے اس سے اچھی اچھی باتیں ہی نہ کیں، بلکہ اُس کا منہ بھی چوما، اُسے کلیجے سے بھی لگایا اور اُس کے ساتھ نرم نرم دوب پر ایسا کھیل کھیلا جس کے لیے اُس کی روح بھوکی تھی۔

وہ تو بکسی پڑتی تھی۔ پر لوگ میکو کو پکڑ کر مارتے پیٹتے چوپال لے گئے تھے۔ دو ایک نے ایک آدھ ہاتھ خود مُنیا پر بھی جھاڑ دیے تھے۔ مُنیا کو ان کی اس حرکت سے کچھ زیادہ دُکھ نہیں پہنچا۔ اس کا جسم اس سے کہیں زیادہ چوٹ کھانے کا عادی تھا۔ ہاں جو بات کلیجے میں تیر کی طرح جا کر چبھ گئی وہ یہ تھی کہ میکو پر ہر شخص نے تھوک تھوک کر یہ کہا کہ پاجی گرا بھی تو کہاں! اندھی، سُور، ڈائن کے ساتھ!"

ماں نے جب یہ بات سُنی تو رسوئی کا جلتا ہوا چیلا لے کر دوڑی اور بیٹی کا چونڈا پکڑ کر

خوب ٹھونکا۔ اور ہزاروں ننگی ننگی گالیاں بھی دیں۔

لیکن رات کو جب برادری اکٹھا ہوئی اور اُسے بیٹی سمیت ٹاٹ باہر کردینے کی بات چیت ہونے لگی تو یہی مُنیا کی ماں جھلا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ چیخ کر بولی۔ ''تمھارے پاس دھن دولت ہے، تمھارے پاس طاقت ہے، جو چاہے طے کرلو، پر مجھے اس بات کا جواب دے دو کہ میری سوریا تو اندھی تھی، پر تمھارے چہرے پر تو آنکھیں تھیں؟ تم دیکھتے تھے کہ وہ جوان ہوگئی ہے، سیانی ہوگئی ہے۔ تم نے آج تک اس کی سگائی کی کیوں فکر نہ کی؟ تم نے پہلے کیوں نہ سوچا کہ ایک دن برادری کی ناک کٹے گی؟ پھر اُس نے کون سی ایسی بُری بات کی؟ مَیں تو کہتی ہوں وہ تمھاری بیویوں سے اچھی ہے۔ تمھاری بیویاں تمھارے ہاتھ بک کے آئیں۔ تم میں سے ہر ایک نے ان کے دام دیے ہیں۔ میری سوریا نے اپنا جسم کسی کے ہاتھ بیچا نہیں۔ اس نے وہ کام کیا جس کے لیے بھگوان نے اُس کا جسم بنایا تھا۔ جس میں اُسے خوشی ہوئی۔ تم ہی ایمان دھرم سے بتاؤ کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے، وہ جو اپنے جسم کو دوسروں کی خوشی کے لیے بیچے، یا وہ جو اپنے جسم سے وہ کام لے جس میں اُس کا دل خوش ہو؟''

مردوں نے گردنیں جھکالیں اور پنچایت بھر پر سناٹا چھا گیا! مگر آس پاس کھڑی ہوئی عورتیں آپے سے باہر ہوگئیں، وہ مُنیا کی ماں پر ٹوٹ پڑیں۔ ''ڈائن! بیسوا! رنڈی! ہرجائی!'' کہہ کہہ کے ہر ایک نے اس کے سر کے مٹھی مٹھی بھر بال نوچ لیے۔ پھٹی ہوئی ساڑی کے چیتھڑے اُڑا دیے۔ اور اسے اتنا مارا اتنا مارا کہ اُسے وہاں سے بھاگنے ہی میں جان بچتی دکھائی دی۔

جب وہ اس طرح لہولہان، گرتی پڑتی جھونپڑے میں پہنچی، تو اُس نے دیکھا کہ میکو بیٹھا کراہ رہا ہے اور مُنیا پاس ہی بیٹھی ہے۔ دونوں کے بیچ میں ایک چینی میں پسی ہوئی ہلدی رکھی ہے، جسے اس کی سوریا میکو کی چوٹ پر ٹٹول کر لگا رہی ہے!

(کچھ ہنسی نہیں اور......۱۹۳۸)

۱۹۴۵ء کی ایک شام

لکھنؤ اور گرمیوں کا زمانہ، دن میں لاکھ خس خانہ و برف آب مہیا ہو، مگر ہوا پر کس کا قابو چلتا ہے۔ اگر پنکھا روکیے تو اُمس کے مارے دم گھٹتا ہے۔ اگر پنکھا چلایئے تو اچھی خاصی لُوں کا سامان ہو جاتا ہے۔ پھر خس کا بار بار بھگوانا بھی تو ایک دردِ سر ہے۔ نوکروں کو بھی تو اسی طرح گرمی لگتی ہے جس طرح مالکوں کو۔ کہاں تک سرمایہ داروں کی طرح دل سخت کر کے کوئی حکم دیتا رہے۔ دو چار حرف پڑھ لینے کی وجہ سے عام انسانی حقوق تو سمجھ میں آنے ہی لگے ہیں۔ انسانی زندگی اسی حد تک خریدی جا سکتی ہے، جہاں تک بیچنے والوں کو اس کی فروخت کا حق ہو۔ مگر گرمیوں کی لُوں دھوپ میں خس خانے بھگوتے رہنے کی خدمت کسی داموں بھی نہیں خریدی جا سکتی۔ چنانچہ ضمیر کے ہاتھوں خوب کبابِ سیخ بنا، کروٹوں پر کروٹیں لیں۔ کبھی پنکھا چلایا، کبھی بند کر دیا۔ مسہری پر لیٹنے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے نیچے کوئلے دہکا رکھے ہیں۔ زمین پر فرش بچھا کر لیٹا، معلوم ہوا گرم پتھر پر پڑا ہوں۔ غرض دن بھر عاشقِ مہجور کی طرح التہاب سے تڑپا۔ شام ہوئی، دم میں دم آیا۔ جسم کو پائپ کے پانی میں جوش دیا۔ جلدی جلدی سر میں 'یوڈی کلون' اور کپڑوں میں عطر خس لگایا۔ خیال آیا، چلو امین آباد سیر کر آئیں۔ راستے میں ایک دوست ملے۔ بڑے بڑے بال، کھدّر کی ٹوپی، کھدّر کا کُرتہ پائجامہ، پاؤں میں چپل، ان کے ڈیل بھر میں تین چار چیزیں خاص طور سے نمایاں تھیں۔ ایک تو ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، دوسرے ان کے جبڑے کی اُبھری ہوئی ہڈیاں اور سُنا ہوا چہرہ، تیسرے ان کی کلمہ اور بیچ کی لمبی انگلیوں کے درمیان سیاہ اور زرد نشان اور چوتھے ان کی انگلیوں کے لمبے لمبے ناخن۔ بات بہت جلد کرتے تھے اور اکثر ایسا ہوتا کہ ان کے دہن کا لعاب اُڑ کر آپ کے چہرے اور کپڑوں پر گل بوٹے بنانے لگتا۔ ساری دُنیا کی ہر چیز سے خفا رہتے تھے۔ بس محبت تھی

تو روس سے۔ اس چہیتے ملک کا کسی نہج سے ذکر آ گیا، اور مجید صاحب نے گلاب پاشی شروع کر دی۔

آج میری طرح گرمی کے وہ بھی ستائے ہوئے تھے۔ علیک سلیک میں کچھ گرم جوشی نہ تھی۔

مَیں نے چھیڑا۔ ''کیوں مجید صاحب آپ کے ملک میں اتنا تابناک موسم بھی ہے؟''

وہ میرے جملے پر ایک مریض کی طرح مسکرائے اور خاموش رہے۔ مَیں نے پہلے وار کو اس طرح خالی جاتے دیکھ کر دوسرا فقرہ سوچنا شروع کیا۔ وہ بولے۔ ''امین آباد چل رہے ہیں؟'' مَیں نے اُن کو چھیڑنے کی جگہ سیدھا سا جواب دیا۔ ''جی ہاں!''

کہنے لگے۔ ''ہاں، اب تو شامِ اودھ چوک کی جگہ اُدھر ہی ہے۔''

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ ''جی ہاں، یہ بھی ایک طرح کا انقلاب ہے!''

اُنھوں نے منہ سکھا کر کہا۔ ''جی، اسے انقلاب نہیں ارتقا کہتے ہیں۔ انقلاب تو جب ہندوستان میں آئے گا تو آپ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔''

مَیں نے بھیگی بلّی بن کر پوچھا۔ ''جی یہ موسم بھی منقلب ہو گیا یا نہیں؟''

میرے دوست کے سوکھے چہرے پر ایک ہلکی سی سُرخی جھلکی، گویا ٹھنڈا توا لہک اُٹھا۔ ممکن تھا کہ بات بڑھتی اور مجھے اپنے تمسخر کی عقوبت میں ایک پورا لکچر سننا پڑتا کہ دفعتاً جگت ٹاکیز سے ریکارڈ نے چیخنا شروع کیا۔ ''چل چل رے نوجوان! چل چل رے نوجوان'' مجید صاحب لمبے لمبے قدم رکھ کر تیزی سے چلنے لگے۔ مَیں نے پھر چھیڑا۔ ''آپ تو اس طرح جھپٹے جیسے اس پکار پر لبیک کہنے جا رہے ہیں۔''

وہ رُک کر بولے۔ ''نہیں بھئی، میں آپ سے گفتگو میں بھول گیا کہ مجھ سے آج ایک لیڈی کامریڈ سے سینما چلنے کا پروگرام ہے۔''

مَیں نے کہا۔ ''تو بسم اللہ، میری وجہ سے انھیں انتظار کی تکلیف کیوں دیجیے۔''

اُنھوں نے کہا۔ ''عنایت'' اور تیر کی طرح بھاگے...

مَیں خراماں خراماں وہاں آیا، جہاں آزاد پارک میں نام نہادی فوارہ ہے۔ یونیورسٹی کے کچھ نوجوان دکھائی دے۔ اوپن نک بنیائن اور پتلون پہنے۔ صورت شکل سے خاصے شریف معلوم ہوتے تھے، لیکن گفتگو میں ہر تیسرے لفظ کے بعد گالی تھی۔

ایک صاحب دوسرے کو سینما کی طرف کھینچتے ہوئے بولے۔ ''ابے چل... بڑا آیا وہاں

سے انگریزی فلم کا عاشق! (بہن کی موٹی سی گالی!"")

دوسرے صاحب نے گلریزی کی۔ ''ارے تو اتنی جلدی ہی کیا ہے... اٹھارہویں دفعہ تو... اس فلم میں جا رہے ہو۔"

پہلے تو جوان نے والہانہ انداز سے فرمایا۔ ''تو بھئی میں کیا کروں، اس نے فلم ہی ایسی تیار کر دی ہے۔ بس قوالی والا حصّہ ہے کہ کٹاریاں چلتی ہیں کٹاریاں!''

چوتھا جو اَب تک چپ تھا سینہ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''ہائے رے لکھنؤ۔ بس اسی پر تو جان جاتی ہے، کٹاریاں، چھریاں!''

پاس ہی سے ککڑی والے نے آواز دی۔ ''لیلا کی اُنگلیاں ہیں، مجنوں کی پسلیاں ہیں، کیا خوب ککڑیاں ہیں۔''

مَیں مسکرا کر اُدھر مڑ پڑا جدھر قومی جھنڈا گڑا ہے۔ پختہ پلیٹ فارم پر ایک نیتا کھڑے تقریر کر رہے تھے۔ جو کچھ وہ کہہ رہے تھے، اس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ نہ تو لب ولہجہ لکھنوی تھا، اور نہ زبان ہی وہ جو وہاں کی خصوصیت ہے۔ مَیں آگے بڑھ گیا۔

''نخاس ایک سواری! نخاس ایک سواری! آیئے نواب صاحب اِدھر آیئے۔ پَر پہ بٹھالوں، اے ہے میاں آپ بھی کس اِکّے پر بیٹھے جاتے ہیں۔ آیئے حضور آیئے۔ ابھی منٹوں میں نخاس پہنچاتا ہوں، اے سرکار سب تین آنے دیتے ہیں، آپ ڈھائی آنے ہی دیجیے گا۔ بس خوش؟''

مَیں اور بھی آگے بڑھ گیا۔ چوراہے پر وہ بھیڑ تھی کہ توبہ ہی بھلی۔ داہنی طرف پان والے، بائیں جانب شربت والا۔ پھر اس پر ہار پھول بیچنے والوں کی صدائیں، تانگے، رکشا والوں کا شور... ''جوہی کے ہار، موتیا کے گجرے... ایک آنہ پوّا، ایک ہی آنہ، کیا لیچیاں ہیں، مظفرپور کی لیچیاں ہیں... ناسپاتی خربوزے، خاص منڈیاؤں کے، تین آنے سیر... پنکھے لے لو، چار چار آنے... بہت سستے لگا دیے ہیں بھئی سنترے، روپے کے تین تین، بٹول کے سنترے، شکّر کے سنترے... حلوا سوہن ہیں میاں، حلوا سوہن، اللہ جانتا ہے عبداللہ کی مٹھائیاں بھول جائیں گی۔''

سیٹی والے، غبارے والے، گڑبڑ جھالے والے، سب ہی تو آوازیں لگا رہے تھے، جھٹ پٹا وقت تھا۔ مَیں جلدی سے پاکستانی پارک میں ہو لیتا۔ امین آباد کے مسلمان تاجر مصلّیٰ

بچھا رہے تھے، وضو بنا رہے تھے، صفیں قائم کر رہے تھے۔ آپس میں چہ میگوئیاں بھی تھیں۔

''دیکھنا اب کے ۲/جون کو وائسرائے واپس آتے ہی پاکستان کا اعلان نہ کر دیں تو تم کہنا۔''

''یہ تو میں بھی مانتا ہوں، لیکن اگر انہوں نے بنگال اور پنجاب کی تقسیم بھی منظور کر لی تو پھر کیا ہوگا؟''

''منظور کیا کر لیں گے، کوئی مذاق ہے۔''

''لیکن بھئی ایمان کی کہو، اصول تو وہی ہیں، جن پر تم پاکستان مانگتے ہو۔''

قریب سے ایک پانی پانڈے لوہے کی بالٹی کا کڑا کھٹکھٹاتے گزرے۔ ''ٹھنڈا جل! میٹھا جل!'' میں مڑ پڑا۔ گھنٹہ گھر کے گرد بنچوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ کوئی کھدّر، کوئی آدھی کا کُرتا پہنے، کوئی شیروانی ٹوپی میں، کوئی سُوٹ ڈانٹے، مگر چہرے پر راشن اور کنٹرول کا اثر اور ہر ایک کی زبان پر اسی کی گفتگو۔ ان لوگوں کے گرد تیل مالش والے مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ ہاتھ میں تیل کی شیشیاں لٹکائے، بڑے بڑے بالوں میں کنگا پھنسائے، میلا سا تولیہ کندھے پر ڈالے، ہر منٹ پر 'تیل مالش' کا وہ نعرہ لگاتے کہ کان کے پردے پھٹ جانے کا ڈر پیدا ہو جاتا۔ مَیں نے چاہا کہ کسی بنچ پر بیٹھوں، مگر ان منڈلاتے گدھوں کی چیخ نے قدم اُکھاڑ دیے۔ سب سے الگ تھلگ جا کر ایک جگہ سبزہ پر بیٹھ رہا۔ دن کی گرمی نے حد درجہ حسّاس بنا دیا تھا۔ کسی سے باتیں کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ امین آباد کی چہل پہل میں کوئی مزہ نہیں آتا تھا۔ پھر رہ رہ کر دل میں خیال آتا ہندوستان کا کیا حشر ہونے والا ہے؟ خود اپنا کیا حشر ہونے والا ہے؟ آخر بھائی بھائی ایک دوسرے سے کیوں لڑتے ہیں؟ اتنی دشمنی کہ خون کے پیاسے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:

''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا''

یہاں بیر رکھنا ہی مذہب ہے۔ ہم آخر کیوں کر دوسرے مہذّب ملکوں کے مقابلے میں آ سکیں گے۔

''آج کل بارہ روپے ہفتے میں کیا کام چلتا ہے۔ کوٹھری کا کرایہ دو، مہریا، بوڑھی ماں، تین بچے، سب ملا کر چھ آدمی کا پیٹ پالو... مُسکل سے بھیّا ایک وخت روٹی ملتی ہے۔''... مزدوروں کا ایک گروہ قریب ہی آ کر بیٹھ گیا۔

دوسرے نے کہا۔ ''پھر بیماری آ جا رہی ہے۔ اس پر میٹ... ہر سٹے گھوس مانگتا ہے۔''

تیسرا بولا۔ ''اور ان کارخانوں میں کام کرنے میں جو بڑی کھرابی ہے، وہ یہ کہ جرا آنکھ

چوکی بس مسین نے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے۔"

چوتھا بولا: "اور اس سیٹھ کو تو دیکھو کیسا موٹر اُڑاتا چلتا ہے۔ ہم کھون پسینہ ایک کرتے ہیں تو ایک وکھت کھانے کو ملتا ہے۔ اور وہ رنڈی بازی کرتا پھرتا ہے!"

میں اُدھر چلا جدھر مندر رہے۔ بوڑھے، جوان، بچّے، عورتیں، مرد، ہاتھوں میں پھول اور مٹھائی لے کر مندر کے در تک جاتے، گھنٹا بجاتے، پرشاد چڑھاتے، پھر ہاتھ جوڑے مرادیں مانگتے پچھلے پاؤں پلٹتے۔ اس مجمع میں بھی ہر طبیعت اور ہر مزاج کے لوگ دکھائی دیے۔ مزدور بھی تھے، سیٹھ ساہوکار بھی، ایماندار بھی تھے، چور اُچکّے بھی، اور دیوی جی کے سامنے دُعا مانگنے والی دیویوں کے پتی بھی اور تماشائی بھی۔ مندر کیا تھا گنگا کا پاٹ تھا، جس پر ناپاک اور پاک، شُدھ اور اشُدھ سب یکساں طور پر ایک روحانی غسل کے لیے جمع تھے۔ اب اس کی گنتی کون جانے کہ ان میں سے کتنے اپنی موجودگی سے مندر کو ناپاک بنا رہے تھے، اور کتنی گندی روحوں کو یہ مذہبی استھان پوتر بنا رہا تھا۔

مَیں اور آگے بڑھ گیا۔ سامنے کاظم اینڈ کو کی گھڑیوں کی دُکان دکھائی دی۔ شیشوں میں سے چاندی کے کپ اور مختلف سامان اس طرح چمک رہے تھے کہ آنکھوں میں چکا چوندسی ہونے لگی۔ میں دُکان سجانے والوں کے سلیقہ کی دل ہی دل میں تعریف ہی کر رہا تھا کہ سردار گراموفون کمپنی والے نے فیاض خاں کا 'بہاگ' والا ریکارڈ لگا دیا۔ مجھے اس موٹی آواز کے لوچ نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ مالک دُکان سے صاحب سلامت تھی۔ ریکارڈ پورا سنا، پھر یہ پوچھ کر کہ فیاض خاں کا کوئی نیا ریکارڈ تو نہیں آیا؟ دُکان سے نکلا ہی تھا کہ کاظم اینڈ کو کے ہاں ایک بڑی شاندار موٹر آ کے رُکی۔ اس میں سے ایک پری اُتری۔ عورت کیا تھی، کریم، پاؤڈر، سُرمہ، لپ اسٹک، سینٹ، ریشمی کپڑوں کا مجموعہ تھی۔ مگر اتنے سارے بناؤ پر بھی یہ بات نمایاں تھی کہ سن ڈھل چکا ہے اور جوانی کا سورج ڈوب گیا ہے۔ ایک اُنیس بیس برس کا نوجوان بھی اس کے ساتھ تھا۔ داڑھی مونچھیں صاف، خوشنما سنہری عینک لگی اور ریشمی سُوٹ پہنے ہوئے۔

مَیں نے سردار سے پوچھا۔ "یہ کون لوگ ہیں؟"

وہ بولے۔ "یہ تتلی تورانی صاحبہ ہیں۔"

مَیں نے کہا۔ "اور وہ نوجوان ان کا لڑکا ہے؟"

وہ ذرا منہ بنا کر بولے۔ "جی نہیں وہ رانی صاحبہ کے نئے دوست ہیں!"

مَیں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''اور راجہ صاحب؟''

وہ بولے۔ ''جی، اُن سے آج کل ان صاحبزادے کی ماں سے دوستی ہے!''

مَیں نے رشتوں کے اس اُلجھاؤ سے گھبرا کر قدم بڑھایا۔ بھیک مانگنے والوں کی ایک قطار ملی۔ بوڑھے، بوڑھیاں، بچّے، بچیاں، اندھے لنگڑے لولے، طرح طرح کی بیماریوں میں گرفتار، میلے، گندے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے۔

''نواب صاحب ایک پیسہ! بابو جی ایک پیسہ! اللہ بھلا کرے گا، بھگوان آپ کی بھی سُنے گا!''

مغرب کا وقت تھا، اذان ہو رہی تھی۔ مسلمان جوق جوق جلدی جلدی لان کی طرف چلے جا رہے تھے۔ جیب سے پیسہ نکالنے میں دیر ہو جانے کا اور نماز کے قضا ہو جانے کا کھٹکا تھا... ہندوؤں کی سندھیا کا وقت تھا۔ وہ رُک کر ان بھکاریوں کی چیخ کیوں کر سنتے؟ پونجی پتی موٹروں میں اُڑے چلے جا رہے تھے، گپیں لڑاتے، گیہوں، شکر، گھی کے چور بازار کی نرخ پر بحث کرتے ہوئے۔ کالج کے نوجوان بیگم پارہ، اور نرگس کے مقابلے میں مشغول تھے، یا پھر سڑک پر سے گزرنے والی ہر صورت میں، ان نجس لوتھڑوں کو کون دیکھتا۔ مجھ سے بھی دیکھا نہ گیا۔ مَیں نے جیب میں دو انگلیاں ڈالیں۔ چار اکنیاں ہاتھ آئیں۔ مَیں نے انہیں اس گروہ کے سامنے زمین پر پھینک دیا۔ سب کے سب ان پیسوں پر اس طرح ٹوٹ پڑے جس طرح بھوکی مکھیاں تھوک پر گرتی ہیں، اور آپس میں اس طرح جھگڑنے لگے۔ جس طرح ہندوستانی کتّے سوکھی ہڈّیوں پر لڑتے ہیں!

(ترقی بنگلور شمارہ ۳)

ایک صبح، کئی کردار

کہنے کو تو اس عظیم و وسیع دنیا میں ہر جگہ ''صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے۔ عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے'' لیکن ہر ایک کے لیے نہ ہر صبح صبح ہوتی ہے اور نہ ہر شام شام، مزاج و طبیعت، عادت و خصلت، افلاس و دولت، مذہب و ملّت، مسکن و وطن، موقع محل، شام و سحر کو بدلتے رہتے ہیں اور تو اور، شہروں اور دیہاتوں کی صُبحیں اور شامیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ دیہاتوں میں نہ تو شہر جیسا شور و شغف، نہ تفریحوں کے سامان، نہ سینما اور تھیٹر کے رومان، نہ کلب گھروں کی میخواری، قمار بازی، نہ دفتروں کی دوڑ دُھوپ، نہ کچہریوں کی گہما گہمی، نہ طلبا و طالبات کا ہجوم اور نہ بات بات پر اُن کی ہڑتالیں، نہ فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلتا دُھواں، نہ ریل گاڑیوں، موٹروں، ٹرکوں کی گڑگڑاہٹ اور نہ گلی کوچوں میں سودا بیچنے والوں کی بے ہنگام یا خوش آئند صدائیں۔

دیہات میں سکوت و سکون، خاموشی اور اطمینان، محنت کے دن، آرام کی راتیں۔ صحت مندی کی فضا اور تازہ تازہ مٹّی کی خوشبو سے معطر ہوا۔

ناصر نے اس فرق کو بڑی شدّت سے محسوس کیا۔ وہ تازہ ولایت کی طرح بی اے کے امتحان سے فراغت پاکر اپنے وطن محمد پور آیا تھا۔ پردیس کے جہنم کی گود سے نکل کر ماں کے آغوش کی جنت میں! اس کے باپ یعقوب میاں محمد پور کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ ان کا وسیع اور پختہ مکان حویلی کہلاتا تھا۔ اس کے دو بڑے بڑے حصّے تھے۔ زنان خانہ خواتین کے لیے مخصوص تھا، وہیں یعقوب میاں بھی سوتے تھے اور چھوٹے بچّے بھی۔ مردانہ حصہ مرد عزیزوں، دوستوں سے ملنے کی جگہ تھی۔ معاملے، مقدمے کے فیصلے اور مہمانوں کا قیام یہیں رہتا۔ ناصر اب جوان تھا، ناکتخدا تھا اس لیے وہ جب وطن آتا تو مردانے ہی میں رہتا۔ باپ ماں کی نگراں نظروں سے دُور۔

اس نے اب کے آتے ہی ساری کتابیں 'سینت کر' رکھ دی تھیں۔ امتحان کے درمیان اور امتحان کے مہینوں پہلے سے ان کا اس طرح رات دن سامنا رہا تھا کہ اب ان کی صورت سے قے آتی تھی۔ اندر جاتا تو ماں سے ہوسٹل کے بدمزہ کھانوں اور ان میں 'فلفل پڑاں' کی افراط کا خوب نمک مرچ لگا کر ذکر کر کے طرح طرح کی لذیذ غذاؤں کی فرمائش کرتا اور ساری خواتین ''ہے ہے، اوئی! نوج!'' کہہ کر آستینیں چڑھا لیتیں اور خالص گھی میں دونوں ہاتھ ڈبوڈبو کر اس کے لیے طرح طرح کے پکوان تیار کرنے میں لگ جاتیں۔ باہر مردانے میں ہم سن اعزا اور دوستوں کا جمگھٹا رہتا، کبھی شکار کا پروگرام بنا کر میلوں ہرن اور نیلے کا پیچھا کیا جاتا اور دن بھر کی دوادوش کے بعد دو چار فاختہ، پانچ چار ہریل اور دو ایک تیتر مار لاتے۔ کبھی کورٹ پیس کی یا شطرنج کی محفلیں جمتیں۔ رات کے گیارہ گیارہ بجے تک اسی طرح کا جماؤ رہتا۔ پھر مجمع چھٹتا اور ناصر و غفور، اس کا پرانا ہم سبق، اپنے اپنے پلنگ پر غافل سو رہتے۔

غفور بھی خصوصیتِ خاص کا مالک تھا۔ دونوں نے الف، ب ساتھ شروع کی، مگر ناصر دو برس کے عرصے میں گلستاں بوستاں کی سیر کر کے شہر انگریزی پڑھنے چل دیا، اور وہ آمدنامہ ہی کی گردانوں کی ٹٹّی بھی نہ پھاند سکا۔ اس نے یہ دماغی ورزش تو چھوڑی اور جسمانی ریاضت پر پل پڑا۔ اس نے اچھے ہاتھ پاؤں نکالے اور خاصا پہلوان بن گیا۔ جہالت نے علم ہی سے نہیں، حلم سے بھی محروم کر دیا تھا اور اب وہ بات بات پر بزرگ ہو کہ خورد، ہر ایک سے خم ٹھونک کر لڑنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ مگر ناصر سے اُسے فطری اُنس تھا۔ ناصر اسے بیوقوف کہتا، موقع بے موقع ڈانٹ دیتا، مگر وہ اس کی ہر بات بہ خوشی انگیز کر لیتا تھا، اور جب بھی وہ آ جاتا تو رات دن سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتا۔ ناصر کو بھی شعوری طور پر اس کی معیت سے ایک طرح کا اطمینان رہتا۔ اس کے لیے غفور گویا رفعِ ضرر کا حرز تھا۔ اسی کی موجودگی کی وجہ سے وہ سال میں دس مہینے ڈالڈا کھانے والا بھی نڈر بن جاتا تھا۔

غرض، گھر پر پہنچتے ہی ناصر کے دن بھی اپنے تھے، شامیں اور راتیں بھی اپنی اور صحبتیں بھی اپنی۔ جی چاہا نماز کے لیے اٹھا، جی چاہا پلنگ پر پڑا خراٹے لیتا رہا۔ نہ کوئی ٹوکنے والا، نہ کوئی ٹھوکے دے کر اُٹھانے والا۔ دیر تک سونے میں یہ تکلیف ضرور ہوتی کہ سورج کی کرنیں تاکتی جھانکتی منہ پر آ کر جم جاتیں اور گرمی سے بے چین ہو کر آنکھ ملتا اُٹھ بیٹھنا پڑتا۔ غفور بھی اپنے محبوب کو ان شوخ چشموں سے نہ بچا سکتا۔ صحن میں آفتاب کا راج ہوتا، اس کے سامنے سر جھکانا

تو ممکن تھا، مگر اس سے آنکھیں لڑانا ناممکن۔

لیکن سورج کی ٹیڑھی ترچھی نظر سے گھنٹوں پہلے جو چیز ناصر ہی کی نہیں سارے گاؤں کی میٹھی نیند میں مخل ہوتی تھی وہ کھکھارو میاں کو شور نشور جیسی کھانسی تھی، عجیب لرزہ خیز کھانسی تھی ان کی اور عجیب وغریب شخصیت تھی کھکھارو میاں کی۔ ستر بہتر کا سن، لمبے چوڑے قد آور، گندمی رنگ، گول چہرے پر سفید بڑی سی داڑھی، چوڑی چوڑی ہڈّیاں۔ اس عمر میں بھی تیر کی طرح سیدھے سینہ تان کر چلتے۔ ہر قدم اتنا مضبوط پڑتا کہ زمین پر نشان اُبھر آتا۔ لوگ کہتے تھے کہ صبحِ کاذب سے بہت پہلے اُٹھتے تھے، تہجد پڑھتے، پھر تھوڑے ڈنڈ پیلتے، کچھ ہاتھ مگدر کے ہلاتے، پھر نیم کی مسواک سے رگڑ رگڑ کر دانت خوب صاف کرتے۔ منہ دھوتے، وضو کرتے اور نمازِ صبح ادا کر کے فوراً ہی ناشتہ کر ڈالتے، یہ رات میں ان کی نیک بیوی ان کے لیے ایک دسترخوان میں لپیٹ کر چھینکے پر رکھ دیتیں۔ یہ ناشتہ ہوتا تھا، تین گیہوں کی موٹی موٹی روٹیاں، شامی کباب کی دوٹکیاں یا سوکھے کوفتوں کی تین چار گولیاں یا گڑ کا ایک بڑا سا ٹکڑا۔ یہ اس ناشتے کو خوب چپل چپل کر کھاتے۔ دانت اب تک بالکل ثابت تھے اور آنکھ کی بینائی بھی قائم۔ ناشتہ ختم کرنے پر ایک بڑا کٹورہ ٹھنڈے پانی سے لبریز پیتے اور گھر سے بانس کا ایک موٹا سونٹا لے کر نکل پڑتے۔

گرمی ہو، جاڑا ہو، برسات ہو ان کی علی الصباح کی اس چہل قدمی میں کوئی فرق نہ آتا۔ نہ لباس میں کوئی خاص تبدیلی ہوتی۔ ململ کا ایک لمبا، تکمہ دار بائیں چھاتی کے اوپر گریبان بنا کرتا اور مارکین کا ایک بر کا، ٹخنوں سے اونچا پائجامہ زیب تن رہتا۔ جاڑوں میں گاؤں ہی کے گنڈریے کا بُنا ہوا ایک کھردرا کمبل کندھے پر ڈال لیتے اور برسات میں سونٹے کی جگہ ہاتھ میں چھتری اور پاؤں میں گھیتلے کی جگہ دو آنے کی منقش کھڑاؤں ہوتی۔ کھکھارو میاں کی چہل قدمی کا راستہ بھی معین تھا۔ وہ اپنے گھر سے نکل کر بستی کی آبادی بھر زور زور سے کھانس کر حلق کا بلغم صاف کرتے یا قصباتی زبان میں کھکھارتے ہوئے کھیتوں تک پہنچتے اور ان کی پتلی پتلی مینڈوں کو کچلتے آم کے کئی باغوں کو پار کرتے اور خود اپنے کھیتوں کی بھی خیر صلا لیتے ہوئے خاندانی ہڑاور تک جاتے۔ وہاں مردہ عزیزوں کی ٹوٹی دھنسی قبروں پر فاتحہ پڑھ کر سورج نکلنے سے پہلے ہی گھر پلٹ آتے۔ جاتے وقت کا وہ شور وشغب اب بالکل خاموشی سے بدل جاتا تھا گویا ان کا گلا فیکٹری کا بھونپو تھا جو مقررہ وقتوں پر ہی بجایا جاتا ہے۔

کھکھارو میاں کی یہ کھکھار نیم خفتہ، نیم بیدار نمازیوں کے لیے بے الفاظ کی اذان بنتی

اور گاؤں کے واحد مندر کے گھنٹہ بجانے اور شنکھ پھونکنے کا الارم۔ کھیت کھلیان والے بھی اس گھنٹی سے فائدہ اُٹھاتے، وہ جلدی سے اُٹھ کر مویشیوں کو ناند پر لگا دیتے اور اسٹیشن جا کر تڑکے گاڑی پکڑنے والے بھی ہوشیار ہو کر اپنا اپنا سامان درست کرنے لگتے۔

مگر کھکھارو میاں چہل قدمی سے واپسی پر جو اپنے گھر میں غروب ہوتے تو پھر ان کی صورت کوئی نہ دیکھتا۔ صرف دو موقعوں پر ان کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ کسی مجلسِ عزا میں آنسو بہاتے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے یا کسی مسلمان کے جنازے کو بعد غسل وکفن کندھا دیتے ہوئے۔ ورنہ وہ گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ کہتے ہیں کہ کھکھارو میاں کی اس گوشہ نشینی کا سبب دو جوان بیٹوں کی موت تھی۔ ان حادثات سے قبل وہ ایک ہنس مکھ، ملنسار، باغ و بہار آدمی تھے۔ لوگ تو اشارۃً کنایۃً یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ قدرے دل پھینک بھی تھے، لیکن طاعون نے جیسے ان کا ہرا بھرا باغ ویران کر دیا، ان سے کوچہ گردی بھی چھڑا دی، ہنسی دل لگی بھی چھین لی اور انھیں ایک راہب نما معتکف بنا دیا۔ اب گاؤں کے لیے ان کی خیریت سے باخبر ہونے کا اگر کوئی ذریعہ تھا تو وہی ان کی کھکھار۔

ایک صبح جب ناصر ایک نہایت ہی رومانی خواب دیکھ رہا تھا، کھکھارو میاں کی اسی بانگ نما کھانسی نے اسے جگا دیا۔ ہر نوجوان کی طرح خوابِ شیریں سے ناوقت جگائے جانے پر وہ بڑبڑایا۔ کھکھارو میاں کی بے موقع 'کھکھار' کو اس نے کوسا اور خواب کے ٹوٹے ہوئے رشتے شعوری طور پر جوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس سعیِ ناتمام کی بدولت غنودگی اس پر پھر سے طاری ہوگئی۔ دینداروں کا کہنا ہے کہ صبح تڑکے یادِ الٰہی کے لیے اُٹھنے والوں پر شیطان اور اس کے چیلوں کی خاص نظرِ عنایت رہتی ہے۔ جہاں عبادت گزاروں نے اُٹھنے کا قصد کیا اور یہ شریر اس کی پاؤں چمپی کرنے لگتے ہیں۔ پھر تو جسم کی کسمساہٹ اور رسمساہٹ میں وہ مزہ آتا ہے کہ ساری چُستیاں اور پھُرتیاں اس پر قربان! عجب نہیں کہ نافرمانوں کا یہ گروہ ناصر کے معاملے میں سو فیصدی کامیابی حاصل کر لیتا، لیکن دفعتہً کسی نے صدری پھاٹک کی کنڈی زور زور سے کھٹکھٹائی۔

ناصر کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں، مگر اس نے نہ آنکھ کھولی اور نہ وہ بولا۔ وہ جانتا تھا یہ کسی ہم چشم یا بزرگ قریہ ہی کی حرکت ہو سکتی ہے۔ رعایا پرجا میں سے کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ زمیندار کے پھاٹک کی کنڈی کھٹکھٹائے۔ بہت ہوتا تو وہ 'کھاں صاحب' یا 'کارندہ جی' کی ہانک لگاتا۔

اور ناصر یہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنوں میں سے کوئی آ کر صبح صبح اُسے جگائے اور نماز سے غفلت برتنے پر ٹوکے۔ زنجیر پھر زور سے کھڑکی تو چھانگر خاں نے نیند سے جاگ کر، غصہ سے غرّا کر پوچھا "ارے کون ہے بھائی!" اس کی آواز میں وہ ساری جھنجھلاہٹ تھی جو کچی نیند سے جگائے جانے والوں کے ہاں فطری طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔

یوں بھی چھانگر خاں بڑا اکڑو خاں تھا۔ وہ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار، مگر سب سے زیادہ نیک زمیندار کا سب سے پرانا منہ لگا پیادہ تھا۔ وہ ہما شما کو نظر میں نہ لاتا تھا۔ رعایا پرجا سے 'ابے تبے' کر کے بات کرتا تھا۔ یہ چھ فٹ کا لحیم شحیم ساٹھ برس کا 'پاٹھا' کسی زمانے میں پہلوانی بھی کر چکا تھا۔ جب سے لنگوٹ کھولا تھا اس نے نہ جانے کتنے رومانی معرکے سر کیے تھے۔ یعقوب میاں عام زمینداروں کے دستور کے خلاف نہ تو کسی اسامی پر لگان کا دعویٰ کرتے، نہ وصولی کے سلسلے میں کسی کی مشکیں کسواتے، نہ کسی قسم کے جبر و تشدد کو روا جانتے اور نہ کسی کی بہو بیٹی کو حریص نگاہوں سے تاکتے۔ ان کی اس نیکی اور 'بھل منساہت' کی کسر چھانگر نکال لیتا۔ وہ ہر ایک نادہند سے نذرانہ وصول کرتا، بالکل مہاجنوں کی طرح سود در سود پر روپیہ قرض دیتا۔ اور دوسروں کی بہو بیٹی کو اپنے لیے مالِ حلال سمجھتا۔ اس نے ایک چھوٹا سا مکان حویلی سے قریب ہی خرید لیا تھا اس لیے چھانگر کو بارہ بجے رات سے پہلے رومان لڑانے سے فرصت نہ ملتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ خلافِ معمول دیر میں سوتا اور دیر میں اُٹھتا تھا۔ ورنہ جیسے اپنا مکان ہونے پر بھی میاں کی ڈیوڑھی پر سونا اس کا معمول تھا، اسی طرح کھکھار و میاں کی کھکھار کے ساتھ ہی اُٹھنا اور اپنا زیل گڑگڑانا اس کا روزمرّہ کا دستور تھا۔

چھانگر کی وجہ تسمیہ ظاہر بظاہر تو کوئی نہ تھی۔ لیکن روایت ہے کہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو اس وقت اس کی چھوٹی انگلی کی جڑ میں ایک ننھا منا گوشت کا ٹکڑا لٹکا ہوا تھا۔ اس کی ماں نے اس کو چھٹی انگلی مان کر اس کا نام چھانگر رکھ دیا۔ باوا جان کو نہ تو نام پسند تھا اور نہ یہ چھچھڑا۔ اس لیے جس دن چھانگر باقاعدہ مسلمان بنایا گیا، نائی نے دوبارہ ہاتھ کی صفائی دکھائی اور سونے کی چڑیا دو چھچھڑے ایک ساتھ اپنی سنہری چونچ میں دبا کر فضا میں غائب ہو گئی۔ لیکن گو کہ ہاتھ کا چھٹا حصّے دار معدوم ہو گیا تھا مگر چھانگر کا نام چپکا ہی رہ گیا، نہ اس نام سے چھٹکارا ملا اور نہ اس ہاتھ کی ہزار پائی گرفت ڈھیلی ہوئی۔ رعایا پرجا کا گلا اسی سے دبایا جاتا تھا۔

لیکن چھانگر کو اس اکڑ کے باوجود بزرگ داشت کا بڑا خیال تھا۔ وہ جانتا تھا یعقوب

میاں اس کی ساری حرکتوں سے چشم پوشی کر سکتے ہیں، مگر وہ اس کے کسی طرح روادار نہیں ہو سکتے کہ ان کا کوئی ملازم ان کے ہمسر زمینداروں سے بدتمیزی یا بدتہذیبی سے پیش آئے۔ اس لیے جیسے ہی پھاٹک کے باہر سے جواب ملا کہ ''ارے میاں چھانگر، دروازہ کھولو! میں ہوں آفتاب!'' وہ ننگے پاؤں پھاٹک کی طرف لپکتا ہوا بولا۔ ''ارے آفتاب میاں آپ اتنے سویرے سویرے کہاں؟'' اور اس نے جلدی سے پھاٹک کھول دیا۔

اور اس سے برآمد ہوئے اپنا ہی جیسا ایک منحنی، سوکھا ہوا اُپلا ہاتھ میں لیے ہوئے آفتاب میاں۔ انھوں نے ایک بانگ دینے والے ٹینی مرغ کی طرح گردن اٹھا کر پورے صحن پر نظر ڈالی۔ دونوں نوجوان خوردوں کو خوابِ خرگوش میں پڑا دیکھ کر طنز سے مسکرائے، پھر بولے ''اچھا، تو یہاں ابھی رات ہی ہے!'' اور انھوں نے چھانگر کے دالان میں داخل ہونے والے زینے پر پاؤں رکھتے ہی دونوں سونے والوں کا نام لے لے کر پکارا۔ ''اے غفور! اے ناصر! اٹھو جی! نماز کا وقت جا رہا ہے!''

چھانگر نے انھیں مزید چیخ پکار سے ایک شرعی بات کہہ کر باز رکھنا چاہا۔ وہ یعقوب میاں کے ساتھ عتباتِ عالیات اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہو آیا تھا اس لیے اس کا شین قاف بھی درست تھا اور وہ تھوڑا بہت مسئلے مسائل سے بھی واقف تھا۔ اس نے کہا ''میاں میں نے اپنے کانوں سے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا ہے کہ نوجوانوں کو صبح کی نماز کے لیے زبردستی جگانے سے منع کیا گیا ہے!''

آفتاب میاں بولے: ''ہونہہ! نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، مگر ان کو سویرے تو جاگنا ہی چاہیے۔ مجھے نہیں دیکھتے ہو کہ پچھتّر کے لگ بھگ ہوں، مگر کھکھارو سے بھی پہلے اُٹھتا ہوں، بھینسوں کو اپنے ہاتھ سے ناند پر لگاتا ہوں، پھر مسجد میں آ کر غوطہ طہارت کرتا ہوں اور نماز پڑھتا ہوں۔ پھر جا کر اپنے ہاتھ سے دونوں بھینسوں کا دودھ دوہتا ہوں۔''

چھانگر نے چلم پر تمباکو اور ہلکا توا جماتے ہوئے بات کاٹی ''اس کے لیے تو بڑی مضبوط چٹکی کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ پہلوان بنجارن ہی اس کام کو...''

آفتاب میاں اپنا دُبلا سوکھا ہاتھ بڑھا کر بولے ''تم اس ہاتھ کو کیا سمجھتے ہو؟ یہ فولاد کا بنا ہے، فولاد کا!'' پھر ذرا سرگوشی کے لہجے میں بولے ''ارے میاں تم جانتے ہی ہو، گاؤں کے کٹر لوگوں کی ذہنیت۔ وہ بنجارن کے ہاتھ کا دوہا ہوا دودھ بھلا کیسے خریدیں گے! اس لیے سب کچھ

اپنے ہی ہاتھ سے کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ سب کرنے کی کیوں قوت ہے، اس لیے کہ ہمیشہ سے صبح سویرے اُٹھتا ہوں، کوّوں کے بولنے سے کہیں پہلے!" اور انھوں نے پھر ذرا ڈانٹ کر آواز دی "اٹھو جی غفور اور ناصر! کیا گھوڑے بیچ کر سوئے ہو!"

ناصر تو جاگ ہی رہا تھا غفور بھی جاگ گیا۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی صبح صبح آفتاب میاں کا چہرہ نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کالے کلوٹے پانچ فٹ دو اِنچ کے بخیل کا چہرہ۔ وہ عمر بھر کلکٹری کی مختلف چھوٹی بڑی اسامیوں پر کام کرنے کے سلسلے میں حاکموں کے روبرو رشوت لینے میں ہاتھ کی بڑی صفائی دکھاتے رہے تھے۔ گاؤں میں مشہور تھا کہ انھوں نے ہزاروں سونے چاندی کے سکّے زمین میں گاڑ رکھے ہیں اور بیس ہزار سے زائد رقم مختلف مقامات کے بینکوں میں جمع ہے اور خود کاشت کا ہزاروں ہزار سیر غلّہ ہر سال بیچ لیتے ہیں۔

سوائے ان کے یا ان کی خفیہ مدخولہ بنجارن کے کوئی ان کے گھر میں کھانے والا نہ تھا۔ لڑکیاں اپنی اپنی سسرال میں تھیں۔ ایک لڑکا تھا وہ بھی غریب اور یتیم بچوں کا وظیفہ حاصل کر کے شہر میں پڑھ رہا تھا اور ایک عزیز کے سر کھاتا پیتا تھا۔ جب کبھی وہ سال میں دو ایک ہفتے کے لیے آتا تو بنجارن میکے میں منتقل ہو جاتی اور آفتاب میاں خرچ کے بڑھ جانے کا گاؤں بھر میں رونا روتے۔ آخر اس بچّے کے لیے ایک آنہ روز کا گوشت یا کوئی ترکاری منگانی ہی پڑتی، نہیں تو بنجارن ان کے اور اپنے لیے جو یا باجرے کی موٹی موٹی ٹکیاں سینک دیتی اور بے مسالے کی اَرہر یا ماش کی دال اُبال دیتی اور دونوں لہسن، لال مرچ کی چٹنی کے ساتھ اسے نوشِ جان کر لیتے۔ آفتاب میاں نے تین تین بھینسیں پال رکھی تھیں۔ ان کا دودھ وہ گوالوں سے زیادہ مہنگے داموں پر کنٹر لوگوں کے ہاتھ بیچتے۔ جو بچ رہتا اس کا دَہی جما کر گھی نکالتے اور گھی الگ اور مٹھا الگ بیچتے۔ بنجارن ان کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ وہی بھینسوں کے گوبر اُٹھاتی، اُپلے پاتھتی، ان کی ٹوٹی پھوٹی پتیلیاں، دودھ کے برتن مانجھتی اور دسویں پندرہویں خود ان کو بھی مانجھ دھو دیتی۔ اس کم خرچ اور وافر آمد پر آفتاب میاں ہر وقت ہر ایک سے اپنی غربت کا دُکھڑا بیان کرتے، مگر ضرورت مند کسانوں کو سود در سود پر روپیہ قرض دیتے اور کابلیوں کی طرح ان سے تقاضا کر کے پائی پائی وصول کر لیتے۔ ہم چشموں میں یہ سود نفع کا نام اختیار کر لیتا اور ان کے ہاں ہر تقاضا ایک دعوت کی صورت اختیار کر لیتا، جس میں وہ اس طرح ڈٹ کر کھاتے کہ کئی وقت گھر میں ہانڈی چڑھنے کی حاجت نہ محسوس ہوتی۔ قصبہ میں کسی کو یاد نہ تھا کہ جب سے وہ پنشن لے

کر گھر آئے تھے انھوں نے کسی موقعے پر کسی کو بھی، بھولے چوکے ہی سہی اپنے ہاں کھانا کھلانے کی عزت بخشی ہو، البتہ خود ہر بہانے کھانے کو نہ چوکتے۔ وہ احسان کے بدلے احسان کرنے یا کسی کی نیکی کا بدلہ دے کر اس کے ثواب میں کمی کرنے کے قائل نہ تھے۔ بقول چھانگر کے ''آفتاب میاں مِلکی بھی تھے اور بنئے بھی۔ وہ کہتا مِلکی سینے پر سوار ہو کر حلق میں انگلی ڈال کر ہر طرح کی حرکتیں کر کے اپنا پیسہ وصول کر لیتا ہے، لیکن وقت پڑنے پر، شان دِکھانے کے لیے خاندان کی آن رکھنے کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہاتا ہے۔ بنیا کا اصولِ زندگی ہے ''چام جائے، دام نہ جائے!'' اس کو شان، آن، خاندان، کسی چیز کی پروا نہیں۔ وہ کسی حال میں روپیہ خرچ نہیں کر سکتا۔ آفتاب میاں مِلکی گھرانے میں پیدا ہوئے، اپنا روپیہ وصول کرنے میں وہ ایک کی جگہ دس وصول کرنے میں نہیں جھجکتے۔ مگر جہاں اپنی 'ٹنینٹ' سے روپیہ خرچ کرنے کا نام آیا وہ بالکل بنیا بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی کھال کھنچوالیں گے مگر دھیلا دینے پر راضی نہ ہوں گے!''

ایسے کنجوس مکھی چوس کی صبح صبح رونمائی کے معنی تھے دن بھر کے فاقے کو پیشگی دے کر بلانا۔ اس لیے ناصر نے پہلے تو آنکھ کھول کر اپنی ہتھیلی دیکھی، پھر غفور کی خمار اور غصّے سے سُرخ آنکھوں میں مسکراتے ہوئے دیکھ کر بہ آواز بلند کہا ''تسلیم دادا جان!''

انھوں نے ناصر و غفور کی طرف پشت کیے ہوئے ہی دعا دی ''جیتے رہو بیٹا! جیتے رہو!'' اور غفور ایک موٹی سی گالی دے کر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا ''اور تم جلد ہی مرو!'' اور قبل اس کے کہ وہ چھانگر کے بسکھٹ پر براجمان ہو کر ان کی طرف منہ کریں، دونوں نوجوان جلدی جلدی پھاٹک سے نکل کر حویلی سے ملی ہوئی مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔

آفتاب میاں نے اپنا اُپلا بسکھٹ پر اپنی بغل ہی میں رکھ لیا اور چھانگر سے بولے ''تمھارے نریل کا گاؤں گاؤں شہرہ ہے۔ میں نے سوچا چلو اپنے حقّے کے لیے آگ بھی لیتا آؤں اور ذرا گیا ساؤ کی تمبا کو اور تمھارے ہاتھ کی بھری ہوئی چلم کا مزہ بھی لے لوں۔ تم اچھا کرتے ہو کہ اس بنئے سے دو چلم تمبا کو 'بجرئ' کے بدلے میں ہر روز مفت وصول کر لیا کرتے ہو ورنہ وہ تو بڑا ناد ہند ہے۔ مفت میں یعقوب کی زمین پر مکان اور دُکان بنا رکھی ہے اور ٹکا دینے کا نام نہیں لیتا!''

اتنے میں آس پاس کے مکانوں کے نوکر بدھو، خیراتی، جمن بھی آ گئے اور سب چھانگر

کے ساتھ زمین پر اُکڑوں بیٹھ گئے اور نریل پر دو کشی چلنے لگی۔ آفتاب میاں کو مفت کا حقہ بھی مل گیا اور اپنی چرب زبانی کی نمائش کا موقع بھی۔ بیچارے نوکران کی موجودگی میں آپس کی چھیڑ چھاڑ اور ہر فقرے میں گالی کی آمیزش سے تو محروم رہے، لیکن اس عزّت سے سرفراز ضرور ہوئے کہ ایک زمیندار نے ان کی حقہ نوشی میں شرکت کی۔ پھر انھوں نے ایسے ایسے نکات بیان کیے کہ جو کبھی ان کے خواب وخیال میں بھی نہ آئے تھے، پھر بھی وہ ان کے لحاظ سے ایک کے بعد ایک دوسری چلم بھری جانے کا انتظار نہ کر سکے اور خلافِ معمول جلدی جلدی اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔ دوسری چلم جو ہمیشہ سلفہ سے بھری جاتی تھی چھانگر اور آفتاب میاں نے شروعات کی بلکہ تنہا آفتاب میاں ہی نے، اس لیے کہ وہ دو چار ہی کش لینے کی بعد صبح صبح حقہ نوشی کا انجام بھگتنے چلا گیا اور آفتاب میاں دالان میں یکہ وتنہا رہ گئے۔ گویا میدان انھیں کے ہاتھ رہا۔ جب ناصر اور چھانگر پلٹے تو وہ سلفے کو سچ مچ سلفہ بنا کر نریل ایک کونے میں دیوار سے لگا کر کھڑا کر چکے تھے اور اپنا محبوب دُبلا، پتلا سوکھا سہا اُپلا، بغیر آگ رکھے ہاتھ میں لیے دالان سے نیچے اُترنے کا قصد کر رہے تھے۔ چھانگر کو دیکھتے ہی بولے "میاں چھانگر خوش رہو! تم واقعی بہت ہی اچھا حقہ بھرتے ہو۔ طبیعت سیر ہوگئی۔ واہ، واہ۔ اب میں برابر صبح کا حقہ تمھارے ساتھ ہی آکر پیا کروں گا۔"

چھانگر نے کہا "تو میاں، یہ اُپلا تو یہیں رکھتے جایئے۔ کل کام آئے گا۔" آفتاب میاں نے اسے اس طرح دیکھا جس طرح مڈل اسکول کا ماسٹر کسی شاگرد کو اس کے بے تکے سوال کے بعد دیکھتا ہے۔ ناصر چونکہ ابھی تک ٹھٹکا ہوا پاس ہی کھڑا تھا اس لیے چھانگر کی جگہ وہی مخاطب بنایا گیا۔ وہ بولے:

"سنتے ہو میاں ناصر، اس چھانگر کی باتیں؟ اس کا یہ سن وسال ہوگیا، ایران، توران، نہ معلوم کہاں کہاں ہو آیا، مگر اسراف کے معنی اسے نہیں معلوم اور یہ بھی نہیں جانتا کہ خدا نے اپنے مقدس کلام میں اسراف کو صاف صاف منع کیا ہے!" پھر چھانگر کی طرف مڑ پڑے۔ "جانتے ہو اسراف کیا ہے؟ اسراف ہے فضول خرچی۔ میں جانتا ہوں کہ تمھیں ہر رات تمھاری سرکار پورا ایک بہت ہی بڑا جنگلی اُپلا مع ایک چنگاری کے لاکر دے جاتی ہے۔ اسی کو تم اپنے 'کوڑ' میں دبا دیتے ہو۔ اس کی آگ صبح کو اتنی ہوتی ہے کہ تم نہ صرف اپنی دو چلمیں بھر لیتے ہو بلکہ چولھا جلانے کے لیے آگ بھی زنان خانے میں بھیج دیتے ہو۔ غرض، تمھارے لیے سرکاری اُپلا بہت کافی ہوتا۔

ایسے میں اگر میرا اُپلا بھی اس میں بڑھا دیا جائے تو یہ بالکل فضول خرچی ہوگئی، اسراف محض! میرے لیے بھی گناہ، تمھارے لیے بھی گناہ؟"

پھر وہ خاص طور سے ناصر کی طرف پلٹ کر بولے "میاں ناصر، ان باریکیوں کو یہ بیچارہ چھانگر کیا سمجھے! تم تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے ہو، ذرا اسے دین ایمان کی باتیں بتاتے رہا کرو۔ اسے سمجھاؤ کہ اخلاق سے پیش آنا، دوسروں کی خاطر تواضع کرنا، خاص طور سے ہم سادات کی خدمت کرنا سب سے بڑی سعادت ہے۔ بہت بڑا کارثواب ہے۔ اس کے مفت ہی مفت حاصل کردہ تمبا کو کا دھواں صرف مرغولہ بن کر یونہی ہوا میں جذب نہیں ہو جاتا، وہ اس کے لیے جنت میں سونے چاندی کے محل بنانے میں کام آتا ہے!"

وہ کچھ اور کہنا چاہیے تھے کہ ان کی بھینس جیسی بنجارن لپکتی ہوئی پھاٹک میں داخل ہوئی اور دونوں موٹے موٹے ہاتھ کمر پر رکھ کر آفتاب میاں کو ملامت کرنے لگی "توں اِیہاں ٹھار بات بناوت ہَو اور اُوہاں دودھ دُوہل رکھل ہَو اوُر لوگ باگ آہکا لیوے کا ٹھار ہَن" (تم یہاں کھڑے باتیں بنا رہے ہو اور وہاں دودھ دوہا ہوا رکھا ہے اور لوگ اسے لینے کو کھڑے ہیں)

آفتاب میاں سٹپٹا گئے۔ دین ایمان کی باتوں پر بنجارن کی موجودگی نے بالکل ہی پانی پھیر دیا۔ وہ بگڑی بات بنانے کا پہلو ڈھونڈھ ہی رہے تھے کہ چھانگر بنجارن سے پوچھ بیٹھا "ارے تو کیا تم ہی سارا دودھ دوہتی ہو؟"

آفتاب دادا کے چہرے پر جھنجھلاہٹ، ندامت اور لالچ کے ملے جلے ہوئے جذبات تیزی سے آتے گئے اور جلدی سے اُس کی طرف اپنا پیارا اُپلا بڑھا کر بولے "تو چل میں آیا" اور میں پیٹ پکڑے ہوئے زنان خانے کی طرف بھاگا۔

(ماہنامہ لکھنؤ، ۲۶/جنوری، ۱۹۶۸ء)

باسی پھول

(حصہ دوم)

(باسی پھول کہانی کا حصہ اول ''علی عباس حسینی کی کہانیاں'' (حصہ اول)
میں ''پژمردہ کلیاں'' کے نام سے صفحہ ۱۷۴ تا ۱۸۹ پر شامل ہے)

صابرہ کو رخصت کیے ہوئے سات برس کا زمانہ گزر چکا تھا، میں بھی نوجوانی کی حدوں کو پار کر کے اور طالب علمی کی بے فکری کو خیرباد کہہ کے، اب ایک ذمہ دار انسان کی طرح، اور ایک باقاعدہ وکیل کی حیثیت سے، دن بھر کچہریوں کی خاک چھانتا اور بارہ بارہ بجے رات تک صابرہ کی یاد میں نہیں، بلکہ محض قانون حفظ کرنے، اور نظیریں ڈھونڈھنے کے لیے، لیمپ جلائے، اپنے دفتر میں بیٹھا کام کیا کرتا تھا۔ میں ہرگز دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ صابرہ کی یاد مجھے اب بھی ستاتی تھی، اس لیے کہ امتدادِ زمانہ نے دل کو اس تکلیف سے اِس قدر مانوس بنا دیا تھا کہ اب الم کی جگہ لذّت محسوس ہوتی تھی۔ سِن کے بڑھنے کی وجہ سے اعصابی ہیجان مفقود، اور جذبات کا وفور معدوم ہو گیا تھا۔ گویا چشمۂ محبت میں، برساتی مدوجزر کی جگہ، اب موسمِ گرما کی سبک و نرم روانی تھی، ہیجان و ہوسنا کی کے خس و خاشاک تہ نشیں ہو چکے تھے اور طغیان و طوفان کی جگہ صفائے قلب و استواریٔ وفا نے لے لی تھی۔ اگر دل میں درد تھا تو وہ بالکل ویسا جیسا کہ محنتِ شاقہ سے اعضا میں پیدا ہو جاتا ہے اور جس کی وجہ سے جسم کے دَبانے میں ایک خاص قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے، اس درد کو جوڑوں کی اس چوٹ سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں جو پُروائی میں چمک اُٹھتی ہے، صابرہ کی یاد کے لیے پُروائی کا کام وہ مرجھائی ہوئی کلی کرتی تھی، جو اب بھی، ہر سال عقد کی تاریخ کو، میرے پاس پُرزے میں لپٹی ہوئی

بھیج دی جاتی تھی، ان دِنوں میں پُرزے کی جگہ دو خطوں نے لے لی تھی۔ ان دونوں خطوں میں اظہارِ خلوص کے ساتھ ساتھ اس اَمر کی نصیحت کی گئی تھی کہ مجھے اب جلد سے جلد شادی کر لینا چاہیے اور آخری خط میں مشاطگی کے فرائض کی انجام دہی کی آمادگی بھی ظاہر کی گئی تھی!

مَیں جھوٹ نہ بولوں گا۔ مجھے شادی کے نام سے نفرت نہ تھی اور نہ اب مجھ میں صابرہ کے متعلق وہ والہانہ کیفیت باقی تھی کہ میں سوائے اس کے کسی دوسرے کے ساتھ اس ذکر ہی کو ناپسند کرتا، لیکن پھر بھی صابرہ کی طرف سے اس اَمر کی سلسلہٴ جنبانی بجھتی ہوئی آگ پر تیل چھڑکنے کے مترادف تھی۔ غور کرنے والی بات یہ تھی کہ وہ عورت جو شوہر، اولاد، اور خانہ داری کے علائق میں گرفتار ہونے کے باوجود ہر سال میری محبت کی یادگار مناتی رہے، جب میرے لیے رفیقِ تنہائی کی تلاش کا کام بھی اپنے ذمہ لے اور خود کوشش کرے تو اس کی اس نئی عنایت سے دل میں جذبہٴ امتنان بڑھے گا، یا نہیں، اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوگا یا نہیں؟ صابرہ کی محبت کو اگر کوئی شئے پھر اس کی پچھلی صورت میں لا سکتی تھی۔ تو اس کی یہ تحریک تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس آخری خط کے پانے کے بعد مَیں اپنے میں وہی والہانہ کیفیت پانے لگا، جو آٹھ برس پہلے مجھ میں موجود تھی۔ گویا آتشِ محبت کی بجھتی ہوئی چنگاری کو جو علائق کے خاکستر میں دَبی پڑی تھی، صابرہ نے پھر اپنے ہاتھوں ایک شعلہٴ جوالہ بنا دیا۔ مَیں سات دن متواتر شب و روز اس آگ میں جلتا رہا۔ بالآخر آٹھویں دن مَیں نے صابرہ کے خط کا جواب بھیجا اس خط میں مَیں نے خدا جانے کتنی قسموں کے ساتھ اپنے اس عہد کو دہرایا تھا کہ میں اب تمام عمر یوں ہی بن بیاہا رہوں گا اور خط ختم اس فقرے پر کیا تھا کہ ''مجھے نارمل کی زندگی سے اپنی یہی زندگی پسند ہے جب اتنی فرصت ہے کہ:

بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کیے ہوئے!

صابرہ نے جو اس کا جواب لکھا تھا وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ اس لئے اس کی نقل بآسانی ممکن ہے۔ ملاحظہ ہو:

''میرے دیوانے! آپ کا خط ملا۔ اسے پڑھ کر مجھے جتنی خوشی ہوئی اس سے زیادہ رنج ہوا۔ دنیا میں بھلا کون سی عورت ہے، جسے اس یقین سے خوشی نہیں ہوتی کہ اس سے ایک شریف تعلیم یافتہ مرد محبت کرتا ہے اور وہ بھی شریفوں کی طرح محبت کرتا ہے! آپ نے جس شرافت

سے میری اور اپنی محبت کو نباہا ہے، اس کی قدر نہ کرنا، عشق و وفا کا نام رُسوا کرنا ہے۔ لیکن واقعات، خواہشات کے پابند نہیں ہوتے اور جو کچھ میرا اور آپ کا جی چاہتا تھا، اور جو کچھ میرے اور آپ کے معاملے میں واقعات پیش آئے، اُن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ میں بیاہی جا چکی، خیر سے بچے والی بھی ہوں، اللہ اسے زندہ رکھے میرا بچہ تین چار برس کا ہو چکا ہے۔ بے حیائی ضرور ہے۔ مگر اظہارِ واقعہ اس موقع پر غالباً واجب ولازم ہے، اس لیے عرض کرتی ہوں کہ میرے بہار کے دن ختم ہو چکے۔ میری آنکھوں کا رس میرے ہاتھ پاؤں کا کس بل زائل ہو چکا ہے۔ مَیں نہ اب نوجوان ہوں نہ بن بیاہی اور آپ ابھی تک گذشتہ ایام کی تصویریں کلیجے سے لگائے بیٹھے ہیں! آپ کی صابرہ سات آٹھ برس قبل والی صابرہ اس دنیا میں نہیں ہے! پھر اس کی یاد کیسی؟ اور اس یاد پر دنیا کا تج دینا کیسا؟ کیا آپ کی اس محبت ......آپ کی اس وفا کے بعد بھی میرا جی نہیں چاہتا کہ میں آپ کو آرام سے دیکھوں؟ آپ کہیں گے۔ 'میرے لیے گزرے ہوئے دِنوں کی تصویریں بہت ہیں!' میں عرض کروں گی تصویروں میں وہ گرمی نہیں جو عورت کے دل میں ہے، وہ خدمت کی صلاحیت نہیں جو عورت کے نازک ہاتھوں میں ہے اور وہ تسکین دہی کی طاقت نہیں جو زندہ عورت کے سینے میں ہے! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں:

ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں!

مَیں اس لیے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں آپ کو خدا اور رسول کا واسطہ دلاتی ہوں اور آپ کو اپنے ہی سر کی قسم دیتی ہوں کہ اب بن بیاہے رہنے کے خیال کو دل سے نکال ڈالیے اور اپنا گھر بسایئے! زندگی کی گاڑی بغیر دونوں پہیوں کے نہیں چلتی۔ آپ دنیا میں رہ کے سنیاس لیے بیٹھے ہیں اور وہ بھی مجھ نصیب جلی کے لیے! وفا ہو چکی محبت کے امتحان کی حدیں کب کی گزر گئیں، اب تو صریحی خودکشی اور قطع نسل ہے! اگر مجھے آپ کی قدر نہ ہوتی۔ اگر میں آپ کے استقلال اور آپ کی پامردی کی قائل نہ ہوتی، یا میں آپ ہی کی صابرہ نہ ہوتی تو میں اپنی جگہ پر اس سے خوش ہوتی کہ آپ نے اپنی زندگی میرے پیچھے تباہ کر دی! لیکن میں سچ کہتی ہوں کہ مجھے آپ کی اس موجودہ زندگی کا جب خیال آتا ہے تو میں کانپ اُٹھتی ہوں۔ میری سی حقیر و ذلیل عورت کے لیے آپ سا مرد اور جوگ لے! یہ میرے اوپر اتنا بار ہے جو میرے کمزور

کاندھوں سے اُٹھایا نہیں جا سکتا! اللہ اپنے پر اور مجھ پر رحم کیجیے اور اپنا گھر بسائیے!

آپ اگر یوں نہ مانیں گے تو میں خود کوئی لڑکی تلاش کر کے آپ کے متعلق سلسلہ جنبانی شروع کر دوں گی، پھر تو آپ اپنی صابرہ کو جھوٹی نہیں بنا سکتے! میں آپ کے جواب کا بے چینی سے انتظار کرتی رہوں گی!''

اس خط کے پڑھنے کے بعد جو میری حالت ہوئی اس کا اندازہ انھیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جو صاحبانِ دل ہیں۔ ایک طرف تو میرے دل میں صابرہ کے اِس نئے ایثار اور اپنی یاد کی قربانی کی ترغیب پر مر مٹنے والا پیار آتا۔ دوسری جانب عقلِ سلیم یہ کہتی کہ صابرہ کی رائے درست وصحیح ہے! پھر عقل کی خشک ہیزمی رائےمیں اعصابی ہیجان ہاں میں ہاں ملا کر نرمی اور گرمی شامل کر دیتا۔ مرد ایسا مرد جس کے قوائے عقلی وذہنی درست ہوں، جس کی تندرستی ٹھیک ہو اور جس کو کوئی جسمانی بیماری نہ ہو، تاہل کی زندگی کے لیے فطرتاً مجبور ہے۔ یہی فطرت میری عقل کے ساتھ تھی۔ دل کہتا صابرہ کی سی شریف غیور اور باحیا خاتون کی یاد مجھ میں اب تک بس رہی ہے اس میں کسی دوسرے کی شرکت نہیں چاہتا، اس گھر میں کسی دوسرے کو جگہ نہیں مل سکتی۔ جسم کہتا میں ایک خیال اور ایک تصویر کے لیے اپنے کو کب تک مارتا رہوں؟ پھر یہ امر تو عقل کے بھی خلاف ہے اور فطرت کے بھی۔'' اس بحث میں بوالہوسی بھی آ کر شریک ہو جاتی اور اپنے مقصدِ خاص کے حصول کے لیے اور 'شیوۂ اہلِ نظر' کی شکست کی غرض سے یہ بہانہ پیش کرتی کہ صابرہ تو خود ہی اس پر مصر ہے کہ برہمچاریہ کا بھرم ٹوٹے اور وہ بھی کن الفاظ میں بغدا درسول کا واسطہ! اپنے سرعزیز کی قسم!

غرض رات دن میرا سینہ دیوانی کچہری تھا، جہاں دو مختلف الخیال وکیلوں کی جرح اور بحث بڑی گھما گھمی سے جاری رہتی اور مَیں ایک جج کی طرح سب کچھ سننے کے لیے مجبور تھا! مَیں نے چوتھے دن اس خانگی جنگ سے عاجز آ کر صابرہ کے خط کے جواب میں لکھ بھیجا:

''نہ فراموش ہونے والی صابرہ! تمھارا خط ملا میں تمھیں اس کے جواب میں کیا لکھوں؟'' زہر دے اس پر یہ تاکید کہ پینا ہوگا! میں تمھارا صید، تمھارا گرفتار، تمھارا غلام! تم مجھے اپنا بنا کے رکھو، کسی دوسرے کو تحفۃً دے دو یا ہمیشہ کے لیے گلا گھونٹ دو! تم مالک ومختار ہو نہ اپنے قبضۂ قدرت میں ہوں، نہ مجھ میں فیصلہ کرنے کی اور نہ عزم وارادہ کی صلاحیت ہے! بس اتنا

جانتا ہوں کہ قفس یا قید خانے کے بدلنے سے میں نہیں بدل سکتا! میں تمھارا ہوں اور تمھارا ہی رہوں گا!"

دوسرے ہی دن جواب آیا۔ "بہت خوب میں اپنے ہی اختیارِ تیزی سے کام لوں گی۔ اور آپ کا گھر بسا کے دم لوں گی۔ اب آپ کو اپیل کا اختیار نہیں!"

اس کے بعد ایک ہفتہ تک کوئی خط نہیں آیا۔ پھر ایک پرزہ ملا۔

"نواب... کی صاحبزادی میری دیکھی بھالی ہیں۔ حسین سلیقہ شعار پڑھی لکھی اور نیک چلن۔ مَیں نے ان سے بات طے کر دی ہے۔ شاید اُدھر کے لوگ آپ سے کسی دن ملنے آئیں۔ خدا کے لیے کوئی ایسی بات نہ کہہ دیجیے گا کہ ان لوگوں کو ناگوار ہو اور میری سبکی ہو!"

بہر حال وہ حضرات آئے، گفتگو ہوئی اور پسند کا اظہار ڈھکے پردوں فرما کر میرا فوٹو لے گئے۔ مَیں نے اپنے ایک دوست جاوید صاحب کو تاریخ وساعت کا دن اور وقت کا تقرر اور تمام انتظامات کا اہتمام سپرد کیا اور خود ایک کمیشن کے سلسلے میں دو ہفتے کے لیے کلکتہ چلا گیا۔

کلکتہ کی سیر وتفریح میں بہت کچھ دل بہل گیا تھا اور ہونے والی شادی کا خیال وہاں کے مختلف اسٹوڈیوں کے دیکھنے کے سلسلے میں ذہن میں دُھندلا سا رہ گیا تھا کہ دفعتاً میاں جاوید کا خط ملا۔ لکھا تھا کہ 'عقد کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے اور اب صرف بیس دن باقی رہ گئے ہیں اس لیے تمھیں جلد سے جلد واپس آنا چاہیے۔ نیز اپنے ہمراہ وہ تمام چیزیں لیتے آنا جو فہرست منسلکہ میں درج ہیں۔"

جی تو چاہتا تھا کہ میں اس مہمل خط کو 'ورق بے معنی' کہہ کر دریائے گنگ میں غرق کردوں، لیکن صابرہ سے زبان ہار چکا تھا اور بوالہوسی اور جسمانی لذات کی خواہش مارِ آستین بنی موجود تھی۔ اُس نے پھر سبز باغ دکھانا شروع کیا اور میں جاوید کے احکام کی تعمیل پر مجبور ہو گیا۔

تین چار دن بعد جب میں ایک اچھی خاصی دُکان کھولنے کا سامان ساتھ لے کر لکھنؤ واپس آیا، تو جاوید اسٹیشن پر موجود ملے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ شادی کی تاریخ محض اس لیے بڑھا دینا پڑی کہ لڑکی والوں میں سے کسی عزیز قریب کا دفعتاً انتقال ہو گیا اور اب جب تک کہ ان کی برسی نہ ہو جائے شادی نہیں ہو سکتی۔ میں نے ذرا اطمینان کی سانس لی اور گھر پہنچ کر میاں جاوید تو اپنی فرمائشات کی فہرست سے خرید شدہ تحائف ملاتے رہے اور مَیں اس تھکے ہوئے

مزدور کی طرح جو بارِ گراں منزلِ مقصود تک پہنچانے کے بعد سبکدوش ہو جاتا ہے، پڑ کے سو رہا۔ قریب شام جب میں سو کے اُٹھا تو جاوید گھر جا چکے تھے۔ منشی جی بھی نہیں آئے تھے اس لیے میں دیر تک حمام میں بیٹھا نہایا کیا۔

اس دیر کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے نہانے میں خاص لطف آ رہا تھا، بلکہ حمام میں پہنچتے ہی مجھے اپنا وہ نہانا یاد آ گیا جو مجھے عشق کی ابتدائی منزلوں میں بارہ بنکی کے سفر کے بعد پیش آیا تھا۔ اور پھر آٹھ برس پہلے والی صورت دماغ نے نظروں کے سامنے پیش کر دی اور پھر وہی ربودگی، وہی بدحواسی پیدا ہو چلی تھی کہ یہ خیال آیا کہ ہونے والی سسرال میں موت، صابرہ کو خط لکھنے کی نوید لے کر آئی۔ مَیں نے اس آٹھ برس کے عرصے میں نہ تو صابرہ کے میاں سے ملنے کی کوشش کی تھی اور نہ خود کبھی خط لکھنے میں سبقت کی تھی، لیکن آج بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ اس حادثے کے متعلق مزید تفصیلات جاننے کی کوشش نہ کرنا خلافِ انسانیت و مروّت ہوتا۔ اس لیے مَیں نے جلدی جلدی جسم خشک کر کے کپڑے پہنے اور صابرہ کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ پورا خط مجھے یاد نہیں، لیکن بعض حصّے اب بھی حافظے میں محفوظ ہیں۔ مَیں نے کلکتہ سے واپسی کی خبر دینے اور اس کی خوشی کے لیے اپنے کو شادی کی دیوی پر بھینٹ چڑھا دینے کا تازہ وعدہ کرنے کے بعد اس حادثے کی نوعیت کے متعلق اطلاع چاہی تھی اور پھر ایک بار لجاجت سے لکھا تھا:

''صبر آزما صابرہ! یہ یاد رکھو کہ یہ رشتہ میں نے تمھارے حکم سے منظور کیا ہے۔ لیکن یہ میری محبت کا تم سخت تریں امتحان لے رہی ہو۔ تم کہہ سکتی ہو کہ:

بت سامنے رکھ لینا اور یادِ خدا کرنا!

مگر دیوی یہ مجسّمے اس کے لیے بنائے جاتے ہیں جو جسم و جسمانیات سے منزل ہے نہ کہ اس کی عوض جو حسن مجسم ہو! تمھارے پرستار کے لیے پتھر کی دیوی میں دل پھونکنے والی گرمی کہاں؟ تم کہو گی وہ پتھر کی نہیں، انسان ہے، جوان ہے! مجھے یہ تسلیم ہے، پہلو ضرور گرم ہوگا، میں کوئی راہب نہیں! لیکن... میری صابرہ سمجھنے کی کوشش کرو کیا تم تاہل کی زندگی میں مجھے بھول سکیں؟ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے جواب دو۔ کیا کسی خیالی تصویر کو دل سے لگائے بیٹھے رہنا اس حالت میں بھی اتنا ہی آسان ہے؟ تم کہو گی میں عورت ذات ہو کر یہ مراحل جھیل رہی ہوں، تم مرد ہو کر اس مصیبت سے کیوں ڈرتے ہو؟ میں کہوں گا کہ یہ تو مقتضائے دوستی نہیں کہ کہا جائے

کہ ''ہم تو ڈوبے ہیں مگر یار کو لے ڈوبیں گے!'' تم ایک شریف بے بس خاتون تھیں اور میں ایک آزاد و خود مختار مرد ہوں۔ تمھیں زبردستی بیڑیاں پہنائیں گئیں۔ تم چاہتی ہو میں خوشی خوشی خود سے پہن لوں۔ للّٰہ اب سے اپنے بندہ پر رحم کرو! جب سے میں نے اس حادثے کی خبر سنی ہے۔ ''فرصت کے رات دن'' کے شیریں خواب پھر دیکھنے لگا ہوں۔ کاش یہ خواب تمھارے ہاتھوں شرمندۂ تعبیر نہ بنتا۔

غرض مختلف پیرایوں میں بہت سی خوشامد اور لجاجت لکھ کر لفافہ بند کیا، مہر لگائی اور اپنے سب سے معتمد آدمی کو بلا کر حوالہ کیا، نواب صاحب کی حویلی کا پتہ بتایا اور تاکید کردی کہ سوائے رسولن ماما کے جو میرے اور صابرہ کے خطوط لایا لے جایا کرتی تھی کسی دوسرے کو خط نہ دے۔ کوئی دو گھنٹہ بعد صابرہ کا جواب آیا۔ میرے ہی خط پر لکھا تھا۔

''رشید صاحب! آپ کی شادی مجھ ہی مانگ اُجڑی کی وجہ سے رُک گئی، آج پانچواں دن ہے کہ میرا بچہ یتیم ہو گیا۔''

اس خبر کا مجھ پر جو اثر ہوا اس کا تجزیہ مشکل ہے۔ میں کبھی روتا تھا اور کبھی ہنستا تھا۔ روتا اِس لیے تھا کہ صابرہ نے میرا گھر بسانے کی کوشش کی اور اس کا گھر خود اُجڑ گیا۔ ایک رنجور و مجبور انسان میں اپنے کو خاص طور سے قسمت کا ستایا سمجھ لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے وہ یہ بہت آسانی سے یقین کر لیتا ہے کہ اس کے دوست احباب پر بھی جو مصائب آتے ہیں ان سب کا باعث وہی ہے۔ مَیں نے اپنے کو بہت دِنوں سے قسمت کا ستایا سمجھ رکھا تھا۔ اس لیے صابرہ کے اس نئے غم کا سبب بھی اپنے ہی کو مان لینا بہت ہی معمولی سی بات تھی، مَیں ان مصائب و تکالیف سے اچھی طرح واقف تھا جو ایک ہندوستانی بیوہ کو آئے دن برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ میں اس کو خوب جانتا تھا کہ ہمارے اس ملک میں بیوہ کے معنی بعض موقعوں پر بالکل اچھوت کے ہیں۔ یہی نہیں کہ اس سہاگ چھن جاتا ہے اور وہ دنیاوی جنگ کے لیے بالکل یکہ و تنہا رہ جاتی ہے، بلکہ اس کے لیے اس طرح کے آلام و مصائب فراہم کردیئے جاتے ہیں جو دیگر ممالک کے باشندوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتے، دولہا کا ہر عزیز اسے بھَن پیری، منحوس اور قاتلہ سمجھنے لگتا ہے اور اپنی اپنی ذہنیت اور صلاحیت کے مطابق اس کے لیے سزائیں تجویز کرتا ہے۔ صابرہ واقعی اسم بامسمّیٰ تھی۔ اس کا تحمل اس کی بردباری اس کا استقلال بے

عدیل ونظیر تھا۔ لیکن پھر بھی میاں کا سہارا اُٹھ جانے اور ایک باعصمت پردہ دار خاتون ہونے کی وجہ سے اس پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا تھا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں کس طرح اس کے پاس پہنچ کے اسے تسکین دوں، اس لیے اپنی اور اس کی بے بسی پر دل کڑھتا اور آنسو اُمڈے آتے تھے۔

ساتھ ہی ہنسی بھی آتی تھی اور وہ اس بات پر کہ بی صابرہ خوشیاں منانے اور مجھے دولہا بنانے چلی تھیں۔ گویا اس صنفی لطافت ونزاکت کے باوجود آپ نے میرے لیے قسامِ ازل اور کاتبِ تقدیر سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا تھا! ایک پری چہرہ کے دستِ سیمیں اور مقدر کا فولادی پنجہ! پھر اس خیال پر بھی ہنسی آتی تھی کہ جہاں تک اس ہونے والے رشتہ کا تعلق تھا، مجھے اس کے ٹل جانے سے خوشی تھی، مگر اُدھر دوسری جانب خدا جانے کیا کیا چہ میگوئیاں ہوں گی اور بہت ممکن ہے کہ وہ ناکردہ کار، جو میرے سر منڈھی جانے والی تھی، اپنے دل میں گھٹتی اور کڑھتی ہو۔ اِدھر اس مخمصے سے چھوٹنے پر اطمینان و امتنان کے جذبات اُدھر اس نئی رکاوٹ کے باعث ایک مستِ شباب حسینہ کے چہرے پر غم کے آثار!

میں سچ عرض کرتا ہوں کہ میرے دل میں سوائے ان جذبات کے اس وقت تک کوئی اور خیال نہ آیا تھا۔ لیکن شام کو جب جاوید آئے اور اُن سے گفتگو ہونے لگی تو انھوں نے ایک ایسا فقرہ کہہ دیا کہ جس سے میرے خیالات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا۔ جاوید میری اور صابرہ کی حالت پر افسوس کرتے رہے۔ اس کے بعد کچھ دیر چپ رہے۔ پھر یکبارگی مسکرا کر بول اُٹھے۔ ’’ارے یار رشید، تم بھی عجیب سودائی ہو۔ اب تو میدان صاف ہے، صابرہ بیگم تو اب تمھاری ہیں!‘‘

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے جاوید نے میرے قلب پر اچانک خنجر کا وار کر دیا ہو۔ میری اور صابرہ کی محبت ایسی نہ تھی کہ میں اس کی مصیبت کے وقت ان لغویات پر غور کر سکتا۔ مَیں نے اسی لیے جاوید کو بہت ہی تیکھے تیوروں سے دیکھ کر کہا۔ ’’جب تمھیں شریفوں کے احساسات و جذبات کا علم نہیں ہے، تو تم خاموش ہی رہنے کی کوشش کیوں نہیں کیا کرتے؟ جو مہمل بات منہ میں آئی کہہ گزرے!‘‘

وہ کچھ شرمندہ و منفعل ہو کر اپنی صفائی میں بحث کرنے کے لیے تیار ہوئے۔ مَیں نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔ ’’بہتر ہے کہ آپ اس وقت خاموش ہی رہیں اور نہ ممکن ہے کہ آپ پھر کوئی

ایسی بے تکی بات کہہ دیں کہ میرے لیے اور بھی باعثِ آزار و تکلیف ہو۔''

انھوں نے آزردہ ہو کر مجھے دیکھا اور اُٹھ کر گھر چلے گئے۔ تھوڑی دیر تو مَیں اُن کو چپکے چپکے خوب بُرا بھلا کہا کیا۔ پھر بد طینتی اور خود غرضی نے آہستہ آہستہ ان کی وکالت شروع کی۔ میں نے گھبرا کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اب میں لاکھ لاکھ لمبے لمبے ڈگ لگاتا اور سگریٹ پر سگریٹ پیتا ہوں مگر دماغ میں وہی ایک فقرہ گونج رہا ہے۔ ''اب میدان صاف ہے، صابرہ بیگم اب تو تمھاری ہیں!''

شریف جذبات کہتے کہ اس طرح کا خیال بھی اس وقت دل میں لانا کمینہ پن ہے، وہ تو میاں کے سوگ میں بیٹھی ہے، اسے تو اپنی خوشیوں کے پامال ہونے کا رنج ہے اور اپنے بچے کی یتیمی کی اذیت اور تمھیں اپنی خود غرضی سے۔ ظاہر بظاہر نہ سہی، مگر خفیہ طور پر مسرّت ہے۔ نہ تو اس کی تکلیف کا خیال اور نہ اس کا دھیان کہ تم اسے کس طرح تسکین دے سکتے ہو، بس اپنے حلوے مانڈے کی فکر!

رذیل جذبات کہتے...... آٹھ برس تک بیٹھے رہے، زندگی برباد کی، اب جب امید کی جھلک دکھائی دی تو خوش نہ ہونا اپنے کو فرشتہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ اب اس ستارۂ امید کو بھی زبردستی اگنی بیتال سمجھ کر اس سے گریز کرنا شرافت وغیرت نہیں، بلکہ خود کشی ہے اور نفس کا صریحی خون ہے۔ یہی کرنا تھا تو دنیاوی زندگی کی جہد للبقا میں حصّہ ہی کیوں لیا۔ راہب بن گئے ہوتے، اپنی شخصیت ہی مٹا ڈالی ہوتی، اپنے کو اِس طرح فنا کر دیا ہوتا کہ بجائے رشید کے 'صابرہ' ہو گئے ہوتے!''

یہ طعن و تشنیع، وار اور رد حملہ اور دفع، میرے سینے کے اندر برابر جاری رہے۔ مَیں نے بڑی مشکلوں سے اس جنگِ زرگری کو بند کیا اور صابرہ کو حسبِ ذیل تعزیت کا خط لکھا:

''میں تمھیں کس منہ سے تسکین دوں۔ نہ میں تمھارے گرد و پیش کے لوگوں سے واقف اور نہ ان واقعات کا مجھے حکم جو تمھیں اس وقت پیش آ رہے ہوں گے۔ بے بس ہوں ورنہ تم تک کسی طرح پہنچتا اور اپنا خون بہاتا، مگر تمھاری نرگسی آنکھوں سے آنسو نہ نکلنے دیتا لیکن اگر کسی قسم کا کام ہو تو خدارا اپنے غلام کو نہ بھولنا۔ اس وقت یہ نہ سوچو کہ میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ بس اتنی سی بات یاد رکھو کہ خداوندِ عالم نے تمھاری خدمت کے لیے ایک مشین نما انسان بنا دیا ہے جو

تمھاری خوشی کے سامنے دینا میں کسی اَمر کی پروانہیں کرتا۔ خدا ہی تمھیں صبر دے۔ یہ غم عورت کے لیے سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ خدا تمھارے بچے کو اپنی حفاظت وامانت میں رکھے۔ وہ ابھی اس نعمت کی قدر کیا جانے جو اس سے چھین لی گئی ہے۔ تمھیں کو اب باپ اور ماں دونوں کے فرائض ادا کرنے ہیں۔ میں تمھارے احکام کا ہر وقت منتظر رہوں گا۔"

صابرہ نے اس خط کا تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن دسواں بیسواں چہلم وغیرہ جو نواب صاحب مرحوم کے لیے کیا گیا، اُن سب کی مجھے باقاعدہ اطلاع دی گئی اور میں ہر ایک رسم میں برابر شریک ہوا۔ اس آمدورفت میں وہاں کے آدمیوں اور داروغہ وغیرہ سے ملاقات ہوگئی۔ اور مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ نواب صاحب کا پان سو کا وثیقہ تھا اور شہر میں چند مکانات بھی تھے، جن سے خاصا کرایہ آتا تھا۔ جس مکان میں صابرہ مقیم تھی، وہ پرانے محلوں کی شان کا تھا، مردانہ اور زنانہ حصّہ علیحدہ علیحدہ، کافی وسیع اور کشادہ تھا۔ لیکن چونکہ نواب صاحب کے بڑے بھائی اب تک بقیدِ حیات تھے، اس لیے یہ مکان دو حصّوں میں منقسم تھا۔ ایک میں اُن کے عیال رہتے تھے اور دوسرے میں صابرہ بیگم اور اُن کا بچّہ۔

چہلم کے بعد عدّت کی مدت تک صابرہ کی والدہ بیٹی کے ساتھ مقیم رہیں لیکن جیسے ہی یہ مدت ختم ہوئی اسے اپنے ہمراہ لے کر اپنے گھر چلی آئیں۔ یہاں آنے پر صابرہ نے رسولن کے ذریعہ میرے پاس کہلایا کہ مجھے اس کے چچا سے مل کر تمام واقعات معلوم کر لینا چاہئیں۔ اور وثیقہ ومکان کا داخل خارج بچے کے نام کرادینا چاہیے۔ نیز اس کی ولدیت کے متعلق ساری قانونی کارروائی کر ڈالنا چاہیے۔ مَیں نے صابرہ کے میکے میں آنا جانا شروع کیا۔ دو ایک بار تو صابرہ کے چچا 'بڑے صاحب' کا درمیان رہا پھر براہِ راست صابرہ کے ہاں تمام قضیہ مَیں نے کہلانا شروع کیا۔ اُدھر صابرہ کی سسرال والوں نے طرح طرح کے اُلجھاوے ڈالنا شروع کیے، بالآخر مقدمہ بازی تک نوبت آئی۔ مَیں بحمدہٖ اس اَمر میں کامیاب رہا۔ مَیں نے نواب صاحب کا وثیقہ اور تمام املاک صابرہ کے بچّے کے لیے بچالی اور صابرہ کو باقاعدہ اس کی ولیہ عدالت سے تسلیم کرالیا۔

ان تمام معاملات کے سلجھانے میں تقریباً ایک سال کا عرصہ لگا۔ میری ہونے والی سسرال والے چونکہ صابرہ کے فریق مخالف کے ہمدردوں میں تھے، اس لیے مجھے اُن کے ہاں

رشتہ سے انکار کرنے میں زیادہ وقت پیش نہیں آئی۔ اس کی اپیل اگر ہو سکتی تھی تو صابرہ ہی کے ہاں لیکن اب وہاں تک ان لوگوں کی رسائی نہ تھی۔

ہمارے نجی معاملات اتنے ترقی پذیر ہو گئے تھے کہ زنانے اور مردانے حصّے میں جو ٹیلی فون تھا۔ مجھے اس پر حاضر ہو کر ہفتے مقدمات کے سلسلے میں، صابرہ سے گفتگو کرنا پڑتی تھی۔ جس دن تک صاحبِ جج کی عدالت سے مقدمات کا آخری اور قطعی فیصلہ نہیں ہو گیا۔ مَیں نے کوئی بات سوائے قانون، گواہ اور مقدمے کے نہیں کی۔ مَیں ایک وکیل تھا اور صابرہ موکلہ لیکن... جب مَیں نے صاحبِ جج کی زبان سے فیصلہ اپنے موافق سنا۔ تو مَیں کچہری کے سارے کام چھوڑ کر سیدھا صابرہ کے مکان پہنچا، ٹیلیفون کی گھنٹی بجائی اور صابرہ کے 'ہلو' کہنے پر مبارکباد دی۔ وہ اپنے بچے کے حقوق کے محفوظ ہو جانے پر اس قدر خوش ہوئی کہ رونے لگی اور بھرّائی ہوئی آواز میں رُک رُک کے بولی۔

''رشید صاحب آپ نے مجھ پر اور میرے بچے پر وہ احسانات کیے ہیں کہ ان کا شکریہ لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''صابرہ غلاموں کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔''

وہ بے ساختہ بول اُٹھی ''وکیل صاحب میں تو خود کو آپ کی کنیز سمجھتی ہوں، آپ میرے محسن ہیں، میرے بچّے کے محسن ہیں! اللہ اب غلام کا لفظ کبھی اپنے نام کے ساتھ نہ استعمال کیجیے گا۔ مجھے حد درجہ تکلیف ہوتی ہے۔''

مَیں نے کہا۔ ''بہت خوب، لیکن پھر تم بھی کبھی شکریہ کا لفظ میرے بارے میں نہ نکالنا۔ اس سے بوئے غیریت آتی ہے۔ میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا۔ میرا قانون پڑھنا اب جا کے سپھل ہوا۔''

صابرہ نے کہا۔ ''یہ آپ کی نیکی و شرافت ہے۔''

میں نے کہا: ''جی نہیں یہ میری خود غرضی و نفسیات ہے۔''

صابرہ کے لب و لہجہ سے استعجاب کا پتہ چلتا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ کیونکر؟''

مَیں نے کہا: ''خود غرضی کا یہی تو تقاضا ہوتا ہے کہ جو کام کیا جائے وہ اس غرض سے کہ اس سے اپنی مصیبتیں گھٹیں، اپنی فکریں کم ہوں، اپنا دردِ دل زائل ہو، اپنے کو خوشی حاصل اور

اپنے قلب کو اطمینان وسکون حاصل ہو! مَیں نے بھی یہی کیا ہے اور صرف یہی! جس کام سے تمھاری تکلیفوں میں کمی ہو سکے، جس سے تمھارے آلام دُور ہوں، جس سے تمھاری راحت میں اضافہ ہو، وہ میرے لیے سب سے زیادہ موجب انبساط ومسرّت ہے اس لیے مَیں نے جو کچھ اِس معاملے میں کیا وہ محض اپنی ہی تکلیفوں کے کم کرنے کے لیے اور اپنی ہی مسرّتوں میں اضافہ کی غرض سے۔ یہ اگر خودغرضی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس میں کسی پر احسان کیسا اور مفت کے شکریہ کی کہاں گنجائش؟''

صابرہ دیر تک خاموش رہی۔ پھر رُک رُک کے بولی۔ ''تو پھر... اتنی محبت... اتنے ایثار کا... کچھ تو عرض میری طرف سے بھی ہونا چاہیے!''

مَیں نے کہا: ''اگر معاوضہ ہی لینا ہے تو پھر منہ مانگا ہی لوں گا۔''

صابرہ نے کچھ گھبرا کے ڈر کے پوچھا۔ ''وہ کیا ہے؟''

میں نے بہت ہی بیتابی سے کہا۔ ''کیا آج آٹھ برس کی پرستش کے بعد بھی پوچھنے کی ضرورت ہے؟ تم اور صرف تم!''

تھوڑی دیر سکوت رہا۔ پھر صابرہ آہستہ آہستہ بولی۔ ''اگر آپ کی جگہ کسی دوسرے نے یہ بات کہی ہوتی تو شاید مَیں اس سے زندگی بھر کے لیے خفا ہو جاتی۔''

مَیں نے عرض کیا۔ ''آخر اس خفگی کا نتیجہ کیا ہوتا؟ زائد سے زائد یہی کہ اِس سے زندگی بھر نہ ملتیں، اپنے حضور میں آنے کی اجازت نہ دیتیں۔ تو غلام باادب عرض کرے گا کہ خوشنودی کی حالت میں بھی تو اس پر یہ عتاب ہے۔ آخر خفگی وخوشی میں کیا فرق ہے؟''

پھر تھوڑی دیر سکوت رہا۔ اس کے بعد جواب ملا۔ ''اور یہ جو آپ سے باتیں کر رہی ہوں اور...''

جب وہ کہتے کہتے رُک گئی تو میں نے جواب دیا۔ ''میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن شاید اتنا تو ہر موکلہ کو اپنے وکیل سے کرنا ہی پڑتا۔''

صابرہ نے پوچھا۔ ''اسی خلوص سے؟''

میں نے کہا: ''جی ہاں، ورنہ خلوص سے کام بھی نہ ہوتا!''

صابرہ خاموش ہو گئی۔ مَیں نے کہا۔ ''صابرہ مجھ سے اِس طرح کی باتیں کرنے کا نتیجہ!

تم جانتی ہو کہ مجھے دنیا میں صرف ایک چیز کی خواہش ہے اور وہ تمھاری ذات ہے۔ مجھے نہ دولت کی ضرورت ہے، نہ عزّت کی، نہ وجاہت کی، میرے لیے ساری کائنات سمٹ کر صرف ایک ذات میں محدود ہو گئی ہے۔ مجھے اگر وہ ذات نہ ملی تو میرے لیے زندگی ایک مستقل عذاب ہے۔ اور اس کے بعد کی زندگی کے لیے نہ مجھے جہنم کا ڈر اور نہ جنت کی پروا!''

صابرہ نے بات کاٹ کر کہا: ''رشید صاحب میں نے مانا آپ کو میری وجہ سے بڑی اذیتیں ہوئیں مگر اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ آپ دین و ایمان سب بھول کر جہنم و جنت سب سے انکار کر کے کفر بکنے لگیں!''

میں نے غصّہ میں کہا۔ ''بیگم صاحبہ میں نے خدا اور رسول والی ہی بات کہی تھی جو آپ اس قدر برہم ہو گئیں کہ زندگی بھر کے لیے ناخوش ہونے کو تیار تھیں۔ کیا خدا نے بیوہ سے عقد کا حکم نہیں دیا؟ کیا رسول اللہ نے خود اس پر عمل کر کے نہیں دکھایا ہے؟ لیکن آپ نے اسے گالی کے مترادف سمجھا۔ سوائے ہندوستان کے کسی ملک میں اسے نہ معیوب سمجھتے ہیں اور نہ خلاف عقل و شرع...''

صابرہ نے پھر بات کاٹ کے پوچھا۔ ''اور ہم لوگ اس وقت ہیں کہاں؟ ہندوستان میں یا کسی اور ملک میں؟''

مَیں نے کہا: ''جی ہاں ہندوستان ہی میں ہیں۔ لیکن اب ہندوستان کے باشندے بھی نہ اسے معیوب سمجھتے ہیں اور نہ قابلِ مضحکہ، ہندوؤں نے یہ مذموم خیال اپنے دل سے نکال ڈالا۔ اب ان کے ہاں قابلِ شادی بیوائیں بٹھائی نہیں جاتی اور نہ ان کے سر مونڈے جاتے ہیں!''

صابرہ نے کہا۔ ''لیکن قابلِ شادی نا؟ یہاں قابلِ شادی کون ہے؟ جس کا کافی سِن آ چکا ہو، ایک بچہ کی ماں ہو چکی ہو اور اپنے میں بڑھاپے کے تمام آثار پاتی ہو، وہ قابلِ شادی کیونکر ہو سکتی ہے؟''

مَیں نے کہا: ''صابرہ خدا کے لیے ہارے ہوئے حریف کی طرح جھوٹ بولنے پر نہ اُتر آؤ۔ تم اپنے سن و سال کے متعلق اُس شخص سے گفتگو کر رہی ہو جو ایک سال سے تمھارا وکیل ہے اور آٹھ برس سے... تمھارا عاشق ہے۔ کیا مجھے اتنا بھی حساب نہیں آتا کہ میں پندرہ میں آٹھ

جوڑلوں اور اپنی عمر میں بھی اتنی ہی برسوں کا اضافہ کرلوں؟ اگر تم تیس برس کی ہوئیں تو میں بھی تیس برس کا، پھر شادی سے اور سن سے کیا تعلق؟ میری اور تمھاری محبت بھی بوالہوسی اور حیوانیت پر مبنی ہے کہ ہمارے عقد میں بھی جسمانی حیثیات و کیفیات کا لحاظ کیا جائے؟ صابرہ بیگم یہ جسم کی نہیں روح کی پیاس ہے! اسے سوائے تمھارے سارے عالم کے دریاؤں کا پانی، یہاں تک کہ کوثر و تسنیم کا آبِ شیریں بھی نہیں بجھا سکتا!"

صابرہ نے کہا: "لیکن وہ چشمہ جس سے آپ سیراب ہونا چاہتے ہیں اب خشک ہو گیا!"

مَیں نے خوفزدہ آواز میں دریافت کیا: "کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں رہی؟"

صابرہ نے کہا۔ "مَیں نے شاید مثال دینے میں غلطی کی۔ چشمہ خشک نہیں ہوا ہے۔ بلکہ وہ اس قدر گندہ کر دیا گیا ہے کہ وہ اب آپ کی پیاس بجھانے کے قابل نہیں رہا۔"

میں نے پوچھا۔ "یعنی؟"

وہ بولی۔ "یعنی یہ کہ میری محبت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ میں کسی اور کی بیوی بننے کے بعد آپ کی بنوں۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ محبت کس کی، جس کی بیوی تھیں یا میری؟"

وہ بھرآئی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ کی!"

میں نے کہا: "یہ اظہارِ محبت کا بالکل ہی انوکھا طریقہ ہے کہ چونکہ تمھیں مجھ سے محبت ہے۔ اس لیے میں ہمیشہ کے لیے محروم بنا دیا جاؤں۔"

صابرہ نے کہا: "جی نہیں یہ آپ کو ایک طرح کی خودکشی سے بچانا ہے..."

صابرہ یہیں تک کہنے پائی تھی کہ ایک معظمہ کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ غالباً ادھر متوجہ ہوئی اس لیے کہ کسی نے پوچھا۔ "کون ہے بیٹا۔ وکیل صاحب؟"

صابرہ نے کہا: "جی ہاں" انھوں نے کہا۔ "میری طرف سے اُن کو دُعا کہو۔"

میں ٹیلی فون سے سن رہا تھا۔ میں نے صابرہ کو پیغام کی زحمت سے بچایا اور خود اس سے تسلیم کرنے کو کہا اور مقدمہ جیتنے کی مبارکباد دی۔ وہ خود ٹیلی فون لے کر دعائیں دے کے بولیں۔ "خدا آپ کو بھی مبارک کرے یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے۔ آپ نے میرے یتیم بچّے

کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے محتاجی اور غریبی سے بچالیا، خدا آپ کو اُجر دے گا۔ ہم غریب دُکھیاریوں کے پاس کیا ہے جو ہم اس کا بدلہ ادا کر سکیں۔ مگر مَیں اتنا ضرور کہوں گی کہ اگر صابرہ اور اس کا لڑکا شریف ہیں، تو دونوں یہ احسان کسی وقت نہ بھولیں گے اور جان و مال عزّت و آبرو کسی چیز سے آپ کے معاملے میں دریغ نہ کریں گے۔"

میں نے عرض کیا۔ "یہ آپ کیا فرماتی ہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔"

"وہ بولیں۔ "میاں یہ تمھاری شرافت ہے کہ تم ایسا کہتے ہو، مجھے تو جہاں تک معلوم ہے تمھیں شاید اب تک کوئی فیس بھی نہیں دی گئی ہے۔"

بظاہر معظمہ نے صابرہ سے اس کی تصدیق چاہی اس لیے کہ وہ کہتی ہوئی سنائی دی کہ "امّی میں تو کہتے کہتے تھک گئی۔ اب آپ بھی ارشاد فرما کے دیکھ لیجیے۔"

معظمہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "کیوں میاں یہ کیا سنتی ہوں کہ تم فیس نہیں لینا چاہتے؟"

مَیں نے حجاب و شرم کو بالائے طاق رکھ کر موقع سے فائدہ اٹھایا اور عرض کیا بیگم صاحبہ یہ کس نے کہا میں فیس نہیں لینا چاہتا۔ "میں تو حضور خود مانگ رہا ہوں۔"

وہ بولیں: "صابرہ کہتی ہے میں فیس دینا چاہتی ہوں وہ نہیں لیتے۔"

مَیں نے عرض کیا۔ "جی ان کا بھی فرمانا ایک حد تک صحیح ہے اور جو کچھ میں نے عرض کیا وہ بھی صحیح ہے۔"

وہ بولیں: "بھئی! میں نے یہ پہیلی نہیں بوجھی۔ وہ بھی سچی آپ بھی سچے۔ وہ کہتی ہے آپ فیس نہیں لیتے، آپ کہتے ہیں میں مانگ رہا ہوں وہ نہیں دیتیں۔ آخر معمہ کیا ہے؟"

مَیں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "بیگم صاحبہ آپ نے ابھی اپنی عزّت افزائی اور بندہ نوازی سے یہ فرمایا تھا کہ تو نے وہ کام کیا ہے کہ صابرہ بیگم اور اُن کے صاحبزادے کو چاہیے کہ وہ تیرے لیے جان و مال عزت و آبرو تک دریغ نہ کریں۔

وہ فرمانے لگیں۔ "میں تو اب بھی کہتی ہوں کہ اگر یہ لوگ ایسا نہ کریں تو شریف نہیں جس شخص نے ایک سال سے اپنا خون پانی ایک کر دیا ہو۔ اپنے پیشہ کا کام ان کے پیچھے خراب کر دیا ہو، دنیا بھر سے ان کے کارن دشمنی مول لی ہو، جس نے ویسی ہمدردی کی ہو جیسی سگا باپ اور حقیقی بھائی مشکل سے کرتا ہو، اس کا احسان بھول جانا کمینوں کا کام ہے شریفوں کا نہیں۔"

میں نے کہا: ''تو معظمہ اس طرح کے کام کی فیس تو صابرہ بیگم نہیں ادا کر سکتی ہیں، حضور ہی عطا فرما سکتی ہیں۔''

وہ بہت ہی سادگی سے بولیں۔ ''تو میاں تم بتاؤ تو سہی۔ آخر کیا فیس ہوئی؟ مَیں ہی ادا کروں گی۔ تم میرے ہاتھ سے لے لینا۔''

مَیں نے رُکتے رُکتے عرض کیا۔ ''تو حضور میں تو اپنی محنت کی فیس یہی سمجھتا ہوں کہ حضور مجھ اس کا حق عطا فرما دیں کہ میں تمام عمر اسی طرح آپ کی صاحبزادی اور آپ کے نواسے کی خدمتیں کرتا رہوں۔''

وہ بیچاری اس گھماؤ کی بات کو نہ سمجھیں۔ گھبرا کے بیٹی سے پوچھنے لگیں کہ ''وکیل صاحب کیا فیس مانگتے ہیں۔ ان کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

وہ بولیں۔ ''امّی ٹیلی فون پر آپ سے انھوں نے کیا کہا مَیں اسے کیا جانوں آپ انھیں سے پوچھئے وہ خود ہی اپنا مطلب بتائیں گے۔''

جتنی دیر ماں بیٹی میں گفتگو ہوئی، اُتنی دیر مَیں میں نے جملہ ذہن میں ترتیب دے لیا تھا۔ اس لیے قبل اس کے کہ بیگم صاحبہ مجھ سے کچھ پوچھیں میں نے عرض کیا۔ ''جناب معظمہ نے میرا مطلب نہیں سمجھا میں یہ چاہتا ہوں کہ حضور اپنے اس غلام کو اپنی فرزندی میں لے لیں۔''

بیگم صاحبہ میرا یہ فقرہ سنتے ہی ساکت ہو گئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس سکوت کا باعثِ استعجاب تھا یا غصّہ۔ البتہ میری یہ حالت تھی کہ پنکھے لگے تھے۔ دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ دیکھئے اتنے دنوں کی امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے، یا سوکھے دھانوں پر پانی پڑتا ہے۔ ساری عمر کا اضطراب چند لمحوں میں آ کے جمع ہو گیا تھا۔ تین بار پیشانی سے پسینہ پونچھا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھرائی۔ شاید محشر کے دن قبل فیصلہ یہی کیفیت ہو گی! بارے مہر سکوت ٹوٹی بیگم صاحبہ آہستہ آہستہ بولیں۔

''میاں تم نے اِس وقت اچانک ایسی خواہش پیش کر دی جو خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔ میں بڑے سوچ میں پڑ گئی کہ تمھیں کیا جواب دوں۔''

مَیں نے جلدی سے عرض کیا۔ ''حضور میں یہ نہیں چاہتا کہ مجھے اسی وقت جواب مل جائے۔ حضور میری ذات میرے خاندان کے متعلق دریافت فرمالیں۔ میرے چال چلن کی

تحقیق کرلیں۔''

وہ بولیں۔ ''نہیں میاں، تمھارے چال چلن، تمھاری شرافت اور نیکی سے کون واقف نہیں ہے۔ پھر پڑھے لکھے، دال روٹی سے خوش، اللہ رکھے تم ہی ہو، مجھے ان باتوں کی فکر نہیں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اب صابرہ کنواری، بن بیاہی نہیں ہے، بیوہ، بچے والی ہے، اب اس کی خواہش و رضامندی ضروری ہے۔ ذرا اس کا عندیہ لے لوں اور دوسرے اعزا سے پوچھ گچھ لوں...''

میں نے کہا: ''تو مجھے اس وقت اجازت دیجیے۔ پھر انشاء اللہ ضرورت ہوگی تو حاضر ہوں گا۔''

انھوں نے فرمایا: ''اچھا خدا کو سونپا۔ سدھارو۔'' مَیں نے تسلیم کی اور وہاں سے چلا آیا رات کو رسولن ایک خط لے کر آئی۔ صابرہ نے لکھا تھا۔

''یہ آخر آپ کی عقل کو کیا ہو گیا ہے کہ دوستی اور دشمنی کی باتوں میں فرق نہیں سمجھا جاتا اور اپنی دھن میں چھوٹے بڑے کی تمیز بھی کھو بیٹھے۔ امّی سے بھلا اس طرح کی خواہش کا کیا موقع تھا؟ وہ میرا بھلا دیکھیں گی یا آپ کا؟ میں آپ سے منت کرتی ہوں کہ اب سے اپنے خیال سے باز آئیے۔ میں ڈھلتی ہوئی دُھوپ ہوں جس میں نہ آپ کو کوئی چمک دمک نظر آئے گی اور نہ کسی قسم کی گرمی محسوس ہوگی۔ میرے ہاں اچھی طرح خزاں آچکی ہے۔ آپ کے ابھی بہار کے دن ہیں۔ اپنی جوانی پر رحم کیجیے اور اس خیال بد کو دل سے نکال ڈالیے۔''

مَیں نے جواب میں لکھا:

''مجھے ڈھلتی ہوئی دُھوپ اور خزاں یافتہ بہار پسند ہے، خود میری محبت میں اتنی حدت ہے کہ وہ برودت کا سارا مخزن جلا سکتی ہے۔ میرے دل کی آگ تم کیا ہو، برف کی قاش میں بھی حرارت پیدا کرسکتی ہے! صابرہ بیگم صاحبہ! آپ میری ناصح و مشفق نہ بنیں بلکہ اس محبت کا مظاہر فرمائیں جس میں علیحدگی و جدائی کی جگہ اتحاد و اتصال کی خواہش کی جاتی ہے۔ مَیں صاف صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ اگر اب بھی انکار کیا گیا تو مجھے اِس امر کا یقین آجائے گا کہ مَیں آج ہی نہیں بلکہ پورے آٹھ سال سے بیوقوف بنایا جارہا ہوں اور پژمردہ کلیوں کے تحفے سے جس اُمید کو ہر سال تازہ کیا تھا، وہ محض موہوم تھی۔ اس یقین کے بعد میرا کیا حال ہوگا اس کا

علم خدا ہی کو ہے ابھی تک تو خیال تھا کہ ''بریں زیستم و بریں بگزرم'' لیکن جب یہ امید بھی جاتی رہے تو میری حالت اس عمارت کی ہوگی جس کا ستون اچانک گرا دیا جائے اور جس کی بنیاد کھود کر پھینک دی جائے۔ للہ اب زیادہ دل نہ دکھایئے:

رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

اِس خط کا کوئی جواب نہ ملا۔ لیکن تیسرے دن بیگم صاحبہ کی مہری ان کا خط لے کر آئی لکھا تھا:

''جس رشتے کی خواہش کی گئی تھی وہ مجھے اور تمام اعزا کو دل و جان سے پسند ہے مگر صابرہ نہ سر سے کھیلتی ہے اور نہ منہ سے بولتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔''

مَیں نے مہری سے کہا کہ ''اچھا تم جاؤ مَیں جواب بھیج دوں گا اور صابرہ کو خط لکھا:

''بیگم صاحبہ کی رضامندی کا صحیفہ آ گیا لیکن آپ کے ہاں ابھی وہی ضد جاری ہے خیر میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے۔ آج آپ کے سارے پچھلے خطوط اور ہر سال کی پژمردہ کلیاں اسی لفافہ میں ارسال ہیں یا تو آپ ان کے عوض ایک تازہ پھول بھیج کر میری استدعا قبول فرمائیں گی یا پھر اپنے سکوت سے اِس اَمر کو واضح فرما دیں گی کہ میری زندگی کا سب سے بہتر و شیریں خواب منت کش تعبیر نہ ہوگا! میں ۲۴ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد اس طرح روپوش ہو جاؤں گا کہ انشاء اللہ تعالیٰ تمام عمر آپ کو پتہ بھی نہ مل سکے گا۔''

کچھ ہی دیر بعد جواب آیا۔

''آپ خفا نہ ہوں، پھول بھیجا جاتا ہے مگر باسی ہے!''

میں نے بڑی سرمستی و خوشی سے لکھا۔ ''کچھ پروا نہیں۔ میں اِسی پھول کو خونِ دل سے سینچ کر پھر تر و تازہ کر لوں گا!'' اسی دن بیگم صاحبہ کو بھی اطلاع ہو گئی اور...اور...آج تک وہ پھول میری دستار کا زیب ہے اور بحمدہٗ اب تک تر و تازہ ہے:

اُن کے گلے کے باسی ہار، دیتے ہیں بوئے جانفزا
جن پر خزاں سی آ چلی، ہیں وہی گل بہار پر!

(باسی پھول)

باغی کی بیوی

اُن دنوں رادھا کے لیے کچھ کم تکلیفیں نہ تھیں۔ ڈیڑھ دوسو روپے مہینے خرچ کرنے کی جگہ وہ آج کل پیسے پیسے کو محتاج تھی۔ بچوں کے کپڑے میلے، چکٹ ہو ہو کے پھٹ چکے تھے۔ انہیں رات دن رفو کرتے کرتے اور گھر پر دھوتے دھوتے اس کے نازک ہاتھوں میں گھٹےّ پڑ گئے تھے۔ برتن باسن مانجھنے کے لیے بوڑی مہری جو میکے سے ساتھ آئی تھی اب بھی موجود تھی، اور مہینوں سے بالکل مفت کام کر رہی تھی۔ پھر بھی رادھا کا ضمیر اس سے یوں مفت کام لینے پر ملامت کرتا۔ وہ اِس لیے چوکا برتن کرنے میں مہری کی برابر شریک رہتی۔ غرض صبح چار بجے سے رات کے گیارہ بجے تک دم مارنے کی فرصت نہ ملتی۔ گود کے بچّے کی خدمت کرلیتی تو بڑا اُٹھتا۔ تھا تو وہ تین ہی برس کا مگر ماں کے ستانے میں چھوٹے کا مقابلہ کرتا۔ اگر وہ گود میں ہوتا تو یہ بھی گود چڑھنے کے لیے رو رو کر جان دیتا۔ اکیلی رادھا، کس کس کو سنبھالے۔ پھر گھر کا کام کاج پیسہ نہ ہونے پر ہر صبح اس کی فکر کہ آج آٹا کہاں سے آئے اور بنیے کو قرض دینے پر کس طرح راضی کیا جائے۔ ترکاری والے نے کل مہری کو بُرا بھلا کہا تھا کہ اب بغیر پیسہ لیے ہوئے دُکان پر نہ آنا۔ پیسہ کہاں سے اور کس سے منگایا جائے۔ کون سی چیز رہن رکھی جائے۔ کون سا گہنا بیچا جائے۔ رادھا یہ سب باتیں انگیز کر رہی تھیں۔ ہندوستان کی عورتوں کو آئے دن یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ صدیوں سے اُن کی یہی زندگی ہو رہی ہے۔ رادھا گو بڑے گھر کی بیٹی تھی مگر اُس کی رگوں میں بیسیوں ایسی بیویوں کا خون تھا جنھیں یہ سب جھیلنا پڑا تھا۔ اس کا شوہر مہیشور چھ مہینے سے پٹنہ میں بیکار پڑا تھا۔ ریلوے کی ملازمت اس نے اسٹرائک کے سلسلے میں کھودی تھی۔ دو چار مہینے تو گھر کا اندوختہ خرچ ہوتا رہا۔ اب بالکل ہی ہاتھ خالی ہو گیا تھا، پھر بھی

رادھا نے ہمّت نہ ہاری تھی۔ وہ شوہر کی اطاعت، بچوں کی خدمت اور گھر کے کام کاج میں لگی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بھی دن پھرے گا۔ وہ اسی روز کی منتظر ساری تکلیفیں برداشت کر رہی تھی۔ مگر شوہر کی حرکتوں نے اُسے حد درجہ پریشان کر دیا تھا۔ وہ ادھر ایک مہینے سے دن میں گھر سے باہر ہی نہ نکلتا تھا۔ البتہ شام ہوتے ہی چلا جاتا، اور کبھی بارہ بجے کبھی ایک بجے گھر پلٹتا۔ اُس کے چہرے سے پریشانی اور فکر کی جگہ اب وحشت کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ وہ دن رات کچھ سوچا کرتا اور آہستہ آہستہ اپنے سے باتیں کرتا تھا۔ رادھا نے دو چار روز تو خاموشی سے یہ حالت دیکھی۔ پھر ایک روز پوچھ بیٹھی کہ کیا معاملہ ہے؟ تم روزانہ شام کو کہاں جاتے ہو اور اتنی دیر تک کہاں رہتے ہو؟

مہیشور نے یہ کہہ کے بات ٹال دی کہ ”کچھ نہیں، ایک صاحب ریلوے کے افسر ہیں اُن سے کچھ کام بننے کی امید ہے، اُنھیں کے یہاں جاتا ہوں۔“ رادھا بھی خاموش ہو رہی، مگر جب اُس نے روز بروز شوہر کی وحشت میں اضافہ ہوتے دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ وہ بُرے کام کے لیے تیار ہو رہا ہے تو اس نے چپکے چپکے اس کے تمام حرکات وسکنات کو دیکھنا شروع کیا۔

مہیشور کا دماغی ہیجان ہر روز بڑھتا ہی جاتا تھا، وہ سوچتے سوچتے کبھی ہنس پڑتا تھا۔ کبھی ایک لمبی سانس اس طرح لیتا تھا کہ سیٹی کی سی آواز منہ سے نکل جاتی۔ کبھی سر ہلا کے خود ہی خود کہتا ”ایسوں کی یہی سزا ہے!“

وہ جب اس طرح سوچتا ہوتا تو اگر بڑا یا چھوٹا کوئی بچہ روتا تو اُس کی آنکھیں غصّے سے چمکنے لگتیں، وہ دانت پیس کے کہتا ”چپ بے کمبخت، نہیں تو گلا گھونٹ دوں گا۔“ پھر خود ہی چیخ اُٹھتا۔ ”بھگوان ایسے وقت ان بچوں ہی کے دینے کی کیا ضرورت تھی؟“

رادھا مہیشور کی ان حرکتوں کو دیکھتی اور ان باتوں کو سنتی اور اس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگتا۔ وہ شوہر پر اپنے خوف کو ظاہر نہ ہونے دیتی، مگر دل ہی دل میں اس ڈر سے کانپتی ہوتی کہ کہیں سوامی کا دماغ نہ خراب ہو جائے۔ کہیں وہ ایسی حرکت نہ کر بیٹھے کہ روپیوں پیسوں اور نوکری کے ساتھ ساتھ لعل سی جان بھی ہاتھ سے جائے۔ وہ جانتی تھی کہ آج کل کے زمانے میں اس شوہر کی طرح کے سینکڑوں نوجوان بیکار ہیں اور ہر ایک اپنی جان سے اور دُنیا سے خفا ہے۔ ہر ایک خطرناک سے خطرناک حرکت کرنے کے لیے تیار ہے۔ مہیشور کی ایسے ہی لوگوں سے دوستی ہے۔ اسے لوگ بہکا کر ہر طرح کے کام کے لیے تیار کر سکتے ہیں۔ اس نے اسی لیے اپنے دل میں یہ طے

کرلیا کہ وہ عمر میں پہلی دفعہ سمجھانے بجھانے کی کوشش کرے گی۔ اس نے اسی لیے ایک رات کو جب مہیشور ایک بجے رات کو مکان پلٹا تو ڈرتے ڈرتے کہا "یہ آدھی رات تک گھر سے باہر رہنا اچھا نہیں ہے۔" مہیشور نے اسے غصّے سے دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ رادھا شوہر کی تیکھی چتون سے سہم ضرور گئی، مگر اس نے پھر دل کڑا کر کے سوال کیا۔ "اگر رات کی جگہ دن میں باہر جایا کرو تو کیا ہرج ہے؟"

مہیشور نے توڑا ہوا نوالا تھالی میں رکھ دیا۔ غصّے سے بولا۔ "تو کیا تم چاہتی ہو کہ میں دن میں بھی گھر میں نہ رہوں؟"

رادھا نے شوہر کو خوشامدانہ انداز سے دیکھا وہ بولی۔ "میں یہ نہیں کہتی، مگر کام کاج کرنے یا گھومنے پھرنے کا وقت دن ہے یا رات میں۔ آٹھ نو بجے تک روزانہ دن بھر گھر میں رہنا اور پھر رات کو ایک ایک بجے تک گھومتے رہنا تو کچھ اچھا نہیں۔"

مہیشور نے تھالی کو ٹھوکر ماری اور چوکے سے اُٹھ گیا۔ سچ ہے ایسی زندگی سے موت بھلی ہے! خود اپنی بیوی بھی مرد کی اسی وقت تک عزت کرتی ہے جب تک جیب میں پیسے ہوں! رادھا نے چاہا کہ اسے روک لے، مگر اس نے اُسے اس طرح جھٹک دیا کہ وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچی۔ مہیشور تو منہ لپیٹ کے سو رہا، مگر رادھا رات بھر اپنی قسمت اور شوہر کی حالت پر رویا کی۔

صبح سویرے ہی مہیشور اُٹھ کے باہر چل دیا۔ دن بھر نہ آیا۔ رات کے کوئی بارہ بجے آیا اور کھانا مانگا۔ بوڑھی مہری اور بچے سو چکے تھے، مگر رادھا چولھے کے پاس کھانا لیے بیٹھی تھی۔ اس نے جلدی جلدی روٹی، دال اور بھاجی لا کے رکھ دی۔ مہیشور نے کوٹ نہ اُتارا بلکہ سارے کپڑے پہنے جوتا اُتار کے چوکے میں بیٹھ گیا، اور اس انداز سے کھانا شروع کیا جیسے اُسے کسی مہم پر جانا ہے۔ اس نے جلدی جلدی دو چار نوالے حلق سے اُتارے اور پانی پی کے چوکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ رادھا کو کل کا تلخ تجربہ تھا، اس نے آج ہاتھ تو نہ پکڑا مگر اتنا پوچھا ضرور کہ "کیا ہے؟ کاہے کی جلدی ہے؟"

مہیشور نے کہا: "کچھ نہیں، مَیں ابھی باہر جاؤں گا۔" رادھا گھبرا گئی، شوہر کی خفگی کا ڈر اس کے کسی خطرے میں پڑنے کے خوف کے سامنے بھول گیا۔ وہ جلدی سے ہاتھ پکڑ کے بولی "اتنی رات کو تو میں اب باہر نہ جانے دوں گی!"

مہیشور نے زہر خندہ کیا۔ پھر وہ بولا ''آج مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ آج مَیں اپنے دُشمنوں سے بدلا لینے جارہا ہوں۔'' اس نے یہ کہہ کے رادھا کا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ اُس نے گرفت اور مضبوط کی ہی تھی کہ چھوٹا بچہ رونے لگا۔ مہیشور نے کہا ''جاؤ دیکھو بھیا رو رہا ہے، اسے چپ کرا کے آؤ تو مجھ سے باتیں کرو۔'' رادھا کی گرفت ڈھیلی ہوگئی اور وہ اُدھر مڑ گئی جدھر اس کا چھوٹا لختِ جگر پلنگ پر تنہا پڑا رو رہا تھا۔ مہیشور نے اس جذبۂ مادرانہ سے فائدہ اُٹھایا اور ہاتھ چھڑا کے گھر کے باہر ہوگیا۔ رادھا کا پچھلا خوف عود کر آیا۔ اُسے یقین ہوگیا کہ سوامی آج جان دینے اور جان لینے جارہا ہے۔ اس نے لپک کے چھوٹے بچّے کو گود میں اُٹھایا اور اُسے لیے ہوئے شوہر کے پیچھے لپکی۔ اندھیری رات تھی، بادل گھر کے آگئے تھے، گلیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ شوہر کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی، مگر وہ محض پاؤں کی آہٹ لیتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ شوہر اس طرف جارہا تھا جدھر ریلوے لائن تھی۔ ان کا گھر کچھ دُور نہ تھا۔ وہ ان راستوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس کے دل میں معاً یہ خیال آیا کہ آج یقینی کچھ ریلوے ہی کے متعلق ہنگامہ ہونے والا ہے۔ اِس نے سنا تھا کہ آج کل ریلوے لائن اور پٹریوں پر باغیوں کا حملہ ہے۔ انھوں نے ٹرینوں کا لڑا دینا اور اُلٹ دینا سوراج حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ اسے یقین ہوگیا کہ اس کا شوہر بھی اسی حماقت میں گرفتار ہے۔ اس نے اپنے قدم اور تیز کیے۔ مگر کچھ دُور چلنے کے بعد معلوم ہوا کہ جیسے مہیشور زمین میں سما گیا۔ اس کے پاؤں کی آہٹ بالکل نہ سنائی دی، اسے یاد نہ آیا کہ وہ چند قدم پیچھے ایک ایسی گلی چھوڑ آئی ہے جو ذرا گھماؤ سے ریل کے چھوٹے پل کے پاس نکلتی ہے۔ پھر وہ پلٹی اور اُسی گلی میں گھسی۔ گلی حد درجہ تنگ اور تاریک تھی۔ بارہ بج چکے تھے، گھروں کے دروازے بند تھے، نہ کسی کے بولنے کی آواز نہ کسی کے جاگنے کی آہٹ ملتی تھی۔ اُس کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ وہ ایک نازک بدن کمزور عورت تھی، اُس نے بچے کو سینے سے قدرے زور سے لگا لیا۔ وہ معصوم سو رہا تھا مگر رادھا کے لیے اتنا سہارا ہی بہت تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس کے سینے سے ایک ایسا جوشن لگا ہے اور اس کے گلے میں ایک ایسا تعویذ ہے کہ دنیا کی آفتیں اس سے ٹل جائیں گی۔ وہ اسی طرح ڈرتی سہمتی بچے کو گلے سے لگائے پل تک پہنچی۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ریلوے پل کی دونوں جانب دیکھا مگر اُسے کوئی دکھائی نہ دیا۔ وہ جانتی تھی کہ آج کل ریلوے لائن پر برابر پولیس کا پہرا رہتا ہے۔ اس لیے اُس نے اپنے شوہر کو پکارا نہیں۔ اس کے دل میں یہ ڈر

سمایا ہوا تھا کہ مہیشور باغیوں کا ضرور شریک ہے۔ اور اس کے پاس پٹریاں اُکھاڑنے کے ہتھیار یقینی ہیں۔ اس نے کھانا کھلاتے وقت دیکھا تھا کہ اس کے کوٹ کی جیبیں بھری ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ پل کے پاس پہنچ کے یہ سوچتی رہی کہ وہ اب کیا کرے۔ شوہر کی تلاش کے لیے وہ کس طرف جائے۔ وہ اُس جانب مڑ پڑی جدھر اسٹیشن تھا۔ اسے دفعتاً یہ بھی یاد آ گیا کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں ہوڑا پشاور ایکسپریس آتی ہوگی۔ وہ پنجاب میل کی رفتار سے چلتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جلدی جلدی قدم رکھنا شروع کیے۔ اسے اسٹیشن پہنچ کر کسی طرح ایکسپریس رکوانا چاہیے۔ سینکڑوں بے قصوروں کی موت مہیشور کی چھ مہینے کی بیکاری کا بدلہ نہیں ہو سکتی ہے۔ اس میں کمپنی یا انگریزوں کا کیا نقصان ہے۔ ان کی کچھ گاڑیاں ٹوٹ جائیں گی، مگر جانیں تو جائیں گی ہندوستانیوں کی، پچاسوں عورتیں بیوہ ہو جائیں گی۔ سینکڑوں بچے یتیم ہو جائیں گے۔ اس کے قدم اور جلدی جلدی پڑنے لگے۔ اس کا دم پھولنے لگا۔ اس کے منہ سے ''ہے بھگوان! ہے بھگوان!'' کی ندا برابر نکل رہی تھی۔ وہ بچے کو کبھی داہنے کندھے سے لگاتی کبھی بائیں سے، کبھی ٹھوکر کھاتی، کبھی پھسل جاتی۔ مگر برابر اسٹیشن کی طرف بڑھتی جاتی۔ یہاں تک کہ اسٹیشن کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی دکھائی دینے لگی۔ اس کے دماغ سے شوہر کا خیال جاتا رہا تھا، بس کئی سو عورتوں کو بیوہ ہونے اور کئی سو بچوں کو یتیم ہونے سے بچانے کا خیال اُس کے دل میں بسا تھا کہ دفعتاً فاصلے والے سگنل کے پاس پہنچ کے وہ رُکی۔ مہیشور آخر کہاں ہے؟ کہیں وہ پل کی دوسری جانب تو نہیں ہے؟ وہ گھبرا کے وہیں بیٹھ گئی۔ سوچنے لگی مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سوامی کو پہلے بچانا چاہیے۔ اسٹیشن پر اگر جا کے کہتی ہوں تو سب پوچھیں گے تجھے کیونکر معلوم ہوا، پھر سوامی دھر لیے جائیں گے، پھانسی ہوگی یا کالے پانی بھیج دیے جائیں گے۔ میرے بچے مر ہی جائیں گے! ہائے رام کیا کروں؟'' وہ پھر اُٹھی اور اب اس طرف دوڑ کے چلنے لگی جدھر سے ابھی آئی تھی۔ تھک گئی تھی، بچہ گود میں لیے ہوئے چلنا آسان کام نہیں تھا۔ پھر ادھر مہینوں سے ہر روز آدھا پیٹ کھایا تھا۔ اپنا حصّہ بچوں اور سوامی کو کھلا دیا تھا۔ پھر ساری فکریں۔ حد درجہ کمزور تھی۔ کب کی تھک کے بیٹھ گئی ہوتی۔ مگر اس وقت قوتِ ارادی نے اعضا کو بالکل ہی محکوم کر لیا تھا۔ اپنی بساط سے زائد کام کر رہے تھے۔ وہ یوں ہی گرتی پڑتی پل تک پہنچی۔ ایک شخص پٹری کے قریب بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ رادھا نے پکارا ''کون سوا......؟''

مگر قبل اس کے کہ پورا لفظ منہ سے نکلے، مہیشور نے جیب سے ریوالور نکال کے فائر

کر دیا۔ گولی بائیں پہلو پر لگی۔ بچہ داہنے پہلو پر اس وقت تھا، وہ بچ گیا۔ مگر رادھا کے کاری زخم آیا وہ ایک سکنڈ تک جھوم کے وہیں گر پڑی۔ مہیشور نے کراہنے کی آواز سے محسوس کیا کہ زخمی کوئی مرد نہیں بلکہ عورت ہے، اور وہ گھبرا کے پُل سے کود کے رادھا کے پاس آیا۔ رادھا کی گود سے بچہ اب تک نہ چھوٹا تھا۔ اِس نے شوہر کو قریب دیکھ کر اب اسے چھوڑ دیا۔ بچہ اس پتھریلی سڑک پر گر کے رونے لگا۔ مہیشور ''ہائے بھگوان رادھا!'' کہہ کے بیوی کے قدموں کے پاس گر پڑا۔ اور ریوالور اپنے سر کے قریب لے جا کے گھوڑا دبانا ہی چاہتا تھا کہ رادھا نے ہاتھ پکڑ لیا۔ رُک رُک کے بولی ''دیکھو پولیس... کی سیٹی بج رہی ہے... آتی ہی ہوگی... اپنی جان... مت دو... میرے بچے... پالنے ہیں... کہہ دینا... مجھے... باغیوں نے مارا ہے... ریوالور پھینک دو...''

مہیشور نے کہا۔ ''میں تمھیں مارنے کے بعد جیوں... ناممکن ہے۔''

رادھا نے مہیشور کا ہاتھ اپنے کانپتے ہاتھوں سے پکڑ کے کہا: ''مجھے اپنے... مرنے کا رنج نہیں... استری کے لیے... سوامی کے ہاتھ سے... مارا جانا سورگ ہے... پر میرے بالک اب... تم کو پالنا... پڑے گا۔''

اور اس نے مہیشور کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا اور اُس کا ہاتھ بچے کے سر پر رکھ دیا...''
مہیشور بیوی اور بچّے کے درمیان غش کھا کے گر پڑا۔

(کچھ ہنسی نہیں اور...... ۱۹۳۳ء)

بجھتی شمع

(۱)

میجر سلیم کو اس وقت اپنی تنہائی کا شدید احساس تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ کرسمس کو دو ہی دن رہ گئے تھے۔ صبح سے برف میں جھلی ہوئی ہوا چل رہی تھی۔ اتنی ٹھنڈی کہ ہر جھونکے کے بعد رگوں میں خون جم جاتا تھا۔ دفتر سے تھکا ماندہ وہ ابھی اپنے گھر پلٹا تھا۔ گو موٹر کے شیشے ہر طرف سے چڑھے تھے، مگر مرکزی سکریٹریٹ کے گرم کمرے کے بعد اس کی قطع بھی برف میں جمی ہوئی قلفی کی تھی۔ اور جب وہ اپنے گھر پہنچا تو وہ گھر کہاں تھا۔ گھر دیوار و در، چھت اور فرش، قالین اور صوفے، مسہری اور ملازم سے نہیں بنتا، نہ اس کی ٹھنڈک بجلی کا ہیٹر لگا دینے سے چلی جاتی ہے۔ وہ تو ایک مسکراتی رفیقۂ حیات سے اور کھلکھلاتے، ہنستے، اُچھلتے کودتے بچوں سے گرماتا ہے۔ یہاں کیا تھا؟ وہ بوڑھی ماں بھی تو نہ رہ گئی تھی جس کے سہارے وہ گھر کی گرمی محسوس کرتا تھا اور جس کی موجودگی میں وہ ایک خیالی تصویر دل سے پچیس برس لگائے بیٹھا رہا تھا۔ وہی غالب کا مثالی تصورِ جاناں کیے ہوئے۔

تھا بھی کتنا پیارا وہ جہاں آرا کا تصور۔ ساتھ کی کھیلی ہوئی، پری چہرہ، گل اندام، وہ بے پئے مست خماری آنکھیں، وہ ناگن کی طرح بل کھاتی زلفِ سیہ فام، وہ بید کی طرح لچکتا جسم، وہ تناسبِ اعضا، موتیوں کی لڑی دانت، وہ گلاب کی پنکھڑیاں ہونٹ اور پھول بکھیرتی ہوئی ہنسی، کیا کیا دلربا تصویریں تھیں جو نظروں کے سامنے اِٹھلاتی پھرتیں۔ وہ روٹھنے کا پیارا انداز، وہ منہ چڑھانے کی شیریں ادا، اور وہ سلیم کی جھنجھلاہٹ پر اسے گدگدا کر ہنسانے کی شوخی، کیسے کیسے اس نے وعدے کیے تھے، کیسی کیسی سخت قسمیں کھائی تھیں، ”میں تمھاری ہوں، تمھاری ہی رہوں گی! نہ ماں

باپ مجھے مجبور کر سکتے ہیں اور نہ سماج اور معاشرہ مجھے کسی اور کا بنا سکتا ہے!''

بات بھی کوئی ایسی انوکھی انہونی نہ تھی۔ برابر کا جوڑا تھا۔ دونوں کے باپ ڈپٹی کلکٹر تھے، دونوں کے بنگلے ایک ہی احاطے میں تھے۔ دونوں کا لان ایک ہی تھا۔ دونوں کی پھلواریاں ایک ہی تھیں۔ دونوں بنگلوں کی برساتیوں میں سے گزرتی ہوئی سڑک ایک ہی تھی۔ دو سواری ایک پھاٹک سے آتی، اسے دونوں بنگلوں کے سامنے سے ہوکر دوسرے پھاٹک سے گزرنا پڑتا تھا۔ زمین و آسمان ایک ہی تھے، ماحول ایک ہی تھا۔ سنوں کا بھی کوئی خاص فرق نہ تھا۔ جہاں آرا سولہویں برس میں تھی اور سلیم نے اٹھارہویں میں قدم رکھا تھا۔ وہ سینئر کیمبرج کی تیاری کر رہی تھی، یہ انٹرمیڈیٹ کی۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے صورتاً اور سیرتاً ایک مثالی کردار تھے۔ دونوں میں قول وقرار، عہد و پیمان ہوئے۔ دونوں کو یقین تھا مستقبل ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ہم اسے اپنی خواہش کے مطابق بنالیں گے اور ہم زندگی کو ہمیشہ رنگین عینکوں سے دیکھتے رہیں گے۔

انھیں اس کا کبھی خیال بھی نہ آتا تھا کہ زندگی کی چادر کا تانا بانا خوشی و غم سے بنتا ہے۔ اس جہان میں جہاں کلیاں کھل کر پھول بنتی ہیں، وہیں ناشگفتہ غنچے مرجھاتے اور سرکتے بھی ہیں، جہاں شادی کے چہچہے سنائی دیتے ہیں، وہاں مرنے والوں پر نوحہ و ماتم کی صدائیں بھی آتی ہیں، جہاں تندرستوں کے کھیل کے میدان ہیں، وہیں مریضوں کے اسپتال بھی ہیں۔ سلیم و جہاں آرا بھولے سے بھی غم و جدائی، فراق و ہجر کا دل میں خیال نہ لاتے تھے لیکن دفعتاً سرکاری حکم آیا کہ جہاں آرا کے والد خان بہادر ابراہیم صاحب بجنور کے کلکٹر بنائے گئے۔

دونوں بنگلوں میں خوشیاں تھیں، کسی ایسے ہندوستانی افسر کا جو آئی سی ایس بھی نہ ہو انگریزی دَور میں ضلع کا حاکم اور کلکٹر بنایا جانا کوئی معمولی اعزاز نہ تھا۔ اس لیے جہاں آرا کے والدین اور بھائی ہی خوش نہ تھے بلکہ سلیم کے والد خان صاحب نعیم الدین اور ان کے گھر والے بھی خوش تھے۔ اخلاص کا تقاضہ یہی تھا، دوستی کے یہی معنی تھے۔ مگر سلیم و جہاں آرا کے چہرے فق تھے، دل رو رہے تھے۔ سب کے سامنے تو وہ سرکس کے مسخروں کی طرح مصنوعی خوشی کا چہرہ لگالیتے، مگر جب اکیلے میں ملتے تو آنکھوں میں آنسو ہوتے، سرد آہیں ہوتیں اور عہد و پیمان پر باقی رہنے کی بار بار قسمیں کھائی جاتیں۔ بار بار مشورے ہونے کے بعد ایک تدبیر ذہن میں آئی۔ سلیم نے ماں کی گود میں سر ڈال کر کہہ دیا کہ بیگم ابراہیم کے یہاں سے جانے سے پہلے

میرے لیے ابھی سے بات پکی کر لیجیے۔ وہ اس بات پر ہنس پڑیں۔ ''اچھا ابھی سے عشق لڑانے لگا۔'' مگر بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مامتا سے کلیجہ پھٹنے لگا۔ منہ بولی بہن کے پاس چلی گئیں۔ بہن گرہستی کا بکھرا ہوا سامان سمیٹنے، بکسوں میں بند کروانے، فرنیچر پر کاغذ لپٹوانے، غرض سفر کی پوری تیاری میں لگی تھیں۔ ان کو سلیم کی ماں کا بے وقت آنا کھلا۔ وہ اب ہونے والے کلکٹر کی بیوی تھیں۔ کون جانے کل ہی نعیم کا بجنور کا تبادلہ ہو کر وہ ماتحتی میں آ جائیں۔ ان کو خود اس کا خیال کرنا چاہیے تھا۔ بے کہلائے نہ آنا چاہیے تھا۔ بہر حال رُکھائی سے ملیں۔ مصروفیت کا بہانہ کر کے سادے کپڑوں میں ہونے کی معافی مانگی اور اُکھڑی اُکھڑی باتیں کیں۔ پورے رنگ ڈھنگ سے، اندازِ گفتگو سے اپنے بدلے ہوئے رُتبوں کا فرق نمایاں کیا۔ ایسے میں سلیم کی ماں کا جی تو نہ چاہتا تھا مگر پھر بھی انھوں نے گھما پھرا کر سلیم اور جہاں آرا کے رشتے کا ذکر کر ہی دیا۔ اُس دن والی نئی بہن نے منہ سکھا کر جواب دیا ''تم نے بھی کہاں بے وقت کی راگنی چھیڑی بہن۔ مَیں تو اس تبادلے کی وجہ سے اسباب سمیٹنے میں لگی ہوں اور تمھیں سوجھی ہے شادی بیاہ کی بات! پھر اللہ رکھے جہاں آرا کا سن ہی کیا ہے۔ سولھویں میں قدم رکھا ہے۔ میں اتنی کمسنی کی شادی کی طرفدار نہیں۔ اٹھارہ اُنیس برس کی ہو لے گی، تو ایسی باتوں کو سوچوں گی!'' اتنے میں ایک ماما نے آ کر پوچھا ''بیگم صاحب وہ جو آپ کے دُھلے کپڑے دھوبی نے آج ہی لا کر دیے ہیں وہ کس بکسے میں رکھے جائیں گے؟'' وہ سلیم کی ماں سے بولیں ''لو دیکھا، ان ماں زادیوں پر کسی کام کو چھوڑا ہی نہیں جا سکتا! بس، اس وقت تو معاف ہی کرو بہن! خدا کرے تمھارے میاں کا بھی بجنور ہی تبادلہ ہو جائے اور ہم تم پھر مل سکیں!''

ان کے معافی مانگنے میں وہی انداز تھا جو کسی بھکاری سے بھیک نہ دینے پر معافی مانگنے کا ہوتا ہے۔ سلیم کی ماں تلملا کر رہ گئیں لیکن کیا کرتیں۔ وہ بھی تو بیٹے کے لیے بھیک مانگنے ہی آئی تھیں۔ جہاں آرا نے اس پر ہمت نہ ہاری۔ ماں باپ کے ساتھ جاتے ہوئے سلیم کو یقین دلاتی گئی کہ ''میں بات پر قائم رہوں گی۔ اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے مگر وعدے سے نہ ہٹوں گی۔''

سلیم نے بی اے میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسری جنگ عظیم چھڑی۔ خان صاحب نعیم نے فوجی بھرتی اور چندہ جمع کرنے میں بڑا کارِ نمایاں کیا، خطاب بڑھا، عہدہ بڑھا، اور سلیم کے بی اے ہوتے ہی اسے فوج کے مرکزی دفتر میں ایک اچھا عہدہ دے دیا گیا۔ وہ قصد ہی کر رہا تھا

کہ ماں سے کہہ کر اب باقاعدہ جہاں آرا کے لیے رقعہ بھجوائے کہ خبر ملی کلکٹر صاحب کی صاحبزادی ایک ڈباؤ پچاس سالہ کمشنر صاحب سے بیاہ دی گئیں۔ بس اُس نے بھی وہی کیا جو اس زمانے کے مجنوں کیا کرتے ہیں۔ شراب و عیاشی۔ زمانۂ جنگ میں ان دونوں کی بڑی سہولتیں رہتی ہیں۔ لڑانے والوں کو سامانِ جنگ کی طرح انھیں بھی افراط سے مہیا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے سلیم نے اپنے کو مکمل طور پر بے خود بنالیا۔ لیکن قبل اس کے کہ منہ کی لگی عادت بنتی، خان بہادر نعیم کے اچانک انتقال سے وہ سنبھل گیا۔ ماں، بہنوں اور چھوٹے بھائیوں کا بار اُس کے سر آ گیا۔ وہ 'داغا ہوا سانڈ' بننے کی جگہ 'لڈو خچر' بن گیا۔ اُس نے بھائیوں اور بہنوں کو تعلیم دلوائی، نوکریاں دلوائیں، شادیاں کر دیں اور بوڑھی ماں کو گلے کا تعویذ بنائے اپنے ساتھ رکھا۔ جنگ ختم ہوتے ہی وہ باقاعدہ ڈپٹی کلکٹر بنا دیا گیا۔ آزادی ملنے کے بعد اس کا عہدہ اور بڑھا اور وہ اے آئی ایس بنا کر دلّی بلا لیا گیا۔

وہ اپنے عہدے اور خانگی فکروں میں اس طرح پھنسا کہ نہ وہ جہاں آرا کے بارے میں زیادہ سوچ سکا اور نہ اس نے خان بہادر ابراہیم کے صاحبزادوں سے تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کی۔ نہ وہ ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑنا چاہتا تھا اور نہ مندمل زخم کو کریدنا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ جب بہنیں اپنے اپنے سسرال چلی گئیں اور چھوٹے بھائی اپنی اپنی نوکریوں پر چلے گئے تو گھر سونا سونا سا محسوس ہونے لگا۔ ماں نے بار بار اپنا گھر بسانے پر زور دیا۔ اُس کے جسم نے بھی کبھی کبھی فریاد کی، لیکن جہاں آرا کی تصویر جو میز کے دراز میں چھپی رکھی تھی اور جس کی زیارت ہر روز ایک بار ضروری تھی ''قول مرادوں جاں داروں'' کا مقولہ ہی یاد دلاتی رہی۔ اور وہ ماں سے یہی بہانہ کرتا رہا ''امی ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ آپ اس گھر کی ملکہ اور رانی ہیں، میں بیوی لا کر اسے آپ کی حکومت میں دخل اندازی کا حق نہیں دے سکتا۔'' بوڑھی مہارانی جب بہلانے سے یوں بے آس ہوئیں تو انھوں نے ہمیشہ کے لیے اپنا راج چھوڑ دیا۔ وہ دوسری دُنیا سدھاریں۔ سلیم نے خالی تخت کو پُر کرنے کے لیے جہاں آرا کا فوٹو خاصا بڑا کرا کے بیڈروم میں لٹا لیا۔ صبح کو اُٹھتے اور رات کو سوتے وقت سب سے پہلی نظر اسی پر پڑتی۔ مگر اسے چند ہی دنوں میں محسوس ہونے لگا کہ یہ کاغذی پیرہن تصویر تنہائی کی شدت کو گھٹانے کی جگہ اور بڑھاتی ہے۔ جسم کی پکار تھی کہ ''کھل کھیلو!'' مگر پوزیشن کا خیال دامن گیر بنا۔ دلّی میں

مرکزی حکومت کا معتمد افسر کوئی گری ہوئی بات نہ کر سکتا تھا۔ خودداری کی بنا پر نہ سہی عہدے کے بھرم کی وجہ سے سہی، ڈگمگاتے پاؤں جم جاتے اور وہ فائلوں میں ڈوب جاتا۔

اس وقت بھی وہ چائے پی رہا تھا اور اپنی تنہائی سے اُلجھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں یخ ہوائیں اس احساس کو اور بھی بڑھا دیتی ہیں، اور ٹھنڈی راتیں کیوں روئی دوئی کے مطالبے میں کیوں شدّت پیدا کر دیتی ہیں۔ اُس نے اپنے خیالات سے اُکتا کر کمرے میں چھوٹی میز پر فائلوں کے ڈھیر کو دیکھا۔ اُٹھا کہ کچھ کام ہی کر ڈالے، مگر دل نہ اُٹھا۔ بالکنی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے کالونی کے بچوں کا پارک تھا۔ وہاں مختلف سن و سال کے بچے دوڑ رہے تھے، کھیل رہے تھے۔ کوئی شوٹ پر چڑھ کر کھیل رہا تھا، کوئی لوہے کے جھولے پر جھول رہا تھا، کئی غول بنائے ہوئے کبڈّی کھیل رہے تھے۔ کئی گیند اُچھال رہے تھے۔ قہقہے تھے، چیخ پکار تھی، دَوڑ تھی، مقابلہ تھا۔ زندگی چہل پہل سے بھری بارونق دِکھائی دے رہی تھی۔ اپنا بچپنا یاد آنے لگا، اور پھر اس نے آگے بڑھ کر وہ زمانہ جب کہ وہ اور جہاں آرا اپنے اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ بنگلوں کے سامنے والی لان پر ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے تھے، اُچکتے پھاندتے تھے اور بنگلے کے درختوں کی موٹی موٹی شاخوں پر جھولے ڈلوا کر لمبی لمبی پینگیں لیتے تھے۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کمرے میں پلٹا ہی تھا کہ کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی اور ملازم نے تار لا کر دیا۔ لکھا تھا۔

''میں میڈیکل کالج کے ٹی بی وارڈ میں داخل ہوں۔ حالت خراب ہے۔ آ کر آخری دیدار کر جاؤ۔ جہاں آرا۔''

اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ مشکل سے تار کے رسیدی پرچے پر دستخط کیا اور کرسی پر بے سُدھ گر پڑا۔ دماغ ایک چرخی کی طرح گھومنے لگا، نظروں میں طرح طرح کے رنگ چھوٹنے لگے۔ عجیب عجیب رقعے دِکھائی دینے لگے۔ معلوم ہوا پھولوں کی سیج میں آگ لگی ہے، دُھواں اُٹھ رہا ہے، شعلے بھڑک بھڑک کر ساری فضا کو لال لال بنا رہے ہیں۔ پھر دِکھائی دیا سمندر میں طوفان آیا ہے۔ موجیں بلّیوں اُچھل رہی ہیں اور وہ جہاں آرا کے ساتھ اس میں غوطے کھا رہا ہے۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے زرد و سیاہ آندھیاں اُٹھ رہی ہیں، بالو اور خاک کے ریزے اُڑ اُڑ کر اُس کے جسم بھر میں سوئیوں کی طرح چبھ رہے ہیں۔

پھر دفعتہً سماں بدلا۔ محسوس ہوا وہ سائبیریا کے میدان میں کھڑا ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں چیخ

چنگھاڑتی چل رہی ہیں اور اسے اندر سے تڑاتڑ سنگساری کر رہی ہیں۔ غرض کبھی گرمی، کبھی سردی، کبھی آگ، کبھی پانی، کبھی خاک، کبھی اولے، ایک تلاطم، ایک طوفان بپا ہے اور ان سب میں وہ اکیلا ہی نہیں ہے بلکہ جہاں آرا بھی لٹیں جھٹکاتے، قہقہے لگاتی، سسکیاں بھرتی، کبھی اپنے پورے حسن و جمال، مست آنکھوں سے دیکھتی، گلنار منہ کیے لچکتی، لڑکھڑاتی، سنبھلتی دَم کر رہی ہے اور کبھی محض ہڈّیوں کا ڈھانچہ بنی، آنکھوں کا خانہ خالی، ناک کا بانسہ غائب، عنابی ہونٹ ندارد، بھیانک طور پر دانت نکالے، جسم کی ہڈّیاں کڑکھٹ کڑکھٹ کرتی، سوکھی انگلیاں اس کے دیدے نکالنے کے لیے بڑھاتی چلی آ رہی ہے۔

وہ آنکھیں بند کیے کانپتا اور خشک سسکیاں لیتا رہا۔ آہستہ آہستہ آتش بازی کی طرح جلتی بھنتی اور جہاز کے پہیوں کی طرح پانی میں ڈوبتی اُبھرتی چرخی کی رفتار کم ہوئی۔ آندھیوں کا زور، اولوں کی بوچھار بھی گھٹنے لگی۔ ملازم نے گلاس میں پانی بڑھا کر کہا ''پانی سرکار؟'' نسیم نے اس کی بات کچھ سمجھی، کچھ نہ سمجھی۔ مگر ہاتھ گلاس کی طرف بڑھا دیا، اور جلدی جلدی پورا گلاس پی گیا۔ دسمبر کا یخ پانی، معلوم ہوا کہ جیسے حلق سے معدے تک ایک ٹھنڈی لکیر دَوڑ گئی۔ گلاس واپس کرتے ہی ایک زور کی چھینک آئی۔ چھینک کیا تھی جادو کا کوئی منتر تھا۔ آگ بھی بجھ گئی، طوفان بھی غائب ہو گیا۔ دل کے پنکھوں کی بھربھراہٹ بھی ختم ہو گئی اور اس کے ہوش و حواس بجا ہو گئے۔

اُس نے تار پھر سے پڑھا۔ میڈیکل کالج تو لکھا تھا، مگر کس مقام کا؟ تار لکھنؤ سے چلا تھا، اس لیے وہیں کا ہو گا۔ اُس نے طے کیا میں اسی رات ہی کی گاڑی سے جاؤں گا۔ فوراً اپنے سے بڑے افسر کو فون کیا، ایک عزیزہ کی سخت علالت بتائی، ایک ہفتہ کی چھٹی لی، رخت سفر باندھا، ریزرویشن کے لیے اسٹیشن فون کیا اور کلرک کے یہ اُمید دلانے پر کہ شاید چلتے وقت کوئی برتھ خالی مل جائے، اسٹیشن آ گیا۔ دلّی-لکھنؤ ایکسپریس کھڑی تھی۔ بدقت تمام ایک نیچے کی برتھ فرسٹ کلاس میں مل ہی گئی۔ ڈبے میں دو مرد اور ایک خاتون تھیں، مرد اُوپر کی برتھوں پر تھے، خاتون مقابل کی برتھ پر۔ جب قلی سے اپنا بستر بچھوا کر ساتھیوں کا جائزہ لیا تو پہچانا کہ ہم سفر خاتون مس رعنا عباسی ہیں۔

مس رعنا علی گڑھ اور آکسورڈ کی تعلیم یافتہ، دلّی یونیورسٹی میں لکچرار تھیں۔ ستائیں اٹھائیس سال کا سن، دُبلی پتلی، خاموش، متین۔ گورا رنگ، ناک نقشہ خاصا، خواہ مخواہ عینک کے

پیچھے آنکھیں چھپائے ہوئے۔ ماں نے مرنے سے پہلے کا ذکر بھی کیا تھا، اور سلیم سے اس سے دو تین پارٹیوں میں ملاقات بھی ہو چکی تھی۔

نسیم نے اس سے پوچھا ''کیا آپ بھی لکھنؤ جا رہی ہیں؟''

وہ جیسے اس سے گفتگو کا بہانہ ہی ڈھونڈ رہی ہو، بولی ''جی ہاں، ایک عزیزہ وہاں بیمار ہو کر میڈیکل کالج میں داخل ہیں۔ بیچاری ٹی بی میں گرفتار ہیں۔ تار آیا ہے اُن کی حالت اچھی نہیں۔''

سلیم نے دھڑکتے دل سے پوچھا ''جہاں آرا تو نہیں!''

اُس نے کہا ''جی ہاں، کیا آپ انھیں جانتے ہیں؟''

سلیم اپنی برتھ سے اُٹھ کر اُس کی برتھ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ بولا ''جی ہاں، مَیں بھی انھیں کو پچیس برس بعد دیکھنے جا رہا ہوں۔'' اور وہ گاڑی کے پٹری بدلنے کے جھٹکے کی وجہ سے ڈگمگانے لگا۔

وہ اپنے بستر پر ایک گوشے میں سمٹ کر بولی ''ارے تو بیٹھ جایئے نا! آپ کھڑے کیوں ہیں؟''

اور رعنا کی زبانی پہلی دفعہ سلیم نے جہاں آرا کی دُکھ بھری کہانی سنی۔ آئی سی ایس بوڑھے دولہا کو شادی کے دوسرے ہی دن قلبی دورہ پڑا۔ تین مہینے مسلسل بستر پر پڑے رہے، اور عمر بھر کے لیے طرح طرح کے پرہیز لازمی قرار دے دیئے گئے۔ جہاں آرا کو دوسرے ہی سال سے اختلاجی دورے شروع ہو گئے۔ وہ معدے کی بیمار ہو گئی۔ پھر جب شوہر نے پنشن لے کر بہار کے ایک دیہات میں رہنا شروع کیا تو اسے کالا آزار ہوا، اس سے مر مر کر بچی تو حرارت مستقل طور پر رہنے لگی۔ پھول جیسے چہرے والی اور ہر وقت ہنسنے والی جہاں آرا آہستہ آہستہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ شوہر پر دل کا دوسرا دورہ پڑا، وہ چل بسے۔ سوتیلے لڑکوں نے بے رُخی برتی، علاج معالجے، دلدہی و ہمدردی کی جگہ اس کے ساتھ بے رُخی برتی، اسے بڑا ستایا، جلایا، تڑپایا۔ وہ دق میں گرفتار ہو کر اپنے بھائی وحید کے پاس چلی گئی۔ بھابھی نے اس کا گھر میں رہنا مناسب نہ سمجھا۔ میڈیکل کالج میں داخل کرا دیا۔

سلیم نے پوچھا ''آپ کا اس سے کیا رشتہ ہے؟''

وہ بولی ''میرے والد اور ان کے شوہر چچازاد بھائی تھے۔ میں ان کو چچی کہتی ہوں۔ گو وہ

رشتے اور عمر میں مجھ سے بڑی ہیں مگر وہ مجھ سے ہمیشہ چھوٹی بہن یا سہیلی کی طرح پیش آئیں۔ میں ان کی عزت بھی کرتی اور ان سے محبت بھی۔''

اب رعنا کی باری تھی۔ اُس نے پلٹ کر پوچھ دیا ''آپ جہاں آرا کو کیسے جانتے ہیں؟''

اور اس کے ہمدردانہ لب و لہجے نے اس آتش فشاں میں سینندھ کر دیا جو پچیس سال سے لاوا کی طرح سلیم کے دل میں پک رہا تھا۔ اُس نے رعنا کو اپنی داستانِ ہجر سنا دی۔ وہ بہت متاثر ہوئی۔ اُس نے آنکھوں سے عینک اُتار کر آنسو پونچھے۔ سلیم کو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ اُستانی کے چہرے کا روکھا پن جاتا رہا اور اس پر نسوانی نرمی و تازگی جھلکنے لگی۔

وہ رُک رُک کر بولی ''اب میں سمجھی کہ جہاں آرا کے ہنسنے میں بھی آنسو کیوں جھلکتے تھے؟ نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگی ہمارے سماج میں اسی طرح برباد ہو جاتی ہے؟''

سلیم نے پوچھا ''اور لڑکوں کی نہیں؟''

وہ بولی ''نہیں، سوائے نکموں کے اور کسی کی نہیں۔ اپنے ہی کو لیجیے۔ آپ نے ان کو دل سے نکال کر اس کے دروازے بند کر دیئے اور اطمینان سے دوسرے کاموں میں لگ گئے۔ آپ کے پاس ان کو بھلانے کے لیے ہزاروں بہانے مل گئے!''

سلیم نے ذرا تیکھے پن سے کہا ''جی ہاں، جب ہی تو اس کی یاد دل سے لگائے آج تک کنوارا بیٹھا ہوں!''

رعنا نے اسے کچھ تعجب سے، کچھ شرما کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا رنگ آ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا ''میرے دل میں آپ کی قدر بہت بڑھ گئی!''

ممکن تھا گفتگو اور بھی دلچسپ ہو جاتی، مگر اُوپر کی برتھ والوں میں سے ایک نے کہا ''اگر آپ لوگوں کو زحمت نہ ہو تو بتی بجھا دیجیے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔''

سلیم نے ''ارے معاف کیجیے گا'' کہا اور بتی بجھاتا ہوا اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

نیند کاہے کو آتی۔ ماضی کی یادوں کا آنکھوں پر پہرا تھا۔ پھر دفعتہً جسم اپنی کلیلیں کرنے لگا۔ رعنا سے بوئے جہاں آرا آ رہی تھی۔ ماں نے مرنے سے پہلے جو رعنا سے رشتہ کرنے کا ذکر کیا تھا یاد آ گیا۔ ماضی و حال، جسم و رُوح میں جنگ چھڑ گئی۔ رُوح کہتی ''ہائے! وہ جس پر جان چھڑکتے تھے، جس کی یاد میں زندگی تج دی وہ دَم توڑ رہی ہو گی، اور تم ہو کہ کچھ اور سوچنے

لگے۔" جسم کہتا "رعنا عینک اُتار کر کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ آنکھوں میں بلا کا جادو ہے اور وہ جس طرح جھینپتی ہے اس میں تو ساری مشابہت جہاں آرا کی آتی ہے۔ اور پھر جہاں آرا پچیس برس پہلے والی جہاں آرا، ہنستی، لبھاتی، لچکتی جہاں آرا سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اسی طرح کی باتیں سوچتا، اسی طرح کی ملی جلی تصویریں بند آنکھوں سے دیکھتا بالآخر سو گیا۔

لکھنؤ کے اسٹیشن پر یہ طے ہونے لگا کہ کہاں قیام ہو اور کب میڈیکل کالج جایا جائے۔ رعنا نے کہا "میں وحید صاحب کا مکان جانتی ہوں۔ وہیں جاتی ہوں، ان سے سب معلوم ہو جائے گا۔"

سلیم نے کہا "یقین تو ہے کہ وحید مجھے بھولا نہ ہوگا۔ آیئے میں بھی وہیں چلوں۔ اس کے مکان میں گنجائش نہ ہوگی تو کسی ہوٹل میں بعد میں اُٹھ جاؤں گا۔"

ٹیکسی کی اور دونوں وحید کے ہاں پہنچے۔ مکان مل گیا، مگر وہاں ایک بوڑھے ملازم کے سوا کوئی نہ تھا۔ معلوم ہوا وحید اور اس کی بیوی بچے سب میڈیکل کالج گئے ہیں۔ بٹیا کا آخری وقت ہے۔ ان دونوں نے اسباب وہیں پھینکا اور اسی ٹیکسی سے کالج پہنچے۔

اسپیشل وارڈ کے باہر ہی وحید سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے ہاتھ ملایا اور جہاں آرا کے پاس لے گیا۔ جہاں آرا اب خاشاکِ جہاں تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ، گورا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا، خمار آلود آنکھوں کے گرد کالے حلقے تھے، گلاب جیسے گال سوکھے بینگنی رنگ کے ہو گئے تھے، صراحی دار گردن سوکھی لوکی تھی، اور گلے سے خرخراہٹ جیسی آواز نکل رہی تھی۔

وحید نے جھک کر کہا "جہان، دیکھو تو رعنا اور سلیم آئے ہیں۔"

اُس نے آنکھیں کھولیں۔ دھنسی دھنسی بے نور سی آنکھوں سے سلیم کو دیکھا۔ پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ سلیم نے اسٹول پر بیٹھ کر اس کا سوکھا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا۔

وہ مسکرا دی۔ ہائے کتنی بے بسی و بے کسی تھی اس مسکراہٹ میں! وہ بولی "ہاں، تم سلیم ہی ہو۔ تم آ گئے! اچھا ہوا تم آ گئے! بس اتنا کہنا تھا، میں نے اپنی قسم نہیں توڑی۔ کسی اور کی نہیں بنی!" وہ اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ رعنا نے سہارا دیا۔ سلیم اور وحید نے جلدی جلدی کئی تکیے سرہانے لگا کر اس کا سر اُونچا کر دیا۔ وہ رعنا سے بولی "جیتی رہو۔ سہاگن بنو!" پھر سلیم سے اُس نے کہا۔ "میں نے ان سے کہہ دیا۔ ماں باپ کے حکم کے خلاف کچھ نہ کر سکی...... مگر میں سلیم

سے قول دے چکی ہوں۔ اسی پر ان کو قلبی دورہ پڑا...... ممکن تھا بعد میں مجھے مجبور کرتے، مگر ڈاکٹروں نے ممانعت کر دی تھی اور انھیں اپنی زندگی زیادہ عزیز تھی!"

وہ کھانسنے لگی۔ وحید نے ذرا غصہ کی آواز سے کہا "زیادہ نہ بولو۔ زور پڑتا ہے۔"

وہ مسکرا دی۔ "چند منٹ اور!...... پھر کبھی نہ بولوں گی بھیّا!"

پھر وہ سلیم کی طرف مڑی "میں جانتی ہوں تم بھی اپنے قول پر قائم رہے!"

سلیم نے بولنے کی کوشش کی مگر آواز گلے میں گھٹ گئی۔ منہ سے کچھ نہ نکلا۔

اُسے پھر کھانسی آئی۔ دَم اُکھڑنے لگا۔ بس وہ اتنا کہہ سکی "آج سے دونوں کے...... وعدے ختم!" آخری ہچکی آئی۔ باچھوں سے بہہ کر دو لال لال لکیریں ٹھوڑی تک ٹھہر گئیں۔ ایک ہلکی سی لمبی سانس کی آواز سنائی دی اور منکا ڈھل گیا۔ سلیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نادیدہ طاقت نے پھونک ماری اور ایک روشن شمع بجھ گئی اور اُس کا دھواں سلیم کی آنکھوں میں بسی مرچوں کی طرح جا لگا۔

(۲)

جہاں آرا کو سپردِ خاک کر کے سلیم سیدھا اسٹیشن چلا آیا۔ رعنا نے بھی اسی شب واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس لیے اُس نے دو برتھیں ریزرو کرانے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ سب جگہیں بھر گئی ہیں۔ بس ایک کوپے خالی ہے۔ اُس نے وہی دونوں برتھیں ریزرو کرا لیے۔ دل میں سوچا "رعنا کو اگر اعتراض ہوگا تو کسی مسافر سے خوشامد کر کے برتھ بدل لیں گے۔"

پھر وہ اپنے سامان سمیت ویٹنگ روم میں جا کر ایک آرام کرسی پر گر پڑا۔ دن بھر کا بھوکا تھا، غموں کا مارا تھا، سگریٹ پی پی کر غم غلط کرنے کی کوشش کی، مگر نہ بدحواسی میں کمی ہوئی نہ پریشانی میں۔ بار بار یہی خیال آتا کہ ہائے جس جسم میں اپنے تصور میں زندگی بھر شعلہ بجوالہ دیکھتا چلا آیا تھا، وہ آج کوئلہ دِکھائی دیا، جس فانوس میں اسے ہمیشہ شمعِ فروزاں دِکھائی دی تھی وہ آج دھوئیں سے کالی گل بندھی بجھی ہوئی لالٹین نظر آئی۔ تصورات اور حقیقت کے فرق نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ کون سی تصویر جہاں آرا کی اب اس کی نظر میں رات کی تنہائیوں میں دیکھیں گی۔ گل بدن وگل پیرہن مرقع یا یہ کفن میں لپٹا ہوا ہڈیوں کا ڈھانچہ؟ اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔

اس کی رگ رگ میں درد ہو رہا تھا۔ اُس نے اٹیچی سے دوسرے کپڑے نکالے اور انھیں لے کر وہ ویٹنگ روم کے حمام میں گھس گیا۔ اتنی دیر تک نہاتا رہا کہ سردی لگنے لگی۔ کپڑے بدل کر وہ ریستوراں میں چلا گیا۔ اُس نے وہاں پہنچ کر تین چار توس اور کئی انڈے کھائے، تین پالیاں چائے کی پی، پھر وہ ایک اسٹال پر گیا۔ وہاں سے کئی انگریزی ناول خریدے اور انھیں کے مطالعے میں نجی انجمنوں کو بھولنے کی کوشش کرتا رہا۔

جب نو بجے کے قریب رعنا اسٹیشن آئی تو بالکل تنہا آئی۔ سلیم نے جب اسے کوپے کا حال بتایا تو وہ ٹپٹا گئی۔ سلیم نے متانت سے انگریزی میں کہا ”مجھ پر بھروسا کیجیے۔ آخر ہم دونوں ذمہ دار اور بافہم ہیں!“

آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ کو کچھ اپنے پر بھی بھروسہ تھا۔ دونوں کوپے میں داخل ہوئے۔ رعنا کا بستر نیچے کی برتھ پر اور سلیم کا بستر اُوپر لگا دیا گیا۔ گاڑی چلنے سے پہلے سلیم نے پوچھا ”آپ نے کھانا کھالیا کہ میں کچھ انتظام کروں۔“

وہ بولی ”جی ہاں، میں وحید کے ہاں سے اپنی ایک بنگالن سہیلی کے ہاں چلی گئی تھی۔ وہیں نہائی اور کھانا کھایا۔ سلیم نے پھر بھی ایک پھل والے کو روک کر سیب، کیلے اور سنترے خریدے۔ اپنے اٹیچی کیس پر رعنا کا سوٹ کیس رکھا۔ بستر سے تولیہ نکالا، فرش پر بچھا کر رعنا کے سامنے رکھ دیئے۔ رعنا نے اس سردی میں پھل کھانے سے عذر کرتے کرتے پرس کھولا اور کہا ”میں نے اپنے ٹکٹ اور ریزرویشن کے دام تو آپ کو دیئے ہی نہیں۔“

وہ اسے ہاتھ سے روک کر بولا ”دلی پہنچ کر حساب ہو جائے گا، اتنی جلدی کاہے کی؟“ اس نے پرس بند کر لیا۔ اتنے میں گاڑی چلی، ایک جھٹکا سا لگا اور سلیم جو اب تک کھڑا تھا، نیچے کی برتھ سے ملی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کیوں اس کے دل میں خیال آیا ”شادی کے بعد اکثر نیا جوڑا ہنی مون منانے یونہی کوپے میں جاتا ہے!“ اور اس نے دن کے واقعات کے پس منظر میں اس رومانی خیال پر اس قدر ندامت محسوس کی کہ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر جھولنے لگا۔

رعنا نے اس کے اس انداز کو دن کے المیہ کا نتیجہ سمجھا اور تعزیتی لب و لہجے میں بولی ”وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اس کا ضرور غم ہے، مگر یہ بھی سوچیے کہ وہ کتنے دُکھ سے چھوٹیں۔ کیسی کیسی

مصیبتیں جھیلنے کے بعد اب انھیں ابدی آرام ملا ہے۔‘‘

سلیم نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر کہا’’یقینی وہ سیدھے جنت سدھاریں۔‘‘

رعنا نے کہا’’ہاں، وہ اس کی مستحق ہیں۔ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔‘‘

اور دونوں ہی اپنی اپنی برتھ پر لیٹ گئے۔ تیز روشنی والی بتی گل کر دی گئی۔ ملیح آباد کے اسٹیشن سے گزرتے گزرتے ریل نے پھر ایک جھٹکا کھایا اور سوٹ کیس پر رکھے ہوئے پھل بھد بھد کر کے گرے۔ سلیم نے سوئچ دبا کر روشنی کی۔ رعنا نے برتھ سے اُٹھ کر پھل سمیٹنا شروع کیے۔ وہ بھی نیچے پھاندا۔ رعنا نے کہا’’انھیں باندھ کر رکھ دیجیے۔‘‘ گرے ہوئے پھل اس سے لے کر سلیم انھیں بیسن کے ٹب سے دھو لایا۔ پھر پھلوں کو تولیے میں پونچھ کر انھیں باندھتے باندھتے ایک سیب رعنا کی طرف بڑھا کر بولا’’ایک تو کھا ہی لیجیے۔‘‘ وہ ذرا جھجکی تو وہ مسکرا کر بولا’’میں خود بھی تو ساتھ دینا چاہتا ہوں۔‘‘ اور اس نے دوسرے سیب میں دانت گڑا دیے۔ رعنا نے بھی مسکرا کر سیب لے لیا۔ پرس میں سے ایک چھوٹا سا خوبصورت چاقو نکالا۔ کئی چھوٹی چھوٹی قاشیں اپنے لیے کاٹیں۔ پھر چاقو بڑھا کر کہا’’کہاں تک دانتوں کو زحمت دیجیے گا، اسے استعمال کیجیے۔‘‘

وہ بولا’’دانت مصنوعی نہیں ہیں۔ لیکن سیب کھٹا ضرور ہے۔‘‘ اور وہ منہ بنا بنا کر اسے کھانے کی کوشش کرنے لگا۔ رعنا نے ایک قاش چکھی۔ اس نے کہا’’مگر یہ تو خاصا میٹھا ہے! لیجیے چکھیے۔‘‘ اور اس نے دوسری قاش سلیم کی طرف بڑھائی۔ سلیم نے اسے کھا کر کہا’’اس میں آپ کے ہاتھ کا اثر آ گیا۔‘‘

وہ کچھ شرما گئی۔ پھر بولی’’اب اسے پھینکیے اور اسی کو کھایئے۔‘‘ اور اس نے سیب کی پتلی پتلی قاشیں کاٹ کر تولیہ پر رکھ دیں۔ سلیم نے اپنا سیب کھڑکی کا شیشہ اُٹھا کر باہر پھینک دیا اور رعنا کی تراشی قاشوں میں حصہ لگایا۔ پھر سنترے اُٹھا کر اس کی طرف بڑھا۔’’اب انھیں بھی آپ چھیلئے۔ میرا ہاتھ لگتے ہی یہ بھی کھٹے ہو جائیں گے۔‘‘

وہ ایک استانی کی طرح بولی’’جاڑوں میں تو ہر پھل کا کھٹا ہونا فطری ہے۔ ان کا عرق اچھی طرح نہ پکنے پاتا ہے اور نہ سوکھنے!‘‘ پھر سنترے کی ایک قاش چکھ کر سلیم کی طرف پورا پھل بڑھاتی ہوئی بولی’’مگر اس کی کھٹاس بہت ہی لطیف ہے۔ بس ایک ہلکی سی چاشنی۔‘‘

سلیم نے کہا ''مگر دوسرا بھی چکھ لیجیے۔اس کی چند قاشیں تو میرے ہی لیے ناکافی ہوں گی۔''

اُس نے سنترہ کی ایک قاش کھا کر کہا ''جی، یہ واقعی میٹھا ہے۔اس میں ترشی ہی نہیں۔''

سلیم نے کہا ''پھر ہلکی چاشنی سے آپ لطف اُٹھائیے۔وہ میٹھا سنترا مجھے عنایت کیجیے۔''

اُس نے ہنستے ہوئے کہا ''یہ تو وہی کہاوت ہوئی ''کڑوا کڑوا تھو تھو، میٹھا میٹھا ہپ!''

وہ منہ سکھا کر بولا ''جی، آجکل کی سرکار کا افسر ہوں، اتنا تو آہی جانا چاہیے۔''

اور رعنا کے بے ساختہ ہنس دینے پر وہ بھی ہنس دیا۔

جب دونوں سنترے ختم ہو گئے تو سلیم نے کہا ''بس ایک پیالی چائے اور مل جاتی تو من وسلویٰ کا مزہ آجاتا!''

وہ بولی ''جی، چائے تو میرے ساتھ ہے۔'' اور اُس نے اپنا بید کا ٹفن کیریئر کھول کر اُس میں سے تھرماس نکالا اور سلولائڈ کا ایک گلاس نکالا اور اس میں چائے اُنڈیل کر سلیم کی طرف بڑھائی۔

وہ بولا ''واہ، واہ! آپ نے کیا بروقت پیاسے کی پیاس بجھائی!''

پھر وہ رعنا سے اجازت لے کر چائے کے ساتھ ساتھ سگریٹ پیتا رہا اور کنکھیوں سے اس کے بیٹھنے، چائے پینے کے دلکش انداز کو دیکھتا رہا، اور دفعتہً اس کے دل میں خیال آیا، کیا اس رات کے دلچسپ سفر کے بعد جب کہ ایک مہذّب، تعلیم یافتہ، دل رُبا۔وہ 'دل رُبا' کے لفظ پر ٹھٹکا۔اُس نے رعنا پر نظر ڈالی۔اُس وقت اس کے بال بے ترتیب تھے، آنکھوں پر چشمہ نہ ہونے سے ان کے دیدوں میں نیند کے خمار نے لال لال ڈورے ڈال دیئے تھے۔اُس کے آفتابی چہرے سے ایک بھولا پن برس رہا تھا اور وہ نصف دھڑ سے بیٹھی، ریشمی لحاف میں لپٹی بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔سلیم کو خود اپنے خیالات پر شرمندگی محسوس ہوئی۔اُس نے سگریٹ بجھا کر باہر پھینکی اور اپنی برتھ پر چڑھتے ہوئے کہا ''آپ کو اب نیند آ رہی ہوگی، معاف کیجیے گا میں نے آپ کو بہت دیر جگایا۔''

وہ بولی ''ہاں، اب تو ساڑھے گیارہ کا وقت ہے!''

سلیم نے بتی بجھا دی اور نیند بلانے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔مگر نیند تو معشوق صفت

ہے، نہ وہ بلانے سے آتا ہے، نہ یہ بلانے سے آتی ہے۔ اُس نے دماغی سکون اور جسمانی تھکن سے بندھن باندھ رکھے ہیں۔ نہ سلیم کے دماغ میں سکون تھا اور نہ اُس نے کوئی خاصی جسمانی محنت کی تھی۔ دن بھر بھوکے رہنے کی محنت، یا لاش ڈھونے والی لاری میں بیٹھ کر قبرستان میں کچھ دیر کھڑے رہنے کی محنت، یہ نیند لانے والی محنتیں نہ تھیں، بلکہ دماغی سکون چھین لینے والی تھی۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ غیر شعوری طور پر ایک شرمندگی سی تھی۔ جہاں آرا کو وعدہ شکن، بے وفا سمجھ چکا تھا، مگر وہ سچی، زبان پر قائم نکلی، اور وہ خود؟ اُس نے کیا کیا نہ کیا۔ کس کس طرح جسم کی بھوک نہ مٹائی۔ اِس میں شک نہیں کہ سال دو سال میں وہ سنبھل گیا، اور پھر اس کے قدم نہ ڈگے۔ مگر اس میں اس کی کیا تعریف۔ اپنے سے چھوٹے بھائی بہن، اپنی نیک اور شریف ماں، پھر عہدے کی ذمہ داریاں، ملازمت میں ترقی کی خواہش، اِن سب نے اسے رنگ رلیاں مچانے، بدنام رہنے سے روکا۔ بس لے دے کر اُس نے اتنا ہی تو کیا کہ اُس نے شادی نہ کی۔ جہاں آرا کی جگہ کسی کو گھر کی ملکہ نہ بننے دیا۔ سو اب تو اس کے مرنے سے وہ بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ عہد و معاہدے بھی ختم ہو گئے۔ وہ آزاد ہو گیا۔ مگر اس آزادی کے بعد بھی وہی ناقابلِ برداشت تنہائی۔ لیکن کیوں رہے وہ تنہا؟ اچھی خاصی مہذّب و شائستہ تو ہے رعنا۔ ماں نے اپنی زندگی میں پسند بھی کیا تھا۔ مگر کیا وہ بھی کرے گی؟ کیوں نہ پوچھ لو؟ اس سے بہتر اور کون سا موقع ملے گا صاف صاف گفتگو کا۔ اُس نے کروٹ لی۔

رعنا کا دل کل رات بھی سلیم کو اپنے ڈبّے میں دیکھ کر دھڑکا تھا، اور آج رات اکیلے کوپے میں اس کے ساتھ سفر کرنے میں تو گویا اس میں پنکھ لگے تھے۔ اس کے دل میں بھی چور تھا۔ جب وہ ڈیڑھ سال قبل یونیورسٹی میں لکچراری پر مقرر ہو کر دلّی آئی تھی تو وہ رشتے کی ایک خالہ کے ہاں ٹھہری تھی۔ جب وہ آکسفورڈ میں تعلیم ہی پا رہی تھی کہ والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اُسی وقت وطن واپس آ جاتی، مگر سرکاری وظیفہ لے کر گئی تھی، اس لیے اُس نے تعلیم مکمل کی۔ جون میں ہندوستان آئی اور جولائی میں اسے یہ جگہ مل گئی۔ عزیزوں میں اپنے قصبے میں ایک ماموں تھے، اور دلّی میں یہ رشتے کی خالہ۔ بیچاری کے کوئی اولاد نہ تھی۔ میاں مرکزی سکریٹریٹ میں سینئر گریڈ کے کلرک تھے۔ اپنا گھر تھا، کشادہ، وسیع۔ رعنا جو اُن کے گھر آئی تو گویا گھر آباد ہو گیا۔ ان کو فکر تھی کہ اس کی شادی بھی ہو جائے تو اس کے شوہر کو خانہ داماد بنا کر اس سونے گھر

میں بچوں کی کلکاریاں سنیں، اسی لیے اس کے آتے ہی انھوں نے اس کے لیے موزوں وَر ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ سلیم سب سے زیادہ موزوں شخصیت دِکھائی دی تھی۔ بڑی بی کے سامنے تجویز پیش کی گئی تھی، مگر انھوں نے اس معاملے میں اپنی بے بسی ظاہر کی تھی۔ ''میری بھی یہی تمنا ہے کہ گھر میں بہو آئے۔ میں بھی پوتا پوتی کھلاؤں، مگر سلیم کو جیسے شادی کے نام ہی سے چڑھ ہے۔'' رعنا سے یہ باتیں چھپی نہ تھیں۔ وہ ایک طرح سلیم سے دل ہی دل میں خفا تھی۔ وہ صورت، شکل، تعلیم و تہذیب کے اعتبار سے ایسی تو نہ تھی کہ اس کے معاملے میں اس قسم کی بے رُخی برتی جائے۔ اس لیے اس نے جب بھی سلیم کو پارٹی وغیرہ میں دیکھا تو ایک معاندانہ نظر سے دیکھا اور اسے نرگسی اور گھمنڈی قرار دیا۔

مگر کل سے وہ خود بین و مغرور ایک دوسری ہی صورت میں دِکھائی دیا۔ ملنسار، با اخلاق، دردمند، باوفا، سچا عاشق۔ بڑی قسمت والی تھی جہاں آرا جو اس جیسا چاہنے والا اسے ملا۔ اے کاش...... اور اُس نے منہ پر لحاف کھینچ کر اپنے خیالات کو بھی اس طرح چھپانے کی کوشش کی گویا کوئی کھڑا اُنھیں اس کے چہرے سے پڑھتا جاتا ہے۔

ویسے ہی سلیم نے کروٹ لے کر نیچے جھانکا۔ برتھ میں جو حرکت ہوئی تو رعنا نے منہ سے لحاف ہٹا کر اُوپر دیکھا۔ نائٹ بلب کی ہلکی روشنی میں اس کی آنکھیں چمکیں۔ سلیم نے ہاتھ بڑھا کر روشنی کرتے ہوئے پوچھا ''کیا آپ سوگئیں؟'' رعنا نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا ''نیند کسی کی باندی نہیں کہ بلاتے ہی دوڑی آئے۔''

اُس نے پوچھا ''تو پھر اجازت دیجیے کہ میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کروں۔''

اُس نے تکلفاً کہا ''لیکن رات بہت ہوگئی۔''

سلیم نے برتھ سے اُترتے ہوئے کہا ''تو اس سے کیا ہوا؟ بعض راتیں 'رت جگے' کی ہوتی ہیں۔ پھر نہ جانے کبھی اس طرح اطمینان سے باتیں کرنے کا موقع ملے نہ ملے!''

رعنا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور اپنے کپڑے برابر کرنے لگی۔ وہ بے خیالی میں بے تکلفی برت گیا۔ اسی کے بستر پر بیٹھ گیا۔ رعنا نے مزید گھبراہٹ سے کہا ''تو آپ کرسی پر تشریف رکھیے نا۔''

سلیم نے اپنی احمقانہ بے تکلفی محسوس کی۔ اُس نے کہا ''ارے معاف کیجیے گا۔'' اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر دونوں طرف خجالت کی خاموشی رہی۔ پھر سلیم نے ایک سگریٹ جلائی۔ کئی

لمبے لمبے کش لیے اور کہا ''میں آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔''

رعنا نے کہا ''فرمایئے۔''

اُس نے کہا ''میرے گھر نہ بسانے کی وجہ سے تو آپ واقف ہی ہوگئیں۔ میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ آخر آپ نے آج تک شادی کیوں نہ کی؟''

رعنا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اُس نے کہا ''آپ کو اس طرح کے ذاتی سوالات کرنے کا کیا حق ہے؟''

سلیم نے کہا ''اسی حق کے حاصل کرنے کے لیے تو پوچھ رہا ہوں۔''

وہ خاموش رہی۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا رہا۔ سلیم نے کہا ''کیا آپ بھی میری طرح کسی سے زبان ہار بیٹھی تھیں؟'' وہ پھر بھی چپ رہی۔ وہ بولا ''آپ کو جو سب سے زیادہ پیارا ہو اُسی کے سرِ عزیز کی قسم بتا دیجیے۔''

وہ بولی ''آپ تو بچوں جیسی ضد کرتے ہیں۔''

اُس نے مسکرا کر کہا ''اب آپ خدانخواستہ ایسی بوڑھی بھی نہیں کہ میں آپ کے سامنے بچہ معلوم ہوں۔''

وہ جھنجھلا کر بولی ''دیکھئے، میں اسی لیے اکیلے کوپے میں آپ کے ساتھ سفر کرنے سے جھجکی تھی۔''

وہ بولا ''یہ جھجک تو آپ کی فطری تھی۔ ہر جوان عورت کو غیر مرد کے ساتھ اکیلے ڈبے میں سفر کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، مگر میرے سوال کا جواب دینے میں کیا برائی ہے وہ میں نہیں سمجھ سکتا۔ آپ آکسفورڈ کی ٹرائی پوس ہیں، یونیورسٹی میں لکچرار ہیں، معلّمہ ہیں، کوئی ناسمجھ بچی نہیں ہیں کہ آپ سے آپ کی آئندہ زندگی کے متعلق باتیں نہ کی جاسکیں۔''

رعنا نے 'آئندہ زندگی' کے لفظ پر اُسے بغور دیکھا، پھر نظریں نیچی کر کے بولی ''جی، اس لیے کہ کسی رشتے میں والدین نے کیڑے نکالے، کسی میں مَیں نے۔''

وہ ہنس کر بولا ''تو اب تو اکیلے آپ ہی کو فیصلہ کرنا ہے، اس لیے میرے ساتھ رشتہ کرنے میں آپ ہی کیڑے نکالیے۔'' وہ عجیب بوکھلاہٹ سے سلیم کا منہ تکنے لگی۔ وہ بولا ''مَیں

اُوپر کی برتھ پر لیٹا یہی سوچتا رہا۔ مَیں نے آپ کو مجمع میں بھی دیکھ لیا، اکیلے بھی دیکھ لیا۔ آپ نے بھی میرے ساتھ دو راتیں کاٹیں، دن بھر ساتھ رہا، غمی و پریشانی بھی ساتھ جھیل لی۔ اب کچھ دِنوں خوشی سے ساتھ ساتھ کیوں نہ کاٹیں؟"

وہ رُک رُک کر بولی "مگر.... مگر.... ان چند گھنٹوں کے ساتھ میں.... نہ آپ نے مجھ کو پہچانا، نہ میں نے آپ کو۔"

وہ بحث کرنے والے انداز میں بولا "کیا کوئی کسی دوسرے کو ایک عمر ساتھ رہ کر بھی پہچان سکتا ہے؟"

وہ تڑسے بولی "کیا جہاں آرا نے آپ کو اور آپ نے جہاں آرا کو نہ پہچانا تھا؟"

اُس نے کہا "کیا خاک پہچانا تھا؟ اسے یہ کیا معلوم کہ مَیں نے یہ یقین کرلیا تھا کہ وہ اپنے وعدے، اپنی قسمیں بھول گئی، اور غم وغصہ میں شراب پی کر بیخود رہا اور بیسیوں عورتوں سے دل بہلایا۔ وہ مجھے وفا کا پتلا سمجھتی رہی اور میں نہ جانے کتنی دفعہ پھسلا، گرا، تب کہیں جا کر سنبھلا۔ اور وہ بھی اس لیے کہ مجھ پر ذمہ داریاں آپڑیں۔ ماں کی، بھائیوں کی، بہنوں کی اور سب سے زیادہ عہدے کی!"

وہ نخرے سے مسکرا کر بولی "آپ نے ابھی بیسیوں دل بہلانے والیوں کا ذکر کیا، تو کیا اس وقت کی گفتگو اس لیے چھیڑی ہے کہ ان کی تعداد میں ایک اور بڑھا کر اکیسویں دل بہلانے والی مہیا کرلیں؟"

وہ جھنجلا اُٹھا۔ اُس نے کہا "جی، میں آپ سے دل بہلانے کی باتیں نہیں کر رہا ہوں بلکہ ایک تنہائی سے عاجز آئے ہوئے انسان کی طرح رفاقتِ حیات کی درخواست کر رہا ہوں!"

رعنا نے نیچے کا ہونٹ ہلکے ہلکے چبا کر کہا "میرا رشتہ ایک جگہ طے ہو چکا ہے اور پندرہ دن میں شادی ہونے والی ہے۔"

وہ چپ ہو گیا۔ ریت پر بنا ہوا محل ڈھ گیا۔ اُس کے چمکتے چہرے پر اُداسی کا سایہ دوڑ گیا۔ اُس نے سگریٹ جلالی۔ کرسی سے متصل کھڑکی کا شیشہ اُٹھا کر تھوڑی دیر باہر دیکھتا رہا۔ پھر آدھی پی ہوئی جلتی سگریٹ باہر پھینک کر شیشہ گرایا، اور "شب بخیر" کہتا ہوا اپنی برتھ پر لیٹ کر

روشنی بجھادی۔ رعنا کے دل پر اس شکست خوردہ اُداس انداز نے بڑا اثر کیا۔ وہ مجوزہ شوہر کا سلیم سے مقابلہ کرنے لگی۔ یہ شخص جو باوجود اپنی ذہانت، اپنی قابلیت، اپنی جسمانی خوبصورتی، اپنے بلند عہدے کے اتنے دِنوں سچی محبت سے محروم رکھا گیا، کیا اس پر قابلِ ترجیح نہیں جو دوسروں کی پسند سے چنا گیا ہے، جو نہ دُنیاوی جاہ و مرتبے میں اس کے برابر ہے اور نہ مردانہ حسن اور صورت وسیرت میں؟ اس کے دل میں جنگ سی ہونے لگی۔

ادھر سلیم کو زندگی کے اس گھپ اندھیرے میں ستارے کی طرح ایک دلیل چمکتی دِکھائی دی۔ وہ فوراً روشنی جلا کر نیچے اُتر آیا۔ رعنا نے، جواب تک لیٹی نہ تھی، اسے گھبرا کر دیکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر بولا ''یہ رشتہ آپ نے خود پسند کیا ہے یا دوسروں نے طے کیا ہے؟''

رعنا نے کہا ''عزیزوں بزرگوں میں صرف ایک ماموں اور ایک خالہ رہ گئی ہیں۔ یہ انھیں نے طے کیا ہے۔''

اُس نے ایک وکیل کی طرح جرح کی ''آپ ان صاحب سے کبھی ملی بھی ہیں؟''

وہ بولی ''نہیں، صرف فوٹو دیکھا ہے۔''

وہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا ''آپ نے میرا اور جہاں آرا کا قصہ سن کر کہا تھا، ہمارا سماج بڑا ظالم ہے، اپنے شکنجے میں کس کرنہ جانے کتنی بچیوں کا خون کرتا ہے۔ کیا آپ نے اپنا حقِ انتخاب چھوڑ کر خود کو اس شکنجے میں نہیں پھنسالیا ہے؟''

وہ بولی ''آپ بیکار کی بحثیں کرتے ہیں۔ میں نے بھی تو ہاں کردی، پھر اپنا حق کہاں چھوڑا؟''

سلیم نے اپنی وکالت کی ''تو پھر اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کیجیے۔ اس وقت ایک اکیلا دعویدار تھا، اب تو میں بھی درخواست لیے سامنے کھڑا ہوں۔''

وہ ہارتے ہوئے لہجے میں بولی ''لیکن اگر میں اپنی بات سے اب پلٹوں تو لوگ کیا کہیں گے؟''

وہ بولا ''اس مسئلے میں لوگوں کا کہنا اتنا اہم نہیں ہے، جتنا کہ آپ کی پوری زندگی کا سوال اہم ہے۔''

وہ عاجز آنے والے لہجے میں بولی ''آپ بہت پریشان کرتے ہیں۔''

وہ بولا ''میں بھی تو تنہائی کی زندگی سے پریشان ہوں۔'' اور اُس نے رعنا کو ایسی فریادی نظر

سے دیکھا جیسے وہی اکیلی اس تنہائی کو دُور کر سکتی ہے۔ اور ستائیس برس کی رعنا کو اپنی ضرورت کی اہمیت کے احساس نے سپر انداختہ کر دیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا اور سر جھکا کر اپنے اُٹھے ہوئے گھٹنوں پر رکھ لیا۔ سلیم نے اس کے جھکے ہوئے سر کو آہستہ آہستہ تھپتھپا کر کہا ''ہم دونوں پڑھے لکھے ذمہ دار لوگ ہیں، ہم ایک دوسرے پر بھروسہ کر سکتے ہیں کہ اگر ہم اپنی خوشی سے کوئی نئی ذمہ داری اپنے سر لیں گے تو اسے کما حقہٗ نبھائیں گے ہی! ہم یقینی اپنے اپنے فرائض کے ادا کرنے میں پورے اُتریں گے۔''

رعنا نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اسے بڑی بے بسی سے دیکھا۔ سلیم نے کہا ''اس میں کوئی جبر و ظلم و تشدد کا پہلو نہیں۔ یہ تو خوشی کا سودا ہے۔ اس لیے اسے تو ہنس ہنس کر طے کرنا چاہیے۔'' رعنا نے مسکرا کر منہ چھپالیا۔ وہ بولا ''اچھا اب آپ آرام سے سوئیے۔ مجھے بھی اب نیند آجائے گی۔ اب دلّی پہنچ کر مزید باتیں ہوں گی۔''

وہ اپنی برتھ پر چڑھ کر روشنی گل کر کے اطمینان سے سو گیا۔ رعنا کب سوئی، کب جاگی، اسے خبر نہیں۔ لیکن جب چھ بجے وہ ہاپوڑ کے قریب جاگا تو اُس نے دیکھا ڈبّے کے باتھ روم سے نہائی دھوئی، نئی خوش رنگ ساری پہنے، بنی سنوری نکل رہی ہے اور اس کے چہرے پر وہ شادابی و تازگی ہے جو جوان رعنا کے لیے مخصوص ہے۔ اُس نے اس تازہ کھلے ہوئے پھول کا کما حقہٗ نظارہ کرنے کے لیے تیز روشنی جلا کر ''گڈ مارننگ'' کہا تو وہ شرما گئی اور مشکل سے جواب سلام دے سکی۔ اس شرمانے میں جو خاص کیف تھا، سلیم اس سے لطف لیتا ہوا برتھ سے نیچے اُترا اور خود بھی سوٹ کیس سے نیا جوڑا نکال کر تولیہ، صابن وغیرہ لے کر باتھ روم میں گھس گیا اور وہاں سے نکلتے وقت جب اُس نے اپنے چہرے پر آئینے میں نظر ڈالی تو اسے اپنے گالوں پر ایک ہلکا سا رنگ دِکھائی دیا، جس پر وہ بے ساختہ مسکرا پڑا۔

ہاپوڑ کے اسٹیشن پر اُس نے ڈبل ٹی آملٹ کے ساتھ منگوائی اور پاپڑ، مٹھائی اور پھل کا اس میں اضافہ کر کے رعنا کے ساتھ ناشتہ کیا۔ پھر اسے کرسی پر بٹھا کر اس کا اور اپنا ہولڈال باندھا اور رات کے پھل اس کے ناشتے دان میں ڈال دیئے۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ متانت سے بولا ''مجھے یقین ہے کہ آپ نے میرے حق میں فیصلہ کیا ہوگا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ فریضہ آج ہی انجام پا جائے!''

رعنا نے پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا" ہائے اللہ! اتنی جلدی کیوں؟"

وہ مسکرا کر بولا" میں بیالیس برس کا ہو چکا، اسپِ عمر تیزی سے بھاگا جا رہا ہے۔ اس لیے مجھے جتنے لمحے بھی آپ کی رفاقت کے مل سکیں گے وہ میرے لیے بڑے قیمتی ہوں گے۔"

وہ رُک رُک کر بولی" تو آپ یہ باتیں خالہ جان سے چل کر کہیے گا!"

گاڑی دلّی اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں داخل ہونے لگی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اسٹیشن سے باہر آ کر سلیم نے ٹیکسی کی۔ رعنا کو پچھلی سیٹ پر تنہا بٹھایا، خود ڈرائیور کی بغل میں بیٹھ گیا۔ چلتے وقت ڈرائیور کو زور سے باڑا ہندو راؤ، رعنا کی قیام گاہ کا حکم دیا۔ مگر راستے میں جھٹکے سے گاڑی دوسری طرف مڑوادی۔ جب جامع مسجد کے پھاٹک پر ٹیکسی رُکی تو رعنا نے گھبرا کر پوچھا "یہاں کیا کام ہے؟"

سلیم نے کہا" آیئے چلیے، خدا کے مقدس گھر میں ہم دونوں ساتھ داخل ہولیں، پھر نئی زندگی میں قدم رکھیں گے۔"

جب وہ دونوں اندر پہنچے اور امام صاحب سے ملاقات ہوئی تو سلیم نے اسی وقت نکاح پڑھ دینے کی فرمائش کر دی۔ امام صاحب نے تعجب سے رعنا کی طرف دیکھا۔ اُس نے گھبرا کر سلیم سے کچھ کہنا چاہا" مگر.... مگر.... خالہ جان...."

وہ بات کاٹ کر بولا" خالہ جان، میرے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار بہت پہلے کر چکی ہیں۔" رعنا پچھلا سلسلۂ جنبانی یاد کر کے پسینے پسینے ہو گئی۔ سلیم اس کے کان کے قریب منہ لا کر بولا" میری عمر کی ڈھلتی دھوپ میں اگر رومان کی تھوڑی سی چمک اور گرمی آ جائے تو کیا برائی ہے؟ رحم کرو، رعنا! میں اب پہاڑ سی راتیں تنہا نہیں کاٹ سکتا!"

رعنا کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔ اُس نے گردن جھکالی اور وہ امام صاحب کے سوالات کے جواب میں "ہاں" کے سوا کچھ نہ کہہ سکی۔"

انھوں نے خطبہ پڑھا، اس جوڑے کے خوش و خرم زندگی بسر کرنے کی دعا مانگی، اور ایک سو ایک روپے بطور نذر کے، معمولی عذر کے بعد، قبول کر کے انھیں مبارکباد دی۔ اور یہ نئی طرح کے دولہا دلہن اسی ٹیکسی سے سلیم کے فلیٹ پر پہنچے۔

جب ملازم نیچے ٹیکسی سے سامان اُتارنے چلا گیا تو سلیم نے رعنا کو گود میں اُٹھا کر

بیڈروم والی مسہری پر بٹھا دیا۔ پھر وہ مسخرے پن سے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا اور بولا ”اپنے خاص غلام کا سلام قبول کیجیے گھر کی ملکہ!“

وہ ہنس کر بولی ”آج مجھے ذاتی تجربہ ہوا کہ مرد عورتوں کا کیونکر اغوا کرتے ہیں!“

دونوں ہنسے۔ رعنا کی اس ہنسی میں سلیم کو بالکل پچیس برس والی جہاں آرا کی شیریں جھنکار سنائی دی۔ معاً اس کی نظر دیوار پر آویزاں فوٹو کی طرف اُٹھ گئی۔ اُس نے اسٹول رکھ کر اسے دیوار سے اُتارا۔ رعنا نے اسے سوالیہ انداز سے دیکھا۔ وہ بولا ”اب اس کی جگہ آپ کی تصویر ہوگی!“

اور تصویر کو دراز میں بند کرتے کرتے اُس نے کہا ”آیئے، ایک ایک سورۂ فاتحہ پڑھ کر جہاں آرا کو بخش دیں۔ اُس نے اپنے کو جلا کر ہمارے گھر کا چراغ جلایا۔ خود عمر بھر شمع کی طرح پگھلتی رہی، مگر ہمارے دلوں میں روشنی جلا گئی جو اللہ نے چاہا تو ہماری زندگی پھر نہ بجھے گی!“

رعنا کو پہلی دفعہ اپنے نئے گھر کے ساتھ جہاں آرا کا ذکر برا معلوم ہوا اور جب دونوں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو رعنا نے خدا سے دعا مانگی کہ ”اے اللہ! جس طرح جہاں آرا کا دیوار پر لٹکا ہوا فوٹو اُتار لیا گیا ہے اسی طرح میرے شوہر کے دل سے جہاں آرا کی تصویر نکال کر اسی جگہ میری تصویر آویزاں کر دے!“

اور اُس نے اپنی دُعا کو مقبول بنانے کے لیے دونوں بلند ہاتھوں کو سر سے اُونچا کر کے انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر چٹخائیں اور ایک ایسی انگڑائی لی کہ سلیم کی آنکھوں میں شمعیں سی جل اُٹھیں۔

(مسودہ، لکھنؤ ۱۳ر اپریل ۱۹۶۳)

برکت

(ایک سچّی کہانی)

جون کی آخری تاریخیں تھیں۔ پانی ہی کی نہیں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم شباب پر تھی۔ آسام اور برما میں جہاں موسلا دھار بارش تھی، وہاں گولوں، گولیوں اور بموں کی بوچھار بھی قیامت خیز تھی۔ عام شہری ہی نہیں، انگریزی فوجیں بھی جاپانیوں کے سیلاب سے بچنے کے لیے بے سروسامانی کے ساتھ فرار کر رہی تھیں۔ دشمن کے بمبار ہوائی جہاز ڈگڈگی بجاتے کلکتہ تک آ کر منڈلا جاتے تھے۔ قحط زدہ بنگال اپنا سب کچھ پناہ گزینوں اور فوجیوں پر نثار کرنے پر مجبور تھا۔ ان کی راجدھانی آدمیوں سے چھلک رہی تھی۔ گو غلّہ گودام خالی تھے مگر تجوریاں بھرتی جا رہی تھیں۔ نہ جان کی کوئی قیمت تھی، نہ جسم کی۔ عزّت و ناموس بک رہے تھے اور مالدار غریبوں کی لاشوں کے ڈھیر پر چڑھ کر سرکار کی نظروں میں اُونچے سے اُونچے ہو کر خطاب پر خطاب پا رہے تھے۔

مَیں نے حسبِ معمول گرمیوں کی چھٹیوں کا مہینہ پٹنہ میں کاٹا تھا۔ جب نواب زادہ جیسے دوست اور بھائی کے خلوص کی ٹھنڈک ملے تو آدمی دارجلنگ، مسوری، نینی تال اور شملہ کی فکر کیوں کرے؟ اس دن اسی جنت کا نکالا چھوٹی لائن سے گھر جا رہا تھا۔ پٹنہ سے سونپور تک اسٹیمر سے آیا تھا۔ دریا میں بڑا تموّج تھا اور ہمارا اسٹیمر دھارے کے خلاف چل رہا تھا۔ بڑے بڑے موجے اُٹھتے اور اسٹیمر سے اس زور سے آ کر ٹکراتے کہ ڈک پر بیٹھے اور کھڑے مسافروں کو فوّارے میں نہانے کا مزہ آ جاتا۔ کوئی ہنستا، کوئی چیخ اُٹھتا، کوئی بلبلاتا، کوئی گالی بکتا۔ اس میں زنانی، مردانی، بوڑھی، جوان، بچکانی ہر طرح کی آوازیں ملی جلی ہوتیں۔ میں سیکنڈ کلاس کا مسافر تھا۔ میں عرشے پر بیٹھا، ان گلاب پاشیوں سے محظوظ اور ان آوازوں کی شیرینی سے لطف لے

رہا تھا۔ نہ جانے کیوں ہمارے دیش کے مغربی و مشرقی حصوں کے باسیوں کے نرخروں میں بھی فرق ہے۔ ایک کی آواز کرخت، سخت، دوسرے کی آواز ایسی میٹھی کہ آپ کان سے سنیں گے، مگر آپ کی زبان کو شہد کا ذائقہ ملے گا۔ پھر عرشے پر بیٹھنے والے کو درد بھری آوازیں بھی میٹھی ہی لگتی ہیں۔ بام پر رہنے والے ہمیشہ خاک نشینوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ موٹر پر جانے والے پیدل چلنے والوں کو گرد میں غلطاں بنا کر ہنستے ہی ہیں۔ میں اپنے کو عام انسانی کمزوریوں سے بالاتر نہیں ثابت کرنا چاہتا۔ مجھے بھی ڈک والوں کے ساتھ ہمدردی کم تھی، ان کی بے قراری میں مزہ زیادہ آرہا تھا۔ ذرا سوچئے تو سترہ اٹھارہ برس کی ایک سانولی سلونی دیہاتن، میلی ساڑی میں ملبوس، جسم کے ہر گوشے کو ڈھکے ہوئے، ایک بیالیس تینتالیس برس کے مدرّس کے لیے کیا کشش رکھتی ہے اور اس کے جمالیاتی ذوق کو کیسے برانگیختہ کرسکتی ہے؟ لیکن جب وہی بھیگ جاتی ہے، اس کے سیاہ بالوں میں پانی کے قطرے موتی گوندھ دیتے ہیں، چہرے کو بوندیں دُلہن کے چہرے کی طرح 'چیت' دیتی ہیں، ساری کا ہر حصہ جسم سے چپک کر اس کے ہر نشیب وفراز کو، اس کی ہر کاواکی اور عمودیت کو ظاہر کردیتا ہے، تو وہ لائقِ صد تماشا بن جاتی ہے یا نہیں؟ میں معلم و مدرّس، یہ بھول گیا کہ ان بوڑھوں، بچوں اور عورتوں میں زیادہ تر وہ تھے جو اپنے چہیتوں کو لام پر بھیجنے، یا اسٹیشنوں اور ہوائی اڈّوں پر دیکھنے یا اسپتالوں میں ان کے کٹے پٹے جسموں پر اپنے نرم یا کھردرے ہاتھوں کا مرہم رکھنے پٹنہ گئے تھے اور اب گھر کے دھندے انھیں واپس لیے جارہے تھے۔ مجھے عرشے پر بیٹھنے والے کو ان کے دلوں کے زخم کی کیا فکر تھی؟ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ ایک دوشیزہ پانی میں بھیگی ڈک کے اس حصے پر کھڑی ہے جو عرشے سے دِکھائی دیتا ہے اور اس کا جسم میلی ساری میں بھی اتنا حسین ہے کہ حسن کے بین لاقوامی مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

عرشے پر کینوس کی چھت کا سایہ تھا۔ یوں بھی گھرے بادلوں کے رُخِ روشن پر مشرقی دُلہنوں جیسا لمبا گھونگھٹ کھینچ رکھا تھا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ میری شیروانی کے دامن اور میرے بڑے مہری کے پائجامے کی پھڑ پھڑاہٹ سے رقص کے تال، سم پیدا ہوتے تھے۔ میں انسانی جسم کی غیر موزوں شکلوں پر اور پھر ان کے مجموعے کے حیرت انگیز حسن اور بے پناہ کشش کے اسباب پر غور کرنے لگا۔ میں نے سوچا حسن نہ کسی جسم میں ہے، نہ دیکھنے والے کی آنکھوں میں، بلکہ صرف تماشائی کے جذبے میں۔ میں جس منظری کیفیت و موسمی خوشگواری پر مسرور ہو رہا

ہوں وہی ڈک والوں کے لیے بھانک اور تکلیف دہ ہے۔ یہ کیوں؟ اور مجھے دفعتہً جنگ یاد آ گئی۔ جلتے ہوئے شہر، پھڑکتی ہوئی لاشیں، بموں کا طغیان، منڈلاتے ہوئے گدھ، اور میں نے نصف زینہ اُتر کر نیچے نظر ڈالی۔ پورے ڈک پر سوائے دو تین فوجی بھرتی کرنے والے جوانوں کے کسی کے چہرے پر نہ بشاشت تھی نہ مسکراہٹ۔ ڈک بھیگا ہوا تھا، مسافر بھیگے تھے، کچھ بوڑھے اکڑوں بیٹھے بیڑی کے کش لے رہے تھے۔ ہر ایک کے چہرے پر فکروں کی، دُکھوں کی لکیریں پڑی ہوئی۔ کچھ بوڑھیاں خاموش سر جھکائے بیٹھی تھیں، دو ایک ایک دوسری بڑھیا کے کھچڑی میل سے اٹے، بالوں سے جوئیں پکڑ کر چٹاچٹ مار رہی تھیں۔ کچھ مائیں گود کے بچوں کو گلے سے چمٹائے تھیں، یا ساڑی کے پلّو کا آڑ کیے اُنھیں دودھ پلا رہی تھیں، اور ایک جوان لڑکی بھیگی ہوئی ساڑی میں کھڑی، عرشے کے زینے سے ٹیک لگائے، سردی سے کانپ رہی تھی۔ میرے ہولڈال اور سوٹ کیس میں سوتی اور ریشمی کئی چادریں تھیں۔ بے ساختہ جی چاہا انھیں کھول کر اسے کوئی چادر اُڑھا دوں، مگر دیکھنے والے سگریٹوں پر لمبے لمبے کش لیتے ہوئے اُسے للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے، بڑی بوڑھیاں اس پر شک وشبہ کی نظریں ڈال رہی تھیں، بوڑھوں نے گو اس کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا، مگر اسے کنکھیوں سے دیکھتے جاتے تھے۔ جوان مائیں اس کو ایک طرح کا خطرہ سمجھ رہی تھیں، مَیں دوسرے مذہب وملت کا آدمی، دوسرے طبقے کا انسان، عرشے کا مسافر، اگر میں اس طرح کی نیکی بھی کروں تو لوگ اسے کیا سمجھیں گے؟ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ یقینی اس طرح کے فعل کو 'ڈورے ڈالنا' سمجھیں گے اور گھر پر جو بیوی کو چادروں کا حساب دینا پڑے گا، تو اس وقت کیا کہوں گا؟ کیا ان کو میری نیک نیتی پر، انسانی ہمدردی پر یقین آئے گا؟ عقل نے راہِ پناہ بجھائی۔ "چند منٹ میں سون پور آ جائے گا بلکہ دیکھو اس کے نشانات ابھی سے دِکھائی دے رہے ہیں، جذبات میں نہ بہو۔" غرض میں اُلجھتا ہوا پھر عرشے پر چڑھ آیا۔ بے وجہ اپنے کو مشکوک ومشتبہ بننے کے وسواس نے مجھے ایک احمقانہ نیکی سے بچالیا!

گھاٹ سے اسٹیشن تک کے لیے بڑی مشکلوں سے ایک قلی ملا۔ یہ کوئی جوان نہ تھا، ایک پچاس سالہ بوڑھا تھا، اس کے چہرے مہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُسے تنفسی دَورے بھی پڑتے ہیں، لیکن نہ اس کے پاس دوا کے دام ہیں اور نہ اس گرانی میں پیٹ بھر کھانے کے پیسے۔ جب وہ ہانپتے ہوئے میرا سوٹ کیس برتھ کے نیچے رکھ کر اور ہولڈال کھول کر برتھ پر بستر بچھانے لگا تو

میں نے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ ''نہیں رہنے دو، میں بچھالوں گا۔'' اور اسے مقررہ مزدوری سے دُگنے پیسے دے دیئے۔ وہ کھیسے نکال کر جب نمستے کر کے دعائیں دیتا چلا گیا تو مَیں نے ایک برتری و بلندی سی محسوس کی۔ ''مَیں بھی اس قابل ہوں کہ مَیں دو چار پیسوں کے عوض لوگوں کی دعائیں خرید سکتا ہوں!'' اسی جذبے کے ساتھ مَیں نے ہولڈال خود کھول کر بستر بچھایا اور جوتے کے فیتے کھول کر لیٹنا چاہا۔ مگر ویسے ہی یاد آیا ''ارے لیٹ تو لوں گا، مگر کتاب کہاں؟''

میرے لیے سفر میں دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک تو لیٹنے کی جگہ، دوسرے دو تین انگریزی ناول۔ کمر اور پیٹھ کی وہ ساری اسپرنگیں جو دس سے چار تک اسکول اور کالج میں کرسی پر بیٹھتے یا کلاس میں کھڑے ہو کر پڑھاتے وقت میرے جسم کو کسے رہتی ہیں، سفر میں بالکل ہی کھل جاتی ہیں۔ مَیں بغیر کمر سیدھی کیے سفر نہیں کر سکتا۔ میرا دوسرا لازمی ہم سفر ہے ناول، یہ لباس کی طرح ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ ناول بینی میرا مرض ہے۔ چار پانچ گھنٹے روزانہ اس کی نذر کرنا ضروری ہیں۔ نیا نہ ملے گا تو پرانا ہی سہی، مگر اس کی مزاولت میں فرق نہ آئے گا۔ بغیر اس کے نہ تو اچھی نیند آتی ہے، نہ جاگتے میں سکونِ قلب میسر ہوتا ہے، اور سفر تو بغیر اس کے کٹ ہی نہیں سکتا۔ مہندرو گھاٹ سے سوار ہوا تھا۔ وہاں کوئی بک اسٹال نہ تھا، سون پور میں موجود تو تھا ضرور، مگر ڈبےّ میں مَیں اکیلا تھا۔ سوٹ کیس اور بستر چھوڑ کر چلے جانے میں ان کے چوری جانے کا خطرہ تھا۔ اس زمانے میں چوریاں ڈکیتیاں بہت بڑھ گئی تھیں، جہاں کوئی مجرم پکڑا گیا، اُس نے جھٹ اپنے کو فوج میں بھرتی کرالیا۔ پھر نہ کوئی مقدمہ چلتا اور نہ تھانے پولیس والے رپٹ لکھتے۔ غرض میرے لیے ڈبےّ کی تنہائی بھی قیدِ تنہائی بنی۔ کھڑکی سے سر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا، اپنا بوڑھا قلی بھی نہ دِکھائی دیا کہ اسی کو سامان کی حفاظت پر سونپ کر کے بک اسٹال سے کتاب خرید لاتا۔ دِکھائی دیا تو ٹرین کا گارڈ سیٹی بجاتا، سبز جھنڈی ہلاتا ہوا۔

مجبوراً اپنی سیٹ کی طرف آ کر میں نے سوٹ کیس کی تلاشی لی۔ اپنے ہی کچھ مسودے ملے، سادے کاغذ کا پیڈ اور پنسل نکالی۔ سوچا لاؤ آج کے سفر میں کوئی کہانی لکھ ڈالوں، مگر میں تو مصرعِ طرح والے غزل گو شعرا جیسا افسانہ نویس ہوں۔ مدیروں یا دوستوں کے تقاضے میرے لیے مصرعِ طرح کا کام دیتے ہیں۔ اس وقت کسی مؤقر جریدے کے مدیر کے خط کا خیال نہ آیا۔ ایسے ویسے پرچے تو مضمون اور افسانے مانگا ہی کرتے ہیں۔ ان میں لکھنے سے ان کی تو

شہرت ہوتی ہے اور اپنی وقعت گھٹتی ہے۔ معاوضہ دینے کا اُردو کے رسالوں میں اس وقت رواج ہی نہیں تھا، بس دو ایک پنجاب والے تو بیس پچیس دے دیتے تھے، ورنہ یوپی والے سوکھا ٹرخاتے تھے۔ پھر لکھنے کا فائدہ ہی کیا، نہ تو صاحبانِ نظر نے اُسے پڑھا اور نہ پیسا ہی ہاتھ آیا۔ نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم! پھر بھی وقت کیونکر کاٹا جائے۔ لاکھ لاکھ دماغ پر زور دیا، کروٹیں بدلیں، بائیں کروٹ لیٹ کر کہنی کے نیچے تکیہ دبایا، شیونگ سیٹ سے ایک بلیڈ نکال کر پنسل کی نوک باریک سے باریک تر کی۔ اس کے بے بنے حصے کو دانتوں سے خوب دبایا، کاٹا، چبایا مگر سوائے اسٹیمر کے سفر کے منظر کے کہانی آگے نہ بڑھی۔

بارے چھپرے کا اسٹیشن آ گیا۔ گاڑی کے اسٹیشن میں داخل ہوتے ہی میں دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اسٹیشن پر کافی چہل پہل تھی، میرا ڈبّہ اتفاق سے وہیلر کی دُکان کے سامنے ہی آ کر رُکا۔ میں نے چاہا جھپٹ کر ایک اسٹال سے دو ایک کتابیں لے لوں، مگر ویسے ہی ایک جوان سیٹھ کئی آدمیوں کے ساتھ ڈبے میں داخل ہونے کے لیے بڑھے۔ دو تو مزدور تھے۔ ایک کے سر پر ایک قیمتی سوٹ کیس تھا، دوسرے کے سر پر ایک نیا ہولڈال اور منیم جی کے ہاتھوں میں ایک چمڑے کا بیگ اور ایک بے ٹونٹی کا جرمن سلور کا لوٹا اور اس کے اندر اُسی دھات کا ایک گلاس۔ مَیں اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ دل میں سوچا، یہ لوگ اپنی اپنی جگہ لے لیں تو مَیں بک اسٹال جاؤں۔ مزدوروں نے سوٹ کیس اوپر کی برتھ پر اور ہولڈال نیچے کی برتھ پر رکھا۔ منیم جی نے بٹوا، لوٹا، گلاس سب اُوپر ہی رکھ کر، ہولڈال اپنے ہاتھ سے کھولا۔ بستر بڑے احتیاط سے بچھایا، چادر کی شکنیں بڑے احترام سے برابر کیں اور سیٹھ صاحب اس پر بیٹھ گئے۔

یہ کوئی تیس پینتیس برس کے جوان تھے، ساڑھے پانچ فٹ قد، گورا رنگ، ذرا پیلا پن لیے ہوئے، پیشانی چوڑی، بھنویں گھنی، ناک کا بانسہ پھیلا ہوا، آنکھیں اوسط، مگر اُن کی پتلیوں میں خلافِ معمول بڑی عیارانہ چمک، چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں، ہونٹ ذرا موٹے، گھٹی ہوئی ٹھوڑی ذرا نوکیلی، گردن نسبتاً چھوٹی اور موٹی، ہاتھ پاؤں متناسب۔ سب پر ایک پگڑی نما مندیل تھی، جو کسی قیمتی کپڑے کی تھی، اس لیے کہ بار بار چمکتی تھی، جو کسی قیمتی کپڑے کی تھی، اس لیے کہ بار بار چمکتی تھی۔ جسم میں ایک بنگالی ریشمی کرتا تھا، جس کے گلے کے بٹن سونے کے تھے، ٹانگوں میں نہایت ہی باریک سفید کنارے دار دھوتی تھی اور پاؤں میں کڈ کا نوک دار سیاہ پمپ تھا۔ ایک کان میں ان کے ایک ہیرے کا آویزہ تھا اور انگلی میں ہیرے ہی کی انگوٹھی۔

سیٹھ صاحب بستر پر لیپ اُتار کر چارزانو بیٹھ گئے۔ انھوں نے سر پر سے پگڑی بہت آہستہ سے اُتاری، اسے منیم جی کی طرف بڑھایا، انھوں نے بڑے احترام سے بلاتشبیہ جس طرح مسلمان قرآن کو لیتا ہے، اپنے آقا کے دستِ مبارک سے اس مقدس سرپوش کو لیا اور اسے سوٹ کیس کی رحل پر رکھ دیا۔ سیٹھ صاحب نے مزدوروں سے کہا ''تم لوگ جاؤ'' ان کے ساتھ ہی میں ڈبےّ سے نکل آیا۔

میں بک اسٹال سے دو وائلڈ وسٹ ناول خرید کر پلٹا۔ ممکن ہے آپ کو میری پسند پر تعجب ہو، مگر میں کیا کروں، مجھے جاسوسی اور جنسی ناولوں سے کہیں زیادہ 'کاؤبوائز' (گوالوں) کے یہ قصّے ہی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں اچھے بُرے کردار شروع ہی سے نمایاں ہوتے ہیں۔ سپید و سیاہ ملا کر عجوبہ سیرتیں نہیں پیش کی جاتی ہیں، اور نہ تحلیلِ نفسی کی افراط ہوتی ہے۔ یہ کھلی فضا میں زندگی بسر کرنے والے جفاکش گنوار گھونسے بازی کرتے ہیں۔ شرابیں پیتے ہیں، لڑتے ہیں، مرتے ہیں، اور ان کے خونیوں تک میں مردانگی، جوانمردی اور غیرت وحمیت کے وہ جوہر ہوتے ہیں، جو میری رومان پسند طبیعت کو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا یقین دلاتے ہیں۔

مَیں جب ڈبےّ میں داخل ہوا تو منیم جی جا چکے تھے اور سیٹھ جی بستر پر دراز تھے۔ میری چیزیں بھی اپنی اپنی جگہ پر تھیں، ان کی چیزیں بھی۔ صرف چمڑے والا بیگ اب تکیے سے نصف دبا سرہانے تھا۔ وہ خود میری سیٹ کی جانب پشت کیے ہوئے لیٹے تھے۔ مَیں نے نئے ناول کے مطالعہ کو ترجیح دی اور تھوڑی دیر میں اپنے ٹکسن ہیرو و راس کے مشکی گھوڑے کے کارناموں میں اس طرح محو ہوا کہ میں سیٹھ جی کے وجود ہی کو بھول گیا۔ گاڑی چلتی رہی، ہر چھوٹے سے چھوٹے اسٹیشن پر مسافر اُترتے، چڑھتے اور شور مچاتے رہے، مگر سیٹھ جی خرّاٹوں کے ساتھ سوتے رہے۔ میں ناول پڑھنے میں محو رہا۔ کوئی ہمارے ڈبےّ میں نہ آیا۔

بلیا کے اسٹیشن پر ایک اور سیٹھ داخل ہوا۔ یہ صورت شکل، قد و قامت، وضع قطع سے بالکل سیٹھ تھا۔ کالا بھی اور موٹا بھی اور ٹھگنا قد اور چھوٹی ٹانگوں پر بڑی سی توند کا بوجھ بھی سنبھالے ہوئے تھا۔ اس نے عرض والی برتھ پر قبضہ کیا اور قلی سے مزدوری پر اس قدر زور زور سے جھگڑا کیا کہ پورا ڈبہ گونجنے لگا۔ قلی امریکی سپاہیوں سے روپیہ دو روپیہ بخششیں پانے کا عادی ہو گیا تھا۔ یہاں سیٹھ چونی تھما رہا تھا، وہ منہ پھلائے کھڑا رہا، بس یہی کہے گیا ''بہت کم ہے، مہنگی

ہے، کال کا سمے ہے!" ہر آدھ آنے پر لڑتے لڑتے بالآخر آٹھ آنے پر صلح ہوئی۔ قلی خفا خفا ادھر گیا اور "یہ لوٹ ہے لوٹ" بڑبڑاتا اور ایک چار خانے کے انگوچھے سے منہ پونچھ کر اُسے زور سے ہولڈال پر پھینکتا ہم دونوں مسافر ساتھیوں کی طرف ہمدردی کے لیے پلٹا۔ مگر سوتا فتنہ جاگ گیا تھا۔ وہ کچھ چیں بجبیں ہو کر کہنی کے بل اُٹھ کر اس شور کرتے بنڈیلے کو دیکھ رہا تھا۔ ادھر میری طرف سے گھومتی ہوئی نظر جب اس رُخ کو گئی تو بجلی کی سی تیزی سے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ کچھ تعجب، کچھ خوف، پھر احترام کی وہ کیفیت جو کسی بزرگ کو اچانک دیکھ کر کسی سعید چھوٹے کے چہرے پر خوف کے آثار کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولا "ارے چھما کرنا سیٹھ جی، میں نے شاید آپ کی نیند خراب کر دی۔"

وہ بولے "نہیں، کوئی بات نہیں۔"

مگر اب وہ کھیسے نکال کر اسی برتھ کی طرف بڑھا۔ "یہ آپ اِدھر کہاں؟"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ارے ایک چھوٹا سا اپنا کام یہاں چھپرے میں بھی ہے!"

"اچھا!"

"ہاں، پارسال سے فوج کے لیے گھی کا ٹھیکہ ایک نئے فرم کے نام سے لے لیا ہے۔ وہ یہیں سے سپلائی ہوتا ہے!"

"تو ہوگا یہی پچاس ساٹھ ہزار کا؟"

وہ مسکرایا۔ گویا اسے اس چھوٹے سیٹھ کی کم ظرفی پر ترس آ رہا تھا۔ وہ بولا "نہیں پارسال چار لاکھ کا تھا، اب کے چودہ لاکھ کا ہے۔"

میں اب تک تو نظریں ناول پر جمائے تھا۔ ان کی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا، مگر جب لاکھوں کی باتیں ہوں تو غریب مدرّس کا دھیان کتاب میں نہیں لگ سکتا۔ ہم جس دولت کا عمر بھر خواب دیکھا کرتے ہیں، وہ ان کا روزمرہ کا کھیل ہوتی ہے۔ ہم جو انھیں عقل و حکمت، اقتصادیات و تجارت کے اصول سکھاتے ہیں، وہ کون سا گر ہے جو ہمیں نہیں آتا اور انھیں بغیر سکھائے آتا ہے؟ یہ کیا بات ہے کہ گرو گڑ ہی رہتا ہے اور چیلا چینی بن جاتا ہے؟ اس لیے مَیں نے کان کھڑے کیے۔ 'کاؤبوائز' کی دھائیں دھائیں بھولا اور سیٹھوں کی کھسر پھسر پورے دھیان سے سننے لگا۔

موٹے سیٹھ نے "شیو شیو" کہہ کر لمبی سانس لی، پھر بولا "ارے تو اپنا دیس چھوڑ کر

یہاں چھپرے میں کا ہے فرم کھولا؟"

گوراسیٹھ بولا "بنگال میں تو کال تھا۔ وہاں گائے بھینس کہاں؟ اناج کی طرح گھی بھی غائب تھا۔ پھر سارا کام ایک ہی فرم کو دے دیا جائے تو سرکار کی بدنامی ہوتی ہے۔ اس لیے نام اور جگہ تو بدلنا ہی پڑتا ہے۔"

موٹا سیٹھ بولا "تو ہم کو کا ہے نہ یاد کیا، ہم جیسے کال کے شمے میں گیہوں، آٹا، چاول، دال ایس پہنچایا ویشے ہی گھی کا انتجام بھی کرتا۔ ہمارا بھی تو پرورس جروری ہے۔"

گوراسیٹھ ذرا جھڑکنے والے انداز میں بولا۔ "تو یہ کال کا سمے تھوڑے تھا کہ تم نے سڑا گلا جیسا بھی مال بھیج دیا، وہ سب کھپ گیا۔"

موٹا سیٹھ سٹپٹا کر بولا۔ "جی، جی! ایسا نہ کہو۔ بڑا شیٹھ کھُد بولا تھا، جیشا بھی ہو بش بھیجو۔"

گوراسیٹھ بولا "وہ تو سمے ہی ایسا تھا، سڑا، کیڑا پڑا ہوا بھی روپے کا تین چھٹانک آدھ پاؤ بیچ لیا۔ پر یہ تو فوج کا معاملہ ہے۔ بس اسی سے سمجھو کہ پارسال چار لاکھ کے ٹھیکے میں بس پچاس ہزار کا نفع ہوا....."

موٹا بولا "ایں، یہ کیشے؟"

گورا ہنس کر بولا "ارے ٹھیکہ ملنا کوئی مجاک تھوڑے ہے۔ دفتر کے چپراسی سے لے کر ڈائریکٹر جنرل سپلائی تک سب ہی کو تو پرساد چڑھانی پڑتی ہے۔ اب کے سوچا تھا لمبی رکم ملے گی، سو وہ بھی یہاں کے آدمیوں نے کام کھراب کیا۔ چودہ لاکھ میں چھ لاکھ کے نفع کی امید تھی....."

موٹے سیٹھ نے پھر "شیو! شیو" کہہ کر لمبی سانس لی۔ پھر وہ بڑے احترام سے بولا "چھ لاکھ!"

اس نے کہا۔ "ہاں، پر ان مورکھوں نے نجر نجرانے میں کمی کی۔ سارا مال دتی سرکار نے ریجیکٹ کر دیا۔ پورے آٹھ لاکھ اصل کے بھی ڈوب رہے تھے۔ جب ہی تو میں کھُد آیا....."

موٹے سیٹھ نے کہا "تو کیا آپ دوسرا مال شپلائی کیا؟"

گورا ہنسا۔ "انھوں نے مجھ سے کہا تم جا کر دیکھو، یہ کیا گول مال ہے۔ میں نے یہاں آکر پوچھا، اگرٹن صاحب سے ملے تھے، اینٹونی صاحب کے درشن کو گئے تھے۔ معلوم ہوا نہیں۔"

موٹے سیٹھ کے پیٹ میں جیسے درد ہو رہا تھا۔ پوچھا "یہ کون شاہب لوگ ہے؟"

وہ بولا" یہ دونوں اپنے ہی کلکتہ سے دلّی گئے ہیں۔ جمخانے میں ہمارے ساتھ کے ممبر تھے۔ کال کے سمے میں ایسی ایسی چیج، ایسی ایسی چیج...."

اور وہ دفعتہً چپ ہو گیا اور اُس کی آنکھیں نہ جانے کون کون سی صورتیں فضا میں دیکھنے لگیں۔

موٹا ذرا اور کھسکا، اس نے کہا" میں سمجھا نہیں، شیٹھ!"

گورا دفعتہً چونک کر کھسیانی ہنسی ہنسا اور اس نے موٹے کے پیٹ میں انگلی چبھو کر کہا "ارے تم کیا کرو گے سمجھ کے۔ تمھاری اب وہ عمر ہی نہیں!"

موٹا اپنی خفت مٹانے کے لیے ہنسا" ہاں بابا ہمارا اب وہ سِن کہاں!" پھر کچھ سوچ کر بولا" تو کیا اس کا بھی بیوپار ہوتا تھا؟"

وہ کچھ چڑ کر بولا" ارے جب پیٹ جلتا ہے تو سب کچھ بکتا ہے۔ ایسے مال کی کھپت پنجاب اور سرحد میں بہت تھی۔ بیسیوں اپنے جانے پہچانے لوگ اس دھندے سے بن گئے۔"

موٹا ہاتھ ملنے لگا۔ بے ساختہ 'شیو شیو' کہا، پھر ذرا گمبھیر ہو کر بولا" یہ بڑا نیچ دھندا ہے!"

گورے نے جھڑک کر ایک بالکل نیا سرمایہ دارانہ نظریہ پیش کیا۔" سیٹھ جی، دھندا اُسی وقت تک اُونچ نیچ ہوتا ہے، جب تک دس پانچ روپیوں کا معاملہ ہو، مگر جب ہجاروں لاکھوں کی بات چیت ہو تو کوئی بھی دھندا نیچ نہیں کہا جاسکتا۔"

موٹے نے سٹپٹا کر کہا" شچ ہے، ٹھیک بولا آپ!" وہ جلدی سے اصل موضوع کی طرف پلٹا۔" تو آپ شاب لوگوں سے ملا؟"

گورے نے اپنی فتحیابی جھوم جھوم کر اور چٹخارے لے لے کر بیان کی۔" ہاں، اگرٹن صاحب، ڈائریکٹر جنرل کے پی اے تھے اور اینٹونی صاحب سارے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ، میں نے اگرٹن صاحب سے ملتے ہی رونی صورت بنا کر کہا" میں تو لٹ گیا! دس بارہ لاکھ ڈوب گئے!" وہ بولے" میں کیا کرتا، سرکاری حکم ہے کہ دس فیصدی میل ہوسکتا ہے، چیف کیمسٹ نے رپورٹ دے دی کہ اس میں بیس فیصدی میل ہے!" میں نے چپکے سے پانچ ہزار کے نوٹ ان کی جیب میں ڈال کے کہا" کام بنواؤ صاحب۔" وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔" اپنے صاحب سے تو چلو ملوا دوں۔ دیکھ وہ کیا کہتے ہیں۔" اُس کے بعد وہ اکیلے بڑے صاحب کے پاس گیا۔ ان سے کچھ باتیں کر کے مجھے اندر بلا لے گیا۔ صاحب نے کہا" ویل سیٹھ!" اور اپنا

ہاتھ ملانے کو بڑھایا۔ مَیں نے جلدی سے جھک کر پاؤں پکڑ لیا۔ ’’مَیں مر گیا ہجور! مَیں مر گیا!‘‘ وہ مجھے جھک کر اُٹھانے لگے تو مَیں نے ایک لفافہ ان کے جوتوں پر رکھ دیا۔ اس میں ہجار ہجار کے پچاس نوٹ رکھے تھے۔ انھوں نے مجھ کو اُٹھاتے ہوئے لفافے کو کنکھیوں سے دیکھا۔ میری پیٹھ ٹھونک کر کرسی پر بٹھایا۔ اگرٹن نے چپکے سے میرا کندھا دبایا اور وہ کمرے کے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی بڑے صاحب نے بڑی بے پروائی سے لفافہ اُٹھایا، نوٹوں کی گڈی کو انگوٹھے سے پھڑ پھڑایا، اور اسے اپنے دراز میں ڈال دیا۔ پھر پوچھا ’’ویل کیا چاہتا ہے؟‘‘ مَیں نے کہا۔ ’’ہجور، میرا مال اتنا کھراب نہیں، گلتی سے نمبر ایک کی جگہ میرے آدمیوں نے نمبر دو کا ٹین بھیج دیا۔ نمبر ایک میں اپنے ساتھ لایا ہوں، وہ جنچوا لیا جائے۔‘‘ انھوں نے گھنٹی بجا کر اگرٹن کو بلایا اور حکم دے دیا کہ چیف کیمسٹ کو ان کا یہ گھی جانچنے کا حکم دے دیا جائے۔ پھر کہا اینٹونی کو بھیج دو۔ وہ آئے تو اُن سے بولے ’’تم چیف کیمسٹ کا بنگلہ جانتے ہی ہو، ان کو لے جا کر ان کی میم صاحب کے ذریعے سے ان سے ملوا دو۔‘‘ مَیں نے اینٹونی صاحب کی جیب میں بھی پانچ ہزار ڈالے اور ان کے ساتھ جا کر چیف کیمسٹ کی بیوی کو بھی پچیس ہزار نجر کیے۔ سنا تھا کہ وہ بڑا سخت آدمی ہے مگر یوروپ والا پھولا دہی کا کیوں نہ بنا ہو میم صاحبوں کے ہاتھ میں موم کا ہو جاتا ہے۔ اس نے بہت پھوں پھاں کیا مگر میم صاحب نے کہا ’’یہ ہمارا آدمی ہے۔ اس کا کام کرنا ہی پڑے گا!‘‘

غرض دوسرے دن پھر گھی جانچا گیا۔ تھا وہی پہلے والا، بس ٹین بدلا ہوا تھا۔ اور ہر ٹین پر نمبر ایک کی مہر لگی تھی۔ اُدھر تو گھی جانچا جانے لگا، اِدھر میں گھسا دفتر میں۔ وہاں بڑا بابو تھا اپنے دیش کا ایک بنگالی۔ اس سے پہلے سے جان پہچان تھی۔ اس نے کہا ’’تم کیا سمجھتے ہو کہ اس دفتر میں بغیر چکنائی لگائے کام ہو جائے گا۔ لاؤ بائیں ہاتھ سے نکالو پینٹ سے رقم۔ مَیں نے وہاں بھی دو ہزار دیے۔ صاحب نے بلا کر کہا ’’یہ تو وہی گھی ہے، میں بیس سے گھٹا کر اسے پندرہ فیصدی لکھے دیتا ہوں۔ اس سے کم نہیں کر سکتا!‘‘ میں خوشامد کرنے لگا مگر وہ خفا ہو گیا۔ بولا ’’ہم کہاں تک بے ایمانی کرے، بس جاؤ‘‘ بڑا بابو مجھے جلدی سے اُٹھا لایا۔ صاحب نے پندرہ انگریزی عدد میں لکھا تھا ’’دفتر نے بہت آسانی سے اسے تیرہ کر دیا۔ مگر تین ہجار اور لیے۔ دوسرے دن اگرٹن صاحب سے جا کر کہا۔ انھوں نے کہا ’’یہاں بھی دفتر میں کھسر پھسر ہے، ان سب کو ملاؤ، نہیں تو کام نہیں بنے گا۔ گھبراؤ نہیں، ہم اور اینٹونی صاحب پھر زور دیں گے کہ

دس کی جگہ تیرہ فیصدی میل کی اجازت دے دی جائے، تو بھائی دفتر میں پانچ ہزار بانٹنے کو دیئے۔ صاحب کے چرن پر بیس ہزار اور چڑھائے۔ حکم نکلا کہ ''جنگ کی ضرورتوں کی وجہ سے دس کی جگہ تیرہ فیصدی میل کی اجازت دی جاتی ہے۔'' اگرٹن اور اینٹونی کو تگڑا ڈنر دیا۔ اچھی سے اچھی شراب پلائی اور ایک ایک بانٹی لونڈیا کا انتظام کیا اور خوشی خوشی گھر پلٹا۔''

موٹے ساٹھ نے ''شیوشیو'' کہہ کے لمبی سانس لی، پوچھا ''کل کتنا کھرچ بیٹھا؟''

موٹے نے دیدے نکال کر کہا۔ ''شیو! شیو! ڈیڑھ لاکھ!''

گورا بڑی بے پروائی سے بولا۔ ''ارے چلو، کیا گھاٹا رہا؟ چھ لاکھ کی جگہ ساڑھے چار لاکھ نفع رہا۔ ساڑھے نو لاکھ اصل پر منافع، پچاس فیصدی سے کچھ ہی کم تو پڑا! اور پھر اگلے ٹھیکے کے لیے راستہ بھی صاف ہو گیا!''

مَیں سنتا جاتا تھا اور کھولتا جاتا تھا۔ دونوں نے جب اپنی تجارتی حرفتوں کی کامیابی پر فاتحانہ قہقہہ لگایا تو میرا پیمانۂ صبر چھلک اُٹھا۔ مدرّس کو بے راہ روی پر ٹوکنے، جھڑکنے اور ملامت کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ اسی خراب عادت نے مجھے ان کی آپس کی گفتگو میں دخل در نامعقولات کرنے پر مجبور کیا۔ میں پوچھ بیٹھا۔

''کیوں سیٹھ جی، آپ کے گھی میں دراصل میل کتنا تھا؟''

اس نے ذرا گھبرا کر مجھے دیکھا۔ کوئی خفیہ پولیس کا آدمی سمجھا۔

میں نے کہا ''آپ گھبرائیں نہیں، میں ایک معمولی سا ٹیچر ہوں۔''

چھوٹے نے ناک سکوڑ کر کہا ''کسی اشکول میں پڑھاتے ہو جی؟''

میں اس کے لب و لہجے میں جو حقارت تھی اسے پی گیا۔ میں نے کہا ''جی ہاں، پڑھاتا ہوں، اسی لیے تو پوچھتا ہوں کہ دراصل کتنا میل تھا۔ مجھ کو اس طرح کے سوالات آپ کے بچوں کو روزانہ حل کرانے پڑتے ہیں!''

گورے سیٹھ نے مجھے بے ضرر محسوس کر کے ذرا اطمینان سے جواب دیا۔ ''پچیس فیصدی۔ دس فیصدی تو گوالے گھر سے ملا کر دیتے ہی ہیں، میاں جی! اب پندرہ فیصدی کارخانے میں نہ ملایا جائے تو فائدہ ہی کیا ہو؟''

اس 'میاں جی' کے برمحل استعمال پر جی جل گیا، مگر مَیں نے ضبط کر کے کہا ''سچ ہے، مگر آپ دو باتیں بھول گئے۔ ایک تو یہ کہ یہ گھی ہمارے ہی ہندوستانی فوجی جوان کھائیں گے، ان

کی صحت پر کیا اثر پڑے گا؟''

چھوٹا بات کاٹ کر بولا'' ''ہمارا جوان کنکر پتھر بچا لیتا ہے، گھی تو پھر گھی ہی ہے۔ اُس پر وہ تو مرنے جا ہی رہا ہے۔ وہ ہمارا گھی کھا کے مرے یا جاپانی گولی سے!'' اور اس نے اپنی حاضر جوابی پر قہقہہ لگایا۔ بڑا سیٹھ پڑھا لکھا تھا، وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔

مَیں تلملا اُٹھا۔ جی چاہا کہہ دوں ''ہاں تو دونوں برابر ہی ہوئے — آپ اور دشمن!'' مگر بے وقوف مدرّس کی طرح پھر غصہ پی گیا۔ البتہ اپنے فرض سے باز نہ آیا۔

مَیں نے کہا'' آپ نے یہ بھی سوچا کہ رشوت لینا اور دینا دونوں جرم ہیں۔''

دونوں اس طرح اُچھل پڑے جیسے مَیں نے ان کی برتھ کے نیچے پٹا خا داغ دیا ہو۔ چھوٹا سیٹھ سچ مچ خفا ہو گیا۔

وہ بولا'' رشوت، گھوش! بنا گھوش کے دُنیا کا کون شا دھندا چلتا ہے میاں جی؟ یہ شاری دُنیا گھوش پر چلتی ہے! بالک کو چاہتے ہو کہ ہنسے، جھنجھنا دو، رنگ برنگ کا گبارہ دو! گئو ماتا کو چاہتے ہو، دودھ دے، اچھا اچھا چارہ دو۔ پتنی کو چاہتے ہو کہ تمکو اچھا اچھا بھوجن کھلائے، دیکھتے ہی آنکھ مٹکائے، اُش کو گہنا دو، اچھا اچھا وستر دو۔ دین دھرم چاہتے ہو ٹھیک رہے، مندر میں جا کر پرشاد چڑھاؤ، کالی مائی کو بکرا دو! ارے بھگوان تک گھوش لیتا ہے بابا، بھگوان تک! کوئی کام بنا گھوش کے نہ یہاں شپھل ہوتا ہے، نہ پرلوک میں!''

مَیں انھیں رشوت کے نقصانات، اس کی اخلاقی خرابیاں، اس کی بے ایمانی اور اس کی خود غرضی وغیرہ پر پورا لکچر دینا ہی چاہتا تھا کہ ''شہباز قلی' کے اسٹیشن کا سواد دِکھائی دینے لگا۔ مجھے وہیں اُترنا تھا۔ مَیں نے جلدی سے بستر سمیٹا، ہولڈال باندھا اور اپنا سوٹ کیس اور ہولڈال دروازے کے پاس رکھا۔ جیسے ہی اسٹیشن آیا جلدی سے پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ گاؤں سے مزدور آئے تھے۔ انھوں نے اسباب سنبھال لیا۔ اب مَیں نے اپنے ڈبےّ پر نظر ڈالی۔ بڑا سیٹھ مسکرا رہا تھا اور چھوٹا سیٹھ ہنسے جا رہا تھا۔ جیسے اُس نے اپنی دلیل سے مجھے بالکل ساکت ہی نہ کر دیا ہو، بلکہ مجھے فرار پر بھی مجبور کر دیا ہو!

راستے بھر میں سرمایہ داروں، پونجی پتیوں کے اخلاقی معیار پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ کتنے ذلیل ہوتے ہیں یہ بڑے بزنس والے۔ ان کو اپنے نفع کے آگے کسی دوسرے کے نقصان کا، تکلیف کی، بلکہ جان تک کا کوئی خیال ہی نہیں رہتا، لیکن جب گھر پہنچ کر نہا دھو کر ناشتہ کرنے

بیٹھا تو اہلمد صاحب کی بیٹی کے جہیز کا ذکر چھڑا۔ دس دن میں اس کی برات آنے والی تھی۔ ڈہرے تہرے سونے کے زیورات، چاندی کا پاندان، خاصدان، چاندی کی پلنگڑی، چاندی کی چوکی دی جانے والی تھی۔ اکیس بھاری جوڑے تیار ہو چکے تھے۔ ابھی اور نہ جانے کتنے بن رہے تھے۔ سارا گاؤں آنے والی برات کے اہتمام سے ہل رہا تھا۔ ہر ایک کے ہاں حسبِ حیثیت اس شادی میں شرکت کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میرے گھر سے ان سے عزیز داری تھی، امّا کو اپنے لیے تو نہیں، مگر اپنی بہو کے لیے نئے جوڑے بنوانے کی فکر تھی۔ پھر ہر رسم پر کچھ نہ کچھ دینا ہی ہوگا۔ غرض پورے ڈیڑھ سو روپے کا تخمینہ تھا۔

مَیں نے ٹھنڈی سانس لے کر امّاں سے کہا۔ ''آج جون کی ۲۸ ہے۔ دو دن میں مہینہ ختم ہے۔ جولائی کی پہلی یا دوسری کو دفتر والے تنخواہ کا منی آرڈر روانہ کر دیں گے۔ ۵ یا ۶ رجولائی تک روپے آ جائیں گے۔ اس میں سے ڈیڑھ سو لے لیجیے گا!''

امّاں منہ بنا کر جھڑکنے والے انداز میں بولیں۔ ''ہونہہ! تمھاری موئی بے برکت والی تنخواہ میں رکھا ہی کیا ہے۔ تم نے اتنا پڑھا لکھا، بڑی بڑی ڈگریاں لیں، اکیس بائیس برس تم کو جھک جھک کرتے، لونڈوں سے اپنا مغز چٹواتے بیت گئے اور ملتا ہے وہی بندھے بندھائے، گنے گنائے تین سو روپلّی!'' اور انھوں نے رُک کر صحن میں ایک بڑی پیک تھوکی۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ مَیں پولیس کا داروغہ ہوتا اور مَیں بنا مدرّس! وہ سمجھانے والے انداز میں بولیں ''ارے اسی ممدو اہلمد کو دیکھو، آٹھواں پاس ہے، تنخواہ کہنے کو باون روپیہ ماہوار پاتا ہے، مگر ہُن برستا ہے ہُن۔ اس کے ہاں ایسا ہی کوئی منحوس دن ہوگا کہ وہ پچیس تیس اُوپر سے کما کر نہ لاتا ہو۔ اس کو کہتے ہیں برکت بیٹا!''

مَیں نے رشوت کی نئی تعبیر ماں کے منہ سے سنی۔ حیرت سے ان کا منہ دیکھا اور گردن جھکائے خاموش، جلدی سے باہر چلا آیا۔ یہاں کی بے برکتی تو قسمت میں تھی ہی، وہاں کی بے برکتی کیوں مفت مول لیتا:

کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے

(ماہنامہ آج کل، دہلی جنوری ۱۹۶۵ء)

برہما کی اولاد

ڈاکٹر اِندرا بہت خوش تھی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے قدِ آدم آئینے میں اپنے کو بار بار دیکھتی، کبھی اپنے موٹے لمبے بالوں کو درست کرتی، کبھی آنکھوں کے سرے کو رومال کے کونے سے پونچھتی، کبھی چہرے اور گردن پر لگے ہوئے پاؤڈر کو اور ہلکا کرتی، کبھی ساڑی کے آنچل کو سر پر لمبا کھینچ کر گھونگھٹ نکال کر ہاتھ جوڑ کر سلام کرتی اور کبھی بغیر گھونگھٹ نکالے ہی ہاتھ جوڑنے کا چھب دیکھتی۔ وہ مسلسل گنگنائے جاتی اور بار بار اس طرح مسکراتی کہ اس کے موتی جیسے چمکتے دانت صاف جھلکنے لگتے۔ وہ خوبصورتوں میں نہ تھی۔ پانچ فٹ چار اِنچ قد، سانولی رنگت، چوڑا چہرہ، جبڑے کی اُبھری ہوئی ہڈّیاں، موٹی موٹی بھنویں، بڑا دہانہ، ہونٹ قدرے موٹے، ہاتھ اور پاؤں سچ مچ مور کے۔ ایک تو گھٹنوں سے نیچے تک لمبے کالے موٹے بال، دوسرے دُودھ جیسے سفید دندان۔ اُس کو اپنی یہ دونوں چیزیں بہت عزیز تھیں۔ وہ ان کے رکھ رکھاؤ اور دیکھ بھال میں بڑا وقت صرف کرتی۔ میڈیکل کالج میں اس کے استاد نے کئی بار اس کے بالوں کے کٹوا ڈالنے کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا لیڈی ڈاکٹروں کے لیے بہت لمبے بال مناسب نہیں۔ وہ بعض وقت نازک آپریشنوں کے انجام دینے میں حائل ہو سکتے ہیں۔ مگر اِندرا نے سنی اَن سنی کر دی۔ اپنا سب سے قیمتی مال اپنے پیشے پر بھینٹ چڑھانے کے لیے تیار نہ تھی۔

اس کے پاس ان کے سوا حسین بنانے والی اور کوئی چیز تھی بھی نہیں۔ نہ ذات، نہ دولت۔ وہ میڈیکل کالج کے مہتر کی لڑکی تھی، اس ذات کی جو سب سے بڑی خدمت گزار ہونے کے باعث سب سے زیادہ ذلت کی مستحق سمجھی جاتی ہے۔ اسی اچھوتن ہونے نے اِندرا کو

اچھوتی بھی بنا رکھا تھا۔ اپنی ذات برادری میں کوئی جوڑ کا بر کہاں؟ اُونچی ذات والے درجوں میں پاس کی سیٹ پر بھی منہ بنا کر ہی بیٹھتے، اس پر نظرِ التفات تو کجا۔ بعض نے اسے ہوس کا شکار بنانے کی کوشش ضرور کی، مگر شریکِ زندگی بنانے کا کسی کو خیال تک نہ آیا۔

وہ جلسوں پارٹیوں میں شریک ہوتی اور نہ لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند کرتی اور نہ اس کے ہونٹوں پر بھولے سے بھی ہنسی آتی۔ وہ اپنے پیشے میں فنا ہو کر ایک مشینی ڈاکٹرنی بن گئی تھی۔ البتہ اِدھر دو تین مہینے سے اس میں نمایاں تبدیلی ہوئی تھی۔ اس کے سوکھے گالوں پر سرخی آئی تھی۔ اس کی بے کیف آنکھوں میں ایک خمار کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور اس کی چال میں مستانہ خرامی کی جھلک آ گئی تھی۔ ان تبدیلیوں کا باعث منیش تھا۔ وہ اسی تحصیل کا تحصیلدار ہو کر آ گیا تھا جہاں کے نئے زنانے اسپتال کی اِندرا انچارج تھی۔ منیش اُونچی ذات کا بھی تھا اور خوبرو سجیلا جوان بھی۔ دراز قد، متناسب اعضا، گندمی رنگت، آنکھوں میں سنجیدگی، ہونٹوں پر ہنسی۔ وہ نئے ہندوستان کا ایک سچا سپوت تھا۔ وہ ایک حاکم کی طرح صرف مقدمے کا ہی نہ فیصلہ کرتا تھا بلکہ وہ اپنے حلقے کے گاؤں اور قصبے والوں سے سچی ہمدردی رکھتا تھا۔ وہ ان کے سدھار اور ترقی کے ہر منصوبے میں رضا کارانہ جوش سے حصہ لیتا تھا۔ تحصیل کی عمارت اور اسپتال پاس ہی پاس تھے۔ اس لیے اِندرا اور منیش کو روزانہ ملاقاتوں کے مواقع برابر ملتے ہی رہے۔ طبیعتوں کی یکسانیت نے ان ملاقاتوں میں جذبہ اور کشش بڑھائی۔ اِندرا کے بار بار دبانے اور گلا گھونٹنے کی کوشش پر بھی دونوں کے ہاں وہ چیز وجود میں آ گئی جسے محبت کہتے ہیں۔ اِندرا ڈرتی تھی منیش اس کی ذات سے واقف ہوتے ہی اپنے سارے خواب بھول جائے گا۔ دودھ کی جلی اِندرا اسی لیے اس مٹھے کو بھی پھونک کر پی رہی تھی اور اُس نے اپنے کو جذبات کے دھارے پر بہنے نہ دیا۔ وہ منیش سے بے تکلف نہ ہوئی۔ منیش نے اس کے رُوکھے رویہ سے اُکتا کر ایک دن شکایت کرتے ہوئے دل کا حال کہہ ڈالا اور شادی کی پیشکش اس کے قدموں میں ڈال دی۔ اِندرا نے انکار کرتے ہوئے وجہِ انکار بھی بتا دی۔ مگر اِندرا کے خیال کے برخلاف اس افشائے راز کا اثر منیش پر اُلٹا ہی پڑا۔ وہ کھل اُٹھا۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر بڑی متانت سے کہا "جے ہو بھگوان! تو نے میری یہ خواہش بھی پوری کر دی!" پھر اُس نے اِندرا سے کہا "میں اس ذات کا ہوں جو برہما کے سر سے پیدا ہوئی مگر میری بڑی اِچھا یہی تھی کہ میں اس

کے چرنوں میں پڑا رہوں! وہ تم نے پوری کر دی۔ اب ہمارے بچے برہما کے سر تا قدم پوت ہوں گے۔'' مگر اِندرا اسی پر اڑی رہی کہ وہ اپنے خاندان والوں سے، ماتا پتا سی پوچھ لے۔ منیش سے معلوم ہوا کہ خاندان میں کوئی نہیں۔ صرف ایک بوڑھی ماں ہے جو آج چودہ برس سے کاشی، پوری اور ہردوار میں سارا وقت بسر کرتی ہے۔ وہ دُنیا چھوڑ چکی ہے۔ نہ اُسے رشتے ناتوں کی فکر اور نہ ذات پات کی۔ وہ بھگتن ہے، سنیاسن اور جوگن ہے۔ پھر بھی اِندرا مچلی ہی رہی کہ جیسے بھی ہو اُن سے پوچھ لیا جائے۔

اتفاق کی بات کہ منیش کی ماتا ہردوار کمبھ کے میلے جاتے ہوئے ادھر سے گزر رہی تھیں۔ منیش نے بڑی خوشامد کر کے انھیں ایک رات کے لیے اپنے ہاں اُتار لیا تھا۔ آج اِندرا کو انھیں کے سلام کو اور انھیں سے آشیرواد لینے جانا تھا۔ منیش نے یقین دلایا تھا کہ اس کی ماں ذات پات کے بندھنوں سے بالاتر ہو چکی ہے۔ اسی لیے اِندرا خوش تھی۔ اندر ہی اندر اس کے دل میں پھول کھل رہے تھے۔ وہ آپ ہی آپ ایک لوری گنگنانے لگی اور پھر دفعتہً خیال کی کڑی کی انتہا کو محسوس کر کے چونکی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وہ اسی طرح ہنستی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔ برآمدے میں اسپتال کا چپراسی ہاتھ میں دواؤں کا بیگ لیے کھڑا تھا۔ منیش کا اصرار تھا، بڑی بی کا مکمل معائنہ کر کے کچھ ضروری دوائیں ساتھ دے دی جائیں۔ وہ چپراسی کے ساتھ برآمدے کے زینے سے اُتر ہی رہی تھی کہ اسپتال کا بہشتی منصور کانپتا ہوا آیا اور گڑگڑا کر بولا ''ہجور! ہجور! ہماری مہریا کو چل کر دیکھ لیجیے۔ ایسا جان پڑتا ہے دم توڑ رہی ہے!''

اِندرا سب کچھ بھول کر فوراً نوکروں کی کوٹھریوں کی طرف مڑ گئی۔ منصور کی بیوی ایک کھترے بسکھٹ پر بیہوش پڑی تھی۔ نہ سانس ٹھیک تھی نہ نبض۔ اُس نے منصور اور چپراسی کو ہٹا کر اس کا مکمل معائنہ کیا۔ چھ مہینے کا بچہ پیٹ ہی میں مر گیا تھا اور اب زہر جسم میں پھیل رہا تھا۔ بسکھٹ سمیت اسے اُٹھوا کر وہ آپریشن تھیٹر میں لائی اور فوراً آپریشن کی تدبیریں کرنے لگی۔ نرسوں میں سے صرف ایک رات کی ڈیوٹی پر تھی۔ اسی کی مدد سے اُس نے آپریشن کیا۔ مردہ بچہ کاٹ کر نکالا اور زچہ کے مسموم حصوں کو کاٹا، دھویا، صاف کیا۔ اس درمیان میں اُس کا جوڑا کھل گیا اور اس کے لمبے بال بار بار چہرے اور ہاتھوں پر پھیل کر اس کے کاموں میں حائل ہوئے۔

اُس نے نرس سے کہا ''انھیں پٹے نما کاٹ کر پھینک دو۔'' اُس نے ان جتاؤں کو کب کاٹا اس کو خبر تک نہ ہوئی۔ اسے نہ تو اپنے تن من کا ہوش تھا اور نہ یاد کہ اُس نے آج دوپہر سے مہیش کی ماں کا آشیرواد لینے کی خوشی میں کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ اسے اس کا بھی دھیان نہ تھا کہ اس کی بیش قیمت ساڑی میں کیسے کیسے بدنما دھبے لگ رہے ہیں اور نہ یہ کہ منیش کی ماں کا آشیرواد نہ پانے پر اسے اپنے ہی قول کے مطابق منیش سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ وہ منصور کی بیوی کی زندگی کے لیے کئی گھنٹے تک یم دیوتا سے لڑتی رہی۔ جب وہ مریضہ کو خطرے سے نکال کر وارڈ کے ایک کمرے میں آرام کی نیند سوتی ہوتی چھوڑ کر نکلی تو اسے پہلی بار اپنی حالت کا خیال آیا۔ حد درجہ تھک گئی تھی۔ کمزوری محسوس ہوئی۔ بھوک معلوم ہوئی۔ پھر منیش یاد آیا اور اس کی ماں۔ انھوں نے نہ جانے کیسی بری رائے اُس کے بارے میں قائم کی ہوگی۔ زندگی میں سوامی ملنے کی آس پہلی بار بندھی تھی۔ اور وہ جس پر دل قربان تھا، جس کی ہر بات پر جان چھڑکنے کو جی چاہتا تھا، وہ آس بھی ٹوٹ گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ وارڈ اور بنگلے سے چند ہی قدم کا فاصلہ تھا مگر اپنا گھر کوسوں دُور محسوس ہونے لگا۔

وہ ٹیڑھے ترچھے قدم رکھتی، لڑکھڑاتی کسی طرح اپنے سونے کے کمرے میں پہنچی، اُس نے اپنی قیمتی ساڑی اپنے جسم سے کھینچ کر فرش پر پھینک دی۔ ڈگمگاتی ہوئی بیسن کے پاس گئی۔ بڑی کوششوں سے اُس نے صابن لگا کر ہاتھ منہ دھویا اور وہ اسی طرح قیمتی بلاوز اور پیٹی کوٹ پہنے پلنگ پر گر پڑی۔ اس پر یاسیت کا دورہ پڑا۔ اس کو یقین ہو گیا، اُس نے آج رات منیش کے ہاں نہ جا کر اپنا سب کچھ کھو دیا۔ وہ تھوڑی دیر خشک سسکیاں لیتی رہی، پھر دفعتہً اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ نڈھال ہو کر سو گئی۔

صبح کو جب چڑیوں کے چہچہانے کی دھیمی سریلی آواز کانوں میں آ رہی تھی اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے گدگدا رہا ہے۔ اُس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا منیش بڑی بے تکلفی سے اس کی مسہری کی پٹّی پر بیٹھا اسے چادر اڑھا رہا ہے، اور اس کی انگلیاں شرارت بھی کرتی جا رہی ہیں۔ وہ ایک دوشیزہ کی فطری حیا کے ساتھ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور اُس نے سر سے پاؤں تک اپنے کو چادر سے ڈھنک لیا۔

وہ ذرا جھنجھلا کر بولی ''یہ آپ میرے کمرے میں کیوں گھس آئے؟''

منیش نے ہتھیلی پر ایک چمکتی انگوٹھی رکھ کر کہا ''ہم پہناتے ہیں!''

اُس نے ہکلا کر کہا ''مگر...... ماتا جی؟''

وہ ہنس کر بولا ''جب تم نہ آئیں تو ہم دونوں تمھیں ڈھونڈنے آ نکلے۔ اُسی وقت نرس تمھارے پیارے بال ایک ٹرے میں بھرے ہوئے پھینکنے لیے جا رہی تھی۔ ماتا جی نے ٹھٹک کر اس سے باتیں کیں، تمھارے بالوں پر بڑے پریم سے ہاتھ پھیرا۔ تمھیں جھانک کر آپریشن روم میں دیکھا۔ انھوں نے پلٹتے ہی مجھ سے کہا ''جو کسی انسان کی جان بچانے میں اپنا سب کچھ کھو دینے کے لیے تیار ہو، وہی سب سے اُونچی ذات کا ہے!''

اور اِندرا نے شرما کر مہیش کے سینے میں اپنا منہ چھپا لیا!

(مسودہ)

بُندوں کی جوڑی

انسپکٹر ''ٹم'' سے مجھ سے ملاقات کرکٹ فیلڈ اور کھیل کے میدانوں کی تھی، باوجود اس کے کہ وہ گرم ملک میں پیدا ہوئے تھے، اور انھوں نے یہاں کی پینتیس چھتیس گرمیاں کاٹی تھیں، مگر وہ اب بھی ضلع بھر میں سب سے تیز دَوڑ لیتے، سب سے زیادہ اُونچا پھاند لیتے اور ہاکی میں سب سے عمدہ سینٹر فارورڈ کھیل لیتے تھے، پولیس کے لائن انسپکٹر اور اینگلو انڈین ہوتے ہوئے بھی وہ بہت ہردلعزیز تھے۔ جب شہر میں کوئی میچ ہوتا تو انسپکٹر ٹم یا خود کھیلتے ہوتے یا ریفری کرتے۔ میلے ٹھیلوں میں بھی ٹہلتے دکھائی دیتے اور تیج تہواروں کے موقع پر بھی۔ آدمی ہنس مکھ، ملنسار تھے۔ پھر پرتاب گڑھ، چھوٹا سا ضلع، ہر گورنمنٹ ملازم یونہی ایک دوسرے سے واقف تھا۔ مجھ سے بھی انسپکٹر سے تعارف ہوا اور ضلع کی کرکٹ ٹیم میں میری شمولیت نے اچھی خاصی ملاقات کرادی۔

اسی لیے جب پرتاب گڑھ سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہوتے وقت اسٹیشن پر یہ معلوم ہوا کہ وہ بھی میرے ساتھ لکھنؤ چل رہے ہیں تو قدرے مسرّت ہوئی۔ یہ یقین تھا کہ سفر لطف سے کٹے گا۔ اسٹیشن پر پوائنیر اخبار بک رہا تھا، مَیں نے خرید لیا اور گاڑی میں سوار ہونے کے بعد مَیں نے جلدی جلدی سُرخیاں دیکھنا شروع کیں۔ اطالیہ وحبش کی آئندہ ہونے والی جنگ کے متعلق جو دولِ عظمٰی شطرنج کی چالیں چل رہے تھے اُن کا ذکر تھا، پھر پنجاب وبنگال کے ہنگامہ خیز سیلابوں کا اور ہٹلر کے یہودیوں اور کیتھلکوں کے خلاف نئے اقدامات کا، مَیں نے ان سب کو سرسری طور پر دیکھا۔ مجھے ان سب سے زیادہ انگلستان اور افریقہ کے پانچویں کرکٹ میچ اور دربھنگا ٹورنامنٹ میں موہن بگان اور محمڈن اسپورٹنگ کے مقابلے کی فکر تھی، مَیں ورق اُلٹ ہی

رہا تھا کہ دفعتاً میری نظر 'طلاق کی درخواست' کی سُرخی پر پڑی۔ مجھے عموماً مقدمات سے اور خاص طور سے طلاق کے مقدمات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ یہ اُن تعلقات کی رُسوائی ہے جو دو انسانوں کو دو شخصیتوں کو ایک بناتے ہیں۔ میری رائے میں جس قدر کہ شادی میں اعلان و اشتہار کی ضرورت ہے، اسی قدر ہی طلاق میں خاموشی اور اخفا کی۔ دو ذاتوں میں جو ارتباط و محبت، یکجہتی و خلوص کے تعلقات قائم کرنا چاہتی تھیں، نہیں نبھ سکی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کنارہ کشی اختیار کرلی، تراضی طرفین ختم، تعلق ختم، اِس میں جھگڑے ہنگامے، وکیل، بیرسٹر، جج اور قاضی کی کیا ضرورت؟

بہرنوع اس دن خلافِ معمول مَیں نے اس سُرخی کے نیچے جو کچھ لکھا تھا اس پر بھی نظر ڈالی۔ لکھا تھا:

''پرتاب گڑھ کے ہر دلعزیز لائن انسپکٹر مسٹر ڈبلو ایچ ٹم. نے عدالتِ عالیہ الہ آباد میں درخواست دی ہے کہ اُنھیں اپنی بیوی مسز ایم۔ ٹی۔ ٹم کو زنا کاری اور بدچلنی کے جرم میں طلاق دینے کی اجازت دی جائے۔''

مَیں نے گھبرا کر مسٹر ٹم کی طرف دیکھا، وہ سگریٹ پی رہے تھے اور پولیس کی شریر آنکھوں سے کمپارٹمنٹ کے دوسرے مسافروں کو دیکھ رہے تھے۔ ہمارے علاوہ صرف دو آدمی اور بیٹھے تھے، ان میں سے ایک صاحب 'برتھ' پر لیٹے ہوئے اخبار بینی میں مصروف تھے۔ دوسرے صاحب بیٹھے ہوئے سگریٹ پیتے جاتے تھے اور سیٹی بجاتے جاتے تھے۔ مَیں نے مسٹر ٹم کی طرف اخبار بڑھا کے کہا: ''آپ نے یہ خبر دیکھی ہے؟''

مسٹر ٹم نے میرے ہاتھ سے اخبار لے لیا، طلاق والی خبر پر نظر ڈالی۔ تھوڑی دیر خاموش سگریٹ پیتے رہے۔ اُن کا ہنس مکھ چہرہ اس وقت بالکل سُرخ تھا، اُن کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اُن کی کنپٹی کے پاس شکنیں پڑ گئی تھیں اور اُن کے نیچے کا پتلا ہونٹ اس طرح کانپ رہا تھا کہ اُن کے ہونٹوں میں دَبا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا خود بخود گر گیا۔ اُنھوں نے اس کی بھی پروانہ کی۔ وہ غالباً اپنی بیوی کو مختلف صورتوں میں دیکھ رہے تھے، منگیتر کی حیثیت سے، دُلہن کے لباس میں، بیوی کی ہیئت سے، مکّار عورت کے بھیس میں، ڈسنے والی ناگن کی وضع میں، جھوٹی عصمت تابی، جھوٹی شرم وحیا، جھوٹا پیار! مَیں نے دیکھا کہ اُن کے چہرے پر اُسی طرح کے

تکلیف کے آثار پیدا ہو گئے جو کسی ذبیحہ کے چہرے پر دم توڑتے وقت پائے جاتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

وہ ایک دفعہ میری طرف پلٹ کر بولے: ''مسٹر نسیم، میں نے یہ حتمی ارادہ کر لیا تھا کہ میں سوائے عدالت کے کہیں اس معاملے کے متعلق زبان نہ کھولوں گا۔ مگر چونکہ آپ سب سے پہلے آدمی میرے جاننے والوں میں ہیں، جو میری درخواست سے باخبر ہو گئے ہیں اور جس نے مجھ سے پوچھنے کی بھی زحمت اُٹھائی ہے اس لیے مَیں آپ سے بلا کم و کاست واقعات بیان کیے دیتا ہوں۔

انسپکٹر ٹم نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا، میری طرف بڑھا دیا، مَیں نے ایک سگریٹ نکال کے شکریہ ادا کیا۔ اُنھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر یونہی کھلا سگریٹ کیس ہاتھوں میں لیے رہے، پھر اسے بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ نہ خود سگریٹ نکالی اور نہ مجھے دِیا سلائی دی۔ مَیں نے جیب سے دِیا سلائی نکالی اور سگریٹ جلائی۔ جب سگریٹ کی مہک اُن کے نتھنوں میں پہنچی تو وہ چونکے، اُنھوں نے کہا ''معاف کیجیے گا۔'' پھر سگریٹ کیس نکال کے اس میں سے سگریٹ لی، جلائی اور اسے ہونٹوں میں دَبا کے بولے۔

مَیں آپ سے عرض نہیں کر سکتا کہ یہ عورت کتنی حسین، کتنی خوبصورت ہے، اور بظاہر کتنی بھولی ہے۔ آپ اگر اس کے حالات سے واقف نہ ہوں تو صورت دیکھ کے کبھی یہ خیال ہی نہیں کر سکتے کہ اِس حسن کی دیوی، اس مجسم معصومیت کے دل و دماغ میں بھی کوئی بُری بات آ سکتی ہے، آنکھیں بڑی بڑی، کشادہ پیشانی، گول چہرہ، پتلے ہونٹ، ہاتھ کی اُنگلیاں پتلی، سڈول، اللہ! اللہ! مَیں نے کتنی مرتبہ اُن اُنگلیوں کا پیار لیا ہے! اور سگریٹ فرش پر گرا کر اسے جوتوں سے مسل کر بولے... پاؤں چھوٹے چھوٹے! بلا کی جامہ زیب!

انسپکٹر ٹم ایک بار دانت پیس کر بولے۔ ''مَیں نے پہلے پہل اسے کلکتہ میں دیکھا، بڑے دن کی تعطیل میں حضور وائسرائے کی آمد کے سلسلے میں جہاں صوبے سے پولیس کے خاص خاص لوگ گئے تھے، مَیں بھی بھیجا گیا تھا، وائسرائے کپ کا دن تھا، بڑے بڑے راجگان، مہاراجگان، رانیاں، مہارانیاں، شہزادیاں، شہزادے، شریف زادے، شریف زادیاں، غرضیکہ ہر طرح کے لوگ چھوٹے بڑے، مرد عورت، سب ہی گھوڑ دوڑ کے میدان میں موجود تھے۔ مَیں

اسٹیڈیم کے باہر کھڑا ہر آنے جانے والے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ یہ اپنی بوڑھی ماں کو سہارا دیے ادھر سے گزرتی دکھائی دی۔ دفعتاً بڑی بی کو چکّر آیا، اُس دن ساری پونجی ہار گئی تھیں، دل و دماغ قابو میں نہ تھا، چنانچہ چلتے چلتے لڑکھڑائیں اور وہیں گر پڑیں، میری نظر اس پھول سے چہرے پر نچھاور ہو رہی تھی، مَیں نے جو یہ حادثہ دیکھا تو جلدی سے دَوڑ کے بڑی بی کو اُٹھایا۔ وہ آدھی سے زیادہ بیہوش تھیں، اِدھر اُدھر نظر کی۔ قریب ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی، اس میں لے جا کے ڈال دیا۔ مارگریٹ نے مجھے آبدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ مَیں نے اس سے گھر کا پتہ پوچھا، اور ٹیکسی والے سے وہاں تک کا کرایہ دریافت کر کے اس کے دام دے دیے اور تاکید کر دی کہ وہ انھیں بخیریت گھر پہنچا آئے۔ اور اپنی ڈائری میں ان کا پتہ اور ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر لیا۔

غرض یہاں سے میرے عشق اور مارگریٹ کی احسان مندی کی ابتدا ہوئی، مَیں ہزاکسلنسی کے قیام کے سلسلے میں کوئی دس دن وہاں رہا اور اس درمیان میں ہمارے تعلقات محسن و احسان مند سے بڑھ کر عاشق و معشوق کے سے ہو گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ چلتے وقت مَیں نے اُس سے شادی کا وعدہ لیا اور الہ آباد میں رپورٹ دیتا ہوا پرتاب گڑھ واپس آیا۔

یہاں آنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ مارگریٹ کے بغیر زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ نہ کھیل کود میں جی بہلتا تھا اور نہ کام میں دل لگتا تھا، بس ہر لمحہ یہی آرزو کہ کسی طرح اُڑ کے اُس کے پاس پہنچ جاؤں۔ وہ بھی اپنے خطوں میں کچھ اسی طرح کے جذبات کا اظہار کرتی تھی۔ بالآخر کوئی مہینہ ہی بھر بعد مَیں نے تین مہینے کی چھٹی لی اور کلکتہ پہنچ گیا اور جلد سے جلد لائسنس حاصل کر کے رجسٹرار کے سامنے جا کر مارگریٹ کو بیاہ لایا۔

انسپکٹر ٹم نے کانپتے ہاتھوں سے پھر جیب سے سگریٹ کیس نکالا، مَیں نے جلدی سے دِیا سلائی جلا کر دی، اور وہ سگریٹ جلا کے لمبے لمبے کش لیتے رہے، پھر بولے۔

"مسٹر نسیم! میں آپ سے دو ڈھائی مہینے کی زندگی کی مسرت، خوشی، اور لذت کو بیان نہیں کر سکتا۔ مارگریٹ اُن عورتوں میں سے ہے، جو اگر مرد کو خوش کرنے پر آتی ہیں تو حورِ بہشتی بن جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مَیں ایک معمولی پولیس انسپکٹر نہیں ہوں بلکہ شاید دونوں جہان کا بادشاہ ہوں، مجھے نہ ماضی کی پروا تھی اور نہ مستقبل کا خیال، میں مارگریٹ میں مستغرق تھا، اور وہ ہر لمحہ گلے سے لپٹی رہی۔

ہم لوگوں نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ شادی کر کے ہم سیدھے، ہگلی چلیں گے، چنانچہ وہاں پہلے تین دن گزارے، پھر وہاں سے ہم گیا پہنچے، وہاں سے پٹنہ، پٹنہ سے بنارس، بنارس سے الہ آباد، الہ آباد سے آگرہ، وہاں سے میرٹھ، پھر کانپور، اور چھٹیوں کے ختم کے قریب لکھنؤ۔ ہر جگہ ہم اوسط درجے کے ہوٹلوں میں ٹھہرتے، شہر کے آثارِ قدیمہ اور مشہور چیزوں کو دیکھتے اور اپنے آئندہ مستقر کے لیے کوئی نہ کوئی سامان خریدتے۔

جب ہم لکھنؤ پہنچے تو مَیں نے محسوس کیا کہ میرا سرمایہ قریب ختم تھا، مَیں نے اِس لیے دل میں یہ طے کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو مارگریٹ کے لیے کوئی نہ کوئی زیور ضرور خریدنا چاہیے۔ مَیں اسی لیے ایک دن حضرت گنج اُسے وہاں زیورات کی دکان پر یہ کہہ کے لے گیا کہ مجھے ایک دوست کی بیوی کے لیے بُندوں کی جوڑی خریدنا ہے، ذرا تم چل کر پسند کر دو۔ وہ بہت خوش خوش مختلف قیمتوں کے بُندے دیکھتی رہی، اور اپنے ہی کان میں لگا کر آئینہ میں صورت دیکھتی اور سر ہلا کر رکھ دیتی۔ بالآخر اسے ایک پلاٹینم کا سادہ بُندہ مگر بہت ہی خوبصورت بنا ہوا پسند آیا۔ دام پوچھنے پر معلوم ہوا خاصا قیمتی ہے، مَیں نے نہایت ہی خاموشی سے دام دے دیے اور مارگریٹ کو ایک پندرہ روپے کی انگوٹھی دلوا کے دُکان سے چلا ہی تھا کہ دُکاندار نے روکا۔ میں نے پوچھا ”کیا ہے بھئی؟“

اُس نے مارگریٹ کی طرف چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ ”میں میم صاحب کو ایک اور چیز دکھادوں تو پھر آپ انھیں لے جائیں۔“

مَیں نے کہا: ”ہمیں اور کچھ نہیں خریدنا ہے۔“

وہ بولا: ”جی وہ جلدی میں خریدنے والی چیز بھی نہیں، آپ دیکھ تو لیں۔“ یہ کہتے کہتے اُس نے ایک مخملی ڈبیہ سیف میں سے نکال کر کھولی، معلوم ہوا جیسے آنکھوں میں بجلی کوند گئی، دیکھا تو بُندوں کی جوڑی تھی۔ بیچ میں ہیرا، دونوں سروں پر زمرد، اور یہ سب اس عمدہ طور پر کاٹے گئے تھے کہ وہ بلا کی چمک پیدا ہوگئی تھی کہ الاماں والحفیظ! مارگریٹ کی یہ حالت تھی کہ دیکھتے ہی بیتاب ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں وہ چمک پیدا ہوگئی، جو چوروں، ڈاکوؤں اور بخیلوں کی آنکھوں میں روپیوں کا ڈھیر دیکھ کر پیدا ہو جاتی ہے۔ دُکاندار اس کی یہ حالت دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا جاتا تھا۔ اس طرح مسکراتا تھا کہ مجھے بُرا معلوم ہونے لگا اور مَیں نے مارگریٹ کے

کاندھوں پر ہاتھ رکھ کے کہا 'آؤ چلیں' مگر اس نے نہایت ہی بے پروائی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور ان بُندوں کو کانپتے ہاتھوں سے کانوں میں پہن کر قد آدم آئینوں میں، جو دُکان میں چاروں طرف لگے تھے اپنے کو دیکھنے لگی۔ مجھے مارگریٹ کی بیتابی، اور جوہری کی مسکراہٹ اس قدر کھل رہی تھی کہ مَیں کہہ نہیں سکتا۔ مَیں نے بڑھتے ہوئے غصّے کو روکنے کے لیے اُس سے قیمت پوچھی۔ اُس نے کہا ''ڈیڑھ ہزار!''

مارگریٹ کے بڑھتے ہوئے جوش پر پانی پڑ گیا۔ اُس نے خاموشی سے بُندے اُتار کر ڈبّے میں رکھ دیے، اور گردن جھکا کر میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ مَیں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھ کو جتنی اس کی پچھلی بیتابی بُری معلوم ہوئی تھی، اس سے زیادہ اُس مایوسی پر تکلیف ہوئی۔ جی چاہتا تھا اپنے کو بیچ ڈالوں، مگر یہ بُندے خرید کر اس کے کانوں میں پہنا کر پھر ایک بار اسے خوش دیکھ لوں۔ مگر اقتصادیات کے آہنی پنجوں کی گرفت جذبات سے متاثر ہو کر کبھی ڈھیلی نہیں ہوتی، ہمیں بالآخر دُکان سے چلا ہی آنا پڑا۔

راستے بھر مارگریٹ ست رہی۔ مَیں نے مختلف طرح کی ہنسی مذاق کی باتیں کیں، اور وہ مجھے خوش کرنے کے لیے تھوڑا بہت ہنسی بھی، لیکن وہ پچھلی شگفتگی اور بیساختگی نہ پیدا ہوئی۔ شب کو کھانا کھانے کے پہلے میں نے اپنے ہاتھ سے خرید کردہ بُندے جب اُس کے کانوں مَیں پہنائے تو وہ بولی ''ایں، یہ تو دوست کی بیوی کے لیے تھے!''

جب مَیں نے کہا: ''ہاں لیکن مَیں ہی آپ اپنا دوست ہوں اور تم اُس دوست کی بیوی!'' تو وہ بیساختہ میرے گلے سے لپٹ گئی... لیکن شب کو جب میں بستر پر پہنچا تو مَیں نے دیکھا کہ وہ محوِخواب ہے مگر گالوں پر آنسوؤں کے قطرے ہیں! مَیں نے اُسے جگایا نہیں، مگر اُسی وقت قسم کھائی کہ خواہ کچھ بھی ہو، مَیں سال چھ مہینے میں کسی نہ کسی طرح اتنی رقم ضرور جمع کر لوں گا کہ اس کے لیے اس کے محبوب بُندے خریدوں!

ذرا آپ خیال فرمائیں کہ ایک شخص جو تین سو تنخواہ پاتا ہو اور تقریباً دو سو روپیہ ماہوار غیر شادی شدہ حالت میں خرچ کرتا رہا ہو، اُس کا شادی کے بعد خرچ کتنا بڑھ جائے گا؟ اور اُس کے لیے ڈیڑھ ہزار روپیہ بچالینا کس قدر دُشوار اَمر ہے؟ لیکن مَیں نے ہزاروں تکلیفیں برداشت کر کے اپنا سگریٹ، اپنی شراب، اور اپنی دیگر تفریحوں کو یک لخت ترک کر کے روپیہ جمع

کرنا شروع کیا اور اسی کے ساتھ تقریباً ہر مہینے لکھنؤ جا کر اُس دُکان پر اُن بُندوں کو دیکھ آتا۔ لیکن تین مہینے کی حد درجہ دماغی و جسمانی تکلیف کے بعد بہ مشکل ڈیڑھ سو روپیہ جمع ہوا، اور وہاں ضرورت تھی ڈیڑھ ہزار کی! اب کیا کیا جائے؟ مارگریٹ کے بُندے ہمیشہ تو رکھے نہ رہیں گے، جوہری کو کوئی نہ کوئی گاہک تو مل ہی جائے گا۔ اس لیے مَیں نے جو حرکت اتنے دِنوں نہ کی تھی وہ کر ڈالی۔ مَیں نے ابتدائے ملازمت سے اُس وقت تک کبھی ظلم نہیں کیا تھا، کبھی بے ایمانی نہیں کی تھی اور کبھی رشوت نہیں لی تھی! مارگریٹ کی خاطر مَیں نے ضمیر فروشی کی، مَیں نے ایک جھوٹے مقدمے میں ایک دولت مند آدمی کو پھنسا دیا اور اس سے پورے ڈیڑھ ہزار رشوت لی، مَیں آپ سے نہیں کہہ سکتا کہ مجھے یہ روپے جب تک میری جیب میں رہے کیونکر ڈس رہے تھے۔ مَیں نے یہ سب مارگریٹ کی خاطر انگیز کیا۔ اور وہیں گاؤں پر سے جہاں میں تفتیش کے سلسلے میں گیا ہوا تھا مَیں نے اپنی موٹر سائیکل بجائے پرتاپ گڑھ کے سیدھے لکھنؤ کے لیے ہانک دی۔ طے کر لیا تھا کہ مارگریٹ کے لیے آج ہی بُندے لے کر آؤں گا۔

مَیں لکھنؤ کوئی تین بجے پہنچا۔ معلوم ہوا کہ مالک دُکان کسی لیڈی کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ مَیں نے پوچھا منیجر کہاں ہیں، وہ میری صورت دیکھ کے کچھ گھبرا سا گیا۔ مَیں نے کچھ خیال نہیں کیا۔ اُسے جلدی سے بُندوں کی جوڑی کی شناخت بتائی، اُس نے سیف کھولا، سارے خانے دیکھ ڈالے، کہیں بُندں کا پتہ نہ تھا، اس نے اپنے ایک ماتحت کو بلایا، اُس سے دریافت کیا۔ اُس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے منیجر کے کان میں چپکے سے کچھ کہا۔ منیجر نے بہ مشکل ہنسی ضبط کی اور مجھ سے متانت سے کہا: ''انسپکٹر صاحب وہ بُندے تو بک گئے!''

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کس قدر مایوسی ہوئی۔ تین مہینے سے جس چیز کے لیے رات دن کوشش کی تھی، جس کی وجہ سے بے ایمانی کی، جھوٹ بولا، رشوت لی، جس کی وجہ سے اس وقت بلا اجازت افسر بالا لکھنؤ بھاگا ہوا آیا تھا، وہ بک گئی۔ اب مارگریٹ کو کیسے منہ دکھاؤں گا۔ اس کے محبوب بُندے میں اُس کو کہاں سے لا کر دوں گا۔ غرض یہی سوچتا نہایت ہی افسردہ پھر موٹر سائیکل پر بیٹھا اور قریب شام پرتاب گڑھ کے مفصلات میں پہنچا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ میں دن بھر کے تکان، سفر سے چور، خاک سے اٹا ہوا، افسردہ دل، مرجھایا ہوا تھا۔ جس چیز پر نگاہ

ڈالتا تھا میری طرح مضمحل معلوم ہوتی تھی۔ وہی سنہری کرنیں جو ہر ذرّے کو خوشی کے لمحوں میں کندنی چمک بخش دیتی تھیں اس وقت ہر شے کو زردرُو بنائے ہوئے تھیں، دنیا میری طرح خزاں دیدہ، الم انگیز، حسرت زا محسوس ہوتی تھی، کتّوں کے بھونکنے میں، غصہ اور چھیڑ کی جگہ درد کا پتہ چلتا تھا اور لونڈے جو سائیکل کو دیکھ کے تالیاں بجاتے تھے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ میرا تمسخر کر رہے ہیں کہ ''واہ رے ٹُم صاحب سارے جتن کیے، سارے پاپڑ بیلے اور میم صاحب کے کان بغیر بندوں ہی کے رہے!''

بہرنوع مَیں جب اسی طرح خاک آلودہ اپنے بنگلے پر پہنچا تو سامنے روش پر کرسیاں رکھی ہوئی دکھائی دیں، مارگریٹ کا پتہ نہ تھا، مَیں نے سمجھا اندر ہوگی، اردلی کو سائیکل دی، کھونٹی پر اپنی ٹوپی لٹکائی اور اندر چلا گیا۔ وہاں کپڑے بدلنے سے قبل مَیں نے سوچا، لاؤ روپیوں کو سیف میں بند کردوں۔ وہ سونے والے کمرے میں تھا، وہاں پہنچ کر اُنھیں بند کیا۔ جب پلٹنے لگا تو سنگار میز پر نظر پڑی جس پر مارگریٹ کی آرائش کا سامان رکھا رہتا تھا۔ دیکھا تو سب غائب ہے۔ اور اُن کی جگہ ایک خط رکھا ہے۔ حیرت سے آگے بڑھ کے اُسے اُٹھالیا۔ جلدی جلدی کھولا۔ وہ خط یہ تھا۔''

انسپکٹر ٹُم نے کوٹ کی جیب سے پاکٹ بک نکالی اور اس میں سے ایک خط وہ میری طرف بڑھا دیا، لکھا تھا:

''ڈیئر ٹُم، میں آج میل سے لکھنؤ جارہی ہوں، اب پھر واپس نہ آؤں گی۔ اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ گو میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن جواہرات سے تم سے بھی زیادہ! مارگریٹ۔''

مَیں نے خاموشی سے خط پڑھ کر انسپکٹر صاحب کی طرف بڑھا دیا، وہ اسے پاکٹ بک میں رکھ کر بولے۔ ''مَیں خط کا مطلب سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ اردلی نے آ کر خبر دی کہ صاحب سپرنڈنٹ باہر کھڑے ہیں... مَیں خط لیے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عادتاً سلام کر کے چپکا کھڑا ہوگیا۔ اُنھوں نے میری صورت دیکھی، خط دیکھا اور اپنے ساتھ موٹر میں بٹھالیا... اپنے بنگلے پر لے گئے اور اپنے سیف سے کچھ کاغذات نکالے اور میرے سامنے رکھ دیے۔ مَیں نے دیکھا تو کلکتہ پولیس کی مارگریٹ کے متعلق رپورٹ تھی۔ اُنھوں نے سارے خاندان کے حالات لکھ کر اس کے متعلق یہ لکھا تھا کہ ''یہ عورت بہت ہی کمسنی سے رنڈی کا پیشہ کرتی تھی اور اس

کی ماں ہمیشہ اس کی بھولی صورت سے فائدہ اُٹھا کرنا کردہ کار نوجوانوں کو تباہ کرتی تھی!''

مَیں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا مصمم ارادہ تھا کہ مَیں دنیا کو اس ناپاک ذات سے ہمیشہ کے لیے پاک کر دوں۔ مگر صاحب سپرنٹنڈنٹ بولے ''میاں ٹم، یہ رپورٹ مجھے اس وقت مل چکی تھی جبکہ تم اپنی بیوی کو یہاں لے کر بھی نہیں آئے تھے۔ مَیں جانتا تھا کہ یہ عورت تم کو دھوکا دے گی۔ خیر انسان کچھ کھو ہی کر ہی سیکھتا ہے۔ تم پولیس افسر ہو، تمھیں ہر طرح کا تجربہ ہونا ضروری تھا۔''

مَیں نے کہا: ''مَیں پولیس کی نوکری سے استعفیٰ دے دوں گا، مگر اس عورت کا خاتمہ کر دوں گا۔''

وہ کچھ بولے نہیں بلکہ اُنھوں نے مجھے ساتھ بٹھا کے شراب پینا شروع کی... اور مجھے اتنی پلا دی کہ میں وہیں مدہوش ہو کر گر پڑا... دوسرے دن سے لائن حاضر کر دیا گیا۔ اور آج تک اُسی ڈیوٹی پر ہوں!''

مَیں نے پوچھا: ''اور مارگریٹ؟''

وہ بولے: ''جی وہ کچھ دِنوں اپنے بُندے لینے اُس اینگلو انڈین جوہری کے ساتھ لکھنؤ میں رہیں۔ اب سنا ہے کہ پھر کلکتہ میں اپنا مادری پیشہ کر رہی ہیں!''

(کچھ ہنسی نہیں اور......۱۹۳۴ء)

بھوک

''کام ملا؟'' بوڑھی بھکارن نے دھوئیں سے کھانستے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! جمیندار کہنے لگا پہلے پورے مہینے کی آدھی مزدوری ہم لے لیں گے اور آدھی صاحب!'' جوان مزدور نے 'سی، سی' کرتے جواب دیا۔

''کون صاحب؟''

''وہی بڑا میٹ۔''

''پھر تم نے کیا نہیں کہا کہ تم مہینہ بھر کھاؤ گے کیا؟''

''اُس نے کہا، ہم کیا جانیں، کمانے آنا تھا تو گرہ گانٹھ میں کچھ رکھ کے آنا تھا!''

''تم نے کہا نہیں کہ اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو مزدوری ہی کرنے کیوں آتے؟''

''سب کچھ کہا، پر اُس نے ایک بات بھی نہ مانی۔ بہت گڑگڑانے پر اتنا کہا۔ ''اگر پہلے مہینے کی پوری مزدوری نہیں دے سکتے تو تین مہینے تک آدھے آدھے مہینے کی مزدوری دینا پڑے گی۔''

''کتنا ملتا ہے روزانہ؟''

''یہی چھ آنے۔''

بھکارن دل ہی دل میں کچھ حساب جوڑنے لگی، پھر بولی۔ ''تو تم مزدوروں سے تو ہم بھکاری ہی اچھے، جو دس بارہ آنے روز کما لیتے ہیں۔''

''ہاں، ہاں!'' مزدور نے بھکارن کی آگ پر ہاتھ سینکتے ہوئے گردن جھکا کر کہا۔

بھکارن نے دو روپیہ کرایہ پر کوٹھری لے رکھی تھی۔ کچی دیواریں، کچا فرش، شکستہ چھت، آٹھ فٹ چوڑی، بارہ فٹ لمبی، اسی میں اس کا وہ بوریا تھا جو پلنگ کی جگہ کام دیتا تھا اور وہ گوڈر

جسے وہ لحاف کی طرح اوڑھتی تھی۔ اسی میں ایک طرف چار گے رکھ کر اس نے ایک چولھا بھی بنا رکھا تھا، جس کے قریب ایک توا تھا، ایک مٹی کا گھڑا اور ایک تاملیٹ۔

بھکارن کا سن کچھ ایسا زیادہ نہ تھا، یہی چالیس پینتالیس برس کی رہی ہوگی، مگر اُس کے چہرے پر جھریاں پڑی تھیں۔ اِس کی آنکھوں میں کیچڑ بھری تھی، اور اس کی ناک بیچ سے دھنسی ہوئی تھی۔ اس کے بالوں اور اس کے کپڑوں پر جوئیں رینگتی پھرتی تھیں۔ وہ ہر وقت میل سے بھرے، جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے ناخونوں سے یا تو سر کھجاتی، یا بدن کو نوچتی رہتی تھی۔

مزدور ایک دیہاتی نوجوان تھا، سترہ اٹھارہ برس کا سن، گندمی رنگ، مضبوط ہاتھ پاؤں، کانپور گنگا اشنان کے سلسلے میں آیا تھا۔ یہاں کسی نے اس کی جیب کاٹ لی اور وہ پورے دو دن سیوا سمتی کے دفتر اور کوتوالی کا چکّر لگاتا رہا۔ پھر جب اپنے پیسوں کے ملنے کی طرف سے مایوس ہوا اور بھوک نے بہت ستایا تو کام ڈھونڈھنے لگا۔ سمجھتا تھا بڑا شہر ہے، بیسیوں ملیں اور کارخانے ہیں، کہیں نہ کہیں پاؤں ٹکانے کی جگہ مل ہی جائے گی۔ مگر ہر جگہ ٹھیکیداروں اور جمعداروں کا دَور دَورہ تھا۔ کام سے پہلے ان کے حق کی گفتگو چھڑ جاتی اور ہر جگہ سے وہ ٹکا سا جواب پا کر مایوس پھرتا۔ تین دن اسی طرح کام کی تلاش میں گزر چکے تھے، اتنے زمانے میں صرف دو مرتبہ ایک ایک آنے کی مزدوری پریڈ کے بازار کے سلسلے میں بوجھ ڈھونے کی مل گئی تھی۔ اس رقم نے دو دن کے چنوں کا ٹھکانا کر دیا تھا، لیکن کل دن بھر اس نے بالکل فاقہ ہی کیا اور شام کو وہ بھوک اور تھکن سے مجبور ہو کر اس بھکارن کی کوٹھری کے سامنے والے چبوترے پر گر پڑا تھا۔ گو سردی تھی، دسمبر کا زمانہ تھا۔ مگر جوانی کی حرارت نے اسے فالج سے بچا لیا تھا۔ بلکہ وہ شب میں اسی طرح اپنے پھٹے کُرتے میں پتھر کے فرش پر تھوڑا بہت سو بھی لیا تھا۔ صبح ہوتے ہی بھکارن اُسے جگا کر اپنی کوٹھری میں لے گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی آگ سلگائی تھی اور مزدور نے اس پر ہاتھ پاؤں سینکے تھے۔ پھر بھکارن نے اسے تھوڑے سے چنے دیے تھے اور وہ انہیں کھا کر بھکارن کی ہدایت کے مطابق اس فیکٹری کے پھاٹک پر سارا دن کھڑا رہا تھا جہاں کے لیے مشہور تھا کہ وہاں مزدوروں کی بڑی مانگ ہے۔ اس وقت وہ وہیں سے ناکامیاب پلٹا تھا۔

"پھر اب کیا کرو گے؟" بھکارن نے پوچھا۔

"کل اسی شرط پر کام کرنا شروع کر دوں گا، تین مہینے تک تین ہی آنے روز سہی!"

"پر رہو گے کہاں؟"

مزدور نے گھبرا کر باہر دیکھا۔ آج دفعتاً دو پہر ہی سے اَبر گھر آیا تھا۔ بار بار بجلی چمکتی تھی، بار بار رعد گرجتا تھا۔ اس وقت ایسی ایک کڑک ہوئی۔ کوٹھری کی بوسیدہ چھت سے تھوڑی سی مٹی نیچے آتی رہی۔ پھر ساتھ ہی بوندیں ٹپ ٹپ گرنا شروع ہوئیں۔ پھر بجلی چمکی، پھر زور کی کڑک ہوئی اور اولے پڑنے لگے۔ ہَوا کے ایک تیز جھونکے نے ان کے دس پانچ دانے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے اس کال کوٹھری میں بکھیر دیے۔ بکھارن نے اُنھیں جھک کر اُٹھالیا اور 'سوسو' کر کے اُنھیں کھایا اور کواڑ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''اب کہاں جاؤ گے، یہیں رہو!''

مزدور نے گھبرا کر کہا۔ ''یہاں کیسے رہوں گا۔ ماں!'' اور اس نے بھکارن کو متعجب نگاہوں سے دیکھا۔

بھکارن کے چہرے کی جھریاں قریب قریب مٹ گئیں، اس کی دھنسی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اس نے مزدور کو ایک شکاری کی آنکھوں سے دیکھا، پھر وہ ہنس کر بولی۔ ''ماں کے جنے! میں کچھ ایسی بوڑھی بھی نہیں ہوں!''

(کچھ ہنسی نہیں اور......۱۹۴۰ء)

بہو کی ہنسی

لالہ ہنس راج رام نگر کے اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگوں میں سے تھے۔ گاؤں گراؤں، نوکر، آدمی، پرجا، سب کچھ بھگوان کا دیا موجود تھا۔ خود چار ہل کی کھیتی کرتے تھے۔ گھر پر دودھ گائیں متعدد بھینسیں پال رکھی تھیں۔ سواری کے لیے گھوڑا بھی تھا اور شادی بیاہ میں جانے کے لیے فینس بھی۔ جوان بیٹا مل راج اتنا نیک تھا کہ باوجود ایف۔ اے تک پڑھنے کے محض ان کی خوشی کے لیے پڑھنا لکھنا چھوڑ بڑھاپے کا سہارا بنا اور کھیتی اور زمینداری میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ لالہ جی بھی جھٹ پٹ بہو ڈھونڈھ لائے اور گو ابھی گنیا تیرہ ہی برس کی تھی، لیکن پرانی ریت رسم کی پابندی میں گوانا بھی کرا لائے۔ کہتے گھر خالی گلدان کی طرح سونا تھا، اب جا کر 'شوبھ' دیتا ہے!

ابھی سال بھر بھی نہ ہوا تھا کہ للائن کو پوتا ہونے کے لیے تیرتھ یاترا کی ترغیب دینے لگے۔ اور خود دیوی دیوتاؤں کو پرشاد چڑھانے لگے۔ تمنا تھی کہ کسی طرح ایک پوتا ہو جائے۔ لیکن شیو جی کسی سوچ میں تھے، انھوں نے جو کچھ لالہ جی کا دل دبی زبان کہہ رہا تھا نہ سنا۔ لالہ جی کی یہ حالت کہ خواہش و تمنا بڑھتی ہی جاتی ہے۔ بیوی سے شکایت کرنے لگتے ہیں۔ ''بھگوان کے نہ تو کان ہیں اور نہ آنکھ۔ وہ نہ سنتا ہے اور نہ اُسے دکھائی دیتا ہے!''

وہ اس مادرانہ لب ولہجہ میں، جو چالیس سے اوپر والی بیویوں کا دستور ہے، ڈانٹتیں۔ ''تم بھی اب سٹھیا ہو گئے ہو۔ ابھی ملو اور بہو دونوں بالک ہیں۔ دودھ کے دانت نہیں ٹوٹے۔ تم چاہتے ہو ہتھیلی پر سرسوں جمے۔ ابھی کے دن گونے کو ہوئے اور اس طرح کی اوّل فول تم پر ماتما کے بارے میں بکنے لگے!''

لالہ جی ایسے وقت غصّہ ہو کر نیچے کی منہ سے لگی ہوئی، نے کھڑی کر دیتے اور ذرا بلند

آواز میں بولتے تھے: ''تو آج سے آٹھ برس بعد کوئی بالک ہوا بھی تو ہمارے کس کام کا؟ یگ دیوتا ہیں کہ تاک لگائے بیٹھے ہیں! جب ہم نہ ہوئے تو پھر کیا مزا؟ وہ کسے 'بابو!' پکارے گا؟ ملو اور بہو تو اسے ہماری طرح پال چکے!'' پھر باہر اُٹھ کر چلے جاتے اور کسی نہ کسی آدمی پر کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ کر اس طرح برس پڑتے گویا دل کی ہانڈی میں بخارات بھرے تھے۔ کسی نہج ڈھکنا بھاپ نکلنے کے لیے اُٹھنا ہی چاہیے تھا یا یہ کہ جتنے نوکر چاکر تھے سب کے سب سازش کر کے اُن کے پوتے کو ان کی گود تک پہنچنے سے روکے ہوئے تھے۔

پھر چھڑی اُٹھا کر گاؤں میں گھومنے نکل جاتے۔ وہاں بازار سے بہو کے لیے تھوڑا سا سیندور، کچھ سُرمہ، ایک کپی میں سر کا تیل، کاٹھ کی دو تین کنگھیاں اور ٹکلیوں سے بھری ایک ڈبیا خرید لاتے تھے اور یہ سب نذر اس طرح خاموشی سے گزاری جاتی تھی گویا خوشامد ہو رہی ہے کہ اب آس نہ ٹوٹے اور پوتا کھلانے کو کس طرح مل ہی جائے! وہ لجا کر پرنام کرنے کو پاؤں کی طرف جھکتی اور تحفوں کے ساتھ ان کا اشیرباد لیتی۔ گھونگھٹ نکالے بدن چرائے ساری چیزیں اپنی بانس والی پٹاری میں لے جا کر رکھ دیتی تھی۔

مل راج جب کھیت کھلیان سے واپس آتا اور شب کی تنہائیوں میں میاں بیوی گھر بھر کے سو جانے کے بعد اکٹھا ہوتے تو گھنٹوں 'بابو جی' کے تحائف دکھائے جاتے اور دونوں ان کے دل میں چھپے ہوئے ارمان پر خوب ہنستے اور ایک دوسرے پر فقرے کستے۔ لیکن اپنے دل میں بھی وہی شوق لیے ہوئے سو رہتے!

ٹھیک اسی زمانے میں جبکہ سرسوں کے کھیت پھولے ہوئے تھے، اَرہر گئی ہوئی تھی اور ''اوکھ پیری جارہی تھی'' اوما دیوی نے شیو جی کو بوڑھے لالہ کی حالت کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے ان کے نہال امید پر دنیا بنانے والی اپنی ایک پھونک ماری۔ لالہ جی کی تمنا بر آئی۔ گھر میں بہار آئی۔ بہو کے پیٹ میں بچہ رہا اور تمام وہ مدارج جلدی جلدی طے ہونے لگے جو دیکھنے والوں کے لیے خواہ کتنے ہی خوش کن ہوں مگر برداشت کرنے والی کے لیے یقینی تباہ کن ہوتے ہیں۔

لالہ جی تو زچہ خانے کے اہتمامات میں خوش خوش مشغول ہو گئے لیکن بہو کے دم پر آ بنی۔ چودہ برس کی لڑکی، نہ پیٹ بھر کھایا، نہ جی بھر سویا جاتا تھا۔ اٹھتی تھی تو چکر آتا تھا۔ بیٹھتی تھی

تو درد ہوتا تھا۔ لیٹتی تھی تو کروٹ نہیں لے سکتی تھی۔ نہ چہرے پر وہ آب وتاب رہی اور نہ آنکھوں میں دلکشی۔ خیر کسی طرح کراہ کراہ کے وہ زمانہ بھی گزر ہی گیا اور لالہ جی کی تمنّا پوری ہوگئی۔ لیکن ہندوستانی آب وہوا اور صدیوں کی نسلی کمزوریاں رنگ لائیں اور کمسن ماں زندگی بھر کے لیے ایک زندہ ڈھانچہ بن کر رہ گئی۔ گاؤں کے ویدجی نے لاکھ لاکھ جتن کیے لیکن ان کے سب 'بھسم' بیکار ثابت ہوئے اور بہو ایک نیم مردہ سی چیز ہی رہی!

لالہ جی غریب کے یہ نہ سمجھ میں آتا تھا کہ وہ اپنے ارمانوں کے بر آنے کی خوشی کریں یا اس بگڑے ہوئے نقشے کا افسوس۔ ان کی حالت بالکل اُس بچے کی تھی، جو لالچ کی وجہ سے حصہ ملنے سے پہلے برفی کی ڈلی ہانڈی سے اُچک لے لیکن جلدی میں پوری ہانڈی ہی گرادے! وہ کبھی اس لعل سے بچے کو دیکھتے جو اُن کے گھر کا اُجالا بنا تھا، اور کبھی اس نیم مردہ بہو کر جو بہار کو خزاں بنائے دیتی تھی! پھر بھی بہو لڑکے اور پوتے ہی کے لیے پیاری ہوتی ہے۔ یہ دونوں تو اچھے تھے، خوش تھے، کھیلتے کھاتے تھے۔ بہو کی صورت بگڑی بلا سے! اُن کا دُکھ تو بسرا، اس کی جان ہی پر کیوں نہ بن جائے یہ بھی خوش تھے اور اب جو ہاٹ بازار سے گھومتے گھماتے آتے تو سُرمہ اور مسی نہ لاتے بلکہ جھنجھنے لاتے، بانسری لاتے اور کھلونے لاتے، اب انھیں سیندور اور کنگھی سے کیا غرض؟ وہ سب چیزیں بھی تو اسی دن کے لیے تھیں!

لیکن بہو تو اپنی حالت پر ضرور ہی غور کرتی۔ اپنی چمکتی دمکتی صورت کی جگہ پچکے ہوئے گال دیکھتی اور آہ کر کے دل تھام لیتی تھی پھر دیکھتی وہ مدن ہی پر جھکا پڑتا تھا، لالہ جی تھے تو، للائن تھیں تو۔ اور تو اور، خود پتی بھی! بس اب بہو اسی وقت یاد آتی تھی جب راج دُلارے مدن کو دودھ پلانا ہوتا تھا۔ جیسے گھر میں گائیں اور بھینسیں پلی تھیں ایک یہ بھی تھی، جب وقت آیا، مدن رویا، یہ بھی دوہ لی گئی!

طبیعت کی کبیدگی نے مزاج میں چڑچڑاپن اور بات بات پر غصہ بھی بڑھا دیا۔ اُٹھتے بیٹھتے ساس سسر کو طعنے تھے، یا مل راج سے تُو تُو مَیں مَیں۔ غذا سے بے پروائی کپڑوں سے نفرت۔ اگر کسی وقت دو چار نوالے چاول کے کھالیے تو دن رات کے لیے کافی ہیں۔ ایک ساری جو ہفتہ بھر پہلے پہن لی تو اُترنے ہی نہیں آتی۔ میلی چکٹ ہوگئی۔ جسم سے بو آنے لگی۔ لیکن کیوں بدلے کس کے لیے؟ صورت آئینے میں دیکھ سکتی تھی۔ 'اُن کی' نظر بدل چکی تھی۔

ظاہر بظاہر اب بھی ہنس بول لیتے تھے۔ لیکن کیا وہ بدلی ہوئی نگاہیں نہ پہچانتی تھی؟ اس نے انہی نینوں کو کسی وقت خوشی سے چمکتے ہوئے، کسی وقت استعجاب سے پھیلتے ہوئے اور تنہائیوں میں اکثر سُرخ ہوتے دیکھا تھا۔ اب وہی دیدے تھے کہ اس کے سامنے ہر وقت صاف صاف دُھلے ہوئے کٹوروں کی طرح رکھے رہتے تھے۔ ہاں اگر ان میں کبھی کوئی کیفیت پیدا بھی ہوتی تھی تو وہ تاریکی اور سیاہی، غصہ اور نفرت کی ہوتی۔ ان میں اب پچھلے پریم کے لگاوٹ کے انداز کہاں؟

اسی کو سوچتی، اس میں گھلتی، اسی اپنے کو کوستی کاٹتی اور موقع موقع سے ساس کی آنکھ بچا کر جس طرح مدن کو پیار کرتی اسی طرح مارتی بھی تھی۔ غصہ اس کا تھا کہ پیدا بھی ہوا تو اسے اَدھ موا کر کے۔ سمجھی تھی جگر پارہ ہوگا لیکن وہ تو سانپ کا بچہ نکلا۔ ماں ہی کو چوٹ دے گیا!

مدن پانچ برس کا ہو چکا تھا۔ لالہ جی کی خواہش تھی کوئی کام کیا جائے اس لیے اتنی کمسنی ہی میں جینو کی رسم کی سُوجھی۔ دن تاریخ رکھ کر ساری برادری کو بلاوا بھیجا۔ ایک ایک کر کے لوگ آنے لگے۔ لالہ سیتارام، لالہ جی کے بھائی بھی، اپنی بیٹی منورما سمیت آئے۔ پندرہ برس کی جوان کنیا، اسی سال مڈل کا امتحان پاس کیا تھا۔ بڑی شوخ چنچل اور سندر تھی۔ چندرما کی طرح چمکتا ہوا چہرہ، ان میں سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، بالکل اس طرح جیسے کنول میں بھونرا۔ چندن کی کلائیاں اور ہاتھ پاؤں، نازک، پتلی کمر جیسے پھول کے نیچے کی ٹہنی۔ ٹانگیں کیلے کے تنے کی سی سڈول اور خوشنما۔ ان سب پر آفت سیاہ گھنے بڑے بڑے بال، کمر سے نیچے تک چوٹی ویسی ہی لٹکتی تھی جیسے چندن کی شاخ میں ناگن! پھر اداؤں میں پھاگن کی مدہوشی اور چیت کی جگر سوزی بھی۔ مگھ بدلیا بھی تھی اور ساون کی گھٹائیں بھی غرض عورت کیا تھی ایک کسی ہوئی تلوار تھی جو دِلوں کا خون اس صفائی سے چاٹ لیتی کہ آنکھ نہ جھپکے اور کام تمام ہو۔

مل راج اور اس کی بیوی سے ملنے کی تمنا دل میں لیے نہ معلوم کب سے بیٹھی تھی۔ لاہور اور بارہ بنکی کا فاصلہ تھوڑا نہ تھا۔ جہاں باپ نوکر تھا وہیں پیدا ہوئی، وہیں پلی بڑھی، پڑھی۔ ماں کے مرنے پر گھر کا کام کاج بھی سنبھالنا پڑا۔ عزیزوں سے، اپنوں سے کیسے ملاقات ہوتی۔ مدن کے جنیوں میں بلاوے کا جو خط پہنچا تو مچل کر لالہ سیتارام کو راضی کیا اور چچا، چچی، بھائی بھاوج سے ملنے آئی۔ راہ بھر یہی سوچتی آئی بھاوج کو یوں تنگ کروں گی، یوں چھیڑوں گی، اس طرح

بناؤں گی۔ یہاں جو پہنچی تو صورت دیکھتے ہی دل پھیکا پڑ گیا۔ پانچ برس کی بیمار، نہ چہرے پر رونق، نہ آنکھوں میں چمک، نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور نہ زبان پر کوئی خوشی کی بات۔ پھر بھی چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ انھوں نے جھڑک دیا۔ وہ غصہ سے بل کھا کر رہ گئی لیکن دل میں میل آ گیا۔ ادھر مل راج سے جو ملی تو صاف دل، سیدھا سادھا، ہنس مکھ جوان۔ خواہ مخواہ ہمدردی شروع ہوئی اور دو روز میں بھاوج سے چشمک بھی۔ اور خفیہ خفیہ یہ کوشش کہ بھاوج سے زیادہ میری باتوں میں انھیں مزہ آئے۔ میرے ہی پاس زیادہ اٹھیں بیٹھیں۔ بھاوج جلیں، اور خوب جلیں، میری جوتی سے۔ ڈائن سی صورت، اس پر یہ دماغ کہ سیدھے منہ بات نہیں! تب تو سمجھو کہ میں بھیا کا دل ان سے پھیر دوں!

لیکن اس دل کے پھیرنے میں کچھ زیادہ کاوش کی ضرورت نہ تھی۔ وہ پہلے ہی سے پھرا پڑا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ دونوں کو فطرت کے اس اصول کا خیال نہ رہا کہ جوان عورت و مرد کا ایک دوسرے کے پاس بیٹھنا درانحالیکہ ایک ہمدردی کا جویا ہو اور دوسرا مرہم رکھنے کے لیے تیار بالکل ویسا ہی جیسے آگ کے قریب ہی سوکھی لکڑی کا ڈھیر کرنا۔ منورما اور مل راج دونوں کے ہاں آہستہ آہستہ آگ سلگنے لگی۔ اس طرح نہیں کہ محسوس ہو، بلکہ اس طرح کی آہستگی سے کہ سوائے بہو کی حاسد آنکھوں کے خود ان کے دل بھی نہ پہچان سکے! اور سچ تو یہ ہے کہ منورما نے کوئی صورت اپنی قدر بڑھانے اور مل راج کے دل میں جگہ کرنے کی اُٹھا بھی نہ رکھی۔ اس نے پندرہ دن کے اندر مل راج کے لیے کئی تکیوں کے غلاف اچھے سے اچھے ڈیزائن کے بنا ڈالے۔ کئی بار اپنی کنول سے ہاتھوں سے اچھے اچھے بھوجن پکا کر کھلائے۔ طرح طرح کے حلوے، چٹنی، مربّے بنا ڈالے اور لالہ جی اور للائن کی کچھ اس طرح خدمت کی کہ ان کی زبان پر بھی منورما کا لفظ اسی طرح پیار سے آنے لگا جیسے مدن کا آتا تھا۔ جب دیکھئے میاں بیوی بیٹھے ہوئے اس کی تعریفیں کر رہے ہیں اور اس گھر میں رہنے والی دوسری جوان عورت سے اس کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ جب اس طرح کے سوکھے درختوں میں محبت کی نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں تو مل راج کے تو ابھی بہار کے دن تھے۔ اس کے دل میں ایک سے نفرت اور دوسرے سے محبت کیوں نہ بڑھے؟ بڑھی اور خوب بڑھی کہ مل راج باوجود اپنی نیکی، سیدھے پن اور دیہاتی پن کے اس آگ کو محسوس کرنے لگا۔

لیکن قبل اس کے کہ وہ کسی قسم کا کوئی فیصلہ کر سکے لالہ سیتارام نے واپس جانے کی تیاری شروع کر دی۔ مل راج نے دَبی زبان ماں سے انھیں روکنے کے لیے کہا۔ للائن نے جب دیور سے یہ پیغام کہا تو انھوں نے نوکری کا عذر پیش کیا۔ بڑی ردوکد رہی بالآخر اس پر فیصلہ ہوا کہ وہ تو چلے جائیں مگر منورما، ایک مہینہ اور یہیں رہے۔ پھر سیتارام آ کر لے جائیں گے۔ سب سے دوبارہ ملاقات بھی ہو جائے گی اور چہیتی بھتیجی تھوڑے دنوں اور کلیجے سے لگی بیٹھی رہے گی۔

ان بوڑھیوں میں سے بھلا کون جانتا تھا کہ یہ اپنے گھر میں آگ لگانے کے سامان ہیں اور بھڑکتے ہوئے شعلوں پر تیل چھڑکنا ہے؟ مدن خوش تھا، مل راج خوش تھا، منورما خوش تھی، خود وہ دونوں خوش تھے۔ رہی بہو، اگر اس کی تیوریاں چڑھی تھیں تو یہ کون سی نئی بات تھی۔ وہ تو ہمیشہ کی ایسی ہی ہے۔ ''رسی جل گئی! اینٹھن نہ گئی۔'' کوئی کیا کرے! کوئی ڈائن کو دیوی تھوڑے بنا سکتا ہے!

ایک دن صبح سویرے منورما، مل راج سے پوچھنے آئی کہ ''آج کیا بھوجن کیجیے گا۔ آپ کے لیے کون سی چیز پکا دوں؟'' مل راج تو یہ کہہ کر کہ ''تم نے یہ اپنے سر کیوں خواہ مخواہ کا جھگڑا لیا ہے؟'' کچھ خوش خوش سوچنے لگے۔ مگر بہو نے پیچ و تاب کھا کر کہا، ''میری سوکن بننے کا ارمان ہے اور کیوں؟''

منورما کا چہرہ بالکل بیر بہوٹی کی رنگ کا ہو گیا۔ چپکی اٹھی اور چولھے کے پاس جا کر بیٹھ رہی، مگر مل راج بے حد خفا ہوا۔ غصہ اس کا تھا کہ جس زخم کے اندمال کے لیے نہ معلوم کن کن وقتوں سے دل ہی دل میں مرہم تیار ہو رہے تھے آج اس عورت نے تیز ناخنوں سے اسے بُری طرح کرید دیا۔ انگور کے ٹانکے ٹوٹ گئے، ناسوری تکلیف پیدا ہو گئی۔ بالکل چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح پلٹ پڑا اور جو کچھ منہ میں آیا بیوی کو کہہ گیا۔

مگر وہ بھی کیا چپ رہنے والی تھی۔ ایک تو نسوانی فطرت، پھر اس پر پانچ برس کے طعن و تشنیع کی مشق چڑھی ہوئی تھی۔ چوٹ پر چوٹ دیتی گئی۔ اور جب یہ مردوں کی طرح اس کی قینچی کی سی چلتی ہوئی زبان کی تاب نہ لا سکے اور پاؤں ٹپکتے باہر چلے تو وہ بولی: ''بڑے تاؤ میں باہر جا رہے ہو، پر اتنا سنتے جاؤ کہ آج تو پریم ہی پریم ہے، اٹھتے بیٹھتے ملو بھیا کی رٹ ہے، بھوجن بھی ہے، حلوا بھی ہے، پان بھی ہے اور حقہ بھی لیکن یہ سب دو ہی دن کی باتیں ہیں۔ میں جب

جانوں جب بیاہ ہونے پر بھی یہی حالت رہے۔ اسی طرح چوکا ہو، اسی طرح تکیے کا غلاف سلے، اسی طرح رومال کاڑھے جائیں۔ اس وقت سب کچھ بھول جایئے گا۔ بس وہی یاد رہے گا جو مانگ میں سیندور بھرے گا اور راگنی کی بھنور گھومے گا!''

اس آخری وار کا مل راج کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بھاگا اور بے تحاشا بھاگا۔ ماں کسی کام کے لیے پکارتی رہی اس نے اعتنا نہ کی۔ باہر لالہ جی پوتے کے ساتھ کسی کھیل میں مشغول تھے۔ ان کی نظر بچا کر لمبے لمبے قدم رکھتا آبادی سے نکل گیا۔ دیہاتی زندگی فطرت و قدرت کے مناظر کو اپنوں سے زیادہ عزیز بنا دیتی ہے۔ لہلہاتے کھیتوں، جھومتے درختوں، چھلکتے تالابوں، اور بہتے ہوئے نالوں میں کیا نہیں؟ جوانی کی اُمنگیں بھی ہیں، معشوق کی مست خرامی بھی، مدھ بھرے کاسے بھی ہیں اور عاشق کا ہر وقت رسنے والا دلی ناسور بھی۔ ہاں صرف دیکھنے والی نظر چاہیے۔ سو وہ مل راج کے پاس موجود تھی!

وہ یہی دیکھتا، یہی سوچتا ایک مٹر کے کھیت کے کنارے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر مینڈھ کے قریب کی گھانس نوچتا رہا۔ پھر درختوں میں سے نرم نرم پتیاں توڑیں اور انھیں چبانا شروع کیا۔ بالکل نیم کی پتیوں کا مزا تھا! جلدی سے تھوک دیں۔ غور سے درختوں کو دیکھا کہ کہیں کیڑا تو نہیں لگا، یا ٹھنڈ تو نہیں مار گئی؟ کوئی خرابی نہ تھی۔ تھوڑی سی پتیاں دوسرے درختوں سے پھر توڑیں مگر جب کچلا تو وہ بھی 'گرچ' سی محسوس ہوئیں، تھوک دیں۔ اُٹھا اور اَرہر کے کھیت میں پہنچا۔ موٹی موٹی پھلیاں چن کر توڑیں۔ اُن سے دانے نکالے اور انھیں چبایا۔ وہی کڑواپن۔ بس طبیعت جھلا گئی۔ دو تین درخت نوچ کر پھینک دیئے جب تھوڑا سا نقصان کر چکا تو کچھ تسکین ہوئی اور آگے بڑھا۔ گنّے کٹ چکے تھے۔ پھر بھی ایک کھیت باقی رہ گیا تھا۔ گنا توڑا، پتیاں اور چھلکے علیحدہ کیے، گھٹنے پر رکھ کر اسے دو ٹکڑے کیا۔ جڑ کی طرف والا حصہ دانت سے ایک پور تک چھیلا، پھر اسے کاٹ کر کھایا۔ بالکل اتنا ہی کڑوا معلوم ہوا جتنا چریتے کا رس۔ کلی کر دی۔ گنّے کو گھما کر دُور پھینکا اور وہیں مینڈھ پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دماغ میں ایک مشین سی چل رہی تھی۔ بس ایک ہی آواز آتی ''کل جب منورما کا بیاہ ہو جائے گا!'' ایسا معلوم ہوتا جیسے کہیں سر کے پیچھے بولنے والی فلم کا انجن لگا ہوا ہے اور اس کی ڈائن بیوی دانت نکالے پوری سوتیا ڈاہ سے اس فقرے کی بار بار تکرار کر رہی ہے۔ جی چاہتا کان میں انگلیاں دے کر کسی طرف بھاگ جائے، مٹر، اَرہر،

اوکھ سے دل بہلاتا۔ مگران میں بھی اسی ڈائن کی باتوں کی کڑواہٹ آگئی تھی۔ کیا کرے دل دکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں مرچیں سی لگی تھیں۔ خشک سسکیاں آرہی تھیں مگر آنسو نہ نکلتا تھا۔ گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے دل پکڑے ہوئے پھر اُٹھا۔ سامنے برگد کا درخت تھا، جوگیوں کی طرح جٹا لٹکائے ہوئے۔ سیکڑوں نکھرے چڑیوں کے بسیرے کی جگہ، تنے سے لپٹ گیا اور بے ساختہ منہ سے نکل گیا۔ یگ بابا بلالو! 'یگ دیوتا اُٹھالو!'' پھر بر وہ تھام کر اُوپر چڑھ گیا اور ایک چوڑی شاخ پر سیدھا لیٹ گیا، جان پڑا جیسے دل پر کسی نے پھایا رکھ دیا۔ پیڑ پر نہ لیٹا تھا ماں کی گود میں تھا۔ وہی سکھ، وہی چین، وہی ٹھنڈک، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دیر تک رویا گیا، پھر وہیں تھک کر سو رہا!

دو گھنٹے بعد ایک چھوٹی سی چڑیا آ کر قریب والی شاخ پر بیٹھی۔ تھوڑی دیر گردن ٹیڑھی کر کے اسے جھانک جھانک کر دیکھتی رہی، پر کھجا کھجا کر سونچا کی، پھر ہمّت کر کے پھدک کر اس کے جسم پر آرہی، سینے پر اور بغلوں میں اپنے لیے غذا تلاش کرتی رہی۔ کوئی چیز نہ ملی۔ کھلتا اور بند ہوتا ہوا منہ دکھائی دیا اور قریب آئی۔ شاید اس گڑھے میں کچھ ملے۔ لعاب دہن ہونٹوں کے کنارے میں بھرا تھا۔ پتلی سی چونچ سے ذرا سا اُٹھا کر چکھا۔ اچھا معلوم ہوا، لالچ بڑھا، جسارت کر کے ٹھوڑی پر آرہی، سوتے ہوئے انسان کے جسم میں ناخن کی خراش لگی۔ گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ چڑیا تو اُڑ گئی لیکن یہ اُٹھ بیٹھا۔ اپنے کو زمین سے کوئی دس گز کی بلندی پر بیٹھا پایا سخت تعجب ہے۔ سوچنے لگا یہاں کیونکر پہنچا۔ ایک ایک کر کے ساری باتیں یاد آ گئیں۔ منورما کی بنتی۔ بیوی کی لڑائی، اس کا منورما کو'سوکن' کہنا، اپنا بیوی کو'ڈائن' کہنا، پھر آخری جملہ وہی بس میں ڈوبا ہوا جملہ ''کل جب منورما کی شادی ہو جائے گی تب!''

پھر بھی طوفان میں کمی ہو چکی تھی، نہ وہ پہلی طغیانی تھی اور نہ وہ جزر و مد! سوچتا ہوا اُترا: سچ کہتی ہے جب منورما کی شادی ہو جائے گی تب؟ اور اگر نہ بھی ہو تو؟ چچا کی لڑکی ہے۔ میری بہن! ہندو دھرم میں یہ کہاں ہے کہ چچا کی لڑکی سے بیاہ ہو... اور میں کیسے کر سکتا ہوں... مدن کی ماں؟... مگر پریم... ہردے نہیں جانتا!... ہے رام... ہے رام! بڑی کٹھن آ پڑی، بڑی بپتا ہے! کیا کروں! کس سے کہوں؟''

انھی خیالات میں محو درخت سے اُترا اور آہستہ آہستہ گردن نہوڑائے گھر کی طرف چلا۔ ابھی گھر میں قدم نہ رکھا تھا کہ شور اور ہنگامے کی آواز سنائی دی۔ قدم اور تیز پڑنے لگے۔ اندر

داخل ہوتے ہی دیکھا تو 'بہو' پر بھوت سوار ہے۔ موسل ہاتھ میں ہے، منہ سے کف جاری ہے۔ مدن زمین پر خاک میں لوٹ رہا ہے۔ ماں پوتے کو بچانے کے لیے جھکی ہے اور منورما اپنی بھاوج سے چمٹی ہوئی ہے اس نے لپک کر بیوی کے ہاتھ سے موسل چھین کر دُور پھینک دیا اور بیٹے کو گود میں اُٹھالیا۔ پھر ڈانٹ کر پوچھا "کیا ہوا؟ یہ...... یہ کاہے کا ہنگامہ ہے؟"

ماں نے ہانپتے ہوئے کہا "جب سے تم باہر گئے ہو بہو بیٹھی نہ جانے کیا بڑبڑاتی رہیں، کہ اتنے میں مدن آ گیا اور ان سے کسی چیز کے لیے مچل گیا۔ بس برس پڑیں۔ کوسا کاٹا، پھر گھر بھر گھسیٹتی اور مارتی پھریں۔ جب میں نے اور منو نے ٹوکا تو جانو سچ مچ سر پر بھوت سوار ہوگیا۔ منو کو بری بری گالیاں دیں۔ پھر موسل اُٹھالائیں کہ میں مدن کو مار ڈالوں گی اور اپنی بھی جان دے دوں گی کہ جس میں تم کو چین آئے۔"

للائن اتنا ہی کہنے پائیں تھیں کہ بہو چیخ کر بولی "تو جھوٹ کیا کہا، آپ کی تو آنکھ پھوٹ گئی ہے۔ آپ کو کب بجھائی دیتا ہے۔ بس 'منو! منو!' کی رٹ ہے۔ اس ڈائن نے آپ کے راج دُلارے کا دل موہ لیا۔ روز روز اچھے اچھے بھوجن ہیں، تکیے کا غلاف ہے، رومال ہے، حلوا ہے۔ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہوں۔ نہ سیدھے منہ بات ہے، نہ ہنسنا ہے نہ بولنا ہے۔ آپ کی منو جو بڑی بھولی بھالی ننھی نادان ہے میری سوکن بننا چاہتی ہیں اور آپ کے پتر جو بڑے نیک سیدھے سادے ہیں یہی دل سے چاہتے ہیں۔ میں کب تک دیکھ دیکھ کر زہر کا گھونٹ پیتی رہوں؟"

منورما نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔ للائن ایک ایک کا منہ تعجب سے دیکھنے لگیں۔ مل راج شیر کی طرح ڈھکا: "چپ رہ بدتمیز! ماں جی کا بھی پاس نہیں!"

وہ بولی: "پاس کرے میری جوتی۔ مجھے کیا اس پاپی دنیا میں بہت دن رہنا ہے۔ تم اپنی کہو، تم تو میرے مرنے پر بھی اپنی چہیتی کو کلیجے سے نہیں لگا سکتے! وہ تمھارے کاکا کی لڑکی ہے!"

یہ کہہ کر اپنے کمرے میں گھس گئی اور دروازہ بند کر کے اسی جنون میں اپنے کپڑوں پر لالٹین سے تیل نکال کر چھڑک لیا۔ پھر دیا سلائی جلا کر آگ لگالی!

للائن اور مل راج مدن کے منہ دھلانے اور چپ کرانے میں مشغول تھے کہ دفعتاً مٹی کے تیل کی بو ناک میں گئی اور کمرے سے دُھواں نکلتا دکھائی دیا۔ دونوں، مدن کو اسی طرح چھوڑ کر

کمرے کی طرف دوڑے اور کواڑ پیٹنے لگے۔ ''بہو! بہو! کواڑ کھولو! ارے یہ دُھواں کیسا ہے؟''

اندر سے ہنسی کی آواز آئی: ''میں ڈائن ہوں ڈائن! اب جل کر چڑیل بنوں گی اور آپ کی منو کے سر پر سوار ہوں گی! اہا... اہا... اہا... اہا... آہ!!!''

لالہ ہنس راج کسی کھیت میں پانی بھروا رہے تھے کہ خبر پہنچی بہو آگ میں جل کر مر گئی۔ دوڑتے ہوئے گھر پہنچے۔ دیکھا کمرے کا دروازہ ٹوٹا ہوا ہے۔ بہو کے جلے ہوئے ڈھانچے پر ایک سپید کپڑا ہے سرہانے للائن بیٹھی ہوئی بین کر رہی ہیں۔ پائنتی مل راج دونوں گھٹنوں پر سر رکھے اکڑوں بیٹھا ہے۔ خود بھی تھوڑی دیر رویا کیے۔ پھر مہری سے ساری روداد پوچھی۔ اسے خاموش رہنے کا حکم دیا۔ بیوی کے پاس گئے انھیں چپ کرا کے اُٹھا لائے۔ اس کے بعد بیٹے کے پاس گئے۔ شانہ ہلایا، پکارا، اس نے چونک کر باپ کی صورت دیکھی۔ خاموش اُٹھا اور سر جھکائے باہر چلا گیا اور وہاں بھی اسی طرح سب سے علیحدہ ایک کمرے میں جا کر بیٹھ رہا۔ لالہ جی نے جب منورما اور مدن کی تلاش کی تو وہ دونوں ایک گوشے میں زمین پر پڑے ہوئے ملے۔ گلے میں باہیں تھیں اور گال پر گال۔ رخسار اب تک آنسو سے تر تھے۔ نہ جانے بے ہوشی تھی یا نیند! بہر حال دونوں غافل تھے۔ حسرت سے دیکھا کیے۔ پھر آہستہ آہستہ دَبے پاؤں کھونٹی پر سے ایک چادر اُتارا اور باہر چلے آئے۔

گاؤں کے لوگ آنے لگے۔ ہر ایک سے جھوٹ بولنا پڑا۔ اتفاقیہ جسم میں آگ لگ گئی! ہر ایک افسوس ظاہر کرتا رہا۔ شام تک داروغہ جی بھی آ گئے۔ آدمی نیک تھے۔ پھر لالہ ہنس راج سے آدمی کے گھر کی بات تھی۔ رپورٹ میں اتنا لکھ کر کہ اتفاقیہ کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ درشن کرا کے رسم ادا کرنے کی اجازت دے کر چلے گئے۔ دوسرے دن صبح تک اس سے بھی فراغت ہو گئی۔ ہاں البتہ یہ ہوا کہ مل راج نے نہ کھایا، نہ پیا، نہ سویا، نہ بولا۔ اس وقت بھی چپ تھا جب ٹکٹی گھر سے نکالی جا رہی تھی اور اس وقت بھی جبکہ گھی کے چھڑکاؤ کے ساتھ مدن کی ماں کی سوکھی ہڈیوں سے شعلے بھڑک رہے تھے!

تین دن بعد لالہ سیتا رام بھی لاہور سے آ گئے۔ بھائی سے ساری روداد سنی۔ منورما کو پاس بلا کر بٹھایا، کچھ اس طرح متجسس اور حسرت بھری نگاہوں سے اس کی صورت دیکھا کیے کہ وہ رونے لگی۔ انھوں نے بن ماں کی بچی کا سر سینے سے لگایا۔ آہستہ آہستہ سر پر ہاتھ پھیرتے

جاتے تھے اور خود بھی روتے جاتے تھے۔

للائن نے جو دوسرے دالان سے یہ حالت دیکھی تو وہاں سے اُٹھ کر آئیں۔ بیٹی کا سر باپ کے سینے سے ہٹا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ پھر دیور سے بولیں: ''تم باہر جاؤ، تمھارے بھائی بلا رہے ہیں!'' وہ جو باہر آئے تو دیکھا لالہ جی بیٹھے ہوئے جلدی جلدی حقہ پی رہے ہیں اور پاس ہی مل راج گردن جھکائے بیٹھا ہے۔ کچھ غصہ معلوم ہوا کچھ افسوس پھر بھی بڑے بھائی کے لحاظ سے کچھ بولے نہیں۔ خود انھی کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئے۔ لالہ جی نے کھانس کر گلا صاف کیا۔ حقّے کے کئی کش پھر جلدی جلدی کھینچے اور بولے: ''اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں ملو سے ابھی یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ... بہو نے جو الزام ان پر منو کے پریم کا لگایا تھا، وہ سچ ہے یا جھوٹ؟''

مل راج اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ لالہ سیتا رام نے اس پر ڈانٹ کر کہا۔ ''ملو سنتے ہو بھیا کیا پوچھتے ہیں؟ جواب دو!''

مل راج نے سر اٹھا کر بڑی حسرت سے انھیں دیکھا۔ لالہ جی نے پھر پوچھا: ''بیٹے تم خود ایک لڑکے باپ ہو، جو بات ہو صاف صاف کہہ دو۔ کیا تم سچ مچ منو سے بہن سے زیادہ پریم کرتے ہو؟''

مل راج نے عجیب درد سے انھیں دیکھا۔ سر ہلا کر حامی بھری اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

لالہ جی بیساختہ جھلا کر بولے۔ ''کاہے رے ہتھیارے کوئی چچا کی کنیا سے اس طرح پریم کرتا ہے؟ کیا تیرا اور منو کا بیاہ ہو سکتا ہے؟ سچ مچ یہ کلجگ ہے!''

مل راج نے گھٹنے سے سر اُٹھایا۔ ایک بار باپ اور چچا کو اس تیور سے دیکھا۔ جس طرح مرد سے مرد آنکھیں ملاتے ہیں۔ پھر جھک کر دونوں کے چرن چھوئے اور گھر میں چلا گیا صحن میں مدن کھیلتا ہوا ملا، اسی طرح خاک میں بھرا ہوا زمین سے اُٹھا کر کلیجے سے لگا لیا۔ پھر اسے وہیں چھوڑ کر اس جگہ گیا جہاں منو رما مرجھائی ہوئی کلی کی طرح اُداس بیٹھی چھالیا کاٹ رہی تھی، انھیں قریب آتے دیکھ کر اس نے اپنے دلی ہیجان سے مجبور ہو کے گھونگھٹ نکال لیا۔ یہ تھوڑی دیر وہیں کھڑا اُس مکھڑے کو دیکھتا رہا جس کے 'کارن' آج لالہ جی سے محبت کرنے والے باپ

نے اسے ہتھیارا کہا۔ پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھے چند منٹ خود لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا اور وہ بیٹھی کانپا کی۔ پھر ماں کے پاس گیا اور اس کے پاؤں آنکھ سے لگا کر گھر سے باہر نکل گیا!

مدن اب پندرہ برس کا ہے اور لالہ جی کے بڑھاپے کا سہارا۔ کھیت کھلیان، زمینداری سب کچھ وہی دیکھتا ہے۔ مل راج دس برس سے لاپتہ ہے۔ ایک بار بس اتنا ہوا کہ خبر ملی کاشی جی سے تھوڑی دُور پر گنگا جی کے کنارے ایک بابا جی نے دُھونی جمائی ہے۔ اور یہ بھی سنائی دیا کہ ان کو آج تک کسی نے باتیں کرتے نہیں سنا اور نہ اکڑوں کے سوا کسی اور طرح بیٹھے دیکھا۔ لالہ جی نے تفتیش کے لیے آدمی بھیجا وہ لا کر ایک پرزہ دے گیا۔ لکھا تھا۔

"پتا جی! مَیں نے آپ اور مدن کی ماں دونوں کے نزدیک منورما سے پریم کرنے میں پاپ کیا۔ لیکن مَیں ہردے سے مجبور تھا۔ مَیں نے اسی پاپ کی اپنے کو سزا دی ہے کہ جوگ لے لیا۔ اب آپ جانیں اور مدن اور منورما۔ ایک انجان بالک ہے اور دوسری ستی استری۔ ہاں میں نے یہ ضرور قسم کھائی ہے کہ میں جنم بھر نہ کسی جانے پہچانے سے ملوں گا اور نہ اس منہ سے بولوں گا جس سے منورما کے لیے پریم کے شبد نہیں نکال سکتا... بلو۔"

اس کے بعد سے پھر پتہ نہ چلا کہ مل راج کہاں گیا یا کیا کر رہا ہے۔ منورما البتہ کئی برس لالہ کی کے یہاں رہی۔ پھر شاید بیاہ ہو گیا۔ اب اس کے دو تین لڑکے ہیں، شوہر محبت کرتا ہے، گھر میں کھانے پینے کو بھی ہے۔ لیکن یہ انوکھی بات ہے کہ اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے سوامی کے لیے نہ کوئی تکیے کا غلاف سیا اور نہ کبھی کوئی کھانا پکایا اور تیسرے چوتھے مہینے بیٹھے بٹھائے دفعتاً کپڑے پھاڑ ڈالتی ہے۔ سر پر خاک ڈالتی ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور آپ ہی آپ ہنسنے لگتی ہے اور اس ہنسی میں بالکل وہی کیفیت ہوتی ہے جو بہو کے اُس قہقہے میں تھے جو جلتے وقت اُس کے حلق سے نکل رہے تھے!!

بیوی

ڈاکٹر منور خوش فہم بھی تھے، اور خوشرو بھی، ستائیس برس کا سن، چڑھتی جوانی آکسفورڈ کے بی۔ای۔سی۔لیڈنر کے پی۔ای۔ڈی، لندنی فیشن کپڑوں میں، کرزنی وضع چہرے کی، اور شوپنہار وڈارون کے نظریئے دل و دماغ میں! پھر اس پر خلیق، خوش گفتار بھی، خوش رفتار بھی، جامہ زیب بھی۔ ماں باپ یورپ سے واپسی کے پہلے ہی مر چکے تھے، تقریباً ایک لاکھ کی جائداد ملی تھی، نہ کوئی بھائی تھا نہ کوئی بہن تھی، بزرگوں میں لے دے کے ایک رشتے کے چچا ہوتے تھے وہ بھی ملازم تھے، کار پرداز تھے، اتالیق نہ تھے! خوردوں یا برابر والوں میں جو کچھ بھی کہو، ایک اللہ کی بندی سلمیٰ تھی، وہ شرع و آئین کی رُو سے بیوی تھی۔ اس لیے کہ عقد ہو چکا تھا، اگر رسم و رواج کی بنا پر اب تک غیر محض تھی، اس لیے کہ بیاہ نہ ہوا تھا۔

ڈاکٹر منور جو یورپ سے واپس ہوا تو عورت سے متنفر، اس کے حقوق سے یکسر غافل اس کی ضرورتوں کے محض حیوانی حدود تک کا قائل اور اس کے مساوی خیالات سے حد درجہ خفا!

وہ کہتا۔ ''عورت ایک موسمی پھول ہے۔ اس سے وقتی مسرت حاصل کرلو، اسے گلے کا ہار نہ بناؤ۔ ورنہ یہ نازک پنکھڑیاں کچھ ہی دنوں میں خارِ مغیلاں بن جائیں گی۔'' ایک دوسرے موقع پر اس نے کہا۔ ''عورت ناگن ہے، بڑی ہی خوبصورت، بڑی ہی نازک، بڑی ہی سبک مگر بڑی زہریلی! اس سے بھاگو دُور بھاگو۔ ورنہ اس کا کاٹا بچتا ہی نہیں!'' ایک بار اس صنف کی یوں تعریف کی۔ ''عورت شیرنی ہے۔ حسین جسم والی، نازک کمر والی، نرم جلد والی، مگر بلا کی خونخوار اور آفت کی تیز دنداں!'' ایک دفعہ یوں گہر پاشی کی۔ ''عورت ایک کسی ہوئی تیغ ہے، جس پر گری اس کا خون چاٹ گئی، جدھر چمکی آنکھوں کی خیرہ کرگئی، جس جانب جھکی، اس طرف صفائی کردی، جس سے گلے ملی اس کو موت سے گلے ملا دیا۔''

اگر کسی نے کہہ دیا کہ ''بہت ہی عمدہ شاعری کی، اچھی تشبیہیں تلاش کیں۔'' تو پھر ڈاکٹر منور ہاتھ دھوکر آستینیں چڑھا کر پیچھے پڑ جاتے تھے۔ 'علم الحیوان'، 'علم الابدان' یا 'علم طبیعات' اور خدا معلوم کن کن علوم سے دورانِ تقریر میں مثالیں، نظریئے اور مقولے اس بہتات سے پیش کر دیتے تھے کہ غریب معترض گھبرا اُٹھتا تھا، اور ساکت ہو کے سر نہ اُٹھا تا تھا۔ اس سکوت پر ڈاکٹر منور ایک خندۂ تحقیر آمیز کے ساتھ کہتے۔ ''حضرت! آپ جن نظریوں پر عمل پیرا ہیں وہ سب جذباتی ہیں، آپ عورتوں پر آج کل کی جدید تریں تصنیفیں دیکھئے اور اگر ان تک دسترس نہ ہو، تو کم از کم 'ہیولاک ابلیس' کی کتاب تو پڑھ ہی لیجیے، آپ کو اس کے دیکھنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ عورتوں کی فطری خواہش اور طبعی میلان کیا ہیں، اور اُن کے اس حسین خول میں کس بلا کا ڈس بھرا ہے۔''

غرض تمام عقلی و نقلی دلائل کی تان اُسی پر ٹوٹتی کہ عورت اور حیوانات میں صرف صورت کا فرق ہے۔ اور وہ حد درجہ کیاد، مکار، حیلہ جو، فتنہ پرداز ہیں۔ ان کا وجود مردوں کی یکسوئی قلب کا دُشمن ہے، اور انھیں طرح طرح کے آلام میں، مصائب میں گرفتار کرانے کا باعث!

جب اِس طرح کے خیالات ہوں، ماں باپ سر پر نہ ہوں، کوئی دبانے والا بزرگ خاندان میں نہ ہو، اور روپیہ وافر ہو، تو عقد کے سورۂ اخلاص پر بیاہ کا جزدان کیونکر چڑھایا جاسکے۔ گویا تدبیر منزل کے لحاظ سے، منور، برگد کا وہ تازہ تنا تھا جو اصل سے جدا کر کے حال ہی میں نصب کیا گیا ہو، نہ وہ خود سرسبز ہو اور نہ اس کی گھنی چھاؤں میں کوئی لُو، دُھوپ کا مارا آرام پاسکتا ہو!

یورپ کی ہوا کھایا ہوا مسافر جس طرح دو چار سوٹ ٹائیاں، اور کئی درجن جوتے ساتھ لاد لاتا ہے۔ اسی طرح قصّوں، کہانیوں، چٹکلوں اور لطیفوں کا بھی ایک ذخیرہ اس کے ہمراہ ہوتا ہے۔ یہ چیزیں سوسائٹی ہی میں، دو چار دس آدمیوں کے مجمع ہی میں کچھ مزا دیتی ہیں۔ اسی لیے لوگوں سے ملنا جلنا، دعوتیں کھانا، پارٹیاں دینا ایسے اشخاص کو زندگی کا جزوِ اعظم بن جاتا ہے۔ منور کے ہاں تو خدا کا دیا سب کچھ تھا، اُس نے اپنی سوسائٹی بنائی اور کچھ مفت خوروں نے اس کو اپنی سوسائٹی کا مرکز قرار دیا۔ گھر پر دعوتیں ہوتیں، چائے پارٹی ہوتی، برج ہوتا، فلش ہوتا، شطرنج ہوتی، باہر موٹر پر ہوا کھائی جاتی، سینما دیکھا جاتا۔ تھیٹر کی سیر ہوتی، اور گھوڑ دوڑ میں بازیاں لگائی

جاتی تھیں۔ 'صاحبیّت' کی یہ سب بدیہی نشانیاں ہیں، اور امارت کی یقینی علامتیں! بھلا ایک 'یورپ زدہ' سرٹیفکیٹ یافتہ بی۔ ایس۔ سی، پی۔ ای۔ ڈی ان سے کیونکر احتراز کرسکتا تھا؟ پھر بھی انھیں یار دوستوں نے دو چار بار سلسلۂ گفتگو میں گھر بسانے اور شادی کی رسم ادا کرنے کی ترغیب دی۔ منور نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔

''میں ایسا بے قوف نہیں! اپنی آزادی کیوں کھودوں اور مفت کی بلا کیوں مول لوں؟'' ناموس کی عزت کا خیال دلایا گیا تو سختی سے جواب ملا۔'' جب میں سلمیٰ کو اپنی ناموس اور عزت سمجھوں جب تو! پھر عصمت وعفت اضافی چیزیں ہیں، میرے نظریئے اور اصول ہندوستانی نہیں، مجھے ان چیزوں کی پروا نہیں!'' عورت کی ضرورت، اس کی خدمت، اطاعت، ہمدردی، انسانیت، ایثار اور بے نفسی کا کون ذکر کرتا؟ وہ بار باران تمام امور کا مضحکہ اُڑا چکا تھا، بار باران کی تردید کر چکا تھا۔ 'پڑھا جن' تھا۔ کون اس کے منہ کو لگتا۔ یارانِ طریقت کو اس کی کیا پڑی تھی؟ ان کا فائدہ بھی اسی میں تھا کہ منور یوں ہی بن بیاہا رہے۔ شادی ہو جانے، بیوی آ جانے پر خدا جانے کون کون سے شوق ترک کر دے، ممکن ہے بیگم صاحبہ اخراجات میں قطع و برید شروع کر دیں، برج بھی بند ہو جائے اور بسیں بھی چھوٹیں، تفریح کی جگہ بیوی کے رُخ انور کی زیارت ضروری ٹھہرے، تھیٹر کے کھیل کی عوض بچوں کا کھیل زیادہ پسند آئے، اور سینما کی چلتی پھرتی تصویروں کی جگہ گھر والی کے خرامِ ناز کا تماشا ہونے لگے۔ اسی لیے سب خاموش ہو رہے۔ منور کے خسر کے دل کو لگی تھی۔ انھوں نے پہلے اس کے کار پرداز چچا کو بلا کر کہا، انھوں نے ڈرتے ڈرتے ذکر کیا، ڈانٹ دیئے گئے۔ گو بزرگ تھے۔ لیکن ملازم بھی تھے، اپنی روٹیوں کا پاس کر گئے۔ کون پیٹ پر ٹھیکرے باندھ کے نکلنا پسند کرتا ہے؟ لگی ہوئی نوکری آج کل زندگی کے برابر ہے، کس کے سر پر اجل کھیلتی ہے کہ وہ اصول کے لیے ملازمت کو بازیچۂ اطفال بنائے۔ اس لیے چچا نے زبان بند کر لی، اور منہ سی لیا، خود اس کے پاس خسر کا خط آیا! پہلے تو جواب ہی کی ضرورت نہ سمجھی گئی، جب بار بار تاکید کی گئی تو لکھ بھیجا کہ ''مجھے منظور نہیں، آپ کہیں اور رشتہ کر لیں'' دوست احباب کے مجمع میں یہ بھی بولا۔'' مجھے اگر بلّی پالنا ہوگی، تو میں یورپ کی کیوں نہ پالوں گا، گلے میں پھندا اگر ڈالنا ہی ہے، تو ریشمی کیوں نہ ہو، سوت کی موٹی رسّی کا کیوں ہو؟ پھر دھیلے کی ہانڈی انسان لیتا ہے تو دیکھ بھال اور ٹھونک بجا کے، نہ کہ اتنا بڑا سودا اور وہ بھی مرحوم

والدین کی مرحوم خواہش کی بنا پر نہیں، صاحب مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں دیدہ دانستہ آستین میں ناگن پالوں!"

خسر نے مہر کے دعوے کی دھمکی دی، اس نے لکھا کہ "میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

سلمٰی نے سن گن پالی، وہ غریب، بے زبان، خدا سے لو لگا نے بیٹھی تھی منور کے کارنامے، اس کے نظریئے، دُور تک مشہور تھے، وہ سب کچھ سن رہی تھی۔ مگر ہندوستانی تھی، شریف تھی۔ منور کے الفاظ میں 'غیر مہذب' تھی اور عرفاً بن بیاہی تھی۔ اس کی زبان نہ کھل سکتی تھی، وہ اپنے منہ سے ہاں نہیں، کچھ نہ کہہ سکتی تھی شرم نے پہرے بٹھا رکھے تھے، اور ہر دم پاسبانی کرتی تھی، مگر وہ پڑھی لکھی تھی، دین و مذہب سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عقد نے اسے منور کی بیوی بنا دیا ہے۔ اور وہ اس کا سرتاج اور شوہر ہو چکا ہے، بیاہ محض ہندوستانی رسم کی پابندی عرف عام کی پیروی ہے، اور نہ اس کی ضرورت ہے، اور نہ حاجت اسی لیے جب اس نے گھر میں مہر اور طلاق کا چرچا سنا تو وہ کئی روز تک پیچ و تاب کھایا کی، وہ اس رشتے کے قطع کرنے کی مخالف تھی۔ مگر اس اختلاف کا اعلان شرم کی وجہ سے ناممکن سا تھا۔ مگر ضرورت اور مجبوری سب کچھ کراتی ہے، ایک دن اپنی ایک سہیلی سے منہ پھوڑ کے وہ بول ہی اُٹھی۔

"بہن مجھے یہ مہر اور طلاق کا ذکر ایک آنکھ نہیں بھاتا، اب تو جس کے ساتھ مقدر تھا نکاح ہو چکا۔ میں ان کی لونڈی بن چکی، وہ خواہ مجھے پوچھیں یا نہ پوچھیں، مَیں ان کے نام پر بیٹھی رہوں گی۔ سینکڑوں رانڈیں ساری عمر یونہی بسر کر دیتی ہیں، پھر مَیں ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟ تم کسی طرح اس بات کو ابا جان کے کانوں تک پہنچا دو کہ اگر طلاق کا پھر کسی نے نام لیا تو میں کچھ کھا کے سو رہوں گی، مجھ سے یہ رسوائی نہ سہی جائے گی۔"

منور کے خسر بیٹی کا ایما پا کے، خاموش ہو رہے، اُن کے لیے یہ رشتہ عذابِ جان تھا۔ داماد حد درجہ آزاد، بیٹی حد درجہ کی شریف، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ منور کے ساتھ شادی کیا تھی سانپ کے منہ کی چھچھوندر تھی، نہ نگلتے چین نہ اُگلتے!

ڈاکٹر منور یونہی شوپنہار کے فلسفے پر گامزن انڈے، مٹن چاپ، پڈنگ اُڑا رہے تھے کہ بلائے ناگہانی کی طرح مکھن میں چیچک کے جراثیم کہیں سے آ نکلے، اور صاحب کے ٹوسٹ کے ساتھ نازک ایشیائی جسم میں پہنچ گئے، دوسرے ہی دن دانے اُبھرے اور وہ بھی اس کثرت سے

کہ جسم میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ سوسائٹی کے اراکین نے یہ سنتے ہی بنگلے کے سامنے والے بکس میں کارڈ چھوڑے اور اپنے اپنے گھروں میں ٹیکے لگوا لگوا کر بیٹھ رہے، انٹہ برج، فلش، سب یک قلم موقوف ہو گئے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہی قرنطینہ کا حکم دیا۔ گھر میں عورتیں نہ ہونے کے باعث کرائے پر نرسیں بلائی گئیں، بڑی بڑی فیسیں لے کے سپید سپید وردیاں ڈٹ کے تانگوں پر موٹروں پر لد کے صبح شام آنے لگیں۔ مگر روپیوں کا لالچ اور خدمت مرضا کی تعلیم، دلّی خلوص اور سچی ہمدردی کی جگہ نہیں لے سکتی۔ نرسیں وقت پر دوا دے سکتی تھیں، مگر مریض کی نگرانی نہ کر سکتی تھیں، ڈاکٹر کے احکام کی پابندی کر سکتی تھیں، مگر ان کا دل منوّر کے درد سے دُکھتا نہ تھا، اُن کو اس کے جسم کے چھونے سے احتراز تھا۔ انھیں اس کے مرض سے گھن آتی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ ان کے دل کو نہیں لگی تھی۔ ان کا سہاگ منوّر کے دم سے نہیں قائم تھا۔ البتہ جب سلمیٰ نے منوّر کی حالت سُنی تو وہ بیتاب ہو گئی۔ حجاب و شرم کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، برق بیتاب کی طرح اپنی جگہ سے اُٹھی اور ماں کے قدموں میں جا کے گر پڑی، دونوں خوب لپٹ کے روئیں، بیٹی نے رُکتے رُکتے ایک ایسی بات کی خواہش کی جو آج تک ہندوستان میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس پر مچلی تھی کہ وہ بن بیاہی اپنے شوہر کے پاس اس کی خدمت کرنے جائے گی، ماں نے سمجھایا، گھڑکا، ڈانٹا، مگر اس نے ایک سماعت نہ کی۔ وہ کہتی بجھتے ہوئے چراغ کی آخری لپک، بن دیکھے نہ رہوں گی، رنڈاپا قسمت میں ہے، رسوائی مقدر میں، مگر آخری خدمت کی حسرت دل میں کانٹے کی طرح ہمیشہ کھٹکے گی، دنیا جو چاہے کہے، اب مَیں نہ مانوں گی، جاؤں گی ضرور، آخر مجھے بھی ایک دن خدا اور رسول کو منہ دکھانا ہے یا نہیں؟ مَیں انھیں کیا جواب دوں گی؟'' سوت کی رسّی پتھر پر خط ڈال دیتی ہے، ماں کا دل تھا موم کا، بیٹی کی منتوں سے کیوں نہ پسیجتا؟ شوہر کو باہر سے بلا بھیجا۔ اُن سے بیٹی کی خواہش کا ذکر کیا، پہلے تو وہ ہندوستانی تربیت کے ماتحت خوب خوب بگڑے، چیخے پیٹے مگر جب یہ معلوم ہو گیا کہ بیٹی کی بالک ہٹ میں بیوی کی تریاہٹ بھی شامل ہوتی جاتی ہے، اور بغیر اجازت دیے بن نہ پڑے گی تو سوچ کے بولے: اچھا وہ جائے، مگر اس شرط پر کہ تم خود اسے اپنے ساتھ لے کے جاؤ۔''

بیوی نے کہا: ''کیا تم مجھے ایسے سڑن سمجھے تھے کہ میں اُسے تنہا جانے دوں گی؟ میاں منوّر بیمار ہوں یا اچھے سلمیٰ جائے گی انھیں کے گھر اپنی سسرال، وہ بھی پہلی مرتبہ، پھر اس گھر میں

نہ کوئی بڑی بوڑھی ہے، اور نہ سنتی ہوں کہ کوئی عورت ذات، خدا جانے کیا پڑے کیا نہ پڑے، وہ بھلا تنہا ایسے مکان میں کیسے جاسکتی ہے۔"

میاں نے ذرا نرم ہو کے کہا: "ہاں میرا یہی مطلب تھا کہ اسے وہاں نہ جانا چاہیے۔" اور باہر چلے گئے۔

ایک ہی شہر کا تو معاملہ تھا، ماں بیٹی دونوں گاڑی پر سوار ہو کے، دو مامائیں ساتھ لے، اُسی وقت منور کے ہاں پہنچیں، گھر میں کوئی عورت تو تھی ہی نہیں۔ ان دو پردہ دار عورتوں کے پہنچ جانے سے اچھی خاصی چہل پہل ہوگئی۔ سلمٰی کی ماں تو قیام و طعام کے انتظام میں مصروف ہوئیں، اور سلمٰی اِدھر شوہر کے کمرے میں داخل ہوئی۔

رونمائی کی رسم انہیں نرس کے ذریعے انجام پائی، مگر یہ عجیب طرح کی بات تھی کہ اس وقت دُلہن صورت دیکھنے آئی تھی، اور دولہا آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ بلکہ اسے تن بدن کا بھی ہوش نہ تھا۔

ڈاکٹر منور ایک نواڑ کے پلنگ پر لیٹا کراہ رہا تھا قریب قریب سارا جسم عریاں تھا۔ ایک ململ کا دوپٹہ جسم پر ڈال دیا گیا تھا۔ کمرہ گندھک سے بسا ہوا تھا، باوجود حد درجہ احتیاط کے دو چار مکھیاں پلنگ کے قریب بھن بھن کرتی اُڑ رہی تھیں مریض کی صورت اس قدر بھیانک تھی کہ دیکھنے سے ڈر معلوم ہوتا تھا، انگریزی بال سر کے دانوں کی وجہ سے مونڈ دیئے گئے تھے، کرزنی چہرے پر داڑھی اور مونچھ کے بال ناہموار طور پر نکلے ہوئے تھے، سارے جسم پر ورم تھا ناک کا بانسا سوج گیا تھا، پلکیں پکی ہوئی تھیں، ہاتھ پاؤں، ہر ہر عضو، ہر ہر بن مو، دانوں اور زخموں سے ڈھکا ہوا تھا۔

سلمٰی نے پہلی بار شوہر کو اس ہیئت میں دیکھا، اس نے جو خیالی تصویر اپنے دل میں بنا رکھی تھی۔ یا جو حلیہ اس سے دوسروں نے بیان کیا تھا، اس میں اور اس زخموں سے پھولے سُوجے متورم مجسمے میں اتنا تفاوت تھا کہ چند منٹ تک اس کا یہی جی چاہا کیا کہ وہ چیخ مار کر بھاگ جائے، مگر صد ہا پشت کی تربیت کا خون میں جو اثر تھا، اور بچپن سے شوہر کی اطاعت اور خدمت کی جو تعلیم دی گئی تھی، وہ اب کام آئی، وہ ایک بار کانپی، اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلیں اور سمٹیں اور اس کی مژہ پر آنسو جھلک آئے۔ پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی شوہر کے پلنگ کی

طرف بڑھی، نرس نے روکا، سلمٰی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، اور پلنگ سے مل کے فرش پر بیٹھ کے شوہر کا منہ تکنے لگی، گویا اس بگڑی ہوئی صورت میں خیالی تصویر کے آثار ڈھونڈھ رہی تھی! پھر دفعتاً چونک پڑی، دستی پنکھا اُٹھالیا شوہر کے جسم سے مکھی جھلتی جاتی تھی، اپنی آنکھوں سے آنسو بہاتی جاتی تھی، اور منور کے خشک لبوں پر برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھتی جاتی تھی۔

نرس بڑے غور سے اس سماں کو دیکھ رہی تھی، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے منور کی زندگی اب خطرے سے نکل گئی، اس لیے کہ اب مرض اکیلا تھا اور اس کی مقابل ایک کی جگہ دو روحیں! وہ اطمینان سے مسکرائی، اس نے 'امد گرویلس' کا ایک ناول اُٹھالیا، اور مریض و مرض سب کو بھول کر وہ اس میں غرق ہوگئی! تیمارداری کا بوجھ اب دوسرے کاندھوں پر تھا، وہ سبکدوش تھی۔

سلمٰی کے آنے کے دوسرے دن سے مرض کا زور گھٹنے لگا، آہستہ آہستہ زخموں میں کھرنڈ پڑے، اور مرض، منور کی آنکھوں سے نور ہدیۃً لے کے اور چہرے اور جسم پر بہت سے داغ اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ کے چلا گیا۔ ہوش وحواس درست ہوتے ہی ڈاکٹر منور نے اس حس کی کمی کو محسوس کیا، مزاج میں توکل اور صبر نہ ہونے کی وجہ سے اس نے آنکھوں کے جانے کا بڑا ماتم کیا۔ کئی وقت غذا نہیں کی، بات بات پر ہائے آنکھیں ہائے میری آنکھیں، کہہ کے چیخ چیخ کے رویا۔ سلمٰی کئی دن تک زبان بند کیے رہی، مگر جب اس نے دیکھا کہ بے صبری حد سے زیادہ بڑھی جارہی ہے تو تسکین دینے والے لہجے میں بولی۔

"خدا کو یوں ہی منظور تھا۔ اب اتنا رنج فضول ہے۔"

منور نے آج پہلی دفعہ ایک نئی دلکش اور سُریلی آواز سُنی پوچھا۔ "کون؟"

سلمٰی کے حلق میں کانٹے پڑ گئے، اس نے کئی مرتبہ زبان خشک ہونٹوں پر پھیری، رُک رُک کے بولی۔ "آپ کی لونڈی... سلمٰی!"

منور نے تعجب سے پوچھا۔ "تم کیوں کر یہاں آئیں؟"

سلمٰی نے آہستہ سے کہا۔ "اماں کے ساتھ... آپ کی خدمت کرنے!"

منور کی بے نور آنکھیں اس جواب پر کھل گئیں۔ اللہ اکبر! عورت اس قدر خطا پوش وعطا پاش ہے، وفا کا مجسمہ! محبت کی پتلی! ایثار کی جان! شرما کے بولا۔ "میں نے تمہارے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے!"

جواب ملا۔ ”آپ مالک ہیں، آپ کو ہر طرح کا اختیار ہے۔“

منور کو اس جواب نے مدہوش کر دیا، اس نے اندھوں کی طرح ٹٹول کے سلمیٰ کا نازک ہاتھ اپنے سخت ہاتھوں میں لے لیا، مگر اپنے مرض کے ساری ہونے کا خیال آتے ہی گھبرا کے چھوڑ دیا۔ سلمیٰ نے شرماتے شرماتے خود ہی ہاتھ بڑھایا اور وہ منور کی جھائیں کی سی کھر کھری ہتھیلی اپنے کنول سے نرم ہاتھوں سے سہلانے لگی۔ منور نے کہا:

”ہائے تمھیں میں اب دیکھ نہیں سکتا!“

نہایت ہی شیریں لب ولہجہ میں جواب ملا۔ ”نہیں اب بھی آپ دیکھ سکتے ہیں۔“

منور نے پوچھا کیسے؟

سلمیٰ نے کہا۔ ”دل کی آنکھوں سے!“

منور کے ہونٹ کانپنے لگے، پیشانی پر خجالت کا پسینہ جھلک آیا، تھوڑی دیر بعد وہ بولا ”نہیں! نہیں سلمیٰ، تم کو مجھ سے طلاق لے لینا چاہیے، میں پہلے روحانی طور پر اندھا تھا، اب جسمانی حیثیت سے بھی ہوں، میں تمھیں اپنی لکڑی نہ بناؤں گا۔“

سلمیٰ نے بڑی محبت سے کہا۔ ”آپ اس طرح کی باتیں نہ کریں، مجھے رنج ہوتا ہے۔ بیوی شوہر سے علیحدہ نہیں ہو سکتی! دونوں ایک دوسرے کے سہارے...“

منور نے قطع کلام کر کے کہا۔ ”مگر میری آنکھیں۔“

سلمیٰ نے بڑی محبت سے کہا۔ ”آپ اپنی آنکھوں کا کیوں بار بار ذکر فرماتے ہیں، پہلے بھی دو تھیں اور اب بھی ہیں۔“

منور خاموش ہو گیا، مگر سلمیٰ کے ایثار اور قربانی نے اس میں دَبے ہوئے جذبات شرافت کو ابھار دیا تھا، خودی کے مد میں جو غیرت وحمیت کے پہاڑ ڈوب گئے تھے وہ اب بے خودی کے جزر میں سطح پر آ گئے۔ اس نے پھر گھبرا کر کہا۔ ”نہیں نہیں یہ زندگی بھر کا ساتھ ہے، میری سیرت وصورت کے آدمی سے بناہ محال ہے۔“

سلمیٰ مسکرائی اور عجیب طرح کی متانت اور خودداری سے بولی۔ ”شوہر کی سیرت بیوی کے اختیار میں ہے۔ وہ جس رنگ میں چاہے ڈھال لے، وہ ماں کی طرح اسے سنوار اور بگاڑ سکتی ہے، میں نے تو اب آپ کی سیرت اپنے دل کے مطابق بنالی ہے۔“

منور گھبرا کے سلمیٰ کا منہ تکنے لگا، گویا وہ یہ چاہتا تھا کہ اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کے کسی طرح اس حجاب کو درمیان سے اُٹھا دے جو اس کی آنکھوں کے سامنے حائل تھا، جب وہ اس کوشش میں نا کامیاب رہا تو حد درجہ شکستہ آواز میں بولا۔ ''یہ بھی سہی لیکن صورت! ہائے وہ تو اب کسی قابل نہ رہی!'' سلمیٰ نے عجیب دلربایانہ انداز سے دستِ حنائی بڑھا کے منور کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور اسے آہستگی سے بلند کر کے بولی۔ ''اب تو وہ بھی میری آنکھوں سے دیکھی جائے گی۔''

منور کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر رخساروں پر آ گئے، سلمیٰ نے جھک کے اُنھیں پاک کر دیا۔ گویا شبنم کے موتی تھے کہ گلوں کی نازک پنکھڑیوں سے سمیٹ لیے گئے۔

منور نے بھرآئی ہوئی آواز میں کہا۔ ''واللہ تم عورت نہیں فرشتہ ہو!''

سلمیٰ کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا، معلوم ہوتا تھا اُفق مشرق سے ابھی ابھی آفتاب نکلا ہے وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ ''نہیں، نہیں، میں ایسے مرتبے والی نہیں، میں صرف عورت ہوں۔ وہ بھی کوئی اور نہیں آپ کی بیوی، آپ کی باندی، آپ کی لونڈی!''

منور روتے میں مسکرا کے بولا۔ ''تو خدا سب کو ایسی ہی بیوی دے!''

اور دو پھٹے ہوئے دل اس طرح مل گئے۔ جیسے الٰہ آباد کے قریب گنگا جمنا... ہاتھوں میں ہاتھ لیے خلوص و محبت کے عہد دلوں میں، اور خوش زندگی بسر کرنے کی تدبیریں زبانوں پر!

(باسی پھول)

پاگل

مظفر پاگل ہے۔ یقینی پاگل ہے۔ اس کے پاگل ہونے میں اور لوگ شک کریں تو کریں، مگر اُس شخص کو تو مظفر کی دیوانگی کا یقین ہی کرنا پڑے گا، جس نے اُسے دن کے دو بجے اور رات کے بارہ بجے چٹیل میدانوں اور سنسان ویرانوں میں 'رُپہلا پانی، سنہرا پانی' گاتے سنا ہے۔ خود مظفر کو نہ ان فقروں کی مہملیت کا احساس ہوتا ہے اور نہ اپنی آواز کی عدم موسیقیت کا۔ وہ گھنٹوں جھوم جھوم 'رُپہلا پانی، سنہرا پانی' کوّے سے ملتی جلتی آواز میں اِس خوش الحانی سے گایا کرتا ہے کہ بھولے بھٹکے راستہ چلنے والے کانوں میں اُنگلیاں دے لیتے ہیں اور آس پاس کی ہری ہری گھاس چرنے والے چوپائے بھڑک کر دُور بھاگ جاتے ہیں۔

اُس کی وضع قطع بھی پاگلوں کی سی ہے۔ سر اور داڑھی کے لمبے لمبے بالوں میں منوں گرد بیٹھی ہوئی...... بڑی بڑی خون کبوتر آنکھوں میں کیچڑ بھری ہوئی اور موٹے موٹے ہونٹوں کی باچھوں میں کف کی دھڑی جمی ہوئی...... سر پر میلی چکٹ ٹوپی...... بَر میں لمبا متعفن کُرتہ......اور ٹانگوں میں موٹا مارکین کا پائجامہ، اُس کی بھی یہ حالت کہ گھٹنوں تک ہر وقت کیچڑ میں اَٹا رہتا اور اکثر ٹخنوں سے نیچا ہو کر موزے کا کام دیتا ہے۔ پاؤں میں جوتا خواہ نیا ہو یا پُرانا ، چپٹا ضرور کر دیا جاتا ہے اور اُسے اس طرح زمین پر کھینچا جاتا ہے جیسے راہ چلنا اور جھاڑو دینا دونوں کام بیک وقت ضروری ہیں۔ بھلا ان باتوں کے بعد کون کہے گا کہ مظفر پاگل نہیں ہے؟ سارا گاؤں اُسے پاگل سمجھتا اور پکارتا ہے۔ آپ بھی یہی کہیں گے اور یہی سمجھیں گے۔ مگر...مگر مظفر کی ماں ہر شخص سے لڑنے کے لیے تیار ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ وہ اُس کی آنکھوں کا تارا، زندگی کا سہارا ہے۔ نہ شوہر زندہ ہے، نہ بھائی اور نہ دوسرے اعزا۔ نہیں یہ درست نہیں۔

اعزا ایسے جن سے اُس سے خونی رشتہ ہے، ضرور زندہ وسلامت ہیں، دیور بھی ہے، بھاوج بھی، بھائی کے لڑکے بھی ہیں اور بہن کی اولاد بھی۔ ہاں مگر ایسا عزیز جو اس بیوہ کے دُکھ درد میں شریک ہو، جو اُس سے یہ پوچھے کہ ''بی بی تمھارے دل پر کیا گزرتی ہے۔ تم دن کیسے کاٹتی ہو۔'' کوئی نہیں۔

اسی لیے اُس کی ساری دُنیا سمٹ کر مظفر میں محدود ہو گئی ہے۔ وہی اُس کی ساری کائنات ہے۔ پیری اور بیوگی کا سہارا، اپنی کوکھ کا پیدا، اُسی طرح گود کا پالا اور کھلایا ہوا۔ جس طرح دُنیا جہان کے بیٹے ہوتے ہیں، وہ بیٹے بھی جو ماں باپ کو سونے چاندی کے محلوں میں رکھتے ہیں اور وہ فرزند بھی جو بیویوں کے کہنے میں آ کر والدین کے جنازے کو کاندھا تک نہیں دیتے۔ پھر بھلا مظفر کو دیکھ کر اِس بڑھیا کی چھاتی مامتا سے کیوں نہ پھٹنے لگے؟ اور وہ اسے پاگل پکارنے والوں کو کیوں نہ پانی پی پی کر کوسے؟

اور بھئی ایمان ہے تو جہان ہے۔ مظفر سب کے لیے پاگل ہو تو ہو، مگر اپنی بیوہ ماں کے لیے تو وہ ہزاروں 'ہشیاروں' سے اچھا ہے۔ جہاں ماں نے کوئی کام بتایا اور وہ سر آنکھوں سے اُسے بجالانے کو دوڑا، اور حرف حرف پورا کیا۔ کیا مجال کہ ذرا سا فرق تو ہو جائے۔ مینہ پڑتا ہو، یا اولے گرتے ہوں۔ گرمیوں کی دوپہر ہو یا جاڑوں کی رات۔ گاؤں ہی میں کام ہو یا دو چار کوس کے فاصلے پر۔ مظفر اُس وقت تک دَم نہیں لے سکتا ہے جب تک کہ ماں کا حکم نہ پورا ہو جائے!

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مدتوں کے وطن آوارہ جب مکان پلٹتے ہیں تو مظفر کی ماں بیٹے سے سلام کہلا بھیجتی ہے۔ مظفر ڈیوڑھی میں آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ چیخ چیخ کر نام لیتا جاتا ہے اور ''امّاں نے سلام کہا ہے، امّاں نے سلام کہا ہے'' کی رٹ اُس وقت تک جاری رکھتا ہے جب تک کہ مخاطب صحیح سامنے نہ آ جائے اور اسے جوابِ سلام نہ دے دے۔ لوگ ایسا بھی کرتے ہیں کہ مظفر سے غلط طور پر یہ کہہ دیتے ہیں کہ: ''بھیّا وہ اس وقت یہاں نہیں ہیں۔'' وہ ذرا کھانس کر پوچھتا ہے۔ ''امّاں نے اُن کو سلام کہا ہے، کہاں ہیں؟'' پھر اگر کسی دوسرے گاؤں سے متعلق کوئی کام ہوا کہہ دیا ''فلاں گاؤں گئے ہیں۔'' مظفر فوراً وہاں جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ جب دو چار قدم چل لیتا ہے تو دھوکا دینے والا جلدی سے کہتا ہے۔ ''ہاں تو مظفر تم وہاں جا ہی رہے ہو، ذرا یہ کام بھی کرتے آنا'' اب مظفر غریب ماں کا سلام پہنچانے کوس دو کوس

کے فاصلے پر دوسرے گاؤں چلا جاتا ہے اور وہاں پیامبری کے فرائض خواہ نہ ادا ہوں لیکن اُن کا کام ضرور کرلاتا ہے۔ یہ یقینی انتہائی حماقت اور سادگی ہے مگر...''

ایک بار برسات میں جبکہ ندی نالے، دریا سب کے سب اُنڈے ہوئے تھے اور پانی ہفتوں سے متواتر برس رہا تھا، کسی شادی کے سلسلے میں مظفر کی ماں کو کسی کے ہاں جانا تھا، نئے کپڑے اور نئی جوتیاں ہونی چاہئیں۔ کپڑے تو خیر بکس میں موجود تھے، مگر جوتیاں کیونکر آئیں۔ بالآخر کئی وقت فاقے کیے گئے اور اِن سے اُن سے قرض اُدھار لے کر دام جمع ہوا۔ مگر پانی دم لینے ہی نہ دیتا تھا کہ شہر تک مظفر بھیجے جائیں۔ بالآخر ساتویں دن وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے کھل گیا۔ جلدی جلدی مظفر کو ہمسائی کی جوتی لا کر دکھائی 'دیکھو بیٹا! سوا دو روپے میں ہمسائی کے میاں شہر سے لے آئے ہیں تم بھی چلے جاؤ۔ تم بھی ایسی ہی خرید لاؤ۔'' مظفر نے ہمسائی کی جوتی اُلٹ پلٹ کر دیکھی۔ اپنے پائجامے کے پائینچے گھٹنوں تک چڑھائے اور اپنے جوتے اس شان سے پہنے جیسے نہ اُن کی ایڑیاں بیٹھ چکی ہیں اور نہ اُن کی قطع بوسیدہ سلیپر کی ہے بلکہ وہ بالکل ٹخنوں تک کے نئے بوٹ ہیں۔ اور گنگناتا، کھانستا، تھوکتا، اور 'سنہرا پانی، رُپہلا پانی' گاتا ہوا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

تین کوس کی مسافت پیدل طے کرنا تھی، وہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کر ڈالی اور شہر میں پہنچا۔ ہر دُکان پر خواہ وہ بساطی کی ہو، بزاز کی، میوہ فروش کی، یا کسی اور کی ہو، پوچھتا چلا ''امّاں نے جوتا مانگا ہے، تمھارے پاس ہے؟'' کوئی اُس کی صورت دیکھتا اور چپ رہ جاتا، کوئی نیک دل سیدھا سادا جواب دے دیتا مگر بعض شریر استہزا بھی کرتے۔ دیوانہ سمجھ کر پھبتیاں بھی کستے اور خفا بھی ہوتے۔ جب کوئی بہت سختی سے جھڑکتا تو وہ نہایت سادگی سے کہتا ''ارے بھائی کیوں خفا ہوتے ہو، امّاں نے کہا ہے 'جوتہ لیں گے' اور پھر کچھ زیر لب بڑبڑاتا آگے بڑھ جاتا۔ خدا خدا کر کے ایک جوتوں کی دُکان پر بھی یہی سوال کیا۔ اُس دُکاندار نے اس کی صورت پر نظر کی پھر پوچھا 'دام لائے ہو' مظفر نے جلدی سے ازار بند سے کھول کر دام دکھائے اُس نے بھی جوتے دکھانا شروع کیے، مگر پاگل سمجھ کر ایک کا ڈیڑھ مانگتا، یہ کہتا ''نہیں یہ ویسا نہیں جیسا امّاں نے مانگا ہے۔'' بارے اُس طرح کا بھی جوتہ نکلا، اب دام پر بحث ہونے لگی۔ یہ کہتا ''امّاں نے سوا دو روپیہ دیا ہے۔ ہم اتنے ہی میں لیں گے۔'' وہ کہتا ''ڈھائی سے کم میں نہ ملیں گے۔ لینا ہو تو لو، ورنہ دوسری دُکان دیکھو'' یہ کہہ کر اُس نے سارے جوتے بکسوں میں بند کر کے رکھنا شروع

کر دیے۔ مظفر اب تو گھبرایا۔ اسے محسوس ہوا کہ ماں کا محبوب جوتہ جیسے کوئی چھینے لیتا ہے۔ جلدی سے ہاتھ جوڑے ''دے دو، اماں کو تکلیف ہوگی۔ سوا دو روپیہ لے لو۔'' دُکاندار کچھ منغص ہو چکا تھا، اس نے دیوانے کی لجاجت کا کچھ خیال نہ کیا اور دُکان سے سختی سے دُھتکار دیا۔

مظفر کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اتنی دُکانوں پر پوچھنے کے بعد وہ جوتے ملے، جو ماں نے مانگے تھے مگر دُکان والا نہ دیتا تھا یہ تو ماں کے ساتھ صریحی ظلم تھا۔ غریب بیوہ پر۔ کوئی اس کا پوچھنے والا نہیں۔ اب ماں کیسے شادی میں جائیں گی۔ برادری میں عورتیں کہیں گی سوا دو روپیہ والا جوتہ نہ پہن کر آئیں۔ لوگ ذلیل کریں گے۔ کچھ نہ سمجھ میں آتا کہ کیا کریں۔ نہ یہ عقل میں آتا کہ دوسری دُکانیں دیکھیں۔ نہ یہی ذہن میں آتا کہ گھر پلٹ چلیں۔ ماں نے جوتے مانگے تھے، وہ اِس دکان پر موجود تھے۔ وہ سامنے والے بکس میں بند تھے مگر دُکاندار نہیں دیتا۔ پھر؟ بے بس ہو کر وہیں سڑک پر بیٹھ گیا۔ سارا دن بیٹھا رہا۔ دُھوپ تھی، اور اِس طرح کی تیز اور سخت دُھوپ، جو برسات میں پانی کھل جانے پر ہوتی ہے۔ مگر نہ تمازتِ آفتاب کی پروا تھی، نہ جلتی ہوئی سڑک کی۔ اس کی اماں والے جوتے سامنے دُکان میں رکھے تھے، اس پر نظر جمی تھی۔ اُنھیں کوئی چھوتا نہ تھا۔ ہر گھنٹے دو گھنٹے پر دُکاندار سے لجاجت سے کہتا ''امّاں کے جوتے دے دو'' اور جب وہ ڈانٹ دیتا، چپ ہو جاتا۔ دُکان پر گاہک آتے، جوتے خریدتے چلے جاتے۔ مگر یہ ٹکٹکی باندھے بس اُس ڈبے کو دیکھ رہا تھا جس میں اس کی امّاں کے جوتے رکھے تھے... کہ اتنے میں ابر محیط آیا، برق چمکی، رعد نے گرج کر بادلوں کا جگر پانی کر دیا۔ موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہوئیں۔ سڑک سے لوگ بھاگنے لگے۔ جن کے پاس چھتریاں تھیں اُنھوں نے چھتریاں کھول لیں، جن کے پاس برساتیاں تھیں، اُنھوں نے وہ اوڑھ لیں۔ اور ہر ایک لمبے لمبے قدم رکھنے لگا۔ مظفر بھی گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر جائے کہاں؟ سامنے ہی دُکان میں تو امّاں کی پسند والا جوتہ رکھا تھا۔ زمین نے پاؤں پکڑ لیے۔ دُکاندار کو بڑی لجاجت سے دیکھا۔ اُس نے منہ پھیر لیا۔ معلوم ہوا ٹانگوں کی طاقت کسی نے سلب کر لی۔ بھد سے سڑک پر بیٹھ گیا۔ اب تیز ہَوا چلنے لگی اور ہر قطرۂ آب تیر کی طرح جسم پر آ کر لگتا۔ مگر اُسے پروا نہ تھی۔ ہَوا اور تیز ہوئی اور دفعتاً انڈے کے برابر اولے پٹر ہٹر، ہٹر پٹر گرنے لگے۔ ہر ایک اس طرح جسم پر آ کر لگتا جیسے کوئی پتھر کھینچ کھینچ کر مار رہا ہو مگر وہ ستون کی طرح اپنی جگہ قائم رہا۔ ماں کے جوتے سامنے تھے، سامنے والی دُکان میں۔ اُس کو نہ ہَوا ہلا سکتی تھی، نہ پانی اور نہ اولے۔ یہ اُسی طرح

بیٹھا رہا۔ سارے کپڑے بھیگ گئے۔ سردی کے اثر سے دانت بجنے لگے۔ مگر جوتوں پر سے نگاہ نہ ہٹی۔ بالآخر دُکان میں پناہ لینے والے گاہکوں نے دُکاندار سے سبب پوچھا اور روداد سُنی۔ سب نے مل کر لعنت ملامت کی، اور پانی کم ہوتے ہی اُسے جوتے دلوا کر روانہ کر دیا۔

مطلع صاف تھا، پانی کھل چکا تھا، مگر ہَوا کی سردی رگ و پے میں پیوست ہو چکی تھی۔ مظفر کے سینے پر سردی کا اثر تھا اور جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ دن بھر کے فاقے سے چکّر آ رہا تھا۔ مگر وہ ماں کے جوتے کو سینے سے لگائے گنگناتا، کھانستا، تھوکتا، اور 'رُپہلا پانی، سنہرا پانی' گاتا چلا جا رہا تھا۔

ہاں ہاں مظفر پاگل ہے یہ یقینی پاگل ہے۔ اِس لیے کہ جب مظفر سر سے پاؤں تک بھیگا ہوا ماں کے جوتے لیے مکان میں داخل ہوا تو گو اس کا سارا جسم بخار سے جل رہا تھا مگر ماں اس کا سر سینے سے لگائے اس کے اُلجھے خاک آلود بال اپنی سوکھی سوکھی اُنگلیوں سے برابر کر رہی تھی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو مظفر کے سر پر ٹپک ٹپک کر تیل کا کام دے رہے تھے!

(کچھ ہنسی نہیں۔ ۱۹۳۰ء)

پرائیویٹ سکریٹری

مکیش نے آکسفورڈ سے بی اے کر کے بیرسٹری پاس کی، لیکن سند ملی ہی تھی کہ اطلاع ملی باپ سورگ سدھارے۔ وہ ہمیشہ کے شاہ خرچ تھے، اس لیے نہ گھر میں کچھ تھا نہ بینک میں۔ وہ جیسے تیسے ہندوستان واپس آیا تو اسے محسوس ہوا کہ اب خاندان اسی کو چلانا ہے۔ بیرسٹری کے لیے بھی تو کام کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں روزانہ کا خرچ بھی قرض اُدھار پر چل رہا تھا۔ کیا کرے کیا نہ کرے، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاق سے بلونت نے ایک اشتہار کی طرف توجہ دلائی۔ ایک ہز ہائینس کو ایک پرائیویٹ سکریٹری کی ضرورت تھی۔ محل میں قیام و طعام کے علاوہ پانچ سو تنخواہ۔

مکیش نے کہا ''نہ یار مجھ سے یہ ہز ہائینسوں کے نخرے نہیں سہے جائیں گے۔''

بلونت بولا ''اس پر ہز ہائینسوں کے نخرے بھی بڑھالو، مگر میاں بیرسٹری کی دُکان لگاتے لگاتے سالہا سال لگ جائیں گے اور اس عرصے میں کھاؤ گے کہاں سے اور کھلاؤ گے کہاں سے؟''

مکیش نے کہا ''ہاں بھئی، اپنا اکیلا معاملہ ہوتا تو میں روکھی سوکھی کھا کر گزار لیتا مگر ماں بہنوں کو کیا کروں۔''

بلونت: ''اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اپنی آزادی اور خودداری کی بھینٹ چڑھاؤ.....''

مکیش: ''تم تو ایسے یقین سے کہتے ہو کہ جیسے یہ جگہ ملی ہی جاتی ہے۔''

بلونت: ''میں ریاستوں کا تم سے زیادہ تجربہ رکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم نے معمولی سوجھ بوجھ سے بھی کام لیا تو یہ جگہ تمھیں مل کر رہے گی۔'' اور وہ ایک خاص انداز سے

مسکرایا۔

مکیش ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی ماتا جی نے اندر سے پکار کر کہا ''ارے مکیش، کچھ بندوبست ہوا؟''

مکیش نے بلونت کی طرف دیکھا۔ اس نے خاموشی سے پرس سے دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ مکیش ماتھے سے پسینہ پونچھتا ہوا اندر گیا اور ماں کو روپے دے کر فوراً پلٹ آیا۔ اسی دن اُس نے پرائیویٹ سکریٹری کے عہدے کے لیے درخواست بھیج دی۔

ایک ہفتہ بعد انٹرویو کی اطلاع ملی۔ ریاست کے وزیر اطلاعات ایک مقامی ہوٹل میں درخواست دہندگان کی شخصیت کا معائنہ فرمانے خاص طور پر بھیجے گئے۔ بیس پچیس امیدواروں کے ساتھ مکیش بھی اپنی باری پر کمرے میں بلایا گیا۔ کمرہ جدید طریقے پر سجا تھا اور اس میں بیٹھے تھے سوکھے سے ٹھگنے سے منتری جی۔ دھڑکتے ہوئے دل میں ان کی صورت دیکھتے ہی خوداعتمادی آ گئی۔ چھ فٹ کا خوبرو، خوش پوش، آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ ایسے ویسوں کو کیا دھیان میں لاتا ہے۔ مگر ریاستی وزیر بڑا جہاندیدہ تھا۔ اس نے مکیش کو اُٹھایا، بٹھایا، چلایا پھرایا۔ بالکل اس ڈھنگ سے دیکھا جس طرح گھوڑا خریدتے وقت اس کے کان، دم ہم دیکھتے ہیں۔ پھر اس نے انگریزی میں چند سوالات کیے۔ مکیش نے آکسفورڈ کے لب و لہجے میں جوابات دیئے۔ منتری جی تعظیماً اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انگریزی حاکموں کے خاص لب و لہجے میں بولی جا رہی تھی۔ ایسے وقت کرسی پر نہیں بیٹھا جا سکتا تھا۔ پھر بھی سکریٹری کو صرف زبان ہی تو چلانی نہیں پڑتی، قلم بھی گھسنا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ وہاں پچیس اور امیدواروں میں سے اسے ملا کر صرف پانچ کو تین خطوں کے جواب اور ایک تقریر لکھنے کا حکم دیا گیا۔ دو خط میں دواداروں کی طرف سے چندہ کی اپیل تھی۔ ایک میں ایک انجمن نے سرپرستی کی درخواست کی تھی۔ تقریر کے لیے موضوع تھا ایک ادبی جلسے کے لیے خطبۂ صدارت۔

مکیش نے چندے والے خطوں کے جواب میں لکھا کہ آپ ریاست کے محکمہ خیر و خیرات سے خط و کتابت کریں۔ اس کے نیچے قوسین کے درمیان ایک نوٹ میں لکھ دیا کہ اس جواب سے سرکارِ عالی کی خوش انتظامی کی بھی تعریف ہو جائے گی اور جود و سخا کی بھی۔ ہر جگہ

چرچے ہونے لگیں گے کہ سرکار نے خیر و خیرات کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کر رکھا ہے۔

سرپرستی چاہنے والی انجمن کو لکھا کہ سرکار عالی عمل کو قول پر ترجیح دیتے ہیں اور چونکہ انھیں ڈاکٹروں نے ریاست کے ضروری انتظامات کے علاوہ کسی نئے کام میں ہاتھ ڈالنے سے منع کیا ہے، اس لیے وہ کسی نئی انجمن کی سرپرستی قبول نہیں فرما سکتے۔ اس پر نوٹ لکھا کہ ''ہر انجمن والا یہی چاہتا ہے کہ وہ کسی بڑے آدمی کا نام سرپرستی میں حاصل کرے اور اس نام نامی کو اُچھال کر پبلک سے خوب چندہ وصول کرے۔ اس لیے سوائے چند مخصوص حالتوں کے سرکار کو کسی انجمن کی سرپرستی نہ قبول فرمانا چاہیے۔''

خطبۂ صدارت میں ادب برائے ادب کا نظریہ پیش کیا۔ اس کی تہذیبی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے اقدار کی توضیح کی، جگہ جگہ انھیں مختلف عظیم شخصیتوں کے اقوال و اشعار سے سجایا اور نئے ترقی پسندانہ رجحانات کی سختی سے مخالفت کی۔ نیچے نوٹ میں لکھا ''اصل مقالہ تو سرکار عالی خود ہی ڈکٹیٹ فرمائیں گے۔ یہ تو محض ایک خاکہ ہے، جو بغرض ملاحظہ گزارا جا رہا ہے۔

جب تحریری مقابلے کے نتیجوں کے سلسلے میں وزیر اطلاعات نے مختلف جوابات کا ہز ہائینس سے ذکر کیا تو ہر ہائینس بھی موجود تھیں۔ انھوں نے مکیش کے جوابات خود بہ نفس نفیس پڑھے اور انھیں بہت پسند فرمایا۔ خاص طور سے ہر جواب کے نیچے جو نوٹ دیئے گئے تھے انھیں بہت سراہا۔ ہز ہائینس نے بھی خوشنودی کا اظہار فرماتے ہوئے کہا ''یہ شخص ریاستوں میں ملازمت والی صلاحیت و ذہنیت رکھتا ہے۔''

پھر وہ وزیر اطلاعات سے بولے ''ان پانچوں نوجوانوں کو ہر ہائینس کے سامنے پیش کیجئے۔ ان کا فیصلہ آخری ہوگا۔''

چنانچہ مکیش ہر ہائینس کے سامنے بھی پیش ہوا۔ انھوں نے اسے نظروں میں تولا۔ بالکل اس طرح جس طرح پہلوان اکھاڑے میں اپنے حریف کے کس بل، پٹھوں اور بٹوں کو دیکھتا ہے۔ ان کے سوالات بہت دلچسپ تھے۔ ہر ہائینس نے دریافت کیا ''آپ کی شادی ہوگئی ہے؟''

مکیش نے کہا ''جی نہیں سرکار!'' اس نے ہر ہائینس کے چہرے پر ایک ہلکی سی چمک دیکھ کر شرارت سے اتنا اور اضافہ کیا ''میں ابھی اس قید سے آزاد ہوں!''

انھوں نے مسکرا کر پوچھا ''بیوی نہیں تو کوئی محبوبہ ہوگی؟''

مکیش نے جواب دیا ''سرکار، میرا معیارِ حسن ذرا بلند ہے۔''

انھوں نے مسکرا کر ابروؤں کی کمان چڑھا کر کہا ''کچھ یقین نہیں آتا کہ یورپ اور ایشیا کے ان تمام ملکوں میں جہاں کی آپ نے سیر کی ہے، آپ کو آپ کے معیار کی کوئی حسینہ نہ دِکھائی دی۔''

اُس نے جواب دیا ''جی، نظر تو آئی مگر اپنی دسترس سے باہر ہے!''

دُرِ دنداں کی جھلک دِکھا کر ارشاد ہوا ''آپ ہمیں بتائیں، ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی خواہش پوری ہو جائے۔''

مکیش نے گردن جھکا کر عرض کیا ''سرکار، یہ وہ مقام ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے میری زبان جلتی ہے۔ اس ذات کے سلسلے میں خواہش کے لفظ کا خیال ہی مصیبت ہے۔ وہاں تو صرف پرساد ہی کی گنجائش ہے۔''

وہ مسکرا کر بولیں ''تو وہ انسان کی جگہ کوئی دیوی ہوگی!''

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا ''جی ہاں سرکار، کچھ قبیل کی بات ہے۔''

اُس نے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا ''اچھا یہ بتائیے کہ اگر آپ کو یہ اسامی دریافت کرنے میں کوئی رُکاوٹ تو نہ پیدا ہو جائے گی!''

وہ بولا ''جی سرکار۔ دیوی کی پرستش کا بہ اطمینان موقع اس ملازمت کے بعد ہی مل سکتا ہے!''

ہر ہائینس نے اپنے پتلے پتلے ہونٹوں پر زبان اس طرح پھرائی جیسے وہ کسی شیریں چیز کا ذائقہ محسوس کر رہی ہیں۔ پھر انھوں نے نظریں نیچے کر کے پوچھا ''اچھا، یہ بتائیے کہ اگر ہز ہائینس کسی بڑے ہوٹل میں جا کر مقیم ہوں اور میں بھی ساتھ ہوں تو آپ قیام کے کمروں کا کیا انتظام کریں گے؟''

وہ بولا ''جی، پورا وِنگ کرایہ پر لے لیا جائے گا۔ ایک سرے پر ہز ہائینس کا کمرہ ہوگا، دوسرے سرے پر سرکارِ عالی کا۔ بیچ میں دونوں سرکاروں کے مخصوص خادم خادمائیں اور یہ غلام۔''

ہر ہائینس نے آخری سول سب سے عجیب کیا۔ انھوں نے پوچھا ''مسٹر مکیش فرض کیجیے میں کسی ایسے کام میں مشغول ہوں کہ اس وقت ہز ہائینس کا میرے کمرے میں تشریف لانا مناسب نہ ہوتو آپ اس کا فوری کیا انتظام کریں گے؟''

اس نے عرض کیا ''اگر مجھے بروقت اطلاع دے دی گئی تو میں ہز ہائینس کے لیے ایسی تفریحوں یا حادثوں کا بندوبست کردوں گا کہ انھیں سرکار کے کمرے تک جانے کا خیال بھی نہ آئے!''

ہر ہائینس نے خوشی سے تالی بجا کر کہا ''واہ واہ مسٹر مکیش، آپ یقینی ہر طرح ہمارے ہز ہائینس کے پرائیویٹ سکریٹری بننے کے لائق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے ہز ہائینس کے سوالات کے جوابات بھی اتنی ہی ہوشیاری سے دیئے تو آپ یقینی اس اہم عہدے پر مقرر کردیئے جائیں گے۔''

اس نے پیر پٹک کر بالکل سترہویں صدی کے مغربی طرز سے دست بوسی کی اور ہر ہائینس کی طرف پشت کیے بغیر پیچھے ہٹتا ہوا باہر نکل گیا۔

وہ اب ہز ہائینس کے سامنے پیش کیا گیا۔ انھوں نے سر سے پاؤں تک اس طرح نظروں میں تولا جس طرح چکوا بکرے کو آنکھوں میں تولتا ہے۔ پھر دفعتہً پوچھا ''پرائیویٹ سکریٹری کی صحیح تعریف سے واقف ہو؟''

اُس نے کہا ''میں کیا اور میرا علم ہی کیا، مگر جو کچھ میری موٹی عقل میں آتا ہے اس کے رُو سے پرائیویٹ سکریٹری اپنے آقا کا غلامِ خاص ہے۔ وہ سرکار کو ہر طرح کی آسائش پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ اس کا کوئی حصہ جسم اس کا اپنا نہیں ہوتا۔ وہ کسی عضو سے سرکار کے حکم کے بغیر اپنا نجی کام نہیں لے سکتا۔ نہ اپنی آنکھوں سے اپنے لیے دیکھ سکتا ہے، نہ کانوں سے اپنے لیے سن سکتا ہے، نہ اپنے ہاتھوں سے خود اپنے کام انجام دے سکتا ہے اور نہ اس کی زبان سرکار کی مدح سرائی کے علاوہ خدا تک کی حمد میں تر ہوسکتی ہے!''

کچھ دَم لینے کے لیے رُکا تو سوال ہوا ''اور اس کا دماغ؟''

وہ جھٹ سے بولا ''اس کی کنجی تو بالکل سرکار کے ہاتھوں میں ہوگی۔ جب ہز ہائینس چاہیں گے وہ مشین کی طرح کام کرے گا، جب سرکار نہ چاہیں گے وہ بند پڑا رہے گا۔''

ہز ہائینس مسکرائے ''یقیناً تم نے صحیح تعلیم پائی ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے نزدیک حسین کون ہے؟''

اُس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا ''جو سرکار کو بھائے! مہاراج کی جوہر شناس آنکھیں انتخاب کریں۔''

ہز ہائینس نے بڑے سرپرستانہ انداز سے اس کی پیٹھ تھپک کر فرمایا ''تم یقیناً میرے سکریٹری بننے کے مستحق ہو۔ بس ایک بات اور رہ گئی۔ ذرا انگریزی ایجنٹ سے بھی مل آؤ۔''

انگریز ایجنٹ گورنر جنرل کی خدمت میں بھی پیشی ہوئی۔ گرگ باراں دیدہ تھا۔ مگر اس نے مکیش کو لومڑی کی سی عیارانہ آنکھوں سے دیکھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ اُس نے پوچھا ''ہر ہائینس اور ہز ہائینس دونوں نے آپ کا تقرر منظور فرمالیا؟''

اس نے سر جھکا کر کہا ''جی، خیال تو یہی ہے!''

اُس نے مکیش کو غور سے دیکھا۔ پھر سوال کیا ''تمہاری نظر میں ریاست کا سب سے اچھا ملازم کون ہے؟''

مکیش نے کہا ''میری کیا بساط کہ میں ایسے اہم مسئلے پر کسی ذاتی خیال کا اظہار کروں!''

اُس نے سنجیدگی سے کہا ''نہیں، نہیں۔ آپ وزیروں سے بھی زیادہ اہم کام انجام دینے کے لیے مقرر کیے جارہے ہیں۔'' آپ کی رائے جاننا ضروری ہے۔''

مکیش بولا ''تو میری حقیر رائے میں تو ریاست کا سب سے اچھا ملازم وہی ہے جو ریاست کے ہر اہم معاملے کو ہز ہائینس کے کانوں تک پہنچانے کے لیے حضور کی طرف رجوع کر کے حضور کی رائے معلوم کرے اور مہاراج کو اپنی حسنِ تدبیر سے اسی فیصلہ پر پہنچنے میں مدد دے۔''

اس نے جھوٹی تیوری چڑھا کر پوچھا ''یہ کیوں؟''

مکیش نے کہا ''اس لیے کہ حکومت کرنے کا دماغ حضور کو عطا ہوا ہے اور ہز ہائینس کو صرف عیش کرنے والا مزاج!''

وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور مکیش کو رخصت کرتے ہوئے بولا۔

''مسٹر مکیش، میں آپ کو آپ کی تقرری پر مبارکباد دیتا ہوں۔ آکسفورڈ کی تعلیم آپ کے معاملے میں ذرّہ بھر بھی رائگاں نہیں گئی!''

جب وہ تقرری کا حکم لے کر گھر پہنچا تو بلونت موجود تھا۔ اس نے ہنس کر پوچھا ''کہو یار بازی جیت آئے؟''

مکیش نے خاموشی سے اس کی طرف کاغذ بڑھا کر کہا ''ہاں اپنا جسم ہی نہیں اپنا ضمیر بھی داؤ میں ہار کر آ رہا ہوں۔''

اور اس کی آنکھوں سے دو گرم گرم بوندیں ٹپک پڑیں۔

✿✿

پیٹ

جیٹھ کی شام تھی، لال لال سورج تاریکی کی گود میں اس طرح ڈوب رہا تھا جیسے دہکتا ہوا انگارہ راکھ کے ڈھیر میں آہستہ آہستہ چھپتا ہے۔ زمین بالکل اسی طرح تپ رہی تھی جس طرح تیز بخار کے مریض کا پنڈا جلتا ہے۔ مطلع اس طرح غبار آلود تھا جس طرح سندھ کے ریگستان کے مسافر کا چہرا بالو سے اَٹا ہوتا ہے۔ درختوں کی پتیوں اور ڈالوں سے وہی اضمحلال ظاہر ہوتا تھا، جو کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے چہرے پر شام کو پلٹتے وقت دِکھائی دیتا ہے، اور کھیتوں کی زمین سوکھ سوکھ کر اس طرح شگافتہ ہوگئی تھی جیسے دن بھر ننگے پاؤں چلنے والے کسانوں کے تلوے پھٹ جاتے ہیں۔ غرض ذرّے ذرّے پر ایک مایوسی، ایک تھکن، ایک افسردگی سی چھائی ہوئی تھی... ہر چیز جلی ہوئی، ہر شے مرجھائی ہوئی، ہر پودا سوکھا ہوا!

ایسی فضا میں کملا گھر سے نکلی۔ سترہ اٹھارہ برس کا سن۔ شباب پورے شباب پر! مگر چہرہ مرجھایا ہوا، گردن جھکی ہوئی، رفتار بتاتی تھی کہ خیال ہر قدم پر زنجیریں پہناتا ہے اور انداز کہتا کہ دماغ اُلجھنوں میں پھنسا ہے۔

وہ یونہی سر جھکائے گاؤں کی خاک سے بھری ہوئی کچی سڑک پر تھوڑی دُور چلتی رہی، اس کا چپل، اور اس کی سادی ساڑی کا نچلا حصّہ گرم خاک میں اَٹ گیا۔ اس کے پاؤں نے اس بھوبھل کی حدّت کو محسوس کیا۔ وہ غیر ارادی طور پر سڑک کی پگڈنڈی کی طرف مڑ گئی۔ سامنے باغ تھا، کسی اندھے بھکاری کے دیدوں کی طرح میلا، بے کیف، وحشت دلانے والا۔

کملا اِسی باغ میں گھس گئی، مگر باغ کے اندر گھر کے صحن سے بھی خراب ہَوا ملی۔ زہریلی، متعفن، راحت و سکون کی دشمن! کملا نے لب جھپ اسے بھی پار کیا۔ آگے ایک ٹیلا سا تھا، یہاں سے قصبے کے اس کچے تالاب کی حدیں شروع ہو جاتی تھیں جہاں گرمیوں میں چراغ

جلنے سے پہلے تک قصبے کے نوجوان اہیر اپنی بھینسوں کو نہلانا فرض سمجھتے تھے۔

گھر سے یہاں تک کملا کے آتے آتے آسمان سے وہ سُرخی بھی غائب ہو چکی تھی جو آفتاب اپنے ترکے کے طور پر روز چھوڑ جاتا ہے۔ اب اُس کی جگہ ایک ہلکی ہلکی، میلی میلی سی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی، تالاب مویشیوں اور چرواہوں سے خالی تھا، درختوں پر چڑیاں گھونسلوں میں چھپ کر بیٹھ گئی تھیں اور ہَوا میں سوائے دو ایک بھولی بھٹکی ابابیلوں کے کوّے تک اُڑتے نہ دکھائی دیتے تھے۔

کملا ٹیلے پر تو ذرا تیز قدم رکھتے ہوئے جلدی سے چڑھ گئی، مگر وہاں پہنچ کر وہ ایک ٹھونٹھ کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی اور ہانپنے لگی! وہ اس لیے نہیں ہانپ رہی تھی کہ اب وہ اپنے خطرناک مقصد کے بالکل قریب آ گئی تھی۔ اس کو اپنے سینے میں دَم رُکتا ہوا سا محسوس ہوتا تھا۔ اس لیے ٹھٹھری اور پیٹ کے درمیان کے ایک حصّے کو ایک ہاتھ سے دبا کر پھنسی ہوئی سانس کے اُوپر آنے میں آسانی پیدا کی، مگر منہ تک آ کر شاید وہ پھر اَٹکی، اِس لیے کہ اس نے دو بار زبان ہونٹوں پر پھرائی اور لعاب دہن گھونٹنے کی تین مرتبہ کوشش کی، پھر اُس نے ساری کے آنچل سے چہرے کا پسینہ پونچھا، اور تالاب کی طرف جھانک کر دیکھا... تاریکی میں ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پانی کی جگہ سیاہی سے بھرا ہوا ہے!

وہ ڈرتی، جھجکتی، آگے بڑھی۔ اس طرح بڑھی جس طرح اژدہے کی طرف اُس کی آنکھوں کی کشش سے مجبور ہو کر اس کا شکار بڑھتا ہے۔ بند بند کانپتا ہوا، جوڑ جوڑ بولتا ہوا! لڑکھڑاتی، ٹیڑھے ٹیڑھے قدم رکھتی، وہ کگارے پر آ کر ٹھٹکی۔ زندگی بڑی پیاری تھی، موت بہت ڈراونی!

کملا کا دل پھر دھڑکنے لگا۔ تالاب میں گرنے سے پہلے ہی وہ اپنے پسینے سے بھیگ گئی۔ خودکشی کے عزم اور موت کے ڈر میں پھر رسّہ کشی شروع ہوئی۔ یہ ذہنی کشاکش کچھ ایسی سخت تھی کہ کملا نے اپنے جسم میں حد درجہ کمزوری محسوس کی۔ وہ کانپ کر کگارے پر اُکڑوں بیٹھ گئی اور گھٹنوں پر سر رکھ کر آنکھیں بند کیے اُس بحث کو سننے لگی جو اُس کے دماغ میں جان دینے اور جان نہ دینے کے درمیان جاری تھی۔ ایک طرف بیوگی کی زندگی کی مصیبتیں ناجائز بچے کے پیٹ میں ہونے کی شرم، ماں باپ، خاندان والوں کا ڈر، اور ہم سنوں ہجولیوں میں سُبکی کی غیرت، دوسری جانب اپنے ہاتھ سے اپنی جان دے دینے کا بے سود ہونا، باکار اور سود مند

زندگی کو محض ایک خیالی شے، گناہ اور بے عصمتی کے لیے کھو دینا اور حال کی بدحالی کی وجہ سے مستقبل درخشندہ سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھنا، اور سوسائٹی، رسم پرست، قدامت پسند، بر خود غلط سوسائٹی سے بغیر بدلہ لیے ہوئے دُنیا سے چلا جانا! گویا کالج کا مباحثہ تھا، جہاں دونوں جانب کے طلبا پوری ذہانت اور قابلیت کے ساتھ بحث میں لگے تھے اور فیصلہ اس کے سر تھا۔ وہ جانبین کے دلائل سنتے سنتے گھبرا گئی۔ اُس نے اُکتا کر سر اُٹھایا۔ تالاب نے اُسے اپنے دیدۂ بے نور سے گھور کر دیکھا۔ وہ پھر کانپی اور کھڑی ہو گئی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی، غیر ارادی طور پر اُس کے پاؤں پیچھے ہٹے۔ قریب کے ٹھونٹھ پر سے اُلّو بولا، تالاب کے اِس کنارے پر سے کسی بوڑھے جغادری مینڈک نے 'غرغر' کی۔ اس نے بدحواسی میں اس طرف دیکھا، تالاب سے بہت دُور کسی دوسرے گاؤں کے ایک جھونپڑے میں ایک دِیا ٹمٹما رہا تھا، وہ اُسی طرف مڑ پڑی اور تالاب کے کنارے کنارے چل کر اُسی روشنی پر نظر جمائے روانہ ہو گئی!

کملا بائی نے اپنی کلکتہ والی عالی شان کوٹھی کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا، وہ ایک قیمتی ساڑی میں ملبوس، جواہر نگار زیورات سے مزیّن شام کی تفریح کے لیے جا رہی تھی، ڈرائیور کو نیچے موٹر لا کر لگا دینے کا حکم دیا جا چکا تھا، اسی کا انتظار تھا۔

موٹر تو نظر نہیں پڑا، مگر مختلف کارخانوں سے چھوٹے ہوئے مزدور اور بابو دکھائی دیے۔ ہر ایک کے چہرے سے اضمحلال، ہر ایک کی چال میں تھکن، ہر ایک کے کپڑے میلے، کوئی بیڑی پیتا ہوا، کوئی سگریٹ سلگائے ہوئے، کوئی چُرٹ منہ میں دَبائے ہوئے۔ مگر ہر ایک کے پاؤں سڑک پر ڈھیلے پڑتے ہوئے! ایسا جان پڑتا، پاؤں کئی کئی من کے ہیں اور خود سے اُٹھتے نہیں، بلکہ کھینچے جا رہے ہیں۔ ان مایوسوں کے مجمع کو ایک قلی بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ ننگے سر، ننگے پاؤں، ایک میلی سی پھٹی دھوتی پہنے، ایک بڑا سا جھوا لیے ہوئے۔ وہ ہر بابو جی کے پیچھے تھوڑی دُور دَوڑتا، بار بار کہتا "مجور ہجور! مجور ہجور!" اور پھر ایک سے مایوس ہو کر دوسرے کا آسرا ڈھونڈھتا۔

اس میلے کچیلے مزدور پر نظر پڑتے ہی کملا چونک پڑی۔ وہ ذرا سا مسکرائی، اِس لیے ملازم کو آواز دے کر حکم دیا کہ اس مزدور کو بلا لائے۔

مزدور بائی جی کے کوٹھے پر آیا، کچھ متعجب، کچھ خوش۔ تعجب اس کا کہ بائی جی کے یہاں

اس کے لیے کیا کام ہوسکتا ہے، خوشی اس کی کہ کام ملنے کی ڈھارس تو بندھی، آٹھ گھنٹے کی بے سود تلاش کے بعد دو چار پیسے مل جانے کی اُمید تو ہوئی!

یہاں جو پہنچا تو آنکھ ملتے ہی اُچک پڑا۔ بالکل اس طرح جیسے چلتے چلتے پاؤں میں ببول کا کانٹا گڑ جائے۔ کملا ہنس پڑی۔

''پہچان لیا، منگل؟''

''ارے تم کہاں، کملا؟''

''اور تمھارے کرتوتوں کے بعد ہوتی کہاں؟ گاؤں کے تالاب میں!'' منگل نے سر جھکا لیا۔

کملا بولی: ''پر مَیں تم سے ناخوش نہیں ہوں، تم نے دھوکا نہ دیا ہوتا تو مَیں بہت سے بہت ایک بیوہ کی طرح رو رو کر، سپید دھوتی باندھ کر، سر منڈوا کر، اپنی سسرال والوں کی جوتیاں کھاتی ہوتی! مگر آج دیکھتے ہو یہ سب سامان؟''

منگل نے رُک رُک کے کہا: ''پر... نرک کملا؟''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، بولی ''نرک منگل! ارے پگلے پیٹ سے بھی بڑھ کر کوئی نرک ہے!''

(کچھ ہنسی نہیں اور......۱۹۳۸ء)

تار بابو

بابو جی کو اس اسٹیشن پر آئے ہوئے کئی مہینے گزر گئے تھے۔ وہی اسٹیشن ماسٹر تھے، وہی اسسٹنٹ، وہی ٹکٹ بابو تھے اور وہی تار بابو۔ اسٹیشن بھی ویسا ہی تھا۔ مال گاڑی کے دو ڈبے کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ ایک اسٹیشن کا دفتر دوسرا بابو جی کا کواٹر۔ دن رات ملا کر دو گاڑیاں ادھر سے گزرتی تھیں اور صرف دو ہی بار اسٹیشن کھلتا تھا۔ آنے جانے والے مسافروں کی تعداد بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ کل ملا کر پانچ سات تک نمبر پہنچتا تھا۔ اس لیے کام تو بہت تھوڑا ہی تھا، مگر بابو جی کے لیے اس کالی کوٹھری میں بند رہنا یا روشنی جلانے والے مہراج سے باتیں کرنے کے سوا اور کوئی ذریعہ وقت کاٹنے کا تھا ہی نہیں۔ ان کی عمر کے بیس سال الٰہ آباد سے شہر میں گزرے تھے۔ جہاں اسکول کالج، یونیورسٹی کے علاوہ بائسکوپ بھی تھے، ناچ گھر بھی، اور کھیل کے میدان بھی۔ جہاں آئے دن میلے ہوا کرتے تھے اور گنگا کے گھاٹ پر صبح و شام پجاریوں ہی کا ہجوم نہ رہتا تھا بلکہ تماشائیوں کا بھی۔ اس طرح زندگی کے بعد اکیسویں سال میں بودھ پورا اسٹیشن کے بال گاڑی کے ڈبے میں دن رات بند رہنا قیدِ تنہائی سے کسی طرح کم نہ تھا۔ لیکن بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن کے لیے یہ مصیبت جھیلنا پڑ رہی تھی۔ آخر پیٹ بھرنے کو کھانا اور تن ڈھکنے کو کپڑا تو ضروری تھا۔ اس لیے تیس روپیہ ماہوار پر یونیورسٹی کی تعلیم چھوڑی، ہاکی اور فٹ بال کے میدان چھوڑے، گنگا کے کنارے جلوے چھوڑے، اور اس پنجرے میں بند ہونا منظور کیا۔ اب وہ تھے اور یہ کال کوٹھری۔ کوسوں نہ آدم نہ آدم زاد۔ سب سے قریب گاؤں تین میل پر تھا۔ یہاں مہراج کا مکان تھا۔ وہ اس لیے تو دونوں گاڑیاں دیکھ کر، اور شام کو ان کی لالٹین جلا کر، گھر بھاگ جاتا اور کبھی ایک بجے کبھی صبح ہوتے اسٹیشن پلٹتا تھا۔ اور وہ بیچارے صحرائے

افریقہ سا، دن اکیلے ہی طے کرتے اور ہمالیہ کی سی راتیں تنہا ہی کاٹتے۔ اس تنہائی نے ان کے دل میں ساتھی کی خواہش اس قدر پیدا کر دی تھی کہ وہ بعض وقت یہ دعا کرنے لگتے تھے کہ درختوں کے بھی زبان ہو جائے اور چڑیاں چوپائے بھی ان سے باتیں کرنے لگیں۔

انھوں نے دو جاندار پال رکھے تھے۔ ایک تو ان کے کوارٹر کے پیچھے ایک سوراخ میں چیونٹیوں کی ایک فوج تھی۔ انھوں نے اس کا نام 'سیوک دل' رکھا تھا۔ وہ صبح شام دونوں وقت تھوڑا سا آٹا، چاول یا شکر ان کے بل کے قریب ڈال دیتے تھے۔ پھر ان چیونٹیوں کی سرگرمی دیکھنے لگتے تھے۔ وہ بیتابی سے ان چیزوں کی طرف دوڑتیں ایک ایک دانے پر تین تین چار چار لپٹ جاتیں، پھر ان کو پیلتی، ٹھیلتی، ڈھکیلتی، لڑھکاتی اپنے بل میں لے جاتیں، ان کی حرکتوں کو وہ بغور دیکھتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک بھی خود ان چیزوں کے کھا ڈالنے کی کوشش نہ کرتی تھی۔ وہ اس نظارے کو دیکھتے دیکھتے سوچنے لگتے تھے کہ "اگر انسان بھی اسی طرح مل جل کر کام کریں۔ ہر فرد اپنی ذات پر جمہور کے فائدے کو ترجیح دے۔ ذرائع معاش اکٹھا کر کے ضرورت کے مطابق ہر ایک کو پہنچائے جائیں تو کتنا ہی اچھا ہو، نہ لڑائی ہو، نہ جھگڑا، نہ چوری نہ ڈاکہ! مگر جمہور کے لیے ہر فرد کی جدوجہد، اور وہ بھی اس قدر مسرت، مستعدی اور خلوص کے ساتھ، شاید بے عقل چیونٹیوں ہی کا حصہ ہے۔ عقلمند انسان تو خود غرضی و نفس پرستی ہیں میں مسرت ڈھونڈتا ہے۔

دوسرا جاندار، جو تار بابو کے پالتو ہونے کا فخر رکھتا تھا۔ وہ ایک مکڑی تھی۔ نہ جانے ہوا کا کونسا جھونکا اس زہریلے عیار کیڑے کو تار بابو کی مال گاڑی تک اُڑا لایا تھا۔ ایک دن جب صبح کی سنہری کرنوں نے ان کو گدگدا کے جگایا تو انھوں نے حسبِ معمول اپنی کال کوٹھری کی دیواروں پر نظر کی۔ انھیں چھت سے ملے ہوئے ایک کونے میں کوئی چیز چمکتی سی دکھائی دی۔ انھوں نے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ کالی دیوار میں چمک کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ گھبرا کے پلنگ سے اُٹھے اور اس کونے کی طرف بڑھے۔ دیکھا تو ایک چھوٹی سی مکڑی نے جالا بنا ہے۔ ان کا ہاتھ بے سوچے سمجھے جھاڑو کی طرف بڑھ گیا کہ جالے کو صاف کر دیں اور مکڑی کو مار گرائیں۔ مگر جھاڑو اٹھاتے اُٹھاتے مکڑی پر نظر پڑ گئی، کاہی جسم پر پتلی پتلی کالی لکیریں بھلی معلوم ہوئیں۔ ان کی صورت دیکھ کر خوف سے سمٹ کر جالے کے بیچ میں بیٹھ گئی اور اس طرح بے حس بنی تھی کہ

جان پڑتا تھا کہ بالکل بے جان ہے۔ تار بابو آپ ہی مسکرا دیئے۔ سر ہلا کر بولے: اچھا تو آج سے میری مہمان ہے! میں تجھے نہ ماروں گا، بلکہ کھانے کو دوں گا۔ پھر سر کھجا کر کہنے لگے، ''مگر تیرا کوئی نام تو ہونا چاہیے، آخر میں تجھے کس نام سے پکاروں گا۔'' پھر تھوڑی دیر تک مکڑی کی طرف دیکھتے رہے، اسے بھی اب کچھ بچنے کی اُمید ہو چکی تھی، جھاڑو اب ہاتھ میں نہ تھی، بابو جی اس کی طرف دیکھ دیکھ کر طرح طرح کا منہ بنا رہے تھے اور بڑبڑا رہے تھے۔ شاید خوش ہونے والے تھے! اس نے اپنے ننھے ننھے پاؤں پیٹ سے نکالے۔ ذرا لٹکتی ہوئی جال پر چلی۔ بابو جی ہنسنے لگے ''پاجی! ناچتی، تھرکتی ہے، میرے سامنے کولھے مٹکا کر چلتی ہے، جانتی ہے نا کہ میں بن بیاہا ہوں! مجھ کو پھنسانا چاہتی ہے بڑی شریر ہے تو! اچھا میں نے تیرا نام آج سے رکھا 'راج رانی'۔

کئی دن تو انھوں نے چیونٹیوں کی طرح 'راج رانی' کی خاطر تواضع میں روٹی اور چاول کے باریک باریک ٹکڑے جال میں اس لیے ڈالے کہ وہ بھی ان کے کھانے میں شریک ہو جائے مگر انھوں نے دیکھا تو اس نے ان کی چیزوں کی طرف توجہ تک نہ کی، وہ اپنا شکار خود ڈھونڈتی تھی، کوئی اُڑتا ہوا کیڑا، مکھی، مچھر، ہر روز اس کے جال میں پھنسا دکھائی دیتا تھا، اس لیے انھوں نے بھی مہمانداری کے فرائض ترک کر دیئے۔ ہاں اب ضرور روزمرّہ میں داخل ہو گیا کہ جہاں وہ تنہا ہوئے اور راج رانی سے باتیں کرنے لگے۔ وہ خاموشی سے ان کی ساری باتیں سن لیتی۔ ان کے طعنے بھی، ان کی پھبتیاں بھی، ان کا دردِ دل بھی اور ان کے طنزیہ فقرے بھی!

وہ کہتے: ''تیری حالت، راج رانی عجیب ہے، تجھے سوائے اپنے کسی سے کوئی مطلب نہیں تو بڑی عیار ہے اور اتنی ہی خودغرض، تو بالکل شخصی راج کرتی ہے، شخصی! چیونٹیاں غریب ایک دوسرے کے لیے جان دیتی ہیں، کبھی کوئی چیز اکیلی نہیں کھاتیں، مگر تو بالکل ان کے برعکس ہے۔ میں تجھے اتنا ہی نفس پرست وخودغرض پاتا ہوں جتنا کہ آج کل کا انسان! تجھے بس اپنے ہی حلوے مانڈے سے غرض ہے! مگر تجھ میں ایک بڑی خوبی ہے۔ تجھ کو اپنے ہی کام سے کام ہے، تو پرائے پھٹے میں پاؤں نہیں ڈالتی! اور اس حیثیت سے تو انسانوں سے کہیں بہتر ہے!''

بابو جی کی ساتھی کے لیے خواہش، تمنا بھوک اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اتفاق سے انھیں ایک تار ملا۔ یہ تار ان کے نام نہ تھا۔ بلکہ بودھ پور سے تین کوس کے فاصلے پر ایک بڑے زمیندار

رہتے تھے، ان کے نام تھا۔ تار میں لکھا تھا ''رادھا اتوار کو شام کو گاڑی سے پہنچے گی۔ سواری کا انتظام کر دینا۔ منوہر۔'' یہ تار انہیں ہفتہ کے دن پانچ بجے شام کو ملا۔ بابو جی نے تار پنسل سے لکھا اور اسے ایک پیلے لفافے میں بند کر دیا۔ مہراج کو پکارا۔ اتفاق سے وہ اس وقت وہاں موجود نہ تھا، ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور دفتر والی مال گاڑی میں قفل ڈالتے ہوئے کوارٹر والی مال گاڑی میں چلے گئے۔

وہاں 'راج رانی' اور 'سیوک دل' سے اس طرح باتوں میں مشغول ہوئے کہ تار کا بالکل خیال ہی نہیں رہا۔ جب شام کی ٹرین آئی اور چلی گئی اور مہراج بھی اپنا ڈنڈا سنبھال کے گھر چلتا بنا۔ تو ان کو تار یاد آیا۔ مگر اب کیا کرتے، اب دل میں چور آیا۔ کیوں نہ اسے کل دن میں بھی چند گھنٹے روک لیا جائے، رادھا آ رہی ہے، بظاہر اکیلی ہی ہوگی، ایک رات اس کال کوٹھری میں رہ سکتی ہے۔ چھ مہینے سے عورت کی صورت تک نہیں دیکھی۔ اس سے چند گھنٹے باتوں کا بہانہ تو ہاتھ آئے گا۔ لیکن اگر کہیں بجز گنوارن ہوئی تو؟ کیسے ہو سکتی ہے، ایسے گھروں میں جہاں تار کے ذریعہ آمد و رفت کی اطلاع دی جاتی ہے عورتیں گنوار نہیں ہوتیں۔ ان کو باتیں کرنے کا سلیقہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر جوان نہ ہوئی، بوڑھی کھوسٹ ہوئی؟ ذرا اس پر جھنجھلائے؟ تحت الشعور میں دوشیزہ پری جمال کی جو رومانی خواہش تھی۔ اسے بہت سختی سے دبایا۔ بوڑھی ہوگی تو ماں برابر ہے اور اگر جوان ہوئی تو بہن...!

خیالات نے پھر پٹری بدلی، تار کا منزلِ مقصود تک پہنچانا فرائض میں داخل ہے۔ زیادہ سے زیادہ ڈاکیہ کے ہاتھ بھیجا جا سکتا ہے۔ اس کی باری کب ہے؟ کل ہی تو! پھر کیوں نہ خاموشی اختیار کی جاوے؟ مگر مہراج تو اپنے گاؤں سے تار لے جانے والے آدمی کا بندوبست کر سکتا ہے؟ آخر کیوں اس کے ذریعے تار نہ بھیج دیا جائے۔ لیکن اگر تار مل گیا تو سواری کا انتظام ہو جائے گا اور کال کوٹھری میں چند گھنٹے باتیں کرنے کو بھی رادھا ٹکائی نہ جا سکے گی... رادھا نام بھی تو پیارا ہے؟ ایسا کہ جس نے سری کرشن بھگوان کا دل موہ لیا تھا، اس نام کی عورت خوبصورت ضرور ہوگی، وہ کالی اور بدصورت ہو ہی نہیں سکتی، اس کا جوان ہونا بھی ضروری ہے۔ جس کا رادھا نام ہو وہ بوڑھی نہیں ہو سکتی۔ وہ تو ہمیشہ بانسری کی اُمرتان سنا کرتی ہے، وہ کیسے بوڑھی ہو سکتی ہے۔ دفعتاً 'راج رانی' کی طرف پلٹے 'کیوں راج رانی، تمھاری کیا رائے ہے؟

گوپیوں کی سرتاج بھی کہیں بوڑھی ہو سکتی ہے؟ وہ بھی کیا سیتا ساوِتری ہے؟ ان بیچاریوں کو البتہ اتنے دُکھ بھرنا پڑے کہ اگر ایک ہی رات میں ان کے سیاہ بال سفید ہو گئے ہوں اور جوان سے بوڑھی ہو گئی ہوں تو کوئی تعجب نہیں، مگر رادھا جو کرشن پرستی کی مدرا پیکر سدا مدہوش رہی، جو ہمیشہ اپنے کنول سے پاؤں پر ناچتی، گاتی، چہکتی، دوڑتی پھری، وہ پری بھلا کیسے بوڑھی ہو سکتی ہے؟ وہ چاہے جتنے رُوپ بھرے، وہ ہمیشہ جوان ہی رہے گی!''

آٹے کی لوئی جو ہاتھ میں توے پر روٹی ڈالنے کو لیے ہوئے تھے وہ تھالی میں رکھ دی، دونوں ہاتھ مل کر ہاتھوں سے آٹا گرا دیا، پھر ''رادھے شیام، رادھے شیام، رادھے شیام!'' کہہ کر آنکھیں بند کر کے جھومنے لگے۔ پھر ایک بار چپ ہو کر ٹھنڈی سانس لی اور بولے ''کہاں ایسے بھاگ!'' انھوں نے جلدی جلدی پھنکنی کے ذریعے آگ کو پھونک پھونک کر بھڑکایا اور روٹیاں تیار کر ڈالیں۔ پھر تھالی میں ترکاری، دال، اور روٹیاں رکھیں اور لوٹا اور گگرا لے کر کنویں پر پہنچے۔ وہاں اشنان کیا اور جگت پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔

پلٹتے وقت گرمیوں کی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، معلوم ہوتا ہر چیز دودھ میں نہائی کھڑی ہے، ایسا آنند آیا کہ تھالی مال گاڑی میں جلدی سے رکھ کر باہر کھاٹ پر آ کر لیٹ رہے اور چاند سے آنکھیں لڑاتے لڑاتے سو گئے اور رات بھر رادھا اور کرشن کی لیلا کے خواب دیکھتے رہے۔

صبح کو اُٹھ کر جب اسٹیشن والی مال گاڑی میں گئے تو پیلا لفافہ نظر پڑا گویا دنیا کے سہاروں سے بے آس کوئی چینی انھیں حسرت بھری نظر سے دیکھ رہا ہے، پھر ان کے ہاں دل اور ضمیر کی لڑائی شروع ہو گئی اور اس کشتی میں ان کی وہی گت بنی جو دو پہلوانوں کی لڑائی میں اکھاڑے کی نرم مٹی کی بنتی ہے۔ پسینے سے بھیگ گئے۔ گھبرا کر مہراج کو آواز دی۔ اب کے اس نے سن لیا۔ آتے ہی بولا۔

''کیا ہے بابو جی؟''

''؟ کل شام سے ایک تار آیا ہے موہنی پور جانا ہے!''

''تو کل تو ڈاک بھی آئے گی، ڈاکیہ کو دے دیجیے گا۔''

''نہیں خاص آدمی سے جانا چاہیے۔''

''تو گاڑی دیکھ لوں، تو گاؤں میں جا کر کوئی آدمی ڈھونڈ لوں۔''

گاڑی آئی، چلی گئی اور مہراج بھی تار لے کر گاؤں سدھارے۔ مگر وہ اسٹیشن ہی والے ڈبے میں بیٹھے رہے۔ ضمیر کی فتح کا بدلہ اب دل لے رہا تھا۔ ایسا سنہری موقع ایک عورت کا ایک رات کے لیے میزبان بننے کا موقع اپنی بیوقوفی سے کھودیا۔ اب 'راج رانی' سے جا کر کیا کہیں گے اور 'سیوک دل' کو کیا منہ دکھائیں گے، صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں گیا تھا۔ مگر رسوئی کرنے کو جی ہی نہ چاہتا تھا، بیٹھے رہے، بیٹھے رہے، مگر کب تک؟ کوئی بارہ بجے گھبرا کر اُٹھے، دفتر کا دروازہ بند کیا، اور کوارٹر کی طرف بڑھے، ہوا کے ایک گرم جھونکے نے وہ طمانچہ رسید کیا کہ منہ لال ہوگیا۔ انھوں نے چونک کر اِدھر اُدھر نظر کی، چٹیل میدان سے معلوم ہوتا تھا۔ ہلکا ہلکا سا دُھواں اُٹھ رہا ہے۔ درختوں کی پتیاں سوکھ سوکھ کر گرجاتی تھیں۔ ان کی کھڑکھڑاہٹ سے اس طرح کی آواز پیدا ہورہی تھی جیسی چتا میں جلتی ہوئی لکڑیوں سے بگولے اُٹھتے اور میلوں دوڑتے ہوئے نکل جاتے تھے۔ جیسے وہ اپنے چکّر میں دنیا کو لے کر چکّی کے پاٹ کی طرح پیس ڈالیں گے!

وہ اپنے کوارٹر کا دروازہ کھول کر جلدی سے اندر گھس گئے۔ لوہے کا ڈبّہ اور وہ بھی بالکل بند تنور کی طرح گرم تھا۔ انھوں نے بھیڑے ہوئے دروازے کھول دیے۔ گرم گرم ہوا آنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہیں قریب ہی آگ لگی ہے۔ اور شعلے لپک لپک کر ان کو بھی جلا ڈالتے ہیں۔ ہوا کے رُخ والا دروازہ بند کیا۔ اب ذرا آرام ملا۔ لیکن دُھوپ کی چمک سے 'پائے نگاہ' میں آبلے سے پڑنے لگے۔ آنکھیں بند کر کے پلنگ پر لیٹے۔ جان پڑا لہکتے ہوئے کوئلوں پر لیٹ گئے۔ بستر الٹ دیا، کھرے پلنگ پر لیٹے۔ مگر چین نہ آتا تھا۔ جس کروٹ لیٹتے ادھر والا جلنے لگتا۔ سر میں دھمک شروع ہوگئی۔ گگرے کو دیکھا۔ اس میں پانی تو ضرور تھا مگر کھولتا ہوا۔ اسی کھولتے ہوئے پانی میں تولیہ بھگویا، اور سر اور شانوں میں اسے لپیٹ لیا۔ ذرا تسکین ہوئی۔ آنکھیں بند ہونے لگیں کہ ایک بار پیاس نے شدّت کی۔ صبح سویرے صراحی بھر کر رکھ دی جاتی تھی۔ آج ضمیر و دل کی کشش میں وہ بھی انھی کی طرح لب خشک رہی۔ اس لیے سوالِ آب پر ادھر سے بھی سوکھا ہی جواب ملا۔ اسی گرم پانی سے دو تین کلیاں کرلیں۔

غرض بھوک اور پیاس، گرمی اور لو سے خوب خوب تڑپے، بے چین ہوئے، کرب میں رہے۔ لیکن فرزندِ آدم ہونے کی وجہ سے کئی گھنٹے جھیل گئے۔ خدا خدا کر کے پانچ بجے اور

درختوں کے سائے لمبے ہونے لگے۔ کنویں کی جگت والا پکّڑ کا پیڑ خاص طور سے جائے پناہ نظر آیا۔ اپنی کال کوٹھری سے بھاگ اور پانی کھینچ کر گڑ کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر خوب غٹ غٹا کے لوٹا بھر پانی پی گئے۔ تھوڑی دیر دم لیا۔ ایک آدھ چیزیں جو گیا اور دیس میں گنگنائیں۔ پھر گگرے پر گگرا کھینچا اور جی بھر کر نہایا۔ اتنا نہایا کہ سردی سے جسم کانپنے لگا۔ اور ایسا کچھ محسوس ہوا کہ دل کا بوجھ ڈھل گیا۔

اتنے میں مہراج بھی آ گئے۔ تار بھیجنے کے بارے میں انھوں نے اطلاع دی کہ دوپہر تک کوئی آدمی نہ ملا۔ پھر لو کی وجہ سے کسی کی ہمّت نہ پڑی، اب گیا ہے، گاڑی آتے آتے وہاں پہنچ ہی جائے گا۔ تار بابو کے دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چلو اچھا ہی ہوا۔ اب اگر وہاں سے لوگ آئیں گے بھی تو دس گیارہ بجے تک اس وقت تک تو رادھا سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع مل ہی جائے گا۔

مگر یہ خوشی مہراج پر ظاہر نہ ہونے دی، اس کو تو ایسے ہی چہرے سے دیکھا جیسے بہت خفا ہیں کہ کیوں کسی طرح دُھوپ اور لو کا خیال کیے بغیر ہی کسی آدمی کو تار دے کر نہ بھیج دیا۔ مہراج تجربہ کار تھا۔ سامنے سے ٹل گیا اور لالٹینوں کی صفائی میں منہمک ہو گیا۔

شام کو گاڑی آئی، بابو جی نے لین کلیر گارڈ کو نہ دیا۔ بلکہ اسے ہاتھ میں دبائے تیسرے درجے کے زنانے ڈبے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہاں سے تو کوئی نہ اترا۔ لیکن سیکنڈ کلاس سے ایک عورت نے "قلی! قلی!" پکارنا شروع کیا۔

بابو جی نے پلٹ کر دیکھا اور گھبرا کر پوچھا "کیا آپ رادھا ہیں!"

اس نے ان کو تعجب سے دیکھا اور سر ہلا دیا۔ انھوں نے لپک کر ڈبّے کے کواڑ کھولے اور کہا 'اتریئے۔' ساتھ ہی اوپر چڑھ کر جلدی جلدی سارا اسباب اُتار دیا۔ ابھی یہ کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ اینگلو انڈین گارڈ لپکتا ہوا آیا۔ اس نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے لین کلیر لیا۔ اور 'یو فول' کہتا ہو سیٹی بجاتا آگے بڑھ گیا۔

گاڑی نے ایک پھریری لی، کنکھجورے کی طرح رینگی اور پھر گھڑ گھڑاتی ہوئی نکل گئی۔ اب وہ تھے، ان کے مال گاڑی والے دونوں ڈبے تھے، بوکھلائے ہوئے مہراج تھے، گھبرائی ہوئی رادھا تھی اور اُداس لٹا ہوا اسٹیشن تھا۔

انھوں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا: ''آپ کے ہاں تار تو بھیج دیا گیا ہے۔''

رادھا نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا مجھے روکنے کے لیے؟''

تار بابو اور سٹپٹائے۔ ''جی! جی! نہیں تو.... میرا مطلب ہے کہ زمیندار صاحب کے ہاں تار بھیج دیا گیا ہے!''

اس نے لبوں کا غنچہ بنایا اور کہا ''اوہ! میں سمجھی! مگر میں ان لوگوں کے آنے تک کیا کروں اس اسٹیشن پر تو کوئی ویٹنگ روم بھی نہیں!''

''جی یہ تو اسٹیشن بھی نہیں! مگر آپ میرے کوارٹر میں تشریف رکھ سکتی ہیں؟''

''وہ کہاں ہے؟'' رادھا نے پوچھا۔

جی، وہ کیا ہے، اسٹیشن کی بغل میں، دوسری مال گاڑی!''

وہ ان کو کنکھیوں سے دیکھ کر ذرا مسکرا دی۔ انھوں نے گھبرا کر مہراج سے کہا ''مہراج دیکھوان کا اسباب اٹھا کر کوارٹر کے پاس رکھو۔''

دس قدم میں وہاں پہنچے، جہاں اسٹیشن اور کوارٹر کی دونوں لالٹینیں اپنی اپنی روشنی میں ڈبوں کی اندرونی حالت 'اکس رے' کی طرح پیش کر رہی تھیں۔ بابو جی نے اسٹیشن کے گمے والے زینے پر چڑھ کر دونوں کاٹھ والی کرسیاں کھینچیں اور انھیں کوارٹر کے سامنے رکھ کر بولے ''بیٹھیے!'' اس نے بیٹھتے ہوئے کہا ''آخر وہ لوگ ابھی کیوں نہ آئے؟''

انھوں نے کہا ''تار بھیجنے میں دیر ہوئی۔ آپ کو تکلیف تو ضرور ہوئی۔ مگر مجھے آج بڑا آنند ملا۔''

اس نے ان کو ذرا تعجب سے دیکھا۔

انھوں نے چہرے سے پسینہ پوچھتے ہوئے کہا۔ ''جی پانچ مہینے سے اس جنگل میں اکیلا رہتا ہوں۔ بس کچھ گھنٹوں کے لیے مہراج کا ساتھ ہوتا ہے اس کے بعد...''

وہ ان کو غور سے دیکھ رہی تھی، بولی ''میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔''

انھوں نے کہا ''میری خوش قسمتی!''

اس کے چہرے پر ایک ہلکا سا رنگ دوڑ گیا۔ اس نے کہا ''آپ الٰہ آباد میں تو کسی کالج میں نہ پڑھتے تھے؟''

انھوں نے کہا۔ ''جی ہاں وہیں کا یستھ پاٹ شالا سے اِنٹرمیجیٹ پاس کیا ہے۔''

اس نے ایک خاص انداز سے کہا ''اور میں بالکے وِدیالا میں ہائی اسکول میں پڑھتی ہوں۔''

''تو پھر آپ نے پارسال مجھے اپنے ہاں کے سالانہ مباحثہ میں دیکھا ہوگا۔ میں ہی نے تو تقریر میں اوّل انعام پایا تھا۔''

اس نے کچھ جھینپتے ہوئے پوچھا ''آپ کا نام؟''

''شیام موہن۔''

اس نے گردن جھکا کر ہلکا گھونگھٹ نکال لیا۔

بابو جی کچھ شرمائے۔ پھر کچھ سوچ اور خوش ہو کر بولے ''ارے آپ بابو منوہر لال کی لڑکی نہیں؟''

اس نے اور بھی گردن جھکا کر سر ہلایا۔

وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

چاندنی اچھی طرح چھٹکی ہوئی تھی۔ گیدڑوں نے بولنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی سانپوں کی 'تی، تی' بھی سنائی دیتی تھی۔ ذرا رُک رُک کر جھینگر بھی 'ٹر، ٹر' کی رٹ لگا رہے تھے۔ تپتی ہوئی زمین ٹھنڈی ہو چکی تھی اور جلتی ہوئی ہوا بھیگ چلی تھی۔ فضا میں ایک ہلکی سی خوشبو پھیل رہی تھی۔

مہراج نے پاس آ کر کہا۔ ''بابو جی میں گاؤں میں جا کر دیکھوں تاکہ دیوی جی کے لیے سواری کہاری کچھ آ رہی ہے کہ نہیں!''

انھوں نے کہا ''ہاں ہاں جاؤ۔'' مگر اس کے جاتے ہی اپنے کو رادھا کے ساتھ اکیلا دیکھ کر اور گھبرائے۔ اس کی طرف دیکھا تو وہ کرسی پر اس طرح سمٹی بیٹھی تھی۔ جیسے حد سے زیادہ خوف زدہ ہے۔

اس نے ان کو ایک نظر دیکھا۔ پھر نگاہیں نیچی کر لیں۔ وہ بولی۔ ''مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔''

انھوں نے کوارٹر کے زینے کی طرف بڑھ کر کہا ''چلئے کنویں پر چلیں، مَیں پانی کھینچ دوں، آپ اشنان کر لیں۔''

''اشنان تو میں گھر ہی جا کر کروں گی۔''

''تو پھر منہ ہاتھ تو دھوڑا لیے۔''

یہ کہتے کہتے وہ رسی، گگرا اور لوٹا نکال لائے اور کنویں کی طرف بڑھے۔ رادھا بھی ساتھ ہولی۔ انھوں نے ایک گگرا پانی کا کھینچا۔ تھوڑا لوٹے میں ڈال کر اسے مانجنا چاہا رادھا نے لوٹے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ تکلیف نہ کریں میں مانجوں گی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے آپ مہمان ہیں۔''

''نہیں!'' اس نے کچھ خاص انداز سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نہیں۔'' انھوں نے گردن جھکا کر کہا۔ اس نے پھر ایک تیر نیم کش مارا۔ انھوں نے گھبرا کر کہا۔

''اچھا آپ ہی مانجیے۔''

رادھا نے لوٹا مانجا، انھوں نے پانی ڈالا۔ دھو کر رکھ دیا گیا۔ انھوں نے جلدی سے گگرے میں ہاتھ ڈال کر اسے مانج دیا۔ اور اسے دھو دھا جھٹ کنویں سے کھینچ کر باہر نکال لیا اور کہا:

''نہا ڈالیے نا۔ بڑا آنند ملے گا۔ ساری تھکن دُور ہو جائے گی۔''

''نہیں۔''

''ارے میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔''

''دھوتی تو بکس میں ہے۔''

''میں ابھی بکس لایا۔''

''نہیں میں آپ ہی بکس سے نکالے لاتی ہوں۔''

''میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ جب تک آپ اشنان کریں گی۔ میں اسٹوو جلا کر پوری ترکاری آپ کے لیے تیار کر دوں گا۔''

''کیوں تکلیف کیجیے گا، میرے ساتھ بہت سی مٹھائی، پوریاں، پکوڑیاں اور پھل ہیں۔''

''اچھا تو پھر اپنے لیے ہی پکاؤں گا۔ آج تو دن بھر نہیں کھایا ہے۔''

''تو میرے ساتھ کی چیزیں کھانے میں کیا کوئی پاپ ہے؟''

''نہیں میں اپنے ہی ہاتھ کی پکائی ہوئی چیزیں کھاتا ہوں۔''

اُس نے مڑ کر لوٹے اور گگرے کا پانی پھینک دیا، پھر وہ بولی:

"تو میں اپنے ہی ہاتھ کے کھینچے ہوئے پانی سے اشنان کرتی ہوں۔"

وہ مسکرا دیئے۔ "آپ خفا نہ ہوں، میں آپ ہی کے ہاں کی چیزیں کھاؤں گا۔"

اس نے حکم دینے والے لہجے میں کہا: "اچھا تو آپ منہ ہاتھ دھوڈالیے اور میرے لیے پانی کھینچ دیجیے۔ میں ساڑی لے کر آتی ہوں۔"

جب وہ ساڑی لے کر پلٹی تو تار بابو اپنے کوارٹر میں چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی انھوں نے اپنے ٹوٹے ہوئے ٹرنک سے تیل نکال کر سر میں ڈالا۔ اور لالٹین کی روشنی میں آئینے میں اپنا منہ دیکھ کر بال بنا ڈالے۔

وہ جب پلٹی تو ایک سادی سپید ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ گورا رنگ، دودھ کی دھلی ساڑی، چاندنی رات، معلوم ہوتا تھا عورت نہیں جوہی کا پھول ہے۔

تار بابو نے لمبی سانس لے کر کہا: "آج سے یہ کوٹھری سچ مچ کی کال کوٹھری ہو جائے گی۔" اس نے پلٹ کر ان کے ڈبے کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک حصہ چاندنی کی وجہ سے روشن تھا۔ وہ بولی "مگر کوٹھری میں تو اُجالا ہے۔"

تار بابو نے کہا "ہاں! مگر وہ بھی چاند ہی کے دم سے ہے، جہاں اس نے ادھر سے منہ پھیرا اور پھر اندھیرا گھپ!"

وہ کچھ شرما سی گئی۔ اس نے جلدی جلدی ناشتہ دان کھولا اور ایک پلیٹ میں ان کے لیے مٹھائی، پوریاں، ترکاری نکالی۔ انھوں نے کہا۔ "یوں نہیں۔" اندر سے تھالی اٹھا لائے اور کھاٹ پر بیٹھ کر بولے:

"دیوی جی آپ بھی یہی بیٹھیے۔ کرسیوں پر پلیٹ اور تھالی رکھیں گے۔ اور ہم دونوں ایک ساتھ کھائیں گے۔"

وہ جھینپی تو ضرور مگر بیٹھ گئی۔ پھر کرسیوں پر تھالی اور پلیٹ میں چیزیں نکالی گئیں۔ اور دونوں نے کھانا شروع کیا۔ وہ تو شرمائی سی چگتی ہی رہی لیکن انھوں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ اور پورا لوٹا بھر پانی چڑھا گئے۔ جب کھا پی چکے۔ تو رادھا نے پوچھا "آپ دن بھر یہاں کس سے باتیں کرتے ہوں گے؟"

تار بابو نے کہا۔ ''آیئے دکھاؤں، میرے دو دوست ہیں۔ ایک تو پورا سیوک دل، اور دوسری راج رانی!''

اس نے تعجب سے پوچھا ''راج رانی!''

انھوں نے کہا ''آیئے آپ سے تعارف کرادوں۔''

وہ کچھ ہچکچاتی ہوئی ساتھ ہولی۔ پہلے چیونٹیوں کے بل کے پاس لائے، وہ ابھی تک ان کی ڈالی شکر کے ریزے ڈھونڈھنے میں منہمک تھیں۔ تار بابو انھیں بڑی محبت سے دیکھنے لگے۔ بولے:

''دیکھیے، اتنی ننھی سی جان، ہوا کا ایک جھونکا آئے اور اُڑا کر لے جائے یا چینی بھر پانی ہو تو سینکڑوں ڈوب کر مر جائیں۔ چلنے والا سینکڑوں کو کچلتا پیتا گزر جائے اور خبر بھی نہ ہو۔ دل دیکھیے تو ہاتھی سے بڑا جان پڑتا ہے۔ اپنے لیے کچھ نہیں، دوسروں کے لیے سب کچھ، اتنا فرض شناس جاندار کہاں ملے گا؟''

وہ آہستہ سے بولی۔ ''تو یہ ہے آپ کا سیوادل!''

''ہاں۔''

رادھا نے منہ پھرا کر آنکھوں کا آنسو پی ڈالا۔

''آیئے اب آپ کو راج رانی دکھاؤں۔''

جب ڈبّے کے اندر داخل ہونے لگے۔ تو وہ گتّے کے زینے پر ٹھٹکی۔ بابو جی نے کہا ''ڈریئے نہیں۔ چلی آیئے۔ آپ کو سب کچھ دیکھ لینے کا حق ہے۔''

جب وہ شرماتی ہوئی اندر آئی تو انھوں نے لالٹین اُٹھا کر اپنی مکڑی دکھائی۔ نہ جانے عورت کو دیکھ کر یا آرام میں خلل پڑنے سے اس کی آنکھیں اس وقت بہت چمک رہی تھیں، جیسے راج رانی بڑے غصّے میں ہے۔ وہ بولے۔ ''ذرا اس کے تیور تو دیکھیے بالکل شاہی مزاج پایا ہے۔ کیسے گھور گھور کے دیکھ رہی ہے۔ بس ہر وقت یا تو آرام خاص میں ہوگی یا نئے جال بچھاتی ہوگی۔ بالکل رانی ہے رانی! اسے سلطنت بڑھانے کی فکر لگی رہتی ہے، اسے اپنے جال بچھانے کی! اور دونوں کا کام ہے، اپنا اُلّو سیدھا کرنا!''

رادھا مسکرا دی۔ اس نے اب پورے ڈبّے پر بھرپور نظر کی، ایک بسکٹ پر ایک دری

میں لپٹا ہوا بستر۔ ایک رسی پر دو ایک قمیص اور دھوتیاں، ایک کونے میں چار گموں کا چولھا، اس کے پاس ایک اسٹوو، توا اور دو تین بٹلوہیاں، بسکھٹ کے نیچے ایک کھڑاون اور ایک پرانا اسٹیل کا بکس، یہ تھی شیام موہن جی کی سلطنت!

دم اُلجھنے لگا، باہر نکل آئی۔ کرسی پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگی۔

کھاٹ پر وہ آ کر بیٹھے۔ پھر بولے۔

''کہیے آپ نے کیا طے کیا ہے؟''

''کاہے کے بارے میں؟''

''ماتا جی نے مجھ کو خط میں آپ کا نام نہیں لکھا تھا، صرف آپ کے پتا جی کا نام لکھا تھا۔ میں یہاں کی تکلیفوں میں سب کچھ بھول گیا تھا۔''

وہ شرارت سے آنکھیں چمکا کر بولی۔ ''تو آپ تو بھول ہی چکے۔''

''پر اب بھولنا بہت مشکل ہے۔''

وہ چپ رہی، پھر بولی۔ ''میں نے سنا تھا، آپ گانا بڑا اچھا گاتے ہیں۔''

''ہاں گاتا تھا، پر اب تو سوائے بروگ اور جوگیا کے کوئی دوسری چیز یاد ہی نہیں آتی۔''

''دیکھئے پھر آپ بھول چلے۔''

''ارے میں کان پکڑتا ہوں دیوی اب بھولنے، لفظ بھولے سے بھی زبان پر نہ لاؤں گا۔ اچھا کیا گاؤں؟''

''شیام کلیان!''

''بھگوان کلیان ہی کرے!''

وہ گا ہی رہے تھے کہ کہار فینس اُٹھائے ہوئے اور کئی آدمی لاٹھیاں اور لالٹینیں لیے آتے دکھائی دیئے۔ انھوں نے گانا روک کر کہا:

''لیجیے ڈولا آ گیا۔''

وہ کچھ سٹ پٹا کر اُٹھ کھڑی ہوئی، اور اس نے اسباب درست کرنا شروع کر دیا۔

انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بولے:

''تو ماتا جی کو کیا لکھ دوں، منظور رہے؟''

''میں کیا جانوں کہ آپ کیا لکھیں گے۔''

''اجی آپ اپنا فیصلہ بتایئے۔ یہاں کون نہ چاہے گا کہ چاند ہر وقت کالی کوٹھری میں اُجالا پھیلاتا رہے!''

''تو پھر اس کو آسمان سے توڑ کر اسی کوٹھری میں لٹکانا پڑے گا۔''

''ہاں، مگر وہاں تک پہنچنا ہی تو مشکل ہے!''

''کوشش کیجیے، دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔''

یہ کہہ کے وہ فینس میں سوار ہوگئی۔ جب کہاروں نے ڈولا اُٹھایا اور مزدوروں نے اسباب، تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو قریب بلایا، اور ان کے کان میں کہا:

''آپ کو راج رانی کو نکالنا پڑے گا۔ مجھے سوکن نہیں پسند۔''

وہ ہنس دیئے۔

کہاروں نے ''ہوں ہوں نیچا کھالا دیکھ کے'' کہنا شروع کیا اور تختِ رواں آگے بڑھ گیا۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری اور سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔

معلوم ہوتا تھا کہ دماغ میں تار لگا ہے۔ ٹکوٹرا، ٹکوٹرا، ٹک ٹک، ٹراٹکو، ٹک ٹک ٹک۔ ''آپ کو راج رانی کو نکالنا پڑے گا، مجھے سوکن نہیں پسند ہے!'' ٹکوٹرا، ٹکوٹرا، ٹک ٹک! ''مجھے سوکن نہیں پسند!''

وہ ہنسنے لگے، بالکل اس طرح جس طرح انار دانہ چھوٹتا ہے! پھر ایک بارگی رُک کر انھوں نے چاند کی طرف دیکھا۔ دونوں ہاتھ جوڑے اور جھوم کے کہا ''تیری لیلا ہے بھگوان! رادھے شیام! رادھے شیام! رادھے شیام!''

تریا چلتّر

ڈاکٹر ضیا نے بیوی کے تمتمائے ہوئے چہرے کو محبت سے دیکھا اور جلدی سے بولے ''یقینی یقینی تمھارا دل ہردوئی ایسے شہر میں گھبراتا ہوگا پھر سارا پروگرام خراب ہوا۔ مگر مَیں کیا کروں مجبوری ہے۔ اب اس طرح تو نہیں چھوڑا جا سکتا، ایسے موقعے دنیا میں کم ملتے ہیں۔''

بیگم ضیا کے وہ خوبصورت نازک ہونٹ جن کا رنگ پانوں سے نہیں بلکہ فیشن کے قلم سے شنگرفی ہو رہا تھا۔ کانپنے لگے اور ان کا وہ چہرہ جس کے گرد ضیا کی آنکھوں کو ایک ہالۂ نور نظر آتا تھا زرد پڑ گیا۔ انھوں نے بے بسی سے اپنے شوہر کے عزیز ترین دوست مسٹر نذیر بیرسٹر کو دیکھا، آنکھیں کہتی تھیں ''دیکھتے ہو میری جوانی کیونکر خاک میں ملائی جا رہی ہے!'' مگر آنکھوں کا پیام پورا نہ ہوا تھا کہ وہ اس انداز سے جھک گئیں جیسے ان میں آنسو آ گئے ہوں اور ان کے پینے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ ڈاکٹر ضیا کے دل پر چوٹ سی لگی۔ یہ غزالی آنکھیں اور آنسو! یہ گلاب کی پنکھڑی سے ہونٹ اور ان کا اس طرح کانپنا! یہ چاند سا چہرہ اور اس پر افسردگی و کبیدگی کے سیاہ بادل! ممکن تھا اب بھی یہ سخت دل مرد صبر کر جاتا، مگر دفعتاً بیگم نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی، سارا نظام عالم درہم برہم ہو گیا۔ گویا مکڑی کا جالا تھا کہ نسیم سبک سیر لے بھاگی۔

جلدی سے بولے۔ ''بھئی للہ تم اپنا دل نہ کڑھاؤ۔ مَیں نے یہ کہاں کہا کہ تم بھی نہ جاؤ۔

بیگم کے زرد چہرے میں سرخی کی تہہ پیدا ہونے لگی اور آنکھوں کی سیاہی میں اس طرح کی چمک ظاہر ہوئی جو ایک لمحہ کے لیے کوندے سے تیرہ و تار گھٹا میں ہوتی ہے۔ نذیر نے اس چمک میں اس خطرہ کی ایک جھلک دیکھی جو اس کے لیے مستقبل تاریک میں پوشیدہ تھا۔ اور کچھ گھبرا کر پہلو بدلا، بیگم ضیا کی سیرت کے بارے میں اس کے وہ تمام شبہات جو فرانس میں سب سے پہلی دفعہ ضیا کی منسوبہ ہونے کی حیثیت سے ملنے کے بعد ہی سے پیدا ہو گئے تھے اور جنھیں اس نے

ضیا کی بیوی ہونے کے بعد زبردستی دل سے نکال ڈالا تھا۔ پھر صف آرا دکھائی دینے لگے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے دوست کی بیوی میں وہ ساری اخلاقی خرابیاں موجود ہیں جن کے لیے فرانس دُنیا میں بدنام ہے۔ شادی کے قبل ضیا کے اور دوستوں کی طرح اس نے بھی اس امر کی کوشش کی تھی کہ ضیا اس کافر کے پھندوں سے چھوٹ جائے۔ مگر انہیں اس ناگن نے کچھ اس طرح ڈسا تھا کہ ان پر ذرّہ بھر بھی اثر نہ ہوا۔ عشق کا جن ضیا کے سر سے ان منتروں سے نہ اُترتا تھا نہ اُترا۔ البتہ برادری اور عزیز داری چھوٹی، خاندان والے اَن مل، بے جوڑ اور غیر کفو کی شادی سے ناخوش ہو کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ رہے۔ اور ضیا نے ایک نہ سُنی۔ وہ اپنی دانست میں فرانسیسی حوریہ سے شادی کر کے اور سارے اقربا سے بے تعلقی حاصل کر کے دُنیا ہی میں 'کسے رابا کسے کارے نہ باشد' کے مقولے کی بنا پر جنت کے مزے لوٹنے لگے۔

نذیر نے البتہ اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یورپ میں بھی ان سے ملتا رہا، اور جب ہردوئی میں آ کر انہوں نے مطب کھولا تھا وہ چھٹیوں میں فرخ آباد سے آ کر جہاں اُس نے اپنا بازار لگایا تھا مخصوص طور پر اُن سے ضرور مل لیا کرتا تھا۔ اسے ضیا سے خلوص تھا اور وہ محض شبہات کی بنا پر بیگم ضیا کو بُرا کہنے اور سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا، وہ اب کے بڑے دنوں کی تعطیل میں بھی انہیں لوگوں سے ملنے اور ان کے ساتھ لکھنؤ کی سیر کرنے ہی کی غرض سے آیا تھا۔

یہاں پہنچتے ہی یہ خبر ملی کہ دفعتاً ضیا کے سب سے زیادہ متمول سرپرست راجہ صاحب ریوڑی نگر حد سے زیادہ علیل ہو گئے ہیں، اور ضیا کو کم از کم آٹھ دن تک شب و روز انہیں کے یہاں رہنا ضروری ہے۔ اس نے اب کے آتے ہی یہ بھی محسوس کیا کہ بیگم ضیا کی آنکھوں میں اس کے لیے ایک خاص کیفیت ایک مخصوص انداز ہے جس میں ایمانداری، اخوت، وفاداری اور خلوص نہیں مگر مرتدی و مدہوشی، بے عزتی و بے حیائی کی پوری جھلک نمایاں ہے۔ اس کا دل ضیا کی نیکی، ضیا کی سادگی، ضیا کے اعتماد کا خیال آتے ہی کانپنے لگا۔ اسے غیر محسوس طور پر اُلجھن سی ہونے لگی۔ وہ غیر مرئی طور پر بیگم ضیا سے آنکھ ملانے سے گھبرانے لگا۔ وہ اس فکر میں مبتلا ہو گیا کہ وہ فرخ آباد کیونکر جلد سے جلد واپس چلا جائے۔

بیگم ضیا بھی اس کے تیور پہچان گئی۔ اُس نے اسی لیے ضیا کے سامنے ہی لکھنؤ چلنے کا ذکر چھیڑ دیا۔ مگر کچھ اس طرح کہ ضیا کو راجہ صاحب کا علاج کرنے اور زرِ کثیر حاصل کرنے کی خوشی کی جگہ بیوی اور نذیر کو لکھنؤ نہ لے جانے کا زیادہ رنج محسوس ہونے لگا۔ بیگم نے جب یہ کیفیت

محض اپنے انداز سے پیدا کرلی تو وہ اس تجویز کی طرف ضیا کو لگا لائیں جو اُن کی دلی خواہش تھی، مگر جسے وہ اپنے منہ سے پیش کرنا مصلحت نہ سمجھتی تھیں۔

ضیا ہنسنے لگے، ایک سیکنڈ بعد بیگم ضیا بھی اس ہنسی میں شریک ہوگئیں۔ نذیر نے جھینپ کر گردن جھکالی۔ ضیا نے اُس کی پیٹھ پر پیارے سے ہاتھ رکھ کے کہا۔ ''کیوں جی نذیر، میری بیوی تمھارے ساتھ بھی نہیں جاسکتیں، لوگ کیا کہیں گے؟ ایں؟'' اور پھر ہنسنے لگا۔ بیگم صاحب نے اپنا شیریں قہقہہ روکا اور اپنے حال کا ایک پھندا نذیر کی گردن میں بھی ڈال دیا۔ بولیں ''جی نہیں، نذیر صاحب یہ ڈرتے ہیں کہ لوگ ہنسیں گے۔ انھیں اپنی نیک نامی کی فکر ہے۔''

نذیر کو خواہ مخواہ بناوٹ سے کہنا پڑا۔ ''نہیں واللہ نہیں، مجھے بڑی مسرت ہوگی، مجھے محض آپ کا خیال ہے۔''

ضیا نے سادگی سے پوچھا۔ ''کیا؟''

نذیر کی حالت تو کچھ عجب گومگو کی تھی۔ وہ چپ ہو رہے۔ مگر بیگم ضیا نے موقع پاتے ہی شوہر پر آخری وار کردیا۔ چمک کے بولیں۔ ''یعنی لوگ کہیں گے اس فرنگن کا کیا اعتبار۔ وہ اپنے شوہر کے پیٹھ پیچھے نذیر سے دل بہلاتی ہے۔''

ضیا، کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہوگیا۔ بولے ''بدمعاش! کمینے! ان کی مجال کیا۔ کہیں میرے سامنے کوئی کہے تو چہرہ بگاڑ دوں۔ بدتمیز!''

بیگم نے افسردہ لہجہ میں کہا۔ ''خیر ان باتوں سے کیا فائدہ۔ مَیں اب خود ہی نہ جاؤں گی۔

ضیا نے کہا ''نہیں، واللہ تم کو جانا پڑے گا اور نذیر ہی کے ساتھ۔ جب میں تم پر اور نذیر پر بھروسہ کرتا ہوں تو پھر دوسروں کی کیا پروا!''

''مردود بکا کریں!''

پھر نذیر کی طرف پلٹ کر بولے۔ ''کیوں نذیر، ہے نہ بات ٹھیک؟ یا تم واقعی ان جاہلوں کی بیہودہ گوئیوں سے ڈرتے ہو؟''

نذیر کو مجبوراً کہنا پڑا۔ ''نہیں نہیں۔ مجھے ان باتوں کا خیال نہیں!''

ضیا نے جلدی سے ان کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا: ''شاباش! شاباش! کبھی ان ہنسنے والوں کی پروا نہ کرنا۔ ان جاہلوں کی باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ تم اپنی بھابھی کو لے جا کے لکھنؤ گھماؤ اور میں یہاں راجہ صاحب سے روپے اینٹھوں!''

نذیر زبان سے نہایت خوشی سے ''بہت بہتر!'' کہتا جاتا تھا مگر دل ہی دل میں اُن خطروں سے سہما جاتا تھا۔ جن کی ایک جھلک اُس نے بیگم ضیا کی ایک نظر میں دیکھی تھی، اور جن کی دُھندلی دُھندلی تصویریں اس وقت کی مسکراہٹ میں بھی دِکھائی دیتی تھیں!

نذیر جوان تھا، نا کتخدا تھا، مغرب کی ہوا کھائے ہوئے تھا، پھر بھی ضیا کا عزیز تھا۔ اس کا مخلص دوست تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ بیگم ضیا اسی کی ذات کو ایک نقصان دہ آلہ بنا کر اس رشتۂ اخوت کو نہ منقطع کر دیں جو ایک مدّت سے ان دونوں کے درمیان قائم تھا۔ اس خطرہ کو اس نے اسٹیشن پہنچنے پر مکان سے زیادہ اور گاڑی میں بیٹھنے پر پورے طور پر محسوس کیا۔ اسٹیشن پر تو صرف اتنا واقعہ ہوا کہ جب یہ تینوں ضیا، نذیر اور بیگم ضیا پلیٹ فارم پر کھڑے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے، تو بیگم نے نہایت ہی افسردہ لب ولہجہ بنا کر اپنے شوہر سے کہا۔ ''تمھارے ساتھ نہ چلنے سے اس سیر وتفریح کا کوئی لطف نہ آئے گا۔ ہر وقت دل تم ہی کو ڈھونڈتا رہے گا۔''

ضیا کی آنکھوں میں وہ کیفیت پیدا ہوگئی جو ہجران نصیب عاشقوں کے لیے مخصوص ہے اور وہ قدرے گلوگیر آواز میں بولے۔ ''پھر اگر تم کو ایسا ہی خیال ہے تو میں... راجہ کا علاج چھوڑ دوں۔ ساتھ چلوں؟''

نذیر نے موقع خاموشی کا نہ دیکھا۔ جلدی سے بول اُٹھا ''اچھا تو یہی ہوتا!''

بیگم نے شوہر کی آنکھ بچا کر آہستہ سے اسے ایک چٹکی کاٹی اور ضیا سے کہنے لگی۔ ''کاش ایسا ہو سکتا۔ لیکن میں تمھاری معشوقہ ہی نہیں بیوی بھی ہوں۔ مجھے تمھارے کام کا بھی خیال ہے۔''

یہ کہتے کہتے وہ شوہر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نذیر کے پاس سے دُور ہٹا لے گئیں۔ اس سے خدا جانے کیا کیا باتیں کیں کہ ضیا کا زرد چہرہ مسرت وخوشی سے گلنار ہو گیا۔ نذیر نے ان دونوں کے پلٹنے پر اس تغیر کو محسوس کیا اور اُس یقین کو دل میں لیے ہوئے کہ ضیا کی گرویدگی اسے بالکل اندھا بنا چکی ہے۔ اُس سے پوچھا۔ ''کیوں بھئی میاں بیوی میں کیا چپکے چپکے طے پا گیا؟ تم چلتے ہو یا نہیں؟''

انھوں نے مسکرا کر کہا: ''نہیں بھئی میں کہاں جا سکتا ہوں۔ مجھے راجہ کی توند سنبھالنی ہے، تم دونوں جاؤ سیر وتفریح کر آؤ۔''

بیگم ضیا نے بڑی محبت سے شوہر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کنکھیوں سے نذیر کی طرف دیکھا، آنکھیں کہتی تھیں "دیکھتے ہومیں اسے کیونکر انگلی کے اشارے پر نچاتی ہوں!"

آنکھوں کے اس اشارے نے گذشتہ چٹکی کے پیغام کے ساتھ مل جل کر نذیر کے سامنے خطرہ کی موہوم اور دُھندلی تصویر ہی نہیں پیش کی بلکہ خدشہ کو مجسم و مکمل بنا کے لاکر کھڑا کردیا۔ مگراب پس وپیش کا کیا نتیجہ تھا۔ وہ زبان ہار چکا تھا۔ اپنی بات سے پلٹ نہیں سکتا تھا۔ مگر اپنی بے بسی کا جتنا خیال آتا تھا اُتنا ہی اُس کا غصّہ ضیا کے بھولے پن اور بیگم ضیا کی چالاکیوں پر بڑھتا جاتا تھا۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ تنہائی ہوتے ہی وہ بیگم ضیا کو اتنا ڈانٹے گا کہ ان کا بھی جی خوش ہو جائے۔

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ گاڑی آ گئی اور فرسٹ کلاس کے ایک خالی ڈبّے میں یہ دونوں سوار ہوئے۔ نذیر نے جھٹ پٹ ایک سیٹ پر بیگم کا بستر قلی کی مدد سے لگا دیا اور دوسری سیٹ پر خود قبضہ کرلیا۔ اور ضیا سے ہاتھ ملا کر اور خدا حافظ کہہ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اُس ناصحانہ تقریر کو اپنے ذہن میں ترتیب دینے لگا، جو اس نے بیگم ضیا کے لیے ابھی ابھی سوچی تھی۔ انجن نے سیٹی دی۔ گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم سے چلی۔ اُس نے کھڑکی سے سر نکال کر ضیا سے مسکرا کر کہا۔ "پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔" اور پھر جملوں کی ترتیب میں مشغول ہو گیا۔

بیگم ضیا تا حدِ نظر کھڑکی پر کھڑی رومال ہلایا کیں اور شوہر کو اپنی محبت کا ثبوت دیتی رہیں۔ پھر مسکراتی ہوئی اپنی سیٹ کی طرف پلٹیں اور نذیر کے سامنے سے گزرتے گزرتے ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ لڑکھڑا کر گر پڑیں۔ نذیر کا سارا جسم اس مَس سے کانپنے لگا۔ بالکل اسی طرح کانپنے لگا جس طرح کسی راست باز مسلم کا دل پہلے پہل جام شراب اپنے سامنے دیکھ کر لرزاں ہو جاتا ہے۔ اس نے جلدی سے بیگم صاحبہ کو اپنی گود سے علیحدہ کیا۔ ان کا تنفس تیز ہو گیا۔ وہ زبان سے کچھ نہ بولیں۔ مگر ان کی آنکھیں دعوتِ عام بھی دے رہی تھیں اور نذیر کی اس 'مولویت' پر ہنس بھی رہی تھیں۔

نذیر نے ذرا جھلا کر کہا۔ "دیکھو بیگم ضیا تم میرے عزیز دوست نذیر کی بیوی ہو! اور وہ تم پر... اور مجھ پر... دونوں پر اعتماد کرتا ہے!"

اس پر وہ عجیب انداز سے ہنسیں اور یہ کہتی ہوئی کہ "اونہہ، تم بیوقوف ہو!" اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئیں اور انگریزی کے وہ اخبارات اور رسالے اُلٹنے پلٹنے لگیں جو ضیا نے راستہ کاٹنے

کے لیے ساتھ کر دیے تھے۔

راستے بھر بیگم ضیا نے کوئی ایسی بات پھر نہ کی جس سے نذیر کو یہ محسوس ہوتا کہ ابتدائے سفر میں کوئی خاص بات ہوئی تھی یا بیگم ضیا اس درمیان میں بھی اپنی چالوں میں مصروف ہیں۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ بیگم نے بجائے اس کے کہ وہ نذیر سے اس طرح کی خدمتیں لیتیں، جس کی بھابھیاں عام طور سے اپنے کو مستحق سمجھتی ہیں وہ نذیر ہی کی چھوٹی چھوٹی اس طرح کی خدمتیں کیا کیں جو ہندوستانی بیویوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ مگر بیگم ضیا کی اس سنجیدگی نے نذیر کے یہاں دو طرح کی شخصیتیں پیدا کر دیں۔ ایک شخصیت تو اس اَمر پر مسرور ہوتی کہ الحمدللہ کہ وہ دوستی اور عزیز داری کے سب سے پہلے مگر سب سے سخت امتحان میں کامیاب رہا۔ لیکن دوسری شخصیت رہ رہ کر دل میں چٹکی لیتی اور یہ خواہش پیدا کرتی کہ کاش اسی طرح کی چھیڑ چھاڑ چلی جاتی اور راستہ لطف سے کٹتا۔

اسٹیشن سے اُتر کر شام کے وقت ہوٹل تک پہنچنے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگی، لیکن ٹیکسی میں گھٹنوں اور شانوں نے اپنی حرکتیں شروع کر دیں۔ نذیر نے بڑا ضبط کیا۔ برابر دُور کھسک کے موٹر کے ایک گوشے میں ہو جاتا۔ لیکن ہمیشہ فاصلہ کم ہی ہو جاتا اور ہمیشہ معمولی سے ہچکولے پر سڈول ٹانگیں اس کی ٹانگوں پر آ جاتیں اور گورے گورے شانے اس کے شانے سے مس ہو جاتے۔ پھر بات بات پر ہنسی اس انداز کی کہ ہونٹ پیار کی دعوت دیتے اور آنکھیں محبت کی۔ نذیر اپنی اُبھرتی ہوئی حیوانیت کو بار بار یہی کہہ کر روکتا کہ یہ ضیا کی بیوی ہے۔ میرے عزیز ترین دوست کی۔ اس نے مجھ پر اعتماد کیا ہے... اس کو دھوکا دینا اس کے مال پر ہاتھ ڈالنا حد درجہ کمینہ پن ہے!'' اور ہر بار بیگم کو جھڑک دیتا۔ جھٹک کے اپنے پاس سے ہٹا دیتا لیکن پھر فاصلہ کم ہو جاتا اور پھر ایک نظر غلط انداز کے ساتھ ٹانگوں سے ٹانگیں اُلجھائی جاتیں، شانے پر شانہ رگڑا جاتا۔ ہوٹل پہنچے۔ رجسٹر میں نام لکھے جانے کی باری آئی۔ بیگم نے جلدی سے جھک کے کان میں کہا۔ فرضی لکھو' میاں بیوی' مگر نذیر نے انھیں بڑے غصّے سے دیکھا اور اپنا ان کا نام علیحدہ علیحدہ صاف صاف لکھا اور دو کمرے لیے۔ انھوں نے دونوں کے نام رجسٹر میں دیکھ کر اس پر ایک تیز نگاہ ڈالی اور مسکرا کر بولیں۔ ''اچھا آپ اسباب اُتروائیے، مَیں ذرا کمرے دیکھ لوں۔ اس نے اسباب اتروایا۔ بیرا نے بتایا۔ میم صاحبہ نے اُوپر کے حصّے میں کمرے پسند کیے ہیں۔

زینہ پر چڑھے، وہ کمروں کے سامنے انتظار کرتی ملیں، کمرے دکھائے، دونوں ملے ہوئے تھے اور دونوں کے درمیان دروازہ بھی تھا!

اس نے جھپٹ کے دروازے میں اپنی جانب کی زنجیر لگادی۔ وہ مسکرائیں اور جب بیرے کمروں میں اسباب رکھنے لگے تو نہایت متانت سے اس دروازے کو کھول کے اپنے کمرے میں سب کے سامنے چلی گئیں اور اپنی جانب سے کنڈی چڑھا دی۔ پھر کواڑ کھول کے جھانک کے بولیں ''کہیں چلو گے یا نہیں؟'' نذیر نے کہا ''بس غسل کر کے کپڑے بدل لوں ابھی چلا۔'' جب حمام سے نکل کر انگریزی کپڑے پہننے لگا تو نیت بدلی۔ مشرقیت کی جگہ مغربیت نے لے لی۔ بھولی ہوئی تعلیم پھر یاد آنے لگی۔ کسی نوجوان خاتون کی محبت کو یوں ٹھکرا دینے کے کیا معنی ہیں؟ یہ تو مردانگی کے سراسر خلاف ہے۔ مگر دوستی اور شرافت؟ اُونہہ، ان کا کہاں خیال جاتا ہے اور پھر اس میں خرابی ہی کیا ہے؟ علم الحیوان اور علم الابدان کے ماہرین تو اس میں کوئی خرابی ہی نہیں سمجھتے، اخلاقیات اور اخلاق؟ اخلاق تو اضافی چیز ہے۔ آخر روس میں علانیہ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں خفیہ طور پر یہی ہوتا ہے یا نہیں؟ لیکن... ضیا کا اعتماد؟ تو کیا اُن کے آنکھیں نہیں ہیں؟ انھیں کیوں نہیں سجھائی دیتا؟ اور پھر انھیں کیا معلوم ہوگا؟ انھیں کیا خبر؟ کچھ نہیں۔ یہ اپنی کمزوری ہے۔ تربیت... مشرقی تربیت کا نتیجہ، اُونہہ، کچھ بھی ہو۔ بھرا ہوا جام جب سامنے ہو تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اور دودھ اور شہد کا کاسۂ لبریز یوں بغیر چکھے نہیں رہا جاسکتا۔''

ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ کھلا۔ بہت ہی آہستہ سے کھلا اور بیگم ضیا آشفتہ مو آدھا تولیہ جسم میں لپیٹے اور آدھے سے جسم خشک کرتی ہوئی کھڑی دکھائی دیں۔ نذیر نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمروں کے دروازے بند تھے۔ ان کے علاوہ کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا سا آنے لگا۔ لڑکھڑا کر اس مجسمۂ شباب کی طرف چلا۔ دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک ہلکی سی ہنسی کے ساتھ دروازہ بند کرلیا گیا اور آواز آئی۔ ''مولوی صاحب ٹیکسی منگواؤ۔''

نذیر نے کانپتے ہاتھوں سے ٹائی درست کی، سیفٹی پن لگائی۔ کمرے سے باہر نکل کر باہر سے ٹیکسی لانے کے لیے کہا اور کوٹ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر مٹھیاں بند کرلیں۔ رگ رگ پھڑک رہی تھی۔ شرافت وعزّت کے خیالات دماغ سے محو ہو رہے تھے۔ تہذیب جدید

مشرقیت کو کچلے ڈالتی تھی۔ حیوانیت ہی حیوانیت کا بول بالا تھا۔

بیگم ضیا ملبوس ہوکر نکلیں۔ موٹے مخملی لبادے کے نیچے ایسا گاؤن تھا کہ جسم کی خوبصورتیوں کو بجائے چھپانے کے عریاں کرتا تھا۔ پھر چال متوالی، نگاہیں مست اور ہونٹ مسکراتے ہوئے۔ قریب آ کر اس ادا سے کھڑی ہوئیں کہ انداز کہتا تھا۔ ''اب کہو! کیا اب بھی مجھ سے مولویت کروگے؟ کیا اس جسم کی لطافتیں تم سے اب بھی پوشیدہ ہی رہیں گی؟ دیکھو میری جانب دیکھو... مالک کی طرح دیکھو... یہ بھرے بھرے بازو... یہ گدرایا ہوا جوبن۔ یہ لچکتی ہوئی کمر۔ یہ سب تمھارے ہی لیے ہیں۔ ہر شخص کو یہ چیزیں نصیب نہیں!''

نذیر نے دیکھا۔ جس طرح وہ چاہتی تھیں اُسی طرح دیکھا، اس کا دل بلیوں جیسے اچھلنے لگا۔ اس کی پیشانی پر ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے۔ اس کا ہاتھ بیساختہ بیگم کی طرف بڑھ گیا اور وہ اپنے ہونٹ چاٹنے لگا۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ کے ہنسیں اور آہستہ سے بولیں۔

''اب سمجھ میں آیا کہ تم نے اب تک کس طرح کی حماقت کی؟''

اُنھوں نے کہا: ''بیگم ضیا...'' اور پھر چپ ہوکر گردن جھکالی۔

اسٹیشن سے ہوٹل تک آنے میں اور ہوٹل سے سینما تک جانے میں قریب قریب ایک ہی سے واقعات پیش آئے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب بیگم کے قریب کھسکنے سے نذیر دُور نہ کھسکتا اور نہ ٹانگ اور شانے کی رگڑ سے گھبرا اُٹھتا تھا۔ مگر ہاں اتنا ضرور تھا کہ آنکھیں اب تک رحم و کرم کی التجا کر رہی تھیں اور زبان سے جب کوئی بات نکلتی تو یہی ہوتی کہ ''خدا کے لیے، خدا کے لیے! تم ضیا کی بیوی ہو!''

وہ اس کے اس کہنے پر کبھی ہنس دیتیں کبھی منہ چھپا کر دُور کھسک کے بیٹھ جاتیں۔ اور کبھی آہستہ سے چٹکی کاٹ لیتیں!

اسی طرح پرنس آف ویلز سینما پہنچ ٹکٹ لیے اور اُوپر والے درجے میں جا کر دونوں بیٹھے ''مٹر و گولڈوین'' کی فلم تھی۔ ادرل ''بلین گش'' کا کام۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے ماحول کو بھول کر تمثال کے اعلیٰ نمونہ میں محو ہوگئے۔ مگر اندھیرے میں بیگم ضیا کا ہاتھ نچلے نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ کبھی شانوں کو آہستہ آہستہ دباتا تھا۔ کبھی کانوں سے کھیلتا تھا۔ کبھی گردن اور کالر کے درمیان ہلکے پھلکے پردوں کی طرح دوڑتا پھرتا تھا۔ نذیر پہلو بدلتا۔ آہستہ سے ہاتھ میں ہاتھ لے کر اُن کے

زانو پر رکھ دیتا۔ اور نظر تماشے پر جمائے رکھتا تھا۔

بارے چار حصّے ختم ہوئے اور انٹرول ہوا۔ بیگم ضیا کی فرمائش پر بار روم جانا پڑا۔ وہاں ایک بڑے گملے کی آڑ میں سب سے علیحدہ دونوں بیٹھے۔ بیرہ نے آکر پوچھا۔ حضور کیا لاؤں؟'' قبل اس کے کہ یہ کچھ کہیں بیگم بولیں ''شیمپین کے دو پیگ (چھوٹے گلاس) وہ سلام کر کے اُدھر روانہ ہوا۔ اِدھر نذیر نے توبہ نہ توڑنے پر اصرار کیا۔ وہ مسکراتی رہی اور خاموش سنا کی۔ یہاں تک کہ شراب آ گئی۔ بیگم ضیا نے دونوں جام اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ بیرا دوسری طرف چلا گیا۔ انہوں نے ایک جام میں منہ لگایا۔ ذرا سی چکھی پھر اُن کی طرف بڑھا کر بولیں ''میرا ہی خون پیئے جو نہ پیئے!'' نذیر نے پھریری لی اور جام ہاتھ سے لے کر چڑھا گیا۔ بیگم نے پھر شراب منگائی اور خود بھی پی اور انہیں بھی اصرار کر کے اور طعنے دے دے کر پلائی۔ پھر ناچ ہونے لگا۔ اپنے ساتھ ناچنے پر مجبور کیا اور اس طرح نذیر سے چپک کے ناچیں کہ اس کے جسم میں آگ سی لگ گئی۔

جب تماشا پھر سے شروع ہونے پر یہاں ناچ ختم ہو گیا تو تماشا نہ دیکھا بلکہ سینما کی بغل والے ہوٹل میں دونوں چلے گئے۔ وہیں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ تھوڑی اور شراب پی اور خوب جی بھر کے ناچے۔ جب وہاں سے گیارہ کے قریب نکلے تو نذیر نے پوچھا۔ ''اب!'' وہ بولیں۔ ''ابھی کارنیوال چلیں گے۔'' تانگہ کیا کارنیوال آئے۔ وہاں بیگم نے پھر پی اور نذیر کو بھی پلائی۔ وہیل پر ساتھ لے کر بیٹھیں پھر نقلی گھوڑوں پر سوار ہوئی۔ پھر ان پر سے اُتر کر جوا کھیلنے لگیں۔ نذیر ہر داؤں ہارتا۔ وہ ہر بار جیتیں۔ جب رات بھیگ چلی اور دو کے قریب ہوئے تو بولیں۔ ''چلو اب چلیں۔''

تانگے پر بیٹھ کے ہوٹل پہنچے۔ وہاں سناٹا تھا۔ جاڑے کی راتیں۔ اور دو کا عمل ہر شخص سو رہا تھا۔ بیرے، خانساں، سب کے سب اپنے اپنے کملوں میں گٹھری بنے پڑے تھے۔ کسی نے ان دونوں کے آنے کی پروا نہ کی۔ بیگم نے نذیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا اور اس کی جانب دیکھ کر مسکرائیں۔ ان کا ہر موئے بدن دعوت دے رہا تھا۔ اپنے کو خوشی خوشی پیش کر رہا تھا۔ اس کی رگ رگ ان کی موجودگی کو محسوس کر رہی تھی۔ انگڑائیاں آ رہی تھیں۔ مستی سے ہر نگاہ چہرے پر بکھر رہی تھی۔ بیگم نے آہستہ سے ہاتھ دبایا۔ اور خاموشی کے لیے انگلی گلابی ہونٹوں پر رکھی۔ پھر دبے پاؤں ان کو لیے ہوئے زینے پر چڑھنے لگی۔ دونوں کمرے کے سامنے پہنچے۔

نذیر نے اپنے کمرے کا قفل کھولا۔ بیگم کچھ پیچھے تھیں۔ اس نے اُلٹا ہاتھ بڑھا کر ان کی کمر میں آویزاں کر دیا اور انھیں اپنے ساتھ اندر گھسیٹ لیا۔ پھر اس دلآویزی اور دلربائی کے مجموعے کو ایک بار سمیٹ کر سینے میں بھر لیا اور ہونٹوں اور آنکھوں کے سینکڑوں پیار لے ڈالے۔ وہ آہستہ سے ہنسیں اور بولیں جلدی نہ کرو۔ مَیں ابھی آئی ذرا تمھارے قابل بن لوں!''

نذیر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس کے ہاتھوں سے ناگن کی طرح پھسل کے نکل گئیں اور اپنے کمرے میں درمیانی دروازے کو کھول کے چلی گئیں۔ نذیر کی گردن میں کالر تنگ محسوس ہونے لگا۔ اس نے تاریکی میں اُسے اُتارنا شروع کیا۔ لیکن دُہرا نشہ تھا اور پھر تاریکی۔ ہاتھ کام نہ دیتے تھے۔ اس نے روشنی کا بٹن دبا دیا۔ کمرہ جگمگا اُٹھا اس نے دو تین مرتبہ آنکھیں چھپکائیں اور آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر کالر اُتارا، ٹائی کھولی۔ اور پھر کوٹ اُتارا۔ پھر پتلون اُتار کر شب خوابی کے کپڑے پہنے۔

نشہ میں مسکراتا جاتا تھا۔ اور آپ ہی آپ آہستہ آہستہ کہتا جاتا تھا۔ ''واقعی میں بیوقوف تھا... یقینی احمق تھا... شرافت... عزّت... خلوص... اعتماد... سب حماقت... سراسر بے وقوفی... ضیا... دوست... عزیز... لاحول ولا... ایسی سادگی... کا یہی نتیجہ ہے۔!''

یہی کہہ رہا تھا کہ دفعتاً میز پر تار کا لفافہ دکھائی دیا۔ نشہ میں لفافہ پر پنسل سے لکھا ہوا پتہ اور نام صاف نہ پڑھا جاتا تھا۔ پھر بھی استعجاب سے اُٹھایا۔ حرف دُھندلے معلوم ہوئے۔ آنکھیں ملیں۔ لفافہ کھولنا چاہا کہ آہستہ سے درمیانی دروازہ کھلا۔ بیگم ضیا تارِ عنکبوت سے باریک تر کپڑے میں لپٹی ہوئی سر سے پاؤں تک معطر کمرے میں داخل ہوئیں وہ ان کی طرف پلٹا۔ تار ہاتھ میں لیے ان کی طرف ایک قدم بڑھا۔ وہ بولیں۔ ''پیارے کہو اب میں کیسی معلوم ہوتی ہوں۔''

اس نے تار اُٹھایا اور کہا ''یہ تار!''

انھوں نے کہا۔ ''اونہہ ہوگا، پھینکو بھی۔ اس وقت اور تار وار!'' یہ کہتے کہتے باہیں اُس کی گردن میں حمائل کر دیں۔ لیکن نذیر کے یہاں شراب کے نشہ نے کام کیا، ضد پیدا ہو گئی۔ اُس نے پھر کہا ''نہیں نہیں تار... پڑھ لینا چاہیے۔ اور لفافہ اپنے ہاتھ سے کھول ڈالا۔ پہلے تو حروف دھندلے معلوم ہوئے۔ اس نے پھر آنکھیں ملیں۔ اور دماغ پر زور دے کر انہیں پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔

دونوں تار ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے۔ جیسے جیسے نذیر پڑھتا جاتا تھا اس کی مدہوشی، سرشاری، بوالہوسی غائب ہوتی جاتی۔ چہرے کی سُرخی زردی میں بدلتی جاتی تھی اور نشہ سے مخمور آنکھیں خوف سے تکلیف سے پھیلتی جاتی تھیں۔

بیگم ضیا بھی ساتھ ساتھ پڑھ رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئیں کہ صیدِ نوگرفتار ہمیشہ کے لیے دام سے نکل گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ خواہش، یہ کشش اور یہ محبت زندگی بھر کے لیے نفرت، حقارت اور عداوت میں بدل گئی۔ مگر پھر بھی نفسانی خواہش اور بوالہوسی کے وفور نے اپنے جسم کو نذیر کے جسم سے مس کرنے پر اور اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں کا بوسہ لینے پر مجبور کیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے نذیر کے ہونٹ پر ان کے لب لعلیں نہ تھے بلکہ بجلی کے مثبت و منفی تار اس لیے کہ وہ ایک بار اُچک پڑا اور اُنہیں بڑے زور سے دھکیل کے بولا۔ ''اب اس کے بعد بھی... خدا کی قسم میری بُری نیت کا مجھے پھل ملا ہے... خدا یقینی دیکھ رہا تھا۔ اس نے سخت ترین سزا دے دی، مگر کاش ہمیں یہ سزا ملی ہوتی جو اس کے مستحق تھے!''

بیگم ضیا تھوڑی دُور پر گری پڑی تھیں۔ نذیر کھڑا جھوم رہا تھا۔ اس کے نتھنوں سے شعلے آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور اُنگلی اس تار کی طرف اشارہ کر رہی تھی جو دونوں کے بیچ میں فرش پر پڑا تھا۔ جن الفاظ نے بیگم ضیا کی مقصد براری میں یہ رُکاوٹ ڈال دی وہ یہ تھے۔
''ڈاکٹر ضیا کی موٹر اسٹیشن سے پلٹتے وقت ایک لاری سے ٹکرا کر چور چور ہوگئی۔ موت فوراً ہوئی تجہیز و تکفین کے لیے آپ لوگوں کا انتظار ہے۔''

ٹھاکروں کی ٹھکرائیاں

بزرگوں نے ٹھیک ہی کہا ہے ''زن، زمین، زر، فساد کی جڑ۔'' سچ ہے ساری خرابیاں، سارے جھگڑے انہی کی بدولت۔ مہابھارت ہو کہ لنکا کی فتح، ٹرائے کی لڑائی ہو کہ جنگ ہفت سالہ، پہلی جنگ عظیم ہو کہ دوسری، سب کی جڑ یہی بِس کی گانٹھ۔ جب تک اپنے ملک میں زمینداری رہی ہر برسات میں کھیتوں کے تردّد میں ہر گاؤں میں خون خرابہ ہوتا۔ کھیتوں میں جیسے جیسے اناج اُگتا ویسے ویسے پھوٹ بھی اُگتی اور لہلہاتی رہتی۔ اب جبکہ زمینداریاں چلی گئیں اور سب کچھ کسانوں کے ہاتھ میں ہے، اسی طرح چپّے چپّے پر لڑائی ہے، وہی کھیتوں کی مینڈھوں کے گز دو گز آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے پر بلّم اور بندوقیں نکلتی دِکھائی دے رہی ہیں۔ شہروں میں روپیوں پیسوں کی مار ہے، دیہاتوں میں ہر کھیت پر بگاڑ ہے، گُہار ہے۔

یوپی کے ایک مشرقی ضلع کا مہندیا کوئی دُنیا اوپر گاؤں نہ تھا۔ ویسا ہی جیسے کہ ملک کی اسّی فیصد آبادی کو بسانے والے دیہات ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مہندیا کی اتنی خصوصیت ضرور تھی کہ یہ نہ جانے کب سے ٹھاکروں کا گاؤں کہلاتا چلا آتا تھا۔ بڑے ٹھاکر کی کوٹھی ایک سرے پر تھی، چھوٹے ٹھاکر کا مکان دوسرے سرے پر۔ اصل میں دونوں گھر ایک ہی چنے کی دو دالیں تھے۔ ایک کو انگریز کی پرورش نے چھوٹا موٹا راجہ بنا دیا تھا، دوسرے گھرانے کو فرنگی عتاب نے مہندیا کی جنت سے نکالا ہی نہ تھا بلکہ ٹکے کا آدمی بنا دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے دوران گرمکھ سنگھ اور بھوپندر سنگھ دو حقیقی بھائیوں، مالکانِ مہندیا نے طے کیا کہ ایک انگریز کا ساتھ دے، ایک ملک والوں کا۔ جو بھی جیتے اس گھر کی بات بنی رہے۔ انعام و اکرام، جاگیر، جائیداد سب آپس میں برابر برابر تقسیم ہو رہے گا۔ نتیجہ میں بھوپندر کو سولی ملی اور

گرمکھ کو پورا مہندیا اور آس پاس کے کئی دیہات جاگیر میں سونے پر سہاگے کے طور پر عطا ہوئے۔ گرمکھ کی نیت بدلی، انھوں نے بھوپندر کی بیوہ اور اس کے دُودھ پیتے بچے کو میکے اور ننھیال بھجوا دیا۔ انگریز سرکار اپنے خاص نمک حلالوں کی آستین میں سنپولا پلتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بس اتنا کرم ضرور کیا کہ گاؤں کے آخری کنارے پر ایک باغ اور تیس چالیس بیگھے زمین بھتیجے کی پرورش کے لیے بخش دیئے۔

بیوہ ٹھکرائن کا بھائی بھی تیکھا ٹھاکر تھا۔ اُس نے بھانجے کے نام مہندیا کے قریب ہی ایک گاؤں لکھ دیا اور مہندیا کی اراضی اور باغ کے گرد ایک چہار دیواری کھنچوا کر ایک چھوٹی سی گڑھی کی صورت دے دی۔ ٹھکرائن اسی چہار دیواری کے تھانے میں سال میں دو ایک بار اپنے کھیتوں کے بندوبست، اپنے باغ کی دیکھ بھال کے لیے آ کر ٹھہرتیں، چھوٹے بچے کو کلیجے سے لگائے لگائے دُنیا میں ترقی و کامرانی کے گُر سکھاتیں اور اسے ہمیشہ یاد دلاتی رہیں کہ حق آدھے مہندیا پر ہے مگر تجھے بے حق کر کے بس یہی مٹھی بھر زمین ملی ہے۔ گرمکھ سنگھ آدمی منتظم اور ہوشیار تھے، انھوں نے ریاست کو بڑھایا، سنوارا اور سرکار دربار میں ممتاز بنے۔ لڑکا ایک ہی تھا۔ انھوں نے اسے انگریزی اسکولوں میں تعلیم دلوائی۔ باپ کا مقصد تھا وہ حاکموں جیسا بنے، وہ بنا تو ضرور مگر بگڑا ہوا انگریز، کلب گھروں میں ناچنے والا، دن رات بوتل پر بوتل خالی کرنے والا، گھوڑ دوڑوں میں شریک ہونے والا اور پوکر کی ہر بیٹھک میں ہزاروں ہزار کا وارا نیارا کرنے والا۔ پھر اس پر ذرا ہندوستانی راجگی کی پُٹ بھی تھی، ناچ رنگ، ڈیرے والیاں، غرض گرمکھ کی آنکھ بند ہوتے ہی روپیہ پانی کی طرح بہنے لگا۔ سوتا خشک ہونے لگا تو سودی روپیہ چلا۔ گاؤں گراؤں رہن رکھے جانے لگے، کھیت باغ بکنے لگے۔ بھوپندر کے بیٹے نے یتیمی، بے وارثی کی گود میں پرورش پائی تھی، بیوہ ماں نے تن آسانی سے بچنے کی ایسی پکی تعلیم دی تھی وہ ٹھاکر کی جگہ بنیا بن گیا تھا۔ اُس نے چچازاد بھائی کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے مرنے سے پہلے آدھا مہندیا خرید کر اپنے دو بیٹوں کے نام چھوڑ گیا۔ ایک ان میں سے لاولد رہا، دوسرے کا چشم و چراغ اٹھارہ برس کا رگھوبیر تھا جسے سب سے چھوٹا ٹھاکر کہتے تھے۔ ڈیل ڈول، رنگ ڈھنگ سب راجپوتی۔ باپ بڑے ٹھاکر سے ایک فوجداری کے سلسلے میں مارا گیا تھا۔ اب پھر ایک بیوہ ٹھکرائن اپنے لختِ جگر کو شمع فروزاں کے لیے بلوری قندیل بنی ہر ہوائے تیز و تند سے بچانے کی

کوشش میں دن رات لگی تھی۔

بڑے ٹھاکر، گرمکھ کے پوتے تھے، وہی داداوالا رکھ رکھاؤ، وہی آن بان، وہی مونچھ نیچی نہ ہونے کا خیال۔ اولادیں کثرت سے ہوئیں، مگر عیش پرستوں کے امراض کے جراثیم خون میں سرایت کر چکے تھے۔ بیٹیاں تو دو ہی تھیں، اچھے گھرانوں میں بیاہ کر بھاری بھاری بھدیل سونے کے زیوروں سے سر سے پاؤں تک لدی اپنی اپنی سسرال سدھاریں۔ بیٹوں میں سے کوئی پاگل نکلا، کوئی نیم پاگل، صرف ایک ہر طرح سے ٹھیک تھا، مگر وہ بھی تعلیم سے گریزاں ہی رہا۔ کھیت کھلیان میں لگ گیا اور کسانوں جیسی زندگی بسر کرنے لگا۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ اس لیے کہ جب زمینداری ٹوٹی تو کئی سو بیگھے کا فارم اس کا کھڑا تھا۔ رگھوبیر کی ماں نے بھی ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ وہ مہندیا کے اکثر کھیتوں کو باغ میں بدلتی رہی تھی اور انھیں باغوں کے سلسلے میں مینڈھوں کے گز دو گز بڑھنے گڑھنے پر آپس میں خوب خوب لاٹھیاں چلی تھیں۔ آجکل دونوں گھرانوں میں انھیں میں سے ایک باغ کے متعلق مقدمہ بازی ہو رہی تھی۔ منصفی سے بڑے ٹھاکر جیتے تھے، ججی سے رگھوبیر، اب ہائی کورٹ میں اپیل تھی۔ سب کو انتظار تھا، دیکھیں چھوٹے بڑے ٹھاکروں میں سے کس کی مونچھ نیچی ہوتی ہے، کس کی اُونچی۔

ہائی کورٹ کے فیصلے کا بھی دن آ ہی گیا۔ میدان بڑے ٹھاکر ہی کے ہاتھ رہا۔ رگھوبیر کی آنکھوں پر جوانی کے ساتھ ساتھ غصّے کی دُھند چھا گئی۔ نہ جانے کیا سے کیا کر گزرتا۔ مگر ذاتی دشمن کی فتح کی خبر کے ساتھ ساتھ ملک کے دشمن کی فتح کی اندوہناک تر اطلاع بھی ملی۔ نیفا میں چینیوں نے ہماری کئی چوکیوں پر اچانک حملہ کر کے چھین لیں اور رگھوبیر کی بوڑھی ماں نے بیٹے کی نفرت وانتقام کے جذبے کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔ گھر کے ایک چھوٹے سے باغ کی جگہ ملک کے لاکھوں چمنوں، گلستانوں، پارکوں، باغوں کی پاسبانی کی طرف توجہ دلائی۔ ملک کا خدائی بیٹا ذاتی نقصان کو اجتماعی نقصان کا دھیان آتے ہی بھول گیا۔

وہ شام بھی عجیب تھی جبکہ بڑے ٹھاکر کے ہاں مقدمہ جیتنے کی خوشی میں چراغاں ہو رہا تھا، قہقہے لگ رہے تھے، مبارکبادیاں دی جا رہی تھیں، لوگ ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر گلے مل رہے تھے اور بڑے ٹھاکر کرسی سے بار بار اُٹھ اُٹھ کر اپنے وسیع صحن میں ٹہلتے اور اپنی گھنی لمبی مونچھوں پر تاؤ دیتے۔ اس کے کونوں کی کجی بالکل نوکدار کر دیتے، اور ادھر رگھوبیر نے اپنی ہی

نہیں گاؤں بھر کی لالٹینیں ریوڑ کے چرانے والے میدان میں جمع کیں، پھر سارے گاؤں کو اکٹھا کر کے تقریر کی۔

وہ جوش سے اُبلا پڑتا تھا، اس کی آنکھیں خونی کبوتر ہو رہی تھیں، اُس کے منہ سے کف جاری تھا۔ معلوم ہوتا تھا غم و غصّے کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ نفرت و انتقام کا جھکڑ عقل و خرد کی ساری آبادیاں ویران بناتا جا رہا ہے۔ اور دفعتہً جوش و خروش کے اس سیلاب میں، جذبات کے اس بے پناہ تلاطم و تموّج میں رگھوبیر نے تلوار کی طرح چلتی زبان روک لی۔ متواتر رعد کی گرج، مسلسل برق کی چمک کے اچانک بند ہو جانے سے جو ایک خاص طرح کی ہیبت ناک مگر دلدوز خاموشی فضا پر چھاتی ہے، وہ کیفیت پیدا ہوگئی۔ رگھوبیر نے نہایت متوازن لب و لہجے میں کہا۔

''شاید آپ یہ سمجھتے ہوں کہ میری باتوں میں آج غم و غصہ اس لیے زیادہ ہے کہ میں باغ والا مقدمہ ہار گیا ہوں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں، اپنے سورگ باشی پتا کی سوگندھ کھا کر کہتا ہوں کہ مکار، دغاباز، بھائی پکارنے والے چینیوں کے اس خونی حملے کی خبر کے بعد اگر میں ایک باغ نہیں سو باغوں کے مقدمے جیت گیا ہوتا تو میں نہ تو خوشی منا سکتا تھا اور نہ گھر میں روشنی کر سکتا تھا۔ جب دیش کے کئی سو سو رماؤں کی بیویوں کی مانگ سونی پڑ گئی ہو، جب کئی سو سہاگنوں کی چوڑیاں توڑی جا رہی ہوں، جب کئی سو شریر بچوں کی روشن چمکتی آنکھوں پر یتیمی کا دُھندلکا چھا گیا ہو، جب دیوتاؤں کے پوتر استھان کو دشمن کے ناپاک قدم روندر ہے ہوں تو اس وقت ہماری آپس کی جیت ہار کس گنتی شمار میں ہے؟ میرے اپنے گھر میں تو اب اُس وقت تک خوشی کی روشنی نہ جلے گی جب تک ہم اپنی ماتر بھومی سے ایک ایک چینی کو نہ نکال دیں گے!''

وہ رُک گیا۔ مجمع میں بڑے ٹھاکر کے چراغاں پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ رگھوبیر نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو خاموش کیا، پھر وہ بولا ''دیکھئے کسی کو برا بھلا نہ کہیے، بڑے ٹھاکر میرے پتا سمان ہیں، بالکل باپ کی طرح! مجھ کو یقین ہے کہ انھیں دُکھ کے اس لاوے کی اطلاع نہیں جو چینیوں نے دیش کی مستک سے بہایا ہے۔ وہ جانتے ہوتے تو آج اُن کا گھر بھی اسی طرح اندھیرا ہوتا جس طرح ہم نے آپ نے اپنے اپنے گھروں کے دیے بجھا کر ہر جگہ اندھیارا پھیلا دیا ہے۔''

وہ پھر رُک گیا۔ جس طرح سمندر کی موج بند سے ٹکرانے پر جب پلٹتی ہے تو اس کا ہر قطرہ لرزاں ہوتا ہے، اُسی طرح مجمع کا ہر شخص پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ اس کی بات سننے کے لیے بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''ایک اور بات کی طرف دھیان دلا دوں۔ یہ وقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا نہیں، اور نہ گھر میں بیٹھے یا میدانوں میں کھڑے صرف اپنی ہی بوٹیاں نوچتے رہنے کا ہے بلکہ یہ وہ سمے ہے کہ اکھاڑے میں اُتر پڑیے، جان لڑایئے، میدان ماریئے، اس لیے میں کل صبح کی گاڑی سے فوج میں بھرتی ہونے شہر جا رہا ہوں۔ گاؤں کے دوسرے نوجوان کیا کریں گے، کیا نہ کریں گے، وہ جانیں اور اُن کے ماتا پتا!''

ایک بوڑھے اہیر نے اپنے خاص لب ولہجے میں کہا ''ارے راگھو بھیا اکیل کا جئ ہو، کوؤ اور نہ جائی تو مور سہد یو بد کے تمرے سنگ جائی!''

معلوم ہوا جیسے کسی نے سوکھے پٹاخوں کی پوری گڈی میں ایک ساتھ آگ لگادی۔ ایک شور اُٹھا ''راگھو بھیا ہم بھی! راگھو بھیا ہم بھی! راگھو بھیا ہم بھی!''

اُس نے انھیں روک کر کہا ''اچھا، اچھا۔ رات بھر سوچنے، ماتا پتا سے آ گیا لینے اور پتنی بالکوں سے بدا (وداع) ہونے کے لیے بیچ میں ہے، جس کو جانا ہو وہ پورے طور تیار ہو کر مجھے اسٹیشن پر ملے!''

اس کے تقریر بند کرتے ہی 'راگھو جی کی جے! راگھو جی کی جے!'' کا شور اتنے زور کا اُٹھا کہ بڑے ٹھاکر کے گرد جمع خوشیاں منانے والوں نے بھی سنا۔ بڑے ٹھاکر نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا ''یہ کا ہے کے جے کارے ہیں؟''

ایک آدمی خبر لینے چلا ہی تھا کہ جلسے میں شریک ایک شخص آ گیا۔ اُس نے بڑے ٹھاکر سے روداد بیان کی۔ جب اُس نے ان کی کوٹھی کے چراغاں کے متعلق رگھوبیر کے فقرے بیان کیے تو انھوں نے اسے روک کر کہا ''کیا کہا تھا اُس نے، اُسی کے شبد دہراؤ!'' جب اُس نے بیان کیا ''رگھوبیر نے کہا، بڑے ٹھاکر میرے پتا سمان ہیں! بالکل باپ کی طرح! تو بڑے ٹھاکر کے چہرے پر اس طرح پسینہ چھوٹا کہ مونچھوں کے کونے بھیگ کر خود بخود جھک گئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے، اس لڑکے میں خاندان والی آن بان ہے! پھر وہ ایک بار نوکروں کی

طرف دیکھ کر غرائے، بجھا دو جی یہ دیواروں کے دیے، یہ رات سچ مچ خوشی کی نہیں، سوگ کی ہے!"

اور عجیب دلدوز سماں تھا اس صبح کا جب رگھوبیر اور گاؤں کے اٹھارہ جوان سینہ تانے، گلو میں ہار پہنے، گاؤں کے قریب والے اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کو رخصت کرنے بوڑھے بالے، مائیں بیویاں، بھائی بہنیں سب ہی آئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے گاؤں کو کسی نے اسٹیشن پر اُنڈیل دیا ہے۔ آنکھوں میں آنسو ضرور تھے مگر ان کے پیچھے فخر و غرور کی چمک بھی تھی۔ ہر آنکھ ایسی دہکتی جیسے رِم جھم بوندوں میں جلتے ہوئے بجلی کے بلب۔

رگھوبیر ماں کے پاس سے اس کے پاؤں چھو کر ہٹا ہی تھا کہ بڑے ٹھاکر مجمع کو چیرتے ہوئے پہنچے۔ رگھوبیر نے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ وہ دعا دیتے ہوئے بولے "رگھوبیر، تم نے خاندان کی ناک رکھ لی! یہ لو باغ کا بیع نامہ۔ میں نے اسے تمھیں دان دیا!"

رگھوبیر نے گھبراہٹ میں کاغذ تو ہاتھ سے تھام لیا، مگر اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اُس نے بڑی بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا۔

ٹھکرائن بولیں "بڑے ٹھاکر اس کی رگوں میں بھی وہی خون ہے جو تمھارے شریر میں اُچھلتا اُبلتا ہے، اور تم جانتے ہی ہو ہم ٹھاکر دان دیتے ہیں، لیتے نہیں!" بڑے ٹھاکر اس طرح جھجھک کر پیچھے ہٹے جیسے کسی نے ان کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا، مگر قبل اس کے کہ وہ کچھ کہہ سکیں ٹھکرائن نے گاؤں کے اُپ پردھان سے کہا "راگھو سے یہ کاغذ لے کر تم رکھو۔ میرا بچہ لڑائی سے جیتا پلٹا تو دیش کے سارے باغ اس کے ہوں گے۔ یہ کاغذ تم پنچایت کو اس کی طرف سے دے دو۔ وہ باغ کی آمدنی گاؤں کی بھلائی کے کاموں میں لگائے!"

بڑے ٹھاکر کا چہرہ پھر پسینے سے بھیگ گیا۔ انھوں نے ٹھکرائن کے سامنے تعظیم سے سر جھکایا۔ راگھو نے بڑے غرور، بڑے گھمنڈ سے ماں کے پاؤں چھوئے۔ وہ اس طرح سامنے نظریں کیے تنی کھڑی رہیں جیسے وہ سارے ملک کے جوانوں کی سلامی لے رہی ہوں!

(مسودہ: ۷ر جولائی ۱۹۶۳ء)

جذباتِ لطیف

اختر صاحب نے جھنجھلا کے چائے کی پیالی سامنے سے کھسکا دی اور کہنے لگے۔ ''میں بھئی اب جذباتِ لطیف، احساساتِ لطیف کے سے الفاظ سے نفرت کرنے لگا ہوں!'' ہم لوگوں نے اُنھیں بڑے تعجب سے دیکھا۔ ہمارے نزدیک اُردو نظم ونثر میں ان سے بہتر طور پر آج تک کسی نے جذباتِ لطیف کا تجزیہ نہیں کیا تھا، اُن کی نثر کا ایک ایک فقرہ اور اُن کی نظم کا ایک ایک مصرعہ اس کا شاہد تھا کہ انھوں نے باریک ترین اور نازک ترین احساسات کا گہرا مطالعہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ انھیں پورے طور پر محسوس بھی کیا ہے۔ ان کی صورت شکل بھی ایک لطافت پسند طبیعت کی چغلی کھا رہی تھی۔ گندمی رنگ، چھریرا بدن، چوڑی پیشانی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، پتلی ناک، پھڑکتے ہوئے نتھنے، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، مونڈی ہوئی داڑھی میانہ قد، خوش لباس وخوش گفتار وخوش اندام۔ غرض وضع قطع، چال ڈھال سے وہ ایک ذکی الحس، نفاست پسند شخص معلوم ہوتے تھے۔ اب اگر ایسا شخص اس طرح کی بات کہے تو حیرت ہونا ضروری تھا۔ اور وہ بھی اِس لیے کہ اس لفظ کا استعمال انھیں کے اشعار کے سلسلے میں کیا گیا تھا اور تعریف ہی کے خیال سے۔ انھوں نے ہماری آزردگی اور استعجاب کو محسوس کر کے اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لیے کہا ''معاف کیجیے گا، مجھے ان کے بیجا استعمال سے کچھ ایسے صدمے پہنچے ہیں کہ ان الفاظ کے سنتے ہی میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ جذباتِ لطیف کا وجود ہی قابلِ نفرت ہے۔ مگر ان کی موجودگی وہیں تک اچھی ہے جہاں تک ادب اور آرٹ کا تعلق ہے۔ جہاں ان کا انطباق روزمرّہ کی زندگی پر کیا گیا اور وہ خانماں بربادی کا سامان بن گئے!''

ہم میں سے ایک صاحب نے بحث کرنے والے انداز سے پوچھا ''یہ روزمرّہ کی زندگی سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

وہ بولے: ''جی، یہی نوکری، مزدوری، افسری، ماتحتی، تجارت، زراعت، اعزا کے ساتھ سلوک، دوستوں کے ساتھ خلوص، بیوی کے ساتھ محبت کا برتاؤ۔''

ہم میں سے ہر ایک نے گھبرا کے کہا۔ ''کیا زن وشو کے تعلقات میں بھی جذباتِ لطیف سے محروم رکھیں!''

مَیں نے بڑے استعجاب سے پوچھا ''اختر صاحب یہ آپ فرماتے ہیں، آپ!''

کہنے لگے ''جی ہاں، مَیں عرض کرتا ہوں اور ذاتی تجربے کی بنا پر عرض کرتا ہوں، آپ لوگوں کو معلوم نہیں۔ اچھا مجھ سے آپ بیتی سنیے۔''

ہم سب خاموش ہو کے ہمہ تن گوش بن کے بیٹھ گئے۔ وہ بھی تھوڑی دیر ساکت رہے پھر آہستہ آہستہ بیان کرنے لگے۔ ''میری بیوی کا نام لطیفہ تھا، وہ کسی امیر کی لڑکی نہ تھی۔ وہ میرے جن عزیز کی بیٹی تھی اُن کا نام حبیب اللہ تھا۔ اُن سے سارا قصبہ واقف تھا۔ وہ عجیب دل ودماغ کے آدمی تھے۔ اُنھوں نے ساری زندگی جھوٹی گواہی دینے اور جھوٹے مقدمے بنانے میں بسر کی تھی، اُن کا ذریعہ معاش یہی تھا۔ بعض لوگ ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ وہ اس ذریعے سے بڑی سے بڑی ترقیاں کر لیتے ہیں۔ وہ میونسپلٹی کے ممبر، کاؤنسل کے ممبر، خان بہادر رائے بہادر ہو جاتے ہیں۔ مگر اس طرح کے ترقی کرنے والوں کی فطرت میں بڑی جرأت اور بڑا استقلال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ موقع شناس بلا کے ہوتے ہیں۔ اور ایک ہی طرح کی دغابازی تک محدود نہیں رہتے، بلکہ ان کی ذہین طبیعتیں روز نئی نئی صورتیں اور تدبیریں سوچ نکالتی ہیں۔ لیکن یہ حضرت اِس قماش کے بھی نہ تھے۔ یہ چونیّ، اٹھنی پر جھوٹی قسم کھالینا ایک بہت ہی معمولی سی بات سمجھتے تھے۔ اسی لیے گو ان کی مانگ بہت تھی، مگر بڑی محنت وجفاکشی کے بعد بھی وہ مہینہ میں کبھی پندرہ روپے سے زیادہ نہ پیدا کر سکے تھے۔ یہ اُن کی خصوصیت تھی کہ اُن کے دماغ میں کبھی کوئی نیک خیال مشکل سے آتا تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کے لیے یہ کہنا کہ اس وقت دن ہے، اس وقت ممکن تھا جبکہ اور لوگ یہ کہتے ہوں کہ اس وقت رات ہے۔ رات کو رات کو کہنا یا دن کو دن اُن کے لیے محال تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی محال تھا کہ وہ رات اور دن کے علاوہ وقت کا کوئی خاص نام رکھ لیں۔ غرض لطیفہ ایسے باپ کی بیٹی تھی، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ

ہو بہو سیرت میں اپنے باپ کی سی تھی، لیکن اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ اس کی فطرت میں اس خون کا اثر ضرور ہی رہا ہوگا۔ ماں ہمارے خاندان کی نہ تھیں، وہ ایرانی النسل تھیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ گوری چٹی، موٹی تازی بڑی تندرست تھی۔ لطیفہ نے صورت شکل تو انھیں ماں باپ سے مل کے ودیعت پائی تھی۔ اُسے اگر باپ کا خرگوش نما چہرہ اور چھوٹی آنکھیں ملی تھیں تو اسی کے ساتھ ماں کا سفید رنگ اور سخت ہاتھ پاؤں بھی ملا تھا، نہ اس میں کوئی نزاکت تھی اور نہ کسی طرح کی کوئی لطافت۔ نہ وہ عطر لگاتی تھی، نہ کپڑے بدلتی تھی اور نہ بال میں کنگھا کرتی تھی۔ کہتی مجھے کوئی یار نہیں ڈھونڈھنا ہے۔ وہ چیونٹوں کے مارنے سے خوش ہوتی۔ کوؤں کے لیے آٹے میں زہر ملا دیتی۔ بلّیوں کو کمروں میں بند کر کے مار ڈالتی۔ چوہوں کے لیے ہر وقت چوہے دان رکھتی اور اُن کو پکڑ کر کتّوں کو کھلاتی۔ تعلیم بھی اُس نے مسمّیٰ پائی تھی یعنی وہ اُردو کی دو ایک مخصوص مذہبی کتابیں ٹٹول ٹٹول کے اور اٹک اٹک کے اُلٹی سیدھی پڑھ لیتی تھی۔ قرآن بھی اُس نے پڑھ لیا تھا۔ اور ہر سال رمضان میں وہ ایک قرآن ختم کر لیتی تھی۔ مگر عربی الفاظ کا تلفظ اور اعراب کی صحت اتنی ہوتی تھی جتنی کہ اُس کے والد ماجد کی باتوں میں صحت وصداقت ہوتی تھی۔ نماز ہمیشہ وہ گنڈے دار پڑھتی تھی۔ جب مَیں کسی اَمر پر خفا ہو کے منہ کالا کر کے کہیں نکل جانے کی دھمکی دیتا تھا تو وہ اس زمانے میں بڑے شغف سے نماز و وظائف پڑھتی، لیکن جب ہانڈی کے اُبال کی طرح ٹھنڈا پڑ جاتا تھا تو پھر وہ مہینوں خدا کو بھول بیٹھتی تھی۔ اور اسے نماز تو کیا طہارت بھی یاد نہ رہتی تھی۔ بس وہ دو ہی کام بہت اچھا جانتی تھی۔ ایک تو بچّے پیدا کرنا، دوسرے سارے خاندان واعزا کی غیبت کرنا اور اُن کے ہر بُرے بھلے فعل میں اپنے معنی پہنانا۔ خیر، یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔

ہاں تو اس کا فیصلہ میرے لیے مشکل تھا کہ مَیں نے شادی کیوں کی۔ لطیفہ میری جانی بوجھی تھی، برادری ہی میں سے تھی۔ مَیں نے بچپنے میں اُسے دیکھا تھا۔ ساتھ کھیلا بھی تھا، جوان ہو کے وہ پردہ کرنے لگی تھی۔ مگر اس حالت میں جب مَیں اس کے گھر جاتا تھا تو وہ کواڑوں کی دراروں میں سے مجھے جھانک کے دیکھتی رہتی تھی اور میں بھی اُس کی ماں کی آنکھ بچا کے ضرور دیکھ لیتا تھا۔ میرے لیے اُس کی صورت میں کوئی کشش نہ تھی۔ نہ بچپنے میں اور نہ جوان ہو کے میرے دل میں کبھی اُسے دیکھ کے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اُسے پیار کر لوں۔ وہ میرے نزدیک گیندے کا پھول تھی کہ جو دیوتاؤں کو محبوب سہی مگر ہمارے لیے جس میں نہ کوئی کشش

ہے اور نہ کوئی خوشبو، ممکن ہے کہ میرے لیے یہ کیفیت اور زیادہ نمایاں طور پر اور بھی اس لیے پیدا ہوگئی ہو کہ مجھے عائشہ جیسی لڑکیاں پسند تھیں۔ وہ بھی خاندان ہی کی لڑکی تھی، جب چھوٹی تھی تو کھیل کود میں جہاں کسی نے اُس کے ساتھ بے ایمانی کی یا لطیفہ سی کسی لڑکی نے اسے کسی بات پر جھٹلا دیا تو وہ سیدھی میرے پاس چلی آتی تھی اور میں ہی اس کا فریاد رس بنتا تھا۔ اُس کی باتوں میں رس اُسی وقت سے تھا، اور اس کی چال میں اسی زمانے سے غضب کا لوچ تھا۔ وہ بید کی طرح لچکتی ہوئی چلتی تھی، جوان ہو کے بھی وہ ناگن سی چھریرے بدن کی ایسی اچھی نکلی تھی، اور اس کی آنکھوں میں اِس بلا کی معصومیت تھی کہ بس یہی جی چاہتا تھا کہ وہ کھڑی کھڑی گھر کے کام کاج کیا کرے اور انسان دُور سے بیٹھا بیٹھا بس دیکھتا ہی رہے۔ وہ اُن عورتوں میں سے تھی جنھیں دیکھ کے مرد کے دل میں سینکڑوں لطیف خواہشیں، خدمت کی، ایثار کی، قربانی کی، شجاعت کی پیدا ہو جاتی ہیں۔ لطیفہ کو یہ بات کہاں نصیب۔ اُسے دیکھ کے انسان حیوانیت کی طرف راغب ہو سکتا تھا مگر اس میں پاکیزہ خیالات نہیں پیدا ہو سکتے تھے۔ اس کا جسم اس طرح کا بنا ہوا تھا، اور جوانی کے بعد اس کی آنکھوں میں اس طرح کی چمک آ گئی تھی کہ اُسے تھوڑی دیر دیکھنے کے بعد مرد کی نیت خراب ہونے لگتی تھی۔ لیکن یہ تمام باتیں میں اس قدر شدت سے نہیں محسوس کرتا تھا، جتنا کہ اب۔ وہ زمانہ ہی ناسمجھی کا تھا، پھر بھی اتنا ضرور محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح دل عائشہ کی طرف کھنچتا تھا، ویسا ہی لطیفہ سے اندر ہی اندر کراہت کرتا تھا۔ حالانکہ اعصاب اسی کی طرف راغب تھے۔

بہر نوع مجھے فیصلہ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ اس کی ذمہ داری بڑے میاں نے اپنے سر اوڑھ لی۔ وہ عائشہ کے والدین سے خفا تھے۔ آپس میں کچھ زمینداری کا جھگڑا تھا۔ کسی اسامی سے اُنھوں نے اپنے حصّہ رسدی سے آٹھ دس روپے زائد لے لیے تھے، اور بڑے میاں کے مانگنے پر بھی اُنھیں واپس نہ دیے۔ حبیب اللہ بھی اسی سلسلے میں والد کے یہاں آ کے اُٹھنے بیٹھنے لگے۔ بڑے میاں نے اُن سے خوش ہو کے اور عائشہ کے والد کو جلانے کے لیے میری شادی لطیفہ سے طے کر دی۔ اور خود ہی حبیب اللہ صاحب کی مدد کر کے بڑی دھوم دھام سے لطیفہ کو بیاہ لائے۔

شادی کے بعد تین ماہ تک مَیں نے اِس طرح کی زندگی بسر کی جو مہذب لوگوں میں قابلِ ذکر نہیں۔ مَیں اُس زمانہ میں انسان نہ تھا حیوان تھا۔ مگر اس کے بعد لطیفہ کے چہرے کی

زردی اور طبیعت کے نڈھال ہونے سے جسمی لذات میں کمی پیدا کی۔ اور میری آنکھوں سے آہستہ آہستہ پردے اُٹھنا شروع ہوئے۔ مَیں نے حال کے ساتھ ماضی و مستقبل پر بھی نظر ڈالی۔ ماضی میں مجھے عائشہ کی معصوم آنکھیں شکایتانہ انداز سے دیکھتی ہوئی نظر آئیں۔ مستقبل میں مجھے ایک ایسی عورت شریکِ زندگی دکھائی دی جو زن وشو کے تعلقات کے مادی حدود سے آگے بڑھ کر کچھ نہ جانتی تھی اور نہ جاننا چاہتی تھی۔ وہ اس کی شریکِ زندگی صرف اسی حد تک بننا چاہتی تھی کہ وہ اس سے اپنی اعصابی ضرورتیں پوری کرے اور ساری عمر اس سے فرمائشیں پوری کرائے۔ وہ اس کے لیے تیار نہ تھی کہ اُسے پڑھانے کی کوشش کی جائے۔ وہ اپنی دانست میں اپنی تمام ہجولیوں سے زیادہ پڑھی لکھی تھی۔ وہ کہتی بیکار کے لیے اپنی آنکھیں کیوں پھوڑوں۔ کیا مجھے کہیں نوکری کرنا ہے؟ میں یہ سمجھاتا کہ بھئی یہ نہیں ہے لیکن آخر مجھ سے باتیں تو کروگی۔ تم خود کہتی ہو میں تمھاری باتوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔ بس ہر وقت پڑھنے لکھنے میں لگا رہتا ہوں۔ تمھیں بتاؤ میں تم سے کیا باتیں کروں۔ تاریخ جانتی ہو، جغرافیہ جانتی ہو؟ تمھیں یہ معلوم ہے کہ انگلستان میں آج کل وزیرِ اعظم کون ہے اور ہندوستان میں جو سیاسی تبدیلیاں ہونے والی ہیں اُن کے متعلق کیا گفت وشنید ہو رہی ہے؟ مشکل سے اتنا کہنے پاتا کہ وہ بول اُٹھتی۔ اُونہہ ہٹو بھی، کیا سڑی دیوانی باتیں ہیں۔ ہم عورتوں کو ان موئی باتوں سے کیا کام؟ ہم سے پوچھو، آج گھر میں کیا پکا ہے۔ بچوں کے پاس کون سا کپڑا ہے، کون سا بننے کی ضرورت ہے؟ برادری میں کس کے یہاں شادی میں جانا ہے۔ عزیزوں میں کون سی تقریب ہونے والی ہے۔ مجھے نہ تمھاری ملکی تبدیلیوں سے مطلب اور نہ تمھارے وہ جو ہیں وزیرِ اعظم۔ ہوں گے نگوڑے کوئی! میں جھلّاتا مگر خاموش ہو رہتا اور بار بار اسی پر غور کرتا کہ آخر مَیں نے یہ کیا حماقت کی کہ بزرگوں کے دباؤ میں آ گیا اور جلدی سے لطیفہ سی عورت سے شادی کے لیے ہامی بھر لی۔ پھر کبھی غصّے میں آ کے یہ بھی سوچتا کہ اچھا اب تو خود مختار ہوں، اب سے کیوں نہ طلاق دے کے مَیں اس قصّے کا خاتمہ کر دوں اور عائشہ کو جو اَب تک بن بیاہی ہے، بیاہ لاؤں۔

چنانچہ ایک دن میں نے لطیفہ سے یہ کہہ ڈالا کہ تم مجھ سے طلاق لے لو، اب میری تمھاری نہیں نبھ سکتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مَیں اس وقت پلنگ پر رُومن رولان کا معرکتہ الارا ناول ’کرسٹوفر‘ پڑھ رہا تھا اور غصّے کی ابتدا اسی امر سے ہوئی تھی کہ وہ کسی ما مادائی پر جھلا کے میرے کمرے میں چیختی داخل ہوئی تھی اور مجھے خیالی دُنیا سے واقعی دنیا میں اچانک اور زبردستی

لائے جانے سے حد درجے کا دماغی دھچکا پہنچا تھا۔ چنانچہ کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ کے زمین پر گر پڑی تھی، اور مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میرے سارے احساسات لطیف بہ یک وقت زمین پر گر کر پاش پاش ہو گئے تھے۔

لطیفہ طلاق کا نام سن کے مبہوت بنی تھوڑی دیر کھڑی رہی۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا، وہ اس طرح کانپ رہی تھی جس طرح سموم کے پہلے جھونکے سے تر و تازہ درخت کانپنے لگتے ہیں۔ اس نے دو تین مرتبہ ہونٹ چاٹے کچھ کہنا چاہا، منہ سے آواز نہ نکلی۔ لڑکھڑائی اور دیوار کا سہارا لیتی ہوئی میرے کمرے سے باہر اور اپنے کمرے کے اندر چلی گئی۔

مَیں نے کتاب پلنگ سے جھک کے اُٹھائی، میرے ہاتھ کانپ رہے تھے، دل بلّیوں اُچھل رہا تھا، میں نے دل کی بات آج لطیفہ سے کہہ تو ڈالی تھی، مگر برسوں کے رشتے کو، اور وہ بھی اس طرح کے رشتے کو توڑ ڈالنا آسان کام نہ تھا۔ پھر لطیفہ نے جس انداز سے یہ فقرہ سُنا تھا اور اُس پر جو اثر ہوا تھا وہ بھی میرے دل پر چوٹ کر گیا۔ میں مانتا ہوں کہ میں پتلی جلد کا آدمی ہوں، میں تکلیفیں نہیں برداشت کر سکتا۔ مگر اسی کے ساتھ مجھ سے یہ بھی ناممکن ہے کہ مَیں کسی دوسرے کو بھی تکلیف دوں۔ لطیفہ کے کانپتے ہونٹ زرد رنگ اور لڑکھڑاتی ہوئی چال، یہ ساری باتیں اس بات کی شاہد تھیں کہ میرے اچانک وار نے اسے کس حد تک مجروح کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ جس طرح وہ اور باتوں میں جذبات سے ہٹ کر صرف واقعیت (Hard Faots) سے بحث کرتی ہے، اسی طرح شادی کو بھی محض اشترا کی زندگی کا ایک پہلو سمجھے گی اور عدم موانست کی وجہ سے جو اس میں خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اُن کے طے کرنے کی جو واحد صورت ہے اس پر عمل پیرا ہونے میں زیادہ پس و پیش نہ کرے گی۔ مگر لطیفہ نے تو اس جدائی کی خبر کو اس طرح سُنا جس طرح کی سنانی سنتے ہیں۔ مَیں سوچنے لگا کہ پتھریلی زمین میں بھی گلاب اُگ سکتے ہیں؟ کیا اس کی سی سخت عورت کے یہاں بھی جذبات و احساسات ہو سکتے ہیں؟ مجھے بے حد تعجب تھا، اس لیے کہ مَیں نے اپنی جگہ طے کر رکھا تھا کہ لطیفہ مجھ سے یہ فقرہ سن کے فوراً مجھ سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائے گی، خوب کوسے کاٹے گی۔ اس لیے کہ یہ اُس کی فطرت تھی، وہ جانتی تھی کہ وہ میرے ساتھ اچھی خاصی آرام کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ بھلا وہ اس طرح کی راحت خوشی سے کیوں ترک کرنے لگی۔ پلاؤ قورمہ چھوڑ کے خشک روٹی اور نمک کون پسند کرتا ہے کہ وہی پسند کر لے گی۔ مگر اُس کی خاموشی، اُس کی حسرت بھری نگاہ اور اُس کے کانپتے ہوئے

ہونٹوں کے لیے مَیں تیار نہ تھا۔ یہ امور تو اس کی چغلی کھا رہے تھے کہ اس سنگ سیاہ کی کسی تہہ میں موم دَبی پڑی ہے۔ اس کی سی عورت میں بھی جذباتِ لطیف ضرور ہیں۔ مَیں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ماما نے ایک رقعہ لا کے دیا۔ لکھا تھا۔

''میرے مالیک کیا آپ نے سچ مچ تلاق کا قسد کرلیا ہے! کیا میرے بچوں پر رہم نہ کیجیے گا۔ آپ کی لونڈی لطیفن۔''

اِس خط میں جتنی املا کی غلطیاں ہیں، ان کا اثر ایک پڑھے لکھے حسّاس طبیعت والے شخص پر سوائے اس کے اور کیا پڑسکتا ہے کہ اسے متلی معلوم ہونے لگے! چنانچہ میرے ساتھ بھی مالیک میں 'ے' کی زیادتی، طلاق میں 'ت' کی موجودگی، قصد میں صاد کا سین سے بدل جانا، رحم کی حائے حطّی کا ہائے ہوز بن جانا، لونڈی کا دو ٹکڑوں میں جدا ہو جانا۔ اور سب سے زیادہ لطیفہ کے سے شریف نام کا لطیفن کبڑنوں، دھوبنوں کا سا نام ہو جانا اِس اَمر کے لیے کافی تھے کہ میں اپنے پچھلے سارے خیالات بھول کے پھر غصّے سے پیچ و تاب کھانے لگوں۔ مَیں نے سنا کیا دیکھا ہے اور آپ نے بھی مشاہدہ کیا ہوگا کہ جب رذیل روپے حاصل کرلیتے ہیں تو اپنے پرانے نام تبدیل کرکے شریفوں کے سے نام رکھ لیتے ہیں۔ میاں جمّن کو جہاں روپے کی گرمی پہنچی اور وہ جمال یا جمیل بنے۔ تھوڑا سا اور جمع کیا اور جمال الدین یا محمد جمیل بنے۔ جہاں ذرا اور حالت سنبھلی تو جمال الدین حسن خاں، شیخ محمد جمیل کاشغری بن بیٹھے۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس، شریف ماں باپ کی بیٹی، ایک دولت مند ادیب و شاعر کی بیوی اور وہ لطیفہ سے لطیفن بن بیٹھی۔ میں نے خط کو اسی نفرت سے دیکھا جس کا وہ جذباتِ لطیف کی نظروں میں مستحق تھا۔ نہ تو وہ کسی عمدہ کاغذ پر لکھا گیا تھا اور نہ اُس میں کسی سینٹ یا عطر کی خوشبو تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ردّی کا کوئی سادہ ٹکڑا کمرے میں پڑا تھا، اسی پر گھسیٹ دیا گیا ہے۔ اور پھر املا کے ساتھ خط بالکل اس طرح کا تھا جس طرح مکھی روشنائی میں ڈوب کے سارے ورق پر چہل قدمی میں لکیریں بنا دے، یا پھر بہت سے مکڑ ایک ہی ورق پر مر گئے ہوں۔ مجھے یہ مثالیں یاد آتے ہی قے آنے لگی۔ مَیں دُنیا میں اِن دونوں چیزوں سے زیادہ کسی سے نہیں نفرت کرتا، بس میرے اس فیصلے کو اس خط نے حد درجہ پختہ کر دیا۔ مَیں نے حد درجہ نفرت اور غصّے میں اسی پرچے پر لکھا۔ ''میرا فیصلہ قطعی ہے۔ میں نے تمھیں اسی وقت سے طلاق دی!''

اختر صاحب نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا۔ جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ کانپتے ہاتھوں

سے ایک سگریٹ جلائی۔ تھوڑی دیر خاموش جلد جلد کش لیتے رہے۔ ہم لوگوں پر بھی سکوت طاری تھا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ حد درجہ ذکی الحس آدمی ہیں۔ خدا معلوم ہماری زبان سے کون سی بات نکل جائے کہ وہ اس آپ بیتی کو ناتمام چھوڑ دیں۔ اُنھوں نے شیروانی کے بٹام کھول دیے اور سینے پر کے ایک چور جیب سے ایک لاکٹ نما ڈبیا نکالی اور اس میں سے ایک پرزہ، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اسے کسی اخبار یا کاپی میں سے نوچ لیا ہو۔ شکنیں بھی اس پر اس قدر پڑی تھیں کہ جو بتا رہی تھیں کہ یہ صرف نوچا ہی نہیں گیا ہے، بلکہ گھنٹوں گولی بنا کے کسی مقام پر دَبایا پڑا رہا ہے۔ اُنھوں نے وہ پرزہ ہماری طرف بڑھا دیا ہے۔ یہ اُن کی بیوی کا خط اور اُس کے نیچے اُن کا جواب تھا۔ واقعی کاغذ، خط، املا ایسا ہی تھا کہ ایک پڑھے لکھے حساس اور غیور مرد کو اسے اپنی بیوی کی طرف منسوب کرتے شرم آنا چاہیے تھی، خود اختر صاحب کی شانِ خط یہ بتا رہی تھی کہ انھوں نے حد درجہ غصّے میں لکھا ہے۔ اور ایسے شخص کے لیے لکھا ہے کہ جو مشکل سے ساری عبارت پڑھ سکتا ہو۔ اس لیے کہ ایک ایک لفظ جنچا، تُلا، خوش خط، نستعلیق، صاف صاف لکھا گیا تھا، بھلا خط لکھنے میں اتنا کون خیال کرسکتا ہے۔ اسی لیے شانِ خط ہی اس کا ثبوت تھی کہ یہ فیصلہ واقعی قطعی اور آخری ہے اور کاتب نے مکتوب الیہ کو حد درجہ جاہل اور قابلِ نفرت سمجھ کے لکھا ہے۔

اختر صاحب نے اس پرزے کو ہم سے واپس لیا۔ ڈبے میں بند کیا۔ جیب میں رکھا شیروانی کے بٹام لگائے اور اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ہم نے گھبرا کے اُن کا منہ دیکھا۔ ہماری صورتیں قصّے کے اختتام کا سوال کر رہی تھیں۔ اُنھوں نے چھڑی پر ٹیک لگا کے کہا ”لطیفہ نے اسی شب میں افیون کھا کے جان دے دی۔ یہ خط مرتے دم تک اس کے ہاتھوں میں رہا۔ اس کی برسی کر کے میں نے عائشہ کی شادی خود کوشش کر کے ایک اچھی جگہ کرادی... اور اب میں خود اپنے جذباتِ لطیف کی پاداش میں لطیفہ کے بچے پال رہا ہوں!“

(کچھ ہنسی نہیں اور......۱۹۳۳ء)

جواب

راجہ صاحب رنگیلے بھی تھے اور ضدی بھی۔ اُن کے نزدیک اُن کا ہر کام اعتراض سے بالا تھا۔ کسی کو کسی قسم کی شکایت کا حق نہ تھا۔ رعایا، پرجا، تو بھیڑ بکری تھے، جانور۔ ان کے یہاں تو زبان ہی نہ تھی، آلۂ شکایت ہی صدیوں سے کٹا پڑا تھا، وزرا اور افسران نوکر تھے، حقِ نمک یہی تھا کہ بلا سوچے سمجھے سرکار کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ اب رہ گئیں رانی۔ تو وہ لاکھ انگریزی پڑھی سہی، برابر کے خاندان کی لڑکی سہی، مگر تھیں تو بیوی ہی۔ ان کا دھرم تھا کہ صبح، شام پتی کے پاؤں کی پوجا کریں۔ ان کو مشورہ دینے، اپنی رائے رکھنے اور اعتراض کرنے کا کیا حق؟ بھگوان نے ان کو راجہ صاحب کا سا شوہر دیا، یہ اُس کی عین بخشش و رحمت تھی، اُن کو چاہیے کہ وہ خدا کی اس دی ہوئی نعمت کو، جو اُنھوں نے اپنی پسند، اپنی خوشی، اپنی مرضی سے نہ پائی تھی، مگر جو اُن کے والدین کے ہاتھوں ان کے سر منڈھی گئی تھی، کلیجے سے لگا کر بیٹھیں اور دن رات اس کی خیریت، صحت و عافیت کے دھیان میں لگی رہیں۔

جب ذہنی کیفیت یہ ہو اور جنسی رجحان ان لوگوں کا جو اناؤں، دائیوں، کھلائیوں اور مہریوں کی بدولت قبل از وقت جوان ہوتے ہیں اور آیورویدک، یونانی اور انگریزی دواخانوں کے بھروسے بعد از وقت تک جوان رہتے ہیں، تو پھر راجہ صاحب کے گُل چھرّوں میں کوئی بیدھا تھا کہ بادھا ڈالتا۔ کس کے منہ میں دانت تھے کہ اس ہاتھی سے گنّا کھاتا۔ اسی لیے وہ جنسی لذّات میں ماہرِ خصوصی تھے۔ انھوں نے بہت سی باتصویر کوک شاستریں جمع کر رکھی تھیں۔ اُن کی میزوں کی درازوں میں سینکڑوں پیرس کی چھپی ہوئی، عدن و بمبئی میں بکنے والی خاص طرح کی تصویریں تھیں۔ ان کے کتب خانے میں اتیس کی تمام جلدیں موجود تھیں۔ اور ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ہر قوم، ہر ملت، ہر سن ہی کی جنسی لذّات سے واقف نہ تھے بلکہ اُنھوں نے اپنے تجربے

کے دائرے میں حیوانات و نباتات تک کو شامل کیا ہے۔ انہوں نے اُسے ایک فن کی طرح حاصل کیا تھا اور ایک سائنٹسٹ کی طرح اس کا تجربہ کیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اس معاملۂ خاص میں وہ تمام ریکارڈ توڑ دیں، جوڈان جوان، کاسونووا، مارکو پولو، کوکا پنڈت، ابنِ بطوطہ اور ہاروارڈ ایلیس نے قائم کیے ہیں۔

یہی اُن کا مطمحِ نظر بھی تھا اور یہی اُن کی ضد۔ اس غرض کے پورا کرنے کے لیے اُن کو نئے نئے معمولوں کی تلاش رہتی، اور مقصود کے حاصل کرنے کے لیے کوئی اَمر نہ مانع ہوسکتا تھا اور نہ حائل، خوشی اور زبردستی تو معمولی الفاظ تھے، دھوکا، جعل، فریب، جھوٹ، یہاں تک کہ قتل و غارت میں بھی عار نہ تھا۔ ایک نئے طرح کے تجربے کے لیے، خواہ وہ ساٹھ سے اُوپر سے متعلق ہو یا نو سے نیچے، دو چار اعزا برادری کا خون زیادہ اہم بات نہ تھی، خودمختار راجہ تھے۔ اُن کو کون روک ٹوک سکتا تھا۔

ایک سال تک رانی صاحبہ یہ سب دیکھتی، کڑھتی، گھٹتی رہیں، مگر اُنہوں نے زبان سے کچھ نہ کہا، لیکن جب راجہ صاحب نے خود اُن کے میکے سے آئی ہوئی مہریوں، دائیوں، کہاریوں کا شکار شروع کر دیا اور اُنھیں کے سینے پر کودوں دَلنا، تو ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ اُنہوں نے راجہ صاحب کو ایسا سبق دینے کا ارادہ کرلیا جواب تک ان کے خواب میں بھی نہ آیا تھا۔

ایک شام راجہ صاحب اپنی کوٹھی میں بیٹھے ریڈیو سن رہے تھے۔ دفعتاً انھیں ایک ایسا گانا سُنائی دیا کہ وہ اپنی جگہ سے اُچھل پڑے۔ مغنیہ کی آواز ان کے دل کی گہرائیوں میں اُترتی جارہی تھی اور اُس کی گلے بازی اُن کی روح کے تاروں پر ناخن مارتی تھی۔ اُن کے جسم بھر میں ایک سنسنی سی محسوس ہونے لگی اور ان کے نتھنوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اُنھوں نے گانا ختم ہوتے ہی ریڈیو ڈائریکٹر کو فون کیا۔ گانے والی کا نام پوچھا اور ان سے خواہش کی کہ وہ اتنی دیر تک روک لی جائے کہ ان کے آدمی وہاں پہنچ کر اس تک ان کا پیغام پہنچا دیں۔ پھر اپنے ملازمِ خاص کو بلا کر اُسے خاص ہدایتیں دیں اور رولس رائس لے جانے کا حکم دیا۔ اس کی واپسی تک وہ ریڈیو کو کھلا ہوا چھوڑ کر کمرے میں ٹہلا کیے۔ انہیں آج مدتوں کے بعد انتظار کرنے کی زحمت اُٹھانا پڑی تھی۔ وہ بے چین تھے، وہ جھنجھلائے ہوئے تھے اور وہ مضمحل تھے، ان کو آج پہلی دفعہ اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوا تھا، ایسا جان پڑتا تھا جیسے وہ تاریکی میں اچانک ایک

اندھے کنویں کے کنارے لاکر کھڑے کردیے گئے ہیں۔ جس سے دُور رہنے کی ایک بے چین خواہش رہ رہ کر دل میں چٹکیاں لے رہی ہے۔ بارے موٹر کا ہارن سُنائی دیا، انجن بند ہوا اور چند منٹ بعد آدمی نے آ کر سلام کیا۔ راجہ صاحب نے خوش ہو کر پوچھا۔ ''لے آئے؟''

آدمی نے ہاتھ باندھ کے کہا: ''نہیں سرکار!''

آدمی نے لرزتے ہوئے جواب دیا۔ ''سرکار! اُنہوں نے کہا میں آرٹسٹ ہوں، پیشہ ور نہیں۔ اگر راجہ صاحب برابر والوں کی طرح ملیں، مجھے ڈِنر پر بلائیں، رانی صاحبہ سے ملائیں، ذات برادری والوں کے ساتھ بٹھائیں تو آ سکتی ہوں، ورنہ مجھے معاف رکھیں۔''

راجہ صاحب نے پوچھا ''دماغ خراب ہے؟ رانی کیوں ملیں گی، میری توہین ہے!''

سرکار اُنہوں نے یہی کہا، اور سرکار وہ اپنی بات پر اَڑی ہیں!''

''اچھا، تو یوں ہی سہی! پر گھر جانتے ہو؟''

''جی ہاں سرکار!''

''چلو، ہم خود چلتے ہیں۔''

موٹر پھر روانہ ہوا، آدھ گھنٹے بعد پلٹا تو راجہ صاحب کے ساتھ ساتھ ایک چمکتی دمکتی ساڑی میں ایک زہرہ مشتری کی زائیدہ بھی تھی۔ اسے وہ بڑے تپاک سے اپنے مرصع ڈرائنگ روم میں ساتھ لائے، اُس نے اِدھر اُدھر نظر کی جیسے کسی چیز کی تلاش ہے۔ پھر راجہ صاحب سے مُڑ کر بولی۔ ''آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ رانی صاحبہ ضرور موجود ہوں گی، مگر مَیں تو اُنہیں کہیں نہیں دیکھتی!''

راجہ نے کہا ''میں ابھی اُنہیں لاتا ہوں۔''

وہ اندر محل میں گئے۔ رانی سہیلیوں میں بیٹھی تھیں، اُنہوں نے سب کا ایک چھچھلتی ہوئی نظر سے سلام لیتے ہوئے بیوی سے کہا ''میری ایک دوست اس وقت آئی ہیں، چل کر اُن سے مل لو۔''

رانی نے پوچھا: ''کون ہیں؟''

راجہ نے کہا۔ ''میری ایک دوست ہیں جو آج شام کو ریڈیو پر گائی تھیں۔''

''مَیں ایسے لوگوں سے نہیں مل سکتی!''

''تم کو میرا حکم ماننا ہی پڑے گا۔''

''مَیں اس کا پندرہ منٹ بعد جواب دوں گی۔''

وہ غصّے میں مسکراتے باہر چلے آئے۔ مغنیہ نے کہا: ''کیا وہ نہ آئیں گی؟ اگر ایسا ہے تو مَیں پھر ایک منٹ بھی یہاں نہ ٹھہروں گی۔ مَیں صرف اُسی کی ہو سکتی ہوں جو مجھے سب سے زیادہ پیار کرے اور جو میری سب سے زیادہ عزّت کرے!''

راجہ نے کہا ''وہ آئیں گی... مگر پندرہ بیس منٹ میں! جب تک کوئی چیز گا کے سُنا دو۔''

مغنیہ نے لگاوٹ سے مسکرا کے ایک عشقیہ غزل گنگنائی۔ راجہ صاحب جھومنے لگے۔ پھر وہ دفعتاً عالمِ سرور میں رُک کر بولی۔ ''رانی تمہارا حکم نہ مانیں گی، وہ مجھے رنڈی سمجھتی ہیں''۔

راجہ کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا، وہ پھر اُٹھ کر چلے۔ مغنیہ نے کہا: ''اور میں اکیلی بیٹھی رہوں۔'' وہ ذرا رُک کر بولے ''نہیں تم بھی ساتھ آؤ۔''

دونوں جب رانی کے کمرے میں پہنچے تو وہ شب خوابی کے کپڑے پہنے ہوئے دکھائی دی، مغنیہ جھجک کر پیچھے رُکی۔ راجہ نے اُسے کھینچ کر آگے کیا۔ پھر وہ بولے ''رانی ان سے ملو، یہ میری دوست ہیں!''

رانی جھپٹ کر اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی اور وہاں سے ایک جوان سپاہی کو کھینچتی ہوئی لائی، پھر راجہ کے سامنے ہی اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اُس نے کہا ''راجہ ان سے ملو، یہ آج سے میرے دوست ہیں!''

(کچھ ہنسی نہیں اور...... ۱۹۴۰ء)

چھانگر

یہ میرے بچپن ہی کی کہانی نہیں، ایک شخص کی کہانی نہیں، پورے گاؤں کی کہانی ہے۔ اس لیے کہ شہر اور گاؤں میں بھی فرق ہے۔ شہر کے رہنے والے پوری پوری زندگیاں ایک ہی شہر میں گزارنے کے بعد بھی ایک دوسرے سے بے خبر رہ سکتے ہیں، بالکل سمندر کی مچھلیوں کی طرح۔ بس ہر ایک کا حلقہ خاص ہوتا ہے۔ کسی خاص مذہب کے لوگ، کسی خاص طرح کے کام میں لگے ہوئے لوگ، کسی خاص زبان کے ادیب، شاعر۔ لیکن جیسے یہ ضروری نہیں کہ کوئی مل مالک اپنی مصنوعات کے فروخت کرنے والے چھوٹے دُکانداروں سے واقف ہو یا کوئی یونیورسٹی کا بڑا محقق، ادیب و ناقد ہر گمنام لکھنے والے یا مشاعروں میں نغمہ سرائی کرنے والے شاعر سے واقف ہو، اس لیے حلقوں میں بھی حلقے ہوتے ہیں اور جاننے والوں کا محفلوں کا حلقہ تنگ سے تنگ تر ہوتا جاتا ہے۔ ہر ایک کی زندگی کے رنگین رستے میں مختلف طرح کی رنگین سُتلیوں کے بل بہ افراط نہیں پڑتے، بس ایک یا دو تین طرح کے سوت ہوتے ہیں جس سے یہ موٹا یا پتلا رسّہ تیار ہو جاتا ہے۔ مگر دیہات میں رہنے والے ایک چھوٹے تالاب یا ایک حوض میں رہنے والی مچھلیوں کی طرح ایک دوسرے سے واقف، ایک دوسرے سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے گو یہ بظاہر آفتاب دادا کی کہانی ہے، ایک فرد کی کہانی ہے مگر یہ پورے محمد پور کی کہانی ہے۔ اس دیہات کی کہانی جس سے میں گیارہ برس کے سن سے زیادہ تر دُور ہی رہا، مگر جس کے باشندوں نے میری سیرت و کردار کے بنانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے اور جن کو سمجھنے کے بعد ہی میں خود اپنے کو جان پہچان سکتا ہوں۔ اور چونکہ یہ کہانی میں لکھ رہا ہوں اس لیے مختلف کرداروں اور سیرتوں سے متعارف ہونے کے لیے میں اپنا ہی قلم استعمال کر سکتا ہوں اور ان کے بیان میں میں وہی باطنی صورت پیش کرتا ہوں جس صورت میں مَیں نے انھیں اپنی

آنکھوں سے دیکھا، اس لیے آفتاب دادا کی کہانی محض ان کی کہانی نہیں، صرف محمد پور کی کہانی نہیں بلکہ خود میری نظر کی بھی کہانی ہے۔ ناقدین کا یہ خیال غلط نہیں کہ قصہ گوئی و ناول نگاری مصنف ہی کی شخصیت کا اظہار ہے۔ دوسروں کی شخصیتوں کو وہ اپنی ہی عینک سے دیکھتا ہے، اس کے واقعات بھی وہی بیان کرتا ہے جن سے اس کو دلچسپی رہی ہے اور مناظر کی تصویریں وہی ہیں جو اس نے دیکھی ہیں۔ دن رات، شام و صبح سب وہی ہیں جس سے اس کے جذبات متاثر ہوئے ہیں یا جنھوں نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑا ہے، یا جن سے یکسانیت میں کوئی خاص فرق آیا ہے۔

چنانچہ ایسی ہی ایک صبح سے اس کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ کوئی غیر معمولی صبح نہ تھی۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ میں، معتصم اور قیوم مردانہ حصہ مکان کے وسیع صحن میں سو رہے تھے۔ گو قیوم اور معتصم کی ناکیں بول رہی تھیں مگر میں کھکھارو دادا کی آواز ہی پر جاگ اُٹھا تھا۔

یہ کھکھارو دادا کی بھی عجیب شخصیت تھی۔ لمبے چوڑے قد آور، ستر سے اُوپر سن، گندمی رنگ، گول آفتابی چہرہ، دھنسی دھنسی کالی مگر بے آب آنکھیں، خشخشی داڑھی، چوڑے چوڑے ہاڑ۔ اُن کے متعلق سب کو معلوم تھا کہ صبح کاذب کے وقت اُٹھتے، ضروری حاجتوں سے فارغ ہو کر تھوڑے سے ڈنڈ لگاتے، کچھ ہاتھ مگدر کے ہلاتے، پھر صبح کی دو رکعت نماز پڑھ کر فوراً ناشتہ کرتے۔ یہ رات ہی سے ان کے لیے چھینکے میں رکھا ہوتا۔ دو جو کی موٹی روٹیاں، شامی کباب کی ایک ٹکیا، یا سوکھ کوئنے کی دو گولیاں یا گڑ کا ایک ٹکڑا۔ یہ اسے خود اپنے ہاتھ سے چھینکے سے اپنا یہ ناشتہ اُتارتے، جلدی جلدی اسے نوش فرماتے اور ٹھنڈے پانی کا ایک کٹورا پی کر وہ گھر سے نکل پڑتے۔ اس زمانے میں اکثر گھروں میں کٹورا ہی استعمال ہوتا تھا، یہ تانبے کا ہوتا اور سال میں ایک یا دو بار اس پر قلعی کرائی جاتی۔ گلاس کا اس وقت مردوں میں بھی رواج نہ تھا۔ کہیں کہیں شیشے کے موٹے موٹے بڑے بڑے بھدے گلاس ہوتے تو وہ زیادہ تر مہمانوں کے کام آتے۔ وہ چینی کے برتنوں کی طرح کسی صندوق میں بند رکھے رہتے۔ گرمی ہو کہ جاڑا یا برسات کسی موسم میں نہ اُن کا لباس بدلتا تھا اور نہ ان کے معمول میں کوئی فرق آتا۔ وہ سینہ پر بائیں کھلا ہوا گھنڈی دار ململ کا لمبا کرتا، اور پورے عرض کی چوڑی مہری کا مارکین کا پجامہ، دوپلی ٹوپی پہنتے تھے۔ جاڑوں میں وہ گھر سے نکلتے وقت شانوں پر ایک کمبل ڈال لیتے اور برسات میں ایک چھتری کا اضافہ ہوتا اور بارہ آنے کی سلیم شاہی کی جگہ دو آنے کی ایک نقش و نگار بنی

کھڑاؤں لے لیتی تھی۔ اس چہل قدمی کا راستہ بھی مقرر تھا۔ وہ اپنے گھر سے نکل کر ہمارے مکان کی پشت سے ہوتے ہوئے رمیز دادا کے کھیتوں کی مینڈ پر مضبوط قدم رکھتے ہوئے ان کے آموں کے باغ کو پار کرتے اور یوں ہی مرزوعہ کھیتوں کی مینڈوں پر ہوتے ہوئے امام باڑے تک جاتے۔ ان مرزوعہ کھیتوں میں جو ان کی خود کاشت اور سیر کے کھیت تھے، جو انھوں نے بٹائی پر دے رکھے تھے اور جن کی پیداوار ان کی گزر اوقات کا وسیلہ تھی، ان کو بہ نظر غور دیکھتے ضرور تھے۔ امام باڑہ کے احاطہ میں محترم کے تعزیے اور علموں کے پھول ہی نہ دفن ہوتے تھے بلکہ وہ گاؤں کے زمینداروں کا پڑاؤ بھی تھا۔ کھکھارو دادا وہاں پہنچ کر بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے اور پھر اسی راستے سے واپس آجاتے۔ جاتے وقت وہ آبادی بھر زور زور سے کھانستے اور بلغم صاف کرتے رہتے۔ یہ ان کا کھانسنا گویا ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' یا ''حی علی خیر العمل'' کا مترادف تھا۔ اس لیے کہ گھر واپسی بھی سورج نکلنے سے پہلے ہو جاتی تھی، مگر واپسی میں ان کو حلق صاف کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ وہ بڑی خاموش زندگی گزارتے تھے۔ اپنی بیوی سے بھی کم ہی باتیں کرتے۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ سنا ہے کہ جوانی میں تین لڑکے ہوئے مگر وہ سن شعور کو پہنچنے سے پہلے ہی ایک ساتھ طاعون میں بیمار ہو کر مر گئے تھے۔ لوگ کہتے اس حادثے سے پہلے کھکھارو دادا ایک ہنس مکھ، ملنسار، دلچسپ اور نیک دل شخصیت کے مالک تھے۔ بچوں کے انتقال نے ان کو بدل دیا۔ ہم نے جب انھیں دیکھا تو وہ صرف محفلوں، مجلسوں میں دِکھائی دیتے یا کسی کی موت پر جنازہ اُٹھانے والوں میں پیش پیش رہتے۔ شادی بیاہ میں وہ شرکت نہ کرتے تھے۔

ان کی بیوی ہم سب بچوں اور نوجوانوں کے سامنے آتی تھیں۔ چھوٹے قد کی، سوکھی سی، سفید موبی بی تھیں۔ ان کے گورے چہرے پر سینکڑوں جھریاں پڑی تھیں اور ان کی آنکھوں سے اتھاہ غم جھلکتا تھا، لیکن جب ہم اعزّا کے بچّے اُن کے پاس جاتے تو ان کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھتا اور وہ ہم میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ کھلاتی ضرور تھیں۔ ان کے گھر میں ہماری خاطر تواضع کا زیادہ سامان تو تھا نہیں، بس تیل میں تلی ہوئی گڑ کی کھجوریں تھیں، سبز ہی رنگ کی گڑ کی ایک ڈلی، لیکن ہم لوگوں کی پذیرائی کبھی صدری دالان میں نہ ہوتی۔ وہ صرف دادا کے لیے مخصوص ہوتا۔ وہ یا تو تخت پر اپنی جانماز پر بیٹھے قرآن پڑھتے ہوئے یا اپنے پلنگ پر لیٹے سوتے ہوتے۔ دونوں حالتوں میں نہ تو ہمیں زور سے بولنے، قہقہے لگانے کی اجازت ہوتی اور

نہ ہمت۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ صبح کا وقت تھا، کھکھارو دادا نے نماز کے عادیوں کو اپنی مخصوص انداز کی کھانسی سے جگا دیا تھا۔ کوّے بول رہے تھے، پو پھٹنے میں دیر تھی اور پوری فضا پر دُھندلکا چھایا ہوا تھا۔ میں جاگ کر کروٹیں لے رہا تھا۔ نہ جانے کیوں صبح کو جاگنے کے بعد بستر سے فوراً اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ بزرگ دیندار کہتے ہیں شیطان اور اس کے چیلے خاص طور سے نمازیوں کے پاؤں دبا کر پھر سے سلا دینا اپنی عبادت سمجھتے ہیں۔ خدا جانے ان کا یہ ارشاد کہاں تک صحیح ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ صبح کو نوجوانوں کو خاص طور سے بڑی گہری نیند آتی ہے اور مجھ جیسے بھی جو سویرے اُٹھنے کے عادی نہیں، جاگنے پر بھی ان کا جی پلنگ چھوڑنے کو نہیں چاہتا۔ سارے جسم میں جو اس وقت کسل ہوتا ہے اور جو ہلکا ہلکا درد اُس میں اتنی اتنی شیرینی اور لذّت ہوتی ہے کہ بے ساختہ اس سے حظ اُٹھانے کو جی چاہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بے نمازیوں کا بھی، یہاں تک کہ خدا کے نہ ماننے والوں کا بھی تڑکے اُٹھ کر خدایا سب سے عظیم ہستی کی پرستش کا جی چاہتا ہے اور قدرت وفطرت کی ہر شے سے ایک طرح کی ہم آہنگی، یک جہتی ومؤانست محسوس ہوتی ہے۔

غرض میں کروٹیں لے رہا تھا، معتصم اور قیوم خراٹے لے رہے تھے، اور چھانگر ابا جان کا بوڑھا ملازم بھی نہ جاگا تھا کہ کسی نے بڑے پھاٹک کی کنڈی کھڑکھڑائی۔

میں تو عمداً نہیں بولا، اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ سوائے کسی ہم چشم یا بزرگ کے کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ کنڈی ہلاتا۔ رعایا پرجا میں سے کوئی ہوتا تو وہ چھانگر کا نام لے کر پکارتا یا کارندہ جی کہہ کر آواز دیتا۔ اور میں نہ چاہتا تھا کہ اپنوں میں سے کوئی آئے اور مجھے صبح صبح جاگ کر پلنگ پر پڑے رہنے پر ٹوکے۔ اس لیے مَیں نے تقریباً آنکھیں بند کرلیں۔ زنجیر پھر زور سے کھڑکی تو چھانگر نے نیند سے جاگ کر پوچھا ''ارے کون ہے؟'' اس کی آواز میں وہ جھنجھلاہٹ تھی جو کچی نیند سے جگائے جانے والوں کے ہاں فطری طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔

یوں بھی چھانگر میاں اکڑو خاں تھے۔ وہ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار کے سب سے پرانے ملازم تھے۔ وہ ہما شما کو نظر میں نہ لاتے تھے۔ رعایا پرجا سے ابے تبے کر کے بات کرتے تھے۔ چھ فٹ کے قد اور لحیم شحیم تھے۔ کسی زمانے میں پہلوانی بھی کر چکے تھے اور جوانی سے لے کر اب تک انھوں نے نہ جانے کتنے اغوا اور زنا بالجبر کے کارنامے کر ڈالے تھے۔ ابا

جان گاؤں کے زمینداروں کے دستور کے خلاف نہ کسی اسامی پر بقایا لگان کا دعویٰ کرتے اور نہ کسی کی بہو بیٹی کو بری نگاہ سے دیکھتے۔ ان سب کی کسر چھانگر نکال لیتے۔ وہ ہر ایک نادہند اسامی سے اپنا نذرانہ وصول کر لیتے۔ بالکل مہاجنوں کی طرح دس پانچ روپے سود در سود پر چلاتے اور سب کی بہو بیٹی کو اپنے لیے حلال سمجھتے۔ انھوں نے ایک چھوٹا سا مکان حویلی سے قریب خرید لیا تھا۔ فی الحال وہ ایک بیوہ چمارن کی قیام گاہ تھی جس نے ان کے نطفے سے کوئی بیس دس پہلے ایک بیٹا جنا تھا۔ رات میں وہ اپنے حرم سے بارہ بجے شب کے بعد تشریف لاتے تھے۔ غالباً انھوں نے اپنے رومان سے بدیر فراغت پائی تھی۔ اس لیے ان کی نیند ابھی پوری نہیں ہوئی تھی اور شب کا خمار اب تک باقی تھا۔

چھانگر کی وجہ تسمیہ ظاہر بظاہر کوئی نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ جب وہ پیدا ہوئے تھے تو اس وقت ان کی چھوٹی انگلی کی جڑ میں ایک چھوٹا سا انگلی نما گوشت کا ٹکڑا لگا ہوا تھا۔ اسی کو اُن کے والدین نے چھٹی انگلی سمجھ کر ان کا نام چھانگر رکھ دیا۔ جب وہ سن شعور کو پہنچا اور کشتی لڑنے اور اکھاڑے بازی کا شوق چرایا تو اسے یہ چھٹی انگلی بری معلوم ہوئی۔ چنانچہ اس نے ایک ساتھی سے اسے گڑاسے کے ایک وار سے کٹوا دیا۔ خوب خون بہا مگر میرا شیر نہ سسکا، نہ تڑپا اور نہ اُس نے اُف کی۔ گاؤں کے جراح نے مرہم پٹی کر دی اور زخم پانچ سات دن میں اچھا ہو گیا۔ اب سوائے اس کے کہ ایک ہلکا سا داغ تھا ورنہ اس انگلی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ مگر چھانگر کا نام اس کی شخصیت کے ساتھ چپکا رہا۔ اسے وہ کسی طرح کاٹ کر الگ نہ کر سکا۔ باوجود اپنے عام کڑوے پن کے چھانگر کو بزرگ داشت کا بڑا خیال تھا۔ اس کے ہاں زمیندار چھوٹا ہو یا بڑا، پھر بھی وہ زمیندار تھا۔ جانتا تھا کہ ابا جان اس کی ساری حرکتیں برداشت کر سکتے ہیں لیکن اپنے ہم چشموں سے بدتمیزی یا بدتہذیبی کے روادار نہیں۔

اس لیے جب اُدھر سے جواب ملا ''ارے میاں پھاٹک کھولو، میں ہوں آفتاب!'' وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور یہ کہتا ہوا کہ ''ارے میاں اتنا سویرے سویرے آپ کہاں؟'' اس نے جلدی سے پھاٹک کھول دیا۔

اور اس میں سے برآمد ہوئے ہاتھ میں اُپلا لیے ہوئے آفتاب دادا، اور انھوں نے آتے ہی پورے صحن پر نظر ڈالی اور وہ بولے ''اچھا، یہاں ابھی تک رات ہی ہے۔ میاں معتصم بھی سو رہے ہیں، قیوم بھی اور سب تو سب شوکت بھی!'' اور انھوں نے چھانگر کے دالان میں

داخل ہونے والے زینے پر قدم رکھ کر مڑ کر ہم سب کو ایک ایک کر کے آواز دی ''معتصم! قیوم! شوکت! ارے لڑکو اُٹھو، نماز کا وقت جا رہا ہے۔''

چھانگر نے کہا ''ارے میاں کا ہے کو ان سب کی نیندیں خراب کرتے ہیں۔ جوانی کی نیند سو رہے ہیں۔ ملا صاحب نے ایک دن اپنے بیان میں کہا تھا، جوان کو نیند سے جگانے کو منع کیا گیا ہے!''

وہ بولے ''ہونہہ! نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں مگر انھیں تو سویرے جاگنا ہی چاہیے۔ ارے مجھے نہیں دیکھتے ہو۔ سترا بہترا ہو گیا ہوں، تمہارے میاں سے بھی بڑا ہوں، لیکن اب بھی کھکھارو میاں سے بھی پہلے اُٹھتا ہوں۔ بھینسوں کو اپنے ہاتھ سے سانی لگاتا ہوں، پھر مسجد میں آ کر وضو طہارت کرتا ہوں اور نماز پڑھ کر تم سے آگ لینے چلا آیا ہوں۔ اور اسی صبح سویرے اُٹھنے کی بدولت آج تک چھینک بھی نہیں آئی۔ اُٹھو جی لڑکو! اُٹھو!''

مَیں آنکھ کھولتے ہی آفتاب دادا کی صورت نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کالے کلوٹے، سوکھے ہوئے پانچ فٹ کے آدمی تھے۔ گاؤں بھر جانتا تھا وہ حد درجہ کنجوس ہیں۔ مشہور تھا کہ انھوں نے بیس پچیس ہزار کے سونے چاندی کے سکّے زمین میں گاڑ رکھے ہیں۔ کئی ہزار ان کے بینک اور ڈاکخانے میں جمع ہیں۔ سیر اور خود کاشت کا غلّہ گھر میں بھرا ہے۔ سوائے ان کے کوئی کھانے والا نہیں۔ لڑکیاں اپنے اپنے سسرالوں میں ہیں۔ لڑکے وظیفہ لے کر اور ٹیوشن کر کے الٰہ آباد میں پڑھ رہے ہیں۔ اندر باہر کوئی کھانے والا نہیں۔ بھینس پال رکھی ہے۔ وافر دودھ دیتی ہے، اُسے وہ بیچتے ہیں اور گھر میں دہی جما کر جو گھی نکالتے ہیں اسے بھی خود نہیں کھاتے، متشرع لوگوں کے ہاتھ عام بھاؤ سے مہنگا فروخت کرتے ہیں۔ ہر روز کچھ گھنٹوں کے لیے ایک چمارن آتی تھی جو بھینس کا گوبر اُٹھا کر اس کے اُپلے تھاپتی۔ ناند ہی میں پانی نہ بھرتی بلکہ میاں کے گھڑے بھی بھر دیتی۔ برتن باسن بھی مانجھ دیتی اور پانچویں ساتویں زنانے مکان کی اندر سے کنڈی بند کر کے ان کے پڑے مانجھ کر انھیں غسل پر مجبور بھی کر دیتی۔ ان کی اپنے ہاتھ کی پکائی غذا بھی بڑی سادہ ہوتی۔ جو کی روٹی، ارہر یا ماش کی بے مسالے کی دال اور لہسن مرچ کی چٹنی یا ارہر، مسور یا ماش کی بے گھی کی اُبالی کھچڑی۔ وہ ہر وقت اپنی غربت اور افلاس کا رونا روتے رہتے اور ہر آن اسی فکر میں رہتے کہ کوئی دوسرا اُن کو مدعو کر کے ان کو پیٹ بھر کھانا کھلا دے۔ ان کو کسی کو اپنے ہاں مہمان بنانے کی توفیق نہیں ہوئی۔

ایسے آدمی کا صبح سویرے منہ دیکھنا دن بھر کے فاقہ کو پیشگی دے کر بلانے کے مترادف ہے۔ اس لیے میں نے پہلے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی ہی دیکھی تو پھر قیوم و معتصم کو ناوقت جگائے جانے اور نماز پڑھنے پر مجبور کیے جانے پر جھنجلاتے ہوئے چہروں پر نظر ڈالی اور زور سے کہا ''داداجان تسلیم!''

انھوں نے کہا ''جیتے رہو بیٹا، جیتے رہو۔'' اور وہ چھانگر کے بسکھٹ پر جاکر براجمان ہو گئے اور ہم تینوں جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہو کر اور وضو کر کے مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب ہم مسجد سے پلٹے تو وہ اسی طرح چھانگر کے بسکھٹ پر بیٹھے اس کے ساتھ نریل کی دوکشی میں مشغول تھے۔ اور اب زمین پر اکڑوں بیٹھنے والوں اور نریل کشی میں کشی میں شریک ہونے والوں میں شیخ چھدو، بغل والے زمیندار وزارت حسین صاحب کے ملازم اور ان کی بغل والے زمیندار کوثر علی کے کارندے تیمور بھی موجود تھے۔ چھانگر کا نریل گاؤں بھر میں مشہور تھا۔ رات کو جب ماما جمراتن زنان خانے سے اپنا کھانا لے کر نکلتیں تو وہ ایک پورے اُپلے پر تھوڑی سی آگ لیتی آتیں۔ یہ چھانگر کا سرکار کی طرف سے مقررہ راشن تھا۔ وہ اسی اُپلے کو مع آگ کے اپنے 'کوڑ' کی راکھ میں دبا دیتا۔ صبح تک وہ آہستہ آہستہ سلگتا رہتا اور جب چھانگر سویرے انگڑائیاں لیتا اُٹھتا تو وہ گیا سیٹھ کے دیئے ہوئے دو چلم تمباکو کا سلفہ بھرتا اور اپنے دوستوں کے ساتھ نریل پر دوکشی لگاتا۔ یہ رفع قبض کا مجرب نسخہ تھا۔ اگر ایک سلفے میں یہ شکایت رفع نہ ہوجاتی تو پھر دوسرا بھرا جاتا، اور رب کے حلقہ بگوشوں میں سے ان کی کمی ہوجاتی جو سیر ہو چکے ہوتے یا جو حقہ نوشی کے انعام سے فیضیاب ہونے میں کامیاب ہوجاتے۔ مگر ہمارے آفتاب دادا ہمیشہ برابر دونوں سلفوں کے دوروں میں شریک رہتے۔ وہ ان کارندوں کے مجمع میں گویا قاضی بنے بیٹھے رہتے اور مفت کی حقہ نوشی اپنے لیے ہر طرح حلال سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال دو چار ہی دن بعد خود ان کی زبان سے اس وقت ظاہر ہوا جب انھوں نے چھانگر کی نریل نوشی ہر صبح اپنا معمول بنالیا۔ ایک دن ان کے ہم عمر زمیندار نے صحبتِ ارزال میں بیٹھنے پر اعتراض اور ان کی مفت حقہ نوشی پر نکتہ چینی کی۔ اُس زمانے میں اشراف و ارزال کا فرق، خاص طور سے دیہات کے زمیندار طبقے میں بہت نمایاں تھا۔ زمینداری ہی شرافت کی علامت تھی۔ کردار و سیرت بلکہ دولت تک کسی شمار قطار میں نہ تھی۔ ٹھاکر زمیندار ذلیل سے ذلیل حرکت کر کے ڈاکہ ڈالے، قتل کرے، زنا بالجبر کا عزم ہو، ٹھاکر ہی رہتا۔ چمار غریب کتنا ہی نیک ہو، سچا ہو، بھگتوں

والا کنٹھا گردن میں پہنے ہو، چمار ہی رہتا۔ بس زمیندار کے علاوہ سب ارزال تھے۔ اس لیے آفتاب دادا کا نوکروں چاکروں کے ساتھ بیٹھ کر نریل پینا سب زمیندار بچوں کو کھلتا، گو اُن کا جواب مسکت تھا۔ وہ بولے ''تم لوگوں کی یہ باتیں تو نری حماقت کی ہیں۔ گاؤں سے نکلے نہیں، دُنیا دیکھی نہیں اور لگے ہم جیسوں پر اعتراض کرنے جنھوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ ارے میاں شہروں میں جا کر دیکھو، شریف رذیل کا وہاں سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ جس کے پاس روپیہ ہے، دولت ہے وہی شریف ہے، قابلِ احترام ہے۔ جو قلاشج ہے، خواہ سیّد ہو یا برہمن وہ بھکاری اور رذیل و ذلیل ہے۔ اب کوئی قوم قبیلے کو نہیں پوچھتا، بس دیکھتا ہے تو یہ کہ اس کے پاس (انگلی اور انگوٹھے سے روپیہ بجانے کا اشارہ کر کے) زر علیہ السلام کتنا ہے۔ تو یہاں چھانگر کارندہ سہی، اس کے پاس اتنا تو ہے کہ وہ ڈٹ کے کھاتا ہے، اور سود پر روپیہ چلاتا ہے۔ میرے پاس کیا دھرا ہے کہ جس پر میں اس سے اکڑوں۔ رہی مفت حقہ کشی کی بات تو جناب وہ سلفہ کی تمباکو کب اپنے پیسے سے لاتا ہے، دو چلم اس کے گیا سیٹھ کے ہاں سے ملتے ہیں، تو میاں اگر میں اس سلفہ پر دو کش لگا لیتا ہوں تو اس کے باپ کا کیا نقصان ہوتا ہے۔ اس کی اپنی اور ہم چشموں کی نظر میں وقعت بڑھتی ہے کہ آفتاب میاں اس کے ساتھ حقہ پیتے ہیں اور میرا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ میری صبح کی تمباکو بچ جاتی ہے۔ وہ چھدام ہی کی سہی مگر ہر روز کے چھدام کو جوڑو تو سال میں ایک روپیہ کے لگ بھگ بچ گیا۔ اب بتاؤ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔

چھانگر کی ان کے بارے میں کیا رائے تھی وہ بھی سنئے۔ وہ ان کی مفت خوری کے بارے میں کہتا ''آفتاب میاں ملکی بھی ہیں اور بنئے بھی۔ ملکی حلق میں انگلی ڈال کر، سینے پر سوار ہو کر، ہر طرح کی چال چل کر اپنا پیسہ وصول کر لیتا ہے، لیکن وقت پڑنے پر، شان دِکھانے پر، خاندان کے نام پر وہ روپیہ پانی کی طرح بہاتا بھی ہے۔ مگر بنیا کا اصولِ زندگی ہے 'چام جائے دام نہ جائے!' آفتاب میاں جہاں سے ان کو کچھ ملتا چاہے ایک کی جگہ دس وصول کرنے کی سوچتے رہتے ہیں اور جہاں اپنی جیب سے، اپنی ٹنٹیٹ سے خرچ کرنے کا موقع آتا ہے وہ اپنی کھال کھچوا لیں گے پر دھیلا دینے پر راضی نہ ہوں گے۔

غرض یہی آفتاب دادا تھے جنھوں نے اس دن صبح صبح ہم سب کو اُٹھایا۔ معتصم اور قیوم تو مسجد سے اپنے گھر چل دیئے۔ دونوں کو فکر تھی کہ جلد سے جلد اپنے ہاں پہنچ کر روکھا سوکھا جو کچھ ہے منہ میں دو نوالے ڈال لیں، نہیں تو آفتاب دادا جیسے کنجوس کا منہ دیکھنے کے بعد دن بھر اگر

ایک کھیل بھی اُڑ کر منہ تک نہ پہنچے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مَیں ڈرتا ڈرتا گھر پلٹا تو دیکھا وہ چھانگر کا دوسرا اسلفہ سوارت کر کے اب اپنے دولت کدے جانے کی تیاری میں ہیں۔ ہاتھ میں وہی چھوٹا سا اُپلا ہے اور اس پر آگ کی کوئی چنگاری بھی نہیں۔ چھانگر نے کہا ''میاں یہ اُپلا تو رکھ جایئے، یہ کل کام آئے گا۔''

انھوں نے اسے اس طرح دیکھا جیسے کوئی استاد کسی شاگرد کو اس کے کسی بے تکے سوال کے بعد دیکھتا ہے۔ میں چونکہ پھاٹک کے اندر قدم رکھ چکا تھا اس لیے انھوں نے اپنے ناصحانہ لکچر میں سمیٹ لینا ضروری سمجھا۔

وہ بولے ''میاں چھانگر، تمہارا یہ سن و سال ہو گیا اور تعجب ہے کہ تمھیں یہ معلوم نہیں کہ خداوند عالم نے اسراف کو منع کیا ہے۔ جانتے ہو، اسراف کیا ہے۔ اسراف ہے فضول خرچی۔ میں جانتا ہوں کہ تم کو ہر رات تمہاری سرکار سے پورا ایک بڑا جنگلی اُپلا ملتا ہے۔ اسے تم زمین میں دبا دیتے ہو، اور اس کی آگ صبح کو اتنی ہوتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ تم اس سے دو سلفے پیتے ہو بلکہ کبھی کبھی چولھا روشن کرنے کے لیے آگ اندر زنان خانے میں بھی بھیج دیتے ہو۔ غرض تمہارے لیے سرکاری اُپلا بہت کافی ہوتا ہے۔ اب اگر میرا اُپلا بھی اس میں بڑھا دیا جائے تو اسراف محض ہوگا۔ میرے لیے بھی گناہ، تمہارے لیے بھی گناہ۔ پھر میری طرف پلٹ پڑے ''میاں، ان شرعی باریکیوں کو بھلا یہ میاں چھانگر کیا سمجھیں۔ تم ماشاء اللہ پڑھے لکھے ہو، تم ذرا ان نکتوں کو انھیں سمجھایا کرو۔ میاں چھانگر اخلاق سے پیش آنا، دوسروں کی خاطر و تواضع کرنا، خاص طور سے ہم سادات آلِ رسول کی، کارِ ثواب ہے۔ تمہارے نریل کے دھوئیں کا مرغولہ یوں ہی ہوا میں گم نہیں ہو جاتا بلکہ تمہارے لیے جنت میں سونے چاندی کے محل بناتا ہے، سمجھے!'' اور وہ مسکراتے ہوئے اپنا چھوٹا، پتلا، منحنی سا اُپلا ہاتھ میں بڑے احتیاط سے سنبھالے ہوئے پھاٹک سے نکل گئے۔ چھانگر منہ کھولے بوکھلاہٹ سے ان کی پشت دیکھتا رہا اور مَیں ہنسی ضبط کر کے اندر چلا گیا۔

(مسودہ بلاعنوان دستیاب ہونے پر اس کا عنوان چھانگر کر دیا ہے۔ یہ کہانی ایک صبح کئی کردار کے عنوان سے کچھ حذف و اضافہ سے بھی شائع ہوئی ہے)

✿✿

چھچھڑا

اسپشل وارڈ میں کمرہ لینے کے معنی ہوئے ڈیڑھ سو روپیہ، ڈاکٹرنی کی فیس لے کر چھ روپیہ روز کا کمرہ۔ دوائیں، انجکشن، انعام واکرام، کھانے پینے کا خرچ اس کے علاوہ۔ ڈھائی تین سو آئیں کہاں سے؟ تنخواہ ملنے کو ابھی سات دن باقی اور ملے گی بھی تو کتنی ہوگی۔ سو روپیہ تنخواہ، پچیس مہنگائی، کل سوا سو ہی تو ہوئے۔ لیکن تیال کرے تو کیا کرے۔ موہنی کو پانچ ہی بجے درد اُٹھنے لگے۔ بڑی ضبط کرنے والی عورت تھی۔ سینکڑوں طرح کے دُکھ جھیل چکی، کبھی اُس نے اُف نہ کی۔ اُس کے لتا اور سوہنی بھی تو ہو چکی تھیں۔ ایک چار برس کی تھی، دوسری دو برس کی۔ اب کی دفعہ ماتا جی نے سب کچھ سنبھال لیا تھا۔ سوہنی الٰہ آباد میں اس کی نوکری کرتے ہوئی۔ ریڈکراس کی دائیوں نے سب کام کر دیا۔ تھوڑے سے پیسے خرچ ہوئے۔ تب نہ تیال کو چیخیں سننا پڑی تھیں، نہ روپیہ پیسے کی زیادہ فکر کرنا پڑی تھی۔ مگر اب کے تو اس تبادلے نے بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ ایک مہینہ ہوا کہ دفعتہً لکھنؤ بدل دیا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں یقین کیے بیٹھا تھا کہ گھر میں خوشی تنخواہ ملنے ہی پر ہوگی۔ لیکن موہنی نے چوبیس ہی کو ہاتھ پاؤں ڈال دیئے اور وہ بھی اس طرح کہ ہر لحہ یہی خیال ہوتا بس اب سورگ باش ہو جائے گی۔ جلدی سے تانگہ کیا۔ دونوں بچوں کو اور موہنی کو لاد کر سات بجے اسپتال پہنچا۔ وہاں برآمدے کے ٹھنڈے پتھروں پر بیٹھے بیٹھے آٹھ بجے ڈاکٹرنی کے درشن ہوئے۔ جواب ملا جنرل وارڈ میں جگہ نہیں۔

"جلدی کرو، جلدی! اسپشل وارڈ میں کمرہ لو، نہیں تو استری کو لے جاؤ۔ اسپتال کے فرش پر بچہ جناؤ گے کیا؟" مرتا کیا نہ کرتا، اُس نے کہا اچھا کمرہ دے دیجیے، میں روپوں کا انتظام کرتا ہوں۔

موہنی اور بچیوں کو چھوڑ کر نرس کے ساتھ دفتر میں جانا پڑا۔ نام، پتہ، اور نہ جانے کیا کیا لکھوانا پڑا۔ حکم ہوا روپے جمع کرو۔ تیال نے کہا گھر سے لے آؤں۔ تیوریاں چڑھ گئیں۔ بنئے کی دُکان نہیں اسپتال ہے۔ نقد سودا ہوتا ہے۔ اِس ہاتھ دو، اُس ہاتھ لو۔ بڑی خوشامد پر دو گھنٹے کی مہلت ملی۔

تیال پلٹا تو اُسے موہنی اور بچیاں اسی طرح فرش پر پڑی ملیں۔ اسپتال چالو ہو چکا تھا۔ مریض موٹروں پر، رکشوں پر، تانگوں پر، اپنی ٹانگوں پر چلے آرہے تھے۔ پھٹے حالوں کی تعداد کم تھی، سواری والوں کا نمبر زیادہ۔ موٹر والیاں بے جھجکے ڈاکٹرنی کے کمرے میں چلی جاتیں۔ دوسری بیچاریاں برآمدے میں کھڑی رہتیں یا اُدھر جاتیں جدھر چھوٹی ڈاکٹرنی کا مطب تھا۔ بڑی ڈاکٹرنی کے کمرے سے ہلکے ہلکے قہقہوں کی آوازیں آتی تھیں۔ کراہنے والیاں چق کے باہر تھیں۔ انھیں میں موہنی کا بھی شمار تھا۔ جب کوئی نرس کھٹ پٹ کرتی اُدھر سے گزرتی تو موہنی بڑی اُمید بھری نظروں سے دیکھتی، وہ ناک سکوڑتی ہوئی گزر جاتی۔

دفعتہً اسپتال کا مہتر ایک کمرے سے پاٹ لیے ہوئے نکلا۔ موہنی کی طرف سے زینہ تھا، وہ جب پاس سے گزرا تو بھنبھنایا۔ ''راستے سے ہٹ کر نہیں بیٹھتی۔ یہیں پھیلنا تھا!'' تیال کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ اُسے ڈانٹنے کے لیے لپکا کہ لتا چیخ کر ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ اُس کے گلابی گال پیلے پڑ گئے تھے۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ تیال نے اُسے گودی میں اُٹھا کر پوچھا ''کیا ہے بیٹے؟'' لتا نے منہ چھپائے انگلی سے اشارہ کیا۔ تیال نے مڑ کر دیکھا تو ایک اٹھارہ اُنیس برس کی لڑکی ایک شاندار موٹر سے اُتری تھی۔ اس کے ساتھ ایک بڑا سا کتا بھی تھا۔ دیوی جی تو ڈاکٹرنی کے کمرے میں چلی گئیں، کتا اُدھر بڑھتا آ رہا تھا جدھر موہنی برآمدے کے کھمبے سے سہارا لگائے کراہ رہی تھی۔ تیال نے لتا کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا ''واہ کتّے سے ڈر گئیں۔'' وہ تتلا کر بولی ''کاتے گا!'' تیال نے کہا ''نہیں، نہیں، کاٹے گا نہیں!'' کتا بھی تیال کا میلا پتلون سونگھتا گزر گیا۔ اُس کی نہ کریز درست تھی نہ کسی اچھے کپڑے کا بنا تھا۔ اُسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اُس کی اِس بے پروائی پر لتا نے بھی تعجب سے آنکھیں پھیلا کر اس کی پیٹھ کی طرف دیکھا۔ بولی ''بلا اچھا، نہیں کاتتا!'' تیال نے ہنس کر کہا ''نہیں بیٹے، وہ ایسوں کو منہ نہیں لگاتا۔''

موہنی پھر گھٹی ہوئی آواز میں چیخی اور اُس نے دونوں ٹانگیں پھیلا دیں۔ تیال لپکا ''کیا ہے؟'' اُس نے شوہر کے چہرے کو دیکھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ تیال بڑی ڈاکٹرنی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اُس نے نہ تو کھٹکھٹایا اور نہ اندر آنے کی اجازت مانگی۔ اُس نے بھڑ سے دروازے کھول دیے۔ سامنے موٹر والی دیوی بلاؤز اُلٹائے کھڑی تھی۔ چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلک رہے تھے اور وہ جلدی جلدی سانسیں لے رہی تھی۔ دروازے کی طرف پشت کیے ڈاکٹرنی تھی۔ وہ دوشیزہ کے پیٹ میں اُنگلی چبھا چبھا کر دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً موٹر والی کی نظر تیال پر پڑی۔ بلاؤز ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپ گیا۔ ڈاکٹرنی مڑ پڑی۔ اُس کا سانولا مدراسی چہرہ تانبے کے رنگ کا ہوگیا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شعلہ ناچنے لگا۔

''کہاں گھسا چلا آتا ہے، یہ جنانا ہوسپٹل ہے۔''

تیال نے کہا ''مس صاحبہ میری استری اب بھی برآمدے کے پتھر پر پڑی تڑپ رہی ہے۔'' اُس نے پاؤں پٹک کر کہا ''ام کچھ نہیں سننا مانگتا۔ تم باہر جائے، بلڈی فول۔''

تیال کا جی چاہا اس کالی انگریزن کا منہ نوچ لے، مگر چھوٹا اہلکار افسروں کی جھڑکیاں سننے کا عادی ہوتا ہے۔ غصّے کو پی ڈالنا سیکھ جاتا ہے۔ ہکلا ہکلا کر صفائی دینا بھی گناہ جانتا ہے۔ تیال مڑ پڑا، اُس نے گردن جھکا لی اور وہ باہر نکل آیا۔

ایک نرس جھکی ہوئی اُس کی بیوی کو سہارا دے رہی تھی۔ وہ لپکتا ہوا اُن کے پاس پہنچا، نرس نے اُسے سوہنی کو دے کر کہا ''میں انھیں لے جاتی ہوں، تم بچوں کو لے جاؤ۔''

وہ لتا اور سوہنی کو لے کر گھر آیا۔ لتا نے راستے ہی سے بھوک بھوک کی رٹ لگا دی تھی۔ اُس نے مکان میں داخل ہوتے ہی دودھ کے ڈبّے پر ہاتھ ڈالا۔ دیکھا تو دونوں کے لیے کافی تھا۔ جلدی سے اسٹو جلایا، اور دودھ بنا کر دونوں کو پلا دیا۔ سوہنی تو دودھ پیتے ہی سو گئی مگر لتا کسی طرح پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ اب اُسے پھر ماتا جی یاد آنے لگی تھی۔ وہ بار بار رٹ لگاتی تھی ''ماتا جی کے پاس لے چلو، ماتا جی کے پاس...''

تیال جھلاّ اُٹھا۔ وہ صبح کی چائے کا عادی تھا۔ انگریزوں کی لائی ہوئی یہ بلا اب ہر ہندوستانی کے گلے پر سوار ہے۔ افیون کی طرح وقت آنے پر اس کے لیے بھی ہاتھ پاؤں

ٹوٹنے لگتے ہیں، لیکن ڈبےّ میں جتنا دودھ تھا وہ تو بچوں کو پلا دیا، خود چائے کیسے پیئے؟ اور اس ایثار کا جواب یہ کہ ماتاجی، ماتاجی کی رٹ۔ اُس نے طمانچہ مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔ دفعتہً بچی کے چہرے پر نظر پڑ گئی۔ لتا کے گول گول چہرے میں سے دو بڑی بڑی آنکھیں اُسے کچھ اس طرح دیکھ رہی تھیں کہ وہ آنکھیں جھکا لینے پر مجبور ہو گیا۔ یہ تو موہنی کی وہ پہلی صورت تھی جو اُس نے پہلی بار دیکھی تھی۔ آنکھوں میں وہی گھبراہٹ، وہی جھجک، وہی شک، وہی ڈر، وہی التجا، وہی اُمید۔ تیال نے اُٹھے ہوئے ہاتھ کی دو انگلیاں پیار سے اس کے نرم گالوں پر ماریں۔

''ابھی لے چلتا ہوں بیٹے۔ ابھی لے چلتا ہوں! تم ذرا سوہنی کے پاس بیٹھ تو جاؤ۔ اے شاباش! واہ واہ!'' اور اس نے لتا کو سوہنی کے پلنگ پر بٹھا دیا۔

لتا نے باپ کے جھوٹ کو سچ مان لیا۔ رونا بند کر کے بالکل موہنی کے انداز سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ تیال نے الماری میں سے کچھ ٹوٹے پھوٹے کھلونے نکال کر اُس کے سامنے ڈال دیے۔ بچّی اُن پر جھک پڑی۔

تیال اس کمرے میں گیا جس میں موہنی کے زیوروں کا بکس تھا۔ جب سے یہ بکس آیا تھا تیال کے علم میں صرف دو بار کھلا تھا۔ ایک دفعہ مہند پور میں جب موہنی کو ساس کے ساتھ کچھی کے بیاہ میں لالہ پریاگ نرائن کے ہاں جانا پڑا تھا۔ دوسری دفعہ جب تیال نے اسے اپنے ساتھی بنسی لال کی بہو کے گھر اسے بھیجا تھا۔ وہ جانتا تھا سسرال والوں سے اچھے قیمتی اور ٹھوس زیور آئے تھے۔ سستی کے زمانے کے پانچ ہزار کے تھے۔ ان سے یہی طے ہوا تھا۔ ڈھائی ہزار تلک پر، ڈھائی ہزار کے کپڑے لتےّ اور پانچ ہزار کے زیور۔ وہ سوچنے لگا یہ آخر کب تک ہندوستانی لڑکوں کے دام طے ہوتے رہیں گے۔ کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں بیٹوں میں، اور کہاں کے کیڑے پڑے ہیں بیٹیوں میں؟ پھر یہ بزرگوں کا طے کیا ہوا سودا! مویشیوں کی طرح دانت کان دیکھے گئے، مول تول ہوا، اور معاملہ طے ہوتے ہی جوا کندھے پر رکھ دیا گیا۔ نوکری کرو، غلامی کرو، بچےّ جناؤ اور لڑکے کھلاؤ۔ شادی کے دو تین برس کے اندر کوئی چھچھڑا نہ پیدا ہو تو ساس نندوں نے ٹوٹے ٹوٹکے کرانے شروع کیے۔ بہو کو بازائیاں کرائیں، ویدجی کو بلا بلا کر مشورے کیے گئے۔ بھسم کھلائے گئے۔ برہمنوں کو بھوگ دیا گیا، لیکن جہاں لڑکا پیدا ہوا پھر کسی کو فکر نہیں۔ کیا کھائے گا، کیا پیئے گا، کیسے پلے گا، کیسے پڑھے گا۔ اس پر اگر کہیں لڑکی ہوئی تو ہر ایک

نے ناک بھوں چڑھالی۔ چلو قرقی آئی۔ لتا اور سوہنی۔

اُس نے کواڑ کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ سوہنی اب بھی سو رہی تھی۔ لتا ایک کھلونے کو چھاتی سے لگائے ماماتا سے جھوم رہی تھی۔ گویا بچہ سلا رہی تھی۔ وہ مسکرا کر گہنے والے بکس پر جھک پڑا۔ موہنی نے اُسے ایک کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔ کپڑے پر چوہوں کی مینگنیاں تھیں، اُن کے پیشاب کے داغ تھے اور اُن کی تہوں میں کئی جھینگروں نے گھر بنایا تھا۔ گرہیں کھولنے میں ناخن دُکھنے لگے۔ قفل بھی زنگ آلود ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے کنجی گھومی۔ اس کی ظاہری صورت سے ہر طرح مایوسی ہوتی تھی، لیکن اندر سب کچھ نیا تھا۔ گہنے سلیقے سے رکھے تھے۔ بالیاں، جھمکے، ٹیک، کڑے، گلوبند، گلے کے، ناک کان کے، سر کے، ہاتھوں کے سارے زیور دوہرے دوہرے تھے۔ اُس نے ایک ایک کو ہاتھ میں لے کر آنکنا شروع کیا۔ کڑے سب سے بھاری ٹھہرے۔ ماتا جی نے بھی کہا تھا کڑے سب سے بھاری ہیں۔ دس تولے کے ہوں گے۔ اُس نے حساب لگایا، آج کل سونے کا بھاؤ ایک سو پندرہ روپیہ تولہ ہے۔ ان کڑوں کو اگر گروی رکھ دوں تو تین سو روپے ہر ایک خوشی دے دے گا۔ پھر کسی طرح پیٹ کاٹ کر چھڑا لوں گا۔ موہنی اچھی ہو کر گھر آ جائے، وہ خود ہی انتظام کر لے گا۔

اُس نے کڑے جیب میں رکھے۔ بکس بند کیا، بچیوں پر نظر ڈالی، سوہنی سو رہی تھی۔ لتا بھی بغل میں لیٹ گئی تھی۔ گیے پارچے کی ٹوٹی گڑیا سینے سے لگی تھی۔ بچے کو لوریاں دیتے دیتے خود ماں کو نیند آ گئی تھی۔ وہ دبے پاؤں گھر سے نکلا۔ باہر سے قفل لگایا اور چل کھڑا ہوا۔

اُس نے شہر کے سب سے بڑے جوہری کھنکھن جی کا نام سن رکھا تھا۔ رکشا کر کے سیدھا وہیں پہنچا۔ ہانپتا ہوا جب زینے پر چڑھا تو دروازے پر سنتری ملا۔ اُس نے بندوق سیدھی کی، اندر نہیں جا سکتے، ابھی دُکان نہیں کھلی ہے۔ تیال نے چوک میں ٹہلنا شروع کیا۔

مہتر سڑک پر جھاڑو دے رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے دستی ٹھیلوں پر کوڑا اُٹھا رہے تھے۔ مہترانیاں نالیاں صاف کر رہی تھیں۔ بہشتی کمر پر مشک لادے پانی ڈال رہا تھا۔ تیال کو ایسا محسوس ہوا جیسے چمڑے کی مشک سے صاف پانی کی دھاریں نہیں نکل رہی ہیں بلکہ اسی کی طرح کے غریبوں کی جیب سے پگھلی ہوئی چاندی بہہ بہہ کر نالیوں میں گر رہی ہے، اور یہ بدبودار میلی کیچڑ میں بدلتی جا رہی ہے، جتنا کا روپیہ کہیں لگے، اسکول میں، اسپتال میں، یتیم خانے میں،

بدھوا آشرم میں، اُس روپیہ سے اُسے فائدہ نہیں پہنچتا۔ مگر.... مگر.... وہ میلے کے کیڑے کی طرح رینگتے ہی کیوں رہتے ہیں؟ جنم لیتے ہی کیوں رہتے ہیں؟ پیدا ہوتے ہی کیوں رہتے ہیں؟ اور اسے وہ نیوز ریل یاد آ گئی جو اُس نے حال ہی میں ایک فلم کے ساتھ دیکھی تھی۔ ''زیادہ اناج اُگاؤ اور کم بچّے پیدا کرو۔'' کتنی سچی بات ہے۔ بے سمجھے بوجھے یہ بچوں کا ڈھیر کیوں؟ گھر میں کھانے کو ہو یا نہ ہو ریل پیل چلے آ رہے ہیں۔ لتا اور سوہنی کی موجودگی میں تیسرے کی ضرورت؟ لیکن کوئی اس جسم کی پکار کو کیا کرے؟ فطرت پر بندھن کیسے لگائے؟ مگر فطرت پر روک تھام ہی سے زندگی منظم و مہذب ہوتی ہے۔ سر کے بال کاٹے جاتے ہیں، داڑھی مونڈی جاتی ہے، مونچھیں تراشی جاتی ہیں، ناخن چھوٹے کیے جاتے ہیں، اولے پالے سے جسم کو بچایا جاتا ہے، سورج کی تیز دھوپ.....

صبح کی ٹھنڈی کرنوں میں کوئی چیز چمکی، تیال نے نظر اُٹھا کر دیکھا، صرّافے کی کئی چھوٹی دکانیں کھل گئی تھیں۔ سپید سپید گدّے، سپید سپید گاؤ تکیے، چھوٹی چھوٹی چوکیوں پر چاندیوں کے زیور رکھے ہوئے، سامنے والا صرّاف ایک دستی آئینہ میں اپنی مونچھ درست کر رہا تھا۔ یہ اسی کی چمک تھی جس نے تیال کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر کے اُسے چونکا دیا تھا۔ وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھا۔ صرّاف نے کہا ''آیئے، آیئے، کیا چاہیے؟'' تیال نے جیب سے کڑے نکال کر بڑھائے۔ صرّاف نے اُنھیں اُلٹ پلٹ کر دیکھا، وہ بولا ''کیا حکم؟'' تیال نے کہا ''گروی رکھنا چاہتا ہوں۔'' سیٹھ کے چہرے سے بشاشت کے نشانات غائب ہو گئے۔ مسکراہٹ خریدار کے لیے ہوتی ہے۔ اخلاق بیچنے والے کے لیے، گروی رکھنے والا تو قرض خواہ ہوتا ہے۔ اپنے سے پست تر... صرّاف نے رُکھائی سے پوچھا ''کتنا چاہیے؟''

''تین سو۔''

صرّاف نے تیال کی طرف کڑے پھینک دیئے۔ ''اتنے کا مال نہیں۔''

تیال کو یقین نہ آیا۔ دس تولے کے کڑے، گیارہ سو سے اوپر دام ہوتے ہیں۔ کہتا ہے تین سو کا بھی مال نہیں، یقینی دھوکا ہے۔ غرض والا سمجھ کر ٹھگنا چاہتا ہے۔ تیال نے کڑے اُٹھا لیے، چلا ہی تھا کہ صرّاف نے روکا۔ ''آپ سمجھتے ہیں یہ کڑے ٹھوس ہیں۔ ایسا نہیں، یہ تو بھرتو ہیں۔ بیچنا ہو تو میں آپ کے سامنے توڑ کر دِکھا دوں گا۔''

تیال کی نظروں میں موہنی کی پچھلی کلائیاں پھرنے لگیں، کیسی بھری بھری گوری گوری تھیں وہ۔ جب موہنی دُلہن بن کر آئی تھی، نرم نرم کلائیاں، نرم نرم ہاتھ، اور اب آٹا گوندھتے گوندھتے، برتن مانجھتے مانجھتے، روٹیاں سینکتے سینکتے کیسے جھلستے، جیسے کالے اور کیسے کھردرے ہوگئے۔ وہی صندل اور مکھن والے ہاتھ اور کلائیاں ـــــ سپید چمکتے پانی کو نالی میں ڈالو، وہی کیچڑ ـــ کیا ہوں گے اب یہ کڑے؟ موہنی کے پاس ان کے پہننے والی کلائیاں ہی نہیں۔

"اچھا توڑ دو ان کو۔" بڑی شکست، بڑی یاس، بڑی جھلاہٹ تھی اس آواز میں۔

صرّاف آئے دن اس طرح کی آوازوں کے سننے کا عادی تھا، اس نے خاموشی سے کانٹا نکالا۔ کڑوں کو تولا، پورے دس تولے کے اُترے۔ صرّاف نے ایک کاغذ نیچے رکھ کر اُنھیں ایک بڑی قینچی سے کاٹ دیا۔ اندر سے کالی کالی لاکھ ڈھیر کی ڈھیر نکل کر کاغذ پر گر پڑی، سونے کی صرف خول تھی۔ تیال نے سوچا یہ گہنا سسرال والوں جیسا ہے، اُوپر سے کچھ، اندر سے کچھ۔ صرّاف نے خول کو تولا، بس پونے تین تولے!

"اس میں بھی ٹانکا ہے۔ میں سو کے بھاؤ لوں گا۔"

تیال کو محسوس ہوا جیسے وہ جذبات کی لہروں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ بہت خوش تھیں ماتا جی ان کڑوں کو دیکھ کر۔ بڑا گھمنڈ تھا موہنی کو اس خول پر۔ بغلیں بجاتے ہوں گے سسرال والے اُسے اس طرح بیوقوف بنا کر۔ بیساختہ جی چاہنے لگا جلدی بھاگو۔ پھینکو ان دھوکے کی یادگاروں کو۔ اُس نے خاموشی سے صرّاف سے روپے لیے اور اسپتال کا رُخ کیا۔

گول دروازے میں سے گزر رہا تھا کہ ایک بچی کے رونے کی آواز نے چونکایا۔ کبڑن اپنی چھوٹی بچی کو مار رہی تھی۔ "ہرام جادی سبوں سبوں (صبح صبح) کھانے کو مانگتی ہے۔ ابھی نہ کوئی گاہک آیا نہ بوہنی ہوئی۔ بس یہ سارے پلے چاپڑے۔ ایک ہوں، دو ہوں تو رات کی روٹی دے کر بہلا دوں۔ موئے سات سات ہیں۔ ہرامی پلّے۔ آجج ہوں آجج (عاجز)!"

برابر کی دُکان سے ایک بولا "ارے تو کس نے کہا تھا ہر سال جننے کو۔"

وہ پلٹ پڑی۔ "ارے تمھارے منہ میں کیڑے پڑیں۔ میں اپنی کھوسی (خوشی) سے جنتی ہوں، اللہ کے نہ آنکھ ہے نہ کان، بس دیئے چلا جاتا ہے۔ سیٹھوں کو روپے دیتا ہے، ہم گریبوں کو یہی چھچھڑے۔"

''دوسرا بولا۔ ''ارے تو بھگوان کو کیوں دوش دیتی ہے۔ میاں کے پاس لیٹتی کھد (خود) ہے اور لڑتی ہے بھگوان سے!''

کبڑن سے جواب نہ بن پڑا، اُس نے جھک کر روتی بچی کو دو طمانچے اور دیئے۔

تیال کو اپنی بچیاں یاد آگئیں۔ رکشا کر کے گھر بھاگا۔ ابھی قفل ہی کھول رہا تھا کہ دونوں کے رونے کا شور سنائی دیا۔ لتا تو وہیں ڈیوڑھی میں لوٹ رہی تھی۔ سوہنی بلک بلک کر اپنے کو پلنگ پر سے گرایا ہی چاہتی تھی۔ تیال نے دونوں کو گود میں اُٹھالیا۔ گھر میں پھر قفل دیا اور اسپتال چلا۔ راستے میں ایک چائے کی دُکان پر کھڑے کھڑے اُس نے بسکٹ خرید کر بچیوں کو دیئے، ٹافی لے کر جیب میں رکھی اور خود ایک پیالی چائے پی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ڈوبتے دل کو گرم پانی کی اس پیالی نے اُبھار دیا۔ اس کے سر اور جسم کا بھاری پن قدرے کم ہوا۔ نئے خریدے ہوئے بیڑی کے بنڈل نے اور ڈھارس دی۔ ہر کش کے دھویں کے ساتھ دل میں گھستے ہوئے جذبات ہلکے ہونے لگے۔

جب وہ اسپتال پہنچا تو پھاٹک ہی پر روک دیا گیا۔ اب مردوں کے اندر جانے کی اجازت نہیں۔ جب اس نے نام، پتہ، کمرہ بتایا اور فیس جمع کرنے کا ذکر کیا تو دفتر تک پہنچایا گیا۔ روپے جمع کرنے کے بعد اُس نے موہنی کی خیریت پوچھی۔ کلرک نے گھنٹی بجائی۔ وہ نرس آئی جس نے موہنی کو فرش سے اُٹھایا تھا۔ بوٹا سا قد، سانولا سلونا رنگ، چھریرا بدن، چہرے پر ہلکا پاؤڈر اور گھنگھریالے بالوں پر سفید رومال ٹوپی کی طرح بندھا ہوا، خاصی دیدہ زیب تھی۔ تیال اُسے حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ انھیں چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں اس کی موہنی کی جان ہے۔ وہ اس کی بوکھلاہٹ پر مسکرائی۔

''آپ کی عورت ٹیبل پر ہے، ایک چھوٹا سا آپریشن ہوگا۔''

''آپریشن!''

گھبرانے کی بات نہیں، ذرا سا کمپلی کیشن ہے۔''

تیال نے دیکھا، موہنی خون میں لت پت میز پر پڑی ہے، اور ڈاکٹرنیاں اور نرسیں منہ پر کپڑا باندھے بڑے بڑے چھرے ہاتھوں میں لیے اُس پر جھکی ہیں اور اُن کے چھرے دھوپ میں اس طرح چمک رہے ہیں کہ اُن کو دیکھنے سے صرّاف کے آئینے کی طرح آنکھوں میں

چکا چوندھ پیدا ہوتی ہے۔ اس کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی اور لتا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرنے لگی۔ نرس نے جلدی سے آگے بڑھ کر بچی کو بھی سنبھالا اور اُسے بھی۔ تیال کو کرسی پر بٹھا کر نرس ایک گلاس پانی لائی اور تیال کی پیٹھ تھپک تھپک کر اسے پلایا۔

پانی سے زیادہ لتا کے رونے نے تیال کے حواس خطا کر دیئے۔ بچی نے پھر ماتا جی، ماتا جی کی رٹ لگائی۔ تیال نے اسے ٹافی دے کر چپ کر دیا اور جب سوہنی نے بھی منہ پچکایا تو اُس کے ننھے ہاتھوں میں بھی ایک ایک تھما دی۔

کمرے کی کلاک نے ٹن ٹن دس بجائے۔ تیال کے دماغ کے بند دروازوں کی جیسے کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ وہ چونک کر بولا۔ ''ارے مجھے کچہری پہنچنا ہے۔ ان بچوں کو کیا کروں؟'' کلرک سے معلوم ہوا کہ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس ہے۔ اس کی الگ فیس ہے۔ وہ بھی داخل کی اور بچوں کو بیوی کی طرح اسپتال میں چھوڑ کر وہ دفتر آیا۔

وہاں آ کر تیال نے پراویڈنٹ فنڈ نکالنے کی درخواست دی۔ بڑے بابو نے درخواست دیکھتے ہی کہا۔ ''ابھی دو مہینے ہوتے ہیں کہ تم نے پچھلا ایڈوانس صاف کیا ہے۔ اب یہ کیسا؟'' انھیں رام کہانی سنانا پڑی۔

بڑے بابو نے عینک ناک کے بانسے پر ذرا کھسکا کر تیال کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ بڑے خشک لہجے میں بولے۔ ''تو یہ ہر دو سال میں بچّے پیدا کرنا کیوں ہی ضروری ہے۔

بڑے بابو کے بارے میں مشہور تھا کہ اُن کی بیوی شادی کے دوسرے ہی برس ایک رنگیلے کہار کے ساتھ بھاگ گئی تھی، اور جب انھوں نے کہار کو گرفتار کرا کے تین برس کی سزا دلوادی تو اُس نے زہر کھا کر جان دے دی تھی۔ جب سے آج تک نہ تو بڑے بابو نے عورت کا نام لیا تھا اور نہ ساتھیوں میں سے کسی سے وہ ہنس کر بولے تھے۔ وہ بس دفتر کے کیڑے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ تھے اور فائلیں تھیں، نہ کسی کے ہاں آتے جاتے تھے نہ کوئی اُن سے ملتا تھا۔ وہ زندگی کے باغ میں اس لکڑی کی طرح تھے جو توڑ کر الگ رکھ دی گئی ہو۔ اب چاہے بہار آئے یا خزاں، کونپلیں پھوٹیں یا کلیاں مرجھائیں، پھل آئے یا لاہی لگے۔ سوکھی لکڑی کو ان باتوں سے کیا مطلب۔ وہ تو صرف اس دن کے انتظار میں پڑی ہے جب وہ جلائی جائے گی اور جل کر بھی دوسروں کو جلائے گی۔ تیال نے کوئی جواب نہ دیا۔ بات سچ تھی، کڑوے گھونٹ کی طرح

حلق سے اُتار گیا۔ بڑے بابو نے ڈرانے والے لہجے میں کہا۔ ''چیف کے سامنے جانا پڑے گا۔'' وہ گردن جھکائے اپنی میز پر آ بیٹھا۔

چیف کے سامنے پیشی ہوئی۔ وہ قابل بھی تھے، جہاندیدہ بھی اور انسان بھی۔ انھوں نے صرف اتنا پوچھا ''تمھارے ہاں پھر بچہ ہو رہا ہے؟'' تیال نے اس 'پھر' کو پی جانا ہی مناسب سمجھا۔ اُس نے کہا ''میری عورت اسپتال میں ٹیبل پر ہے۔'' چیف نے درخواست منظور کر دی۔

اب بل بنانا اور رقم اُتارنا باقی رہ گیا۔ بل کلرک ساتھی تھی، اُس نے جھٹ پٹ بل تیار کر دیا، مگر خزانے سے پاس ہونا اور امپیریل بینک سے وصول ہونا دو بڑی رُکاوٹیں بیچ میں آ گئیں۔ معلوم ہوا ایک خندق تو پار ہو گئی، مگر امپیریل بینک کا مرحلہ کل کے پہلے سر ہونا ممکن نہیں۔

تیال دن بھر انھیں اُلجھنوں میں رہا۔ دو بجے خیال آیا، فون کر کے موہنی کی خیریت کیوں نہ پوچھوں۔ ڈائریکٹری میں نمبر ڈھونڈا۔ معلوم ہوا مردانے اسپتال میں ٹیلی فون ہے، زنانے میں نہیں، وہیں فون کیا۔ ایک کمپاؤنڈر نے جواب دے دیا ''ہمیں کیا خبر کہ وہاں کس کے بچہ ہوا کس کے نہیں۔'' خوشامد کی ''بھیا پچھوا لو۔'' اُس نے کہا ''ابھی فرصت نہیں۔ نمبر بتا دوں، پچھوا کر بتا دوں گا۔ اب ہر آدھ گھنٹے پر کھٹکھٹانا پڑا۔ تیسری دفعہ جواب ملا ''ابھی وہاں دیر ہے۔''

تیال کے لیے یہ دیر اندھیر میں بدل گئی۔ طرح طرح کے برے خیالات نے تصویروں کا رُوپ بھرا۔ موہنی کو بیہوشی کی دوا سنگھا کر اُسے ڈاکٹرنی کاٹ پیٹ رہی ہے۔ موہنی بیہوشی سے ہوش میں نہ آئی۔ کلوروفارم کی مقدار زیادہ ہو گئی اور وہ سوئی کی سوئی رہ گئی۔ موہنی کا بچہ صحیح سالم نہیں پیدا ہو سکتا۔ اُس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈاکٹرنی نکال رہی ہے۔ مردہ موہنی فرش پر پڑی ہے اور اس پر مکھیاں بھنک رہی ہیں۔

ایک مکھی بھنبھناتی ہوئی تیال کی ناک پر آ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے ہاتھ کا چونگا بنا کر اُسے پکڑنا چاہا، وہ اُڑ کر فائل پر جا بیٹھی اور فائلوں کے عوض ہاتھ میں اس کی اپنی ناک آئی۔ وہ جھنجھلا اُٹھا، اُس نے دوسری فائل اُٹھا کر زور سے مٹھی پر دے ماری۔

بڑے بابو نے ناک پر عینک سنبھالتے ہوئے کہا ''مکھی ہی مارتے رہو گے کہ آج کچھ

کام بھی کرو گے۔"

تیال نے بڑے بابو کو زہر کی نظر سے دیکھا اور وہ میز پر سر رکھ کر سسکنے لگا۔ چھوٹے بابو پنڈت سدانند نے اپنی میز چھوڑی۔ چلتے تو معلوم ہوا ڈھول لڑھکا دیا گیا ہے۔ پانچ فٹ چار اِنچ قد، پتلی پتلی ٹانگیں، بڑی سی توند، بھرے بھرے گال، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پیشانی پر چندن کی تین لکیریں، بڑی سی چوٹیاں، مگر آدمی تھے دل والے۔ بڑے بابو کی رُکھائی کا کڑواپن اپنی ہنسی کی مٹھاس سے کم کر دیا کرتے تھے۔

سدانند جی لڑھکتے ہوئے تیال کے پاس آئے۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُنھوں نے پوچھا "کیا بات ہے تیال؟ سب کشل آنند تو ہے؟"

تیال نے کہا "موہنی ٹیبل پر ہے۔"

وہ بولے "اچھا تم اسپتال جاؤ، میں بڑے بابو کو سمجھائے دیتا ہوں۔"

بڑے بابو نے یہ اختلاط دیکھ کر پہلے ہی منہ سکھا کر چہرہ موڑ لیا تھا۔ چھوٹے بابو ان تک لڑھکتے پہنچے۔ انھیں کچھ آہستہ آہستہ سمجھایا، وہ بولے "آپ ذمہ دار ہیں۔" سدانند جی نے کہا "ہاں ہاں، جاؤ جی تیال، تم جاؤ!"

وہ پھر اسپتال پہنچا۔ چار بجے تھے۔ مردانہ تھا۔ موہنی کے کمرے میں گیا۔ وہ کمبل اوڑھے بستر پر بے جان سی اکیلی پڑی تھی۔ چہرے بھر میں لہو کی ایک بوند نہ تھی۔ تیال کا کلیجہ دھک سے ہو گیا، جس کا دن بھر دھڑکا لگا تھا وہی ہوا۔ تیال کے منہ سے اس طرح کی آواز نکلی جس طرح کی پانی سے بھرے ہوئے ٹب سے اس کے سوراخ کھل جانے سے نکلتی ہے۔ بھک، بھرک، بھک! اس عجیب آواز پر موہنی نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک کمزور سی مسکراہٹ سے اس کے ہونٹ تھرائے۔ تیال دوزانو پلنگ کے پاس گر پڑا۔ بیوی کے بستر کی پٹی پر سر رکھ کر وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ موہنی کا سوکھا ہاتھ آہستہ آہستہ کمل سے نکل کر اس کا سر تھپکنے لگا۔ اُس نے سر اُٹھا کر بیوی کو دیکھا۔ "اب کتنی دیر ہے؟" موہنی کے ہونٹ کج ہو گئے۔ وہ انسانی علم کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ بڑے بڑے دعووں کے بعد کسی کو کچھ نہیں معلوم۔

سانولی سلونی نرس کھٹ پٹ کرتی اندر داخل ہوئی۔ "اوہ آپ آ گئے، لیجیے یہ نسخہ، جلدی سے انجکشن کی دوائیں لائیے۔"

وہ نسخہ لے کر چلا، اسپتال کے دروازے پر لتا اور سوہنی یاد آئیں۔ تھوڑی دیر بیوی کی محبت اور بچیوں کی محبت میں رسہ کشی رہی۔ پھر اُس نے اونہہ کہہ کر بیوی کو جتا دیا اور بازار آیا۔ امین آباد، چوک اور حضرت گنج تینوں جگہ کے دواخانے دیکھے۔ جب جا کر انجکشن کی ساری دوائیں ہاتھ آئیں۔ قیمتی بھی تھیں اور کمیاب بھی۔ چھ بجے کے قریب پلٹا تو نرس نے جلدی سے دوائیں لے کر اُسے جلدی سے اسپتال سے باہر جانے کو کہا۔ مردوں کا وقت ختم ہو گیا تھا۔

جب وہ پلٹنے لگی تو تیال نے ڈرتے ڈرتے دس کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ مسکرائی، اس کے دانت بہت سفید اور خوبصورت تھے۔ ''یہ کیا؟''

تیال نے کہا ''میں یہیں پھاٹک پر پہرا دوں گا۔ میرے بچوں کا انتظام کرا دیجیے اور مجھے جلدی جلدی خبر بھجوائیے۔'' وہ 'اچھا، اچھا' کہتی چلی گئی۔ دربان نے بھی تھوڑی ہمدردی جتا کر ایک روپیہ اینٹھا۔ پھر رائے دی۔ ''بابو جی، ایسے کاموں میں دیر لگتی ہے۔ آپ گھر جا کر منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا پی تو آیئے۔''

ان خریدے ہوئے وعدوں سے ان کی ڈھارس بندھ گئی اور اُسے محسوس ہوا کہ اُسے بھوک لگی ہے۔ گھر کی کالی کوٹھری میں جانے کو جی نہ چاہا۔ وہ پاس ہی کے ایک ریستوراں میں گھس گیا۔ اُس نے وہاں چائے کے ساتھ توس مکھن، کیک، بسکٹ، کریکر، جلی، انڈے اور نہ جانے کیا کیا کھایا۔ وہ اپنا پیٹ ایک خالی گھڑے کی طرح بھر رہا تھا۔ وہ نوالہ چباتا نہ تھا، بلکہ نگلتا جاتا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کافی کھایا اور خاصی مہنگی چیزیں کھائیں۔ اس لیے کہ جب اُس نے بل ادا کیا تو اُسے سوا سات روپے دینے پڑے۔ سات روپے تو کھانے اور چائے کے اور چار آنے ٹپ کے۔ پھر بھی وہ اپنے کو رستوراں میں اجنبی محسوس کرتا رہا اور یہ سمجھتا رہا جیسے ہر شخص اسی کو بغور دیکھ رہا ہے۔ اسی لیے اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اپنی بیڑی وہاں سلگائے۔ وہاں تو ہر شخص قیمتی سگریٹوں کا ٹین ہاتھ میں لیے آتا یا چاندی سونے کے سگریٹ کیسوں سے سگریٹ نکال کر جلاتا ہے۔ وہاں اس پتیوں والی چھچھوندر کا کہاں گزر؟ مگر ریستوراں کے اس وزنی بل نے اس کو فضول خرچی کی طرف مائل کر دیا۔ اب بھی پچاس کے اوپر ہی روپے اس کی جیب میں پڑے تھے۔ وہ بھی آج ایک اچھی سی سگریٹ پیے گا۔ اُس نے ریستوراں کے سامنے والی دُکان سے پلیئرز کی ایک ڈبیہ خریدی اور ایک سگریٹ جلا کر اُسے

منہ میں لگائے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں رکھے شان سے ٹہلتا ہوا اسپتال آیا۔

وہاں اطلاع ملی سوہنی اور لتا کھلا پلا کر سلا دی گئی ہیں۔ اور موہنی پھر ٹیبل پر ہے۔ سگریٹ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی اور تیال نے پھاٹک پر ٹہلنا شروع کیا۔ بالکل ایک سنتری کی طرح۔ رائٹ ٹرن! کوئک مارچ! ایک دو، ایک دو، ایک، دو! لیفٹ ٹرن! کوئک مارچ! ایک، دو! ایک دو! رائٹ اباؤٹ ٹرن! کوئک مارچ! ایک، دو! ایک، دو....

موہنی مرگئی تو؟ —— سامنے شمشان پر چتا جلنے لگی۔ برہمن کھڑا سوکھی لکڑیوں پر گھی ڈال رہا ہے اور دھویں کے ساتھ ساتھ جلتے گوشت اور گھی کی چراند اُٹھ رہی ہے۔ دفعتہً موہنی شعلوں میں لپٹی ہوئی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی شکایت کرتی ہوئی آواز ساری فضا میں گونج اُٹھی۔ ’’تم نے مجھے اپنی ہوس کا شکار بنایا۔ تم نے یہ نئی بلا میرے سر منڈھی! تم نے مجھے جلا کر خاک کیا! تم نے! تم نے!‘‘ اور اس کی آواز میں لتا کی چیخ، سوہنی کی چیخ شامل و شریک ہوگئی۔ ’’ماتا جی! ماتا جی!‘‘

تیال ٹھٹھک کر سننے لگا۔ کان بج رہے تھے۔ پیشانی پسینے سے تر تھی۔ حلق کڑوا تھا، ہاتھوں کی مٹھیاں بند تھیں۔ اُس نے دانت پر دانت بھینچ کر اپنے آپ سے کہا ’’اب کبھی نہیں! مرد بچہ ہوں تو اب کسی عورت کے پاس لیٹوں گا ہی نہیں!.... کبھی نہیں!‘‘.... وہ پھر چلنے لگا۔ لیفٹ رائٹ، ایک، دو! ایک، دو!.....

دُور سے ایک نوزائیدہ بچّے کے رونے کی آواز آئی۔ ’’کے ہاں! کے ہاں!‘‘ سنتری لیفٹ رائٹ بھول گیا۔ اُس کے پاؤں جم گئے۔ نظریں صحن کی تاریکی کو چیر کر برآمدے کے دُھندلکے کے اس پار آپریشن روم میں سب کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا، برآمدے میں ایک سپید سایہ دِکھائی دیا اور صحن کے اندھیرے کو طے کرتا اس کی طرف بڑھا۔

سانولی سلونی نرس نے ہانپتے ہوئے کہا ’’بیٹا مبارک‘‘ —— اور ایک ساتھ اُس کے سامنے دونوں ہاتھ پھیلے۔ ایک نازک زنانہ، دوسرا سوکھا مردانہ۔ تیال نے حلق میں اٹکی ہوئی سانس کو پھیپھڑوں میں اُتارا اور جیب سے نکال کر دس کا نوٹ زنانے ہاتھ میں اور پانچ کا نوٹ مردانے ہاتھ میں رکھ دیا۔

برآمدے سے جھنجھناتی آواز آئی۔ ’’نرس!‘‘ —— ’’جی، آئی!‘‘ اور وہ بھاگ گئی۔ تیال

نے لڑکھڑا کر پھاٹک کا سہارا لیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ نرس پھر پلٹی۔ ڈاکٹرنی کہتی ہیں "جلدی سے پینسلین کے دس دس لاکھ کے تین ٹیوپ لے آیئے۔ انجکشن دینا ضروری ہے۔"

تیال پرزہ لے کر جلدی سے رکشے پر بیٹھا اور پھر بھاگا۔ پھر کئی دُکانیں دیکھنا پڑیں۔ جب جا کر ٹیوپ ملے، رکشے والے نے بھی خاصے دام لیے اور دواخانے والے نے بھی۔ جیب اب بہت ہلکی ہو چکی تھی۔ پھر بھی خوشی تھی، بیٹا ہوا اور موہنی کی دوا مل گئی۔

اندر دوا بھجوا کر پھر پہرہ شروع ہو گیا۔ رائٹ لیفٹ! رائٹ لیفٹ! ایک، دو، ایک، دو۔

ساڑھے دس بجے مہربان نرس نکلی۔ سپید وردی پر سیاہ کوٹ، ہاتھوں میں پرس، آنکھوں میں خمار۔ قریب آتے ہی جماہی لی۔ "ایں آپ اب بھی یہیں کھڑے ہیں۔ آپ کی مسز کو ٹھیک دس بجے انجکشن دے دیا گیا۔ وہ بھی سو رہی ہیں اور بچّے بھی۔ جایئے اب آپ بھی جا کر سویئے۔"

تیال ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ رکشے کے قریب پہنچتے پہنچتے نہ جانے کیوں اس کے منہ سے نکل گیا "میں آپ کو آپ کے گھر نہ چھوڑ آؤں؟"

اُس نے رُک کر تیال کو دیکھا۔ اس کی پتلیاں پھیلیں اور سمٹیں۔ وہ ذرا کسمسائی، پھر اُس نے کھل کر انگڑائی لی۔ "اے کنگڈم فور اے پگ!" (A Kingldom for a Peg) اس کے موتی جیسے دانت جھلنے لگے۔

تیال بھی مسکرا دیا۔ "آیئے چلیے، امپیریل چلیں۔" وہ خاموش اس کے ساتھ رکشے پر بیٹھ گئی۔ امپیریل میں دونوں نے ایک کی جگہ دو دو پیگ پیے۔ تیال نے گھڑی دیکھی۔ پھر رکشے پر بیٹھے، "کہاں چلوں" تیال نے پوچھا۔ وہ ہنس دی۔ اُس کے حسین دانت اور بھی چمکے۔ "چلیے آپ کو آپ کے گھر چھوڑ آؤں۔"

تیال نے اندھیری گلی کے موڑ پر رکشا رخصت کیا۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے تاریک اور خالی گھر تک آئے، اور دونوں نے ہنستے ہوئے وہاں روشنی جلائی۔

صبح کو جب تیال اسپتال جانے لگا تو اس کی جیب میں صرف ایک روپیہ تھا اور کچھ آنے پیسے، پھر بھی وہ بار بار سیٹی بجا رہا تھا اور گنگنا رہا تھا۔

"پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے۔"

جیسے ہی اُس نے باہر نکل کر قفل بند کیا، شہدوں کے ایک جھنڈ نے اُسے گھیر لیا۔ کوئی بغل بجار ہا تھا، کوئی منہ سے پٹ پٹ کر رہا تھا، کوئی ایک ساتھی کے سر پر طبلے کے بول نکال رہا تھا۔

''مبارک سلامت! مبارک سلامت! بیٹا مبارک! چاند سا بھیا مبارک! سورج سا ننھا مبارک۔''

تیال نے آخری روپیہ جلدی سے جیب سے نکال کر اُن کے بیچ میں پھینک دیا۔ انھوں نے شور مچایا ''دو بیٹیوں پر پہلا بیٹا، راجہ ہوگا راجہ، بابو جی اور انعام! اور انعام۔'' اُس نے بچے ہوئے پیسے بھی وہیں پھینک دیے اور تیز چلا۔

اُن میں سے ایک دل جلے نے آواز دی۔ ''ارے پہلے بیٹے پر اتنا کم انعام! اللہ کرے ہر تیسرے مہینے ایک ہو کہ ہم شہدوں کا بھی پیٹ بھرے۔''

تیال سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ شہدوں کا شور گلی کے موڑ تک اس کا پیچھا کرتا رہا۔ وہاں اکثر سواری دینے والے رکشے والے نے پوچھا۔ ''کہیں لے چلوں بابو جی!''

تیال نے کوٹ کی دونوں خالی جیبیں باہر نکال کر دِکھا دیں۔ رکشے والے کی گھبراہٹ پر وہ بے ساختہ ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مگر وہ بار بار مڑ کر گھر کی گلی کی طرف دیکھتا تھا اور اس کے ہونٹ اس طرح ہلتے تھے جیسے وہ کہہ رہا ہے ''مبارک! مبارج؟ ہر تیسرے مہینے ایک! ہر تیسرے مہینے ایک!'' — دفعتہً اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اس پر ندامت، خجالت، حقارت، نفرت اور غصّے کے آثار جھلکے۔ اس نے رُک کر سڑک پر تھوک دیا۔ اس کے کج ہونٹوں سے آواز نکلی — ''چھچھڑا!''

(ماہنامہ آج کل، دہلی مارچ ۱۹۵۲ء)

حقِ نمک

راجے چھ برس کا تھا۔ جب ٹھاکر صاحب نے اُسے پانچ روپیہ پر مول لیا ۳۴ء کے زلزلے میں اس کا گھر کا گھر صاف ہوگیا تھا۔ ماں باپ، بھائی بہن سب کے سب گرتے ہوئے گھر کی قبر میں زندہ دفن ہوگئے تھے۔ وہ اتفاق سے اُس وقت گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ مویشی چرانے گیا تھا۔ یہاں فرشتوں نے زمین کو جھولا بنا کر دو چار ٹیڑھی ترچھی پینگیں لیں۔ اور اُن کے تین چار منٹ کے کھیل نے سینکڑوں بنے گھر گرادیئے اور ہزاروں بسے گھر اجاڑ دیئے۔ راجے جب گھر پلٹا تو اُس نے وہ سماں دیکھا کہ شاید اگر زیادہ سمجھ ہوتی تو وہ پاگل ہوگیا ہوتا۔ مگر بچہ ہی تو تھا، وہ اپنے بھائی بہنوں اور ماں باپ کو نہ پا کر تھوڑا سا رویا، گلگلایا اور پیٹ بھرنے کی فکر میں لگ گیا، مگر گاؤں میں جتنے لوگ بچ گئے تھے۔ سب اسی فکر میں گرفتار تھے۔ گھر کی بربادی مرنے والوں کا سوگ اور بھوک کی دُور نہ ہونے والی تکلیف، ہر ایک کے لیے یکساں تھی۔ دوسرے گاؤں تک پہنچنا بھی مشکل ہی تھا۔ زمین جگہ جگہ سے میلوں تک ککڑی کی طرح پھٹ گئی تھی اور کوس بھر کے فاصلہ پر بہنے والے دریا کے پانی نے بھاگلپور ضلع کے اس گاؤں کو اچھا خاصا ایک جزیرہ بنادیا تھا۔ راجے اور سارے گاؤں کو پورے دو دن پانی کے اِس محاصرہ میں بھوکا رہنا پڑا۔ تیسرے دن آس پاس کے لوگ کشتیوں میں سوار ہو کر آئے اور انھوں نے بڑی کوششوں سے اِن لوگوں کی جان بچائی... اسی نفسا نفسی کے عالم میں گاؤں کے ایک پاجی نے، جس کی رسّی دراز تھی، اِس بچّے کو اپنایا اور تین چار دن کے بعد اُسے ٹھاکر صاحب کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

ٹھاکر صاحب قانون سے واقف تھے، جانتے تھے کہ انسان کا بیچنا اور خریدنا اب

برطانوی ہندوستان میں جرم ہے، لیکن ان کے خاندان میں زمینداری اس سمے سے چلی آتی تھی، جب پٹھان اور مغل بھی ہندوستان میں نہ آئے تھے اور اُن کے پُرکھے سینکڑوں داس اور داسیوں کے بغیر ایک قدم بھی چلنا گوارا نہ کرتے تھے، اس لیے ان کے سامنے یہ سوال کوئی اخلاقی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ نیچ قوموں کے لوگ ٹھاکروں اور برہمنوں کی سیوا کے لیے بنائے ہی گئے ہیں۔ یہ تو برہما کے پاؤں سے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان کا کام تو ٹھوکریں کھانا اور جوتیاں سیدھی کرنا ہی۔ رہی سرکار کی طرف سے پوچھ گچھ، سو اس کا کوئی ڈر نہ تھا، کہار مہریاں گھر میں تھیں، اُن میں سے ہر ایک کو پولیس آنے پر اس بچے کا دعویدار بنایا جا سکتا تھا چنانچہ اُنھوں نے راجے کو بے کھٹکے مول لے لیا۔ اُن کو اس زمانے میں اسی سن و سال کے ایک لڑکے کی تلاش بھی تھی۔ ان کا تین برس کا ہیرا، ایک تو بچپن سے ہی کچھ اعضا بیکار لے کر پیدا ہوا تھا۔ مگر پچھلے چھ مہینہ میں تو وہ طرح طرح کی بیماریوں کا ایسا شکار ہوا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو گئی تھیں، اب اس کے لیے ایک مستقل سواری کی ضرورت تھی۔ وہ بھی کسی جانور کی نہیں۔ ہیرا نا سمجھ تھا۔ سواری کو سمجھ دار ہونا چاہیے تھا، اس کے لیے ایک لڑکا سب سے زیادہ موزوں تھا۔ کوئی چھوکرا نوکر رکھا جا سکتا تھا۔ دنیا میں ہر طرح کی خدمت چند پیسوں میں خریدی جا سکتی ہے، لیکن اگر کوئی جان ہی چند روپوں میں مل جائے، تو اِس سے بہتر کیا صورت ہو سکتی تھی! چنانچہ راجے خریدا گیا۔
بھوکا، ننگا، چیتھڑوں میں لپٹا ہوا، ہڈی اور چمڑے کا ڈھانچہ۔

ٹھاکر صاحب نے حکم دیا۔ ’’اس کے کپڑے بدلو، خوب کھلاؤ پلاؤ۔ یہ ہیرا کی سواری ہے۔ مضبوط نہ ہوگا۔ تو بوجھ کیسے اُٹھائے گا۔ صاف نہ ہوگا تو ہیرا کو بھی میلا کرے گا۔‘‘ راجے کے لیے نائی آیا۔ خط بنا۔ خاص ٹھاکر صاحب کی پرانی دھوتی پھاڑ کر اس کے لیے دھوتیاں بنیں۔ اور خاصے کا بچا کھچا کھانے کو ملا، اُس نے بھی خوب ٹوٹ کے کھایا۔ جھوٹا، بچا کھچا، جو کچھ ملا۔ سمیٹ گیا۔ چھ برس تک ایسے اچھے کھانے پیٹ میں نہ گئے تھے۔ اُس نے وہاں پہنچتے ہی ہاتھ پاؤں نکالے، راجے پانچ سات دن کبھی پیٹ کے درد کا، کبھی قبض کا، کبھی دستوں کا روگی رہا۔ پھر چند ہی دِنوں میں لوٹ پوٹ کے ٹھیک ہو گیا۔

اب اس نے اپنے فرائض انجام دینا شروع کیے۔ دن بھر یا تو ٹھاکر صاحب اور ٹھکرائن صاحبہ کے احکام بجا لاتا، یا کسی کہار یا مہری کا اس کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا۔ چار بجے شام سے

ہیرا کو لے کر سڑک پر نکلتا۔ اس لڑکے کی قطع 'سند بادی تسمہ پا' کی تھی۔ جس وقت سے گودی میں آتا۔ آٹھ بجے رات تک اُترنے کا نام نہ لیتا۔ سڑک پر موٹر جاتے دیکھتا تو فرمائش ہوتی ویسے ہی تم بھی چلو۔ راجے منہ سے 'پوں، پوں' کرتا۔ اس کے پیچھے دوڑتا۔ اِکّا، تانگا نظر پڑتا۔ تو حکم ہوتا۔ ''منہ میں رسّی لو۔'' پھر تخ تخ کر کے راجے دوڑایا جاتا۔ اگر راجے اس کو لیے ہوئے دو چار دس منٹ بھی بیٹھ جاتا۔ تو وہ شور مچاتا کہ اللہ اکبر بس ایک چیخ اُوپر ہوتی، ایک نیچے۔ نتیجہ میں راجے دو چار تھپڑ کھا کر روتا، بلکتا، سسکتا، اپنے بوجھ کو لادے پھرتا۔ ''پوں، پوں' کرتا۔ دوڑتا اور پھر 'تخ تخ' کی آواز پر دُلکی چلتا۔ وہ رات کو اتنا تھک جاتا کہ پلنگ پر لیٹتے ہی سو جاتا۔ وہ اتنی جلدی سونے پر بھی ڈانٹا جاتا۔ مہریاں کہتی ''اچھا یہ بھی لونڈا ہے۔ کہ تیل میں بتّی پڑی نہیں۔ کہ اس کی آنکھیں بند ہوئیں۔ نہ تن من کا ہوش، نہ کھانے پینے کے حواس۔'' غرض جھنجھوڑا جاتا، ڈانٹا جاتا تھا... پیٹا جاتا تھا، تب جا کے وہ اُٹھ کے رات کو کھانا کھاتا۔ رات کو سونے میں کبھی وہ ماں کو خواب میں دیکھتا۔ کبھی باپ کو، کبھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلتا ہوتا۔ کبھی کسی بھینس کی دم تھامے دوڑتا ہوتا۔ اور کبھی کبھی ہاتھ پاؤں کا درد اور زلزلے کا خوف کسی مہیب دیو یا بھوت کی صورت میں اس پر مسلّط ہوتا اور اس کے ہاتھ پاؤں، اس طرح موڑتا، توڑتا، کہ وہ تکلیف سے چیخ اُٹھتا ایسے خوابوں کے بعد وہ اکثر ڈانٹا جاتا۔ اور گالیاں سن کر چپکا آنکھ بند کر کے پڑا رہتا تھا۔

ہیرا بات بات پر مچلتا تھا۔ دنیا جہان کے لٹو کھلونے، جوتے کپڑے، موزے، سٹیاں، گیند، غلیل، چھڑیاں، جو نئی چیز اُس کے سامنے سے گزرتی۔ وہ اس کے لیے خریدی جانا ضروری تھی۔ اب اگر ان چیزوں کو رکھ سینت سکتا تھا۔ تو وہ راجے ہی تھا۔ دوسرے کی مجال نہ تھی کہ وہ ہیرا کی کسی چیز کو ہاتھ لگا سکے۔ کسی نے ان کو چھوا نہیں کہ ہیرا نے چیخنا شروع کیا۔ اور سارا گھر سر پر اُٹھا لیا۔ خود اُس کی یہ حالت تھی کہ دو چار ہی منٹ میں ہر چیز سے جی بھر جاتا۔ اور قیمتی ہو یا سستی اس کے پُرزے پُرزے کر ڈالتا تھا۔ ان لاڈلے کو تو کوئی کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ کان گرمائے جاتے تھے تو راجے ہی کے۔ اُس نے آخر کیوں نہ اُن کو توڑنے سے روکا وہ تو بچہ ہی ہے۔ اس کا کام ہی توڑنا پھوڑنا ہے۔ یہ تو سمجھدار ہے، اُس نے کیوں نہیں اس چیز کو بچانے کی کوشش کی۔

غرض سینکڑوں طرح کی مصیبتیں تھیں۔ اور ایک راجے! مگر انسان کا بچہ تھا۔ سب جھیل گیا۔ کبھی کبھی اس کا دل یہ ضرور چاہتا کہ ماما، دائیوں کے کوسنے اور ٹھکرائن کی ڈانٹ ڈپٹ کا کلّہ بہ کلّہ جواب دے۔ کبھی وہ سوچتا کہ ٹھاکر صاحب کے گھر کو آگ لگا کر بھاگ نکلے۔ مگر اپاہج ہیرا کے حال پر ترس کھاتا۔ اور خون کے آنسو پی کر رہ جاتا۔ ہیرا سے ہمدردی نے پہلے محبت کی صورت اختیار کی۔ پھر اس محبت نے راجے میں وفاداری نفس کشی اور اطاعت شعاری کی وہ تمام صلاحیتیں پیدا کر دیں جو غلاموں میں آقاؤں کو پسند ہیں۔

اس کو اس طرح کی زندگی بسر کرتے ایک سال گزرا، دو سال گزرے، تین سال ہوئے۔ چار سال ہوئے۔ اس درمیان میں اُس نے بچپن کی حدوں سے قدم نکال کر لڑکپن کی حدوں میں قدم رکھا۔ اُس کے جسم کو تھکن بھی محسوس ہونے لگی اور چوٹ بھی۔ اُسے ڈانٹے جانے کا بھی احساس ہونے لگا۔ اور مارے جانے کا بھی۔ اُس کے اعضا میں سختی سی آنے لگی۔ اور اُس کے جسم پر اب کپڑے جلد جلد پھٹنے لگے۔ وہ دوسرے لڑکوں کو اسکول جاتے دیکھتا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے، کتابیں اور بستے بغل میں دبائے سائیکل پر یا پیدل چلے جا رہے ہیں۔ اُس کا جی چاہتا۔ وہ بھی اُن کے ساتھ جاتا، پڑھتا، لکھتا۔ داس کی جگہ بابو جی بنتا۔ ہمیشہ اُس کو سلام کے لیے نہ جھکنا پڑتا۔ بلکہ دوسرے بھی اُس کو سلام کرتے، اپنا ایک مکان ہوتا۔ آرام سے رہتا۔ نہ کوئی ڈانٹ سکتا۔ نہ مار سکتا۔ دفعتاً ہیرا ایڑ لگاتا۔ ’’ٹخ ٹخ چل بے گھوڑے چل!‘‘

ایک دن جاڑوں کے زمانے میں جبکہ ٹھاکر صاحب اپنی شہر والی کوٹھی میں تھے۔ مینہ بہت پڑا۔ دن بھر تو نہ ٹھاکر صاحب گھر سے نکلے۔ اور نہ ہیرا ہی اپنی سواری پر ہوا خواری کر سکا۔ شام کے قریب ذرا پانی بند ہوا۔ بجلی کی چمک، بادل کی گرج پہلے ہی کی طرح جاری تھی۔ راجے کو حکم ملا ہمیں سڑک پر گھماؤ۔ اُس نے سمجھایا۔ ’’نہیں بھیّا بہت مینہ پڑا ہے، سڑک پر سوائے کیچڑ اور پانی کے کچھ بھی نہیں، یہیں بیٹھے رہو۔‘‘ لیکن بالک ہٹ کے سامنے ایک نہ چلی۔ ہیرا کو پیٹھ پر لادا اور کوٹھی سے باہر نکلا۔ سڑک پر پانی دیکھتے ہی ہیرا باغ باغ ہو گیا اُڑوس پڑوس کے کچھ لڑکے اس پانی میں دوڑ رہے تھے اور چھینٹوں سے ایک دوسرے کو رنگ لگے تھے۔ بس مچل گیا۔ تم بھی اس طرح دوڑو اور مجھے لیکے دوڑو... راجے نے دوڑنا شروع کیا۔ چند ہی قدم تیزی

سے رکھے ہوں گے کہ پاؤں پھسلا اور مع ہیرا کے سڑک کے اُوپر بے تحاشا گرا۔ اس کے کولہے اور ران میں بڑی چوٹ آئی، مگر اس نے اپنی فکر نہ کی، جلدی سے پلٹ کے ہیرا سے پوچھا۔ ''بھیا چوٹ تو نہیں آئی۔'' وہ پہلے ہی سے بسور رہے تھے، ہمدردی کے سوال نے بھُس میں چنگاری کا کام کیا۔ گرجنے برسنے لگے۔ راجے ان کو چپ کرانے کی کوشش کرتا۔ لنگڑاتا، پانی اور کیچڑ میں لت پت کوٹھی پلٹا۔ اس کی یہ صورت دیکھتے ہی گھر بھر میں شور سا برپا ہو گیا۔ مہریوں دائیوں سے لے کر ٹھاکر ٹھکرانی تک جسے دیکھئے گالیاں دے رہا ہے اور ہر ایک دو ایک چپت گھونسے لات سے ضیافت بھی لیتا جاتا ہے۔ راجے ڈانٹا، اور پیٹا جا رہا تھا۔ کس سے اپنی بے قصوری بیان کرتا اور کسے اپنی چوٹ دکھاتا؟ وہ رو تا سسکتا، اور سردی سے کانپتا کمرے کے باہر کھڑا رہا اور وہاں سے اس وقت ہٹا جب اُسے ٹھکرائن کا یہ حکم کہ ''جا کے پاجی اپنے کپڑے نہیں بدلتا۔ کھڑا ٹسوے بہار ہا ہے! جیسے اس سؤر نے میرے بچے کے مار ڈالنے میں کوئی کسر اُٹھا رکھی تھی!'' اُس نے بھیگی دھوتی اُتار کر سوکھی دھوتی اور اپنی چست بنڈی پہن لی لیکن سردی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اندر ہی اندر بیٹھا گدگدا رہا ہے، وہ رہ رہ کے جھرجھری سی لے لیتا تھا۔ آخر وہ گھبرا کے چولھے کے پاس چلا۔ رسوئیا نے دُور ہی سے ڈانٹا، دیکھ ادھر قدم نہ رکھنا نہیں تو سب کھانا خراب ہو جائے گا!'' وہ ٹھٹک کے کھڑا ہو گیا۔ گڑگڑا کے بولا۔ '' کاکا بڑی سردی لگ رہی ہے! وہ ترشروئی سے بولا۔ ''تو میں کیا کروں چولھے میں سے سب آگ نکال کے تمھیں دیدوں، چل چل بڑا آیا وہاں سے سیٹھ بن کے، جا یہاں سے!''

راجے دُھتکارے ہوئے کتے کی طرح وہاں سے پلٹا اور وہاں گیا جہاں ہیرا کی گدّے دار مسہری کے پاس اس کا جھنگا پڑا تھا۔ وہ اپنے پلنگ پر گٹھری بن کے لیٹ گیا۔ اور اُس نے اپنے اُوپر وہ پھٹا لحاف ڈال لیا جو مالک و مالکہ کی پانچ سات برس تک خدمت کر چکا تھا... مختلف کاموں کے سلسلے میں جب وہ پکارے جانے پر نہ بولا تو ایک مہری نے کمرے میں جا کر اُس کی حالت دیکھی اور ٹھکرائن کو خبر کی۔ انھوں نے کہا۔ انہوں نے کہا۔ 'اسے اسی طرح پڑا رہنے دو، آج رات کھانا نہ دینا۔'' رات کو جبکہ سوتا ہوا ہیرا اس کمرے میں منتقل کیا گیا تو راجے کے جھلنگے سے ذرا ہٹ کے میز پر لیمپ جلا دیا گیا۔ اس کا بلب زیرو پاور کا تھا۔ یہ رات بھر جلتا تھا کہ کہیں بچہ رات میں جاگ جائے تو اندھیرے سے نہ ڈرے۔ مہری نے جاتے ہوئے پلٹ کے

کمرے کی ہر ایک چیز پر نظر ڈالی۔ مسہری پر ہیرا غافل سو رہا تھا۔ جھلنگے پر راجے پڑا تھا، لمپ جل رہا تھا۔ وہ اطمینان سے باہر چلی گئی... دو بجے کے قریب راجے پیاس سے پریشان پسینہ میں تر اُٹھا۔ اُس نے پہلے تو دو ایک بار لیٹے ہی پانی پانی کہا، پھر وہ لحاف پھینک کے اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی، وہاں کہیں پانی نہ تھا، وہ لڑکھڑاتا، لنگڑاتا دروازے کی طرف چلا۔ راستے میں اُس کا پاؤں بجلی کے تار میں اُلجھا اور لمپ تڑاق سے نیچے گرا۔ ٹوٹتے ہوئے بلب سے ایک شعلہ نکلا اور کمرے کی دری اور راجے کا جھلنگا جلنے لگا۔ وہ 'ہائے بھیّا' کر کے پلٹا۔ اُس نے لپک کے ہیرا کو اُٹھایا۔ وہ گھبرایا ہوا گردن سے لپٹ گیا، اتنے میں پاؤں میں اُلجھے ہوئے تار میں آگ لگی اور راجے 'ہائے' کر کے اچھلا پھر پورے قد سے منہ کے بل دروازے کے رُخ پر گرا۔ اپاہج ہیرا ہاتھ سے چھوٹ کر لڑھکتا دروازے کی چوکھٹ پر سے ہوتا ہوا کمرے کے باہر گرا اور راجے کو آتشیں شعلوں نے زرتار سہرا پہنا دیا۔

تھوڑی دیر بعد جب سسکتے ہوئے ہیرا نے راجے کی جانبازی کا واقعہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بیان کیا تو ٹھاکر صاحب نے کہا۔ "لڑکا اچھا تھا مرتے مرتے حقِ نمک ادا کر گیا۔"

ٹھکرائن نے تنک کر کہا۔ "ہونہہ اچھا کیوں نہ ہوتا! چھ برس کی جان کے لیے مٹھی بھر روپیہ نہیں دیا تھا؟"

خاموش! خاموش!

مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ پیش تھا، ملزم کے کٹہرے میں رامو چمار کھڑا تھا، سیاہ چہرے کی اُبھری ہڈّیاں، دھنسی دھنسی آنکھیں، چھوٹی اور تنگ پیشانی اس کے ڈر اور نسل کی شاہد تھی۔ نیچے کا جبڑا کچھ آگے نکلا ہوا تھا۔ اُس کی چوڑان نے چھوٹی ٹھڈی کو قریب قریب غائب کر دیا تھا۔ گردن سر پر بوجھ ڈھونے کی وجہ سے مضبوط تھی۔ جسم چھریرا تھا اور اس پر جوانی کی آخری چمک باقی تھی۔ کمر میں جو میلی سی مارکین کی دھوتی تھی وہ گھٹنوں سے اُوپر تک پہنچ کر ختم ہو گئی تھی۔ اِس لیے اس کی سوکھی پنڈلیاں دکھائی دیتی تھیں۔ پاؤں چپٹا تھا، اور اُس کی اُنگلیاں چھوٹی اور موٹی تھیں۔ تمام عمر ننگے پاؤں رہنے سے انگوٹھا انگلیوں سے ایک اِنچ کے فاصلے پر زاویہ قائمہ بنا رہا تھا اور تلوے کی کھال پھوٹ کی طرح جگہ جگہ سے پھٹ کر پاؤں کو چھاواں بنا رہی تھی۔

عدالت کے سامنے اسی رامو کی بیوی سوہنی کا بیان ہو رہا تھا۔ یہ ایک سترہ اٹھارہ برس کی جوان عورت تھی۔ اس کا بھرپور شباب ایک میلی پھٹی ہوئی ساڑی میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ گھونگھٹ نکالے کھڑی تھی۔ اس کی ناک پر خون آلودہ چیٹ بندھی تھی اور اس کی ساڑی پر جا بجا لہو کے دھبے پڑے تھے۔

سوہنی کے قریب ہی سرکاری وکیل کالا گاؤن پہنے کھڑے تھے۔ وہ ایک خاص انداز سے اپنے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے، اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں سے کھیلتے، گاؤن کا دامن برابر کرتے، اور پھر سوہنی سے کوئی ایسا سوال کر دیتے جس سے وہ کانپنے لگتی اور جس سے وہ شرم سے زمین میں گڑ جاتی تھی۔

اُن کے پیچھے ایک کُرسی پر رامو کے وکیل صاحب تھے۔ وہ بیچ بیچ میں اپنے موکل کے فائدے کی غرض سے لقمہ دیتے اور سوہنی پر اس طرح کے فقرے چست کر دیتے جس سے کمرے میں ایک ہنسی سی پڑ جاتی اور سوہنی کا جی چاہتا کہ کسی طرح زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں دھنس جاتی۔ اُن کی بغل میں میز کے گرد کُرسیوں پر بہت سے وکلاء اور تماشائی بیٹھے تھے۔ کچھ لوگ کھڑے تھے، کچھ کمرے کے باہر آ جا رہے تھے اور دس کے قریب رامو کے ذات برادری کے لوگ اہلمد کے سامنے والے کونے میں اُکڑوں بیٹھے ہوئے ساری باتوں کو ٹکٹکی لگائے سن رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر کبھی وحشت کے آثار پیدا ہوتے، کبھی غصّے کے اور کبھی تعجب کے، مگر ان سب پر جو چیز غالب تھی وہ ڈر کی علامت تھی۔ وہ ہر آنے جانے والے کو گوشۂ چشم سے اِس طرح دیکھتے جیسے انھیں اس کا برابر خوف لگا ہوا ہے کہ وہ کہیں انہیں بھی رامو کی طرح کٹہرے میں نہ بند کر دیں اور اُن کے ہاتھ میں بھی ہتھکڑیاں نہ ڈال دیں۔ اس لیے جب کبھی مجسٹریٹ بہادر شور کم کرنے کے لیے میز کو موگری سے کھٹکھٹاتے تو وہ اپنی سانسیں تک روک لیتے اور اس طرح گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتے جیسے وہ بن مانس جو ابھی جنگل سے پکڑ کر آیا ہو، اپنے کٹہرے سے انسانوں کو دیکھتا ہے۔ وکیل سرکار نے اپنے تیل سے چکنے بالوں پر ہاتھ پھیر کر سیاہ گاؤن کا دامن برابر کیا پھر پوچھا۔ ”تو جس رات میں یہ واقعہ ہوا، اُس دن تم زمیندار کے یہاں بیگار میں گئی تھیں۔“

سوہنی : ”جی ہاں، ہجور۔“

وکیل سرکار : ”اور یہ رامو کہاں تھا؟“

سوہنی : ”واسو کے ساتھ پُر چلا رہے تھے۔“

وکیل سرکار : ”تو دن بھر پُر چلا رہا تھا۔“

سوہنی : ”جی ہاں ہجور۔“

وکیل سرکار : ”کیوں کتنے کھیتوں میں پانی بھرنا تھا؟“

سوہنی : ”اپنے اور واسو کے دونوں کے کھیت میں۔“

وکیل سرکار : ”یہ واسو کے کھیت میں کیوں؟“

سوہنی : ”ہجور ایک بیل ہمارا تھا ایک اُن کا۔“

وکیل سرکار : ''کیا تمھارے پاس ایک ہی بیل ہے؟''

مجسٹریٹ : ''آخران سوالوں کا نتیجہ؟''

وکیل سرکار : ''جناب عالی میں ان کی زندگی کا پس منظر پیش کرنا چاہتا ہوں کہ کتنی تاریک، بھیانک اور دُکھ سے بھری ہے!''

رامو کا وکیل : ''تو آپ وکیل کی جگہ مصوّر کے فرائض ادا کرنا چاہتے ہیں۔''

عدالت میں قہقہہ پڑ گیا۔ مجسٹریٹ نے موگری سے میز کھٹ کھٹائی اور کہا ''خاموش! خاموش!''

(کمرے میں پھر سکوت چھا گیا)

مجسٹریٹ : وکیل سرکار سے بولا۔ ''آپ سوال کریں۔''

وکیل سرکار : ''کیا تمھارے پاس ایک ہی بیل ہے؟''

سوہنی : ''جی ہاں ہجور۔''

وکیل سرکار : ''تو اُس دن تمھارا شوہر اور تمھارا بیل دن بھر کھیت پر رہے اور تم زمیندار کے گھر بیگار میں؟''

سوہنی : ''جی!''

وکیل سرکار : ''تو تم کو دن میں کسی وقت تو چھٹی ملی ہوگی؟''

سوہنی : ''جی ہاں، دوپہر کو گھڑی بھر کے لیے۔''

وکیل سرکار : ''تو تم نے اُس وقت کچھ پکایا نہیں؟''

سوہنی : ''ہجور گھر میں دال، چاول، آٹا کچھ نہ تھا۔''

وکیل سرکار : ''تو پھر تم نے نہ خود کھایا اور نہ رامو کو کچھ کھانے کو دیا؟''

سوہنی : ''نہیں ہجور، ہم نے گُڑ کھا کے پانی پی لیا۔ اور ان کے واسطے ستو اور نمک مرچ کنویں پر لے کے گئے۔''

وکیل سرکار : ''تو اُس نے وہ ستو کھایا؟''

سوہنی : ''کھاتے نہ تو کیا کرتے، پر گُستا ہوئے۔''

وکیل سرکار : ''غصّہ کیوں ہوئے تھے؟''

سوہنی : ’’یہی کہتے تھے۔ جس سے دیکھو تو ستو ہی لاتی ہے۔ تیرے گھر میں کچھ نہیں رہتا۔‘‘

وکیل سرکار : تو تم نے کیا کہا؟‘‘

سوہنی : ’’ہجور ہم نے کہا۔ اس میں ہمارا کیا دوس ہے نہ تم لا کے دیتے ہو اور نہ رہتا ہے۔‘‘

وکیل سرکار : ’’کیوں کیا تمھارے آنے پر اس نے تمھیں اناج لا کر نہیں دیا؟‘‘

سوہنی : ’’نہیں ہجور، بس گھر میں دو من جو، ایک من ارہر تھی۔ اسی سے کام چلایا۔‘‘

وکیل سرکار : ’’کتنے مہینے ہوئے تمھارا گونا ہوئے؟‘‘

سوہنی : ’’کوئی چھ سات مہینے ہجور!‘‘

رامو کا وکیل : ’’جناب عالی میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ان سوالات سے عدالت کا بہت سا قیمتی وقت فضول صرف کیا جا رہا ہے۔‘‘

وکیل سرکار : ’’مگر آپ کی سمجھ جتنی ہے وہ ظاہر ہے!‘‘

عدالت میں لوگ ہنسنے لگے۔ مجسٹریٹ نے میز کھٹکھٹائی اور کہا ’خاموش! خاموش!‘ پھر سکوت چھا گیا۔

وکیل سرکار : ’’تو ہاں جی سوہنی... ہی تمھارا نام ہے نا؟‘‘

سوہنی : ’’جی!‘‘

وکیل سرکار : ’’تو تم اُس دن رامو کو ستو کھلا کے پلٹ آئیں اور زمیندار کے یہاں چلی گئیں؟‘‘

سوہنی : ’’جی ہجور!

وکیل سرکار : ’’ہوں! مگر اتنا اور بتا دو کہ پُر سے پلٹتے وقت رامو نے تم کو کچھ دھمکی دی تھی؟‘‘

رامو کا وکیل : ’’جناب عالی میں اس سوال کے خلاف احتجاج کرتا ہوں!‘‘

وکیل سرکار : ’’جناب عالی! مگر میں اس سوال کا جواب حد درجہ ضروری سمجھتا ہوں!

مجسٹریٹ : ’’کیوں؟‘‘

وکیل سرکار : ''اس لیے کہ اِس سے ظاہر ہو جائے گا کہ رامو کا یہ فعل پہلے سے سوچا سمجھا تھا یا نہیں؟''

مجسٹریٹ : ''سوال کیجیے!''

وکیل سرکار : ''تو بتاؤ سوہنی کہ رامو نے پُر سے تمھارے پلٹتے وقت کیا کہا تھا؟''

سوہنی : ''ہجور اُنھوں نے کہا اگر آج شام کو بھوجن ٹھیک سے نہ ملا تو ہڈّی پسلی توڑ دوں گا۔''

وکیل سرکار : ''پھر تم نے کوئی فکر نہ کی؟''

سوہنی : ''ہاں ہجور! جاتے ہی پڑوس میں آٹا دال اُدھار مانگا، پر کسی نے نہ دیا!''

وکیل سرکار : ''کیا کوئی تم لوگوں پر اعتبار نہیں کرتا؟''

سوہنی : ''ہجور، سب بھوکے ننگے ہیں۔''

مجسٹریٹ : ''کیا مدعیہ کا یہ مطلب ہے کہ کسی کے پاس کچھ تھا ہی نہیں؟''

وکیل سرکار : ''جی ہاں جناب عالی! اور اگر کسی کے پاس کچھ رہا بھی ہوگا تو اُس نے دینے سے انکار کر دیا ہوگا۔ بھوک میں انسانیت کے آثار اسی طرح مٹ جاتے ہیں جس طرح سیلاب آنے پر دریا کے کنارے کی سر بفلک عمارتیں۔''

رامو کا وکیل : ''سبحان اللہ! کیا شاعری فرمائی ہے! کتنی اچھی تشبیہ ہے!''

عدالت میں قہقہہ ہوا۔ وکیل سرکار نے ایک قہر آلود نظر سے اپنے حریف کو دیکھا۔ مجسٹریٹ نے میز کھٹکھٹائی ''خاموش! خاموش!''

مجسٹریٹ : ''آپ مدعیہ سے سوال کریں!''

وکیل سرکار : ''بہت خوب جناب عالی... ہاں جی، تو تم نے پڑوس میں سب سے اناج مانگا، مگر کسی نے اُدھار نہ دیا۔''

سوہنی : ''جی، ہجور۔''

وکیل سرکار : ''پھر تم نے کیا کیا؟''

سوہنی : ''ہجور، ہم ہار کے جمیندار کی کوٹھی پر چلے گئے۔''

وکیل سرکار : ''وہاں شام تک کیا کام کرتی رہیں؟''

سوہنی : ''اوکھلی میں دھان کوٹتے رہے۔''

وکیل سرکار : ''شام کو کیا مزدوری ملی؟''

سوہنی : ''ہجور، دو پیسے۔''

وکیل سرکار : ''ارے دن بھر کی محنت کے بعد صرف دو پیسے! تم نے زمیندار سے کہا نہیں کہ دو پیسے تو بہت کم ہیں۔''

سوہنی : ''ہجور دو پیسے تو بیگار میں ملتے ہی ہیں۔ ہم کہہ کے کیا کرتے۔ وہ ہمیں جیادہ دے کے گاؤں کی سرح تھوڑے بگاڑتے۔''

وکیل سرکار : ''ہوں... اچھا تو پھر تم وہ دو پیسے لے کر گھر چلیں۔''

سوہنی : ''جی ہاں! رستے میں بڑبھونجے سے اُس کے چنے لے لیے۔''

وکیل سرکار : ''یہ کیوں؟''

سوہنی : ''ہجور اپنے اوران کے چبانے کے لیے۔''

وکیل سرکار : ''تو تم گھر پہنچیں تو راموموجود تھا؟''

سوہنی : ''نہیں یہ بعد میں آئے۔''

وکیل سرکار : ''تو تم نے ان کو وہ چنے کھانے کو دیے۔''

سوہنی : ''جی ہاں ہجور، بس یہ بگڑ کھڑے ہوئے۔ اُنھوں نے مجھ کو گالیاں دیں اور خوب مارا۔''

وکیل سرکار : ''تم نے کہا نہیں کہ اس میں میرا کیا قصور؟''

سوہنی: ''ہم نے ان سے کہا کہ ہم نردوش ہیں۔ پر اِن پر گُسّے کا بھوت سوار تھا۔ یہ سدا ایسے ہی رہے!''

وکیل سرکار : ''پھر کیا ہوا؟''

سوہنی : ''انھوں نے ہم کو کھینچ کر باہر نکال دیا۔ پھر بولے ہم تاڑی کھانے جاتے ہیں، آنے پر بھوجن نہ ملا تو گردن کاٹ کر پھینک دیں گے۔''

وکیل سرکار : ''تو تم نے کیا کیا؟''

سوہنی : ''ہجور ہم کو بھی گُستا تھا۔ دن بھر دھان کوٹتے کوٹتے ہاتھ تھک گیا تھا۔ اِس پر اُن کی مار پیٹ۔ ہم نے کہا ہم آج جمیندار سے ضرور کہیں گے۔''

وکیل سرکار : ''تو تم زمیندار کے یہاں گئیں؟''

سوہنی : ''ہاں ہجور ہم سیدھے کوٹھی گئے۔''

وکیل سرکار : ''تو وہاں زمیندار سے ملاقات ہوئی؟''

سوہنی : ''نہیں ہجور!''

وکیل سرکار : ''کیوں؟''

سوہنی : ''جی دوارے پر کنور جی بیٹھے تھے۔''

وکیل سرکار : ''تو تم نے اُنھیں دیکھ کے کیا کیا؟''

سوہنی : ''ہجور ہم ٹھٹک کے کھڑے ہو گئے۔''

وکیل سرکار : ''کیوں؟''

سوہنی : ''ہجور...وہ...''

وکیل سرکار : ''ہاں ہاں، بتاؤ...کہو...''

سوہنی : ''ہجور...وہ اچھے نہیں ہیں۔''

وکیل سرکار : ''کیا بیمار رہتے ہیں؟''

سوہنی : ''بیماری نہیں۔ ہجور، اُن کی بات نہیں اچھی ہے۔''

وکیل سرکار : ''کیوں کیا تم کو اُنہوں نے کبھی چھیڑا تھا؟''

سوہنی : ''ہجور! وہ برابر ہم کو دیکھ کر، دانت کٹکٹاتے اور آپ ہی آپ بڑبڑاتے تھے۔''

وکیل سرکار : ''کیا کہتے تھے؟''

سوہنی : ''یہی ہجور جو بدمرد اِستریوں کو دیکھ کر کہا کرتے ہیں۔''

وکیل سرکار : ''تو تم ان کو دیکھ کر ڈر گئیں۔''

سوہنی : ''ہاں! ہجور۔''

وکیل سرکار : ''لیکن! کیا وہاں اور کوئی نہ تھا؟''

سوہنی : ''نہیں ہجور بالکل اکیلے تھے۔''

وکیل سرکار : ''تو پھر اُنھوں نے کیا کیا؟''

سوہنی : ''ہجور وہ بولے ارے آج تمھارے کٹھور ہردے میں دَیا ہی آ گئی!''

وکیل سرکار : ''کیا اس سے پہلے اُنھوں نے کبھی تم کو بلایا تھا؟''

سوہنی : ''ہجور وہ برابر یہی تو کہا ہی کرتے تھے کہ کسی رات کو آ وَ۔ ہم پر دَیا کرو!''

وکیل سرکار : ''تو تم نے کہا نہیں کہ میں فریاد لے کے آئی ہوں؟''

سوہنی : ''ہجور! ایسا جان پڑا جیسے ہماری جیبھ کسی نے سی دی۔''

وکیل سرکار : ''پھر اُنھوں نے کیا کیا؟''

سوہنی : ''ہجور وہ ہم پر...''

وکیل سرکار : ''ہاں، ہاں، کہو جی، یہ سرکاری عدالت ہے۔ یہاں کوئی بات چھپائی نہیں جاسکتی۔''

سوہنی : ''ہجور! وہ ہم کو جھپٹ کے اُٹھا لے گئے۔''

وکیل سرکار : ''تو تم چیخیں چلاّئی بھی؟''

سوہنی : ''نہیں ہجور۔''

رامو کا وکیل : ''وہ تو گئی ہی تھی اسی کے لیے چیختی کیوں!''

عدالت میں قہقہہ پڑا۔ سوہنی منہ چھپا کر رونے لگی۔ رامو نے ہتھکڑی میں پھنسے ہوئے ہاتھ کٹھرے پر مار کر کہا۔ ''ارے یہ ہرامجادی پہلے ہی سب طے کر کے آئی تھی۔

مجسٹریٹ نے میز پر تین مرتبہ موگری ماری، پھر کہا ''خاموش!''

وکیل سرکار : ''اب تو جو کچھ ہونے کو تھا وہ ہو چکا۔ رونے دھونے سے فائدہ۔ تم میری باتوں کا جواب دو... ہاں تو تم چیخیں چلاّئیں نہیں!''

سوہنی : ''نہیں ہجور۔''

وکیل سرکار : ''تم نے ان سے ہاتھا پائی بھی نہیں کی!''

سوہنی : ''مَیں ان سے تھوڑی دیر لڑتی اور منّتی کرتی رہی کہ اِجّت نہ بگاڑیں پر وہ نہ

مانے!''

وکیل سرکار : (عدالت سے) ''جناب عالی ممکن ہے کہ میرے دوست رامو کے وکیل صاحب کو مدعیہ کا نہ چیخنا سمجھ میں نہ آتا ہو، تو میں آپ کی اجازت سے دو لفظوں میں اِس فعل کی نفسیاتی تحلیل کر دینا چاہتا ہوں۔ جناب عالی! مدعیہ ایک جوان عورت ہے، گو جس طبقے میں وہ پیدا ہوئی ہے اُس میں جوانی کچلی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی فطری طور پر اس کا جی چاہتا ہوگا کہ اس کا شوہر اس سے محبت کی، پریم کی باتیں کر لے۔ اس کے حسن کی تعریف کرے۔ اس کا دیوانہ، والہ وشیدا بنا رہے۔ اس کی جگہ پر رامو کی یہ حالت کہ اُٹھتے گالی اور بیٹھتے جوتے سے تواضع کرنا۔ نہ پیار کرنا نہ محبت۔ ہر وقت حکومت جتانا اور پھر پیٹ بھر کھانے کو نہ دینا!''

رامو : (کٹھرا ہلا کے) ''تو ہم کہاں سے کھانے کو دیں، چوری کریں اِس ہرا مجادی کے لیے۔''

مجسٹریٹ نے میز کھٹ کھٹائی۔ خاموش! خاموش!

وکیل سرکار : ''تو جناب عالی جیسا میں عرض کر رہا تھا۔ ایک طرف تو گھریلو زندگی کی یہ بھیانک تصویر۔ دوسری جانب زمیندار کا لڑکا، بانکا چھیلا چھبیلا۔ بیس بائیس برس کا نوجوان، اس پر ہر وقت اظہارِ عشق کرتا ہے۔ دیوانہ پن کا اظہار کرتا ہے۔ صورت دیکھتے ہی سرد آہیں بھرتا ہے۔ آرام و آسائش کا یقین دلاتا ہے۔ مدعیہ پر غیر ارادی طور پر ضرور اثر پڑتا رہا ہوگا۔ اس مخصوص دن میں جو کچھ ہوا، وہ جناب عالی نے سن ہی لیا۔ دن بھر کی بیگار کے بعد گھر پلٹی، تھک کے چور تھی، کھانے کا سہارا نہ تھا۔ اڑوس پڑوس میں اُدھار مانگ چکی تھی، وہاں سے ٹکا سا جواب مل چکا تھا۔ میاں رامو آئے، نہ پیار نہ محبت، نہ تفصیل سے حالات سُنے۔ بلکہ گالی اور مار سے تواضع کی، گھر سے نکال دیا۔ بھاگ کے فریاد کے لیے چلی۔ یہاں تنہائی میں کنور ملے۔ وہی، جو زبانی ہی سہی، مگر اس پر جان دیتے تھے۔ اُنھوں نے اچانک حملہ

کردیا۔ باز نے چڑیا کی گردن پکڑلی۔ کیسے چیخے چلاّئے۔ ایک جگہ سے چیخ کے بھاگی تھی۔ اب کیا یہاں بھی چیخ کر رُسوائی کراتی؟''

رامو کا وکیل : ''اور اب جو ہوا، اس میں تو بڑی نیک نامی ہوئی؟''

وکیل سرکار : ''جی ہاں! لیکن اُس وقت وہ یہ نہ سمجھ سکتی تھی وہ چاہتی تھی بات چھپی رہے۔''

رامو کا وکیل : ''تو آپ کے نزدیک کسی بُرے فعل کی بُرائی اُس کے چھپے رہنے سے کیا کم ہو جاتی ہے؟''

وکیل سرکار : ''جی ہاں، آپ نے اپنی آنکھوں سے کام لیا ہوتا تو دیکھ لیا ہوتا کہ ہماری پوری سوسائٹی ہی اس اصول پر مبنی ہے۔ بُرا فعل جب تک ظاہر نہ ہو سوسائٹی کے نزدیک بُرا نہیں ہے۔ خلوت میں جو جی چاہے کیجیے مگر جلوت میں ثقہ بنے رہیے۔''

عدالت میں فقرے چلنے لگے، پھبتیاں کسی جانے لگیں، کسی نے موقع کا ایک شعر بھی پڑھ دیا۔

مجسٹریٹ نے ڈانٹا ''خاموش! خاموش!'' پھر وکیل سرکار سے کہا ''آپ سوال کریں!''

وکیل سرکار : ''تو سوہنی، جب وہ اپنا منہ کالا کر چکے تو اُنھوں نے کیا کیا؟''

سوہنی : ''ہجور، اُنھوں نے ساڑی کے آنچل میں ایک روپیہ باندھ دیا اور اُٹھ کے چلے گئے۔''

وکیل سرکار : ''تو تم نے روپیہ لے لیا۔''

سوہنی : ''ہجور چاندی کا پورا روپیہ تھا!''

وکیل سرکار : ''کیا تم کو اس سے پہلے کبھی کسی نے کوئی روپیہ نہیں دیا تھا؟''

سوہنی : ''نہیں ہجور۔''

وکیل سرکار : ''ماتا پتا نے گونا کے وقت بھی نہیں؟''

سوہنی : ''نہیں ہجور، بس چلتے سمے پتا جی نے ایک چونی دی تھی۔''

وکیل سرکار : ''ہوں، تو تم وہ روپیہ لیے گھر پلٹیں۔''

سوہنی : ''جی۔''

وکیل سرکار : ''تم نے وہ روپیہ تُڑوا کے آٹا دال نہیں مول لیا؟''

سوہنی : ''نہیں ہجور!''

وکیل سرکار : ''کیوں؟''

سوہنی : ''ہجور ہم کو بڑا اُگستا تھا۔ اگر انھوں نے مار نکالا نہ ہوتا تو ہم کاہے کو کوٹھی جاتے، اور کاہے کو بے اِجّت ہوتے!''

وکیل سرکار : ''تو تم نے گھر پلٹ کے کیا کیا؟''

سوہنی : ہجور ہم گھر آ کے کھاٹ پر لیٹ رہے۔''

وکیل سرکار : ''پھر؟''

سوہنی : ''اِتّے میں یہ آ گئے۔''

وکیل سرکار : ''پھر؟''

سوہنی : ''اُنھوں نے گالی دے کے پوچھا۔ بھوجن تیار ہے۔ ہم نے کھونٹ سے روپیہ نکال کر پھینک دیا کہ جاؤ جنس لا کے پکاؤ اور کھاؤ!''

وکیل سرکار : ''پھر اس نے کیا کیا؟''

سوہنی : ''یہ ہم سے پوچھنے لگے کہ روپیہ کہاں سے ملا۔ ہم نے جل کر کہہ دیا تمھاری اِستری کی اِجّت کے دام ہیں۔ کنور جی نے دیا ہے۔''

وکیل سرکار : ''تو یہ بہت جھلاّیا ہوگا؟''

سوہنی : ''ان پر بھوت سوار ہوگیا۔ گڑانسا اُٹھالائے۔ کہنے لگے۔ میں ابھی کنور کو جان سے مار کے دَم لوں گا۔''

وکیل سرکار : ''لیکن تمھاری ناک پر چوٹ کیسے آئی؟''

(سوہنی نے ایک بار رامو کو دیکھا، سوکھے ہونٹوں پر زبان پھرائی، وہ سر جھکا کے بولی۔ ''ہجور ان کے ہاتھ سے گڑانسا چھیننے میں ایک کونا ناک میں لگ گیا۔'' وکیل سرکار نے اُس کو غصّے سے دیکھا اور کہا۔ ''اس نے

تمھاری ناک کاٹنے کی کوشش کی؟'' سوہنی بہت آہستہ سے بولی۔ ''نہیں
ہجور!'' رامو نے ہتھکڑی بھرے ہاتھ کٹہرے پر مارے۔ ''جھوٹی کہیں کی!
ہجور مَیں نے اس کی ناک کھد کاٹی، اور سب لوگوں نے پکڑ نہ لیا ہوتا تو میں
اُس پاجی کنور کی بھی بوٹی بوٹی کاٹ ڈالے ہوتا۔ اور اب جرا یہاں سے
چھوٹ لوں تو مجا چکھاؤں گا! مجسٹریٹ نے میز کھٹکھٹائی، خاموش!
خاموش!''

سوہنی : ''ہجور ہم اب ان کے ساتھ نہیں رہیں گے۔ ہجور ماتا پتا سمان ہیں۔ ہجور یہ ہم کو مار ڈالیں گے۔ ہمیں پھارک کھتی دلوادی جائے!''

وکیل سرکار : ''ہاں، ہاں، صاحب بہادر تم کو فارغ خطی دلوادیں گے۔ تم ڈرو نہیں، یہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔''

رامو : ''پھارک کھتی، تلاک لے لے تلاک۔ ہرا مجادی۔ جیسے ہم ہندو دھرم میں نہیں ہیں۔ تو سہی کہ اس لوک اور پرلوک دونوں میں تجھ کو نہ چھوڑوں!''

عدالت میں لوگ ہنسنے لگے۔ سوہنی نے کانپ کر دونوں ہاتھوں سے منہ
چھپالیا۔
مجسٹریٹ نے میز پر تین بار موگری ماری۔ ''خاموش! خاموش! خاموش!''

(کچھ ہنسی نہیں اور...... ۱۹۳۹ء)

دو بچّے

نواب صاحب پوتڑوں کے رئیس تھے، باپ دادا لاکھوں کے جاگیردار رہ چکے تھے، وہ بات تو اب نہ تھی، مگر مٹنے مٹانے پر بھی بہت کچھ تھا۔ اس لیے رکھ رکھاؤ، آن بان وہی تھی۔ نوکر چاکر، ماما دائیاں، خواصیں، مہریاں، سب ہی تھیں۔ محل بھی ایک نہیں کئی تھے، لیکن بچہ صرف ایک ہی تھا۔ دو برس کی جان، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا۔ بڑے اللہ آمین سے پالا جارہا تھا۔ جہاں بیگم صاحبہ کی گود سے اُترا، اناؤں، دائیوں، کھلائیوں کے حصار میں گھر گیا، ہر وقت یہی خیال کہ کمرے سے باہر نہ نکلے اور گرمیوں میں تیز دُھوپ سے سنولا نہ جائے۔ اور جاڑوں میں ٹھنڈی ہَوا کا جھونکا نزلے کی تحریک نہ پیدا کردے۔ اناؤں اور کھلائیوں پر بھی تاکید تھی کہ ہر وقت صاف ستھری رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بچّے کے مزاج میں گندگی کے برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے! ہر وقت یہ قدغن کہ مٹّی دھول میں کھیلنے نہ پائے، اگر ننھے ننھے صندل کے پاؤں سے چلایا بھی جائے تو وہ بھی اندر کمرے کے قالین پر، یا مسہری کے مخملی گدوں پر!

بچہ خوش قسمت تھا کہ وہ ان بندشوں پر بھی لُد پھُد، لُد پھُد چلنے لگا، اور تُتلا کے چھوٹے چھوٹے فقرے بولنے بھی لگا۔ اِس کی بھولی بھولی صورت، اور اس کا یہ تتلانا اتنا پیارا معلوم ہوتا تھا کہ ہر وقت بیگم صاحبہ اور نواب صاحب کو "ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، خدا نظر بد سے بچائے" کہہ کہہ کر نہ جانے کتنی دفعہ نادِ علی، جوشنین اور بہت سی دُعائیں دَم کرنا پڑتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر بڑے یقین سے کہتے تھے۔

"ماشاء اللہ بڑا ذہین ہوگا۔"

"اللہ اس پر حضرت عباس کے علم کا سایہ رکھے، یہ جوان ہوکر قیامت ڈھائے گا!"

اور نواب صاحب اپنے قیامت ڈھانے والے واقعات مسکرا مسکرا کر یاد کرنے لگتے تھے۔

غرض ننھے نواب پر ماں باپ جان چھڑکتے اور ہر وقت اس بچے کی صفائی، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، ہر اُمر کا خاص اہتمام رکھتے تھے... کہ ایک دن محل میں بجائے بوڑھی مہترانی کے اُس کی پوتی آئی، یہی کوئی چھ سات برس کے سن کی، میلے کپڑے پہنے، ایک چھوٹی سی کوڑا اُٹھانے کی بالٹی لیے ہوئے۔ دادی بیمار پڑ گئی تھی اِس لیے ساٹھ برس کی بوڑھی کے کام کی ذمہ داری اِس ننھی سی جان پر آ پڑی تھی۔ ڈرتی، سہمتی، جھجکتی، گھبراتی آئی اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنے فرائض ادا کرنے میں منہمک ہو گئی۔

ننھے نواب نے آج پہلی دفعہ اپنے سن سے نسبتاً قریب تر عمر کی ایک لڑکی دیکھی، انّا کی گود سے اُتر کر فرش کے کنارے تک لُد پُھد، لُد پُھد کرتے آئے۔ دونوں بچوں نے ایک دوسرے پر سر سے پاؤں تک نظریں ڈالیں۔ چھوٹی مہترانی کی آنکھوں سے اِس صاف ستھرے بچے کو گود میں اُٹھا لینے اور پھول سا منہ چوم لینے کی بے چین خواہش ظاہر تھی، ننھے نواب کے ہاں تعجب تھا۔ اتنے چھوٹے لوگ بھی ہوتے ہیں، جن کے بال انہیں کی طرح سیاہ، جن کے ہاتھ پاؤں انہیں کی طرح چھوٹے چھوٹے، مگر جو بالٹی سے کھیل سکتے ہیں، گھر کی سب سے زیادہ دلچسپ چیز کوڑا، جس میں تنکے بھی ہیں، کاغذ بھی اور رسیوں کے ٹکڑے بھی، یوں سمیٹ کر لے جا سکتے ہیں۔ دوستی کرنے کے لیے مسکرا دیے۔ انّا نے جو یہ تیور دیکھے ڈانٹا ”نواب اُدھر کہاں جا رہے ہو، مہترانی ہے، گندی، چھی! چھی! چھی!“

ننھے نواب نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ٹھٹک کر کھڑے چھوٹی مہترانی کو بغور دیکھتے رہے، اور جب وہ کوڑا لے کر باہر چلی گئی تو انّا سے پلٹ کر بولے ”مہہ تلانی، تلی گئی!“

وہ بولی: ”ہاں نواب وہ موئی دفان ہوئی! لو تم اپنے کھلونے کھیلو، اس گندی چھوکری کی فکر نہ کرو!“

دوسرے دن ننھے نواب کمرے کے فرش پر اپنی گڑیا سے دوسری دایہ کی نگرانی میں منہمک تھے کہ پھر چھوٹی مہترانی آئی، ان کا گلاب سا چہرہ خوشی سے بالکل بیر بہوٹی کے رنگ کا ہو گیا، وہ ایک مرتبہ ننھے ننھے ہاتھوں سے تالی بجا کر بولے۔ ”مہہ تلانی، میلی (میری) مہہ تلانی آ گئی!“

پھر بیگم صاحبہ کے پاس دوڑ کر خوشخبری سنائی۔ ”امّی! امّی، مہہ تلانی آ گئی!“

انھوں نے اِس گلنار چہرے کو چوم کر کہا: ”امّی تیرے صدقے! لیکن بیٹے مہترانی کے آنے پر اتنا کیوں خوشی ہے! وہ تو گندی، میلی، کالی، اور خراب ہے...“

بچّے نے گھبرا کر کہا۔ ''کھر آب، نہیں، میلی... مہہ تلانی... اتھی.... بہت اتھی!''

وہ بولیں۔ ''وہ موئی کیا اچھی ہوگی! وہ البتہ اچھی ہوگی جسے میں بہو بنا کر لاؤں گی! چاند سی ہوگی، چاند سی!''

ننھے نے کہا'' تاندسی؟ تندا ماؤں سی!''

وہ کلیجے سے چمٹا کر بولیں۔ ''چندا ماموں سے بھی کہیں زیادہ اچھی!''

تیسرے دن ننھے نواب نے قیامت ڈھادی۔

چھوٹی مہترانی آئی، اُس نے کمرے کے سامنے جھاڑو دی، حسرت بھری نگاہوں سے اِس پھول کو دیکھا جس کی وجہ سے کمرہ گلدان بنا ہوا تھا اور چھوٹی بالٹی میں جھک کر کوڑا رکھنے لگی۔ ننھے نواب پہلے تو اُس کی حرکتیں تعجب سے دیکھتے رہے۔ پھر ایک بار لُد پھد، لُد پھد دوڑے اور اُنہوں نے اپنی دونوں بانہیں مہترانی کی گردن میں ڈال دیں۔

بس گھر بھر میں زلزلہ آ گیا۔

انائیں، دائیاں، مہریاں، خواصیں، مامائیں سب ایک ساتھ دوڑیں، خود بیگم صاحبہ مسہری سے اُتر کر ننھے کی طرف لپکیں۔ نواب صاحب نے پیچوان ہاتھ سے پھینکا، اور ''ارے، رے! توبہ! توبہ!'' کہتے ہوئے اسی طرف چلے۔

بیچاری چھوٹی مہترانی عجیب مخمصے میں پھنس گئی، اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی کہ کہیں ننھے نواب گر نہ پڑیں۔ ہاتھ سے چھو نہیں سکتی اِس لیے کہ بچہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے اچھوت ہونے سے واقف تھی۔ غرض وہ بالکل بُت بنی بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ بڑی انّا نے بڑھ کر ننھے کے ہاتھ اس کے گلے سے الگ کیے اور اسے گود میں لیتے ہی مہترانی کو ایک لات جڑ دی۔

''حرامزادی، نواب کو سر سے پاؤں تک نجس کر دیا!''

دوسری ماما دائیوں نے بھی گالیوں کی ایک باڑھ ماری اور جوتیوں لاتوں سے تواضع کی، بیگم صاحبہ کی طرف سے بھی خطابوں کی بارش ہوئی۔ اور چھوٹی مہترانی روتی، بسورتی، بلکتی، سسکتی، بالٹی سمیت باہر بھاگی۔

بیگم صاحبہ بولیں'' اِس قطامہ سے کہہ دو کہ اگر آج سے محل میں قدم رکھا تو کتّوں سے بوٹیاں نچوادوں گی! کمینی!''

نواب صاحب بولے'' ارے بھئی ننھے کے سارے کپڑے اُتار کر پھینک دو اور اسے

خوب نہلا کر دوسرے کپڑے پہناؤ!"

بیگم صاحبہ نے کہا: "اور دیکھو پنڈے میں ملنے کے لیے صابن کی ایک نئی بٹی اور آدھ پاؤ بیسن نکال لو!"

بوڑھی انّا نے کہا "سرکار، قربان جاؤں! تھوڑا ماش اور کڑوا تیل بھی صدقے کے لیے ایک ٹوکری میں نہ رکھ لاؤں؟"

بیگم نے کہا۔ "ہاں بوا ضرور! اور اسی ٹوکری میں ایک نیا روپیہ اور چاندی کی چونی بھی رکھ دینا۔ بلا گلے ہی سے چمٹ گئی تھی! خدا نے بڑا فضل کیا جو میر العل بال بال بچ گیا!

ننھے نواب یہ سارا ہنگامہ ایک فلسفی کی متانت سے دیکھا کیے۔ پھر انھوں نے اپنے باپ کی طرف پلٹ کر اپنے نزدیک سب سے اہم خبر سنائی۔

"میلی، مہہ تلانی بھاگ گئی!"

(کچھ ہنسی نہیں اور......۱۹۴۱ء)

دو تھکے مسافر

رنجنی اسی دفتر میں ٹائپسٹ تھی جس میں کمار اسسٹنٹ منیجر ہو کر حال ہی میں آیا تھا۔ کوئی کچھ ضروری نہ تھا کہ اسسٹنٹ منیجر کی نظر ایک ٹائپسٹ پر نہ پڑتی۔ پرنتو کافی بڑا دفتر تھا۔ پچاس سے اِدھک ناری پرش اس میں کام کرتے تھے۔ پھر ہر وقت انجان چہروں سے بھرا رہتا تھا۔ اس کمپنی کا کام ہی تھا کہ دُنیا کے کسی کونے میں جانے والے مسافر، چاہے وہ ہوائی جہاز سے جائیں، چاہے پانی کے جہاز سے، چاہے ریل اور بس سے، وہ سب کے لیے جگہوں کا انتظام کرتے، گھومنے اور ٹھہرنے کا بندوبست کرتے۔ ایسے میں اس دفتر کے ہر کام کرنے والے کو ہر سے مسکراتا رہنا پڑتا ہے۔ مسافروں سے بات چیت کا ڈھنگ جاننا پڑتا ہے اور ان سے ایسا گھل مل جانا پڑتا ہے، انھیں اس ڈھب سے اپنا بنانا پڑتا ہے کہ جیسے دو انجان آج پہلی بار نہیں مل رہے ہیں بلکہ دو پرانے دوست۔ دفتر کیا ہوتا ہے ایک چڑیا خانہ ہوتا ہے جہاں ایک چہکار سی اُٹھتی رہتی ہے۔ ایک دوسرے سے ہر ایک ہنس مسکرا کر باتیں کرتا ہے اور ہر سے اس ڈھب سے چھپانا پڑتا ہے جیسے اس میں غم کا نام نہیں۔

اس ہنستی آوازوں سے گونجتے دفتر میں اگر کوئی اُداس چہرہ تھا تو وہ رنجنی کا۔ اسی لیے دفتر کا ہر افسر دو ہی ایک روز میں اسے دیکھتا اور غور سے دیکھتا۔ لمبا چھریرا شریر، بینت سمان لچکتا ہوا، لمبی کالی چوٹی پیٹھ پر پڑی ہوئی، وہ ہر سے ٹائپ کی مشین پر جھکی رہتی دکھائی دیتی۔ گول چہرہ، چوڑی مستک، کھلتا گیہواں رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، کسی بڑے دُکھ سے بوجھل، بجھی بجھی سی، ان کے دیکھنے کو بہت سی آنکھیں ترستیں۔ وہ ہر صبح ٹھیک وقت پر آتی۔ سیدھی اپنی میز پر چلی جاتی، دراز کھولتی، جھاڑن نکالتی، مشین جھاڑتی پونچھتی، اور ٹائپ کی کھٹ کھٹ آرمبھ ہو جاتی۔ وہ اس چہکتے باغ میں رنگ برنگی پھولوں کے بیچ ایک ٹھونٹھ تھی۔

اسی لیے وہ کمار کی آنکھوں میں کھٹکی اور آپ ہی آپ اس کی چاروں طرف دوڑتی نظر رنجنی کی پیٹھ پر پہنچ کر ٹھٹک کر رُک گئی۔ کون ہے یہ سب سے اَنمل بے جوڑ۔ اور سب عورتیں تو رنگین کپڑے بھی پہنے ہیں، لپ اسٹک بھی لگائی ہے، سینٹ پاؤڈر بھی لگائے بنی ٹھنی ہیں۔ یہ سفید سادے کپڑوں، روکھے بالوں والی کون ہے، کوئی بیوہ؟ اُس نے اسے پھر دیکھا۔ صورت کچھ جانی پہچانی دِکھائی دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے آج سے دس بارہ برس پہلے جبکہ اس کی جوانی پورے رس پر رہی ہوگی اسے ضرور دیکھا ہے۔ اس میں کھلتی کلی والا رنگ روپ نہ تھا، وہ پورا کھلا ہوا پھول تھی۔ جوانی کی دھوپ کی جگہ جوانی کی چھاؤں۔ پر ناک نقشہ تو وہی تھا، دیکھا بھالا، جانا پہچانا ہوا۔

وہ بہت دیر اس اُلجھن کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ ٹہلتا ہوا رنجنی کی میز تک پہنچا۔ اُس نے پوچھا ''کیا آپ اس سے پہلے بمبئی کے دفتر میں تھیں؟''

رنجنی نے اسے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ رُکھائی سے ''جی نہیں'' کہہ دیا اور ٹائپ کرنے لگی۔ اپنے ایک ماتحت سے اس لہجے میں جواب پا کر اسسٹنٹ منیجر کو ضرور کرودھ آیا، پر اس خول کے اندر والا کمار اپنی عمر کے پینتیس برسوں میں بھن بھن ٹھوکریں کھا چکا تھا۔ وہ کرودھ کی آنکھیں بھی پہچانتا تھا اور ڈر کی نظر بھی۔ اُس نے رنجنی کے ''ہاں، نہیں'' کے ساتھ ساتھ بھے کی ایک جھلک بھی دیکھ لی تھی۔ وہ ''سوری'' کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ اس ''سوری'' نے رنجنی پر ہزاروں گھڑے پانی ڈال دیا۔ وہ دل ہی دل میں کٹ گئی۔ اسسٹنٹ منیجر اس کا افسر تھا، اُس نے روکھی 'بہن جی' کا جو تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا، اس پر نہ وہ جھلایا اور نہ بڑبڑایا، اُلٹے معافی مانگ کر چلا گیا۔ وہ اُلجھنے لگی۔ کمار کوئی چھچھورا، دفتر کا چھوکرا نہ تھا، اور نہ وہ کوئی ننھی، نئی نویلی۔ اٹھائیس اُنتیس برس کی استری سے کوئی بھی فلرٹ کرنے کے لیے ایسے سوالات نہیں کرتا۔ کمار کے گمبھیر چہرے پر کوئی سستی قسم کی مسکراہٹ نہ تھی۔ سن بھی پینتیس سے کم نہ تھا۔ دونوں طرف قلموں کے بال پک گئے تھے۔ لمبوترے، کلین شیوڈ چہرے پر جگہ جگہ دُکھوں اور فکروں نے، بیتے ہوئے دِنوں کے کڑوے اور میٹھے تجربوں نے ہلکی ہلکی لکیریں بنا دی تھیں۔ چال بالکل فوجیوں جیسی تھی۔ تیر کی طرح سیدھا، بوٹی بوٹی کسی ہوئی، پاؤں زمین پر مضبوطی سے پڑتے تھے۔ کمپنی کے سارے کام کرنے والوں کی طرح چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ پر نتو یہ مسکراہٹ شرارت کی نہ ہوتی بلکہ اپنے آتم وشواس اور اپنے پر بھروسے کی۔ رنجنی یہی سوچتی

جاتی اور خط ٹائپ کرتی جاتی۔ اس نے اسی میں اپنا آخری فیصلہ بھی چھاپ دیا۔ ''یہ کمار کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہے۔'' اور جب اپنے کام کو دہراتے سے اسے اپنا یہ جملہ دِکھائی دیا تو اس کا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ یہ جملہ وہ کیسے لکھ گئی۔ اس کو کیا ہوگیا تھا؟ بارہ برس کے بعد آج پہلی بار اُس نے گھنشیام کو بھول کر کسی دوسرے پرش کے بارے میں اتنی دیر اور اس ڈھنگ سے سوچا تھا۔ وہ کانپنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھوں میں ڈبڈباتے ہوئے آنسوؤں کو پی ڈالا۔ اُس نے جھلا کر خط پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

کمار نے دُور ہی دُور سے رنجنی کی یہ حالت دیکھی اور اس کے دل پر نہ جانے کیوں چوٹ سی لگی۔ اس کو وشواس ہوگیا کہ اس کے سوال نے رنجنی کی کڑوی یادوں کا کوئی سلسلہ چھیڑ دیا۔ اسے دُکھ ہونے لگا کہ اُس نے رنجنی سے ایسا سوال کیوں کیا؟ پر کرتا کیا، اب بھی اس کا دل یہی کہتا تھا کہ یہ کوئی انجانی صورت نہیں ہے۔ اُس نے اسے دیکھا ہے اور اچھی طرح دیکھا ہے۔ پرنتو کہاں اور کب؟ ایک ایسے آدمی کے لیے جس نے فوجی ملازمت کے سلسلے میں صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ یورپ، امریکہ اور افریقہ کی بہت سی جگہیں دیکھی ہیں، جس کے ہزاروں جاننے والے اور سینکڑوں دوست ہیں وہ کسی بھولے ہوئے چہرے کو جلدی سے کیسے ڈھونڈے۔ وہ اسی لیے دن بھر اپنا کام تو کرتا رہا پر جب بھی نظر اُٹھاتا تو وہ رنجنی کو ضرور دیکھ لیتا۔

یونہی وہ گھر پہنچا اور اس نے ایک پرانا ٹرنک کھول کر تصویریں کے البم نکالے۔ امریکہ، افریقہ، انگلستان، یورپ، نہ جانے کہاں کہاں کی کیسی کیسی یادیں لپٹی تھیں، چھپی بیٹھی تھیں ان البموں میں۔ مگر اس وقت تو بس ایک دُھن سوار تھی، رجنی کا چہرہ کہاں دیکھا۔ کس دیش کے چمن میں یہ پھول نظر آیا۔ بار بار زنانے چہروں پر نظریں رُکتیں، کوئی بھولی بسری یاد دل کو مسلتی ہوئی آتی اور وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر آگے بڑھ جاتا۔ مردانے چہرے فوجیوں کے تھے، انہی میں گھنشیام کی تصویر دِکھائی دی اور اسے وہ شام یاد آ گئی جب برما کے جنگلوں میں اُن کی پٹرول کرنے والی جیپ پر جاپانیوں نے اچانک حملہ کیا تھا۔ گھنشیام اور وہ ڈرائیور کی بغل میں آگے بیٹھے تھے۔ پیچھے ٹومی گن لیے ہوئے آدھے درجن جوان۔ یکایک مشین کی پٹ پٹ شروع ہوئی، پہلی ہی باڑھ میں گھنشیام آہ کر کے اس کی گود میں آ رہا تھا۔ ڈرائیور بھی زخمی ہوگیا تھا پرنتو اُس نے بڑی تیزی سے جیپ بھگائی اور اسے سانپ کی طرح لہراتا ہوا لے چلا۔ اِدھر جوانوں

نے بھی تڑاتڑ فائر کیے اور یہ لوگ کسی طرح جان بچا کر نکل آئے۔ پرنتو جب کیمپ پہنچے تو گھنشیام نے ایک ہچکی کے ساتھ ''رانجھا'' کہا اور سدا کے لیے چپ ہوگیا۔

گھنشیام کے سینے پر اندر والی جیب میں یہی فوٹو تو تھا جو اپنی مست جوانی کے ساتھ اس سے بھی اس کی بغل میں البم میں مسکرا رہا تھا، اور کمار نے اسے البم سے نکال کر ہاتھ میں لے کر دیر تک دیکھا۔ وہ اس رانجھا کو کئی برس تک ڈھونڈا کیا تھا۔ اُس نے اخباروں میں اشتہار دیئے تھے، اُس نے گھنشیام کے گاؤں آدمی بھیج کر پہنچوایا تھا۔ وہاں بس اتنا پتہ لگا کہ لڑائی چھڑنے کے پہلے ہی سال میں گھنشیام کہار اونچے گھر کی بدھوا کو لے کر بھاگ گیا تھا۔ دونوں کے کٹم میں کوئی چھوٹا بڑا باقی نہ تھا اس لیے کسی نے کھوج پتہ لگانے کی فکر نہ کی۔ دونوں زمین میں سما گئے کہ آسمان میں اُڑ گئے کسی کو نہیں معلوم۔ کمار کو وشواس ہوگیا کہ اُس نے گھنشیام کی رانجھا کو پالیا۔ پر اب؟ رانجھا بنا گھنشیام کے...... کیا وہ کسی اور کی......؟ جب وہ آج تک اپنے گھنشیام کے نام کی مالا جپتی رہی تو پھر کسی اور کی کیسے ہوسکتی ہے؟ کچھ خوشی سی ہو چلی تھی کہ خود اپنے ہاں ایک کسک سی پیدا ہوگئی۔ پھر وہ آپ ہی آپ مسکرایا جیسے تھکے ماندے مسافر کو گھور اندھیرے میں دُور کوئی دیا ٹمٹماتا دِکھائی دیا۔ اس نے سینے میں کھٹکتی ایک سانس لی اور وہ پلنگ پر لیٹ کر سو رہا۔

دوسرے دن رنجنی دفتر نہ آئی۔ اُس نے آج برت رکھا تھا۔ ایرادھ پتہ تھا کہ رات بھر وہ کمار سے بھی ادھک بے چین رہی۔ بارہ برس بعد آج پہلی دفعہ گھنشیام کی جگہ کسی اور مرد کا خیال اُس کے من میں آیا تھا۔ اتنے دِنوں سے وہ جس تپسیا میں لگی تھی وہ چھن بھر کے لیے دل سے ایسی نکل گئی کہ اسے یہ یاد تک نہ رہا کہ گھنشیام کو چھوڑ کر کسی اور پرش کے بارے میں سوچنا بھی اس کے لیے پاپ ہے۔ اسی لیے اُس نے اپنے آپ کو یہ برت کی سزا دی۔ مگر سزا نے اُلجھن کی آگ کو بجھایا نہیں، بھڑکا دیا۔ گھنشیام بھی فوجی تھا، کمار بھی فوجی۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں میں بھینٹ ملاقات رہی ہو۔ ممکن ہے کمار جانتا ہو کہ گھنشیام اب کس جگہ ہے اور کس نئی نویلی کو بغل میں دبائے پھرتا ہے۔ پوچھ لینے میں کیا برائی ہے۔ اپنے سوامی کے بارے میں پوچھنا، اُس کی کھوج لگانا تو ہر استری کا دھرم ہے۔ پر کیا گھنشیام اُس کا سوامی ہے۔ وہ اس کے ساتھ اگنی کے چاروں اور کب گھومی؟ کون برہمن وید کے منتر پڑھتا ایک اُونچی ذات کی استری کو نیچی ذات کے پرش کی پتنی بنانے کے لیے؟ کون ایسا جنم گانٹھ دے کر دھرم کو نشٹ کرتا۔ پر کیا کیا جائے۔ بے پوچھے بھی تو نہیں بنتی۔ اور کمار کیا سمجھے گا اپنے دل میں۔ اس کے ''نہیں جی'' نے

جوعزت کا قلعہ اس کے دل میں کھڑا کیا تھا وہ گھنشیام کی بات آتے ہی سب ڈھ جائے گا۔ پھر وہ اپنا راز کہہ کر دفتر میں نوکر بھی ہو سکے گی؟۔ بات پھوٹ گئی تھی؟ سب اسے کس نظروں سے دیکھیں گے؟ اُس نے انہی گتھیوں سے گھبرا کر برت رکھ لیا۔ بھگوان تم ہی کوئی اُپائے بجھاؤ، کوئی ایسی ڈگر دِکھاؤ کہ آن نہ جائے اور بات سلجھ جائے۔

کمار کام کرتے کرتے جب بھی سر اُٹھاتا تو اس کی آنکھیں رنجنی کی خالی کرسی پر جم جاتیں۔ کیوں نہیں آئی؟ کیا واقعی چڑھ گئی؟ اگر اتنی سی بات سے چڑھ سکتی ہے تو پھر اس سے گھنشیام کے بارے میں کیسے پوچھا جا سکے گا۔ اور گھنشیام کے بارے میں پوچھنا ضروری ہے۔ پر اب کیا کرے۔ رنجنی کے گھر کا پتہ تک نہیں معلوم۔ اُس نے ہیڈ کلرک کو بلا بھیجا۔ آپ کے پاس دفتر کے سارے ملازمین کے نام ہیں اور ان کے گھروں کا پتہ؟ اس نے کہا ضرور۔ کمار نے بات بنائی۔ آپ رجسٹر مجھے دے دیں، میں کچھ لوگوں کے نام اور پتہ نوٹ کر لینا چاہتا ہوں۔ میں ان کے گھروں پر جا کر ملنا چاہتا ہوں۔

پرانے ڈھنگ کے بابو نے تب رسماً یاد دلانا ضروری سمجھا۔ ''آج تک کبھی کوئی منیجر یا اسٹنٹ کسی کے گھر...... آپ کیوں؟ کیا اس میں سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔'' وہ سر ہلاتا چلا گیا اور اس نے رجسٹر بھیج دیا۔ کمار نے رنجنی کا پتہ نکال لیا۔ وہ وائی ڈبلیو سی اے میں رہتی تھی۔ جلدی جلدی وہاں کا نمبر ڈھونڈ کے فون کیا۔ دونوں میں انوکھی بات چیت ہوئی۔

''ہیلو!''

''ہیلو!''

''میں کمار ہوں۔''

''میں رنجنی ہوں۔''

''آپ کیسی ہیں؟''

''اچھی ہوں۔''

''اچھی ہیں تو دفتر کیوں نہیں آئیں؟''

''بات یہ ہے...... بات یہ ہے کہ میں نے آج برت رکھا تھا۔''

''کیوں؟ آج تو کوئی تہوار نہیں؟''

''ہاں، مگر مجھے تو پرائشچت کرنا تھا۔''

''ایں! آپ اور پرائچشت! بھلا آپ جیسی دیوی بھی کوئی پاپ کر سکتی ہے؟''

جواب نہ ملا۔ کمار نے مزہ لے کر کہا ''بتایا نہیں آپ نے؟ پرائچشت کا ہے کا؟''

رنجنی نے جلایا ''پرائے پرش کو چھن بھر دل میں جگہ دینے کی!''

''کون تھا وہ پرایا پرش؟''

پھر جواب نہ ملا۔ اُس نے کئی بات جب ''ہیلو ہیلو'' کہا تو اُلٹے اُدھر سے پوچھا گیا

''سنیے آپ فوج میں تھے؟''

''ہاں، تھا تو۔''

''تو آپ...... آپ گھنشیام جی کو جانتے ہیں؟''

''کیا آپ ہی ان کی رانجھا تھیں؟'' کمار نے بے دھڑک پوچھ لیا۔ اور جواب میں ٹیلی فون کے ساتھ کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ کمار فوراً ٹیکسی پر وائی ڈبلیو سی اے پہنچا۔ میڈن کی اجازت سے ڈرائنگ روم میں ملاقات ہوئی۔ چہرہ سُونا، آنکھیں سوجی ہوئی، بس ایک شبد 'تھیں' نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

دیکھتے ہی پوچھا ''کب اور کہاں؟''

کمار نے کہا ''دس برس ہوئے، جب جاپانیوں نے برما پر چڑھائی کی تھی تو ہم دونوں جیپ میں بیٹھے پٹرولنگ کر رہے تھے۔ دشمن کے کچھ آدمیوں نے پیڑوں کی آڑ لے کر باڑھ ماردی۔ اور سب تو بچ کر نکل آئے پرنتو گھنشیام کے پیٹ میں گولی لگی۔ مرتے سمے انھوں نے آپ کا فوٹو دیا اور 'رانجھا' کہا۔ سب سے آپ کو برابر ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''آپ مجھے کیسے پاتے؟ میں سوئم منہ چھپائے پھرتی تھی۔ میں گاؤں سے بھاگ کر ان کے ساتھ کلکتہ آئی تھی۔ ڈرتی تھی کوئی گاؤں والا نہ دیکھ لے۔''

''کیوں بھاگی تھیں؟'' اُس نے دھیرے سے پوچھا۔

''میں ابھاگنی ہوں۔ بارہ برس کے سن میں بیاہی گئی۔ برات راستے ہی میں تھی کہ پانی برسا، اولے پڑے۔ وہ پندرہ سولہ برس کے تھے، سردی لگ گئی۔ گھر پہنچے پہنچتے نمونیہ ہوگیا۔ تیسرے دن وہ سدھار گئے۔ پھر ساس جی نے مجھے کوسا کاٹا، مارا پیٹا اور مجھ سے داسیوں سمان بیوہار کرنے لگے۔ گھنشیام کہار تھا، وہی پانی وانی بھر دیا کرتا تھا۔ وہی سب کی نظروں سے بچ کر میری ہمدردی کر دیا کرتا اور گاؤں بھر میں کوئی استری پرش میری بات بھی نہ پوچھتا۔ اس طرح

آٹھ دس برس کٹے۔ گاؤں میں ہیضہ ہوا اور چوبیس گھنٹے میں ساس سسر دونوں مر گئے۔ بڑی مشکل سے دونوں گنگا گھاٹ پہنچائے گئے۔ پر گنگا تٹ سے پلٹنے پر کسی نے بات نہ پوچھی۔ گھنشیام گاؤں کے پاس والے ہوائی اڈّے پر کام کرتا تھا۔ وہی رات برات آتا اور میرے لیے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان لاتا۔ جب لوگوں نے اسے اس طرح آتے جاتے دیکھا تو پھر آپس میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ ایک دن سب نے پکڑ کر اسے مارا کہ اونچی ذات کی بدھوا کو پاجی بگاڑتا ہے۔ وہ میرے پاس آ کر رونے لگا۔ میرا من بھی پریم سے بھر آیا۔ مَیں نے کہیں چل ہم دونوں نکل چلیں۔ بس ہم کلکتہ آ ئے۔ دو چار دن تو چھوٹا موٹا زیور بیچ باچ کر کھایا پھر گھنشیام اور مجھے دونوں کو کام کی فکر ہوئی۔ کوئی کام نہ ملا، وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ چلتے سے اُس نے کہا تھا ''مجھے بھولنا مت رانجھا۔ بھگوان کے سامنے میں تیرا پتی ہوں۔ میں اس دِن سے طرح طرح کی ٹھوکریں کھاتی رہی، پھر اسی کے آسرے پر بیٹھی رہی۔ میں بچ ابھاگن ہوں۔''

کمار نے ٹھوڑی میں انگلی لگا کر اس کا سر اُونچا کیا۔ ''اور یہ فوجی دس برس سے رانجھا کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔''

رنجنی نے کانپ کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ کمار بولتا گیا۔ ''میں نے جس دن یہ فوٹو دیکھی تھی، طے کر لیا تھا کہ گھنشیام کی رانجھا کو اپنی بنا کر چھوڑوں گا۔ دس برس کی تپسیا کچھ کم نہیں ہوتی رنجنی۔''

وہ پھر بھی سر جھکائے سسکتی رہی۔ کمار نے کہا۔ ''ہم دونوں تھکے ہارے مسافر ہیں۔ دونوں کو آرام کے لیے گھنیری چھاؤں کی ضرورت ہے۔ آؤ ہم ہی ایک دوسرے کے لیے چھتنا پیڑ بن جائیں!''

رنجنی نے آنکھ اُٹھا کر کمار کو دیکھا ''بجھے بجھے دیدوں میں بتیاں سی جلنے لگیں اور وہ کمار کی طرف جھک گئی۔

(مسودہ۔ تاریخ درج نہیں)

دوسری ممّی

اینی نے اُکتا کر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا جیسے کمبخت سوئیاں جم کر رہ گئی تھیں۔ اُن سے کھسکا ہی نہیں جاتا تھا۔ چار ہی بجے تھے۔ کافی ہاؤس کے لمبے چوڑے کمرے پر بالکل اُس کی زندگی جیسا سناٹا چھایا تھا۔ سامنے والی سڑک پر بھی یہی کیفیت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پورا گنج اونگھ رہا ہے۔ نہ شور، نہ ہنگامہ، نہ چہل پہل۔

اپریل کا مہینہ تھا، مگر دن بھر لو چلی تھی۔ اُس کے تھپیڑے اب ہلکے ہو گئے تھے، مگر تارکول کے غلاف میں لپٹی ہوئی سڑک ہلکی راکھ سے ڈھکے لہکتے کوئلوں کا مزہ دیتی تھی۔ ایسے میں اس کی کہاں اُمید کہ خس خانوں میں چھپے ہوئے دفتروں کے کلرک چھ بجے سے پہلے کافی ہاؤس کی زینت بنیں گے، یا یونیورسٹی اور کالج کے نازک بدن اس دھوپ اور گرمی میں گلگشت کو نکلیں گے۔

یہاں آنے والے تو تین ہی قسم کے لوگ تھے۔ سکریٹریٹ اور آس پاس کے دفتروں کے کلرک، یونیورسٹی اور کالجوں کے پروفیسر، طلبا اور طالبات۔ سب دماغی مزدور، سب ایسے جو تین آنے کی کافی کی پیالی میں اپنی تھکن، اپنی کوفت اور اپنی اُجڑی ہوئی زندگیاں بھولنا چاہتے تھے۔ جوان ہو کہ بوڑھا، ہر ایک کا چہرہ ستا ہوا، ہر ایک کچھ متفکر، کچھ متجسس، کچھ کھویا کھویا سا، کچھ کچھ گھبرایا گھبرایا سا۔ موجودہ زندگی سے پریشان، نئے نئے خوابوں کا تانا بانا بننے میں سرگرداں۔ پروفیسروں کی میز پر علم و ادب کی گفتگو نہ ہوتی بلکہ سیاست کی، جیسے علم و ادب ان کی اصلی زندگی نہیں محض پیٹ پالنے کا بہانہ ہے۔ کلرکوں کی میز پر کام ٹالنے اور رشوت ستانی کا ذکر ہوتا یا وزارتوں میں اپنے اپنے ساتھیوں کے رسوخ اور رشتوں کا۔ نہ ملک کے اُبھارنے اور

سنوارنے کی باتیں اور نہ اس کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے کی فکر اور طالب علموں کے جتھوں میں نہ کالیداس پر بحث، نہ تلسی و ٹیگور پر بلکہ رائے زنی ہے تو گالیوں کے ساتھ فلمی کرداروں اور فلمی گانوں پر۔ غرض ہر ایک کا دل کچھ اور چاہتا تھا، ہر ایک کرتا کچھ اور ہی تھا۔ ایک غیر منظم، بے سر پاؤں کی، بے ڈھنگی زندگی!

ہوا کے ایک گرم جھونکے نے اینی کو چونکا دیا۔ ایک بیرا کسی ضرورت سے باہر گیا، جلتی تپتی سڑک کی گرمی اندر گھس آئی۔ اینی کے سر کے سوکھے باریک بال اُڑ کر اس کی پیشانی پر اس طرح پھیل گئے کہ اسے ہاتھ اُٹھا کر انھیں برابر کرنا پڑا۔ یہ پریشانی اس کے لیے نئی نہ تھی، زندگی کے گرم جھونکے ہمیشہ اس کے ہاں اس طرح کی سلوٹیں ڈالتے رہے تھے اور ان شکنوں کو اسے بار بار مٹانا اور برابر کرنا پڑتا تھا۔

وہ پانچ برس کی تھی کہ اس کا باپ جنگ عظیم پر چلا گیا۔ ایک سال تو روپے بھی بھیجتا رہا اور خط بھی، پھر لا پتہ ہو گیا۔ نہ جانے برما میں جاپانیوں کے ہاتھ مارا گیا، یا وہاں سے بھاگتے میں کسی اور کا شکار بنا۔ نہ ٹھیک پتہ چلا، نہ صحیح خبر ملی۔ اینی کی ماں روزی روئی پیٹی پھر بچی کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئی۔ لیکن اس بے ایمان دُنیا میں ایماندار کو پیسے بڑی مشکل سے ملتے ہیں، وہ بھی ایک عورت کو، جو جوان بھی ہو، حاجت مند بھی ہو اور اپنی غربت برقرار رکھنے پر مصر بھی ہو۔ روزی دن رات موزے سوئیٹر بنتی، سلائی کرتی، میز پوش اور تکیوں کے غلاف کاڑھتی، جب جا کر ماں بیٹی کی گزر بسر ہوتی۔ اس پر اینی کو تعلیم کا شوق۔ کتابوں اور کاپیوں کی بے پناہ بڑھتی ہوئی تعداد، فیس بھی درجہ بدرجہ بڑھتی ہوئی اور اُن پر روز روز کے چندے۔ غرض اینی کو ہائی اسکول پاس کرانے میں روزی کی آنکھوں نے جواب دے دیا۔ اب اینی کیسے آگے بڑھتی۔ اب تو اسے ماں کو سنبھالنا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک ساتھی کے باپ سے کافی ہاؤس کے منیجر سے دوستی تھی۔ وہاں ایک کیشئر کی ضرورت تھی۔ اُس مردِ خدا نے سعی سفارش کر کے اینی کو یہ جگہ دلوا دی۔

اینی کافی ہاؤس کی کیشئر بن گئی۔ شروع شروع میں وہ احسان مندی کے جذبہ کے ماتحت ویٹر کا کام کرنے کے لیے بھی تیار تھی، مگر پہلے ہی دن کے تلخ تجربے نے اسے ہمیشہ کے لیے سبق دے دیا۔ بوائے بروقت موجود نہ تھا۔ وہ خود ہی بل پیش کرنے اور دام وصول کرنے کے

لیے میزوں کے درمیان سے گزری۔ آنکھیں جھکائے ہوئے، دھڑکتے دل اور عرق آلود پیشانی سے جب اُس نے بل پیش کیے تو نوجوانوں نے لمبی لمبی سانسیں بھی نذر کیں اور بڑی بڑی ٹپیں بھی۔ اینی کو محسوس ہوا جیسے اجنبی ہاتھ اس کے کپڑے نوچنے لگے۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا، اس کی آنکھیں غصّے سے چمکنے لگیں۔ اُس نے ہر ایک کے پیسے گن گن کر واپس کیے۔ نوجوانوں نے سیٹیاں بھی بجائیں، اور بعض نے ٹپوں کی واپسی توہین بھی سمجھی مگر وہ اپنی بات پر اَڑی رہی اور اُسی دن گھر جانے سے پہلے مینجر نے یہ طے کرلیا کہ وہ کسی حالت میں بھی بل وصول کرنے میزوں کے پاس نہ جائے گی۔ اس سے اس کی نسوانیت مجروح ہوتی ہے۔

یوں کافی ہاؤس کی چہل پہل، گہما گہمی میں بھی اینی کی زندگی ویران ہی رہی۔ اس ویرانی میں صرف ایک آباد گوشہ تھا۔ زندگی کے گھور اندھیرے میں ایک ٹمٹماتا ہوا دیا، اور وہ تھی کرشن کی ذات۔ کرشن کوئی خوبصورت گبرو جوان نہ تھا، نہ تو چہرے پر شباب کی تازگی تھی اور نہ دولت کی چمک، جو انسان کو فطری و اصلی حسن سے بھی دلکش و دیدہ زیب بنا دیتی ہے۔ وہ ایک خاموش، سوکھے، رُوکھے چہرے والا پینتیس برس کا پریس مین تھا۔ میلا پتلون، میلا کوٹ، میلے ہاتھ۔ جیسا کام ویسی آمدنی۔ یہی سوا سو ڈیڑھ سو روپے ماہوار۔ بس اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں بلا کا درد تھا۔ جب وہ آٹھ بجے رات کو کافی کی ایک پیالی پیتے پیتے خلا میں تکنے لگتا تو اینی کا بے اختیار جی چاہنے لگتا کہ وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر پوچھے کاہے کی سوچ ہے، کس بات کی فکر ہے۔ جس طرح بھی ہو وہ کرشن کی غمگین آنکھوں میں مسرت کی چمک، خوشی کی سرخی پیدا کردے۔ نہ جانے کون سا جادو بھرا تھا اینی کے لیے اُن آنکھوں میں کہ وہ ان پر نظر پڑتے ہی اُتھل پتھل ہونے لگتی تھی۔ وہ گھبراہٹ، وہ بے چینی، وہ دُکھ بانٹ لینے کی خواہش کہ اللہ کی پناہ!

پہلی ہی شام جب کرشن آیا اور کاؤنٹر کے قریب ہی ایک خالی میز پر بیٹھ کر کافی کی پیالی میں اپنی تکلیفیں نچوڑنے لگا تو اینی بار بار کیش میمو سے آنکھیں ہٹا کر اسے دیکھنے پر مجبور ہوگئی اور جب ساڑھے آٹھ بجے تک اس کی یہی حالت رہی اور وہ یوں ہی کھویا ہوا بیٹھا رہا تو وہ اپنے اصول کے خلاف اس کے پاس بل لے کر خود ہی گئی۔ کرشن حسبِ معمول تین آنے کی جگہ چونی پیش کی۔ جب اینی نے ''نو تھینک یو'' کہہ اکنی واپس کی تو کرشن نے پہلی بار اسے سر سے پاؤں

تک دیکھا اور کچھ خجل آواز میں ''سوری'' کہہ کر انگلی واپس لے لی، اور گردن جھکائے باہر چلا گیا۔

کرشن کی یہی بے نیازی اور معصوم سادگی اینی کو اس سے نزدیک کرتی گئی۔ یہاں تک کہ آپس میں گفتگو بھی ہونے لگی۔ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ اس لیے کرشن آٹھ ساڑھے آٹھ بجے آتا، کافی پیتا اور جب نو بجے اینی کافی ہاؤس کے کاموں سے فراغت پا کر گھر پلٹتی تو وہ اس کے ساتھ اس کے گھر تک جاتا۔ سارا راستہ کارخانے اور کافی ہاؤس کے قصوں میں کٹتا، کبھی بھی نجی باتیں نہ ہوتیں۔ سنسان گلیوں میں ہوتے ہوئے جب وہ کرشن کے ساتھ چلتی تو کرشن کبھی سہارا دینے کے بہانے بھی اس کا ہاتھ نہ تھامتا۔ اُس نے آج تک نہ کبھی کوئی لفظ محبت یا پیار کا استعمال کیا اور نہ کبھی اسے ڈیئر یا ڈارلنگ کہا۔ وہ مسکرا کر بہت دھیرے سے ''اینی'' کہتا اور اینی کہتے وقت جو محبت اس کی پلکوں کی چلمن سے پھوٹ نکلتی وہ اینی کو مدہوش کر دیتی۔ اپنے ہاتھ سے چائے کی پیالی وہ اس کے سامنے رکھ دیتی تو وہ ''شکریہ'' کہنے کے بجائے اسے اتنے پیار سے دیکھتا کہ اینی ان وادیوں میں کھو جاتی جہاں کے پھولوں میں خلوص کی خوشبو ہے، برفانی چوٹیوں سے محبت کی گنگناتی ندیاں نکلتی ہیں اور خوابوں کے جزیرے کا شہزادہ مسکرا کر اپنی شہزادی کی طرف دیکھتا ہے اور اس روشن مینار کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں صبح کی تازگی اور لطیف ٹھنڈک اپنے نازک پروں پر سورج کی سنہری کرنوں کا حاشیہ لیے مسکرا رہی ہے اور ایک نئی سحر کی نوید دے رہی ہے، اور دونوں ہنستے ہنساتے اس اُفق کی طرف بڑھتے جاتے ہیں جہاں زمین و آسمان ہم آغوش ہوتے ہیں، جہاں شام و سحر ملتے ہیں، اور جہاں موت و زندگی ایک نیا دلفریب رُوپ اختیار کر لیتے ہیں۔

لیکن آج صبح سے وہ مسرت غائب تھی۔ اندھی روزی نے ممتا کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ آج اُس نے کافی ہاؤس میں ڈیوٹی پر جانے سے پہلے اینی سے کرشن کے بارے میں سوالات کیے تھے۔ کیسا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کیا آمدنی ہے؟ کیا ارادے ہیں؟ اور اینی کے اُلجھے ہوئے جوابوں سے اس کی اتھاہ محبت کا اندازہ لگا کر اسے ڈانٹا تھا، سمجھایا تھا۔ اسے اپنے کھوئے ہوئے ڈر کے تھامے رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ بھی کہا تھا کہ اُس سے کہہ دو کہ وہ مجھ سے ملے۔ مجھ سے باتیں کرے، ورنہ تم اس کے ساتھ رات کو گھر آنا چھوڑ دو۔ نیتیں پاک صاف

سہی، مگر دُنیا والوں کی زبان کوئی نہیں روک سکتا۔

اسی لیے وہ آج معمول سے زیادہ اُلجھتی رہی۔ سہ پہر کے سناٹے میں بھی، شام کی چہل پہل میں بھی۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتی، بار بار ہر آنے والے پر نظر ڈالتی۔ پانچ بجے، چھ بجے، سات، آٹھ، ساڑھے آٹھ۔ وہ انتظار کرتے کرتے تھک سی گئی۔ وہ ایک طرف جا کر آرام کرسی پر دَم لینے کے لیے بیٹھ گئی۔ منیجر خود حساب جوڑنے کاؤنٹر پر آ گیا تھا۔ اِکاّ دُکاّ گاہک رہ گئے تھے۔ اس کے لیے اپنی اُلجھنوں کو بھلانے کے لیے کوئی کام نہ رہ گیا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی سامنے والے قدِ آدم آئینے میں اسے اپنی صورت نظر آئی۔ خشک بھورے بالوں کی لٹیں بکھر گئی تھیں، ہونٹوں پر پپڑی جم گئی تھی، آنکھوں کے گرد حلقے اور نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ سوکھے لبوں پر زبان پھیرنے اور جوڑا ٹھیک کرنے لگی کہ دفعتہً کافی ہاؤس کا دروازہ کھلا اور کرشن اندر داخل ہوا۔ بس اینی اسے دیکھنے لگی، ویسی نگاہ سے جس میں محبت کی طراوت و حرارت چمک رہی تھی۔ زندگی کی ساری بہاریں، خوشیوں کے اُجالے، ہنسی کے پھول، آرزوؤں کی اَدھ کھلی کلیاں، سب کچھ اسی ایک نظر میں سمٹ کر آ گیا تھا۔

اُس نے خود کرشن کو کافی کی پیالی دی، اُس نے خود اس سے دام لے کر منیجر کو دیئے اور وہ جلدی جلدی حساب سمجھا کر کرشن کے ساتھ گھر پلٹی۔ راستے میں نہ اینی سے کچھ کہا گیا اور نہ کرشن ہی کچھ بولا۔ لیکن جب وہ اپنے گھر پہنچ کر اندر جانے لگی تو کرشن نے اسے سامنے والے پختہ چبوترے پر رُکنے کو کہا۔ اینی کی دل کی دھڑکن میں ایک گیت کا ترنم پیدا ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا آج کرشن اس سے شادی کی درخواست کرے گا۔ وہ کہے گا اب ہمارے دو گھر کی جگہ ایک ہی ہونا چاہیے۔ میرے لیے تم سے الگ زندگی محال ہے۔

مگر چبوترے پر بیٹھتے ہی کرشن نے اس کے ہاتھ میں ایک خط دے دیا۔ دل نے کہا کرشن ہمیشہ کا گونگا ہے، زبان سے کہنے کی ہمت نہیں رکھتا اسی لیے اپنی عرضداشت لکھ کر لایا ہے۔ اینی نے شرمیلی محبت بھری مسکراہٹ سے کرشن کو دیکھا، مگر کرشن گردن جھکائے ہی رہا۔ اینی نے لفافہ کھولا، خط نکالا۔ ایں، یہ تو کسی بچی کی تصویر تھی۔

''پاپا جی، نمستے! ممّی کہتے ہیں تمھارے پاپا روپے کمانے گئے تھے، مگر دوسری ممّی نے روپے چھین لیے۔ میں خوب روئی۔ پاپا اتنے طاقتور ہیں، ان سے دوسری ممّی روپے کیسے چھین

لے گی؟ پاپا یہ دوسری ممّی کون ہے؟

کل مجھے ممّی نے مارا بھی اور بہت سارو ئی بھی۔ ہوا یہ کہ ممّی آپ کا پرانا کوٹ، وہی جو میرے سرہانے ٹنگا ہے، اسے جھاڑ رہی تھیں، اور اس پر اس طرح پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھیں جیسے سچ مچ آپ اسے پہنے کھڑے ہیں۔ مجھے وہ کوٹ بہت برا لگتا ہے، جگہ جگہ سے کٹ گیا ہے اور اس میں سے کھٹی کھٹی بوٗ آتی ہے۔ میں نے کہا ممّی اسے پھینک دو۔ بس اس پر وہ مجھے مار بیٹھیں۔ جب میں رونے لگی تو وہ خود بھی روئیں اور کہا اب پھر اسے پھینکنے کو نہ کہنا۔

پاپا، ممّی رات کو چپکے چپکے رویا کرتی ہیں۔ ایک دن میں نے پوچھ لیا کیا بات ہے؟ بس اُسی دن سے مجھے الگ سلاتی ہیں۔ مجھے کیلے سلاتی ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ آپ آجائیں تو میں آپ کے ساتھ سوؤں گی۔

ہاں آیئے گا تو میرے لیے آنکھ نچانے والی ایک گڑیا لیتے آیئے گا اور بہت سی مٹھائی! اور جلد آیئے پاپا، جلد! آپ کی بیٹی — شیلو۔"

اینی کو خط کا پہلا حصہ پڑھتے ہی دھچکا لگا۔ ارے کرشن شادی شدہ ہے۔ اس کے ایک بیٹی بھی ہے، پھر اُسے غصہ آیا۔ کرشن نے اسے سخت دھوکا دیا۔ دھوکے میں رکھا، دھوکے کا جال بُنتا چلا گیا۔ کیوں ملاوہ اس طرح اینی سے کہ اس کے دل میں محبت ہوگئی۔ وہ اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے میٹھے سپنے دیکھنے لگی؟ مگر دوسری ممّی کا لفظ دل میں پیوست ہو گیا۔ طبیعت نے پلٹا کھایا۔ ممّی، ممّی۔ کسی معصوم کے منہ سے تتلا کے جب یہ لفظ پہلی بار نکلتا ہے تو ممتا کی چھاتی پھٹنے لگتی ہے۔ بس اس ممّی نے اینی کا پورا موڈ بدل دیا۔ وہ پورے خط کو ایک ماں کے جذبہ سے دوبارہ پڑھنے لگی۔ چھوٹی بچی وار پروار کرتی، نشتر پر نشتر چبھوتی چلی گئی، اور آخر تک پہنچتے پہنچتے تو خط پورا مرثیہ بن گیا۔ اینی کے آنسو گالوں سے ڈھلک کر دامن پر آ گئے۔ اُس نے دیکھا شیلو کی ممّی دُور کھڑی ہے۔ اُس کی نگاہوں میں وہی حسرت ویاس ہے، وہی امیدوں کا جنازہ ہے جو اُس نے اپنی ماں کی نگاہوں میں، بے نور ہونے سے پہلے، اکثر دیکھا تھا۔ پھر اسے شیلو کو دیکھا۔ جیسے پانچ سات برس کی بچی اس کی طرف ہاتھ پھیلائے عاجزی سے اپنے پاپا کو مانگ رہی ہے، اینی کو اپنا باپ یاد آ گیا۔ اسی سن میں تو وہ بھی اپنی بچی کو چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا۔ روزی کہتی وہ مرا نہیں، اُس نے ہمیں چھوڑ کر کوئی دوسرا گھر آباد کیا۔ وہ سدا کا خود غرض اور بے وفا تھا، مگر اینی

کا دل کہتا وہ کیسا بھی ہو ایک بار آ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیتا، اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر میری بیٹی، میری بیٹی کہہ دیتا۔ ساتھ ہی شیلو کی آواز سنائی دی۔ چھوڑ دو میرے پاپا کو دوسری ممی۔ مجھے اکیلے سوتے ڈر لگتا ہے۔ میں اس کے سینے سے چمٹ کر سوؤں گی اور اینی ایک بار کانپ کر کھڑی ہوگئی۔ ''کب جا رہے ہو؟'' اُس نے کرشن سے پوچھا۔

کرشن کرب سے تلملا گیا۔ ''ذرا میری سن لو۔ ہماری شادی ماں باپ نے کی۔ میں نے اپنی بیوی میں محبت کی وہ تڑپ اور گرمی کبھی نہ پائی جس کی میری رُوح بھوکی تھی۔ میں شاعر ہوں، میں محبت کا آرزو مند ہوں۔ اس طرح کی محبت کا جو صرف دلوں میں چھپی نہ بیٹھی رہے بلکہ جو زبانوں پر بھی آتی رہے۔ میری بیوی پرانے ڈھنگ کی استری، اُس نے اپنے اس پریم کو جو شیلو نے لکھا ہے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ برف کی سل، پتھر کی مورتی بنی رہی، اور میں پیار کے ایک بول کے لیے تڑپتا رہا۔ اسی لیے ہمارے درمیان ایک گہری خلیج حائل ہوگئی۔ میں ایک اچھی خاصی نوکری چھوڑ کر اس شہر میں بھاگ آیا۔ مہینوں کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اتنے کا کام مل گیا کہ پیٹ بھر لیتا ہوں، مگر یہاں تم بھی مل گئیں۔ وہ جس کی مجھے کئی جنموں سے تلاش تھی، جس نے میری رُوح میں پڑے ہوئے گھاؤ بھر دیئے۔ جس کو دیکھتے ہی میرے جی میں پھولوں سے لدے باغ کھل اُٹھتے ہیں، اور دودھ اور شہد کی نہریں نکل پڑتی ہیں۔ کیا میں تمھیں چھوڑ کر اسی سوکھے چشمے کی طرف چلا جاؤں جس سے میرے ہونٹ کبھی تر نہ ہوئے۔ بولو! انصاف کرو!''

اینی نے اتنے میٹھے بول عمر میں کبھی نہ سنے تھے۔ اس کا دل بھر آیا۔ اُس کا سر کرشن کے کندھے کی طرف جھکنے لگا، مگر ویسے ہی اس کی نظروں کے سامنے دو ننھے ننھے ہاتھ پاپا کی بھیک مانگتے ہوئے پھیلے ہوئے دِکھائی دیئے۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے جھکی ہوئی لٹیں برابر کیں۔

''میں شیلو کا باپ اُس سے نہیں چھین سکتی!'' اُس نے بڑے عزم سے کہا۔

اور قبل اس کے کہ کرشن کچھ اور کہے وہ جھپٹی ہوئی اندر گئی۔ تنخواہ میں سے کرایہ اور قرضہ ادا کر کے جو پندرہ روپے بچے تھے وہ اسے مٹھی میں دبائے پلٹی۔ اُس نے کرشن کو اس کے شانے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور روپے اس کی جیب میں ڈال کر کہا ''شیلو کو اس کی دوسری ممی کی طرف سے مٹھائی!''

کرشن گھبرا گھبرا کر اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اُس نے گھر میں گھس کر اندر سے کنڈی بند کر لی۔ وہ تھوڑی دیر دیوار سے لگی کانپتی رہی۔ پھر اس پر دفعتہً ہنسی کا دورہ پڑا۔ وہ ہنستی لڑکھڑاتی ہوئی اپنے بستر پر جا کر گر پڑی۔ وہ بار بار ہنستی تھی، تکیوں کو دانتوں سے نوچتی تھی اور غالبؔ کا شعر پڑھتی تھی:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

جب روزی اس شور سے جاگ کر "کیا ہے اینی، کیا ہوا بیٹی؟" کہتی ٹٹولتی اس کے بستر پر پہنچی تو وہ بیہوش تھی۔

(مسودہ۔۔تاریخ درج نہیں)

دیش اور دھرم

غازی پور کے ضلع میں ایک چھوٹی سی بستی محمد پور نامی ہے یہاں کے سب سے بڑے زمیندار میر عنایت حسین صاحب تھے۔ یہ ایک پچیس تیس برس کے نوجوان خوشترو آدمی تھے۔ ان کی فطرت نہایت نیک اور طبیعت نہایت ملنسار تھی۔ گاؤں کی رعایا پرجا سب ان سے خوش تھی۔ یہ ہندو مسلمان سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے اور جب کوئی معاملہ آپس میں فساد کا پیدا ہوتا، سب انھیں کو سرپنچ بناتے اور یہ اس طرح فیصلہ کرتے کہ سب خوش رہتے تھے۔ میر صاحب کی اس نیکی کی دھوم دُور دُور تھی۔ اور قرب و جوار کے دوسرے گاؤں والے بھی اکثر و بیشتر ان سے مشورہ لینے یا اپنے معاملے مقدمے میں مدد مانگنے آتے تھے۔ ان میں ایک خاص بات تھی کہ وہ ہمیشہ ظالم کے خلاف مظلوم کا ساتھ دیتے، خواہ اس میں ان کا کوئی بھائی ہی، کوئی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے لیکن وہ ایسے لوگوں سے ملتے ملاتے رہتے تھے کہ جو آج کل کے رنگ سے اچھی طرح واقف ہیں اور انھی سے وہ ملکی معاملات اور قومی جھگڑوں کے متعلق بحثیں سنتے اور اپنی جگہ پر ایک رائے قائم کرتے۔ میر صاحب کی آمد ورفت صرف وکلا ہی تک نہ تھی بلکہ ان کی حکامِ ضلع سے بھی ملاقات تھی۔

اور میر صاحب کسی کو رشوت نہ دیتے تھے لیکن ان سب میں سہدیو اہیر خاص طور پر میر صاحب کا منہ لگا تھا۔ یہ ایک پچیس برس کا جوان کشرتی آدمی تھا۔ گاؤں میں نہ تو کوئی اس کی سی کشتی لڑسکتا تھا اور نہ کوئی ویسی لاٹھی چلاسکتا تھا۔ اس پر منچلا بلا کا۔ وہ بڑے سے بڑے غول میں لاٹھی لیے نہایت بے باکی سے گھس جاتا تھا اور لوگوں کی یہ حالت ہوتی تھی کہ کائی کی طرح پھٹ جاتے تھے۔ میر صاحب کو اس کی نڈری اور اس کی جیوٹ بہت پسند تھی اور انھوں نے 'پہچان' میں اس کی کشتی ہی دیکھ کر اسے نوکر رکھا تھا۔

گاؤں میں دو اکھاڑے تھے، ایک تو بزرگ بابا کا دوسرا نوبت کا۔ بزرگ بابا کے اکھاڑے کا خلیفہ جوکھو جولاہا تھا اور نوبت کے اکھاڑے میں سب سے پرانا لڑنے والا نانک تھا۔ دونوں اکھاڑوں میں ہندو مسلمان سب ہی شاگرد تھے۔ لیکن ان میں اَن بن، بڑی رہتی تھی اور سال 'پچپان' کے دن اکثر و بیشتر مقابلے کی ٹھہرتی۔ گاؤں کے اور زمیندار خواہ اکھاڑے پر جائیں یا نہ جائیں، لیکن میر صاحب محض اس خیال سے کہ کوئی فساد نہ ہونے پائے اور جوانوں میں کشتی اور کسرت کا شوق باقی رہے، ضرور جاتے۔ اسی پچپان میں میر صاحب کے سامنے سہدیو جوکھو کو ٹوک کر لڑ گیا اور اس نے پلک مارتے 'بزرگ بابا' کے خلیفہ کو پچھاڑ دیا۔ اس کے بعد اکھاڑے میں قدم گاڑ کر وہ پکار کر بولا "ہے کوئی اور جوان جس کے دل میں حوصلہ ہے تو آجائے!" گو بزرگ بابا کے اکھاڑے والوں نے اس کے اس فعل کو اتنا برا مانا تھا کہ اگر میر صاحب نہ ہوتے تو شاید فساد ہو جاتا اور دو چار کے سر ٹوٹتے۔ لیکن میر صاحب کو سہدیو کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ اسے اسی وقت اپنے ساتھ گھر لے گئے اور اپنے کارندوں میں نوکر رکھ لیا۔ اور علاوہ تنخواہ کے اس کی 'خوراکی' بھی مقرر کر دی تا کہ وہ کھانے پینے کی طرف سے مطمئن رہے اور اس کی ورزش میں کوئی رخنہ نہ پڑے۔

۱۹۲۱ء میں محمد پور میں بھی نان کوآپریشن کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ ایک آدھ چماریا کوری جنھیں ذرا مقدمہ بازی سے دلچسپی تھی اور وکلا تک رسائی، غازی پور سے خبر لائے کہ مہاتما جی کا حکم ہے کہ ہر گاؤں میں کسان سبھا قائم ہونی چاہیے۔ اور اگر کوئی زمیندار سرکاری عملوں سے ملتا ہو تو اس کا لگان بند کر دو۔ اب گاؤں میں ہر طرف کھچڑی پکنے لگی۔ بعض پرانے رنگ کے لوگ ان نئی نئی باتوں سے گھبراتے تھے اور یہی صلاح دیتے تھے کہ رعایا اور زمیندار کی لڑائی اچھی نہیں، تم دَبے ہوئے ہو، نقصان اٹھاؤ گے۔ اور دیہات کی مطیع طبیعتیں کچھ مان چلی تھیں کہ ایک روز ایک دُبلے پتلے آدمی کھدر کا کرتا، کھدر کی کشتی نما ٹوپی پہنے، لنگی باندھے والنٹیر کی پٹی ڈالے آموجود ہوئے اور جھگڑو کوری کے یہاں اترے۔ اب کیا تھا، خبر ہونے کی دیر تھی۔ لوگ جوق در جوق ان کے دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کی تمنا میں آنے لگے۔ اور ان سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ نان کوآپریٹو صاحب سب کے جواب دیتے اور سب کو سمجھاتے رہے اور سبھوں نے تو کچھ ایسا ہی ویسا اثر لیا۔ لیکن سہدیو اس دن سے ان کا کلمہ پڑھنے لگا۔ وہ تو ایک دن کے بعد چلے گئے۔ لیکن گاؤں بھر میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی اور ایک

اچھی خاصی کسان سبھا کی نیو پڑ گئی۔ میر صاحب بے چارے بے حد پریشان تھے، اس لیے کہ سرکاری عملہ انھیں ایک طرف کھینچتا تھا اور پرجا دوسری طرف۔ عجیب طرح کی کشمکش تھی۔ اس پر غضب یہ کہ سہدیو، خاص کارندہ، ہر کام کو جان پر کھیل کر انجام دینے والا، وہ بھی اب الگ الگ سا رہنے لگا۔ اور وہ جب بھی اسے کسی کام سے بھیجتے، تو وہ جس کے یہاں جاتا اپنے دل کے موافق تذکرے اور چرچے پا کر وہیں کا ہو رہتا۔

میر صاحب اسی سے پریشان تھے کہ گاؤں میں ایک اور نیا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ایک مہاجن نے اپنے مکان کے سامنے پیپل کے درخت کے نیچے ایک مورتی رکھی اور گھنٹہ بجایا اور ایک دن خاص طور سے کتھا کہلانے کے لیے مقرر کیا۔ گاؤں کے مسلمان بہت خفا ہوئے اور میر صاحب کے پاس فریاد لے کر پہنچے کہ صاحب آج تک اس گاؤں میں سوائے مندر کے اور کہیں مورتی نہیں رکھتے تھے اور سنکھ نہیں بجاتے تھے۔ اب گجادھر بنئے نے یہ ریت نکالی ہے۔ اب آپ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار ہیں آپ اس کا انتظام تو کریں اور نہیں تو صاحب ہم خود انتظام کر لیں گے۔ دو چار آدمی نہ سہی دیکھا جائے گا۔ میر صاحب نے بڑھتے ہوئے غصّے کو روکا اور کہا۔ ''اچھا ہم گجادھر کو بلا کر پوچھیں گے تو جیسا مناسب سمجھیں گے ویسا کریں گے۔'' گجادھر کو بلا کر میر صاحب نے لاکھ لاکھ سمجھایا لیکن وہ ایک نہ مانا۔ اس نے کہا ''یوں آپ مالک ہیں جو چاہیں کریں لیکن دھرم کی بات میں آپ نہیں روک سکتے۔ آپ مسلمان، ہم ہندو، آپ چاہیں کہ ہم اپنا دھرم چھوڑ کر آپ کے دھرم میں آ جائیں تو یہ بھلا کہیں ہو سکتا ہے۔'' میر صاحب نے جب یہ دیکھا کہ فساد ہوا چاہتا ہے تو ایک خط کانگریس اور خلافت کمیٹیوں کے سکریٹریوں کو لکھ بھیجا کہ ''آپ لوگ مہربانی کر کے اس معاملے کو سلجھایئے۔ ورنہ خون خرابہ ہوگا۔''

خلافت کمیٹی اور کانگریس والے آ کر وارد ہو گئے اور ان کے اثر سے ہندو مسلمان سب ایک طرف ایک زبان ہو کر یہی کہنے لگے کہ جو آج تک گاؤں میں ہوتا آیا تھا وہی ہونا چاہیے، لیکن گجادھر اپنی بات پر اڑ گیا اور گو سکریٹری نے لاکھ لاکھ سمجھایا اور بہت کچھ اونچ نیچ سمجھایا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ سہدیو، جیسا کہ جاہل اور قوی لوگوں میں اکثر دیکھا گیا ہے۔ جلد اثر لینے والا اور جھلا جانے والا تھا، اس نے ایک مرتبہ گجادھر کو ڈانٹ کر کہا ''تم کو میاں نے سمجھایا، تمھیں سکتر صاحب سمجھا رہے ہیں۔ لیکن تم ہو کہ مرغ کی ایک ٹانگ، بڑے دھرم والے یہی بنے ہیں۔ بس چپکے سے جو یہ لوگ کہتے ہیں مان لو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔'' گجادھر نے سانپ کی طرح بل کھایا اور

بولا ''تو کون بیچ میں بولنے والا؟ اہیر کی ذات اور اوپر سے ٹراتا ہے اہیر بہتر بن بکرا۔ ہوت یہاں کھائے چار لکڑا'' ابھی گجادھر کی بات بھی پوری نہ ہوئی تھی کہ سہدیو نے ایک مرتبہ گرج کر پوری لاٹھی اس کے سر پر ماری اور اس نے ایک آہ کی، تھوڑی دیر جھوما اور سیدھا لیٹ گیا۔ لوگ بائیں بائیں کر کے دوڑ پڑے اور سہدیو کو وہاں سے ہٹایا۔

مقدمہ چلا اور بڑے زور کا مقدمہ چلا۔ اور سچ پوچھئے تو اگر میر صاحب کی سب سے میل ملاقات نہ ہوتی اور وہ روپیہ ٹھیکری کی طرح نہ خرچتے اور فیض علی بیرسٹر چھبرے والے نہ آتے تو سہدیو چھ مہینہ سے کم جیل خانہ نہ جاتا۔ لیکن بارے میر صاحب کی محنت ٹھکانے لگی اور سہدیو بے داغ چھوٹا۔

مشکل سے دو سال ابھی اس ہنگامے کو فرو ہوئے، ہوئے تھے کہ گاؤں میں مالوی جی کی سنگھٹن کی تحریک شروع ہوئی اور چونکہ سہدیو ہندو میں سب سے زیادہ قوی اور مضبوط تھا اس لیے وہ اس کا سر گردہ اور سرغنہ بنایا گیا۔ کثرت سے اکھاڑے کھدنے لگے اور ہر جگہ جوش میں لانے والی اور ہمّت دلانے والی کتھائیں اور آلھا ہونے لگا۔ کچھ تو سہدیو سے پہلے ہی سے چشمک ہونے سے اور کچھ غازی پور کے 'علی غول' کے اثر سے ادھر مسلمانوں نے بھی اکھاڑے کھودنے اور کسرت و کشتی کے ساتھ ساتھ لکڑی بھی سیکھنی شروع کر دی۔ جیسا کہ فطرتاً ہونا چاہیے تھا جو کھو جالاہا ان سب کا خلیفہ اور سردار بنا، میر صاحب ابھی تک تو چپ رہے اس لیے کہ ایسی باتیں قوموں کی زندگی کی دلیل ہیں اور مقابلہ اگر جہالت سے مقابلہ کی صورت نہ اختیار کرے، تو ترقی میں ہمیشہ مدد دیتا ہے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں انھوں نے دیکھا کہ دونوں طرف کے تیور بُرے نظر آنے لگے۔ یعنی جب کبھی ایک طرف کے آدمی سے دوسری طرف کے آدمی سے سامنا ہو جاتا تھا تو محض غصّہ و نفرت کی نگاہوں ہی تک معاملہ نہ رہتا، بلکہ ہمیشہ گالیوں تک نوبت آ جاتی اور اگر بیچ میں آ جانے والے چھڑا نہ دیا کریں تو لات گھونسے تک۔

آہستہ آہستہ نفرت و نفاق کی آگ بڑھنے لگی اور اکھاڑوں سے نکل کر اب دونوں قوموں کے لوگوں تک پہنچی اور یہاں تک نوبت آئی کہ میر صاحب سے سہدیو کے نکالنے کی خواہش کی گئی، اور انھوں نے فرمائش کرنے والے کی صورت سر سے پیر تک دیکھی اور بولے ''صاحب یہ میرے طریقے کے خلاف ہے۔ میرا نوکر خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان جب تک کہ اپنا کام ایمانداری سے کرتا ہے وہ میری نظروں میں میرا بیٹا اور میری اولاد ہے۔ میں مجبور ہوں

میں ایسا نہیں کر سکتا!''

میر صاحب اپنی مسہری پر ایک شال چادر اوڑھے لیٹے تھے۔ رات سے سخت بخار میں مبتلا تھے۔ سر میں درد بھی تھا اور رگ رگ دکھ رہی تھی کہ ایک مرتبہ ملازم نے آ کر خبر کی کہ ''سرکار مسجد پر چل گئی'' میر صاحب گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور بولے ''ارے کس سے چل گئی۔ کیا ہوا؟''

وہ بولا ''سہدیو کے اکھاڑے والے رام ڈول لیے جا رہے تھے کہ جوکھو کے اکھاڑے والوں نے مسجد سے انھیں گالیاں دے کر کہا کہ ہم نماز پڑھتے ہیں باجہ مت بجاؤ۔ کبھی نہیں بجا۔'' وہ کہنے لگے ''ہم تو بجائیں گے'' بس دونوں طرف سے اینٹیں چل رہی ہیں۔''

میر صاحب اسی طرح چادر اوڑھے لپکتے ہوئے پہنچے۔ دیکھا تو ادھر زور زور سے سنکھ پھونکا جا رہا ہے اور تاشہ، مجیرا جھانجھ، سب ہی پوری قوت سے بجائے جا رہے ہیں۔ ادھر اللہ اکبر کا زور ہے اور اینٹیں ہیں کہ سن سن دونوں طرف سے چل رہی ہیں۔ میر صاحب کے پہنچتے پہنچتے کئی ایک سر ٹوٹ چکے تھے اور اب قریب تھا کہ یا ہندو مسجد میں گھس جائیں یا مسلمان مسجد سے نکل کر ان پر آ پڑیں، کہ میر صاحب ''ارے کیا کر رہے ہو ظالمو'' کہتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھائے بیچ میں آ کھڑے ہو گئے۔

چلتے ہوئے ہاتھ تو جھجکے لیکن چلی ہوئی اینٹیں نہ ٹھٹکیں اور ایک پورا اگّا رام ڈول کے گروہ کی طرف کا آ کر میر صاحب کے سر پر پڑا اور میر صاحب 'ہائے!' کہہ کر زمین کی طرف چلے ہی تھے کہ دوسرا انکیلا ٹکڑا مسجد کی طرف سے آ کر اس زور سے پڑا کہ پھٹتے ہوئے سر کا بھیجا نکل آیا اور اس بے قصور بے گناہ کے خون کی چھینٹوں نے ایک طرف تو ہندو غول کو رنگ دیا اور دوسری جانب مسجد کی دیواریں بھیجے کے ٹکڑوں سے داغدار ہو گئیں۔

سہدیو نے لاٹھی پھینکی اور گرتے ہوئے مالک کو اٹھانے دوڑا اور جوکھو نے ایک مرتبہ کہا کہ میر صاحب کی جان گئی اور مسجد کی دیوار سے کود کر اس مرنے والے کی طرف لپکا۔ دونوں ساتھ ہی پہنچے لیکن اس وقت جب میر صاحب زمین پر گر چکے تھے... انھوں نے ایک مرتبہ آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے سہدیو کی تلک لگی ہوئی پیشانی اور جوکھو کی تکنی داڑھی پر حیرت سے نظر کی۔ رُک رُک کر بولے ''ظالمو... یہی... دیش... اور دھرم... کے... کام ہیں؟'' اور وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے!

✿✿

ردِّ عشق

مس بہار کی یونیورسٹی میں آج پھر تقریر تھی۔ سامعین پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی۔ ہر شخص ہمہ گوش بنا مبہوت بیٹھا تھا۔ الفاظ کی آمد، بیان کی سلاست، آواز کا ترنم اور مقررہ کی صورت دل موہے لیتی تھی۔ ایک سیلاب تھا جو دِلوں میں طوفان اُٹھاتا، عقل کے بند توڑتا بہا چلا جارہا تھا اور سارے مجمع کی فہم و فراست تنکے کی طرح بے بس اس دھارے کے ساتھ تھی۔

پروفیسر رعنا بھی ایک گوشے میں بیٹھے سب کچھ سن رہے تھے۔ جب مس بہار ہاتھ چمکا کر کوئی خاص فقرہ زور دے کر کہہ دیتیں تو یہ گھبرا کر اپنے ہاتھ مونچھوں تک لے جاتے اور ان کے بال انگلیوں سے کھینچنے لگتے اور جب وہ مسکرا کر کوئی طنزیہ جملہ دوسری جماعت کے خلاف کہتی تو اور لوگ تو ہنسی سے بیتاب ہو جاتے لیکن یہ جلدی جلدی اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگتے۔ اگر کبھی مقررہ کی نظر اُن کی طرف مڑ جاتی تو انھیں ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی کرن ان کی آنکھوں کے اندر گھسی جاتی ہے۔ یہ سراسیمہ ہو کر عینک اُتار کر اسے رومال سے صاف کرنے لگتے اور اس پر غور کرنے لگتے تھے کہ تقریر میں شراب کی سی تیزی اور مدہوشی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ سارے جسم میں ایک حدت سی دوڑتی ہوئی کیوں محسوس ہوتی ہے؟

ممکن ہے آپ کو ان کی یہ حرکتیں انوکھی اور عجیب معلوم ہوتی ہوں۔ لیکن اتنا یاد رکھئے کہ پروفیسر رعنا جوان و ناکتخدا ہی نہ تھے بلکہ فلسفہ کے معلم بھی تھے۔ ان کے ہاں ہر چیز کے متعلق 'کیوں؟' اور 'کیسے؟' کی بڑی بھرمار تھی۔ وہ ہر اُمر کی کنہ دریافت کرنے پر تلے رہتے تھے۔ حیاتِ انسانی کا معمہ ان کے لیے بہت ہی دلچسپ تھا۔ تخیل و تصور کا ہر جز اُن کے پیشِ نظر تھا اور ممکن و واجب کے اسرار سے وہ واقف ہونے کی کوشش میں ہمیشہ لگے رہتے تھے۔ اگر وہ کسی

شئے سے لاعلم تھے تو وہ جذبات وحسیات کی دنیا تھی۔ اس کا بھی انھیں کتابی علم ضرور تھا لیکن ذاتی تجربہ نہ تھا۔ اور اس لیے تین مہینے سے جب سے کہ مس بہار یونیورسٹی میں داخل ہوئی تو وہ بار بار یہی سوچتے رہے تھے کہ اس نو بہار ناز کے دیکھنے سے ان کے دل میں گدگدی سی کیوں محسوس ہوتی ہے۔ اور آخر اس نئی حس کا باعث کیا ہے؟ یونیورسٹی میں اور بھی لڑکیاں ہیں۔ لیکن ان کی وجہ سے یہ کیفیتیں کیوں نہیں پیدا ہوتی ہیں؟ انھی کو نظر نے کیوں انتخاب کیا اور انھی کی طرف دل کیوں کھنچتا ہے؟

آج بھی جبکہ تقریر کی روانی، فقروں کی برجستگی اور دلائل کی کثرت ومضبوطی، مخالفین کو موافق بناتی جارہی تھی، تو وہ یہی غور کررہے تھے کہ ان پر اس آواز کا خاص اثر کیوں ہے اور وہ دوسرے پروفیسروں کی طرح 'شاباش' کہنے اور تعریف کرنے سے کیوں عاری ہیں؟ وہ اسی ادھیڑ بن میں گرفتار تھے کہ دفعتاً تالیوں کے سقف شگاف شور نے انھیں چونکایا۔ مقررہ کو بیٹھتے دیکھ کر ان سے اپنی جگہ نہ بیٹھا گیا اور اپنے کمرے میں چلے آئے اور پھر غور وفکر میں ڈوب گئے۔

پروفیسر رعنا پانی برسے، اولہ پڑے یا پتھر گرے، لیکن کانٹ کی طرح ٹھیک پانچ بجے شام کی تفریح کے لیے ضرور باہر جاتے تھے۔ ہمسایہ ان کی پابندی وقت سے اتنا واقف تھے کہ اکثر ان کے برآمد ہوتے ہی تیز وسست رفتار گھڑیوں کی سوئیاں ٹھیک پانچ پر کرلیتے اور اس لیے پروفیسر صاحب کو معلوم ہو یا نہ ہو، لیکن محلّہ بھر انھیں گھنٹہ گھر کہہ کر پکارتا تھا۔

جس طرح پابندی وقت ان کی وضع میں داخل تھی۔ اسی طرح یہ بھی ان کی عادت تھی کہ ہر فعل میں چھڑی ہی پر بھروسا کرتے۔ کبھی چھتری لے کر یا 'واٹر پروف' پہن کر باہر نہ نکلتے، اکثر بھیگے اور بری طرح بیمار بھی ہوئے، بخار بھی آیا، نزلہ زکام بھی ہوا، لیکن انھوں نے پروا نہ کی۔ ضعیفہ ماں اور بوڑھی دایہ دونوں سمجھاتے سمجھاتے عاجز آگئیں لیکن نہ ٹھیک پانچ بجے کی سیر بند ہوئی اور نہ بے چھڑی کے نکلنا۔

مگر یہ اس لیے نہیں کہ طبیعت میں ضد تھی، بلکہ محض اس وجہ سے کہ دنیا کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی طرف سے بے پروا تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جتنی دیر میں ان باتوں پر غور کروں گا اتنی دیر میں فلسفہ کا کوئی بڑا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ خواہ مخواہ عادت کے خلاف کام کرکے اپنے دماغ کو پریشان کیوں کروں؟ پانی کا برسنا ضروری، دنیا کا میل دُھلتا ہے، درخت وسبزہ نکھر جاتا ہے،

پھولوں میں تازگی آجاتی ہے اور چڑیاں چہکنے لگتی ہیں۔ پھر مجھے کیوں تکلیف ہوگی؟ جسم کو شاید زحمت ہو، روح کو تو انبساط ہوتا ہے اور دماغ کو فرحت۔ سو اُن کے آگے جسم کا خیال بے سود، نزلہ اور بخار کا ڈر بے فائدہ! اس لیے لکچر کے دوسرے ہی دن ہمارا بے پروا، وضع کا پابند پروفیسر صرف چھڑی ہاتھ میں لیے گھر سے نکل کر سیر کے لیے چل کھڑا ہوا:

نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل شہر سے راہ جنگل کی لی

ادھر آسمان پر ابر کے دیوتاؤں میں سے ایک کی شادی تھی۔ عالم کی تمام گھٹائیں ڈھول تاشہ، دہل دوما بجاتی چلی آرہی تھیں۔ ہموار راستوں پر یوں ہی تاریکی میں سرگرم خرام، لیکن بیہڑ جگہوں، کھانچے سے بھری سڑکوں پر بجلی کی روشنی کام آتی تھی۔ سب کو جلدی اس کی کہ کسی طرح دلہن کے گھر پہنچ کر دل کا بخار نکالیں اور ذرا سی چھیڑ چھاڑ پر گھر والوں پر برس پڑیں کہ اتنے میں دوسری طرف والے بادلوں نے بڑھ کر خیر مقدم کیا اور اس خوشی میں جو آپس میں گرم فقرے اور چست جملے چلے، تو دونوں طرف قہقہہ پڑا۔ برات کی آرائش لٹنے لگی۔ آتش بازیوں کو آگ دکھادی گئی اور ان کے پھول مینہ کی صورت میں زمین کی طرف آنے لگے۔

پروفیسر رعنا نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کی جانب۔ وہاں چھتری کی جگہ چھڑی ہی تھی۔ اسے ذرا مضبوط پکڑا کوٹ کا کالر بند کیا اور گھر کی طرف پلٹے۔ بوندیں آہستہ آہستہ تیز ہوئیں یہاں تک کہ پانی کی چادر گرنے لگی اور یہ سر سے پاؤں تک بھیگ کر شرابور ہوگئے۔ رفتہ رفتہ راستہ پر بھی پانی کی زیادتی ہونے لگی۔ جوتوں کے تلے بھیگے۔ پھر سارا جوتہ ڈوبا۔ پھر گھٹنوں گھٹنوں تک پروفیسر صاحب پانی ہی میں تھے۔ اب تو فلسفہ بھی دھل گیا اور منطق بھی اور جسم ہی نہیں بھیگا بلکہ شاید روح بھی۔ اس لیے کہ پروفیسر صاحب کو مسرت کی جگہ تکلیف محسوس ہوئی اور انبساط کے عوض سردی۔ پھر تاریکی ایسا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں، کئی مرتبہ گرے، عینک کہیں کیچڑ میں گر کر پھنس رہی اور چھڑی ہاتھ سے چھوٹ کر کسی جانب بہ نکلی۔

خدا خدا کر کے دُور سے روشنی دکھادی۔ اسی طرف کا رُخ کیا۔ تھوڑی دُور چلنے پر بنگلہ ملا۔ غیرت کیچڑ سے زیادہ مضبوط قدم پکڑتی رہی۔ لیکن ضرورت نے سب کو دھکا دے کنارے

کیا، اندر داخل ہوئے برآمدہ میں پناہ لی۔ صاحب مکان کے پاؤں کی چاپ سنی۔ دروازہ کھول کر انھیں بغور دیکھا۔ شریف سمجھ کر بڑے تپاک سے پیش آئے۔ کپڑے اُتروائے اور کمبل اُڑھا کر اندر کمرے میں بٹھایا۔ انگیٹھی میں آگ روشن کرا کے پاس رکھوائی اور چائے کے لیے آواز دی۔ ایک ماما چائے کا سامان لیے ہوئے آئی اور اس کے پیچھے پیچھے مس بہار!

پروفیسر رعنا فلسفی تو ضرور تھے لیکن ناکتخدا بھی تھے۔ فلسفہ تو ابھی ڈھل کر خس وخاشاک کی طرح سڑک کے میلے پانی میں بہا جا رہا تھا۔ جوانی اور اس کی اُمنگیں، ناکتخدائی اور اس کے دُور کرنے کی خواہش، جو ہمیشہ اس بارِ ثقیل سے دَبی رہتی، اس وقت اُبھر کر سطح پر آ گئیں اور پھر کمرے کی کرسی، کوچ کی لچک، لیمپ کا سُرخ فانوس، فرش کا موٹا قالین اور سب سے زیادہ آگ کی قربت، ٹھٹھری ہوئی جسمی حیوانیت کو ہمّت دلا کر آگے بڑھا رہی تھی کہ اس کے ساتھ مس بہار کی آمد نے بھس میں چنگاری کا کام کیا اور یہ ایک مرتبہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور ذہن نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ اس کی خوش پوشی کا اپنی بے سروسامانی سے مقابلہ اور اپنے چہرے پر بھیگے ہوئے پریشان بالوں کا، اس کے رخِ گلنار پر کالی زُلفوں کے پیچ سے تقابل تھا اور یہ جلدی جلدی ایک ہاتھ سے کمبل سمیٹنے لگے اور دوسرے ہاتھ سے اُلجھے ہوئے بالوں کو برابر کرنے لگے۔

وہ بھی ان کو کمبل میں اس طرح لپٹا لپٹایا دیکھ کر پہلے تو کچھ جھجکی، پھر پہچان کر منہ پھیر کر مسکرائی، صاحب خانہ متبسم آگے بڑھ کر بولے۔ ''پروفیسر صاحب یہ اس گھر کی بہار، میری سالی ہیں۔'' وہ چمک کر بولی۔ ''آپ کے تعارف کرانے کا شکریہ۔ لیکن پروفیسر صاحب مجھ کو جانتے ہیں۔ میں ایک طرح ان کی شاگرد ہوں۔ ہاں شاید آپ کو نہ جانتے ہوں گے۔ یہ حضور، ڈاکٹر شمیم ہیں اور جس گھر میں جاتے ہیں اسے نیپتھلین کی سی خوشبو سے معطر کر دیتے ہیں۔'' پھر بہنوئی کی طرف مڑ کر بولی۔ ''اور آپ ڈاکٹر رعنا ایم.اے، پی.ایچ.ڈی ہماری یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب ہنس کر بولے۔ ''اخاہ تب تو بڑا ہی لطف ہے۔ جہاں بہار ہو اور رعنا بھی اور اسی کے ساتھ شمیم بھی تو سوکھے سے سوکھے منطقی کا غنچۂ دل کھل جانا چاہیے۔''

پروفیسر رعنا نے کہا۔ ''لیکن اس وقت تو منطقی بھیگا ہے!''

ڈاکٹر صاحب ہنس کر بولے ”جب خشکی ہی باقی نہ رہی تو مسرت و دل بستگی میں پھر کاہے کی کسر رہی؟“

سب ہنس ہی رہے تھے کہ دفعتاً پروفیسر صاحب کو کچھ یاد آ گیا اور وہ متانت سے بولے۔ ”لیکن ان باتوں میں یہ تو بھول ہی گیا کہ مجھے گھر جانا ہے۔ وہاں سب منتظر ہوں گے۔“

ڈاکٹر صاحب نے خاموشی سے دروازہ کھول دیا۔ اس غضب کی تاریکی تھی کہ خدا کی پناہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اَبر کے دیوتاؤں کے ہاں شادی میں حبشیوں کا ناچ ہو رہا ہے۔ سوائے شور، ہنگامے کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا، نہ تال ٹھیک نہ سر۔ بس جھما جھم کی آواز تو ذرا قرینے کی تھی، ورنہ اور صدائیں ان کے خط و خال کی طرح، بے قرینہ، بے ہنگام، بے ربط۔

کواڑ کھلتے ہی ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ ان کے سرو کے پھول کمرے کے فرش پر بکھر گئے۔ ڈاکٹر صاحب ”مزید داخلہ کی گنجائش نہیں“ کہہ کر دروازے بند کر کے پروفیسر سے بولے۔ ”دیکھی حضرت ان کی سینہ زوری۔ جب یہ کمرے میں اس طرح گھسے آتے ہیں تو پھر آپ کو گھر تک کیسے جانے دیں گے؟“

پروفیسر رعنا کی ہمّت مردانہ کو اس سے ٹھیس لگی۔ وہ بولے ”مجھے جانا ضروری ہے۔ میں گھر سے رات بھر باہر نہیں رہ سکتا اور پھر ایسے موسم میں!“

ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ ”کیوں بیوی تنہائی میں گھبرائیں گی یا بجلی سے ڈرتی ہیں؟“

پروفیسر صاحب نے کہا۔ ”جی بیوی تو بحمدہ اب تک ہئی نہیں۔“

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ”اچھا تو آپ کے ہاں ابھی بہار نہیں آئی!“ اور پھر مس بہار کی شرمندہ صورت اور خشمگیں آنکھیں دیکھ کر جلدی سے بولے۔ ”تب پھر کون پریشان ہونے والا ہے؟“

پروفیسر صاحب نے کہا۔ ”جی ضعیفہ ماں ہیں وہ پریشان ہوں گی۔“ اور ڈاکٹر صاحب کے ”پھر؟“ کہنے پر بولے ”مجھے جانا چاہیے؟“ ڈاکٹر صاحب نے تھوڑی دیر اور روکنے کا بہانہ نکالا اور بولے ”اچھا تو گھر کی مالکہ سے اجازت لے لیجیے!“ پروفیسر صاحب مس بہار کی طرف

بڑھے، تو وہ بولے ''جی یہ تو بد قسمتی سے میری سالی ہیں۔ گھر کی مالکہ تو میری بیوی، ان کی بہن، نسترن ہیں۔ ان سے پوچھ کر کیا کیجیے گا۔ یہ تو اس غلطی سے اور خفا ہو جائیں گی!''

پروفیسر صاحب نے جلدی سے یہ کہہ کر جھینپ مٹائی۔ ''جی تو بیگم شمیم کہاں ہیں؟ ان کی تو زیارت ہی نہیں ہوئی!'' ڈاکٹر بولے ''اچھا تو تشریف رکھئے، میں انھیں بلائے لاتا ہوں'' اور یہ کہتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

دِل میں جب محبت کا چور ہو اور تخلیہ و تنہائی ہو تو زبان بند ہو جاتی ہے، اور گفتگو کا کوئی پہلو نہیں ملتا۔ سارے موضوع، تمام مباحث، دماغ سے چہرے کی سُرخی کی طرح کافور ہو جاتے ہیں۔ بس کچھ دزیدہ نگاہیں ہوتی ہیں، کچھ سرد آہیں اور پیشانی پر بکھرے ہوئے عرق کے تھوڑے سے سرنگوں موتی!

پروفیسر رعنا کا دل اپنے کو مس بہار کے قریب تنہا پاکر زور زور سے اُچھلنے لگا۔ انھوں نے گردن اس طرح جھکا لی جیسے اس کی حرکتوں کو بغور دیکھتے جاتے ہیں اور یہ پوچھتے جاتے ہیں کہ ''کیوں؟ یہ کیا ہے؟ یہ کون سا نیا انداز ہے۔ اس میں اضطراب کا ہے کا اور بے چینی کیسی؟''

یہ اسی طرح اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں تھے کہ بڑے زور کی کڑک ہوئی اور سارا کمرہ یک بارگی چمک اٹھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بجلی کہیں بنگلہ ہی میں گرمی اور مس بہار چیخ کر اُن کے کوچ پر آ کر گر پڑیں۔ نصف لمحہ یا اس سے بھی کچھ کم ان کا کمبل میں لپٹا ہوا جسم اس پھول سے مس ہو گیا۔ زُلفوں کی شمیم نتھنوں سے دماغ میں جا بسی۔ پروانۂ فلسفہ کے پر و بال شمعِ عشق نے جلا دیئے اور ان کے دل میں درد و انبساط، خوف اور خواہش کا جامِ لبریز چھلکنے لگا۔ کانپ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور معمولی انسانی ہمدردی بھی بھول گئے گھبرا کر بولے۔ ''مجھے گھر جانا چاہیے۔''

وہ نرمی سے بولی: ''آپ کی خوشی، باجی سے مل لیجیے۔''

انھوں نے کہا: ''انھیں کا تو انتظار کر رہا ہوں۔''

اس نے پوچھا: ''تو میں بلا لاؤں۔'' انھوں نے کہا۔ ''ہاں'' لیکن جب وہ اٹھنے لگی تو جلدی سے بولے۔ ''نہیں بیٹھی رہیے!'' اُس نے ان کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں نیچی کر لیں۔ اسی نظر نے انھیں ہمت دلائی۔ دل کڑا کر کے انھوں نے پوچھا۔ ''آپ بجلی سے بہت ڈرتی

ہیں؟'' وہ خجالت سے سر جھکا کر بولی ''جی ہاں'' انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔ ''اور بجلی گرانے سے؟'' اس کے چہرے کی طرف اتنی سرعت اور کثرت سے خون دوڑ آیا کہ چہرہ گلنار ہو گیا لیکن سر اور جھک گیا ان کی ہمّت اور بھی بڑھی۔ جواب کے لیے اِصرار شروع کر دیا۔ ''کیوں صاحب اس کا جواب نہیں ملے گا؟''

اس نے سر اُٹھایا۔ کچھ عجیب انداز سے گردن کو جنبش دے کر چشم اَبرو سے خاص کام لیتی ہوئی بولی۔ ''میں آپ کی شاگرد ہوں۔'' انھوں نے جواب کے ہلکے پہلو کو نظر انداز کر کے کہا۔ ''اونہہ شاگردی و استادی کا یہاں کیا ذکر یہاں تو صاعقہ حسن اور خرمن دل کی بحث ہے۔'' وہ بولی۔ ''تو پھر کسی شئے کے بیجا اور غیر فطری استعمال پر باز پرس کی گنجائش ہو سکتی ہے، نہ کہ صحیح و باطل استعمال پر۔''

انھوں نے پوچھا۔ ''یعنی؟'' وہ بولی: ''آفتاب کا فطری کام روشنی پہنچانا، چاند کی غایت جلتی ہوئی دنیا کو سیمابی چادر میں سلانا، مرد کا مقصد قوانین قدرت پر ظفریاب ہونا اور کمزور عورت کی غرض فاتح مردوں کو شکست دینا۔ ہمارے ناتواں ہاتھوں میں صرف صنف ہی ایک آلہ ہے اور یہی ایک حربہ!''

وہ بولے۔ ''لیکن پھر بھی اس دیدہ دلیری اور اس بے دردی سے اس کا استعمال اور پھر اس پر یوں فخر!''

وہ مسکرائی اور آنکھیں نیچی کر کے بولی۔ ''ہم نے تو مبداءِ حسن سے جس طرح صاعقہ پایا ہے اسی طرح اس سے لن ترانی بھی سیکھی ہے، لیکن جب بار بار کہنے پر بھی مردوں کی آنکھیں نہ کھلیں اور انھیں بجھائی نہ دے تو ہمارا کیا قصور؟''

پروفیسر صاحب نے سوال کو پھر شخصی اور ذاتی بنایا اور بولے۔ ''لیکن میں نے دو کی جگہ عینک لگا کر چار آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔ پھر بھی آنکھوں میں خیرگی سی ہوئی اور اب تو بیہوشی سی ہے۔''

وہ بے ساختہ مسکرا کر بولی ''اور پھر ایسی حالت میں یہ اصرار کہ گھر جائیں گے۔ لیکن ہاں جب آدمی اپنے ہوش ہی میں نہ ہو تو پھر اس کی بات کب گرفت کے قابل ہے؟ اچھا ذرا اچھی طرح کوچ پر بیٹھ جایئے تو میں ہوش میں لانے کی کوشش کروں۔'' یہ بھی کچھ لاجواب سے ہو کر

مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے وہ میز سے سگریٹ کیس اٹھالائی انھیں سگریٹ دی اور دِیا سلائی خود ہی جلائی اور ہاتھوں کے کٹوروں میں اسے بند کر کے ان کے منہ کے قریب لے گئی۔ انھوں نے سگریٹ نہیں سلگائی بلکہ روشنی میں اس کے نازک ہاتھوں کا تیز گلابی رنگ اور ان میں سبز سبز رگوں کی دلفریبیاں دیکھنے لگے۔ اس نے انھیں محو دید دیکھ کر روشن دِیا سلائی پھونک کر گل کر دی اور جب انھوں نے قدرے استعجاب سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے بڑی متانت سے دونوں ہاتھوں پر دِیا سلائی کی ڈبیہ رکھ ان کی طرف بڑھا دی۔ انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیوں کیا اب دوسری دِیا سلائی نہ جلایئے گا؟''

وہ بولی۔ ''جی مجھے منظور نہیں کہ آپ علم سمدرک کا مطالعہ میرے ہاتھوں میں کریں!'' انھوں نے بات بنائی اور کہا۔ ''نہیں، نہیں میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ ان ہاتھوں میں میری قسمت کا کیا فیصلہ لکھا ہے۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''تو بہت خوب دوسری دیا سلائی جلائے دیتی ہوں۔ غور سے ملاحظہ فرمایئے۔'' اور یہ کہتے کہتے پھر دِیا سلائی روشن کی اور کفِ دست کا فانوس بنا کر اُن کی طرف بڑھائی۔ انھوں نے اب کی سگریٹ جلائی۔ پھر ہاتھ دیکھنے کو جھکے۔ اُس نے پھر دِیا سلائی بجھا دی اور روٹھے ہوئے بچے کی طرح منہ پھلا کر بولی۔ ''ہونہہ، دِیا سلائی تو جلوائی سگریٹ جلانے کے لیے اور غرض بتائی ہاتھ دیکھنے کی!''

وہ بولے۔ ''وہی غرض تو آپ کی بھی تھی۔ اس لیے کہ تقدیر پر نہ آپ یقین رکھتی ہیں اور نہ میں!''

اس نے کہا ''لیکن میں تو مانتی ہوں!''

یہ چپکے سے بولے ''ہاں! آخر کن باتوں میں؟'' وہ بولی ''مثلاً موت و زندگی کے معاملے میں۔'' انھوں نے پوچھا ''اور؟'' اس نے شرما کر گردن نیچی کر لی۔ ان کا اصرار اور بھی بڑھا۔ وہ بولی۔ ''اور شادی بیاہ کے بارے میں۔'' انھوں نے ہنس کر کہا ''تو پھر ہاتھ ضرور دیکھوں گا۔ یہ تو میرے مطلب کی بات ہے۔''

وہ شرم سے عرق آلود ہوگئی کہ اتنے میں ڈاکٹر صاحب مع اپنی بیوی کے آگئے اور ان کا پروفیسر صاحب سے تعارف کرا کے بولے۔ ''دیکھتی ہو یہ اس طوفان میں گھر جانے کے لیے

مصر ہیں۔''

وہ بولیں۔''یہ ناممکن ہے۔ دستر خوان چن دیا گیا ہے کھانا حاضر ہے اوّل طعام بعدہ کلام۔''انھوں نے پھر ماں کا نام لیا تو مس بہار نے بڑھ کر کہا۔''یہاں ٹیلی فون موجود ہے اور آپ کے ہاں بھی یقینی ہوگا۔ انھوں اطلاع دے دیجیے کہ اس آفت میں آپ آنے سے رہے۔''

یہ بولے۔''ہاں یہ صورت معقول ہے۔''اور جلدی جلدی ٹیلی فون کیا۔ وہاں وہ غریب پریشان ہو رہی تھیں۔ یہ معلوم کر کے یہ ایک گھر میں آرام سے موجود ہیں وہ مطمئن ہو کر بولیں۔''وہیں رات بھر رہ جانا۔ اس آفت میں آنے کا قصد نہ کرنا۔''

انھیں جب اس طرح بطیب خاطر اجازت ملی تو پھر میزبان سے بولے:''بن بلایا مہمان حاضر ہے۔ اب جو حکم ہو۔'' بیگم شمیم نے کہا:''تو پھر آیئے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

کھانا کھانے کے بعد تاش کی ٹھہری۔ ڈاکٹر صاحب کا جوڑہ تو سلامتی سے موجود ہی تھا، ان کی ساتھی مس بہار بنیں۔ یہ آکسفورڈ اور کیمرج کے برج کھیلے ہوئے۔ خوب خوب جیتے، اور ہارے ہوئے حریف ہنس ہنس کر ان سے یہ فن حاصل کرتے رہے۔ کھیل کے اثنا میں ڈاکٹر صاحب اور ان کی سالی میں گرم گرم فقرے ہوا کیے۔ لیکن انھوں نے اپنا کام 'دور کا جلوہ' رکھا اور چپکے چپکے لطف لیتے رہے۔ ہاں دل ہی دل میں مس بہار کی ذہانت و ذکاوت کی داد دیتے رہے۔

گھنٹہ دو گھنٹہ اس لطف سے کٹا، پھر یہ طے ہوا کہ مس بہار کوئی چیز پیانو پر بجا کر سنائیں۔ پروفیسر صاحب فطرتاً گانے کے عاشق تھے اور خود بھی اس فن میں دسترس رکھتے تھے۔ پیانو کا چھڑنا تھا کہ بیتاب ہو گئے۔ کمرے میں ٹہلنے لگے اور مس بہار کی موقع موقع سے داد دینے لگے۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیوی ان کے چہرے سے بھانپ گئیں کہ یہ بھی اس فن سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور اس پر مصر ہوئے کہ یہ خود بھی کچھ گائیں۔ انھوں نے بھاشا اور اُردو کی خالص جذباتی چیزیں گانا شروع کیں۔ فن پر قدرت، آواز میں گداز اور پھر موسم یہ کہ کالی گھٹا ہے، پانی برس رہا ہے، رات کا وقت ہے اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ حالت تھی کہ آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے۔ اور سب کی نظریں بچا بچا کر اپنی بیوی کی طرف

اس طرح دیکھتے کہ وہ شرما شرما جاتیں۔ مس بہار ایک کونے میں علیحدہ جا کر بیٹھی تھیں۔ لیکن چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ غریب چھوٹے ریشمی رومال کی شامت تھی۔ کبھی مٹھیوں میں دَبا کر گیند، کبھی دونوں ہاتھوں میں اینٹھ کر مار پیچاں بنایا جاتا تھا اور کبھی اس کے گوشے دانت سے دَبا کر کھینچے جاتے تھے۔

بارے یہ ہیجانی کیفیت پروفیسر صاحب کے گانے کے رُک جانے سے ختم ہوئی۔ اب ان کے دل کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہو گیا تھا اور رات بھی اچھی طرح بھیگ چکی تھی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ اب شب بخیر ہی کہہ لینا زیادہ اچھا ہے، دونوں مہوشوں سے رخصت ہو کر پروفیسر صاحب ڈاکٹر صاحب کی ہمراہی میں اس کمرے کی طرف چلے جس میں ان کے سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔

انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی مہمان نوازیوں کا شکریہ ادا کرتے وقت ان سے رُک رُک کر کہا: ''اگر آپ اجازت دیں تو مَیں اپنی ماں کو آپ کی بیوی اور سالی سے ملنے کے لیے لے آؤں؟''

وہ بولے۔ ''عزّت افزائی، اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔''

پروفیسر صاحب نے کہا۔ ''ہاں... مجھے صرف اس کا خیال ہے کہ وہ پرانی ریت رسم کا خیال رکھنے والی پردہ کی پابند ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے ذرا منہ بنا کر کہا۔ ''یہ تو دقت ہے... لیکن خیر مَیں اس وقت اندر نہ جاؤں گا۔ آپ ضرور لائیں۔''

پروفیسر صاحب نے کہا۔

''بہت خوب۔ آپ گھبرائیں نہیں میں انھیں سمجھا دوں گا۔ وہ آپ حضرات پر کوئی اعتراض نہ کریں گی۔''

ڈاکٹر صاحب نے متانت سے کہا۔ ''ہاں صاحب۔ ان پرانے خیال کے لوگوں سے یہی ڈر لگتا ہے... میرے تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سا تعلیم یافتہ ان کے ساتھ کیونکر زندگی بسر کر لیتا ہے؟''

پروفیسر صاحب مسکرا کر بولے۔ ''بہت آسانی سے۔ اس لیے کہ خیالات کا اختلاف

اطاعت اور مامتا کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کبھی میں کوئی ان کی خلافِ عقل بات مان کر اپنی محبت وسعادت کا ثبوت دیتا ہوں، تو کبھی وہ میرے 'مغرب زدہ' فعل کو نظر انداز فرما کر اپنی بزرگی اور مامتا ظاہر فرماتی ہیں!''

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔''تو انھی اختلافی چیزوں میں پردہ بھی ہے؟''

پروفیسر صاحب بولے۔''ہاں ایک حد تک۔ اس لیے کہ گو میں اس کا حامی نہیں ہوں کہ عورتوں کو چادروں میں لپیٹ کر چہار دیواریوں میں بند کر دینا چاہیے۔ لیکن میں اس کا موید ضرور ہوں کہ انھیں بالکل مغرب پرست بے حجاب بھی نہ بنا دینا چاہیے۔ وہ علوم حاصل کریں، بازار سے خرید وفروخت کریں، ضرورت ہو تو ملازمتیں کریں، غرض ہر طرح ایک باکار اور مفید شہری بنیں، مگر مردوں سے چمٹ کر ناچنا، ان کے ساتھ بیٹھ کر جام پر جام اُڑانا، حسن کے مقابلوں میں شریک ہونا، عریاں ٹانگوں کی تصویریں کھنچوانا، اٹھتے بیٹھتے بوس وکنار کرنا۔ ان پر تو بندشیں عائد کرنا ہی پڑیں گی۔''

ڈاکٹر صاحب بولے:''تو یہی بندشیں مردوں پر کیوں نہ عائد کی جائیں؟''

پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔''یقینی ان پر بھی ہونا چاہئیں۔ اور عقلاً ہیں بھی!''

ڈاکٹر صاحب نے اعتراض کیا''مگر عرفاً تو نہیں ہیں!''

پروفیسر صاحب نے کہا۔''ہاں یہ معاشرت کی خرابی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دونوں صنفوں میں کچھ ایسے فطری اختلافات بھی ہیں کہ دونوں کے حقوقِ آزادی بالکل یکساں نہیں ہو سکتے۔ عورت آئندہ نسل کی امانت دار ہے اور اسی لیے اس کی پابندیاں مردوں سے نسبتاً زیادہ ہیں۔ اگر یہ بھی ہٹا دی جائیں تو نسل انسانی کا امتیاز خصوصی مٹ جائے گا۔ اور ہم میں اور بہائم میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔''

ڈاکٹر صاحب نے کہا:''آپ فرماتے تو بڑی حد تک ٹھیک ہیں، مگر آج کل تعلیم یافتہ طبقۂ نسواں اتنی پابندی کو بھی تسلیم کرنے کے لیے مشکل ہی سے تیار ہے!''

پروفیسر صاحب نے مسکرا کر کہا۔''خیر ابھی تو وہ اپنی بڑی بوڑھیوں ہی سے نپٹ لیں پھر بعد میں ہم مردوں کی باری آئے گی!''

ڈاکٹر صاحب مسکرا کر بولے۔''مگر بڑی بوڑھیوں کے سنبھالے یہ بوجھ نہیں سنبھلتا۔

آج کل کی فضا ہی آزادی کی ہے۔اور پروفیسر صاحب میں تو خانہ جنگی سے بچنے کے لیے مکمل آزادی دے دینا بہتر سمجھتا ہوں!''

پروفیسر رعنا پھر متین ہو کر بولے۔''اس لفظِ آزادی کے بھی عجیب وغریب معنی آج کل نوجوان سمجھنے لگے ہیں۔وہ انفرادی حقوق پر معمولی سی بندش بھی آزادی کے منافی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔صنفوں کے تعلقات ہی کو لے لیجیے۔اگر دونوں کو بالکل مساوی حقوق دے دیئے جائیں تو گھریلو زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔جتنے بچے ہوں گے وہ سب 'شاہی بچے' ہوں گے یا اسٹیٹ کے۔ورنہ باپ کا کہیں پتہ نہیں، ماں خود بھی ذمہ دار نہیں۔وہ مقدس جذبہ جس کا نام مامتا ہے بالکل ہی معدوم ہوگا اور اتنا ہی نہیں کہ ماں اور باپ کو اپنے بچوں سے کوئی مطلب وسروکار نہیں ہوگا بلکہ شاید کچھ آگے بڑھ کر، بالکل ہی حیوانات کی طرح باپ بیٹی، ماں اور بیٹے کے بھی جوڑے بن سکیں گے۔''

ڈاکٹر صاحب بولے:''جی نہیں، یہ تو جذبہ آزادی کا منطقی نتیجہ ہے۔ڈاکٹر صاحب آزادی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ابتدائے تخلیق سے صدیوں تک، ہم نے بڑی آزادی اور مطلق العنان زندگی بسر کی ہے۔لیکن ہمارے تجربے نے بتایا ہے کہ سماجی زندگی بغیر پابندیوں کے نہیں بسر ہو سکتی۔ہم اشرف المخلوقات اسی وقت کہلا سکتے ہیں جب ہم اپنی انفرادی آزادی پر قیود عائد کریں اور اپنے ہی حقوق کا خیال نہ رکھیں بلکہ دوسروں کے حقوق کا بھی۔اخلاق کی بنیاد بھی اسی اصول پر ہے!''

ڈاکٹر صاحب مسئلہ کی وسعت سے گھبرا کر پھر سے اصل موضوع کی طرف لے آئے۔''تو پھر آپ کے خیال میں پردہ کسی نہ کسی صورت میں رہنا ضروری ہے۔''

پروفیسر صاحب نے کہا۔''جی ہاں کسی حد تک، مگر اسے پردہ کیوں کہیے، پابندیاں کہیے یا عورتوں کے مخصوص فرائض!''

صبح سویرے جب پروفیسر صاحب رات کے بھیگے ہوئے کپڑے زیبِ تن کر کے کمرے سے نکلے تو انھیں سارا گھر سوتا ملا۔انھوں نے جیب سے 'فاؤنٹن پن' نکالا اور ایک پُرزے پر یہ لکھ کر''ڈاکٹر صاحب رات کی مہمان نوازیوں کا شکریہ اب بندہ رخصت ہوتا ہے۔'' وہیں میز پر رکھ دیا اور سیدھے گھر چلے گئے۔ماں سے دیر تک اپنے میزبانوں کی تعریف میں

رطب اللسان رہے اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی بیوی اور سالی سے ملنے ضرور چلیں گی۔ چنانچہ یونیورسٹی سے واپسی پر شام کو ماں کو بند گاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر صاحب کے بنگلہ پر پہنچے۔ خود ڈاکٹر صاحب کے پاس علیحدہ بیٹھ گئے اور پردہ کرا کے اس ضعیفہ کو بیگم شمیم کے پاس بھیج دیا۔ مس بہار کہیں ٹینس کھیلنے گئی تھیں اس لیے ان سے ملاقات نہ ہوئی۔ جب گھر پلٹے تو ماں نے بھی بیگم شمیم کی تعریف کی۔

دو تین روز کے بعد پھر ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے کہنے لگے کہ ''اگر آپ حضرات پسند کریں اور مس بہار میری ماں کو خوش کرنے کے لیے کچھ دنوں پردہ میں رہنا منظور کر لیں تو میں اپنے کو ان کی غلامی میں دینا چاہتا ہوں۔''

ڈاکٹر صاحب کچھ متفکر ہو گئے۔ تھوڑی دیر سوچ کر بولے ''میرے نزدیک تو مس قابلِ رشک ہیں کہ ان کو آپ کا سا کفو ملا لیکن یہ وہ شاید آپ دونوں کے درمیان حائل ہی ہو کر رہے گا۔''

انھوں نے کہا۔ ''بہر حال آپ میرا پیغام پہنچا دیں۔ اس کے بعد میری قسمت۔'' اور ان سے رخصت ہو کر چلے آئے۔

آج طلبا آئے گئے۔ لکچر بھی دیا پڑھایا بھی لیکن جس کو آنکھیں ڈھونڈتی تھیں وہ کہیں نہ دکھائی دی۔ گاڑی پر گھر بھی پلٹے مگر بادلِ ناخواستہ۔ راستہ بھر سوچتے رہے کہ دریافت خیریت کے لیے آج ڈاکٹر صاحب کے ہاں جائیں یا نہ جائیں۔ دل کا چور قدم پکڑتا تھا لیکن فطرت کی کشش یہی کہتی تھی کہ بے دیکھے رات کیونکر کٹ سکتی ہے۔ عقل سمجھاتی کہ ابھی ابتدا ہے ابھی روک تھام لازمی ہے۔ ورنہ ساری دنیا بہار ہی ہو کر رہ جائے گی۔ اس کے سوا سب کچھ چھوٹ جائے گا۔ سودا کہتا۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ غرض ایک طوفان تھا کہ اس نوجوان فلسفی کے دل و دماغ میں برپا تھا۔ آندھیاں بھی آتی تھیں اور جھکڑ بھی۔ صرف برسوں کی منجی ہوئی طبیعت، اپنے کو لیے دیئے رہنے کی عادت، آڑے آتی، جب جذبات میں تلاطم اُٹھتا تو وہ جھیل کے کنارے کے بید کے درختوں کی طرح لچک جاتی جھک جاتی لیکن جہاں اس طوفان میں ذرا سی کمی ہوتی، وہ پھر اُٹھ کھڑی ہوتی۔ نہ کسی طرح ٹوٹتی اور نہ جڑ سے اُکھڑتی تھی۔ مقابلہ تھا کہ جاری تھا۔ جنگ تھی کہ بے دست پائی میں بھی نہ رُکتی تھی۔ اس ادھیڑ بن کا سلسلہ گاڑی

رُکنے سے ٹوٹا۔ پروفیسر رعنا اُترے اندر داخل ہوئے وہاں ایک خط ملا۔ لکھا تھا:

''ڈیر پروفیسر صاحب! میں نے آپ کا پیام دونوں جگہ پہنچا دیا۔ میری بیوی تو آپ پر اسی رات سے عاشق ہیں۔ انھوں نے تو خوشی خوشی منظور کر لیا لیکن صاحب معاملہ، پردہ کے جھگڑے سے بظاہر گریزاں ہیں۔ جب مَیں نے آپ کی وکالت شروع کی تو انھوں نے مدعی سست اور گواہ چست، والی مشہور پھبتی مجھ پر کسی اور چپ ہو رہیں۔ آپ چاہے اس کے معنی 'السکوت کالاقرار' سمجھیں لیکن مجھے تو تیور بتلاتے ہیں کہ ''خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید۔''
بہر حال آپ تشریف لائے اور خود اپنے کانوں اپنی قسمت کا فیصلہ سن لیں۔ خیر اندیش شمیم۔''

پروفیسر صاحب خط پڑھ کر آرام کرسی پر دراز ہو گئے، دیر تک سگار پیا کیے اور یہی سوچا کیے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر کا خیال سہی۔ جواب نفی میں ہے۔ کس سے رائے لیں کس سے مشورہ کریں۔ کوئی تجربہ کار ہو تو بتلائے۔ کوئی عقل والا ہو تو اس پر بھروسہ کیا جائے۔ جلدی سے اُٹھے۔ کانٹ، اسپنوز، ڈیکارٹ، ہیوم، بارکے، سب کی کتابیں اُٹھا لائے۔ ان کی ورق گردانی کر ڈالی۔ سب اس موضوع پر خاموش۔ عقل کل لیکن جذبات سے معرا۔ خیال آیا جیمس، امریکہ کا رہنے والا زندہ دل تھا۔ شاید اس کے ہاں کوئی کام کی بات ملے۔ اس کی کتاب اُٹھائی، محبت کا بیان نکالا۔ حرف حرف پڑھ ڈالا، کوئی مشورہ نہ ملا۔ عاجز آ کر سب پھینک دیا اور سر تھامے دیر تک بیٹھے سوچا کیے۔ پھر بچپن سے پڑی ہوئی عادت کام آئی۔ سیدھے ماں کے پاس پہنچے ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ رہے اور انھیں اپنی تحریک کا جواب سنا دیا۔ ضعیفہ نے سب کچھ اس طرح ٹھنڈے دل سے سنا جس طرح وہ اس وقت کی باتیں سنا کرتی تھی جب یہ پانچ سات برس کے تھے اور اس کی خشک انگلیاں ان کے سر کے بالوں سے برابر کھیلتی رہیں۔ جب انھوں نے تتمۂ کلام میں یہ کہا کہ ''امّی اب یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔'' تو اس نے مامتا سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان کا چہرہ کلیجہ سے ہٹا کر سیدھا کیا جھک کر دیر تک ان کی آنکھوں میں کچھ دیکھا کی۔ عجب نہیں کہ ان میں اس نے انھیں پالنے میں ہمکتے، ہاتھ پیر پھینکتے، پھر ننھی ٹانگوں سے دوڑتے، پھر عنفوانِ شباب میں سبزہ آغاز، پھر جوانی میں پروفیسر کی حیثیت سے، پھر آج عاشق بے تاب کی طرح پریشان خاطر، سب کچھ ایک ہی نظر میں دیکھ لیا ہو۔ اس لیے کہ ماں کی نظر میں بیٹے کی ہر صورت، ہر وقت یکساں طور پر موجود رہتی ہے۔

بہرحال وہ تجربہ کار بی بی بولی: "بیٹے یہ تمھاری ناتجربہ کاری ہے کہ تم اس قدر پریشان ہو۔ دل لگانا اور دل کا آنا تو دنیا میں عام ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہاں پردہ کی رکاوٹ البتہ لیکن ہمارے ہاں تو یہ رسم صرف بزرگوں ہی سے نہیں چلی آتی ہے بلکہ ایمان و شرافت کا جز ہے، میری خواہش تو یہی ہے کہ چاندسی بہو گھر میں آئے تو وہ بھی شریفوں کے دستور کی پابند ہو۔ لیکن اُردو، فارسی اور تھوڑی سی عربی۔ مَیں تم لوگوں کے خیالات کیا سمجھوں۔ مَیں تو عورت ذات تھی، میرا کیا ذکر۔ لیکن میرے میکے کے مردوں میں سے بھی کوئی نہ فرنگیوں سے ملا اور نہ فرنگیوں کے ساتھ اُٹھا بیٹھا۔ تم ماشاءاللہ تمام دنیا کی سیر کر آئے ہو، سمندر پار ملکوں میں تم نے تعلیم پائی ہے، تم ہمارے طریقے، ہماری رسموں کی کہاں پابندی کر سکتے ہو، اس لیے اگر تم کسی بے پردہ سے شادی کرو گے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ ہاں اتنی تمنا ضرور ہے کہ کسی کو بیاہ کر لاؤ مگر شریف ہو۔ قوم اور ذات کی اچھی نہ سہی لیکن افعال شریفوں کے ہوں دل شریف کا ہو اور طبیعت شریف کی۔ ایسا نہ ہو کہ تمھاری بیوی اور میری بہو ہو کر وہ تمھارے باپ کا نام ہنسوائے۔"

پروفیسر صاحب اُٹھ کر بیٹھ گئے اور ماں سے بڑی محبت سے بولے۔ "امّی میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس بات کا ضرور خیال رکھوں گا۔"

وہ بولیں: "اللہ تمھیں سلامت رکھے اور تمھارے سر پر سہرا مجھے دیکھنا جلد نصیب ہو۔ اب تمھیں اختیار ہے جو جی چاہے کرو۔" انھوں نے بالکل بچوں کے انداز سے پوچھا۔ "تو پھر آج جاؤں؟"

وہ جہاں ندیدہ مسکرا کر بولی۔ "نہیں بیٹا جلدی نہ کرو۔ میں نے آج تک اس لڑکی کو نہیں دیکھا۔ ذرا پہلے میں خود دیکھ آؤں۔ اس کے بعد تم بھی چلے جانا۔"

یہ وہاں سے اُٹھ کر باہر آئے۔ کوچبان کو گاڑی تیار کرنے کا حکم دے کر اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ رہے۔

بڑی بی نے واپسی پر صرف اتنا کہا کہ "بیٹا لڑکی ہر طرح اچھی ہے۔ لیکن طور طریقہ سارا فرنگیوں کے ہے۔" اور چپ ہو رہیں۔ جب انھوں نے بہت اصرار کیا تو کہنے لگیں۔ "بڑی تو آج پھر بڑے تپاک سے ملیں۔ ان کے انداز سے تو صاف ٹپکتا ہے جیسے انھیں یہ بات دل سے منظور ہے، چھوٹی بھی سلام کر کے قریب آ کر تہذیب سے بیٹھی۔ لیکن ذرا نہ جھجکی نہ شرمائی۔ اگر

اسے بھی منظور ہوتا تو قریب نہ بیٹھتی۔ بیٹا برا نہ ماننا۔ وہ تم سے ابھی محبت نہیں کرتی۔ مَیں اتنی دیر کی ملاقات میں اتنا ضرور اندازہ کر سکی کہ اگر وہ تم کو چاہتی ہوتی تو وہ اس طرح کی لڑکی ہے کہ تمھارے ایک پردے میں کیا، ہزار پردے میں، بیٹھنا قبول کر لیتی اور پھر جب مَیں نے اُسے دیکھا ہے، تو ایک سُرخ انگریزی لباس پہنے تھی۔ گردن کے پاس سے بالکل کھلا ہوا، یہ ہندوستان کی کنواری لڑکیوں کا دستور نہیں۔ اس پر سے ماشاء اللہ بنی سنوری بھی تھی۔ تم چاہے ہنسو یا اسے بُرا کہو۔ لیکن ہمارے شرفا بن بیاہی لڑکیوں کو موٹا کپڑا پہناتے تھے۔ ایک تو اس لیے کہ خود پسندی نہ آئے۔ دوسرے، اللہ جانے غریب سے بیاہی جائے یا امیر سے۔ اگر میکے میں ریشم پہنتی رہی اور غریب شوہر کے پاس اتنا نہ ہوا تو پھر زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ یہاں ماشاء اللہ ابھی سے سب کچھ ہے۔ اب بیٹے جو تم انگریزی کپڑے نہ پہنا سکے تو پھر؟ مجھ بڑھیا کی اگر رائے مانو تو تم اس خیال کو اپنے دل سے نکال ڈالو۔ ابھی میرے گھر میں بہو آنا خدا کو منظور نہیں!''

یہ وہاں سے چپکے چلے آئے اور پلنگ پر آ کر لیٹ رہے۔ ماں کا پاس، خاندانی روایات کا لحاظ، شرافت و عزّت کا خیال ایک جانب۔ حسن کی کشمکش، محبت کا جذب، مغربی تعلیم کا اثر، دوسری طرف۔ نتیجہ یہ تھا کہ ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ کبھی بیٹھے، کبھی ٹہلے، کبھی پھر لیٹ رہے۔ نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ ہاں مس بہار کی تصویریں تھیں کہ قطار در قطار، انبوہ در انبوہ، نئے نئے انداز سے چلی آتی تھیں، کبھی تقریر کرتی ہوئی، زیرِلب مسکراتی ہوئی، کبھی سبق پڑھتی ہوئی ایک خاص انداز سے گردن ٹیڑھی کیے، ہونٹوں پر پنسل کی نوک رکھے، کبھی بجلی سے ڈرتی ہوئی زرد رو، کبھی بجلی گراتی ہوئی سُرخ رو۔ ہر ایک ادا دلربا دلکش، دلآویز۔ عجیب معمہ اور طرفہ اسرار یہ تھا کہ آنکھ کھولے رہتے جب بھی دیکھتے۔ آنکھیں بند کر لیتے جب بھی دیکھتے گویا ہر تصویر پردہ ہائے چشم پر ثبت تھی!

صبح کے وقت جب موذن نے اذان دی، تو یہ بھی 'الا اللہ' کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور کپڑے پہن کر چھڑی گھماتے چل کھڑے ہوئے اور پہنچے وہیں جہاں رات کی نیند تھی۔ بنگلہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ بہار گلگشت چمن میں مصروف ہے۔ انھیں دیکھتے ہی سلام کر کے وہ بولی: ''رات آپ کی والدہ سے مل کر بے حد دل خوش ہوا۔ بہت ہی نیک، پرانے طرز کی آدمی

ہیں۔"

یہ بولے: "آپ کی عنایت، میں بھی اس وقت مخصوص شکریہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوا کہ آپ نے کم از کم انھیں چھیڑا نہیں اور انھیں خوش ہی کرنے کی کوشش کی۔"

وہ بولی۔ "سچ کہوں جی تو بے ساختہ یہی چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بات کہہ دوں کہ ذرا وہ اُلجھ جائیں۔ لیکن پھر آپ کا خیال آ گیا۔"

یہ بولے: "میں اس کا اور زیادہ ممنون ہوں کہ میرا خیال تو آیا۔"

اس نے مسکرا کر کہا: "کیوں اس میں شکریہ کی کونسی بات ہے۔ پروفیسروں کا تو ہر روز سبق کے سلسلے میں خیال آ ہی جاتا ہے۔"

وہ بولے: "میں آپ کے بنگلہ پر شاگرد و استاد کی طرح باتیں کرنے نہیں آتا بلکہ دوستوں کی طرح۔"

اس نے بے ساختہ جواب دیا۔ "دوستی میں، سن کا فرق، جنس کا اختلاف، علم کی کمی زیادتی یہ سب امور مانع ہیں۔"

انھوں نے کہا: "لیکن محبت میں تو نہیں! عشق میں تو یہی اختلافات جذب وکشش کی زیادتی کا باعث ہوتے ہیں۔"

وہ بولی: "ممکن ہے ایسا ہی ہو، لیکن اس میں بھی درجے ہوتے ہیں۔"

انھوں نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا "بس اس سے سمجھ لیجیے کہ میری محبت کس درجہ کی ہے کہ میں آپ کی غلامی میں آنے کے لیے تیار ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولی: "آپ کی عنایت و محبت کا شکریہ لیکن وہ تو کچھ شرطوں پر مبنی ہے انھیں شاید آپ بھول گئے۔"

انھوں نے کہا۔ "بہت معمولی سی۔ صرف اتنی سی بات کہ والدہ کی حیات تک علانیہ بے پردہ نہ نکلیے بلکہ برقعہ پہن کر۔"

اس نے کچھ منفعل ہو کر 'ہوں!' کہا اور پھر پوچھا۔ "اور کچھ؟"

انھوں نے کہا: "بالکل نہیں!"

وہ تھوڑی دیر چپ چنا کی۔ جب انھوں نے کہا۔ "کیوں بھئی کیا لائق جواب بھی نہیں

ہوں؟ ہاں نہیں کچھ تو بولیے!''

وہ ان کی طرف منہ پھیر کر بولی۔ ''اگر آپ سے دو چار ہفتے میں نے تعلیم نہ حاصل کی ہوتی اور آپ کی قابلیت اور علمیت کی قائل نہ ہوتی تو شاید میں ُچار پایہ بروُ والا شعر پڑھ لیتی۔ لیکن شاگرد ہونے پر بھی جب آپ منہ کھلواتے ہیں، تو اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ کی سی ذہنیت کے آدمی کو فلسفہ نہ پڑھنا چاہیے تھا۔ آپ کو عقلیات سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ محض رواسم کے پابند اور پرانی لکیر کے فقیر ہیں! میں اپنے کو ایک ایسے شخص کے اختیار میں دے کر اپنی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی۔''

انھوں نے غصّہ اور درد بھری آواز سے پوچھا۔ ''پھر یہ آخری جواب ہے؟''

اس نے کہا: ''بالکل! مجھے تو سخت تعجب ہے کہ جب میرے اور آپ کے درمیان ایسا اصولی اختلاف ہے، تو پھر آپ کے دل میں یہ خیال ہی کیونکر پیدا ہوا!''

وہ بولے: ''خیر یہ تعجب تو آپ کا اس وقت رفع ہو جائے گا جب آپ آئینہ سامنے رکھ کر اپنی صورت پر غور کریں گی!''

اس نے ترش روئی سے کہا۔ ''تو صورت تو کوئی ایسی چیز نہیں جس پر زندگی کی بنیادیں رکھی جائیں۔ دیکھئے پھر وہی فلسفیت کے خلاف بات!'' وہ عجیب طرح جھنجھلا کر بولے: ''ارے تو میں مرد بھی تو ہوں، جوان بھی تو ہوں، یا خالی فلسفی ہی؟''

اس پر وہ کنکھیوں سے انھیں دیکھ کر مسکرائی اور چپ ہو رہی اور پھر پھول چننے لگی۔

انھوں نے پوچھا۔ ''تو بس جاؤں؟'' وہ بھویں اُونچی کر کے متعجب آواز بنا کر بولی۔ ''کیوں؟ کیا ڈاکٹر شمیم اور باجی سے نہ ملیے گا؟''

انھوں نے کہا: ''نہیں... اچھا خدا حافظ... اور اگر فلسفہ اجازت دے تو دو چار پھول مجھے عنایت فرما دیجیے، بطور یادگار کے رکھ چھوڑوں گا۔''

اس نے دو تین مرجھائے ہوئے پھول ٹوکری سے چن کر نکالے اور انھیں ان کی طرف بڑھاتے بڑھاتے عمداً زمین پر گرا دیا۔ اور پھر 'ارے؟' کہہ کر انھیں اُٹھا کر ان کی جانب بڑھایا۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر کے جیب میں رکھ لیں اور تعظیماً جھک کر وہ بولے:

''شکریہ! لیکن مرجھائے ہوئے بھی ہیں اور خاک آلود بھی۔ رکھ چھوڑیے اور انھیں میرا دل سمجھ کر پیروں سے کچل ڈالیے گا!'' یہ کہتے لمبے لمبے ڈگ رکھتے وہ بنگلہ کے باہر نکل آئے۔ ادھر اس نے پھولوں کی جانب دیکھا اور پھر ان کی پشت کی طرف نظر جمائے دیکھتی رہی۔ جب آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو اس نے ان بے گناہوں کو زمین پر پھینک کر واقعی پیر سے مسل ڈالا۔ پھر ساری ٹوکری وہیں بکھیر کر وہ جلدی جلدی اپنے کمرے میں گئی اور اپنے پلنگ پر گر کر دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

پروفیسر رعنا وہاں سے پلٹتے ہی سیدھے وائس چانسلر کے یہاں پہنچے اور ان سے دو مہینے کی رخصت لے کر رختِ سفر باندھ اسی دن پہاڑ چلے گئے۔ وہاں پہاڑوں کی سختی سے اور ان کی متانت اور ان کے استقلال سے دو ہی چار روز میں وہ پامردی کا سبق حاصل کر کے فلسفہ الٰہیات میں ڈوب گئے، معشوق مجازی کا خیال ترک کر کے معشوق حقیقی کے حسن جہاں سوز کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے اس مبحث پر ایک مستقل کتاب لکھنی شروع کر دی۔ شب کو دس بجے تک اور صبح تڑکے سے نو بجے تک وہ لکھتے رہتے اور پھر سارا دن چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کی کوشش میں صرف کرتے۔ غرض دماغی وجسمانی محنت نے دل کا درد اس طرح مٹایا کہ اب صرف داغ ہی داغ رہ گیا، بے چینی کی جگہ سکون اور اضطراب کے عوض تسکین عود کر آئی۔

ممکن ہے کہ اس کامیاب میں ماں کی دعا بھی شریک رہی ہو، اس لیے کہ وہ ضعیفہ دن رات خالق سے اپنے بچے کے لیے صرف استقلال و پامردی ہی مانگتی۔ آخر ماں کی آواز جب اس طرح درِ اجابت کو کھٹکھٹائے تو کب تک شنوائی نہ ہو اور اسے بھی سوا اس کے اور کام ہی کیا تھا۔ کھانا کھانا، نمازیں پڑھنا، یا بیٹے کے کپڑوں کو الٹنا پلٹنا اور انھیں دُھوپ دکھا کر، صاف کر کے، شکنیں مٹا کر پھر سلیقے سے رکھ دینا۔ یہی روزمرہ کا کام تھا اور یہی زندگی کی غرض و غایت!

ہاں دو تین مرتبہ اس معمول میں کچھ فرق آیا اور وہ اس لیے کہ بیگم شمیم اس سے ملنے آئیں۔ ان کو یہ رشتہ دل سے پسند تھا۔ وہ بہن کو بہت کچھ دنیا کا گرم و سرد سمجھا چکی تھیں۔ اس نے بھی اپنی عادت کے خلاف خاموشی سے ساری نصیحت سن لی تھی۔ بیگم شمیم کا خیال تھا کہ رعنا و

بہار دونوں کے ہاں جذب و محبت موجود ہے، صرف بڑی بی کی قدامت پسندی اور بہار کی افراطِ آزادی بیچ میں حائل ہے وہ اس لیے دونوں کو ہموار کرنا چاہتی تھیں۔ وہ اس سے واقف تھیں کہ خود بڑی بی، ان سے یا ان کی بہن سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ جب انھوں نے پروفیسر صاحب کے متعلق پوچھا تو بڑی بی کے جواب نے ناراضگی کی بالکل وضاحت کردی۔ وہ بولیں: ''بی بی وہ اپنے دل سے مردانہ وار لڑنے گیا ہے، اور سچ جانو میرا بچہ وہاں سے کامیاب پلٹے گا۔ وہ مرد بچہ ہے مرد!'' وہ بھی ''جی ہاں'' کہہ کر بات ٹال گئیں۔ جب دوبارہ بیگم شمیم آئیں تو بڑی بی نے مس بہار میں اتنی دلچسپی ظاہر کی کہ اس نے بیگم شمیم سے پوچھا۔ ''کیوں بی بی تم اکیلی ہی آئی ہو۔ تمھاری بہن نہیں آئیں؟ ماشاءاللہ مزاج تو اچھا۔'' اس نے کہا ''کیوں؟ ارے انھوں نے میرا کیا بگاڑا ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ انھوں نے مجھ پر بڑا احسان کیا، جو میرے بچے کی آنکھیں کھول دیں۔ اب وہ ذرا آسانی سے عشق و محبت کے پھندے میں نہیں پھنسے گا... ان کو اب کی اپنے ساتھ ضرور لانا۔ اب انھیں کاہے کی شرم اور لاج۔ اب تو وہ خیال ہی دل سے جاتا رہا!''

غرض کہ بہار بھی آئیں۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستانی ساری اور معمولی پمپ پہن کر آئیں۔ نہ سینے پر کھلا ہوا گاؤن زیب بدن تھا، اور نہ میموں والا ہرن کھری کا جوتا پاؤں میں تھا۔ وہ جتنی دیر بیٹھی رہی نیچی نظریں کیے متانت سے جواب دیتی رہیں۔ اور جب گھر دیکھنے کے سلسلے میں اس کمرے میں پہنچیں جو خاص پروفیسر صاحب کے سونے اور پڑھنے کا کمرہ تھا تو گوان کی بہن اور رعنا کی ماں وہاں سے چلی آئیں لیکن وہ وہیں ٹھٹک رہیں۔ دیر تک سارے کمرے کو بغور دیکھتی رہیں۔ پھر سامنے میز پر قلمدان سے قلم اُٹھایا اور اس سے 'پیڈ' میں جو سوختہ کے نیچے دفتی ہوتی ہے اس پر کچھ لکھا۔ پھر جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور وہاں سے چلی آئیں۔

پروفیسر صاحب جو واپس آئے تو پیشانی پر گہرے نشانات، ہونٹوں پر سختی، اور دل و دماغ میں صحت کی قوت بھی ساتھ لائے۔ ماں نے جب مسکرا کر بلائیں لیں تو اسی کے ساتھ دو آنسو بھی بے اختیار آنکھوں سے گر پڑے۔

پہلے ہی دن جب یونیورسٹی میں مس بہار کا سامنا ہوا اور انھوں نے سلام کیا تو جواب اسی

بے پرواہی سے ملا جس سے کہ اور شاگردوں کو ملتا تھا، اور جب وہ درس کے بعد کمرے میں کھڑی رہی تو انھوں نے بے رُخی سے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا: ''کیوں؟ آپ کو کچھ پوچھنا ہے؟''

وہ اپنا ریشمی رومال دونوں ہاتھوں میں اینٹھتی رہی اور نظریں نیچی کیے بولیں۔ ''صرف دریافت حال کرنا تھا کہ اب مزاج کیسا ہے؟''

بولے۔ ''کیوں، کیا میں بیمار معلوم ہوتا ہوں؟ میں تو برسوں سے علیل نہیں ہوا!''

وہ بولیں۔ ''جی نہیں! صرف اس طرح دفعتاً پہاڑ پر چلے جانے سے خیال ہوا کہ شاید دُشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی تھی؟''

انھوں نے کہا۔ ''نہیں ایک کتاب فلسفہ الٰہیات پر لکھنا تھی اور اس کی داغ بیل ڈالنے کے لیے بڑی یکسوئی دماغ اور اطمینان قلب کی ضرورت تھی سو وہ یہاں نصیب نہ تھا۔ اسی لیے پہاڑ پر چلا گیا تھا۔''

مس بہار نے اپنے سوکھے ہونٹوں کو زبان سے تر کیا، اور بولیں: ''تو کتاب شروع ہو گئی!''

انھوں نے کہا۔ ''جی ہاں بلکہ قریب ختم ہے۔ اب انشاء اللہ ہفتہ عشرہ میں مطبع میں بھیج دوں گا۔ اور یہ کہتے کہتے وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے الماری میں رجسٹر اور کاپیاں بند کر کے کمرے سے چلتے وقت بولے ''اور اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد آپ چاہے ''چار پایہ بر و کتابے چند'' ہی کہیں لیکن دنیا تو مجھے فلسفی مان ہی لے گی!''

مس بہار خجالت سے عرق عرق ہو گئیں اور کچھ کہنے ہی کو تھیں کہ وہ کمرے سے چلے گئے اور یہ سر جھکائے اپنی سائیکل پر بیٹھیں اور گھر چلی آئیں۔ بہن نے اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر پوچھا ''کیوں خیر تو ہے کیسا مزاج ہے؟'' یہ بولیں ''کچھ نہیں سر میں درد ہے۔'' اور پلنگ پر منہ لپیٹ کر پڑ رہیں۔ گھنٹوں پڑی رویا کیں، تڑپا کیں، سوچا کیں۔ پھر اٹھیں منہ ہاتھ دھویا اور بہن کے پاس آئیں اور ان سے کہنے لگیں کہ ''پروفیسر صاحب پہاڑ سے واپس آ گئے ہیں۔ انھیں کھانے پر کسی دن نہ بلائیے گا؟'' نسترن نے ان کی صورت دیکھی، سر ہلایا، اور خط کا کاغذ کھینچ کر لکھا۔

''جناب پروفیسر صاحب بہار سے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ پہاڑ سے

واپس آ گئے۔ چونکہ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی اس لیے جی چاہتا ہے کہ آج شام کو کھانا ہمارے ساتھ کھا کر ہم لوگوں کو بھی رُخِ انور کی زیارت کا موقع دیجیے۔

"بیگم شمیم۔"

جب بیرا خط لے کر پہنچا تو یہ ٹہل رہے تھے۔ خط لے کر پڑھا، جواب لکھا: "بہت خوب آٹھ بجے حاضر ہوں گا۔" گاڑیبان کو گاڑی پیچھے پیچھے لانے کا حکم دے کر ٹھیک پانچ بجے پیدل اپنی تفریح کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ خیال یہ تھا کہ گھومتے گھماتے آٹھ بجے تک وہاں پہنچ جائیں گے۔ اس لیے بڑے گھماؤ کا راستہ اختیار کیا کہ جس میں پانچ چھ میل سے کم چلنا نہ پڑے۔ گاڑی اس لیے ساتھ لے لی تھی کہ اگر راہ میں تھک گئے تو بیٹھ لیں گے۔

ادھر نسترن نے خط پڑھ کر بہار کو دیا۔ سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ کئی روز سے تفریح کے لیے نہیں گئی تھیں۔ ذرا سی امید نے غنچۂ ناشگفتہ کو کھلا دیا۔ اپنی ریشمی چھتری اٹھا کر ٹہلنے نکل گئیں اور خیالات میں غرق نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔ یہ نہ سوچا کہ یہ ۲۹-۱۹۲۸ء کا زمانہ اندھیرے اور ویرانے میں مردوں کے تنہا نکلنے کا تو ہئی نہیں چہ جائیکہ کسی عورت کے۔ وہ بھی دوشیزہ اور پری جمال۔ چوروں اُچکّوں کے علاوہ، مذہب کی آڑ پکڑنے والے پاجی بھی ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے۔ چنانچہ یہ اپنے خیالات میں غرق، رعنا کو منانے کی صورتوں پر غور کرتی چلی جارہی تھیں کہ.... دو آدمیوں نے انھیں دیکھا۔ آپس میں کچھ اشارے ہوئے اور وہ ان کے پیچھے ہو لیے۔ جب یہ آبادی سے بہت دور نکل گئیں اور آفتاب نے بھی اپنا رُخِ روشن سیاہ چادر میں چھپا لیا تو وہ دونوں ان کے برابر آ کر بولے "میم صاحب یہ بٹوا اور چھتری ادھر لائیے۔" انھوں نے صیدِ نو گرفتار کی طرح گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اپنے کو آبادی سے دُور اُن کے بس میں پایا۔ انگریزی تعلیم نے جہاں 'اپ ٹو ڈیٹ' عورتوں میں بعض خرابیاں پیدا کر دی ہیں وہاں اتنی بھلائی ضرور کی ہے کہ ان کی ہمّت پردہ میں بیٹھنے والیوں سے کئی گنا زیادہ ہو گئی ہے۔ اسی لیے مس بہار نے بے تکان چھتری گھما کر دونوں کے منہ پر تڑاق تڑاق ماری۔ وہ جھجک کر ہٹے اور یہ بے تحاشا بھاگیں۔ چوٹ کھائے ہوئے حریف جھلا کر پیچھے دوڑے۔ عورت اور مرد کی دوڑ تھی۔ پھر وہ بھی اس وقت جبکہ گاؤن زیبِ جسم ہو اور ہدہد کی چونچ سی ایڑی والا جوتا پاؤں میں ہو۔ تھوڑی دُور تو انھوں نے نسیم سبک رو کی پھرتی دکھائی۔ پھر دم پھولنے لگا۔ گاؤن

میں پیر الجھا۔ جوتے کی ایڑی کی وجہ سے قدم ڈگمگائے اور یہ منہ کے بل سڑک پر گر پڑیں۔ لب لعلین کو لہو نے اور لال کر دیا کہ اتنے میں دونوں بدمعاش پہنچ گئے اور ایک نے چھرا نکال کر بھرپور وار کیا۔ پہلو کو زخمی کرتا چھرا گاؤن میں در آیا۔ یہ چیخیں اور پھر اُٹھ کر بھاگیں۔ دوسرے نے لپک کر ہاتھ تھاما اور نازک کلائیاں اینٹھ کر بولا: ''بس اب بٹوا لاؤ۔'' اتنے میں پہلے نے پھر چھرا تانا۔ دوسرا بولا'' بیوقوف ہوا ہے یہ چیز جان سے مارنے کی ہے یا سینے سے لگانے کی؟'' اس نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر ان کی کمر میں ڈالا۔ یہ پھر چیخیں۔ خدا کا کرنا کہ رعنا بھی قریب ہی تھے ایک عورت کی چیخ کی آواز سن کر بے تحاشا دوڑے۔ گاڑیبان نے بھی گھوڑے کو چابک لگائی۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو بہار کو ایک بدمعاش گود میں اُٹھائے ہے اور وہ تڑپ رہی ہیں۔ یہ للکارتے آگے بڑھے۔ بدمعاشوں نے ان کی آواز سنی اور گاڑی پیچھے آتے ہوئے دیکھی تو انھیں جلدی سے گود سے پھینک بٹوہ لے کر ایک طرف بھاگ نکلے۔ مس بہار گرتے ہی بے ہوش ہو گئیں۔ انھوں نے جلدی سے گود میں اُٹھا کر گاڑی میں ڈال دیا اور گاڑیبان سے 'اسپتال چلو' کہہ کر اس کا سر زانو پر رکھ کر خود بھی بیٹھ گئے۔

پروفیسر رعنا مرہم پٹی کرا کے بہار کو اپنے گھر، جو قریب ہی تھا، لے آئے اور اپنے بستر پر لٹا کر ماں کو لخلخہ سنگھانے کی تاکید کر کے، ڈاکٹر شمیم کو ٹیلی فون کرنے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ بہار نے آنکھیں کھولیں، سہمی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر نقیہ آواز سے پوچھا۔ ''میں کہاں ہوں؟'' بڑی بی نے مسکرا کر جواب دیا: ''جہاں تم نہ آنا چاہتی تھیں، اس گھر میں!'' اس کی غزالی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اتنے میں رعنا آ گئے۔ اس نے انھیں دیکھا اور آنکھیں چرا لیں، بڑی بی چپکے سے کمرے سے کھسک گئیں۔ رعنا اس کے پاس آئے اور آہستہ سے بولے: ''مزاج کیسا ہے؟''

بہار نے آنکھیں کھولیں اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ رعنا پھر مسکرا کر بولے: ''وہ چلی گئیں!''

وہ بھی مسکرا دی اور چپکے سے بولی۔ ''پہلو میں درد ہے لیکن دل مسرت سے لبریز!''

''کیوں؟''

وہ بولی۔ ''اس لیے کہ آپ نے جان و آبرو بچائی۔ اب تو شاید اس کی ملکیت سے انکار نہ ہوگا؟''

وہ اس کا مطلب بالکل نہ سمجھے اور گھبرا کر استعجاب سے بولے۔ ''کیا کہا؟''

اس نے پیڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اسے اٹھایئے'' یہ متعجب ہو کر پیڈ مع دفتی کے اٹھالائے۔ اس نے سوختہ ہٹا کر انھیں دکھایا۔ لکھا تھا ''میں نے ہار مان لی!''

''کب لکھا؟''

''جب آپ پہاڑ گئے تھے!''

وہ ایک مرتبہ کانپے۔ پھر بے ساختہ جھک کر انھوں نے اس کے ہاتھوں کا پیار لیا۔ اس نے ان کی جھکی ہوئی گردن میں اپنی باہیں حمائل کر دیں اور بولی ''للہ اب تو پیشانی کی ان شکنوں کو مٹا ڈالیے!''

ردِّ عمل

مقرّرہ کی تقریر میں آفت کا جوش اور بلا کی گرمی تھی۔ معلوم ہوتا دہکتے ہوئے انگارے ہیں جو لعل ایسے لب سے نکل رہے ہیں اور جلتے ہوئے پھول ہیں جو انار جیسے منہ سے چھوٹ رہے ہیں۔ مقرّرہ کے قد و قامت کی موزونی، لباس و غازے کی دلربائی، شیریں آواز کا زیر و بم اور حرکات و سکنات کی دلآویزی یوں ہی حشر بداماں تھی، اِس پر موضوع بحث کی دلآویزی نے اور بھی قیامت برپا کر رکھی تھی۔ بس ایک تلاطم تھا، ایک ہنگامہ تھا، ایک طوفان تھا جو نوجوان دِلوں کی چولیں ہلاتا اور اعصاب و جذبات میں زلزلہ ڈال جاتا تھا۔ مجمع بھی تھا یونیورسٹی اور کالج کے طلباء اور طالبات کا، لڑکے قطار در قطار تو لڑکیاں لشکر در لشکر! ان سب کو مسز رتنا پٹیم کا نام کھینچ لایا تھا۔ وہ ان کے لیے اجنبی نہ تھی۔ آج سے دو ہی برس پہلے تو وہ ان کی یونیورسٹی کی مشہور طالبات میں سے تھی۔ اس کے باپ شہر کے سب سے بڑے کروڑپتی تھے اور رتنا کے لیے اس زمانے میں تمام وہ سامانِ آسائش و آرائش مہیّا تھے، جو دولت کی بہتات ایک ادنیٰ اشارے پر موجود کر دیتی ہے۔ وہ اس قارونِ وقت اور ہندوستانی روش چائلڈ کی اِکلوتی بیٹی تھی، اور اُن کے چودہ شوگر اور کپڑے کے کارخانوں کی واحد وارثہ! رتنا دس ہی برس کی تھی کہ اس کی ماں سورگ باشی ہوگئیں۔ سیٹھ چندر جی نے بیوی کی محبت بھی بیٹی کی طرف منتقل کر دی، اُسے آنکھوں کا تارا بنایا اور بڑے ناز و نعم سے پالا۔ اس کی ہر ہٹ اور ہر ضد پوری کی، چشم و ابرو کے اشارے پر چلے اور چھوٹی سے چھوٹی خواہش بھی نہ ٹالی۔ غرض رتنا کے سن کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت ہی نہ بڑھتی رہی بلکہ اس کی تعلیمی ترقی اور اپنی جہالت کی وجہ سے اس کا ڈر بھی دل میں گھر کرتا گیا۔

مگر یہ حالت رتنا کے ایف۔اے۔ پاس کرنے تک رہی۔ اِدھر رتنا نیورسٹی میں داخل ہوئی اُدھر سیٹھ جی کے بوڑھے خون میں جوش آیا۔ اُنھوں نے یار دوستوں کے کہنے سے دوبارہ گھر بسایا۔ نئی سیٹھائی رتنا ہی کے سن و سال کی تھیں، اِس لیے اُن کے گھر میں براجتے ہی اُن کے

اور رتنا کے درمیان ماں بیٹی کی محبت کی جگہ سوکنوں کی جلن پیدا ہوگئی۔ سیٹھ جی کچھ دنوں تو برابر تولنے کی کوشش کرتے رہے، مگر آہستہ آہستہ بیٹی ہلکی اور بیوی بھاری پڑتی گئی۔ وجہ بھی ظاہر تھی۔ رتنا لختِ جگر، نورِ نظر، دل کی ٹھنڈک سہی لیکن اس سے جسم کی پیاس نہ بجھتی تھی۔ اس کی سبیل تو نئی سیٹھانی ہی کے پاس تھی۔ اور وہ تھیں کہ ذرا ذرا سی بات پر آنسوؤں کے جل تھل بہا دیتی تھیں۔ اس سیلاب میں سیٹھ جی کے سارے عزائم انصاف وعدل تنکے کی طرح بہہ جاتے تھے۔ اور وہ غزالی آنکھوں کے آنسو خشک کرتے کرتے رتنا کو انھیں کے نینوں سے دیکھنے لگتے تھے۔

رتنا کی وہی حالت تھی جیسے کسی شہنشاہ سے اس کا راج چھین لیا جائے، جہاں وہ اکیلی حکمرانی کرتی تھی وہاں وہ روز بروز محکوم بنتی جارہی تھی۔ دو چار بار اس نے سلب شدہ اختیارات کے واپس لینے کی کوشش کی، مگر:

"دو دل یک شود بشکند کوہ را"

سیٹھ اور سیٹھانی نے اسے غاصب ثابت کرکے شکست دے دی۔ چنانچہ اب اسے گھر کاٹنے لگا اور اس میں گھومنے پھرنے اور سوسائٹی کی تتلی بننے کی خواہش بڑھنے لگی۔ ساتھ ہی باپ کی شادی نے غیر شعوری طور پر اس کے نیم خستہ اعصاب کو بیدار کردیا اور اُس میں اپنے لیے 'بر' کی تلاش وجستجو کی رغبت پیدا ہوگئی۔ وہ اپنے ساتھی طلبا پر اس حیثیت سے نظر ڈالنے لگی کہ ان میں سے کون کفو بننے کے لائق ہے۔

نظرِ انتخاب ٹھہری پتیم پر!

یہ ذات کے برہمن تھے، اور گھر کے غریب، ذہن بھی کچھ اچھا نہ تھا، رَٹ رَٹ کے امتحان تیسرے درجے میں پاس کرلیتے تھے۔ مگر جسم بہت سڈول تھا، صورت شکل اچھی تھی، اور خاموش اور سنجیدہ ہونے کی وجہ سے جنس مخالف کے لیے خاص کشش کے مالک تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رتنا ان کی ذات برادری کی نہیں، کھتری ہے، یہ ہیرا اُن کی پیتل کی انگوٹھی پر ٹھیک نہیں بیٹھ سکتا۔ لیکن جب رتنا خود چاہے، صیاد خود صید بننے کی کوشش کرے، رانی خود بڑھ کر گلے میں ہار ڈالے تو کیونکر بس چلے؟ اس لیے وہ محبت کی شست میں پھنس گئے۔ اور بوڑھی ماں اور گاؤں والے پھونس کے جھونپڑے ہی کو نہ بھولے، بلکہ پیپل کے تنے کے پاس رکھی ہوئی مورتی کی جگہ مدہوش شباب رتنا کی پرستش کرنے لگے۔ پھر بھی رتنا کا دولت مند ہونا اور خود کا بالکل قلاّنچ ہونا کبھی کبھی مردانگی کا ٹھوکا دیتا تھا، لیکن جذبات کے تلاطم نے زیادہ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ

دی۔ اور وہ خوشی خوشی غیرت وحمیت کی قربانی کے لیے بھی تیار ہو گئے اور مستقبل میں دیش کی سیوا کے منصوبے بھی پریم پر بھینٹ چڑھا بیٹھے۔

رتنا نے اپنے انتخاب اور اپنی پسند کی اطلاع سیٹھ جی کو دے دی۔ وہاں نئی سیٹھانی کے زیرِ اثر جس طرح کھویا ہوا شباب پلٹا تھا اُسی طرح اصابت رائے بھی عود کر آئی تھی۔ اُنھوں نے ذات پات کے پھیر میں پڑ کر اس شادی کی مخالفت کی۔ اور یہ حکم دینے کی جرأت کر ڈالی کہ رتنا اپنے پیارے پنڈت سے ملنا تک ترک کر دے۔ بس رسہ کشی شروع ہو گئی، یونیورسٹی کی نوجوان پارٹی، پیتم پریم کی حامی بنی، یہ رتنا کی ٹیم ہوئی۔ دوسری جانب کھانستے ہوئے سیٹھ جی اور بل کھاتی ہوئی سیٹھانی نے ٹیم بنائی۔ دونوں طرف سے زور لگنے لگے۔ مخالفتیں بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ سیٹھ جی نے خفا ہو کر دھمکی دی کہ اگر رتنا نے کہانہ مانا تو ان کی دولت سے محروم کر دی جائے گی۔ بس اس کو صرف وہی پچاس ہزار مل سکیں گے جو اس کے نام سے بینک میں ہیں۔

سیٹھ جی کی اس دھمکی نے ان کی محبت میں جذبۂ قربانی کا اضافہ کر دیا۔ رتنا کے اخلاص کی جانچ کے لیے یہ کسوٹی اچھی ہاتھ آئی۔ پیتم کی غیرت کا ڈنک بھی ٹوٹ گیا۔ جہاں کروڑوں کی بات چیت ہو، وہاں ہزار کوڑیوں کے برابر دکھائی دیتے ہیں، پیتم کا پس و پیش ختم ہو گیا۔ رتنا کسوٹی پر پوری اُتری اور چند ہی دِنوں میں دونوں کی 'سول میرج' ہو گئی۔

اِس محبت کی شادی کو دو برس ہو چکے تھے۔ پیتم جی 'پرنس کنسورٹ' کی حیثیت سے تعلیم نامکمل چھوڑ کر رتنا کے ساتھ دیس بدیس کی سیر کر آئے تھے۔ اب جبکہ نقد پونجی ختم ہونے کے قریب تھی تو دونوں شہر پلٹے تھے۔ آج رتنا کا پہلا پبلک لکچر تھا موضوع تھا۔ "ہماری شادیاں!"

رتنا نے اپنی پسند کی شادی کی وہ تعریفیں بیان کی تھیں، اور خوشیوں اور مسرتوں کی وہ سندر تصویر پیش کی تھی کہ ہر نوجوان لڑکی اور لڑکا جنت کے سارے مزے اسی دُنیا میں لوٹنے کا اپنے کو مستحق سمجھنے لگا تھا۔ ساتھ ہی رتنا نے والدین کے دباؤ، زبردستی، جبر، تشدد اور ظلم کا وہ بھیانک مرقع پیش کیا تھا کہ سارے طلبا اور طالبات انھیں 'ہون' اور 'مغل' سے بھی زیادہ سفاک اور بے رحم سمجھنے لگی تھیں۔ اس نے آخر تقریر میں انہیں اس بات کا یقین دلایا کہ اگر زندگی کا سب سے اہم کوئی مسئلہ ہے تو وہ پریم اور صرف پریم ہے! ان میں سے ہر ایک کا دل خالی کٹورے کی طرح پریم کی پیاس میں کھنکنے لگا تھا۔ ان کا بس نہ چلتا کہ وہ کس طرح جلد سے جلد اس جام خالی کو جنس مخالف کی کسی فرد کی چاہ سے بھر لیں۔ وہ مستقبل قریب ہی میں اس آبِ حیات سے سیراب

ہونے کی اُمید میں ابھی سے اپنے عنابی ہونٹ چاٹنے لگی تھیں۔ وہ اس آنے والی پُر از مسرت زندگی کے خیال ہی سے بار بار سرشار ہو کر جھومنے لگی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں ابھی سے خمار سا چھایا جاتا تھا، ان کے ہاتھ پاؤں ابھی سے ٹوٹنے لگے تھے۔ وہ مقررہ پر نظریں جمائے ایک ایک لفظ کانوں سے پیئے جا رہی تھیں۔ رتنا کہہ رہی تھی۔

''میں آخر میں پھر ایک بار دُہراتی ہوں، پریم ہی سب کچھ ہے۔ پریم ہی بھوک ہے، پریم ہی پیاس، پریم ہی امارت ہے، پریم ہی سب سے بڑی دولت! اگر کسی کے پاس یہ نہیں ہے تو کروڑ پتی ہو کر بھی کنگال ہے۔ اگر کسی کے پاس یہ ہے تو کنگال ہو کر بھی مالا مال ہے! یہ اگر ہے تو کوئی دُکھ دُکھ نہیں، یہ اگر نہیں ہے تو کوئی سکھ سکھ نہیں ہے۔ لوگ کسانوں کو دُکھی بتا کر اُن کے لیے لڑتے ہیں، لوگ مزدوروں کو مصیبت زدہ بتا کر اُس کے لیے جنگ کرتے ہیں، لوگ سرمایہ و دولت کی غیر مساوی تقسیم کو بُرا بھلا کہہ کر اس کے سدھار کے لیے آمادۂ پیکار ہوتے ہیں، لوگ دیش اور وطن کو غلامی سے چھڑانے کے لیے آزادی کی مالا جپنے لگتے ہیں۔ لیکن مَیں کہتی ہوں سب سے بڑی آزادی ہے پریم کی آزادی، سب سے پہلے اسے جیتو، اس کو سوسائٹی کے، دھرم کے، دیش کے پنجے سے آزاد کراؤ، پھر آزادی ہی آزادی ہے! ملک کی آزادی ایک مادّی چیز ہے، پریم کی آزادی روح، آتما کی آزادی ہے۔

اس لیے، بہنو، بھائیو! میری بات گرہ میں باندھ رکھو، پریم کرو پریم! تم جانتے ہو، مَیں نے کروڑوں روپے پر اسی لیے لات ماردی! مگر اپنی پسند اپنے انتخاب سے نہ ٹلی! تعلیم چھوڑ دی، خاندان چھوڑ دیا، یہاں تک کہ برادری ہی نہیں بلکہ دیس چھوڑ دیا، پر اس کو نہ چھوڑا! جس سے مَیں پریم کرتی ہوں۔ مَیں آپ لوگوں کو یقین دلاتی ہوں کہ مجھے اس وقت تک کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہ آیا کہ مجھے پریم کی قیمت زیادہ دینا پڑی۔ سچ مانیے میری گرہست زندگی کی ہر سانس سورگ کی رچناؤں سے بھری پڑی ہے! مجھے وہ آنند ہے کہ جو بڑے بڑے دھن والوں نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا! میں اپنے کو ہر وقت مبارکباد دیتی ہوں کہ مَیں نے پریمی پتیم کا سا سوامی اور سرتاج اپنے لیے چنا! اور یہی آشا ہے کہ اُنہیں کے پوتر چرنوں میں پوری زندگی، یہ پورا جنم بسر کر دوں! میری پیاری بہنو، اور میرے پیارے بھائیو! بھگوان تم سب کو اسی طرح کا سکھی جیون دے۔''

ہال تالیوں کی آواز اور ''براوو! شاباش! مرحبا!'' کی صدا سے گونجنے لگا۔ سامعین میں سے ہر ایک، سوائے ایک شخص کے جو پچھلی سیٹ پر بیٹھا مسکرا رہا تھا، چیخ رہا تھا۔ جلسے کے ختم

ہونے پر جب رتنا بہت سے سلام قبول کرتی موٹر کی طرف چلی تو وہ شخص بھی گردن جھکائے ساتھ ہولیا، یہی ان کا 'پرنس کنسورٹ' پیتم تھا!

راستے میں میاں بیوی میں کوئی خاص بات نہ ہوئی، دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ لیکن گھر پہنچتے ہی پیتم ایک کمرے میں جس کے پھٹے ہوئے کوچ اور ٹوٹی ہوئی گدّے دار کُرسیاں بتا رہی تھیں کہ ڈرائنگ روم ہے، گھس گیا۔ اور وہاں داخل ہوتے ہی ایک کوچ پر گر کر بیساختہ قہقہے لگانے لگا۔ رتنا پیچھے رہ گئی تھی، اس نے کمرے میں آتے ہی میاں کو جو اس طرح ہنستے دیکھا تو اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وہ اسے بڑے غصّے سے گھورنے لگی۔ پیتم کی ہنسی اور بھی بڑھ گئی۔ رتنا نے ہرن کُھری والے جوتے کی ایڑی زمین پر ماری اور پوچھا۔ ''کون سی نئی بات ہوئی، جو مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بنے جا رہے ہو؟''

پیتم نے ہنسی ضبط کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ''ہی! ہی! میری گرہست زندگی کی ہر سانس! ہی! ہی!.... ہر سانس!.... ہے رام!.... ہی! ہی!.... سورگ کی رچناؤں سے بھری ہے! ہی! ہی!.... میں اپنے کو ہر وقت مبارکباد دیتی ہوں! ہی! ہی!.... کہ میں نے پریمی پیتم! ہی! ہی! ہی!.... پریمی پیتم! ہے بھگوان ان پریمی پیتم! اُف! پریمی پیتم کا سا سوامی چنا! ہاہا... ہاہا... ہاہا... اور ابھی کل مجھے اپنے کنول سے پاؤں سے ٹھوکر ماری تھی! ہی! ہی! کہ میرے کمرے سے نکل جاؤ! ہاہا... ہاہا... مجھے تمھاری صورت دیکھ کر تے آتی ہے! ہاہا... ہاہا... ہاہا...''

رتنا نے جھلاّ کے کہا۔ ''تو کیا کہہ دیتی کہ تم بڑے نیچ اور کمینے نکلے! تم میرے پیسوں پر پڑے کھاتے ہو! اور کبھی چار پیسے کمانے کی کوشش نہیں کرتے!''

پیتم نے قہقہہ لگایا۔ ''ہاہا... ہاہا... پریمی پیتم اور چار پیسے! ہاہا... ہاہا... ہاہا...''

رتنا نے دانت پیس کر کہا۔ ''اچھا بس اب چپ رہو! بہت ہنس چکے!''

پیتم نے پیٹ پکڑ کے کہا۔ ''مجھے کبھی بھولے سے بھی خیال نہ آیا... ہی ہی! بھولے سے بھی! ہی... ہی... کہ مجھے پریم کی قیمت زیادہ دینا پڑی! ہاہا... ہاہا... ہاہا...''

رتنا نے ایکبارگی پاس کی چھوٹی میز سے گلدان اُٹھا کر پیتم پر کھینچ مارا۔ پریمی نے آہ کر کے سر پکڑ لیا اور وہ دھڑاکے سے کواڑ بھیڑتی اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی!''

(کچھ ہنسی نہیں اور...... ۱۹۳۹ء)

روزہ

''میاں آج تیسرا دن ہے کہ روزے پر روزہ رکھ رہا ہوں۔'' میر صاحب نے سوکھی زبان سوکھے ہونٹوں پر پھرا کے کہا۔

رشید نے پھر ایک مرتبہ ان کی صورت سر سے پاؤں تک دیکھی، زرد چہرا، دھنسی ہوئی آنکھیں، کلّے پر بال کی کھونٹیاں نکلی ہوئی۔ پتلی سی گردن، پتلا سا سینہ سوکھے ہوئے ہاتھ پاؤں، کسی کی دی ہوئی ایک لمبی، ڈھیلی اور پھٹی ہوئی شیروانی زیبِ جسم تھی۔ پیوندار میلا گھٹنا بھی کسی دوسرے ہی کا تھا، اِس لیے کہ وہ اتنا اُونچا تھا کہ ٹخنے اور پنڈلیوں کا خشک حصّہ صاف نمایاں تھا۔ پاؤں میں کینوس کا حددرجہ میلا جوتا تھا، جس میں سُتلی فیتے کا کام دے رہی تھی اور جو اتنا شکستہ تھا کہ دونوں پاؤں کے انگوٹھے کچھوے کی طرح گردنیں باہر نکالے جھانک رہے تھے۔

میر صاحب کے چلنے سے واقعی معلوم ہوتا تھا کہ اُنہوں نے روزے پر روزے رکھے ہیں، لیکن رشید کے دل میں ان کے اس چلنے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُسے لکھنؤ میں رہتے ایک عمر گزری تھی، اسے ہر طرح کے سائلوں اور بھیک مانگنے والوں کا تجربہ تھا۔ وہ ان لوگوں سے بھی واقف تھا جو آپ کو تانگے پر دیکھ کر ''ارے اے وہ سرکار جو تانگے پر جارہے ہیں'' کہہ کر کئی سلام کر کے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اُن لوگوں کو بھی جانتا تھا جو لنگڑے لولے بن کر آپ کی ہمدردی کا اندازہ کرنے نکلتے ہیں۔ اُن لوگوں کو بھی پہچانتا تھا جو آپ کو دوستوں کے مجمع سے الگ لے جا کر اس طرح آہستہ سے بھیک مانگتے ہیں جیسے آپ سے ان کی بڑی گہری چھنتی ہے۔ اور وہ کوئی خاص راز کی بات آپ سے کہہ رہے ہیں۔ اور اُن لوگوں کا بھی تجربہ رکھتا تھا جو ہر سال کھیت کھلیان سے فراغت حاصل کر کے لکھنؤ تشریف لاتے ہیں، اور ہر مہینے میں کم سے کم تیس روپیہ کا منی آرڈر گھر بھیجتے ہیں۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ میر صاحب بھی اسی آخری قسم کے فقیروں

میں سے ہیں۔

اس نے پوچھا۔ ’’میر صاحب! کیا آپ سچ مچ روزے سے ہیں؟‘‘

اُنھوں نے فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لا کر کہا۔ ’’مَیں بھلا حضور سے جھوٹ بولوں گا۔ رمضان کا مہینہ ہے، گرمیوں کے دن ہیں اور پرایا دیس۔‘‘

’’سیّد ہوں اور مسافر...‘‘

رشید نے بات کاٹ کر کہا۔ ’’تو کیا آپ نے سچ مچ کل کچھ بھی نہیں کھایا تھا؟‘‘

میر صاحب آزردہ لہجے میں بولے۔ ’’حضور کے سرِ عزیز کی قسم کھاتا ہوں کہ پرسوں سے ایک کھیل اُڑ کر منہ میں نہیں گئی، بس پانی سے افطار کرتا ہوں اور پانی ہی کی سحری کھاتا ہوں۔‘‘

رشید نے کہا: ’’تو پھر آپ کو روزہ رکھنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟‘‘

میر صاحب بہت ہی متانت سے شکایتانہ انداز سے بولے: ’’آپ بھی میاں مذاق کرتے ہیں۔ ہم غریبوں کی دُنیا ہی کون سی اچھی ہے، کہ اب عاقبت بھی خراب کرلیں!‘‘

رشید، میر صاحب سے کچھ اور پوچھنے والا ہی تھا کہ حاجی صاحب آگئے۔

آپ اگر ان کے نام سے مرعوب ہو گئے ہوں تو اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ یہ رشید کے ملازم 'کلّو' کا خطاب ہے۔ یہ نماز روزے کے معاملے میں کٹّر قسم کے مسلمان ہیں اور ماشاء اللہ ان کو قرآن کے ڈیڑھ پارے بھی یاد ہیں۔ لڑکوں نے ان کی سچائی، سادگی اور لمبی داڑھی دیکھ کر کسی سال جون یا جنوری میں انھیں ’’حاجی صاحب‘‘ کا خطاب عطا کر دیا۔ یہ ان کے اُوپر کچھ ایسا ٹھیک اُترا کہ اپنے پرائے سب لوگوں نے انھیں اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔

حاجی صاحب کا حلیہ، ان کے اصلی نام ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ایسا پختہ رنگ ہے کہ دن میں کئی بار غسل و وضو کے سلسلے میں دُھلنے کے باوجود اس کی چمک میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ چھریرا بدن اگرچہ کمزور ہے، لیکن حاجی صاحب کی پھرتی کا باعث بھی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ صبح پانچ بجے سے رات کے بارہ بجے تک یا تو وہ طرح طرح کے کاموں میں مشغول رہیں گے یا نماز و تہجد میں محو۔ مزاج ایسا پایا ہے کہ پیر پیمبروں ہی کو ملا ہوگا۔ نہ کسی سے لڑنا، نہ تُو تُو مَیں مَیں، اور نہ دانتا کل کل، ہر ایک سے دوستی، ہر ایک سے محبت اور ہر ایک پر اعتبار۔ وہ کمزور انسان کی صورت میں صرف دو ہی وقتوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو اپنی بیوی سے باتیں کرتے وقت، اور دوسرے اپنا پیسہ صرف کرتے وقت۔ مگر اس کمزوری کا پہلا موقع تو حاجی

صاحب نے سرے ہی سے غائب کر دیا یعنی وہ شادی کرنے پر بھی بن بیاہے ہی رہے اور بد دماغ بیوی جوتے لات سے عاجز آ کر طلاق لے کر بیٹھ رہی۔ البتہ دوسرا موقع باوجود حاجی صاحب کی کوششوں کے سال میں دو چار بار پیش آ ہی جاتا ہے۔ ان کا اندازیہ ہے کہ وہ اپنا پیسہ حرام اور ناجائز ہی نہیں سمجھتے، بلکہ اسے چھپے کونوں سے نکالنا اور دوسروں کو ضرورت کے وقت قرض دینا بھی شدّت کے ساتھ مکروہ جانتے ہیں۔ تنخواہ ملی نہیں کہ حاجی صاحب نے اس کا منی آرڈر اپنی ماں کے پاس بھیجا نہیں۔ اس میں دیر نہیں ہو سکتی، جہاں مہینہ کی پہلی تاریخ سے دو چار دن بھی ٹلے، اور حاجی صاحب پریشان ہو گئے، بار بار ڈیوڑھی پر جا کر بیوی سے فریاد کریں گے۔ ''اے سرکار آخر تنخواہ کیوں نہیں ملتی؟'' بچوں کی طرح مچلیں گے، روٹھیں گے، ضد کریں گے، اور بالآخر تنخواہ لے کر اور اُسے پوری کی پوری ماں کے نام روانہ کر کے دَم لیں گے۔

رشید اور اُس کے گھر والے سب اُن کا لحاظ کرتے اور ڈرتے ہیں۔ اس لیے کہ حاجی صاحب ان سب سے اچھے آدمی ہی نہیں ہیں بلکہ سب کے خداوند نعمت بھی ہیں یعنی کھانا وہی پکاتے ہیں۔ دیہاتی مثل ہے۔ ''جس کے ہاتھ میں ڈوئی، اُسی کا سب کوئی' اس لیے اچھے بھلے نمک حلال آدمیوں کی طرح رشید اور اُس کے متعلقین کو حاجی صاحب کو خوش رکھنا ہی پڑتا ہے۔

رشید، میر صاحب کو آنکھوں میں اچھی طرح تول کر اُنھیں کچھ سخت سست سنا کر دُھتکار بتانے والا ہی تھا کہ یہی حاجی صاحب کے ہاتھوں میں پھلکیوں کا گیلا بیسن بھرے ہوئے آ گئے اور میر صاحب سے بولے۔ ''آپ ٹھہریئے، میں ابھی آپ کے لیے کچھ لایا۔''

حاجی صاحب تو باورچی خانے کے مالک ہی ہیں، ان کو کسی سے پوچھنے گچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس لیے وہ رشید کے مال کی بہت کشادہ دلی سے خیرات بانٹنے چلے تھے کہ رشید نے اُن سے مسکرا کر پوچھا ''کیوں بھئی، کیا ابھی سے تم نے افطار تیار کر لی؟''

وہ بولے۔ ''جی ہاں میاں! آج کل تو ایک بجے دن سے لگا نہ لگا دوں تو مغرب سے پہلے سے کچھ تیار کیوں کر ہو؟''

رشید کچھ اور کہنے والا ہی تھا کہ حاجی صاحب باورچی خانے میں گھس گئے، وہ ایک کارِ خیر کی نیت باندھ چکے تھے، رشید کی باتیں ان کی یکسوئی دماغ میں خلل انداز ہو رہی تھیں، رشید ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ چپ ہو رہا۔

میر صاحب کے چہرے نے اس درمیان میں کئی رنگ بدلے، پہلے تو اس پر التجا اور لجاجت

کی خشکی تھی، پھر اِس پر اُمید کی سُرخی دوڑی۔ حاجی صاحب سے رشید کی باتوں نے اس سُرخی کو ذرا مایوسی کی ہلکی زردی میں بدلا۔ مگر حاجی صاحب کے اندر چلے جانے نے اس زردی میں پھر ایک چمک سی پیدا کردی۔ اب وہ دروازے کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے، جس طرح کھونٹے سے بندھا ہوا جانور چارا لاتے ہوئے آدمی کو دیکھتا ہے۔ ان کے سوکھے نتھنے بار بار پھیلتے اور سمٹتے تھے۔ اُن کے جسم میں ایک خفیف سی تھرتھراہٹ تھی، اور اُن کی پیشانی پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے جھلک رہے تھے۔ ان کی اس حالت میں شاید اس ہلکی سی مسکراہٹ نے اضافہ کردیا تھا۔ جو رشید کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔

بارے حاجی صاحب ایک پلیٹ میں کچھ رکھے ہوئے اور اُسے اپنی میلی قمیص سے ڈھانکے ہوئے لے کر نکلے۔ میر صاحب ان کی طرف بڑھے، رشید نے بھیک دینے والے اور بھیک مانگنے والے دونوں کو سزا دینے کی غرض سے کہا۔ ”حاجی پلیٹ یہاں لاؤ“ حاجی صاحب کا بڑھا ہاتھ رُک گیا۔ میر صاحب کا پھیلا ہوا ہاتھ لٹک گیا۔ حاجی صاحب نے رشید کو گھبرا کر دیکھا۔ وہ رشید کا مال دریادلی سے خیرات کرنے میں آج پہلی دفعہ ٹوکے گئے تھے۔ میر صاحب نے رشید پر ایک خوف زدہ نظر ڈالی۔ ملتی ہوئی بھیک ہاتھ سے جاتی دکھائی دی، رشید پھر مسکرایا۔ اُسے آج ان غریبوں کے ستانے میں سرمایہ داروں کا سا مزا آرہا تھا۔ حاجی صاحب نے اس کے سامنے پلیٹ لاکر رکھ دی۔ دو سُہال، دو پوریاں، آٹھ پھلکیاں، دو سموسے، تھوڑا سا قیمہ اور مٹر اور چنے کی گھگھنیاں، پوری افطار کا سامان تھا۔

رشید کو اس سخاوت پر غصہ تو آیا، مگر وہ اُسے پی گیا، بولا ”ہوں! اچھا دے دیجیے!“

میر صاحب نے جلدی سے شیروانی کا دامن اُٹھا کر پھیلا دیا۔ حاجی صاحب نے پلیٹ اُٹھا کر کہا۔ ”نہیں میرا صاحب، اس طرح کہاں لے جایئے گا۔ دیکھئے میں کوئی برتن لاتا ہوں۔“

رشید کے قریب پلیٹ رکھ کر وہ اندر پھر چلے گئے۔ اور میر صاحب اس بھری پلیٹ کو اسی نظر سے دیکھنے لگے، جس نظر سے بھوکا کتّا قریب رکھے ہوئے چھیچھڑے کو دیکھتا ہے۔ رشید پھر مسکرا رہا تھا، میر صاحب اِس مسکراہٹ سے اس طرح گھبراتے اور اُلجھتے تھے کہ ان کے جسم میں بار بار ایک جھرجھری سی پیدا ہو جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے اب اُنھیں لرزہ آنے والا ہی ہے۔

بارے حاجی جی مٹی کی ایک بڑی سی رکابی لے کر پلٹے۔ اُنھوں نے بھری ہوئی پلیٹ

اس رکابی میں پلٹ دی۔ میر صاحب نے جلدی سے افطار اُٹھالی اور چل دیے۔''

رشید نے حاجی صاحب سے کہا۔ ''اگر شام تک اسی طرح کے دو چار فقیر آ گئے تو تم تو ہم لوگوں کی ساری افطار ہی ختم کر دو گے۔''

وہ چونک کر بولے۔ ''نہیں میاں! مگر میر صاحب پر مجھے کچھ ایسا رحم آیا کہ نہیں رہا گیا۔ پرایا دیس، پہاڑ کے سے دن، اور اس پر حضور روزے پر روزہ!''

رشید نے ہنس کر پوچھا۔ ''تم کو ان کی باتوں کا یقین آ گیا؟''

اُنھوں نے کہا۔ ''بھلا رمضان شریف میں بھی کوئی اس طرح جھوٹ بولے گا حضور۔''

رشید نے ان کے بھولے پن پر مسکرا کے کہا۔ ''اچھا تو میر صاحب ابھی زیادہ دُور نہیں گئے ہوں گے۔ تم ذرا ان کا پیچھا کر کے دیکھو کہ کیا کرتے ہیں۔''

حاجی صاحب، رشید کو اپنے چہرے مہرے سے حد درجہ بیوقوف سمجھتے ہوئے میر صاحب کے پیچھے لپکے۔ تھوڑی دیر بعد پلٹے۔ کچھ خفا، کچھ نادم۔

رشید نے پوچھا۔ ''کیوں بھئی کیا ہوا؟''

وہ کہنے لگے۔ ''میاں آپ سچ کہتے تھے۔ گلی کے موڑ پر جو نل ہے۔ اس کے پاس زمین پر اُکڑوں بیٹھے جلدی جلدی افطار اُڑا رہے تھے۔ مجھے جو دیکھا تو سب سمیٹ کر منہ میں بھر لیا۔ اُچھو ہوتے ہوتے بچا۔ جب پائپ سے چلّو لگا کر غٹ غٹ پانی پی لیا اور گلے میں پھنسا ہوا نوالہ حلق سے اُتر گیا تو میں نے پوچھا ''مرد خدا اس قدر جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ بولے ''ہونھ! جھوٹ بولا! جیسے روزے اور فاقے میں بڑا فرق ہی ہے؟'' میرا جی چاہا، ایک تھپڑ دوں۔ مگر وہ جلدی سے گلی کے اندر بھاگ کے بولا۔ ''ارے جاؤ بھی حاجی جی، اس طرح جھوٹ نہ بولتا تو تمھارے کنگک مالک کی افطار کیسے چکھنے کو ملتی!''

رشید بیساختہ ہنس پڑا۔ حاجی صاحب جھنجھلاتے ہوئے باورچی خانے میں چلے گئے۔

(کچھ ہنسی نہیں اور......۱۹۳۹ء)

سازِ دل کے چھوٹے بڑے پردے

گوپال اپنی کوٹھی کے برآمدے میں حد درجہ پریشان ٹہل رہا تھا۔ ابھی ابھی اسے یہ خبر ملی تھی کہ اس کے پتاجی منورنجن بابو نے اسی کو نہیں بلکہ اس کے سب سے بڑے دشمن مجید کو بھی ایک ساتھ گاؤں بلایا ہے۔ مجید کا خیال آتے ہی اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ پچیس برس کی دوستی اس پاجی نے خاک میں ملادی تھی۔ 'بائی جی' کا مقدمہ ہارنے پر اُس نے بھرے بازار میں منورنجن جی پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا تھا اور منورنجن جی وہ تھے جن کی سچائی کی دُور دُور تک دھوم تھی۔ لوگ کہتے اگر کوئی وشوناتھ کے مندر میں گنگا جل ہاتھ میں لے کر قسم کھائے تو اس پر تو شک ہوسکتا ہے، مگر منورنجن جی راہ چلتے کھلی سڑک پر کوئی بات کہہ دیں تو اس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ گھر والے تک، جن کے ہاں اپنی مرغی بھی دال برابر ہوتی ہے، ان کو دوسرا ہریش چندر سمجھتے تھے۔ دھرم، پاکیزگی اور سچائی کا اوتار۔ خود یہی مجید کہا کرتا تھا کہ ٹھیک دوپہر کے وقت چلچلاتی دھوپ میں اگر منورنجن جی کہہ دیں کہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے تو اپنی اور دوسروں کی بینائی پر شک کیا جاسکتا ہے مگر منورنجن جی کی بات جھٹلائی نہیں جاسکتی۔

مگر بائی جی کے مقدمے میں جب منورنجن جی اس کی بیٹی نرگس خاتون کی طرف سے گواہی دینے آئے تو اسی مجید نے انھیں جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ سب ہی جانتے تھے کہ بائی جی سے چودھری عشرت نے شادی کرلی تھی اور ان کی وارث بھی یہی ایک بیٹی نرگس خاتون تھی۔ چودھری صاحب کے مرنے پر ان کے دوسرے عزیزوں نے جائداد پر قبضہ کرنے کے لیے مقدمہ دائر کیا اور آس پاس کے کئی ویدوں، حکیموں، ڈاکٹروں سے بیان دلوادیا کہ چودھری صاحب کے کوئی اولاد ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ چودھری صاحب نے بائی جی سے اس وقت شادی کی ہوگی جب اُن کے ہاں کسی اور کا بچہ رہ چکا ہوگا۔ مجید انھیں دعویداروں کا وکیل تھا۔ اُس نے خود

بھی کچھ اس طرح کی افواہیں سن رکھی تھیں اور ڈاکٹروں اور حکیموں کے بیان کے بعد اسے یقین تھا کہ اس کے مؤکلوں کا دعویٰ صحیح ہے۔

منورنجن جی نے بیان دیا کہ نرگس خاتون چودھری صاحب ہی کی لڑکی ہیں۔ مجید نے جرح میں سوال کیا۔ ''آپ کو اس کا کیونکر علم ہے کہ یہ انہی کی لڑکی ہے؟''

منورنجن جی نے جواب دیا ''بالکل اسی طرح جس طرح مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ میرے دوست حمید صاحب کے بیٹے ہیں!'' اس پر عدالت میں وہ قہقہہ پڑا کہ مجید پانی پانی ہو گیا۔ منورنجن جی نے ہنسی رُکتے ہی زخم پر یوں نمک چھڑکا ''آپ کے والد نے کہا، آپ اُن کے لڑکے ہیں، میں نے شک نہ کیا، چودھری نے کہا نرگس خاتون اُن کی لڑکی ہے، میں نے ان کی بات بھی مان لی!''

مجید نے تلملا کر پوچھا ''اور یہ جو حکیم اور ڈاکٹر چودھری صاحب کے بارے میں کہتے ہیں؟''

منورنجن جی بولے ''میاں، اولاد بھگوان دیتا ہے، حکیم ڈاکٹر نہیں دیتے!''

غرض ایک منورنجن جی کی گواہی پر مقدمہ اُلٹ گیا اور بائی جی جیتیں اور مجید کے مؤکل ہار گئے۔ یہی وجہ تھی کہ بازاروں میں جب کچھ ہم سنوں نے مجید پر فقرے کسے تو اُس نے جھلا کر کہا ''منورنجن جی جھوٹ بولے اور بیچ کھیت جھوٹ بولے!'' خیریت ہوئی کہ گوپال اس دن کسی مقدمے کی پیروی میں باہر گیا ہوا تھا ورنہ اسی وقت خون خرابا ہو جاتا۔ اپنے باپ پر جھوٹ کا الزام کوئی سعید لڑکا نہیں برداشت کر سکتا۔ نہ کہ گوپال جو منورنجن جی کو حقیقتاً سچ کا پتلا سمجھتا تھا۔ جب وہ باہر سے پلٹا تو لگانے بجھانے والوں نے اس کے کانوں تک مجید کا قول اور بھی بڑھا چڑھا کر پہنچایا۔ اُس نے غصّے سے اپنی بوٹیاں نوچ لیں، لیکن مجید سے رُوبرو گفتگو کرنے کی کسی نے رائے نہ دی۔ پھر بھی اُس نے مجید سے ملنا جلنا بلکہ بات تک کرنا بھی چھوڑ دیا۔ سیاسی جماعتوں نے اس پھوٹ کو خوب ہوا دی اور یہ آگ اتنی بھڑکائی کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

اور آج منورنجن جی نے اسی دشمنِ جانی سے منہ در منہ بات چیت کے لیے گاؤں بلا بھیجا تھا۔ جی چاہتا کہ پتاجی کے حکم سے سرتابی کر لی جائے۔ اسے یقین تھا وہ مجید کی صورت دیکھتے ہی اپنے غصّے، اپنی نفرت پر قابو نہ رکھ سکے گا، لیکن منورنجن جی ہی کی تعلیم و تربیت کام آ گئی۔ وہ

اپنی موٹر میں بیٹھ کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اُس نے دیکھا مکان کے مردانے حصے کے بڑے ہال میں منورنجن جی حسب معمول آرام کرسی پر دراز پچوان پی رہے ہیں۔ مجید بھی موجود ہے اور برقعہ پہنے ہوئے بائی جی بھی۔ گوپال کے اندر داخل ہوتے ہی منورنجن جی نے کہا ''آدمیوں سے کہہ دو کوئی اِدھر نہ آنے پائے اور تم اندر کے دروازوں میں چٹکنی لگا کر یہاں آ کر بیٹھو۔''

جب وہ تعمیلِ حکم کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو منورنجن جی بولے ''اب کاہے کا پردہ ہے بائی جی؟ یہ دونوں تو تمھارے بچے ہی ہیں!'' اُس نے نقاب اُلٹ دی۔ گوپال اور مجید نے بچپن میں اسے نہ جانے کتنی بار دیکھا تھا۔ چودھری صاحب کی زندگی میں وہ جوہی کے کھلے ہوئے پھولوں جیسی تھی، مگر اس وقت وہ گلے سے اُترا ہوا ہار نظر آئی۔ کھچڑی بال، آنکھیں بے سرمہ، چہرے پر جھرّیاں، لبوں سے پان کی دھڑی غائب۔ دونوں جب اسے سلام کر کے سنبھل کر بیٹھے تو منورنجن جی بولے۔

''گوپال، تم اپنے بھائی سے بے وجہ خفا ہو۔ انھوں نے سچ ہی کہا کہ میں نے جھوٹ بولا۔'' گوپال اور مجید کے چہرے تمتما اُٹھے۔ انھوں نے مجید کی طرف پلٹ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''میں نے اس جھوٹ کا تمھارے ابا جان اور چودھری عشرت اپنے دوستوں سے وعدہ کیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تم لڑکوں کی آپس کی لڑائی کی وجہ سے اپنا وعدہ عمر بھر نہ نبھا سکا، مگر کیا کروں ان بائی جی کا بھی یہی اصرار ہے کہ میں وعدہ خلافی کروں اور اپنے دونوں دوستوں کی روحوں سے شرمندہ نہ بنوں۔''

بائی جی نے منہ سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ''آپ یقین رکھیں منو جی کہ روحیں اس وعدہ خلافی سے ناخوش نہ ہوں گی بلکہ خوشی سے باغ باغ ہو رہی ہوں گی۔''

منورنجن جی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''بھگوان ہی جانے! ہاں، تو سنو میاں مجید اور گوپال، ہم تینوں یعنی بھائی حمید، چودھری عشرت اور میں، ہم عمر تھے اور جگری دوست۔ ہم تینوں ناچ گانے کے بڑے شوقین تھے اور ان بائی جی کی ماں کے ہاں چھپ چھپ کر مجرا سننے برابر جایا کرتے تھے۔ یہ اس وقت تیرہ چودہ برس کی تھیں، مگر کتھک ڈانس میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں اور گلا نور کا پایا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک ان پر سچے دل سے عاشق تھا، لیکن ہماری شادیاں ہو چکی تھیں، بھائی حمید اور میرے ہاں اولادیں بھی ہو چکی تھیں۔ تم دونوں غالباً آٹھویں یا نویں میں

تھے اور وہیں کالج کے بورڈنگ میں رہتے تھے۔ بس ہم تینوں میں چودھری کے کوئی اولاد نہ تھی۔ حکیموں، ڈاکٹروں نے طرح طرح کے علاج دوا کے بعد بالاتفاق کہہ دیا تھا کہ ان کی قسمت میں اولاد نہیں، لیکن وہ اولاد کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ اتفاق کہ اسی زمانے میں ان کی بیگم کا انتقال ہوگیا۔ ہم تینوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ اس بے اولادے کو اولاد کیسے بہم پہنچائی جائے۔ رائے یہی ٹھہری کہ بائی جی سے حمید بھائی خفیہ نکاح کرلیں اور جیسے ہی ان کے ہاں ثمر کے آثار پیدا ہوں، وہ انھیں طلاق دے دیں اور چودھری ان سے نکاح کر کے کئی برس کے لیے کسی باہری دیس میں چلے جائیں اور ولادت کے برسوں بعد واپس آئیں۔ چنانچہ ان کی مرضی سے یہی کیا گیا۔"

مجید نے گھبرا کر پوچھا "تو نرگس خاتون میری......"

بائی جی نے آنکھ سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "ہاں، وہ تمھاری بہن ہے مجید میاں! اور قسم لے لو جو نکاح ہوتے ہوئے بھی چودھری صاحب نے میرے جسم کو انگلی چھوائی ہو۔"

منورنجن جی نے لمبی ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یا تو ہم تینوں میں اس طرح کی دوستی تھی کہ اپنی اپنی اولاد ایک دوسرے کو خوشی خوشی دے دیتے تھے یا آج ہمارے ہی بیٹوں میں وہ پھوٹ کہ ہماری ساری دوستی میں آگ لگانے کھڑے ہیں۔"

گوپال اور مجید دونوں نے جھپٹ کر منورنجن جی کے قدم پکڑ لیے۔ "ہمیں معاف کر دیجیے چچا جان، ہمیں چھما کر دیجیے پتا جی!" اور بائی جی اُن کی پشت پر اس طرح آ کر کھڑی ہوگئیں کہ اس کا آنچل دونوں جھکے ہوئے سروں پر سایہ کر رہا تھا۔ وہ بولی "اب ان کو دعا دے دیجیے منو جی!"

منورنجن جی نے دونوں کانپتے ہوئے ہاتھ بلند کر کے کہا "بھگوان ان کے دلوں کے پردے ہمارے ہی جیسے ساز سے بھر دے!"

(مسودہ، لکھنؤ، ۱۳؍اپریل ۱۹۶۳ء)

سُرخ لکیر

بے سوچ سمجھے اس نے کچھ لکھنا شروع کیا، لکھنے کے لیے سوچنا یا سوچنے کے لیے کچھ لکھنا شروع کیا۔

دراصل وہ کچھ لکھنا چاہتا تھا، مگر لکھتا تو کیا لکھتا۔ رومان! سو اُس کا اُس زمانے میں کیا پتہ؟ یہ تو وہ زمانہ تھا جس میں غیر متوازن دماغوں والی سوکھی جوانیاں تھیں، ایسی جن کی رگ رگ میں غلاظتیں بھری پڑی تھیں، جنہیں سڑے ہوئے سماج کو متعفن نالی کے رینگتے کیڑے اور بدبودار حوض کی چھوٹی بڑی کیڑیاں کہنا زیادہ درست تھا۔ نہ ان میں اُپج، نہ حوصلہ، نہ اُمنگ، نہ ولولہ نہ جوش، نہ بے ساختہ ہنسی، نہ بھرپور قہقہہ، ایسے میں رومان کہاں؟ پھر فنکار کیا کرے؟ حقیقت نگاری؟ تو وہ پورے اپنے ہی دُکھڑے روتا ہوا۔ کب تک سب کے سامنے ٹسوئے بہاتے بسورتے پھرے؟ اور اس میں ندرت ہی کہاں ہے۔ کس کو یہ دُکھ نہیں جھیلنا پڑ رہے ہیں۔ کون ہے جس کی خوشی کی بنیاد غم پر نہیں ہے؟ کون ہے جس کے قہقہوں کے خاکستر میں رنج و اندوہ کی چنگاریاں دَبی ہوئی نہیں سلگ رہی ہیں! پھر وہ کیا لکھے اور کیونکر لکھے؟

بیوی رات سے بیمار پڑی ہے۔ بیماری بھی کچھ عجیب سی ہے۔ سویرے سے بیچاری بستر سے اُٹھ نہیں پاتی، نہ تو کہیں درد بتاتی ہے، نہ کہیں کوئی زخم ہے، نہ کھانسی، نہ بخار، رات سوتے سوتے اس نے ہاتھ بڑھا کر شوہر کو جگایا تھا۔ ''مجھے رضائی اُڑھا دو'' اس نے بھی نیند میں کچھ خیال نہ کیا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ تھا۔ بیکاری سب سے تھکا دینے والا کام ہے۔ اس نے رضائی اُڑھا دی اور سو گیا۔ مگر صبح سے نہ تو منورما سے اُٹھا جاتا ہے، نہ بولا ہی جاتا ہے۔ جب بولنا چاہتی ہے لفظ حلق میں آ کر اٹک رہتے ہیں۔ جب اٹھنے کا ارادہ کرتی ہے، ارادہ صرف کروٹ

لے کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنی منور ما کو اس طرح ایک نا معلوم بیماری کی گہرائیوں میں ڈوبتا دیکھ کر گھر سے نکلا ڈاکٹر بلانے کی ہمت نہ پڑی۔ لمبی فیس کہاں سے دیتا، پڑوس والے حکیم صاحب کو لے آیا۔

انھوں نے بتایا رات میں سخت قلبی دَورہ پڑا تھا۔ پھر موٹی رضائی اوڑھ کر سوئے رہنے سے پسینہ بھی بہت آیا۔ اسی سے کمزوری ہے۔ انھوں نے تاکید کی مریضہ ذرا سی بھی حرکت نہ کرنے پائے، بس چت لیٹی رہے، کروٹ تک نہ لے اور حکم دیا کہ بار بار دودھ دیا جائے اور قوت کی دوائیں کھلائی جائیں نسخہ جو تجویز ہوا تھا وہ خاصا قیمتی تھا۔ سفوفِ ذہب، جواہر مہرہ اور خدا جانے کیا کیا۔ اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ وہ اس مہنگے نسخے کے دام دے سکے۔

وہ بیوی سے کہہ کے باہر آیا کہ "ذرا میں نسخہ بندھوانے کی فکر کروں" مگر وہ باہر ہی کمرے میں سوچنے لگا کہ نسخہ بندھے تو کیونکر بندھے۔ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو کل سوا بارہ آنے نکلے۔ اس نے پیسے مٹھی میں دَبا لیے اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

دفعتاً رُک کر اس نے دیوار پر آویزاں مرقع کو دیکھا، ایک آرٹسٹ ساتھی کا تحفہ تھا۔ بڑا اچھا فنکار تھا، رمیش نہ جانے کیسے کیسے شاہکار پیش کرتا وہ دنیا کے سامنے۔ لیکن آج کل وہ جیل میں سڑ رہا تھا۔ اس لیے وہ سیاست میں حصّہ لینے لگا تھا۔ "کیا ضرورت ہے فنکار کو سیاست پڑھنے کی" وہ بڑبڑایا لیکن وہ غیر شعوری طور پر اس تصویر پر آنکھیں گڑائے کھڑا رہا۔

عیسیٰ کی مقدس ماں گود میں شیر خوار عیسیٰ کو لیے پلنگ پر لیٹی تھی۔ اس کے سُتے ہوئے چہرے اور جھکی جھکی پلکوں سے بے پناہ تھکن کا اظہار ہو رہا تھا۔ جیسے عیسیٰ کی محترم ماں مدت العمر کسی زبردست بوجھ کو اُٹھائے چلتی رہی ہو، اور منزل پر پہنچ کر نڈھال ہو کر گر پڑی ہو اور بالکل اس کی بیوی کی طرح اس سے اُٹھا نہ جاتا ہو۔

اس نے چونک کر سوچا "مریم کو سہارا دینے والا کون ہوا؟" یہ حد درجہ پریشان کن سوال اس کے سر میں گونجنے لگا۔ اور وہ سر تھام کر میز کے قریب کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا اور اس سوال کے جتنے حل اس وقت تک دنیا کے مفکروں نے پیش کیے ہیں سب پر ایک ایک کر کے نظر ڈال گیا لیکن اس کا کوئی جواب نہ ملا کہ ضروریاتِ زندگی کے مہیا کرنے کے لیے سہارے کی ضرورت ہی کیوں باقی رکھی جائے؟

حکومت ہی کیوں نہ یہ بار اپنے ذمّے لے لے؟ پیدائش سے موت تک کسی شہری کو دستِ سوال پھیلانے کی ضرورت ہی کیوں پڑے؟ اس نے دفعتاً محسوس کیا وہ سیاست کی سرحد میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ سر کو جھٹکا دے کر بڑبڑایا۔ ''فنکار کو سیاست سے کیا سروکار؟'' اور اس نے قلم اور کاغذ گھسیٹ کر بے سمجھے بوجھے کچھ لکھنا شروع کیا۔ لکھنے کے لیے سوچنا یا سوچنے کے لیے لکھنا شروع کیا۔

دراصل وہ کچھ لکھنا چاہتا تھا، مگر لکھتا تو کیا لکھتا۔ رات سے اس کی منورما بیمار تھی، وہ بھی اس طرح کہ دل بیٹھا جا رہا ہے، نبضیں ڈوبتی جا رہی ہیں اور علاج کے لیے اس کے شوہر کی جیب میں صرف سوا بارہ آنے پیسے!

اس نے مٹھی کھول دی، ہتھیلی پسیج گئی تھی اور پیسے بھیگ گئے تھے، اسے بڑی گھن معلوم ہوئی۔ یہ پیسے کن کن ہاتھوں سے مس ہوتے ہیں۔ گندے فقیروں کے ہاتھوں سے، لنگڑے لولوں کے ہاتھوں سے، مبروصوں کوڑھیوں کے ہاتھوں سے اور اُن کے ہاتھوں سے جو انسانی غلاظت کو صاف کرتے پھرتے ہیں، برہمنوں کی نسلی برتری وراثتاً اس کے خون میں رچی ہوئی تھی۔ وہ آخری خیال پر سارے جسم پر سے گھنگھنا اُٹھا اور میز پر پیسے گراتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا کہ ہاتھ دھو ڈالے، مگر... مگر کھڑے ہوتے ہی اسے خیال آیا کہ یہی پیسے حسین و معطر جیبوں میں بھی کھنکتے ہیں۔ انھیں پیسوں سے رومانی تحائف خریدے جاتے ہیں، انھیں پیسوں سے اُونچے اُونچے شیش محل کھڑے کیے جاتے ہیں، انھیں پیسوں سے نیکی و بدی خریدی جاتی ہے۔ انھیں پیسوں سے ضمیر و جسم کا سودا ہوتا ہے، انھیں پیسوں کو ٹاٹا برلا کہتے ہیں، انھیں پیسوں کا ایک نام امریکہ ہے جو بین الاقوامی تجارت کے پلڑوں کو اُونچا نیچا کرتا رہتا ہے، اور... اور انھیں پیسوں کی دوا ملتی ہے، انسانی زندگی کو موت کے منہ سے چھین لانے والی دوا۔ اس کی اپنی منورما کی دوا، جو رات سے نڈھال پڑی اسے نرگسی آنکھوں سے تک رہی ہے۔ اور بے زبان نگاہوں سے کہہ رہی ہے کہ ''مجھے بچالو، مجھے موت کے فولادی ہاتھوں سے چھڑالو۔ تم توانا ہو، تندرست ہو، قوی ہو، مرد ہو، کاٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو بستیوں کو اور بہالاؤ جوئے شیر کو کہ میں تمھارے سر میں تیل ڈالتی ہوں اور سر کے نیچے چاندی جیسے بانہوں کے تکیے لگا دیتی ہوں! میں ٹھنڈی گھنی چھاؤں ہوں، تم تھکے ماندے مسافر! چھاؤں سرک گئی تو بیٹھو گے کہاں؟ جھلتی دُھوپ میں؟''

اس کے دل میں ہوکیں اُٹھنے لگیں۔ وہ جلتی آنکھیں لیے میز پر جھکا۔ وہ سوا بارہ آنے پیسوں پر منہ رکھ کر خشک سسکیاں لینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دھیرے دھیرے سر اُٹھایا اور قلم اُٹھا کر اور کاغذ کھینچ کر بے سوچے سمجھے کچھ لکھنا شروع کیا۔ لکھنا کیا شروع کیا، لکھنے کے لیے سوچنا، سوچنے کے لیے لکھنا شروع کیا۔

اس کے قلم نے لکھا: ''موہن غریب ہے'' لکھتے ہی اس نے فوراً جملے کو قلم زد کر دیا۔ وہ اس کٹے ہوئے جملے کو خوفزدہ نظروں سے تکنے لگا۔ نہ جانے کیوں اُسے اس جملے سے بے انتہا خوف معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس نے بے سوچے سمجھے مداری کی پٹاری کھول دی ہو اور اس میں سے پھپکاریاں مارتے ہوئے سانپ نکل پڑے ہوں۔ وہ جھجک کر پیچھے ہٹا۔ اُس نے دیدے نکال کر اس سادہ سے فقرے کو پڑھا ''موہن غریب ہے'' اس اکیلے موہن میں اسے بھوکے ننگوں کا ایک کارواں سر و پا برہنہ چلتا نظر آ رہا تھا، جس کا ہر مسافر کسی گرتی ہوئی دیوار کی طرح آگے کو جھکتا جا رہا تھا... جھکتا جا رہا تھا۔ زمین پر گر پڑنے کے لیے، گر کے ڈھیر ہو جانے کے لیے، خون اور لاشوں کا ڈھیر، جو سڑ گل کر ایک دن زمین کی کھاد بن جائے!

''موہن غریب ہے'' اس نے قلم زد جملے کو ایک بار پھر دیکھا اور اب کے اسے محسوس ہوا، جیسے اس کٹے ہوئے جملے کے پیچھے اس کی بیمار منورما جاں کنی کے عالم میں پڑی اُسے حسرت بھری نظروں سے تک رہی ہے۔

اس نے گھبرا کر 'غریب' کے لفظوں کو کئی دفعہ کاٹا... متوازی اور مستقیم خطوط کھینچ کر کاٹا، اوپر سے کاٹا نیچے سے کاٹا، اس طرح کاٹا کہ چار خانے سے بن گئے۔ چھوٹی بڑی بہت سی صلیبیں! مگر اسے محسوس ہوا کہ 'غریب' مصلوب ہونے پر اور بھی اُجاگر ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر جلدی جلدی اپنے لمبے ناخنوں سے اس لفظ کو کھرچنا شروع کیا۔ وہ 'غریب' کو کھرچتا رہا، کھرچتا رہا، یہاں تک کہ اس جگہ کا کاغذ اُڑ گیا۔ اور اس کاغذ میں آنکھ سی بن گئی، مفلسی سے بے نور، تکلیف لے کر اپنی بھوک سے بلبلاتی، سماجی ظلم سے فریاد کرتی آنکھ، اس کی منورما کی طرح یاس سے بھری آنکھ!

اسے اچانک دوا کا خیال آیا اور وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سوا بارہ آنے پیسے سمیٹ لیے۔ ان کو پھر سے گنا... موہوم سی اُمید تھی شاید رقم بڑھ گئی ہو، مگر پیسے اتنے ہی نکلے، پورے سوا

بارہ آنے! اس نے جھنجھلا کر انھیں مٹھی میں کس کے بند کر لیا اور بھچی ہوئی مٹھی کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

ابھی وہ دو قدم بھی نہ چلا تھا کہ دھماکے کی آواز آئی۔ جیسے جڑ سے کٹی ہوئی کچی دیوار برسات میں ڈھے جائے۔ اس نے لپک کر اندر دیکھا۔ اس کی بیوی بستر سے الگ زمین پر پڑی ہے اور اس کے منہ سے خون کی لکیر نکل کر زمین پر کچھ لکھ رہی ہے۔ اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کی بیوی نے قلم زد فقرے 'موہن غریب ہے' کے نیچے سُرخ لکیر کھینچ دی ہے!

(ماہنامہ ایشیا، جولائی ۱۹۳۹ء)

سیلاب کی راتیں

پہلی رات: آسمان کا چہرہ کسی نہائی دھوئی کشمیری دوشیزہ کے رُخِ زیبا کی طرح صاف تھا۔ نہ بادلوں کے آنچلوں کے گھونگھٹ کے چمکتے آویزے اور نہ دھوپ ہی میں تاش بادلے کی کیفیت۔ ایسا محسوس ہوتا کہ نہ تو برسات کا موسم تھا، اور نہ ابھی تین دن پہلے لکھنؤ میں دھواں دھار بارش نے پانچ سو گھر زمین دوز کر دیئے تھے۔ حضرت گنج کی وہی گہما گہمی تھی۔ امین آباد میں وہی آدمیوں کی ریل پیل، چوک میں وہی لٹی ہوئی شام اودھ کی خوشبوئیں اور ڈالی گنج میں وہی اناج کو اور بھی مہنگا کرنے کے مشورے۔ چھوٹے دُوکان دار دیوالی کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ لیّا بھونی جا رہی تھی، چوڑا کوٹا جا رہا تھا۔ کھلونے بنائے جا رہے تھے، نئے نئے برتن دُکانوں پر سجائے جا رہے تھے اور لڑکوں نے ابھی سے پٹاخے داغنا اور پھلجھڑیاں شروع کر دیا تھا۔

گومتی کے تیور البتہ بدلے ہوئے تھے، اس کا دامن پھیلتا جاتا تھا، اس کی غراہٹ میں دہشت انگیزی آ گئی تھی۔ اس کے سینے پر درخت، چھپر، کھاٹ، لاشیں، بیل، گائیں، بہتی دکھائی دینے لگی تھیں۔ مگر ڈالی گنج والوں کے لیے گومتی کے یہ غرے ڈبے نئے نہ تھے، بہیا ان کی جانی پہچانی چیز تھی، دریا کنارے کے سو پچاس گھر، آس پاس کے چند گاؤں ہر سال ہی گرتے بہتے تھے۔ وہ ایسا مناظر کے عادی تھے۔ نہ انھیں اس میں کوئی نئی بات دکھائی دیتی تھی اور نہ کوئی نیا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔

رام بھروسے ہر چیز سے بے خبر اور بے پروا لکشمی دیوی کی مورتی بنانے میں مشغول تھا۔ اس نے سیٹھ رام داس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اب کی دیوالی پر لکشمی دیوی کی ایسی مورتی انھیں بنا کر دے گا جیسی نہ آج تک کسی سنگ تراش نے بنائی ہوگی، نہ کسی نجار نے اور نہ کسی سادہ

کارنے۔ سیٹھ جی کے گھر میں لکشمی کی بہت سی مورتیاں تھیں۔ سونے چاندی کی بھی، دوسری دھاتوں کی بھی، صندل کی بھی، آبنوس کی بھی، سنگِ مرمر کی بھی اور سنگِ خام کی بھی۔ لیکن رام بھروسے کا دعویٰ تھا کہ وہ مٹّی کی ایسی مورتی بنا دے گا کہ ان میں سے ہر ایک اس کے سامنے ماند پڑ جائے گی۔

رام بھروسے لکھنؤ کے کمہاروں کے اس خاندان سے تھا، جس کے بنائے ہوئے کھلونے ہندوستان ہی نہیں، غیر ملکوں میں بھی ڈرائنگ روم کی زیبائش کا سامان ہیں۔ فن تو اسے اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملا تھا، لیکن قدرت نے بھی اسے ایجاد و اختراع کا مادہ دینے میں بخل سے کام نہ لیا تھا۔ اس نے خاندانی روایت کے خلاف ہائی اسکول تک تعلیم بھی حاصل کی تھی اور وہ اپنے گھر سے قریب والے آرٹ کالج میں دوسرے تیسرے دن جا کر مجسمہ سازی کے بہترین نمونے بھی دیکھتا رہتا تھا۔ وہ نئے سانچے بناتا، کھلونوں کی مٹّی میں نئے نئے مسالے ملا کر تجربے کرتا، آنوے سے نکالنے کے بعد کھلونوں، مورتیوں کو ریتی سے، چاکو سے گھس کر کھرچ کر، ان کا حسن بڑھاتا، رنگ روغن کے ذریعے، ان کے چہروں سے طرح طرح کے جذبات ظاہر کرتا، اور ایک سچے فنکار کی طرح اپنی ہر تخلیق کو بہتر سے بہتر بنانے کی دھن میں لگا رہتا تھا۔

خوش قسمتی سے اُسے منجھو جیسی بیوی مل گئی تھی۔ لمبان میں تو وہ میاں کے برابر ہی تھی، یعنی پانچ فٹ چار اِنچ، مگر چوڑان میں حمام کی دیوار اور چھپکلی کی نسبت تھی۔ اسی لیے رام بھروسے کے معاملے میں اس کا مادرانہ انداز نہ انوکھا معلوم ہوتا، نہ غیر فطری۔ اپنی چھوٹی چھوٹی چمکتی آنکھوں سے، وہ بھروسے کو بھی اسی محافظانہ نظر سے دیکھتی جس سے وہ اپنی تیرہ سالہ بیٹی مالتی، اور اپنے پانچ برس کے بیٹے منو کو دیکھتی تھی۔ منجھو نے ابتدا ہی سے میاں کی فنکاری سے تجارتی نفع اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ یہ اسی کے حسن انتظام کا نتیجہ تھا کہ گلی کے اندر کی ایک در کی دُکان آج ایک بڑے کارخانے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس میں بھروسے کے دو مددگار کمہار اور پانچ مزدور کام کرتے تھے، اپنا ایک پختہ بجلی لگا ہوا مکان بن گیا تھا اور دُور دراز کے ملکوں سے براہِ راست 'بھروسے ٹوائیز' کے نام آرڈر آتے تھے۔

رام بھروسے آمد و خرچ سے بے پروا، بچوں کی پرورش و پرداخت سے بے پروا منجھو کی

محبت اور مامتا سے بے پروا، اپنے کھلونوں اور مورتیوں کے بنانے میں لگا رہتا۔ فن کا بھگت ہو کہ بھگوان کا، دونوں کی استغراق کی حالت یکساں ہوتی ہے۔ شاید اس لیے کہ دونوں کی منزل ایک ہی ہے، حسن مجرد کی تلاش!

چنانچہ آج بھی رام بھروسے اپنے گھر کے اندر والے دالان میں، تخت پر بیٹھا تین مورتیوں کی تیاری میں محو تھا۔ سیٹھ جی کی لکشمی مکمل ہو چکی تھی۔ آنوے سے نکالنے کے بعد چاکوؤں، ریتیوں اور ریگ مال سے تراش اور گھس کر اور اس کی رنگنے اور روغن چڑھانے میں پوری فنکاری سے کام لے کر، بھروسے نے اس مٹی کے مجسمے کو ایسا مقدس حسن دے دیا تھا اور جود و بخشش و کرم کا ایسا مجموعہ بنا دیا تھا کہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اب دو اور مجسموں کے بنانے میں مشغول تھا۔ ان میں سے ایک نوجوان حسینہ۔ بوٹی بوٹی سے جوانی پھوٹتی ہوئی، اور رگ رگ سے جنسی کشش ٹپکتی ہوئی۔ نظر میں رس، مسکراہٹ میں لگاوٹ اور انداز میں دل فریبی بھری ہوئی۔ بھروسے نے اس کا نام رکھا تھا 'انوکھی ناگن' دوسری مورتی تھی 'بانکے بہادر' کی۔ ایک راجپوتی ڈھنگ کا چھیل چھبیلا جوان۔ مضبوط ٹانگیں، پتلی کمر، چوڑا سینہ آنکھوں اور ہونٹوں کے وہ تیور کہ محسوس ہوتا کہ اگر اس میں جان ہوتی تو یہ شیر کو للکارتا اور ارجن و بھیم دیکھ لیتے تو انھیں بھی اس پر پیار آتا۔

بھروسے 'انوکھی ناگن' کو ہاتھ سے سنبھالے اُسے آہستہ آہستہ گھماتا جا رہا تھا، اور گنگناتا جا رہا تھا۔ ''کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں!''

کہ اچانک گھر کا دروازہ دھڑ سے کھلا، اور منجھو ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

اس نے صحن میں قدم رکھتے ہی چیخ کر پوچھا ''ارے او کھلونوں سے بہلنے والے! کچھ تمھیں گھر اور بچوں کی بھی پھکر (فکر) ہے؟''

بھروسے نے اپنے اس محبوب تمبا کو پنڈے پر اچٹتی سی نظر ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا ''اور یہ کھلونے کس لیے بنا رہا ہوں؟''

وہ سر پر ہاتھ مار کر بولی ''ہائے دیا! میں تم کو کیسے بجھاؤں! تم کو ٹھٹھول کی سوجھی ہے اور پانی محلے میں گھستا چلا آ رہا ہے، لوگ کہتے ہیں ایسی بہیا آنے والی ہے کہ اس محلے کا کچھ نہ بچے گا، سب کچھ ڈوب کر بہہ جائے گا...''

بھروسے بڑے وثوق سے بولا ''ارے یونہی بے پر کی اُڑاتے ہیں پاجی! چاہتے ہیں لوگ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگ جائیں۔ پھر گنڈوں، چوروں کی بن آئے...''

منجھو نے کہا ''تم کو چاہے یکین (یقین) نہ آئے، پر آدھے سے جیادہ (زیادہ) لوگ محلے سے بھاگ چکے ہیں۔ پل کے اس پار ناؤ چل رہی ہے!''

رام بھروسے نے دلاسا دیتے ہوئے کہا ''اچھا، تو تم بھی بچوں کو لے کر، اپنے کاکا کے ہاں چوک چلی جاؤ۔ میں کل تک یہاں کا پوری طرح انتجام (انتظام) کر کے وہیں آجاؤں گا۔''

منجھو کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی ''تو دیکھو، سب چیزیں سنبھال کر رکھ دینا اور کل ضرور چلے آنا...''

رام بھروسے نے پوچھا ''ارے دونوں بچے کہاں ہیں؟''

منجھو نے کہا ''میں نے انھیں رنبھیر، پان والے کے ساتھ پہلے ہی سے لوہے والے پل پر بھیج دیا ہے۔''

رام بھروسے بولا۔ ''یہ تو تم نے اچھا ہی کیا۔ پر اب تم بھی جلدی کرو۔ شام ہونے کو آئی، بچے گھبراتے ہوں گے!''

منجھو جھپٹتی ہوئی کمرے میں گئی، اس نے کچھ زیورات، کچھ روپے کمبلوں میں سے نکالے اور ان کی پوٹلی بنا کر، اسے ہاتھ میں لیے تیز تیز گھر سے باہر چلی۔ مگر دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ پھر پلٹی، اس نے کنجیوں کا بڑا سا گچھا بھروسے کی طرف پھینکا ''دیکھو سارے بکسوں کے تالے دیکھ لینا، باہری دروازے پر با علی گڑھ والا لگا دینا... اور دروازے سے نکلتی نکلتی بولی ''اور کل جرور چلے آنا!''

بھروسے مسکرایا۔ اس نے 'انوکھی ناگن' کو اُٹھا لیا۔ اسے گھما گھما کر ہر رُخ سے دیکھا۔ خود ہی بول اٹھا ''بڑی رنگیلی چھبیلی ہے رے!'' اور اس نے اپنی انا گن کو لکشمی دیوی کے چرنوں میں لٹا کر بانکے بہادر کو اُٹھا لیا، اور اسے چھیلنے، تراشنے اور وہی مصرعہ گنگنانے لگا۔ ''کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں!'' وہ یونہی منہمک تھا کہ اُسے محسوس ہوا جیسے اندھیرا ہو رہا ہے، وہ گھبرا کر صحن میں نکل آیا۔ سورج نے سیاہی مائل چادرے میں منہ چھپا لیا تھا۔ فضا میں اُڑتی ہوئی چڑیاں اپنے اپنے بسیروں کی طرف چلی جا رہی تھیں۔ محلے کا شور، جس سے ہر وقت گھر

گونجتا رہتا تھا، بالکل سنائی نہ دیتا تھا۔ اندھیری راتوں کے بارہ بجے کے بعد والے، ٹٹ سناٹے کی کیفیت تھی۔ نہ کسی آدمی ہی کی آواز آتی تھی اور نہ ان کتوں کی جنھوں نے کئی راتوں سے رو رو کر کان پکا دیے تھے۔ بس ایک خاص قسم کی آواز تھی جو سرسراہٹ سے ملتی جلتی، کچھ چھپ چھپ میں بدل جاتی تھی۔

رام بھروسے کو وحشت سی ہونے لگی۔ اس نے گھر کے کونے کونے پر نظر ڈالی۔ ہمیشہ کا ہنستا ہوا گھر اس وقت بھیانک محسوس ہونے لگا۔ اس نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ اب بھی نہائی دھوئی دوشیزہ کی طرح صاف تھا۔ البتہ صباحت پر ملاحت غالب تھی۔ اور پچھم دکن کے کونوں پر دو تارے جھلمل جھلمل کرنے لگے تھے۔ ان کے درمیان سے قازوں کی ایک قطار اُڑتی چلی آ رہی تھی۔ ان کے سپید پروں پر ڈوبتے سورج کی کوئی تھکی کرن ایک لمحے کے لیے دم لینے کی غرض سے بسیرا لیتی اور وہ افشاں بھری مانگ کی طرح چمک اٹھتے۔

بھروسے اس حسین منظر کے نظارے میں محو تھا کہ دفعتاً کوئی ٹھنڈی سی بھیگی ہوئی چیز اس کے پاؤں سے سرسراتی ہوئی گزرنے لگی۔ اس نے غیر ارادی طور پر پاؤں جھٹک دیا، تو ایک سانپ کا بچہ بھاگتا دکھائی دیا۔ وہ چیخ کر ڈنڈا اُٹھانے دالان کی طرف لپکا تو سنپولیا آنوے کے پاس والے ٹوٹے کھلونوں کے انبار میں گھس کر غائب ہو گیا۔

رام بھروسے سارے جسم سے کانپنے لگا۔ اس اکیلے مکان میں سانپ کے کاٹنے اور اس کے زہر کے اثر سے ایک بھیانک موت سے دوچار ہونے کا پورا نقشہ اس کے ذہن میں ایک لمحے میں کھینچ گیا۔ وہ پسینے میں نہا گیا، اسے یقین آ گیا سنپولے نے ضرور کاٹا ہوگا۔ اس نے پاؤں کو آہستہ آہستہ ہاتھ ٹٹولا۔ کہیں کسی خراش کی تکلیف نہیں محسوس ہوئی۔ اب اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے بڑے غور سے دیکھا۔ دانت کا کوئی نشان نہ دکھائی دیا۔ اپنی نظر پر یقین نہ آیا۔ چاہا کہ بجلی جلا کر اس کی تیز روشنی میں اسے پھر دیکھے، سوئچ کا کھٹکا اُٹھایا۔ گرایا، مگر روشنی نہ ہوئی۔ اندھیارے کا راج بڑھتا ہی گیا۔ بھروسے کا ڈر بھی بڑھتا ہی گیا۔ مگر اسی حالت میں یاد آیا، منجھو ہمیشہ دیا سلائی کی ڈبیاں اور موم بتّی کے پیکٹ ایسے ہی موقعوں کے لیے دالان کے طاق پر رکھے رہتی تھی۔ وہاں ہاتھ ڈالا، دونوں چیزیں مل گئیں۔ دھڑکتا دل ٹھہر گیا۔

بتّی جلاتے ہی، اس نے اپنے پاؤں کو 'انوکھی ناگن' کی مورتی کی طرح گھما گھما کر

دیکھا۔ مور کے پاؤں تھے۔ کالے کالے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے، مٹی، رنگ اور روغن سے داغ دار۔ یہ بدصورت، مگر سالم پاؤں، بھروسے کو اس وقت حسین ترین محسوس ہوئے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔

معاً خیال آیا، بجلی کیوں نہیں جلی۔ مین دیکھوں، فیوز تو نہیں ہو گیا۔ سوئچ کو آف کر کے 'مین' کے ڈھکنے کھولے۔ دونوں تار اپنی جگہ پر تھے۔ دروازہ کھول کر باہر گلی میں جھانکا۔ وہاں بھی کالی مائی کی سواری اُتری تھی۔ بجلی کے کھمبے کالے لبادے اوڑھے منہ چھپائے کھڑے تھے۔ اور بڑی دُور سے بہت سے لوگوں کے چیخنے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ ''ہائے بجلی بھی چلی گئی! اندھیرے میں پانی اور بھی ڈراؤنا ہو گیا۔'' رام بھروسے پھر کانپنے لگا۔ اپنا وہی گھر جو ساری خوشیوں کا مرکز تھا۔ جہاں آ کر ساری آفتوں اور بلاؤں سے پناہ ملتی تھی، اس وقت اکیلا ہونے، اندھیرا ہونے سے سانپوں، بچھوؤں سے بھرا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بے تحاشہ جھپٹتا ہوا باہر نکل پڑا، اس نے دروازے کے پٹ بھی اچھی طرح نہیں بھیڑے اور گلی کے سرے پر نظر جمائے تیز تیز چلنے لگا۔ دفعتاً اس کا پاؤں چھپ سے پانی میں پڑا۔ اس نے جھجک کر ہلکی سی چھلانگ ماری۔ اب کے صرف تلوا ہی نہیں بھیگا، پورا پاؤں پانی میں ڈوب گیا۔ اس نے دھوتی سمیٹ کر گھٹنوں سے اُوپر اُٹھالی۔ گلی کے سرے تک پہنچا، اب وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں تھا۔ گلی سڑک سے بلندی پر تھی، اس لیے اس نے نیچے اُترنے سے پہلے سڑک پر نظر ڈالی۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ نہ آدمی، نہ کوئی جانور نظر آیا۔ عجیب بے بسی سی محسوس ہوئی۔ کس سے پوچھے۔ کس سے مدد مانگے، کس کا سہارا لے، کہاں جائے کہ کوئی جانا پہچانا اپنے محلے والا ملے! سامنے مٹھومل کا سہ منزلہ مکان تھا۔ وہ اپنی کنجوسی اور اپنے سود بٹّے کے لیے مشہور تھا۔ ایک روپیہ قرض دے کر سو روپے وصول کرنا، اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ بھروسے کو اس کے نام سے چڑ تھی۔ مگر اس وقت وہی دیوتا محسوس ہوا۔ اس نے بے اختیار زور زور سے پکارنا شروع کیا: ''سیٹھ جی! سیٹھ جی!'' تیسری منزل کی چھت سے مگھو چوکیدار نے جھانک کر کہا ''ارے کون ہے؟ رام بھروسے کاکا؟''

بھروسے نے کہا ''ہاں بھیا، میں ہی ہوں!''

وہ بولا ''ارے کاکا، تم اس پار نہیں گئے؟ اب تو پل تک پہنچنے میں ہاتھی کا ڈباؤ ہے! نہ

کہیں نکلنے کا راستہ ہے، نہ بھاگنے کی جگہ!'' بھروسے نے بڑی مایوسی سے پوچھا ''تو پھر کیا کروں بھیا! اکیلا گھر تو کاٹے کھاتا ہے!''

وہ بولا ''اب ہو ہی کیا سکتا ہے کاکا؟ بس اپنے گھر کی چھت پر جا کر کسی طرح رات کاٹو، صبح کوئی بندوبست ہو سکا تو تمھیں نکلوانے کی پھکر (فکر) کروں گا۔''

بھروسے پلٹا۔ اب گھر پھر جائے پناہ بنا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی دالان میں جلتی شمع نے ڈھارس کا دیا دل جلا دیا۔ اس نے اندر آ کر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ وہ شمع کے پاس جا کر تخت پر پاؤں لٹکا کر ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح ڈھیلا سا بیٹھ گیا۔ پورا انداز کہتا تھا کہ اب اس میں کسی مصیبت کے مقابلے کی نہ طاقت ہے، نہ ہمت۔ وہ یونہی مایوسی کا مجسمہ بنا بیٹھا تھا کہ ہوا کے ایک جھونکے سے شمع کی لو لہرائی اور بانکے بہادر کا چہرہ چمکا۔ رام بھروسے کو محسوس ہوا جیسے وہ للکار رہا ہے ''واہ سارا دم خم پر مجھ جیسا بانکا جوان بنانے چلے تھے؟'' اور رام بھروسے ''دھت تری کی!'' کہتا ہوا اٹھا اور ایک ہاتھ میں ڈنڈا اور ایک میں کئی موم بتیاں اور دیا سلامی کی ڈبیاں لے کر زینہ سے ہوتا ہوا چھت پر چڑھ گیا۔ مکان کی چھت تین طرف سے کھلی ہوئی تھی۔ بچوں کے گرنے سے بچانے کے لیے صرف دو فٹ اونچی چھن جھری دار منڈیریں بنا دی گئی تھیں۔ چوتھی طرف زینے سے ملے ہوئے حصّے پر ٹین کا سائبان پڑا ہوا تھا۔ رام بھروسے نے اسی ٹین کے نیچے ایک کونے میں شمع روشن کر کے رکھ دی۔ اور نیچے اُترتے ہوئے دو شمعیں اور جلائیں۔ ایک تو وہیں زینے پر رکھ دی، دوسری ہاتھ میں لیے وہ کمرے میں گھس گیا۔ وہاں کئی چھوٹے بڑے بکس اور صندوق رکھے تھے۔ منجھو نے ان میں بڑے بڑے قفل ڈال رکھے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے ان سب کو چھت پر پہنچا آیا۔ پھر کچھ خاص خاص کھلونے بھی ڈھو ڈالے۔ سب سے پہلے تو لکشمی دیوی کی سواری نکلی، پھر 'انوکھی ناگن' اور 'بانکے بہادر' کو بھی چھت کی سیر کرائی گئی۔

اتنی مسلسل محنت کے بعد، بھوک بھی لگی اور پیاس بھی۔ صحن کا پائپ کھول کر دو چلو منہ پر پانی ڈالا ہی تھا کہ شیں شیں کی آواز ہوئی اور پانی بند ہو گیا۔ ''ہے بھگوان، یہ کیا تیری لیلا ہے کہ چاروں طرف پانی، اور پینے کا پانی بند!'' وہ دل میں بڑبڑایا۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ گھڑونچی پر ایک گھڑا اور ایک گگرا رکھا دکھائی دیا۔ دونوں میں پانی موجود تھا۔ بھروسے نے گھڑا

جھکا کر اوک ہی سے پانی پی لیا۔ منجھو گھر میں ہوتی تو ڈانٹ پڑتی۔ وہ یہ سوچ کر مسکرایا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو خوشی بھی محسوس ہوئی کہ وہ بچوں کے ساتھ اس مصیبت سے بچ کر نکل گئی۔

رسوئی گھر میں کچھ اور کھانے کو تو نہ ملا، مگر ایک باسی روٹی اور بچوں کے پینے کا آدھ سیر دودھ اُبالا ہوا رکھا دکھائی دیا۔ اس نے روٹی کا ملیدہ بنایا اور اسے دودھ میں ڈال کر شکر ملائی۔ اور خوب شکم سیر ہو کر کھا ڈالا۔ لیکن اتنی دیر میں گلی کا پانی اتنا بلند ہو گیا تھا کہ دروازے کی دہلیز سے ٹکرانے لگا تھا۔ اس کو چھپاکے کی آواز صاف صاف اندر سنائی دیتی تھی۔ بھروسے نے جھانک کر باہر دیکھا۔ ایک لہر نے آگے بڑھ کر اس کے قدم لینا چاہے۔ بھروسے کو یہ چاپلوسی پسند نہ آئی۔ اس نے جلدی سے پاؤں کھینچ کر دروازہ بند کر لیا اور بند دروازے سے پیٹھ لگائے اپنی سانس درست کرتا اور سوچتا رہا کہ اس دشمن سے گھر کو کس طرح بچایا جائے۔ پھر وہ سارے گمے اٹھا لیا جو بکسوں کے نیچے منجھو نے رکھ چھوڑے تھے۔ اور کھلونا بنانے والی گیلی مٹی کی ٹوکری لا کر اس نے دروازے کو چننا شروع کر دیا۔ ایک گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد آدھے سے زیادہ دروازہ نئی دیوار سے چھپ گیا۔ مگر اب وہ تھک کر چور ہو گیا تھا اور دالان کی بتی بھی جھلملانے لگی تھی۔ بھروسے نے اطمینان کی جگہ مایوسی کی ایک نظر گھر پر ڈالی، موم بتیاں اور دِیا سلائی کی ڈبیاں ٹ جیب میں ڈالیں، منو کا کھٹولا اٹھایا اور زینے کی بتی بجھاتا ہوا اُوپر پہنچا۔ وہاں بتی اب بھی جل رہی تھی اور ہوا میں ٹھنڈک سی تھی۔ جسمانی محنت سے تھکے ہوئے بھروسے کو یہ خنکی بہت پسند آئی۔ اس نے منو کا کھٹولا ٹین ہی کے نیچے بچھایا اور وہ اس پر کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا چند منٹ میں وہ غافل سو گیا۔

کوئی دو گھنٹے بعد وہ ایک دھماکے اور چیخ کی آواز سن کر جاگا۔ شمع گل ہو چکی تھی اور ہر طرف اندھیرا ہی تھا۔ ایک لمحہ تک تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس نئے دیس میں، کس نئے مقام پر پہنچ گیا ہے۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ جب اسے اپنے بکس دُھندلے نظر آئے، تو اُسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے جلدی سے ایک نئی شمع روشن کی اور اسے لیے ہوئے وہ پوری چھت پر گھوم آیا۔ تین طرف تو اس کی نیچی نیچی منڈیریں تھیں۔ ان میں سے دو جانب تو گلی تھی، جہاں پانی چھپ چھپ کرتا موجود تھا، تیسری طرف خود اس کا صحن تھا، چوتھی طرف جدھر ٹین تھا، دیوار ذرا زیادہ اونچی تھی۔ ادھر تھا ملیا ترکاری والی کا مکان۔ اس نے آہٹ لی۔ اسی طرف سے کسی کے

سسکنے اور رونے کی آواز آ رہی تھی۔ بھروسے نے ’مُلیا! مُلیا‘ پکارنا شروع کیا۔

کسی عورت کی گھٹی گھٹی آواز آئی ’’کاکا میں ہوں۔‘‘ یہ ہریا تھی۔ ملیا کی بیٹی۔ وہ بچپن ہی سے بیاہ دی گئی تھی۔ ابھی اچھی طرح جوان بھی نہ ہونے پائی تھی کہ شوہر مر گیا۔ سسرال چھوڑ کر وہ ماں کے پاس چلی آئی تھی، اور جب سے آئی تھی مُلیا کی دُکان چمک اٹھی تھی، گاہکوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اور ملیا نے بھروسے کی بغل میں ایک چھوٹا سا مکان بھی بنوالیا تھا۔ منجھو ہر وقت منمناتی اور ایسی ہمسائی کو کوستی کاٹتی رہتی تھی۔ مگر بھروسے کو اپنے کھلونوں سے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ ایسی باتوں پر دھیان دیتا۔ اس وقت بس اسے اتنا یاد رہا کہ ہمسائے میں رہنے والی ایک عورت مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس نے کئی بکس ایک دوسرے پر کھینچ کھینچ کر دیوار سے ملا کر رکھے اور ان پر چڑھتا ہوا دیوار کے اوپر پہنچ گیا۔ اس نے جھانک کر دیکھا، تو اُسے ہریا اپنی چھت پر لالٹین لیے کھڑی کانپتی نظر آئی۔

بھروسے نے پوچھا ’’کیا ہوا ہریا؟ مُلیا کہاں ہے؟‘‘

وہ بولی ’’ماتا جی دن ہی سے سہر ترکاری لے کر گئی تھیں، پلٹیں نہیں۔ میں سام سے اکیلی بیٹھی ڈر رہی ہوں۔ ابھی پانی کے جور (زور) سے درواجا (دروازہ) کٹ کر گر پڑا! اور پانی آنگن میں گھس آیا۔ مجھے اس گھر سے نکالو کاکا! میں تمھارے پاؤں پڑتی ہوں مجھے بچاؤ کاکا!‘‘ اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

بھروسے نے کہا ’’تو روتی کیوں ہے، میری چھت پر چلی آ!‘‘

یہ کہہ دینا تو آسان تھا، مگر دیوار ہریا کے قد سے کہیں اونچی تھی، وہ اس پر چڑھے کیوں کر؟ بھروسے نے اِدھر اُدھر نظر ڈال کر دیکھا۔ ’’ارے نیچے کوئی بسکھٹ نہیں ہے؟ جا، اسے اٹھا لا!‘‘

اس نے کہا ’’ہم سے اکیلے جینے (زینے) پر نہ آئے گا۔‘‘

بھروسے نے کہا ’’ارے جا بھی کسی طرح کھینچ کھانچ کر چڑھا لا!‘‘

وہ بولی۔ ’’ہمیں نیچے جاتے بھے لگتا ہے کاکا! ہم اکیلے نہ جائیں گے!‘‘

پانچ فٹ چار اِنچ کا دُبلا پتلا بھروسے ہریا کی فریاد پر بانکے بہادر بن گیا۔ وہ اپنے ٹین کی منڈیر سے پاؤں لٹکا کر، سات فٹ کی اونچائی سے ہریا کی چھت پر پھاند پڑا۔ ایڑیاں ذرا

جھنجھنائیں، مگر اس نے کچھ خیال نہ کیا۔اس نے ہریا سے کہا ''کہاں ہے بسکھٹ ؟ چل دکھا!''

ہریا کی مدد سے وہ بسکھٹ چھت پر اُٹھا لایا۔اس نے اسے اپنی دیوار سے لگا کر دیکھا۔ سرے کے پائے اور پٹی منڈیر سے گز بھر نیچے ہی تک پہنچتی تھی۔اس نے جھٹ اورادوائن کھول ڈالی۔ ہریا سے کہا ''بسکھٹ پکڑے رہ!'' اور وہ اس پر چڑھ گیا۔اور اس نے پٹی پر کھڑے ہو کر بسکھٹ رسی سے اپنے ٹین کی پتلی دھنی میں باندھ دیا۔پھر خود اپنی منڈیر پر چڑھ کر ہریا سے کہا ''اب چڑھ آ!'' ہریا نے کوشش کی تو اس کی ساڑی بار بار پھنسی۔اس نے بھروسے کہا ''کاکا، جرا (ذرا) ادھر منہ کر لو!'' اور بھروسے کے منہ پھیرتے ہی اس نے ساڑی کھول کر اسے دہرا کر کے بھروسے کی دھوتی کی طرح باندھ لیا۔اور وہ بھروسے کے ہمّت دلانے پر پلنگ پر چڑھ کر سرہانے کی پٹی پر پہنچ کر بیٹھ گئی۔اس پر کھڑے ہونے کا اس کا ہیاؤ نہ پڑتا تھا۔بھروسے ٹین پر لیٹ کر آدھے دھڑ سے لٹک گیا۔اس نے ہاتھ بڑھا کر ہریا کو سہارا دیا اور اسے ٹین پر کھینچ لایا۔پھر وہ بکس پر ذرا سا پاؤں رکھ کر اپنی چھت پر کود گیا۔مگر جب ہریا اترنے لگی تو بکس ڈگمگائے۔بھروسے نے لپک کر ہریا کی کھلی رانیں پکڑ لیں اور اسے کندھے پر بٹھا کر نیچے اُتار دیا۔بھروسے کے لمس نے ہریا کے جسم میں گدگدی سی پیدا کر دی اور وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ چھت پر بھد سے بیٹھ گئی۔

رام بھروسے نے اسے تعجب سے دیکھا۔وہ بات ٹالنے کے لیے بولی ''کاکا کچھ کھانے کو نہیں ہے؟ بڑی بھوک لگی ہے۔''

بھروے نے کہا ''جنس تو سب گھر میں ہو گی، مگر کھد (خود) پکانا پڑے گا۔''

وہ بولی۔ ''لکڑی مل جائے تو کچھ نہ کچھ اُبال لوں گی!''

رام بھروسے جلتی ہوئی شمع لے کر چند زینے اُترا۔پھر ''باپ رے باپ!'' کہتا ہانپتا ہوا پلٹا۔ہریا نے پوچھا ''کیا ہوا کاکا؟ کیا ہوا؟''

وہ بولا ''سایدآنگن میں پانی آ گیا ہے۔جینے (زینے) پر نہ جانے کتنے مینڈک اور سانپ بچھو بیٹھے ہیں۔'' پھر وہ ڈنڈا اٹھا کر بولا۔ ''تو بتی لے کر چل، میں ڈنڈے سے کھٹکھٹاتا چلتا ہوں۔''

دونوں ساتھ ساتھ چلے۔مینڈک، کیڑے مکوڑے، اپنے سب سے بڑے دشمن، انسان کو

یوں مسلح آتے دیکھ کر جلدی جلدی اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ بھروسے نے ہریا کو روک کر زینے کی بتی پھر جلادی۔ جب وہ اپنے آنگن میں پہنچا تو اس نے دیکھا، نابدان کے راستے ایک فٹ پانی اندر گھس آیا ہے۔ وہ کنارے کنارے ہو کر رسوئی گھر میں گئے اور سارے برتن، جنس، مسالہ، سل بٹا، لکڑی، کوئلہ، جتنا بھی سامان وہاں تھا، وہ سب اوپر اٹھالائے۔ بھرا ہوا اسٹوو بھی گرہستن منجھو نے وہیں اٹاری پر رکھ چھوڑا تھا، وہ بھی لے آئے۔ رات کافی آچکی تھی، صحن میں پانی برابر بڑھ رہا تھا۔ مینڈک اِدھر اُدھر اُچک رہے تھے کچھ اور کیڑے مکوڑے بھی رینگتے دکھائی دے جاتے تھے۔ مگر عورت اور مرد کے ساتھ نے دونوں کی ہمت بڑھادی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں ہیں، رَت جگا منا رہے ہیں اور گھر کے مختلف طاقوں پر جلتی ہوئی موم بتیاں اس سلسلے میں چراغاں کا کام انجام دے رہی ہیں۔

ہریا نے اسٹوو جلا کر کھچڑی اُبالی، چٹنی بھی پیس لی۔ دونوں نے اسے اس طرح چٹخارے لے کر کھایا، جیسے انھوں نے اس سے زیادہ خوش ذائقہ چیز آج تک کھائی ہی نہ تھی۔ جب ہریا برتن مانجھ دھو چکی، تو اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "کاکا، کھٹولا تو ایک ہی ہے اور ہم ٹھہرے دو جنے!" اور اس کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں۔

بھروسے نے ذرا رُک کر کہا "تو کھٹولے پر سورہ! میں بکس ملا کر، ان پر گدے ڈال کر لیٹ رہوں گا!"

ہریا نے اسے کنکھیوں سے دیکھا۔ وہ لب کج کر کے مسکرائی، اور کھٹولے پر لیٹ گئی، بھروسے نے کئی بکس کھسکا کر ملائے، گدوں کی مدد سے ان کی سطح برابر کی اور موبتی بجھا کر ان پر دراز ہو گیا۔ مگر وہ ستاروں کے مہیا کیے ہوئے دُھندلکے میں بھی، بار بار کروٹیں بدلتی ہوئی ہریا کو دیکھتا رہا، اور اس کی نظریں بھٹک بھٹک کر، ادھر بھی چلتی جاتیں۔ جہاں اس کی 'انوکھی ناگن' اپنی ساری لگاوٹوں سمیت دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

دوسری رات، صبح تڑکے ہی رام بھروسے کی آنکھ کھل گئی۔ آج نہ کسی مسجد سے اذان سنائی دی اور نہ مندر سے گھنٹے اور سنکھ کی آواز آئی۔ بس ایک کوّا منڈیر پر بیٹھا قائیں قائیں کر کے، ان سونے والوں کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ بھروسے کو یہ بے سری قائیں قائیں بھیرویں کی طرح بھلی معلوم ہوئی۔ اس اجنبی سناٹے، خاموش اور تنہائی میں، یہ سامعہ خراش آواز دل کش

موسیقی میں تبدیل ہوگئی تھی۔اس کے لیے کوّا بلبل ہوگیا تھا۔

وہ اُٹھ بیٹھا۔رات کی غیر معمولی محنت سے، پھر بکس پر لیٹنے سے جسم اکڑ سا گیا تھا۔اس نے بکس پر بیٹھے ہی بیٹھے کمرے سے اُوپر کے دھڑ کو دائیں بائیں گھما جھکا کر، اپنی رگیں پٹھے ڈھیلے کیے۔پھر اس نے بکس سے اُتر کر پندرہ بیس بیٹھکیں لگا ڈالیں۔وہ تو ڈنڈ بھی کرنے جا رہا تھا کہ ہریا جاگ گئی اور اس نے لیٹے ہی لیٹے اس طرح انگڑائی لی کہ کھٹولے کی چولیں بولنے لگیں۔بھروسے نے رُک کر اُسے بغور دیکھا۔بھدا بھدا سا نقشہ تھا، مگر رنگ صاف تھا۔اس وقت جو وہ کھٹولے پر تنی، تو جسم کے کچھ حصّے ابھرے کچھ دَبے، اور فنکار کو محسوس ہوا کہ چہرے سے کہیں زیادہ اس کا جسم حسین ہے۔بھروسے کے دل میں ایک مجسمہ بنانے والے کی خواہش جاگی۔کاش وہ اسے عریاں دیکھ سکتا! لیکن فوراً ہی ہندوستانی تہذیب کی روائتوں نے اسے آنکھ دکھائی اور بھروسے نے کچھ شرما کر منہ پھیر لیا۔

ہریا، جو در پردہ بھروسے کو چھیڑنے کے لیے اپنے جسم کی نمائش کر رہی تھی، بھروسے کے تمتمائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر فاتحانہ انداز سے مسکرائی۔اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے لے جاکر پھنسائے اور انگلیاں چٹخائیں۔پھر وہ اٹھلا کر بولی۔"کاکا، اس وکھت (وقت) تو چائے پینے کو جی چاہتا ہے۔"

بھروسے نے کہا۔"گھر میں بوند بھر بھی دودھ نہیں ہے۔"

وہ بولی "ایسے میں تو بلا دودھ ہی کے مجا (مزہ) دے گی۔"

اسٹوو پھر جلا۔مگر جب کیتلی میں پانی بھرنے کی نوبت آئی تو گھڑا بھی خالی ملا، گگرا بھی، بالٹیاں بھی۔رات کی کھچڑی پکانے اور برتنوں کے مانجھنے، دھونے میں پانی سب صرف ہو چکا تھا۔ہریا نے جھٹ بالٹی اٹھائی اور نیچے اُسے بھرلانے چلی۔بھروسے نے ٹوکا "اری کہاں جارہی ہے، پائپ سے پانی نہیں آتا۔"

وہ بولی۔"ہونہہ! اور یہ جو آنگن بھر میں جل ہی جل ہے!"

بھروسے نے ہاتھ پکڑ لیا۔"میں مر بھی جاؤں گا، پر اپنے آنگن کے نابدان سے آیا ہوا پانی نہ پیوؤں گا!"

ہریا نے کہا "تو پھر چاروں اور پانی ہی پانی ہے، اسی میں سے ایک گگرا بھر کر نکالو۔"

بھروسے نے گگرا اٹھالیا۔ منڈیر سے جھک کر دیکھا، پانی دوگز سے بھی زیادہ نیچا تھا۔ وہ بولا کوئی رسی ہوتی، تو اس میں باندھ کر گگرا لٹکا لیتا۔''

ہریا نے کہا'' اچھا تم جرا (ذرا) منہ پھیر لو، میں بندوبست کرتی ہوں۔'' اور بھروسے کے منہ پھیرتے ہی اس نے اپنی ساڑی کھول کر بھروسے کے سامنے پھینک دی۔ بھروسے نے کانپتے ہاتھوں سے ساڑی کا ایک کونہ گگرے میں مضبوط باندھا، پھر اسے لٹکا کر پانی بھر لیا۔ جب گگرا کھینچ کر اس نے منڈیر پر رکھا تو وہ نظریں نیچی کیے کیے بولا'' تو کھٹولا کھڑا کر کے اس کے پیچھے ہو جا، تو میں سارے برتنوں میں پانی بھر دوں۔''

ہریا ہنستی ہوئی آڑ میں ہو گئی، بھروسے نے گھڑے کے علاوہ سارے برتنوں اور بالٹیوں میں پانی بھر دیا۔

جب وہ گگرے سے ہریا کی ساڑی کھولنے لگا، تو اس نے دیکھا وہ جگہ جگہ سے بھیگ بھی گئی ہے اور پھٹ بھی گئی ہے، اس نے ساڑی کھول کر چھت پر پھینک دی، اور کھٹولے کی طرف سے منہ پھیرے، بکسوں کی طرف بڑھا۔

ہریا چھیڑنے والی آواز میں بولی۔'' ارے ادھر کہاں چلے آ رہے ہو؟''

وہ بولا:'' ارے میں تجھ کو دیکھ تھوڑے رہا ہوں، چھوکری!''

اور اس نے منجھو کا دیا ہوا کنجیوں کا گچھا کمر سے نکالا، اور ایک بکس کھولا۔ سب سے اوپر ایک نئی چادر دکھائی دی، اور اس کے نیچے ایک جارجٹ کی ساڑی، اس نے منہ پھیرے ہی پھیرے یہ ساڑی ہریا کی طرف بڑھا کر کہا'' لے تو اب پہن لے!''

وہ بوکھلا گئی:'' ک۔ کیا۔ کیا یہ مجھے دے رہے ہو کاکا؟''

وہ بولا:'' ہاں، ہاں، تیری ساڑی میں نے پھاڑ ڈالی، اب اس کے بدلے تو یہ ساڑی باندھ!''

وہ بولی:'' تو میں اسے بنا نہائے نہ پہنوں گی۔ ایسی بڑھیا ساڑی میں کھراب (خراب) نہ کروں گی۔''

وہ بولا:'' تو گگرا اُٹھا لے۔ جینے (زینے) پر چلی جا، وہیں نہا دھو کر ساڑی بدل لے!''

وہ بھد بھد کر کے دوڑی اور پرانی اور نئی دونوں ساڑھیاں ایک ہاتھ میں لے، دوسرے

میں گگرا اُٹھائے زینے کی نیچی والی سیڑھیوں پر چلی گئی۔

بھروسے نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ بکس سے نئی چادر نکال کر وہ پانی اُبالنے اور اُسے چھاننے میں مصروف ہو گیا۔ وہ اپنے خیالات میں اس طرح کھویا ہوا تھا کہ بکس کے قفل میں کنجی لگی رہی اور وہ کھلا ہوا کنڈے میں لٹکا رہا۔ اس وقت ہریا کے عریاں جسم نے پھر اس کی فنکاری کو ٹھوکا دیا تھا۔ اس کا بے ساختہ جی چاہتا تھا کہ وہ مغربی فنکاروں کی طرح اس چھوکری کو اپنا 'ماڈل' بنائے۔ لیکن ہریا سے یہ بات کہنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔ وہ سوچنے لگا "لڑکی ذرا تیز ہے۔ وہ رات ہی سے بار بار چھیڑ رہی ہے، کچھ اور نہ سمجھے۔ پھر اگر وہ راضی بھی ہو جائے، مگر بعد میں بات پھوٹی تو؟ اور تو کسی کی پروا نہیں، مگر منجھو اپنی سگھڑ گھر گرہستن منجھو، وہی جو اس کے جیسے ناکارہ آدمی کا بوجھ اپنے کندھوں پر خوشی خوشی اٹھائے ہوئے تھی!" اور بھروسے کی پیشانی پر پسینے کی ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے۔

وہ ماتھے سے پسینہ پونچھ ہی رہا تھا کہ ہریا جارجٹ کی ساڑی باندھے، اور پرانی ساڑی دھوئی نچوڑی ہوئی ہاتھ میں لیے اوپر آ گئی۔ اس نے نہ کوئی پیٹی کوٹ پہن رکھا تھا، نہ کوئی بلاؤز، اس کے جسم کے سارے نشیب و فراز، ساری کجیاں و ہمواریاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ بھروسے کی نظریں آپ ہی آپ اس حسین جسم کی طرف اُٹھ گئیں۔ ہریا نے جو جھک کر بھیگی ہوئی ساڑھی منڈیر پر پھیلانا شروع کی تو جارجٹ کی ساڑی کا بغل میں دبا ہوا کونا پھسل گیا اور وہ کمر تک ننگی ہو گئی۔

اس نے شرارت سے بھروسے کو دیکھ کر کہا "کیسے بے سرم (شرم) ہو، میں ننگی ہوں اور تم گھور رہے ہو!"

بھروسے پانی پانی ہو گیا، اور اس نے نظریں جھکا لیں۔ وہ اٹھلاتی ہوئی ٹین کے نیچے آئی اور اس نے بڑی بے باکی سے بکس کھولا، اور اس میں سے ڈھونڈھ کر آئینہ کنگھا نکال لیا۔

بھروسے نے ڈانٹا "کیا کرتی ہے چھوکری؟ یہ سب منجھو نے مالتی کے بیاہ کے لیے رکھ چھوڑا ہے؟"

وہ بولی۔ "جارجٹ کی ساڑی پہنائی ہے، تو مجھے اپنی صورت تو آئینے میں دیکھنے دو!" اور وہ بھیگے بال جھٹک کر کنگھا کرنے اور گنگنانے لگی۔

بھروسے نے چائے کی ایک پیالی خود لی اور ایک اس کی طرف بڑھادی۔ وہ چائے پی رہے تھے کہ نیچے سے چھپ چھپ مٹی کٹ کٹ کر پانی میں گرنے کی آواز آئی۔ بھروسے نے ڈنڈا اُٹھا کر کہا ''دیکھوں، یہ کیا ہو رہا ہے۔'' اور وہ نیچے آیا۔ اس نے دیکھا صحن میں نابدان کے ذریعہ آنے والا پانی بڑھ گیا تھا اور گلی کا پانی اُونچا ہو کر دروازے کے پیچھے کی گیلی دیوار کو کاٹ کر گرا رہا تھا۔ بھروسے نے گھبرا کر اِدھر اُدھر نظر ڈالی، تو اس دوسرے دالان کے کونے میں ڈھیروں بالو دکھائی دی جو بعض برتنوں، کھلونوں کی مٹی میں ملانے کے لیے رکھی تھی۔ یہیں کئی بورے بھی تہہ کیے رکھے تھے۔ اس نے ایک بورے میں آدھے کے قریب بالو بھری اور اُسے نالدان کے منہ میں ٹھونس دیا۔ پھر اس نے پانچ چھ بورے بالو سے بھر کر دروازے کے پیچھے والی دیوار کے پیچھے پشتے کے طور پر لگادیئے۔

وہ انھی کاموں میں مصروف تھا کہ ہریا نے زینے سے جھانکا۔ وہ پورا سنگار کر چکی تھی۔ وہ دالان اور صحن کی کیچڑ میں اُتر کر اپنی جارجٹ کی ساری غارت کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ پھر بھی عورت تھی، بے کار نہ بیٹھ سکتی تھی۔ اس لیے اس نے وہیں سے پکار کر پوچھا ''اس وکھت (وقت) بھی کھچڑی ہی پکے گی نا؟''

بھروسے نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی چھب نے دل میں چٹکی لی، وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا ''ہرام جادی!'' پھر زور سے بولا ''ہاں، کھچڑی ہی پکا لے!''

دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ سورج گومتی کو اتنی تیکھی نظروں سے دیکھ رہا تھا، کہ لحمہ بہ لحمہ اس کی تڑپ بڑھتی۔ ہر طرف سے دھماکوں، چھپاکوں کی آوازیں آ رہی تھیں، مکان گر رہے تھے، دیواریں ڈھئی جا رہی تھیں۔ فضا میں منڈلاتی ہوئی چیلوں اور گدوں کے علاوہ کوئی چڑیا نظر نہ آتی تھی۔ صبح کے کوے تک غائب تھے۔ ایک عجیب طرح کا سناٹا تھا۔ ہر لحمہ تنہائی، خطرے اور بے بسی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی کے اثر سے ہریا نے منڈیر سے جھک کر پکارا ''ارے کاکا، اب اوپر آؤ، ہمیں ڈر لگتا ہے!''

''ہرام جادی!'' وہ پھر بڑبڑایا، اور وہ بالو کے بوروں پر نظر ڈالتا ہوا، اُوپر جانے کے قصد سے چلا۔ دالان میں پہنچتے ہی اُسے کچھ خیال آیا۔ اس نے ایک جھوئے میں مورتی بنانے والی مٹی بھری اور اُسے سر پر رکھ کر اُوپر لے گیا۔ اس نے دیکھا ہریا نے جارجٹ کی ساڑی اُتار

کر کے بکس پر رکھ دی ہے، اور وہ اپنی پھٹی سوتی ساڑی پہنے چٹنی پیس رہی ہے، اس نے چھت پر ایک طرف مٹّی ڈال دی اور خاموشی سے دو جھوے مٹّی اور لے آیا۔

ہریا کچھ دیر تو چپکی یہ تماشہ دیکھتی رہی، پھر تعجب سے بولی ''لے اب ختم بھی کرو۔ یہ نگوڑی مٹّی کون سا سونا چاندی ہے کہ اُسے ڈھو کر جان ہلکان کر رہے ہو؟''

بھروسے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خود بھی تھک گیا تھا۔ اس نے مٹّی سے، بھرے ہاتھ اپنی دھوتی میں پونچھ پونچھ کر صاف کیے۔ پھر اس نے ایک کے بعد ایک بکس کھول کر دیکھا۔ آخر ایک میں اس کے دُھلے کپڑے مل گئے۔ اس نے ایک کرتا اور ایک دھوتی نکالی اور گھڑا اُٹھایا۔ ہریا چیخی ''ارے اسی میں پینے کا پانی رکھا ہے، اُسے کہاں لے جا رہے ہو؟ نہانا ہے تو گگرا بھر لو!''

بھروسے نے کہا ''تو لا اپنی ساڑی اُتار!''

وہ بولی واہ، میں کیوں اپنی جارجٹ کی ساڑی ابھی سے پہن کر کھراب (خراب) کروں۔ لو تم یہ اپنی چادر لو!'' اور اس نے وہی چادر بڑھا دی جس میں بھروسے نے پانی چھانا تھا۔ بھروسے نے گگرے میں چادر باندھی اور اسے لٹکایا۔ پانی پہلے سے اونچا ہونے پر بھی گگرا وہاں تک نہ پہنچ سکا۔ وہ جھنجھلا کر پلٹا اور اس نے اپنی دھلی ہوئی دھوتی، جو اب جگہ جگہ سے بھیگ بھی گئی تھی، باندھ لی اور میلی دھوتی کچار کر پھیلا دی۔ پھر وہ ہریا کے پاس جا کر بولا۔ ''لا اب کھانے کو دے!''

کھچڑی میں جیسے افیون گھلی ہوئی تھی۔ وہ اسے کھاتے ہی کھٹولے پر پڑ کر سو رہا۔ ہریا کچھ دیر تو برتنوں کے دھونے میں لگی۔ پھر اس نے آہستہ سے بھروسے کے سرہانے رکھا ہوا کنجیوں کا گچھا اُٹھایا اور ہر بکس کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دو میں تو منو، مالتی، منجھو اور بھروسے کے دُھلے کپڑے رکھے تھے۔ ایک میں منجھو کے نئے نئے جوڑے تھے اور دو بکسوں میں مالتی کے جہیز کے جوڑے اور سامان تھا۔ بھاری بھاری ساڑیاں، لہنگے، شالیں، بیاہ میں دینے والا چاندی کا سامان۔ ہریا نے ایسی گراں قیمت چیزیں نہ میکے میں دیکھی تھیں نہ سسرال میں۔ یاروں نے بھی دو چار روپے سے زیادہ کا کوئی تحفہ نہیں پیش کیا تھا۔ ہریا کو ان چیزوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اتنی تکلیف ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ جھنجھلائی ہوئی اپنے

بھگوان سے دل ہی دل میں اپنے اور مالتی میں فرق کا سبب پوچھ رہی تھی کہ بھروسے نے کروٹ لی۔ ہریا نے جلدی سے کنجیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ ٹھنک کر کہا "ارے پڑے سویا ہی کروگے کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی اپا کروگے؟"

بھروسے آنکھ ملتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ دن ڈھلنے لگا تھا، اور بھیانک پن بڑھنے لگا تھا۔ دوسری رات بھی اپنے ہی مکان میں کاٹنے کے خیال ہی سے اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ چاروں طرف مکانات گر رہے ہیں۔ نہ جانے کب یہ بھی بیٹھ جائے، اُسے ڈر لگنے لگا تھا۔ اس طرح ہاتھ پاؤں ڈالے بیٹھے رہنا موت کے منہ میں خود سے جانا ہے۔ وہ کھڑا ہوگیا اور وہ بکسوں کو ایک کے اوپر ایک رکھ کر دیوار پر چڑھنے لگا۔

ہریا نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا "میں اکیلی نہ رہوں گی، مجھے بھی لیتے چلو! مجھے بہت ڈر لگتا ہے!" وہ دِلاسا دے کر بولا "پگلی! میں کہیں دُور تھوڑے جا رہا ہوں جرا کوٹھے کوٹھے سڑک تک جا کر دیکھوں گا۔ کہیں سے نکلنے کا رستہ بھی ہے کہ نہیں۔ تو ڈر مت، میں ابھی آتا ہوں۔"

ہریا گرفت ڈھیلی کر کے گڑگڑائی "پر پلٹ آنا جرور!"

وہ "ہاں، ہاں!" کہتا بکسوں پر کھڑا ہو کر دیوار پر چڑھ گیا۔ پھر ہمسایوں کی چھتوں سے ہوتا ہوا سڑک کے کنارے والے مکان کی چھت پر پہنچا۔ کوئی بھی اپنے مکان میں نہ دکھائی دیا۔ البتہ ایک چھت پر ایک مرغی اپنے چوزوں کو پروں میں چھپائے بیٹھی نظر آئی۔ ایک دیوار پر کبوتروں کا ایک جوڑا دکھائی دیا۔ اس نے مکان کے اندر جھانکا تو ان کی کابک کے اوپر والے حصّے پر ایک سانپ رینگتا دکھائی دیا۔ اور کابک کے اندر دو چھوٹے چھوٹے انڈے جھلکے۔ سڑک پر لگے ہوئے بجلی کے کھمبے تقریباً پورے پورے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے، اور پانی اتنا اونچا تھا کہ کشتیاں چھتوں سے ملا کر لگائی جا سکتی تھیں۔ اس پر تموج بلا کا تھا۔ ہر لہر بانسوں پانی اچھالتی اور ہر گھر کے در و دیوار کو اس زور کی ٹکر مارتی کہ ہر مکان ہلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ داہنی طرف دُور بلندی پر لوہے کا پل تھا۔ یہاں سے صاف تو نہ دکھائی دیتا مگر اتنا ضرور نظر آتا تھا کہ اس پر سینکڑوں آدمی کھڑا ہے۔ بھروسے کو یقین ہوگیا کہ یہ تماشائی ہیں، جو بپھیا کے نظارے سے لطف لے رہے ہیں۔ اس نے چیخنا شروع کردیا۔ "بچاؤ! بچاؤ! ارے دیا کر کے ہمیں یہاں سے نکالو!"

مگر پانی کے شور میں اس کی آواز دَب کر رہ گئی۔ البتہ سڑک کے پار والے سیٹھ کے چوکیدار نے پھر منڈیر سے سر نکال کر کہا ”کاہے بن ناہک، بن ناہک (ناحق) چیختے ہو کاکا! اس پانی میں نہ ڈونگی کشتی آسکتی ہے، اور نہ تم تک کوئی آدمی پہنچ سکتا ہے؟ کہہ تو دیا اپنی چھت پر جاکر بیٹھو، کوئی اُپائے نکلے گا تو ہم کھد مدد بھیجیں گے!“

بھروسے نے کہا ”ارے میں ہی اکیلا نہیں ہوں، وہ مُلیا کی چھوکری بھی تو پھنسی پڑی ہے۔“

وہ ہنس کر بولا ”چلو پھر کاہے کاکا! مجے (مزے) کرو وہ تو بڑی پٹاخا ہے!“

بھروسے بڑبڑایا ”ہرام جادہ!“ اور گھر کی طرف پلٹا۔ چوکی دار نے آواز دی ”کہیں منگلو نجر پڑا تو میں اس کو کھبر کردوں گا۔ وہ اس چھوکری پر بُری طرح لٹو ہے!“

منگلو کا نام سنتے ہی بھروسے کا دم نکل گیا۔ منگلو گنڈوں کا سردار تھا۔ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہو گیا کہ بھروسے نے اس کی چہیتی کو بُری نظر سے دیکھا ہے، تو وہ اس کا بھرتا ہی نکال دے گا۔ وہ سوچنے لگا اس نے ناحق ہی ہریا کے بارے میں چوکیدار کو بتایا۔ منجھو کا ڈر تو تھا ہی، اب منگلو کا خوف بھی دل میں سمایا۔ پھر محلے بھر میں رسوائی اور بدنامی گھاتے میں! واہ، اچھا عذاب اپنے سر لیا! وہ یہی سوچتا، ڈر ڈر کر قدم رکھتا گھر کی طرف پلٹ رہا تھا کہ اس نے ہریا کی آواز سنی ”کاکا! کاکا! بھروسے کاکا!“ اس نے دیکھا تو وہ ٹین والی دیوار پر کھڑی ہے، ہوا کے جھونکے سے وہ پھول کی ٹہنی کی طرح ہل رہی ہے۔ جارجٹ کی ساڑی کبھی غبارے کی طرح پھول جاتی ہے، کبھی جسم میں اس طرح چپک جاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جسم پر کپڑا ہی نہیں ہے اس نے وہیں سے چیخ کر ڈانٹا ”تو کیوں اُوپر چڑھ آئی! نیچے اُتر! میں آرہا ہوں!“ وہ جلدی سے نیچے اُتر گئی۔

بھروسے نے اب مکانوں میں جھانک کر ہر ایک کی کیفیت دیکھی۔ ہر جگہ پانی بھرا تھا۔ ہر گھر کے صحن میں طرح طرح کی چیزیں تیر رہی تھیں۔ چوکیاں، میزیں، اسٹول، دَھنیاں، بانس، چھڑیاں، ڈنڈے، اوندھے گھڑے، کبوتروں والے گھر میں سانپ اب کابک کے خانے میں گھس گیا تھا اور انڈے غائب تھے۔ مرغی والے چھت کی دیوار پر، ایک جنگلی بلی دَبے پاؤں چلی جارہی تھی۔ فطرت کے خطرات و مظالم کو اس نے غیر شعوری طور پر محسوس کیا اور

وہ ذرا جلدی جلدی چلنے لگا، اور ایک جگہ اس طرح ڈگمگایا کہ گرتے گرتے بچا۔ بیساختہ ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی اور وہ دیوار پر بیٹھ کانپنے لگا، وہ پھر کھڑا ہو کر نہ چل سکا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے اس نے بقیہ مسافت طے کی۔ جب وہ اپنے ٹین پر پہنچا تو اس نے ہریا کے گھر میں جھانک کر دیکھا۔ لالٹین اب بھی جل رہی تھی اور بسکھٹ اب بھی دیوار سے لگا کھڑا تھا، پھر اس نے اپنے گھر پر نظر ڈالی۔ عجیب منظر نظر آیا۔

ہریا پوت کا لہنگا اور اس کا چست شلوکا پہنے، گوٹوں، پٹھوں سے لدا دوپٹہ اوڑھے عجیب بھاؤ سے ناچ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا سچ مچ اس کی 'انوکھی ناگن' میں جان آ گئی ہے۔ جسم کے روئیں روئیں سے جوانی پھٹی پڑ رہی تھی وہ لہک لہک کر گا رہی تھی:

کانھا مانے نا ارجیا ، مور ڈگریا روکے نا!
جاؤ چھلیاں ہم سے نہ بولو ، بنتی کروں تمھاری
تم ہو اہیر کے بٹوا ، میں ہوں سجان دلاری
کانھا مانے نا ارجیا ، مور ڈگریا روکے نا!

[اے کنہیا تم میری عرض قبول نہیں کرتے، تم میرا راستہ روک کر نہیں کھڑے ہو جاتے! اچھا تو پھر جاؤ اے نٹ کھٹ۔ مجھ سے نہ بولو، میں گڑگڑا کر تمھاری خوشامد کرتی ہوں (حالانکہ) تم اہیر کے بیٹے ہو، اور میں بڑے بڑوں کی چہیتی ہوں۔ اے کنہیا تم میری عرض کیوں نہیں سنتے؟ تم میرا راستہ روک کر کیوں نہیں کھڑے ہو جاتے؟]

بھروسے کو بڑا غصّہ آیا۔ اس لونڈیا نے تو انگلی پکڑتے پکڑتے پونچھا پکڑا۔ ایک ساڑی کیا دے دی کہ سارے بکس کی مالکن بن بیٹھی۔ پھر دیکھو کتنا قیمتی جوڑا نکال کر پہنا ہے۔ دو ڈھائی سو کی لاگت کا ہوگا۔ منجھو دیکھ لے تو اپنی اور اس کی جان ایک کر دے۔ نہ جانے بے چاری نے کن کن دُکھوں کو جھیل کر اتنا بچایا ہوگا کہ ایسا جوڑا مالتی کو جہیز میں دے سکے! اور مالتی کا خیال آتے ہی، اس کا غصّہ اور بڑھ گیا۔ اس کی بھولی بھالی بچی کے بیاہ کا جوڑا اور اسے گندہ کرے ہریا جیسی عورت! اس نے دیوار پر بیٹھے زور سے ڈانٹا "کیا کر رہی ہے ہرام جادی! لے کے لڑکی کے بیاہ کا گہنا بھی پہن لیا!"

ہریا نے بھی بھروسے کو تیکھے تیوروں سے دیکھ کر جواب دیا "دو دو بکس تو بھرے پڑے

ہیں۔ اِک جرا (ذرا) لہنگا پہن لیا تو کیا ہوا؟''

اور اس نے ایک جھٹکے سے دوپٹہ سر سے گرا دیا، اور اپنی میلی ساڑی اُٹھاتے اُٹھاتے شلوکا بھی اُتار پھینکا، پھر ساڑی کمر تک لپیٹ کر بولی ''گھورے جا رہے ہو، گھورے جا رہے ہو! اس میں نہیں شرم آتی؟''

بھروسے نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ وہ مسکرائی اور گرے ہوئے کپڑے کو اُٹھا اُٹھا کر جھٹکنے اور تہہ کرنے لگی۔ اس نے وہ جوڑا ہی نہیں، بلکہ جارجٹ کی ساڑی بھی سنبھال کر بکس میں رکھ دی۔

بھروسے کے کان کی لویں سُرخ ہو گئیں، حلق خشک ہو گیا، دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ کیسی اچھی مورتی بن سکتی ہے اس چھوکری کے جسم کی! یورپ والے یہی تو کرتے ہیں۔ ماڈل بننے میں نہ تو لونڈیوں ہی کو کوئی عذر ہوتا ہے اور نہ آرٹسٹ اس کو کوئی شرم کی بات سمجھتا ہے۔ لیکن یہاں ہندوستان میں۔ پھر اپنے لکھنؤ میں اگر کسی نے سن لیا تو ناک ہی کٹ جائے گی۔ اور منجھو! اپنی منجھو تو اس کو نہ جانے کتنا کمینہ سمجھنے لگے گی۔ مگر کسی کو خبر ہی کیسے ملے گی؟ اس لونڈیا سے بات پکی کر لی جائے کہ کسی پر بھید نہ کھلے۔ پر وہ مانے گی کیسے کہیں کچھ اور نہ سمجھے!''

اور وہ ٹین سے نیچے اُترنے لگا۔ ہریا نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر کہا ''ٹھہرو، ٹھہرو! ابھی ادھر نہ اُترو۔ ہمارے گھر کی چھت پر اُتر جاؤ۔ ہم گریبوں (غریبوں) کے پاس بھی دو چار جوڑے کپڑے ہیں۔ انھیں نیچے جا کر اُٹھا لاؤ...''

بھروسے نے اُسے تعجب سے دیکھا۔ پھر جھنجھلا کر بولا۔ ''میری جان مُپھت (مفت) کی نہیں چھوکری! تیرے گھر میں تو پانی ہی پانی ہے!'' وہ جھپٹ کر بکسوں پر چڑھ کر ٹین پر آ گئی ''تم نہ جاؤ، میں کھد جاؤں گی!'' اور اس نے دیوار پر پیٹ کے بل لیٹ کر دونوں ٹانگیں اپنی چھت کی طرف لٹکا دیں، اور وہ پاؤں سے بسکھٹ کی پٹی ٹٹولنے لگی۔ بھروسے نے لپک کر اس کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں۔ وہ بولا ''اری کیوں جان دینے پر تلی ہے چھوکری! اگر جائے گی تو ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی!''

وہ اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ''چھوڑو میرا ہاتھ! چھوڑو! مر جاؤں، مگر جاؤں گی جرور!''

ان دونوں میں رسہ کشی کا مقابلہ جاری تھا ہی کہ ہریا کے مکان سے بھس! بھس!'' جیسی آواز پیدا ہوئی اور پورا مکان ہلنے لگا۔ بھروسے نے کہا۔ اری بھاگ! مکان گر رہا ہے!''

ہریا چیخ کر بھروسے کے سہارے ٹین پر آئی ہی تھی کہ ایک دھماکے کے ساتھ اس کا مکان آنگن کی طرف گر گیا۔ بھروسے کی ٹین والی دیوار اس طرح ہلنے لگی کہ محسوس ہوتا تھا اب گری۔ اب گری! ہریا ڈر سے برابر چیخے چلی جا رہی تھی۔ بھروسے بڑی مشکلوں سے اسے ٹین سے نیچے اُتار کر لایا۔ پوری چھت پر ایک زلزلہ کی سی کیفیت طاری تھی۔ دونوں ٹین سے دور، دوسرے کنارے پر کھڑے ہو گئے۔ اور ہریا بھروسے کے سینے سے لگی ہوئی سسک سسک کر رونے لگی بھروسے خود بھی حواس باختہ تھا۔ ہریا کے مکان کو گرتے دیکھ چکا تھا، اپنی چھت بھی ہل رہی تھی، ٹین بھیانک طور پر ٹن ٹن کر رہا تھا۔ مگر جس طرح ہریا کے خوف وڈر نے اس کے ڈر کو بڑھا دیا تھا۔ اسی طرح ہریا، کمزور عورت کے لپٹ جانے نے، اس کی مردانگی کو اُبھار بھی دیا۔ بھروسے اس لیے اپنا ڈر بھول کر اسے دلاسا دینے، چمکارنے لگا۔ ''ڈ...ڈر نہیں... ڈر نہیں!...ڈر نہیں!''

چھت کی لرزش میں کچھ کمی ہوئی۔ چھپاکوں، دھماکوں کی آواز کسی قدر کم ہوئی۔ ہریا نے بھروسے کے سینے سے سر اٹھا کر پھیلے پھیلے دیدوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دیوار سے لگی لکشمی کی مورتی نظر آئی۔ وہ دوڑ کر ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے سجدے میں گر پڑی ''مجھے بچاؤ، دیوی! مجھے بچاؤ!''

دھماکوں کی آوازیں رُک گئیں۔ چھت کا ہلنا موقوف ہوا۔ بھروسے نے کانپتے ہاتھوں سے اسٹوو جلایا اور چائے کے لیے پانی کیتلی میں چڑھا دیا۔ پھر وہ ہریا کے کندھے ہلا کر بولا۔ ''اٹھ! منہ دھو ڈال!''

اس نے منہ تو دھولیا، مگر اس کے آنسو نہ رُکتے تھے۔ بھروسے نے پوچھا ''ارے اب کیوں رو رہی ہے؟''

وہ سسکیاں لے کر بولی ''ارے کاکا میں لٹ گئی! میرا تو سب کچھ اسی مکان میں تھا۔''

بھروسے نے پیار سے ڈانٹا ''ہرجادی! بھگوان کا سکر نہیں کرتی کہ جان بچ گئی! دَھن دولت روپیہ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے۔''

ہریا مکان کے گرنے کا منظر یاد کر کے کانپنے لگی۔ وہ بولی ''ہاں کاکا، تم نے ہاتھ نہ پکڑ لیا ہوتا تو میں چھت پر پھاند پڑی ہوتی اور پھر...!'' وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر زور سے کانپی۔

بھروسے نے چائے کی ایک پیالی اُس کی طرف بڑھا کر کہا ''لے چائے پی! اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔''

وہ احسان مندانہ لہجے میں بولی ''تم نے میری دو مرتبہ جان بچائی۔ رات بھی، اس وکھت (وقت) بھی۔ میں جنم بھر تمھاری داسی رہوں گی!''

بھروسے نے کہا ''کیا بکتی ہے پگلی!'' اور اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

چائے کے گرم گرم چار گھونٹوں نے ہریا کے ٹھنڈے جسم کو پھر گرمایا۔ وہ بھروسے کے شرمانے پر مسکرائی، اس نے شرارت سے کہا ''اب تو تم نے ہاتھ پکڑا ہے تو جندگی (زندگی) بھر نباہنا!''

اور بھروسے کے بوکھلائے ہوئے ''کیا!'' پر وہ ہنس پڑی۔

بھروسے ''ہرمجادی!'' بڑبڑاتا کھلونوں والی مٹی کے پاس چلا گیا۔ اس نے تھوڑی سی مٹی ہاتھ میں اٹھائی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں اسے لمبا، چپٹا، گول بناتی رہیں، پھر اس نے اسے مختلف صورتیں دینا شروع کیں ایک سے ایک بھیانک، گھناؤنی۔ مرد کا جسم سؤر کا سر، آدھا انسان آدھا بھالو۔ عورت کا دھڑ ناگن کا سر، عورت اور ہر عضو میں اس کے سانپ لپٹا ہوا، انسان ڈھانچہ اور اس پر طرح طرح کے کیڑے مکوڑے رینگتے ہوئے۔ اور وہ ہر بار جھنجھلاتا اور بنی ہوئی صورت کو توڑتا اور کوئی نئی حسین شکل بنانے کی کوشش کرتا اور ناکامیاب رہتا۔ پھر اس نے ہاتھ کی مٹی گول کر کے زمین پر پھینک دی۔ اور وہ لکشمی دیوی کی مورتی کو اٹھا لایا۔ اس نے اسے ایک ہاتھ سے سہارا دیا اور دوسرے سے گھما گھما کر دیکھا۔ پھر اُسے دیوار سے لگا کر ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے سر جھکا لیا۔

ہریا اسے دیر تک حیرت سے دیکھا کی۔ پھر وہ خاموشی سے اٹھی اور کھٹولے پر لیٹ گئی، اسے ایسا سکون محسوس ہوا کہ وہ سو گئی۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ بھروسے نے نیچے سے ایک اور بسکھٹ لا کر چھت پر ڈال لیا ہے۔ لکشمی کی مورتی بجائے کھلی چھت کے، ٹین کے نیچے بڑے بکس کے اوپر

دیوار سے لگا کر کھڑی کر دی گئی ہے، اور بھروسے بجائے اسٹوو کے لکڑی جلا کر توے پر موٹی موٹی روٹیاں ڈال رہا ہے۔ اور کئی اچاریاں آم، لیمو، سُرخ مرچوں کے اچار سے بھری اس کے پاس رکھی ہیں۔

ہریا نے ان کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "ارے یہ کہاں سے آ گئیں؟"

بھروسے نے فخریہ لہجے میں کہا "ارے مالتی کی ماں بڑی گرہستن ہے۔ وہ سال کا سال پھسل (فصل) میں اچار بنا کر رکھ لیتی ہے۔ مجھے خیال آ گیا تو میں کمرے کی اٹاریوں سے جا کر اُتار لایا۔"

ہریا نے پاس آ کر پوچھا "اور دال بھی پکا لی؟"

اس نے ایک بٹلوی کی طرف اشارہ کر کے کہا "ہاں، دال پہلے ہی تیار کر لی تھی!"

اور انھوں نے دال روٹی طرح طرح کے اچاروں کے ساتھ خوب ڈٹ کر کھائی۔ اور جب سونے کی باری آئی تو ہریا، اپنا کھٹولا باہر اٹھا لائی اور اس نے اُسے بھروسے کے بسکھٹ سے ملا کر بچھایا۔

بھروسے نے کہا "ٹین کے نیچے کیوں نہیں لیٹتی؟"

وہ بولی "ہمیں ڈر لگتا ہے۔" اور جب وہ کھٹولے پر لیٹی تو اس نے اپنے جسم کو اس طرح تانا، مروڑا، کھینچا، سکوڑا کہ ہر بُن مو دعوت جنس دینے لگا۔ بھروسے بڑبڑایا "ہرام جادی!" اور اس نے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر ہریا کو اس چھیڑ میں مزہ آنے لگا تھا۔ وہ گنگنانے لگی:

کا کا نا مانے ارجیا، کا کا نا مانے ارجیا!
کا کا کمہار کا بٹوا، میں سجان دُلاری
کا کا نا مانے ارجیا! کا کا نا مانے ارجیا!

بھروسے کے ہاں جنسی طوفان اُٹھنا شروع ہوئے۔ کیا برائی ہے اگر ایک رات گھر کے ٹھہرے کی جگہ، باہر کی برانڈی پی لی جائے؟ اگر سردی میں خوب لہکا ہوا کوئلہ ملے، تو ہاتھ کیوں نہ سینکے جائیں؟ اگر اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ گے تو وہ بھی تھوڑی دیر میں جل کر ٹھنڈی راکھ کا ڈھیر ہو جائے گا! دو الگ الگ ڈرنے والے، دونوں کی جان کے لالے پڑے ہوئے، ڈراؤنی

رات، بھیانک سنّاٹا، پانی کی وہ چھپ چھپاہٹ کہ معلوم ہوتا بڑا سا بھوت ہونٹ چپ چپ چاٹتا، ان کے نگل لینے کو بھی بڑھا چلا آتا ہے، ایسے میں اپنے کو داسی کہنے والی ہریا! وہ کہنی کے بل تھوڑا سا پلنگ سے اُٹھا۔ نظر پہلے ٹین ہی کے نیچے رکھی ہوئی چیزوں پر پڑی۔ موم بتی کی لولہرائی۔ لکشمی دیوی کا چہرہ چمکا۔ دیا اور رحم والا چہرہ غصّے سے تمتمایا ہوا محسوس ہوا، بھروسے کا سر بھد سے تکیہ پر گر پڑا! ہریا ہلکی ہنسی کے ساتھ گانے لگی۔ ''کاکا نا مانے ارجیا'' اور بھروسے نے اس پر یوں غصّہ اُتارا ''چپ ہرمجادی! میں تیرے باپ کے برابر ہوں!''

وہ چپ ہوگئی مگر برابر ہنستی رہی، یہاں تک کہ آنسو کے چند قطرے آنکھوں سے نکل کر گالوں پر ڈھلک آئے اور ہوا کے ایک جھونکے نے ٹمٹماتی شمع کو بھی خاموش کر دیا۔

تیسری رات۔ صبح بھروسے کسی پرندے کے پھڑ پھڑانے سے اُٹھا۔ اُس نے دیکھا سامنے گلی پار والے مکان کی دیوار پر کئی گدھ بیٹھے ہیں۔ اُس نے جلدی سے منہ پھیر کر ادھر دیکھنا چاہا، جدھر لکشمی کی مورتی رکھی تھی تو پہلے جوانی کی متوالی نیند سونے والی ہریا ہی پر نظر پڑی اور وہ 'رام! رام!'' کہتا ہوا لوٹے میں پانی لے کر نیچے چلا گیا۔ جب وہ وہاں سے پلٹنے پر کوئلے سے دانت مانجھ کر نہا رہا تھا تو ہریا جاگی... وہ لیٹے ہی لیٹے انگڑائی لیتے ہوئے بولی ''ہم بھی نہائیں گے کاکا! ہمارے لیے بھی پانی نکال دینا۔''

بھروسے نے بھیگی دھوتی بدل کر گھڑے اور برتنوں میں بھی پانی بھر دیا۔ پھر ہریا کو بھرا گگرا دے کر کہا ''لے تو بھی نیچے جا کر نہا ڈال!'' اور جب وہ گگرا اور لوٹا لے کر نیچے چلی، تو اس نے کہا ''ارے، وہ جار جٹ والی ساڑی بھی تو لیتی جا، نہا کے پہنے گی کیا؟''

ہریا نے مسکرا کر اسے دیکھا، ساڑی بکس سے نکالی اور کمر لچکاتی نیچے چلی گئی۔

بھروسے نے ہریا کے واپس آنے تک چائے تیار کر لی تھی، اور یہ بھی طے کر لیا تھا کہ وہ ہریا سے اپنی وہ خواہش بھی بیان کر دے گا، جو کل سے اس کے لیے وبال جان بنی ہوئی تھی۔ جب ہریا کنگھی چوٹی سے فارغ ہو کر چائے پینے لگی تو بھروسے نے اس سے کہا: ''تجھے یہ گھاگھرے والا جوڑا بہت پسند ہے؟''

وہ ناک سکوڑ کر بولی۔ ''پسند ہو یا نا پسند، کچھ مجھے مل تھوڑے جائے گا!''

بھروسے نے کہا ''تجھے دینے ہی کے لیے تو پوچھ رہا ہوں!''

ہریا تعجب اور خوشی سے اُچھل پڑی ''سچ؟'' اس نے اپنے کانوں پر بھروسہ نہ کر کے پوچھا۔ بھروسے نے نظریں جھکا کر کہا ''ہاں، مگر ایک شرط پر...''

وہ لپک کر گھاگھرے والا جوڑا اُٹھا لائی، اور اسے گال سے لگا کر ہنس کر بولی۔ ''مجھے ساری سرتیں منجور ہیں!''

بھروسے کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ وہ کچھ جھنجھلا کر بولا۔ ''اری پوری بات تو سن لے! یہ جوڑا لینے کے لیے تجھے میرے سامنے ننگی ہو کر کھڑا رہنا پڑے گا!''

نہ جانے کیوں ہندوستان کی عورت، اپنے پورے دھڑ کی نمائش کو سب سے زیادہ بے شرمی سمجھتی ہے۔ وہ اپنی خوشی سے نہ پتی کے سامنے عریاں ہو گی، اور نہ یار کے سامنے۔ غالباً اس کے دل میں یہ یقین چھپا بیٹھا ہے کہ اس کا جسم اتنا حسین نہیں، جتنا کہ اُس کا چہرہ۔ رُخ زیبا، حنائی ہاتھ، صندلی پاؤں کے علاوہ اسے کسی عضو کے حسین بنانے کی فکر بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اس کے نزدیک بھی ان کی دل کشی مشتبہ رہتی ہے۔ اسے فطرت اس کی نمائش پر نہیں اُکساتی۔ حسن کا یقین ہی خود نمائی پر اُبھارتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہی ہریا جو دو دن سے اپنی نسوانیت اور اپنی جوانی کی طرح طرح سے نمائش کر رہی تھی۔ بھروسے کی شرط سنتے ہی چیخ اُٹھی ''ہائے دیا! کبھی نہ ہو گا!''

بھروسے نے سمجھایا ''پگلی! میں کسی اور گرج (غرض) سے تھوڑے کہہ رہا ہوں۔ میں تیرا ننگا شریر دیکھ کر بھر پور جوانی کی ایک مورتی بناؤں گا۔''

وہ ذرا نرم پڑ کر بولی ''اور سارے لوگ مورتی دیکھ کر مجھے پہچان جو لیں گے!''

بھروسے ''ارے اس میں تیرا چہرہ تھوڑے ہو گا۔ بس تیرا شریر!''

ہریا نے ہاری ہوئی آواز میں کہا ''اور جو کوئی مورتی بناتے وکھت (وقت) مجھے دیکھ لے!''

بھروسے نے جیتی ہوئی آواز میں کہا ''پگلی! آج اس چھت پر اور اس کے اِرد گرد آکاش پر لٹکے ہوئے سورج کے سوا، اور کون دیکھنے والا ہے!''

اور وہ اُٹھ کر مٹی کے پاس چلا گیا۔ ہریا لہنگے والا جوڑا سینے سے لگائے، خوشی سے کھڑی جھومتی رہی، بھروسے نے کہا، ''اب اسے کھولے پر رکھ کر ادھر آ!'' اور جب وہ اس کے قریب

آ کر لجائی ہوئی کھڑی ہوگئی تو پھر بھروسے نے کہا ''سر کے بال کھول دے!''

اس نے جوڑا کھول دیا۔ کالے بال ہوا میں لہرانے لگے، بھروسے نے بہت سی گیلی مٹی لے کر اسے پورے انسانی چہرے کی صورت دینا شروع کی۔ سر کے بال، پیشانی، بھویں، آنکھیں، ناک، کان، ہونٹ، ٹھوڑی، جب ساری چیزیں بن چکیں، تو گردن اور اس سے نیچے کے حصّوں کی نوبت آئی۔ ہریا نے اب بھی یہ سارے اعضا ساڑی سے ڈھک رکھے تھے۔

بھروسے اُٹھ کر اس کے پاس گیا۔ اس نے اس ذرا سا ترچھا کیا اور بغل میں دَبے ہوئے ساڑی کے آنچل کو کھینچ کر اُسے آدھے دھڑ سے ننگا کر دیا۔ ہریا نے ''ہائے رام!'' کہہ کر منہ چھپا لیا۔ بھروسے نے اپنی مورتی میں اس کے کھلے ہوئے اعضا اُتارنے شروع کر دیئے۔ مگر ہاتھوں کے چہرے پر ہونے سے وہ اپنی صحیح شکل میں اور ٹھیک جگہ پر نہ تھے۔ اس نے کہا ''ہاتھ گرا دے!'' ہریا ہاتھ گرا کر بھروسے کو بڑے تعجب سے دیکھنے لگی۔

فنکار کے چہرے پر ہوس کی چھاؤں تک نہ تھی۔ اس کے ماتھے پر شکن تھی اور وہ اسے جب بھی دیکھتا، تو اس طرح دیکھتا، جیسے اس فوٹو گرافر نے دیکھا تھا، جس نے منگلو کی فرمائش پر اس کا فوٹو کھینچا تھا۔ وہ منگلو کے ساتھ حضرت گنج سینما دیکھنے گئی تھی۔ وہاں، پان سگریٹ والے کی دُکان کی بغل میں، ایک فوٹو گرافر نے اپنی دُکان بھی کھول رکھی تھی۔ چار آنے فی تصویر لیتا تھا۔ پھر مزہ یہ کہ اِنٹرول میں تصویر کھنچواؤ اور کھیل ختم ہوتے ہی پیسے دے کر اپنی تصویر لیتے جاؤ۔ منگلو مچل گیا تھا۔ ''میں تیری تصویر کھنچوا کر اپنے پاس رکھوں گا۔'' اور ہریا نے کہا تھا ''میں بھی تیری تصویر اپنے پاس رکھوں گی۔'' بس اِنٹرول میں دونوں نے اپنی اپنی تصویریں کھنچوائی تھیں۔ لیکن فوٹو لینے سے پہلے فوٹو گرافر نے اس سے پہلے تو ٹھیک طرح کھڑے ہونے کو کہا تھا۔ پھر اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا جھکا سر اُٹھایا، گھمایا تھا، پھر وہ بولا تھا ''مسکراؤ!'' اور اس رات کی زبردستی کی بلائی ہوئی مسکراہٹ یاد کر کے، وہ اس وقت بھی مسکرا دی۔ اور اس نے دل ہی دل میں سوچا ''اس بے چارے بھروسے کا کاسے کیا شرمانا ہے، یہ تو فوٹو کا کیمرہ ہے!'' اور اس نے ایک 'اونہہ!' کر کے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لیے اور ذرا تن کر کھڑی ہوگئی۔ بھروسے کے منہ سے بے ساختہ 'واہ!' نکل گئی اور وہ جلدی جلدی اس انداز کو مٹی کی مورتی میں اُتارنے لگا۔

ماڈل بننا کوئی آسان کام نہیں۔ جیتی جاگتی، ہنستی بولتی حسینہ کو بت بن جانا پڑتا ہے۔ وہ

سوچنے لگتی ہے عورت ہو کر، وہ کیوں مداری کی بندریا بن رہی ہے۔ اس کے لیے جسم کی نمائش میں نہ کوئی راحت ہوتی ہے نہ لذت، بس چند سکّے، کچھ پیسے مل جاتے ہیں۔ اس کا ہر لمحہ اپنی بے بسی، اپنی کمتری، اپنی تنگ دستی، اپنی ذلتِ نفس کے احساس میں گزرتا ہے۔ ہریا بھی کھڑے کھڑے تھک گئی تھی۔ ڈھلتی ہوئی دُھوپ بھی ننگے جسم کو جلانے لگی تھی۔ مگر فنکار بھروسے اپنی جنت میں تھا، اُسے نہ تھکن احساس تھا، نہ گرمی کا، نہ سردی کا...اسے تو وہ راحت مل رہی تھی، جو ٹپکتے پھوڑے سے مواد نکلتے وقت ملتی ہے۔ جلن، کھٹک، درد، آہستہ آہستہ کم ہو جاتا تھا اور آرام وسکون بڑھتا چلا جاتا تھا...وہ آہستہ آہستہ گنگنانے بھی لگا تھا: ''کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں! کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں!''

ہریا نے تھک کر ہاتھ نیچے گرا دیئے، اس کے سارے اعضا میں ایک ڈھیلا پن سا آ گیا۔

بھروسے غرّایا ''کیا کرتی ہے چھوکری! ویسے ہی کمر ہر ہاتھ رکھے تنی کھڑی رہ!''

ہریا نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''تھک گئی کاکا!''

وہ اسی طرح ڈانٹ کر بولا ''تھکنا وکنا کچھ نہیں! اس طرح کھڑی رہ، جیسے مجھ سے لڑ رہی ہے!''

اور ہریا سر جھٹک کر واقعی لڑنے والے انداز میں کھڑی ہو گئی۔ اور اس کا بھروسے کیا، بھگوان سے بھی لڑنے کو جی چاہنے لگا۔ ''کیا حق ہے ایک پرائے مرد کو کہ وہ اس طرح اسے آدھا ننگا کر کے دیکھے؟ بس اسی لیے نا کہ اس نے اُسے ایک ساری ایک لہنگا دے دیا ہے؟ تو خود بھگوان نے کیوں اسے پہلے ہی سے ایسی ساڑی ایسا لہنگا نہ دیا؟ بھگوان کے ہاں تو کسی چیز کی کمی نہیں۔ وہ سیٹھ رام داس کی بہوؤں، بیٹیوں کو سب کچھ دے سکتا تھا، وہ ملیا کی بیٹی کو کیوں نہ دے سکتا تھا؟ اور اس بھروسے کو تو دیکھو۔ اسے اس طرح دیکھ رہا ہے۔ جیسے قصائی بکری کو دیکھتا ہے۔ اسے نظروں نظروں میں تول رہا ہے، کتنا گوشت نکلنے لگا اس میں اور کتنی چربی، کتنے کو گلے پائے بکیں گے اور کھال کے کیا دام آئیں گے! خود ہی کہتا ہے اس کا شریر جوانی کا رُوپ ہے۔ پھر اس بھرپور جوانی کو دیکھ کر اس بوڑھے میں گرمی کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ کیا اس کی ساڑی گرمی اسی ہتھنی منجھو کے لیے ہے؟ اور کیا کہے وہ بھد بھد منجھو، جو اپنے اس سوکھے گاجر کے سے پتی کو یوں آدھے دھڑ سے ننگی ہریا کو گھورتے دیکھ لے؟'' وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

اس ہنسی پر بھروسے نے سر اُٹھا کر اُسے تعجب سے دیکھا اور جلدی جلدی گردن کی رگوں کے اس تناؤ کو مورتی میں منتقل کرنے میں محو ہو گیا۔ ہریا نے بھروسے پر ایک حقارت انگیز نظر ڈالی، اور وہ گردن جھکائے ٹین کے نیچے بسکھٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ پھر لوٹے میں پانی بھر کر وہ اسے ہاتھ میں لیے نیچے چلی گئی۔

ہریا کی چیخ سن کر بھروسے چونکا ''کیا ہوا؟ کیا ہوا'' کہتا، وہ جھپٹ کر اُٹھا اس نے چھت پر نظر ڈالی۔ ہریا دکھائی نہ دی۔ اس نے صحن میں جھانک کر دیکھا، وہاں بھی نظر نہ آئی۔ اس نے پکارا ''ہریا! کہاں گئی رے؟'' نیچے سے گھٹی گھٹی آواز آئی ''یہاں!'' وہ ڈنڈا اُٹھا کر اُسے زمین پر مارتا، کھٹ کھٹ کرتا نیچے اُتر آیا۔ اس نے دیکھا ہریا کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی کانپ رہی ہے۔ اس نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا، ''کیا ہوا؟'' مگر ہریا کی گھگھی بندھی تھی، وہ بول نہ سکتی تھی، اس نے کمرے کے اندر اشارہ کر دیا۔ بھروسے نے جھانک کر دیکھا۔ دوڑھائی گز کا ایک افعی پھن پھیلائے جھوم رہا تھا اور اس کے سامنے ایک نیولا اپنے جسم کو سمیٹے پچھلے پاؤں جھکائے اُچک کر حملہ کرنے کے انداز سے کھڑا تھا۔ بھروسے نے ہریا کو ڈھکیل کر پیچھے کیا ''اری تو یہاں آئی کیوں؟ چل اُوپر، لڑنے دے ہرمجادوں کو!''

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ سانپ نے پھکاری مار کر حملہ کیا۔ نیولا اُچک کر وار خالی دے گیا۔ سانپ نے جھنجھلا کر پھر سر اُٹھایا۔ بھروسے تماشہ دیکھنے کے لیے ذرا اور آگے بڑھا تو ہریا نے اُسے کھینچ کر دروازے کی چوکھٹ اور بازوؤں کی طرف انگلی اٹھا دی۔ چوکھٹ پر بیسیوں کنکھجورے لپٹے ہوئے تھے اور بازوؤں پر کالے کالے بچھو، اپنے اپنے ڈنک اُٹھائے اس طرح ٹہل رہے تھے، جیسے پہرا دے رہے ہوں کہ کوئی ان کے راج میں گھسنے نہ پائے۔ بھروسے نے ان کی طرّم خانی نکالنے کے لیے ڈنڈا اٹھایا ہی تھا کہ اس نے ایک بھنبھناہٹ سنی۔ نظر اُونچی کی، تو دیکھا دروازے کی اُوپر والی چول میں لال بھڑوں نے چھتا لگا رکھا ہے۔ اس کے آگے بچھوؤں کا بھی پتا پانی ہوتا تھا۔ مجال نہ تھی کہ وہ بھی ان کی سلطنت میں قدم رکھیں۔

بھروسے خود بھی ڈر گیا۔ وہ ہر کیڑے مکوڑے میں، نہ جانے کتنی بھیانک روحوں کے رُوپ دیکھتا تھا۔ نہ جانے ان میں کس کس طرح کے بھوت ہوں! وہ ہریا کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹا ہی تھا کہ ایک مینڈک رسوئی گھر کی دہلیز سے اُچھل کر پانی میں اچانک چھپاک سے کودا۔ اور

وہ دونوں چیختے ہوئے ایک ساتھ بھاگے۔ ان کی اس سراسیمگی پر کئی مینڈک ٹرٹر کر کے بے ساختہ ہنس پڑے اور یہ بھاگتا ہوا جوڑا زینے کی پہلی سیڑھی پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ہریا نے مڑ مڑ کر مینڈک کو ڈانٹا۔ ''ہر مجادے! لے کے ڈرا دیا!'' اور پھر پلٹ کر بھروسے کو طعنہ دیا ''واہ رے کاکا واہ! تم تو مجھ سے بھی ڈرپوک نکلے!'' وہ ہنستی ہوئی زینے پر چڑھ گئی۔ اور بھروسے کچھ تو اپنے گھر کو کیڑوں مکوڑوں کا مسکن بنا ہوا دیکھنے سے، اور کچھ ہریا کے سچے طعنے پر جھنجلایا ہوا اُوپر آیا، اور اس نے بانکے بہادر کو ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ وہ بھی اس کی کمزوری اور بے بسی پر ہنستا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے جھلا کر مورتی دیوار پر کھینچ ماری۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ پھر اس نے جھپٹ کر 'انوکھی ناگن' اُٹھالی۔ وہ اسے بھی دیوار پر دے مارنے والا تھا کہ ہریا نے چیخ کر کہا ''ارے کیا کر رہے ہو؟ کاہے کا تیہا ہے؟''

بھروسے نے ڈانٹ کر کہا ''تو چپ رہ! تجھے کیا مطلب؟ تو چائے بنا!'' مگر اس نے انوکھی ناگن کو پٹکا نہیں۔ بلکہ اسے دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے ہریا کو کنکھیوں سے دیکھا، وہ آگ جلانے میں مشغول تھی۔ اس نے بانکے بہادر کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ایک ایک کر کے بڑے پیار سے اُٹھائے اور آہستہ آہستہ گلی والی منڈیر کی طرف جا کر ہاتھ بڑھا کر انھیں پانی میں اس طرح ڈالا جیسے کوئی جگر کے ٹکڑے کی لاش اپنے ہاتھ سے گنگا میں بہاتا ہے۔

شفق کی سُرخی غائب ہو چلی تھی، چائے کے بعد کھچڑی تیاری ہو رہی تھی۔ بھروسے پر ایک عجیب طرح کی یاسیت چھائی جا رہی تھی۔ کیا فائدہ گھر بنانے کا؟ کیا فائدہ مورتیاں بنانے کا؟ کیا فائدہ آدرشوں، اصولوں پر چلنے کا؟ کیا فائدہ بھگوان پر یقین کرنے کا؟ ایک دن مرنا سب کو ہے۔ کون جانتا ہے کہ شمشان میں جل جانے کے بعد پھر کیا ہو گا، کیا نہیں ہو گا کیا دوسرا جنم، تیسرا جنم! میں اس سے پہلے کیا تھا، میں کچھ نہیں جانتا۔ میں مر کے کیا بنوں گا، میں کچھ نہیں جانتا۔ کچھ نہیں جانتا۔ کچھ نہیں! کچھ نہیں! سب کچھ مایا ہے، ڈھکوسلا ہے، دھوکا ہے۔ بیوی بچّے، شہرت، نام، سب بے کار! لوگ کہتے ہیں فنکار، ادیب، شاعر، بڑے بڑے کام کرنے والے اَمر ہو جاتے ہیں۔ لوگ انھیں کبھی نہیں بھولتے۔ مگر اس سے مرے ہوئے فنکار کو فائدہ؟ کوئی یاد کرے یا نہ کرے، کوئی اچھا کہے یا بُرا سمجھے، جب ہم ہی نہ رہے تو پھر کیا؟ چتا میں جلنے کے بعد، ہوا اس کی راکھ کو کہیں اور اُڑا لے جائے گی اور منجھو کی راکھ کو کہیں اور۔ ذرّے ملے بھی تو کیا

وہ ایک دوسرے کو جان سکیں گے، پہچان سکیں گے؟ کچھ نہیں! کچھ نہیں! ہم سب بڑے کمہار کے کھلونے ہیں، جب ٹوٹ جاتے ہیں وہ ہمیں پھینک کر دوسرے بنانے لگتا ہے۔ اور وہ آپ ہی گنگنانے لگا! ''کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں۔ کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں!'' پھر دفعتاً اسے خیال آیا۔ کون بہلایا گیا ہے؟ میں یا بڑا کمہار؟ میرے لیے تو ہزاروں جنجال ہیں، ہزاروں فکریں۔ اگر ان کھلونوں سے میرا دل بہل جاتا، تو پھر مجھے منجھو کی کیوں فکر ہوتی، مالتی اور منو کے لیے میرا دل کیوں کڑھتا؟ اور یہ چھوکری ہریا بھی تو ایک کھلونا ہی ہے۔ کیوں نہ دل بہلاؤں میں اس سے؟ مگر بہلے گا بھی دل اس سے؟ بس چند منٹ کی لذّت اور جنم بھر کی ذلت! میں اور منگلو دونوں پلے میں برابر ہی ٹھہریں گے۔ منگلو کو تو لوگ گُنڈا کہتے ہیں۔ مگر میں! میں تو دیوی، دیوتاؤں کا بنانے والا ہوں۔ اگر میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھوں، تو کیا میں پھر کسی دیوی کی مورتی بنا سکوں گا؟ کیا میں لکشمی کو بلا کسی گندے خیال کے چھو سکوں گا؟''

اس کے خیالات کی زنجیر، ہریا کی آواز نے ایک جھٹکے سے توڑ دی۔ وہ بٹلوئی، آگ سے نیچے اُتار کر بولی ''لو آؤ کھچڑی کھالو، تیار ہوگئی۔'' اور بھروسے کو دفعتاً محسوس ہوا کہ وہ بہت تھک گیا ہے، اور اسے بھوک بھی لگی ہے۔ وہ خاموشی سے منہ ہاتھ دھو کر کھچڑی کھانے بیٹھا تو ہریا نے تعجب سے پوچھا کہ ''نہاؤ گے نہیں؟'' وہ بولا ''سارا محلّہ ہی پانی میں نہار رہا ہے۔ میں نہ نہاؤں گا تو کون سا ہرج ہو جائے گا!''

کھچڑی کھا کر وہ لکشمی دیوی کی مورتی کو اُٹھا لیا۔ ہریا نے گھبرا کر پوچھا ''اب کیا اسے بھی توڑنے کا ارادہ ہے؟'' وہ بولا ''نہیں! تو بار بار کہتی ہے ڈر لگتا ہے۔ اُسے تیرے سرہانے کھڑا کردوں گا، اس کے چرنوں میں تو تجھے ڈر نہ لگے گا!''

اور ہریا آج کی رات کے لیے ساری سوچی ہوئی شرارتیں بھول کر دیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر جھک گئی۔

دوسرے دن بھی سویرے اُٹھتے ہی، جو سب سے بڑی فکر سر پر سوار ہوئی، وہ گھر سے نکلنے کی تدبیر کی تلاش تھی۔ بھروسے پھر دیوار پر چڑھا، پھر دوسروں کی دیواروں اور چھتوں سے ہوتا ہوا سڑک تک پہنچا۔ اس نے سیٹھ جی کے چوکی دار کو آواز دی۔ مگھوا اپنی چھت کی منڈیر پر آبیٹھا۔ دونوں میں باتیں ہوئیں۔ خبریں بڑی بھیانک تھیں۔ دو سو سے زیادہ آدمی، عورتیں

بچے، لوہے کے پل پر پھنسے ہیں اور پل کو پانی دونوں کناروں سے کاٹ رہا ہے۔ دھارا اتنا تیز ہے کہ نہ کوئی کشتی، نہ کوئی پیرنے والا اُن تک پہنچ سکتا ہے۔ رات کے سناٹے میں جب پل ہلتا ہے تو لوگ اس طرح چیختے ہیں کہ آواز مگھو تک آتی ہے۔ ان کی فریاد سن کر دل ٹکڑے ہوتا ہے، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔ اس پر دو دن سے سب بھوکے ہیں، ایک دانہ کسی کو نہیں ملا ہے۔

مگھو یہی بیان کر رہا تھا کہ ایک ہیلی کاپٹر اُڑتا ہوا آیا، اور پل کی طرف نیچا ہو کر، کچھ گراتا دکھائی دینے لگا۔ ہوا مظلوموں کی آوازیں بھروسے تک لانے لگی ''ارے روٹی ہے! روٹی! چنا ہے؟ ارے ایک ٹکڑا مجھ کو بھی! چار دانے اس بچے کو بھی! ہائے، ہائے! پورا تھیلا پانی میں چلا گیا! ہائے! ہائے! ارے بچاؤ! بچاؤ! ہمیں یہاں سے نکالو!'' مگر ہیلی کاپٹر ان کے سروں پر سے اُڑتا ہوا اونچا ہو گیا اور کہیں اور مدد پہنچانے نکل گیا۔ اس میں بیٹھنے والوں نے مشین کے شور میں غالباً فاقہ کشوں کی چیخیں بھی نہ سنیں!

چوکیدار نے پھر چیخ کر کہا ''اور بھروسے کاکا جرارات کو ہوسیار سونا، رات کو ناؤ پر چوڑ ڈاکو بھی گھومنے لگے ہیں۔ اس آپھت (آفت) میں بھی ہرامجادے اپنے کام میں لگے ہیں۔ کھوب کھوب مال کاٹ رہے ہیں!''

اور پھر ہریا نے پکارنا شروع کیا ''کاکا! کاکا! بھروسے کاکا! بھروسے کاکا!''

بھروسے نے پکار کر جواب دیا ''آرہا ہوں، آرہا ہوں!'' اور جب وہ گھر کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا ہریا ٹین والی دیوار پر کھڑی ہے۔ اور بھروسے نے وہیں سے پھر ڈانٹا ''تو کیوں اُوپر چڑھ آئی؟ نیچے اُتر!''

لیکن وہ اس وقت تک وہیں کھڑی رہی، جب تک بھروسے ٹین پر نہ آ گیا۔ پھر وہ بولی ''میں سمجھی تم بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ سارا گھر کاٹ کھانے لگا۔ اور میں نے اُوپر چڑھ کر اپنے گھر کو دیکھا، مجھے جان پڑا ماتا جی اسی کے نیچے کچلی پڑی ہیں۔'' اور وہ وہیں بیٹھ کر سسکنے لگی۔ بھروسے نے دلاسا دیا ''پگلی! وہ سہر میں چین کر رہی ہے۔ وہ یہاں کہاں تھی کہ کچل جاتی؟ بے کارمت رو۔ چل، نیچے اتر آ'' اور وہ اسے سنبھال کر نیچے لے آیا۔ اور گو اس کا مورتی بنانے کا آج جی نہ اُٹھتا تھا مگر ہریا کی توجہ بٹانے اور اسے غصہ دلانے کے لیے بھروسے نے کہا

''چل، چل! لہنگے کے دام ادا کر!''

ہریا نے اسے بڑے غصّے سے دیکھا۔ وہ بولا ''گھورتی کیا ہے؟ ایسا بڑھیا لہنگا کہیں مپھت (مفت) ملتا ہے۔'' اور وہ مٹّی میں تھوڑا پانی ملا کر اسے نرم کرنے لگا۔ ہریا کھڑی اُسے غصّے سے دیکھا کی۔ بھروسے نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے حکم سنایا، ''کھڑی دیکھتی کیا ہے؟ چل، ساڑی اُتار!''

ہریا ٹہلتی ہوئی کمر میں بیسیوں بل ڈالتی ہوئی اس کے پاس پہنچی اور دانت پیس کر بولی ''نہیں ننگے ہوں گے! نہیں ننگے ہوں گے! تمھارا جو جی چاہے کر لو!''

بھروسے نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ ٹین کے نیچے سے لہنگے والا جوڑا اُٹھایا اور اسے لیے ہوئے گلی والی منڈیر کی طرف چلا۔ ہریا نے تعجب سے پوچھا ''کہاں لیے جارہے ہو اسے؟''

بھروسے نے کہا ''تو اب اُسے لے گی نہیں! مالتی کو مَیں اسے پہننے نہ دوں گا۔ اس لیے یہ تین سو کی لاگت کا جوڑا بے کار ہے اسے پانی میں بہا دینا ہی ٹھیک ہے!'' اور اس نے جوڑا اس طرح ہاتھوں پر اُونچا کیا کہ جیسے وہ اُسے پھینکنے والا ہی ہے۔ لہنگے کے زری کے کام میں، اور دوپٹے کی ٹانکن میں سورج کی کرنیں پھنس کر تڑپیں، ہریا کے دل پر بجلی سی گری۔ اس نے اُچک کر بھروسے کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ گڑگڑائی ''نہ پھینکو کاکا! میں تمھارے سامنے ننگی ہوں گی! سو بار ننگی ہوں گی!''

بھروسے ایک جیتے ہوئے شاطر کی طرح مسکرایا، اور اس نے جوڑا ہریا کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اسے سینے سے لگائے دیر تک کھڑی جھوما کی۔ پھر اس نے اسے جا کر کھٹولے پر رکھا اور اس طرح آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا جیسے اس کا سویا ہوا محبوب ہے! پھر اس نے سر جھٹک کر ساڑی کھول کر پھینک دی اور بڑی متانت سے ٹہلتی ہوئی بھروسے کے پاس آ کر بولی ''لو! دیکھ لو! جی بھر کر دیکھ لو!''

اور بھروسے دوپہر تک دُھوپ میں بیٹھا، پسینے میں نہایا، مورتی بناتا رہا۔ ہریا کو ایک گھنٹہ کے بعد روٹی دال پکانے کے لیے چھٹی مل گئی تھی۔ مگر خود بھروسے کا نہ تو ہاتھ رُکا اور نہ اس نے دم لیا۔ بار بار مختلف اعضا کو بناتا، بگاڑتا، توڑتا، بدلتا رہا۔ کسی کے تناؤ میں کمی کرتا، کسی کے

ڈھیلے پن کو کستا، کسی کو بڑھاتا، کسی کے اُبھار کو گھٹاتا۔ اس نے مورتی سے اسی وقت سر اٹھایا جب ہریا نے روٹی کھانے کے لیے پکارا۔ اس نے پہلے اشنان کیا پھر وہ تھوڑا سا کھانا کھا کر بکس پر لیٹ گیا اور منزل پر پہنچے ہوئے مسافر کی طرح اطمینان سے سو گیا۔

ہریا پر بھی اس کی متانت، اور فن میں اس کی محویت کا بڑا اثر پڑا۔ وہ اپنا چنچل پن بھول گئی۔ اور وہ بھی برتن مانجھ دھوکر، جب کھٹولے پر کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹی تو اُسے فوراً نیند آ گئی۔ سہ پہر کو ہیلی کاپٹر کی بھربھراہٹ نے انھیں جگا دیا۔ دونوں کھلی چھت پر آ کر اسے دیکھنے لگے۔ بھروسے ہریا کی میلی ساڑی ہوا میں لہرا لہرا کر زور زور سے پکارا۔ ''ہمیں بچاؤ!'' مگر ہیلی کاپٹر اُڑتا ہوا دُور نکل گیا۔ نہ جانے اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظر ان دونوں پر پڑی بھی یا نہیں۔ ہریا سسکنے لگی، ''کسی کو ہماری پروا نہیں! کوئی سنتا ہی نہیں! ہم یہیں مریں گے! سڑیں گے!''

بھروسے نے دلاسا دیا ''کیوں بن ناہک (ناحق) ہلکان ہوتی ہے! بھگوان تو ہے، وہ تو سب سنتا دیکھتا ہے!''

ہریا نے جل کر کہا ''پر اس کے ہردے میں دیا نہیں! وہ کسی کی بپتا سن کر پسیجتا ہی نہیں!''

بھروسے نے اپنی قابلیت جتائی ''ارے گالب (غالب) کہہ گیا ہے، ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا! آ چل، مورتی بنائیں!'' اور وہ مورتی کے پاس جا کر اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ ٹانگوں کے تناؤ یا جھکاؤ میں اسے کچھ شک ہوا۔ وہ بولا ''جرا ساڑی کھول کر گرا دے!''

ہریا جھنجھلا اُٹھی ''تمھارا جی ہی نہیں بھرتا ننگی دیکھنے سے!''

وہ عاجزی سے دانت نکال کر بولا ''کھپا (خفا) مت ہو! ایک جگہ مورتی ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ میں پھر دیکھ لینا چاہتا ہوں!''

ہریا نے پھر جھٹکے سے ساڑی کھول کر دُور پھینک دی۔ ''لو پھر دیکھو! اچھی طرح دیکھو!'' وہ بولی۔

تھوڑی دیر تو وہ تنی کھڑی رہی، پھر بھروسے کی پتلی پتلی انگلیوں کو مٹی کو بے پروائی سے توڑتے، مروڑتے، گھٹاتے، بڑھاتے دیکھ کر وہ خود مورتی کو جھک کر دیکھنے لگی۔ وہ اسے دیکھتی، پھر اپنے جسم کے مختلف حصوں کو دیکھتی۔ معلوم ہوتا ہو بہو وہی کھڑی ہے۔ بس چہرہ دوسرا تھا۔ حد

درجہ حسین، دلکش، نک سک سے درست۔

ہریا احساس کمتری کا شکار ہو کر، بھروسے کا کندھا جھنجھوڑ کر بولی ''اس کو میرا شریر دیا ہے، تو مجھے بھی اس کا چہرہ دو!''

بھروسے نے سر اٹھا کر مسکرا کر کہا ''پگلی! یہ تو مٹی کی ہے اس کو میں بنا رہا ہوں۔ تجھے تو سب سے بڑے کمہار نے بنایا ہے، بھگوان نے!''

ساڑی باندھنے کی غرض سے ٹین کی طرف اِٹھلاتے ہوئے جا کر ہریا نے کہا ''تو وہ تم سے بھی چھوٹا کمہار ہے!''

رات کو جب دونوں الگ الگ لیٹے، تو ہریا نے انگڑائی لے کر اپنے کو اتنا تانا کہ اس کی ٹانگیں کھٹولے سے باہر نکل گئیں، اس نے شرارت سے بھروسے کو چھیڑنے کے لیے کہا ''کاکا، یہ کھٹولا بہت چھوٹا ہے، کہو تو تمھاری ہی کھاٹ پر میں بھی آ جاؤں!''

بھروسے نے غرا کر کہا ''ہرمجادی! لگی پھر پاجی پن کرنے!''

وہ بولی ''اب اس میں لجانے کی کیا بات ہے؟ تم میرا رواں رواں تو دیکھ چکے!''

بھروسے نے جھلا کر طعنہ دیا ''میں منگلو نہیں ہوں!''

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''نہ جانے کس حال میں ہے وہ بے چارا۔ وہ یہاں آ سکتا تو اب تک کب کا مجھے آ کر نکال لے گیا ہوتا!''

بھروسے نے طنز سے کہا ''جرور! جرور!''

ہریا نے جھنجھلا کر کہا ''وہ مرد ہے کاکا! مرد! تم جیسا نہیں!''

بھروسے نے حد درجہ تپ کر جواب دیا ''ہاں وہ مرد ہے۔ شیر ہے باگھ ہے! اسے معلوم ہوتا تو یہاں ہے تو وہ ہمکتا، اُچکتا، پھاندتا پہنچ جاتا! پانی اسے روکتا تو وہ ایسی ڈانٹ بتاتا کہ یہ سارے میں پھیلی ہوئی گومتی سمٹ کر سرکتا نالا بن جاتی! ہونہہ!''

اور اس نے کروٹ لے لی۔ ہریا نے پہلے تو اس کی باتیں تعجب سے سنیں۔ پھر وہ ہنسنے لگی۔ اُسے بھروسے کے منگلو سے تپنے جلنے سے تسکین سی محسوس ہوئی۔ وہ دیر تک مسکراتی رہی، پھر بھروسے کی اس بلا کو نیند آ گئی!

چوتھی رات: آدھی رات گزری ہو گی کہ کسی نے ٹارچ کی تیز روشنی چھت پر ڈالی، ہریا

کے کھٹولے سے ہوتی ہوئی، جب روشنی بھروسے کے چہرے پر پڑی، تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ روشنی غائب ہوگئی، مگر کئی آدمیوں کے بولنے اور پھر دھما دھم چھت پر کودنے کی آواز آئی۔

بھروسے نے خوف زدہ آواز میں پوچھا ''ک...ک...کون؟''

جواب ملا ''تمھارے چچا!'' پھر ٹارچ جلا کر اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی گئی اور تین سائے ہاتھوں میں بلّم لیے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ بھروسے کی گھگّی بندھ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ حواس ٹھکانے کر کے اُن کے مقابلے، یا اپنی حفاظت کی ہمّت کر سکے، ایک انی اس کے سینے پر رکھ دی گئی۔ اور ایک موٹی آواز میں حکم ملا۔ ''کھبردار جو اپنی جگہ سے ہلا...!''

ٹارچ کی روشنی بکسوں سے ہوتی ہوئی موم بتی پر بھی پڑی جو آدھی سے زیادہ جل چکی تھی، اور جو سوتے وقت بجھا دی گئی تھی۔ ان میں سے ایک بولا ''ارے اسے جلا لو، یہاں تو بڑا سامان ہے!''

ایک نے تو بتّی جلائی، دوسرا جو بھروسے کے سینے پر انی رکھے تھا بولا، ''جی، بکسوں کی چابی اِدھر بڑھاؤ!''

بھروسے نے سرہانے رکھا ہوا گچھا کانپتے ہاتھوں سے اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ گچھا لے کر بکس کھولنے لگا۔ اتنی جو کھٹ پٹ ہوئی تو ہریا جاگ اٹھی، اور گھٹی گھٹی آواز میں ''چور چور!'' چلّانے لگی۔ تیسرے ڈاکو نے بڑھ کر اُسے طمانچہ مارا ''چپ حرام جادی!''

بھروسے کی مردانگی کو ٹھیس لگی۔ ڈر پر غصّہ غالب آیا۔ اس نے کہا ''استری پر ہاتھ اٹھاتے تمھیں شرم نہیں آتی؟''

وہ بولا ''اچھا تو لے مرد کو مارتے ہیں!'' اور اس نے بھالے کا ڈنڈا اس زور سے بھروسے کے سینے میں کونچ دیا کہ وہ 'ہائے!' کر کے پلنگ سے نیچے گر پڑا۔ دوسرا ڈاکو پلٹ پڑا ''ارے اسے مارو نہیں، اسے باندھ کر ڈال دو۔ یہ اپنے سہر کا سب سے بڑا کاریگر ہے!''

اس نے کہا ''ہوگا کاریگر! لڑتا کیوں ہے!'' پھر وہ ہریا کی طرف مڑ کر بولا ''چپکی بیٹھی رہ، نہیں تو یہ بھالا سینے کے پار ہوگا!'' اور اس نے نیم بے ہوش بھروسے کو ننگا کر کے اسی کی دھوتی سے اس کے ہاتھ پاؤں کس کے باندھ دیئے۔ ہریا بھروسے کو یوں ننگا دیکھ کر اپنا ڈر بھول گئی اور بے ساختہ ''کھی کھی!'' کر کے ہنسنے لگی۔ ڈاکو نے بھروسے کے پاس ہی سے بیٹھے بیٹھے پوچھا

''کیوں ہنستی ہے رے!'' ہریا کی ہنسی رُک گئی۔ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ''کچھ نہیں!''

وہ ہاتھ سے خاک جھاڑتا ہوا اٹھا، اس نے ہریا کے سر کے بال پکڑ کر اس طرح کھینچے کہ ہریا کا چہرہ بالکل اس کی طرف ہو گیا۔ اس نے ہریا کو مخمور آنکھوں میں اپنی خونی آنکھیں ڈال کر کہا ''ہم ایسوں کی ہر بات کا ٹھیک جواب دیتے ہیں، میری جان!''

وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی، ''انھیں ننگا دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ انھوں نے مجھے ننگا کر کے...''

اس نے ہریا کے بال چھوڑ دیئے اور بھروسے کے چوتڑوں پر بلم کے ڈنڈے سے ہلکی سی چوٹ دے کر کہا ''اچھا تو یہ کرتوت ہیں، ان بڑے میاں کے!'' اور وہ خود بھی مسکرانے لگا۔

پھر اس نے ہریا سے پوچھا، ''کون ہے یہ تیرا؟ پتی کہ یار؟''

ہریا نے سر ہلا کر کہا ''کوئی نہیں!''

''پھر تو یہاں کیسے آئی؟ کہاں گھر ہے؟ اس نے پوچھا۔

ہریا نے کہا ''بگل (بغل) والے مکان میں۔ وہ گرنے لگا تو یہ مجھے بچا لائے!''

وہ مسکرا کر بولا ''اچھا، تو اسی جان بچانے کے دام یہ وصول کر رہے تھے! تو پھر چل ہمارے ساتھ! ہم تجھے سہر پہنچا دیں گے!''

بھروسے وہیں فرش پر پڑا بولا ''ارے نہ جانا اس کے ساتھ! یہ ڈاکو ہے!''

ڈاکو نے پلٹ کر بھروسے کو دیکھا ''اچھا، چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں!'' وہ غرایا اور اس نے بھروسے کو ایک ٹھوکر رسید کی ''کھبر دار جو اب ایک شبد بھی منہ سے نکالا!'' پھر وہ ہریا سے پلٹ کر بولا ''بول! چلے گی سہر؟''

ہریا نے کہا ''سچ؟ پہنچا دو گے؟''

اس نے کہا ''ہاں، ہاں، چل ہمارے ساتھ، نہ جانے کب یہ گھر بھی گر جائے!''

اتنے میں بکسوں میں سے ساری چیزیں سمیٹنے والوں میں ایک بولا ''ارے یار کیا لونڈیا سے مکھول (مخول) کر رہا ہے، لے یہ گٹھری تو ناؤ میں رکھ آ۔''

ہریا کو چھیڑنے والے نے ساتھی سے گٹھری لے کر ہریا کے سر پر رکھ دی ''چل، اسے ناؤ تک پہنچا!''

وہ ذرا ٹھٹکی تو ڈاکو بولا: ''ارے نکھرے (نخرے) نہ بگھار! سیدھے سیدھے چل!'' اور اس نے ہریا کو اس طرح ڈھکیلا جس طرح ٹھنڈے انجن والی موٹروں کو ڈھکیلا جاتا ہے۔ گلی والی منڈیر تک آ کر ہریا نے نیچے جھانکا۔ پانی اب منڈیر کے نیچے تھا۔ وہ غرا غرا کر دیوار کو ٹکریں مار رہا تھا۔ اسی میلے جھاگ سے بھرے پانی پر ایک کشتی تیر رہی تھی، جو منڈیر کی جھجھریوں سے بندھی تھی۔ اندھیرا تھا، پانی کی بھیانک آواز تھی اور بلم لیے ڈاکو بغل میں۔ ہریا جھجھک کر پیچھے ہٹی۔ ڈاکو نے زور سے بازو پکڑ کر کہا ''کھبر دار، چپکی کھڑی رہ!'' وہ کھڑی ہو کر تھر تھر کانپنے لگی۔ وہ کندھا تھپ تھپا کر بولا ''بڑی ڈرپوک ہے ری اور چمکار والے لہجے میں بولا ''آ، تو بھی چلی آ، کہاں اس بوڑھے کھوسٹ کے ساتھ رہ کر بھوکوں مرے گی! ابھی پانی ہپتوں (ہفتوں) نہیں گھٹے گا!'' ہریا نے کہا ''مجھے بڑا ڈر لگتا ہے!''

وہ بولا ''ڈر کاہے کا؟ ہم تین تین جوان ہیں، ابھی چٹکی بجاتے تجھے پار اُتار دیں گے!'' اور وہ پھر منڈیر پھاند کر چھت پر آ گیا۔

اِدھر دونوں ساتھ خوشی سے کھل کھلا رہے تھے۔ ''اچھے کا منہ دیکھ کر آج سبوں (صبح) اُٹھے! بڑا مال مسالا اکٹھا کر کے رکھا ہے اس کمہار نے!'' انھیں کی چھپا کر رکھی ہوئی چاندی کی اینٹیں ملی تھیں اور کئی ساڑیوں کی تہوں میں سو سو کے نوٹ بھی۔ انھوں نے یہ سب سمیٹ کر دوسری گٹھری میں باندھنا چاہا تو لہنگے والا جوڑا بھی اُٹھایا۔ ہریا چیخ پڑی ''اسے نہ رکھو! یہ میرا ہے!'' اور وہ ان کی طرف جھپٹی۔ ڈاکو نے اس کی کمر میں ہاتھ دے کر روکا ''ہاں، ہاں، یہ تیرا ہی ہے، بلکہ اس مال میں پورا تیسرا حصّہ تیرا ہے۔ تو چل میرے ساتھ!''

ہریا نے ٹھنک کر کہا ''تو ہم وہ بنارسی ساڑی بھی لیں گے جو دھانی رنگ کی ہے!''

اس نے ذرا چھٹا کر کہا ''ہاں، ہاں، وہ بھی لے لیتا، سب کچھ تیرا ہے پیاری!''

اور وہ اس کی گردن میں باہیں ڈال کر بولی ''تم بڑے اچھے ہو!'' اور اس کے ساتھ چلنے لگی۔ منڈیر کے پاس جب وہ سب پہنچے تو دونوں ساتھیوں نے کہا ''یہ کہاں کا جھول پال رہے ہو؟''

ہریا کے ساتھ والے ڈاکو نے کہا ''تم دونوں کی اپنی اپنی پتّنی ہے۔ ہم اپنا گھر نہ بسائیں؟'' اور ہریا سے بولا ''آؤ چلو، پیاری!''

اس نے کہا ''میں ابھی آئی'' اور لپکی ہوئی بھروسے کے پاس آئی۔ اس نے جھک کر

تیزی سے اس کے ہاتھ کی گرہ کھول دی۔ بھروسے نے کہا ''ارے مت جا، ان کے ساتھ۔ یہ ڈاکو ہیں۔ جان جوکھوں کا مالا (معاملہ) ہے۔

وہ ہنس کر بولی: ''ہونہہ! میں مردسے نہیں ڈرتی!''

ڈاکو نے پکارا ''اری کیا کرنے لگی؟''

وہ اس کی طرف جاتے ہوئے بولی ''کچھ نہیں اس ہیجڑے پر تھوک رہی تھی!'' اور اس نے پلٹ کر سچ مچ بھروسے پر تھوک دیا!

بھروسے کو زور کے قہقہوں کے ساتھ چپو کی چپ چپ تھوڑی دیر تک سنائی دیتی رہی، پھر وہی اپنے آنگن کے مینڈکوں کی ٹرٹر۔ بھروسے نے دھوتی کے پھندے ہاتھوں سے نکالے، ٹانگوں میں بندھی گرہیں کھولیں اور دھوتی باندھے بغیر وہ بکسوں پر جھکا۔ ایک ایک کر کے انھیں دیکھ ڈالا۔ تہہ میں بچھائے ہوئے کاغذ کے سوا ان میں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ ہر بکس کو دھڑاکے سے بند کرتا اور ہر بار ''حرم جادے! حرام جادے!'' کہتا رہا۔ پھر اسے نے دفعتاً اپنے جسم پر ہریا کے تھوک کی ٹھنڈک محسوس کی۔ وہ سارے جسم سے گنگنا اُٹھا۔ اور اس نے منہ بنا کر کہا ''حرام جادی!''

اس نے اپنی دھوتی گگرے کی گردن میں باندھی اور اسے گلی میں لٹکا کر بھرا اور پورا اگرا اپنے پر اُنڈیل لیا۔ اس نے جسم کے ہر حصّے کو خوب ملا، مگر تھوک سے داغ دار حصّے پر وہ اپنا ہاتھ نہ پھیر سکا۔ اس نے دوسرا اگرا پھر بھرا اور اسے کمر سے ٹانگوں پر اُنڈیلا۔ اب بھی وہ تھوکے ہوئے حصّے تک ہاتھ نہ لے جا سکا۔ اسے نہ جانے کیوں اپنے اس حصّے سے گھن لگتی تھی۔ اس گھن کی وجہ جسمانی سے زیادہ ذہنی تھی۔ کیا وہ ایسا بُرا تھا کہ ہریا جیسی چھوکری اس پر تھوکے؟ اور اسے عمر میں پہلی دفعہ اپنے جسم کے بے ڈھنگے پن کا احساس ہوا۔ دوسروں کے جسم کی خوب صورتی و بدصورتی پرکھنے والے فنکار نے اپنے سوکھے لاغر جسم کو غور سے دیکھا۔ واقعی اس کے اعضا میں کوئی تناسب نہ تھا۔ اس نے تلخی سے سوچا: ''عورت تو مضبوط سے مضبوط بازوؤں کا سہارا چاہتی ہے، اور توانا آغوش کی پناہ... وہ ہریا کے معیار پر پورا نہیں اُتر سکتا تھا۔ پھر بھی یہ تھوک! اُس نے بڑی نفرت اور حسرت سے ''حرام جادی!'' کہا اور بڑی بے بسی سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ شمع کی جھلملاتی روشنی میں مورتیوں والی مٹی دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر تھوڑی سی مٹی اٹھالی اور اُسے صابن کی طرح کمر سے نیچے سارے دھڑ پر مل ڈالا۔ اور جب اس نے تیسرا اگرا بھر کر جسم

دھویا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے فن میں کام آنے والی مٹی نے اسے پاک کر دیا ہے۔ وہ عجیب طرح کی فرحت محسوس کرنے لگا۔ اس کا کام کرنے کو بے ساختہ جی چاہنے لگا۔ اس نے اپنی نیم خشک دھوتی باندھ کر دُھند لکے ہی میں نا تمام مورتی سنبھالی اور کام میں لگ گیا اور زبان پر چڑھا ہوا مصرعہ گنگناتا رہا ''کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں!''

صبح دیر تک وہ سوتا رہا۔ اس کی آنکھ کسی کے پکارنے پر کھلی۔ کوئی قریب والی چھت سے پکار رہا تھا ''بھروسے کا کا!'' وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس نے چیخ کر پوچھا ''کون ہے بھائی؟ میں یہاں ہوں، اپنی چھت پر!''

تھوڑی دیر میں منگلو دیوار دیوار آتا دکھائی دیا۔ بھروسے نے دانت نکال کر پوچھا ''ارے تم کیسے ادھر نکل آئے، منگلو!'' وہ بولا ''تم ہی لوگوں کی کھوج میں نکلا ہوں کا کا۔'' پھر اس نے اِدھر اُدھر نظر ڈال کر پوچھا۔ ''وہ بے چاری ہریا کہاں ہے کا کا؟ اس کا تو پورا گھر ہی گر پڑا ہے!''

بھروسے نے کہا ''ہاں بھیّا بڑی تباہی آئی ہم سب پر! میں تو ہریا کو اسی رات اپنی چھت پر لے آیا تھا، جس رات پانی بڑھا ہے۔ بڑا آرام ملا اس لونڈیا کی وجہ سے۔ پر کل رات تین تین ڈاکو ناؤ پر چڑھ کر آئے اور میری چھت پر دھما دھم کو دے۔ منجھو نے جو کچھ عمر بھر میں اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹ کر مالتی کے بیاہ کے لیے اکٹھا کیا تھا، وہ سب بٹور لے گئے حرام جادے! اور ہریا کو بھی ساتھ لے گئے...''

منگلو نے ذرا کڑوے لہجے میں پوچھا ''وہ ہریا کو پکڑ لے گئے اور تم بیٹھے دیکھا کیے؟''

بھروسے نے کہا ''نہیں بھیّا! کہیں ایسا ہو سکتا تھا! پر، انھوں نے پہلے ہی سے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تھے۔ اور ہریا تو کھد (خود) انی کھسی (خوشی) سے ان کے ساتھ گئی...''

منگلو نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''ہا! اب اس کی جان بچنا مشکل ہے!''

بھروسے نے کہا ''مگر ان میں کا ایک بار بار کہتا تھا، میں تجھے اُس پار پہنچا دوں گا!''

منگلو نے کہا: ''اسے ساتھ لے جانے کے لیے اس پاجی نے باتیں بنائیں، وہ پار کیا اُتارے گا، ہریا سے ان کا نام پتہ پولیس کو نہ مل جائے گا؟'' پھر وہ رُک کر بولا ''اچھا، آؤ کا کا، تمھیں تو نکال لے چلیں، یہ محلّہ تو ابھی کئی دن پانی میں ڈوبا رہے گا!''

بھروسے نے پوچھا ''ارے بھیّا کچھ منجھو اور میرے بچوں کی بھی تمھیں کھبر ہے؟''

وہ بولا: ''بھگوان جانے کا کا۔ دوسو سے جیادہ (زیادہ) عورت، مرد، بچے، بوڑھے لوہے کے پل پر تین دن سے پھنسے پڑے ہیں، ہوائی جہاز سے روٹی چنا گرایا جارہا ہے۔ اب تک ان کو نکالنے کو کوئی ناؤ نہ جاسکی۔ ہم کھد گرجا گھر میں تھے۔ وہاں سیکڑوں آدمی بھوکا پڑا ہے...نہ جانے کہاں سے یہ پانی پھٹ پڑا ہے!''

بھروسے جلدی جلدی بکس پر بکس رکھ کر اوپر چڑھنے لگا تو منگلو کی نظر کھانے کے سامان پر پڑی۔ اس نے کہا'' کا کا یہ سب سامان اور برتن باندھ لو۔ گرجا گھر میں کسی کے منہ میں کئی دن سے ایک دانہ نہیں گیا ہے۔ سیٹھ رام رام داس بھی وہیں پھنسے ہیں!'' بھروسے نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ اور سامان تو ٹینوں میں تھا صرف چاول ایک تھیلے میں تھا۔ اُسی میں اس نے ایک بلٹوئی، مسالے کا ڈبہ، توا، کرچھا رکھا۔ مگر اور سامان کا ہے میں رکھا جائے؟ اس نے منگلو کو بے بسی سے دیکھ کر کہا'' ہے تو سب کچھ، مگر جائے گا کا ہے میں اور کیسے؟''

منگلو نے کہا'' ارے یہ بکسے تو کھالی ہی ہیں، ان میں سے کسی میں بھر دو۔ پھر کسی طرح لے چلیں گے!''

اور منگلو اور بھروسے... گنڈا اور فنکار... انسانیت کے ناطے، اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر، اناج اور برتن سے بھرا بکس گرجا گھر تک لے ہی گئے۔ اور راستے بھر فنکار بھروسے، منگلو گنڈے کو، سچے دل سے بھیّا، اور 'بیٹا' کہا گیا!

آٹھویں دن جب بھروسے منجھو، مالتی اور منو کے ساتھ ٹوٹے ہوئے لوہے کے پل کی جگہ، کشتی کے ذریعہ ڈالی گنج پہنچا، تو اُسے دریا کے کنارے ہی پر منگلو ملا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ بھروسے نے بیوی بچوں کو آگے بڑھ جانے دیا اور خود رُک کر منگلو سے پوچھا'' کیا بات ہے منگلو؟ کھیریت (خیریت) تو ہے؟''

منگلو نے بھروسے کا ہاتھ پکڑ کر کہا'' میرے ساتھ آؤ، کا کا!'' اور وہ دریا کے کنارے کنارے چل کر تھوڑی دُور گئے تھے کہ بھروسے کے نتھنوں نے سڑی ہوئی لاش کی خبر دی، اور پھر گدھوں کے ایک چیختے، لڑتے، نوچتے، کھسوٹتے جھنڈ نے اس کی تصدیق کر دی۔ منگلو نے ڈھیلے مار مار کر گدھوں کو اُڑا دیا۔ ہڈیوں کے ڈھانچے کے قریب کچھ گوشت کے سڑے ٹکڑے

پڑے تھے، کچھ کی ساری کی دھجیاں۔ پہچان صرف کالے بالوں، اور گھنی بھوؤں سے ہوتی تھی یا منگلو کی دی ہوئی چاندی کی ایک انگوٹھی سے جو گدھوں کے نوچنے پر بھی انگلی سے نہ نکل سکی تھی۔

بھروسے نے ہاتھ مل کر کہا ''ہائے، چھوکری کو حرام جادوں نے مار ہی ڈالا!'' پھر وہ بو سے ہار کر تھوتھو کرتا، ڈگمگاتا، لڑکھڑاتا گھر کی طرف چلا، منگلو کھڑا دانت پیٹتا رہا۔ پھر اس نے اپنا انگوچھا ناک اور منہ میں لپیٹ لیا اور بڑے بڑے ڈھیلے چن کر وہ گدھوں کو مارنے لگا۔

بھروسے کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ اس میں مالتی اور منو تو تھے ہی، اس کے دونوں ماتحت کاریگر اور دو ایک محلے والے بھی موجود تھے۔ مگر بھروسے نے کسی سے بات نہ کی۔ وہ سیدھا اپنی چھت پر چلا گیا۔ اس نے دیکھا ہوا نے دیوار سے لگی لکشمی دیوی کو زمین پر گرا دیا ہے اور اس کا داہنا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔ اس نے ادھر دیکھا جہاں 'انوکھی ناگن' تھی۔ وہ بھی کسی حادثے کا شکار ہو کر ٹوٹی پڑی تھی۔ پھر اس نے ادھر دیکھا جدھر وہ مورتی تھی، جس میں ہریا کے جسم کی نقل اُتار دی گئی تھی۔ منجھو اس پر جھکی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور غصّے سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ آہٹ پاتے ہی اس نے بھروسے کو گھور کر دیکھا اور مورتی کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہا ''تمھیں شرم نہیں آتی؟ تمھاری بیٹی اب جوان ہوئی ہے!''

بھروسے نے عمر میں پہلی بار منجھو سے جھڑک کر کہا ''بکو مت! جوان عورت ہی کی تو مورتی ہے! میں نے مٹّی ہی کی تو بنائی ہے! اس سے کیوں نہیں پوچھتیں جو گوشت کی بناتا ہے۔ وہ کیوں جوان عورت میں جان ڈالتا ہے، پھر کیوں اسے مٹا دیتا ہے!'' اس نے رُک کر سسکی لی'' ہریا جیسی جوان عورت کو مار ڈالتا ہے۔ اس کے سندر شریر کو گدھوں کو کھلا دیتا ہے! ہے بھگوان گدھوں کو!'' اور اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو اس کے سوکھے گالوں پر ڈھلک آئے۔ وہ ہاتھ میں گیلی مٹّی اُٹھا کر جوش سے بولا ''مگر میں ہریا کو مرنے نہ دوں گا! کبھی مرنے نہ دوں گا۔ میں اسے لکشمی کی مورتی میں بدل دوں گا!''

اور گھبرائی، بوکھلائی ہوئی منجھو کو محسوس ہوا کہ جیسے مورتی میں جان سی پڑ گئی ہے اور وہ بھروسے کو بڑے پیار سے مسکرا کر دیکھ رہی ہے!

✿✿

سب کو اپنی اپنی

روزِ حشر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں نفسی نفسی ہوگی۔ ہر ایک کو اپنے اعمال کیف کی ہوگی۔ نہ باپ بیٹے کے ساتھ مروت کرنیکے لئے تیار ہوگا، نہ ماں اپنے دودھ کے پالوں سے اظہارِ محبت کرے گی۔ نہ بھائی بھائی کو پہچانے گا، نہ عاشق معشوقوں پر فدا ہوں گے۔ اور نہ بیویاں شوہروں کے بارے میں پتی ورتا دکھائیں گی۔ لیکن ایسے قیامت کے دن اسی دنیا میں آتے رہتے ہیں اور ہمارے کانوں میں جوں تک نہیں رینگتی۔ ایسا ہی ایک دن نومبر ۱۹۶۲ء کا دن بھی تھا۔ پانچ مقامات پر پانچ طرح کی گفتگوئیں تھیں۔ یادیں تھیں، خواب تھے۔ خواب کی تعبیریں تھیں اور شکستِ خواب کی تصویریں۔

کانپور میں جیارام سیٹھ کے بنگلے پر:

جیارام: تو جوگندر یہ فوجی ٹھیکے کا کام تو کچھ اچھا نہ چلا۔

جوگندر: کیا کرتا پتاجی۔ اب نیفا ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ تیز پور تک برابر خالی ہو رہا ہے۔

جیارام: اچھا ہی کیا جو چلے آئے۔ جان جوکھوں کا معاملہ ہے۔

جوگندر: ہاں پتاجی۔ میری جان پر بنی تھی، اتنے دنوں بھی نہ نکلتا بس ذرا بزنس کو ٹھکانے سے لگانے کی فکر تھی۔

جیارام: تو کیا کر سکے ہوگے، اس کا بندوبست؟ ایسے میں تو گھاٹا ہونا بدا ہی تھا۔

جوگندر: نہیں پتاجی۔ مَیں نے ایک سردار جی سے معاملہ کر لیا۔

جیارام: تو کیا اُسے ڈر بھے نہیں لگتا؟

جوگندر: نہیں پتاجی۔ ڈر بھے تو یہ لوگ جانتے ہی نہیں۔ جنگ ہو یا بزنس۔ یہ اپنی جگہ ڈٹے ہی رہتے ہیں۔

جیارام: تو تُم نے اپنے دام کھرے کر لئے؟

جوگندر: ہاں! بلکہ دس ہزار اُوپر سے۔

جیارام: چلو۔ مہینے بھر کے ہیر پھیر میں دس ہزار بُرے نہیں۔ اور اُن کے سوکھے چہرے پر فاتحانہ ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔

جوگندر: ہاں یہی مَیں نے بھی سوچا۔ پھر یہاں نملا کے جیتنے کے لئے بھی تو میدان صاف ملے گا۔

جیارام: کیوں؟ وہ جو گو بند اور رام داس اس پر دانت گڑائے بیٹھے ہیں، وہ کیا ہوئے؟

جوگندر: وہ بھی تو اپنی ہی برادری کے ہیں۔ وہ بھی اس لڑائی سے فائدہ اُٹھانے، کمانے کھانے نکلے ہیں۔

جیارام: تو پھر میری آشیر باد لو، نملا مل جائے تو پھر اپنی چاندی ہی چاندی ہے۔

اس کانپور کی ایک دوسری شاندار کوٹھی میں:

سیٹھ مرلی مل: کیوں چلے آئے گو بند؟

گو بند: اب سری نگر ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ منٹوں میں آدمی وہاں برف کی سِل بن جاتا ہے۔

مُرلی مل: تو جموں میں ٹکتے۔

گو بند: جموں میں! وہاں تو ہر وقت سڑکوں پر فوجی ٹرک، توپ خانہ اور ٹینک کی گھڑ گھڑاہٹ سے پورا شہر لرزتا رہتا ہے۔ میرا تو ان سامانوں کے دیکھتے ہی دم گھٹنے لگتا ہے۔

مرلی مل: تو بزنس سب ستیاناس ہوا۔

گو بند: نہیں پتا جی وہاں ایک خان صاحب فوجی ٹھیکے دار ہیں، انہیں کے ہاتھ ہی اپنا دھندا بیچ دیا۔

مرلی مل: تو اچھا خاصا گھاٹا اُٹھانا پڑا ہو گا؟

گو بند: گھاٹا؟ پتا جی۔ مَیں آپ ہی کا بیٹا ہوں مَیں نے سُن رکھا تھا۔ ان خان

صاحب کے پیچھے کوئی بڑی موٹی ٹھوس پارٹی ہے۔ مَیں نے دو چار رگڑے گھسے دیئے اور صاف پندرہ ہزار نفع کے نکال لئے۔

مرلی مل: شاباش! پر اب یہاں آگئے ہو تو کوئی اور دھندا کرو۔ آج کل بلیک میں وارے نیارے ہو سکتے ہیں۔

گوبند: ضرور پتا جی! کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ پر سب سے پہلے اپنی سونے کی چڑیا پکڑنی ہے۔

مرلی مل: نملا کو لپیٹے ہو؟ وہ پنچھی پنجرے میں آجائے تو یہ گھر سونے کی اینٹوں کا بن جائے گا۔

اسی شہر کی ایک بہت بڑی صرافے کی دوکان پر رام داس اور اُس کے باپ جگن داس باتیں کر رہے تھے۔ سڑک پر ایک موٹر کھڑی ہے۔ خاک سے اٹی ہوئی۔ اُس کی صورت چغلی کھا رہی ہے کہ اس کوئی لمبا سفر کیا گیا ہے۔

جگن داس: تُم نیفا اور لداخ دونوں جگہوں کا انتظام کر آئے؟

رام داس: جی پتا جی!

جگن داس: سردار جی اور خان صاحب ہی کے ذریعہ سے سارے معاملات ہو گئے نا؟

رامداس: جی ہاں

جگن داس: تمہارے دوستوں کو تو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔

رام داس مسکرا کر بولا۔ ”وہ جان جاتے تو ایک کا دس مانگتے۔ یوں سستے میں ہی معاملہ ہو گیا۔ اُن کیا معلوم کہ یہ لاکھوں لاکھ کے فائدے کے کام ہیں۔ وہ دس پانچ ہزار ہی پا کر خوش ہو گئے۔ اور جلدی سے بھاگ آئے۔

جگن داس: ارے تو اُن کے پاس سردار جی اور خاں صاحب جیسے نڈر بھروسے کے آدمی کہاں تھے......اچھا تو اب کیا ارادے ہیں؟

رام داس: جی اب یہیں شہر میں رہ کر آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا۔

جگن داس: میرا کیا خاک ہاتھ بٹاؤ گے۔ دوکان میں نہ سونا ہے نہ سونے کے زیور۔ نہ بنانے والے گھڑنے والے سنار جو پرانے آدمی پتا جی کے سمے سے لگے تھے انہیں الگ نہیں کیا، وہ بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

رام داس: تو کیا آپ نے سارا سونا گورنمنٹ کو دے دیا؟

جگن داس: ہونہہ! کل کا چھوکرا اور مجھے بزنس کے داؤ پیچ سکھانے چلا ہے۔ یہ باتیں تمہاری ماتا تک کو بتانے کی نہیں۔

رام داس: پھر؟

جگن داس: ارے ایک بتایا چار چھپایا۔

رام داس: مگر جب آپ اسے بیچ ہی نہیں سکتے تو چھپا کر رکھنے سے کیا فائدہ؟

جگن داس: ارے جیتی رہیں ہمارے دیش کی اِستریاں۔ وہ سونے پر سب کچھ قربان کر سکتی ہیں۔ بس اب دن کے اُجیالے کی جگہ رات کے اندھیرے میں سودا ہوتا ہے۔ آج کل ایک سو ستر بہتر کا بھاؤ ہے۔

رام داس: تو اب تو نملا کو اس گھر میں لانا اور بھی ضروری ہوا۔ منوں سونا اُس کے ہاں بھی دبا پڑا ہوگا۔

جگن داس: ارے وہ آجائے اور اُس کی تینوں ملیں مل جائیں تو مَیں اس صرافے کا کام چھوڑ کر ڈسٹلری کھولوں اب اس دھندے سے زیادہ نفع کسی چیز میں نہیں۔

☆

اور اسی شہر کے مضافات میں ایک بڑی شاندار کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں نملا اور اس کی چچی کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ بڑی بی سمجھا رہی تھیں کہ اب جبکہ وہ ایم اے بھی کر چکی ہے اور اپنا کام بھی سنبھال چکی ہے، اُسے اپنا سارا وقت قومی کاموں میں لگانا چاہیے۔ نہ نرسنگ کی تعلیم حاصل کرنے کی اسے ضرورت، نہ اسپتالوں میں زخمی سپاہیوں کی دیکھ بھال کی اسے حاجت اور نہ گھر گھر ڈیفنس فنڈ کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے جانا مناسب۔ اسے اب اپنا گھر بسانے کی فکر کرنی چاہیے۔

چچی: مَیں کہتی ہوں، یہ تینوں بُرے نہیں جوگندر، گوبند رام داس۔ اپنی ذات برادری کے ہیں۔

نملا: کیا اپنی ذات برادری کا ہونا ضروری ہے؟

چچی: ہے کیوں نہیں۔ منوجی نے کچھ سوچ سمجھ ہی کے تو چار ذاتیں کر دیں۔ اور ان کے الگ الگ کام بانٹ دئے۔ ایسا نہ ہوتا تو یہ تینوں بھی کہیں وہ تمہارے گجا

دھرسنگھ کی طرح سرحد پر برف سے ڈھکی پہاڑیوں پر لیٹے، دھائیں دھائیں کرتے اور سارا دھندا خاک میں مل جاتا۔

نملا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اُسے گجادھر چشول کے آگے والی چوکی پر اُس کے عارضی اسپتال میں تھکا ماندہ زخمی لیٹا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ یہ اسپتال کیا تھا ۱۶×۲۰ فٹ کا ایک کمرہ تھا۔ دیواریں لکڑی کی، چھت ٹین کی۔ ایک سے ایک ملے ہوئے تین لوہے کے پلنگ تھے۔ ایک اسٹول تھا۔ ایک چھوٹی سی میز تھی۔ میز پر ہاتھ دھونے کا ایک تسلا تھا اور فرسٹ ایڈ کا مختصر سا سامان۔ اس کمرے کی دیواروں اور چھت پر ریڈ کراد کا نشان بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف ریڈ کراس کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اندر پلنگوں پر گجادھر کے ساتھ اُس کے وہ دو جوان تھے جنھیں وہ چوکی نمبر ۱۳ سے بچا کر اپنے ساتھ نکال لایا تھا۔ ۴۸ گھنٹے سے اُن میں سے کسی کی پلک سے پلک نہ لگی تھی۔ چوبیس گھنٹے متواتر چوکی نمبر ۱۳ کے پچیس جوانوں نے کئی سو چینیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ آخر دشمن نے چھوٹی توپیں لگا دیں۔۔ جو کام رائفلوں اور مشین گنوں کی ہزار گولیاں نہ کر سکی تھیں وہ توپوں کے دس گولوں نے چند منٹوں میں تمام کیا۔ چوکی کی دیواریں مسمار ہوئیں، چھتیں ٹوٹیں اور بیس لوہے جیسے سورما پاش پاش ہو گئے۔ گجادھر صرف پانچ جوانوں کو بچا کر لڑتا ہوا پیچھے ہٹا۔ دشمن نے تعاقب کیا۔ تین اور ساتھی راستے میں دشمن کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ صرف گجادھر اور اُس کے دو جوان اس چوکی تک سلامت پہنچ سکے تھے۔ یہاں کے کمانڈر میر رامناتھن نے چشول کے قریب ہونے سے دشمن کا گرم جوشی سے استقبال کرنے کا پورا سامان کر رکھا تھا۔ وہ پچھلی جنگ میں برما کے جنگلوں میں لڑ چکا تھا۔ اُس نے کوریا میں چینیوں کے ہتکنڈے دیکھے تھا۔ اس کے پاس چھوٹی توپیں بھی تھیں، مشین گنیں اور بچاؤ کے سامان بھی۔ اُس نے گجادھر اور اُس کے ساتھیوں کو چشول جانے کی اجازت دے دی تھی مگر ان تینوں کے ہاں انتقام کی آگ ایسی بھڑک رہی تھی کہ وہ فضا کی ٹھنڈک بھی بھول گئے تھے اور زخموں کی تپک بھی۔ اُن کا اصرار تھا کہ ہم چند گھنٹے کی جھپکی لے کر اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر دشمن سے پھر لڑیں گے اور اپنے جوانوں کے خون کا بدلہ لے کر ہی دم لیں گے۔

اسی لئے گجادھر پلنگ پر لیٹا سگریٹ پی رہا تھا اور تلخ و شیریں یادیں تھیں کہ پرا باندھے اُس کے نظر کے سامنے ایک کے بعد ایک دھندلی تصویروں کے ڈھنگ سے چلی آ رہی تھیں۔ وہ کھیل کے میدان یں نملا سے پہلی ملاقات۔

صوبے بھر کی یونیورسٹیوں کے ہاکی ٹورنامنٹ کا فائنل تھا۔ اُس کی یونیورسٹی ایک گول سے ہاری ہوئی تھی۔ سبھی کے چہروں پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ ہر ایک اُسے للکار رہا تھا۔ دھکار رہا تھا کہ دفعتہً اُسے موقع مل گیا۔ اور اُس نے پہلا گول کیا۔ ہر طرف تالیوں کا شور اُٹھا۔ اچھلتے ،کودتے ، ناچتے ساتھیوں کا ہنگامہ ہوا۔ پھر جو دل بڑھا تو اُس نے لگا تار دو گول اور پانچ منٹ کے اندر کر ڈالے۔ ہر لڑکا چاہتا تھا کہ اُسے کندھے پر بٹھالے۔ ہر لڑکی چاہتی تھی اُسے دل میں بٹھالے اور اسی خوش مجمع کو چیرتا ہوا جوگندر آیا تھا اور اُس نے کہا تھا۔ ''آؤ یونیورسٹی کے بادشاہ تمہیں اس کی ملکہ سے ملادیں۔''

اور اُس کی پہلی دفعہ نملا سے ملاقات ہوئی تھی اور یہ ملاقات دوستوں کے ذریعہ پانچ دن برابر چلتی رہی تھی۔ اور نملا کیا تھی؟ لچھمی دیوی کی خاص چہیتی بیٹی...... دیوی نے اُسے ہر طرح کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ دولتِ زر، دولتِ علم، دولتِ عقل، اور دولتِ حُسن۔ تین ملوں کی مالکہ۔ اقتصادیات کی ایم اے۔ اسے خود مختار، ہنس مکھ، ملنسار، ہوشیار، اپنے پورے بزنس پر حاوی۔ اور اُس کے گرد اُس کے تین اُس کی ذات برادری کے پروانے۔ جوگندر، گوبند اور رامداس۔ جوگندر گورا چٹا پانچ فُٹ آٹھ اِنچ کا گبرو جوان، ہر بات میں آگے بڑھنے والا۔ اپنے کو ایک کی جگہ دس دکھانے والا۔ گوبند لمبا دُبلا، پتلا لیکن بلا کا چالباز۔ ہر وقت نیت نیت داؤ پیچ کرنے ولا۔ بڑے سیٹھ کا بیٹا اور رام داس دیکھنے میں بھیگی بلی، چُپ چاپ، سیدھا سادا مگر شہر بھر میں مشہور تھا، اُس کا گھر سونے کی کان ہے۔ اُس کے باپ کو اس وقت کا میڈاز کہتے ہیں۔ وہ مٹی کو چھولیتا ہے تو سونا ہو جاتی ہے۔ اب ان اشرفیوں کے تھیلوں کی موجودگی میں گجادھر سنگھ ایک چھوٹے سے کاشتکار کا لڑکا کس گنتی شمار میں تھا۔ اس لئے وہ جلدی سے فوجی مقابلے کے امتحان میں شریک ہوا اور اپنے کھیل کود، اپنی اُچک پھاند کی وجہ سے چُن لیا گیا۔ نملا نے یہ خبر اس کی زبانی اسی طرح چمکتی آنکھوں اور گلاب جیسے لال گالوں سے سُنی تھی۔ جس طرح وہ اُسے پہلی دفعہ کھیل کے میدان میں ملی تھی۔ پھر اُن کی ملاقات دو برس تک خطوں ہی تک محدود رہی۔ وہی رہی دو ملاقاتیوں کے خطوط۔ کچھ دہرہ دون اسکول کی باتیں کچھ کانپور کے حالات۔ مگر جب وہ وہاں سے کامیاب ہو کر نکلا تو بخت نے یاوری کی۔ وہ لکھنؤ کی ایک رجمنٹ میں لفٹنٹ مقرر ہوا۔ اب پھر ہر ہفتے ملاقاتیں ہونے لگیں اور پھر وہ بھی رومان کی اسی فضا میں بے دست و پا تنکے کی طرح بہنے لگا تھا جو نملا کے گرد جوگندر، گوبند اور رام داس نے اپنی اپنی

حرفتوں سے بنا رکھی تھی۔ نملا کی بارگاہ میں ہر ایک کی طرف سے شادی کی پیشکش ہو چکی تھی مگر نملا کی آنکھیں جو کچھ ڈھونڈتی تھیں، وہ اُن میں نہ ملتا تھا۔ پھر بھی وہ صاف صاف 'نہیں' کہہ کر کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے سب ہی زیرِ غور تھے۔

اس رومانی فضا میں دفعتہً چین نے ایک بم پھینکا۔ زرد رو کنکھجورا ہزار پا بن کر پورے ہمالیہ پر رینگا۔ سفید بے داغ دیوتاؤں کا استھان بے گناہوں کے خون سے لالہ زار بن گیا۔ نملا نے دفاعی فنڈ جمع کرنے کا بیڑہ اُٹھایا۔ جوگندر، گوبند رام اور رام داس خدمتِ ملک وقوم کا نعرہ زبانوں سے بلند کرتے سرحدوں کی طرف چلے اور گجادھر کو لداخ جانے کا حکم ملا۔

سب سے دلآویز تھی گجادھر کے لئے یہ آخری تصویر۔ نملا اُسے رخصت کرنے اسٹیشن پر آئی تھی۔ اُس نے گجادھر کو گاڑی میں بٹھاتے وقت عجیب انداز سے کہا تھا۔ ''جاؤ بھگوان کو سونپا! پلٹ کر ضرور آنا میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

نملا کے اس انتظار کے وعدے نے گجادھر کو امر بنا دیا تھا۔ اُس کو یقین تھا کہ چوکی نمبر ۱۳ سے اُس کا بچ کر نکلنا اس کا ثبوت ہے کہ بھگوان نے اُس کی اور نملا کی دعا سُن لی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ اب کے جب لام سے واپس جائے گا تو نملا سے صاف صاف اپنا مدعا ظاہر کر دے گا۔ اُس کا چہرہ ایک کھلتی ہوئی کلی کی طرح خوشی سے کھل اُٹھا۔ وہ نملا سے مطلب کی بات کہنے کے لئے الفاظ تلاش کرنے لگا۔

اور اسی دن شام نو بجے نملا کی کوٹھی میں...... جوگندر، گوبند رام رام داس، اور نملا ڈرائنگ روم میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ابھی ابھی انہوں نے ایک لذیذ ڈنر سے فراغت پائی تھی۔ نملا کے چچا اور چچی نوجوانوں کو بے تکلفی سے گفتگو کا موقع دینے کی غرض سے دوسرے کمرے میں اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ جوگندر حسبِ معمول باتوں کا ایک تلخہ باندھے ہوئے تھا کہ دفعتہً کھلے ہوئے ریڈیو سے گانے کے بعد خبریں سنائی جانے لگیں۔ اناؤنسر نے پورے محاذ کا حال سُنا کر چینیوں کے ایک ایک نئے ظلم کی خبر سنائی۔ چشول سے قریب ترین چوکی پر حملہ کرتے ہوئے انہوں نے اس عارضی اسپتال پر بھی گولے برسائے جس پر ریڈ کراس کے جھنڈے چاروں طرف لہرا رہے تھے۔ اُس وقت وہاں تین زخمی آرام کر رہے تھے تینوں ہلاک ہو گئے۔

جوگندر نے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا۔ ''بڑے پاجی کمینے ہیں۔ بین الاقوامی قانون

کی بھی پروانہیں کرتے!''

گوبند نے کہا۔'' کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔اس چوکی کی فتح نہ کر سکے تو بے چارے زخمیوں پر غصہ اُتارا۔

رام داس نے کہا'' پر ہمارا جوان بھی ڈٹا ہوا ہے۔''

نملا نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔'' نہ جانے کس کا سہاگ لٹا۔کس کی کوکھ جلی، کس کی مانگ اُجڑی، کون بن باپ کا ہوا۔کون بے منگیتر کا بنا''

گوبند شرارت سے مسکرا کر بولا۔ارے اپنا گجادھر بھی تو وہیں کسی چوکی پر ہے؟''

زہر میں بجھا ہو تیر نملا کے سینے پر لگا ہی تھا کہ ریڈیائی مخبر نے چلتے چلتے ایک اور بان مارا، عارضی اسپتال کے جان ہاروں کے نام سنا دئے۔سپائے موہن سنگھ، سپاہی محمد ایاز اور افسر لفٹنٹ گجادھر سنگھ!

نملا ایک بار جھومی۔پھر وہ کرسی سے پھسل کر فرش پر بے ہوش گر پڑی۔

رام داس،'' کیا ہوا دیوی جی! کیا بات ہے نملا؟ کہتا ہوا اُس پر جھکا۔

جوگندر نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے نملا کو اس نئے روپ میں دیکھا۔پھر وہ پتلون کی جیب میں دونوں ہاتھ ڈالے، ٹہلتا ہوا فرش پر ڈھیر مجموعۂ حُسن کے پاس آ کر بولا۔'' اچھا وہی تو راہ کا روڑا تھا۔''

گوبند اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔وہ اپنے سوکھے ہاتھ مل کر ہنستا ہوا بولا۔'' وہ روڑا ہو گا کہ کانٹا۔اب تو راستہ صاف ہے۔جنگ جگ جئیں یہ چینی بھائی! ہمارا تو ہر طرح فائدہ ہی فائدہ کر رہے ہیں۔''

جوگندر نے پہلے اس پر تعجب کی نظر ڈالی۔پھر وہ بھی ہنس پڑا۔رام داس نے اُن دونوں کو بڑے غصے اور حقارت سے دیکھا۔پھر وہ بھی گردن جھکا کر مونھوں ہی موچھوں میں مسکرانے لگا۔''

(ماہنامہ آج کل، دہلی، اگست ۱۹۶۳ء)

شکار یا شکاری

ہم تینوں آدمی گاؤں سے باہر جانے کے قصد سے اپنے اپنے گھروں سے نکلے تھے، جاڑوں کا زمانہ تھا، پاس والی جھیل میں چڑیاں بڑی کثرت سے گرتی تھیں، خیال تھا کہ دو گھنٹے کے شکار میں بیس پچیس سرخاب اور دوسری چڑیاں اگر ہاتھ آ گئیں تو صبح کی سیر و تفریح کے ساتھ شام کے کبابوں کا مفت انتظام ہو جائے گا۔

وقت بھی وہ تھا جب دیہی دیویاں پیتل کے لوٹے دست سیمیں میں لیے ایک خاص انداز سے شرماتی، جھجکتی، گھونگھٹ نکالتی، بدن چراتی، جنگلوں سے پلٹتی دکھائی دیتی تھیں۔ ان کی ملگجی ساری، اُن کے خمار آلود چہرے، اور کسی جانے پہچانے مرد کو دیکھ کر اُن کا آپس کا معصومانہ ٹھٹول اور پر ترنم قہقہہ ویسا ہی بھلا معلوم ہوتا تھا جیسا کہ شبنم سے بھیگے اور ہلکے سے کہرے سے ڈھکے ہوئے درختوں پر رہنے والی چڑیوں کا اپنے اپنے گھونسلوں کے قریب چہچہانا۔ اس سہانی فضا میں کبھی کسی کسان کے گھر سے بیلوں کو کھول کر کھیتوں کی طرف لے چلنے کے لیے 'للکارنے' کی آواز آ رہی تھی، تو کبھی کسی اہیر کے کھونٹے سے بندھے ہوئے بچھڑے کے بولنے کی... اور ہم لوگ بندوقیں کندھوں پر رکھے کارتوسوں کی پیٹیاں گردنوں میں لٹکائے، ہنستے، فقرے کستے، چلے جا رہے تھے۔

زمین نم تھی، سبزہ بھیگا ہوا تھا، ہوا ٹھنڈی تھی اور سامنے سیاہی مائل دُھندلے دُھندلے کھیت تھے۔ معلوم ہوتا تھا ہم خود نہیں جا رہے ہیں، بلکہ فضا کی موسیقیت ہمیں اپنے نہ تھکنے والے دھارے میں بہائے لیے جا رہی ہے۔ نہ تکان تھی، نہ کسل تھا اور نہ پیدل چلنے میں کسی قسم کی کوئی اذیت۔ گویا ہم اپنے پیروں اور ٹانگوں کے سہارے نہیں چل رہے تھے۔ بلکہ جوانی،

بے فکری اور سرشاری کے دوش پر سوار تھے!

ہم نے گاؤں کے باہر کے کھیتوں کو طے کر کے پچھی پور کا رُخ کیا۔ اب کھیتوں کی حالت بدل گئی۔ گاؤں سے متصل مزروعہ حصّہ مسطح تھا۔ یہ کھیت 'دھنکر' تھے۔ اور برسات میں پانی سے بھر جایا کرتے تھے۔ ان میں دھان ہوتا تھا۔ اسی لیے اُن کی زمین ناہموار تھی۔ مسطح کھیتوں میں ہمارے پاؤں برابر پڑتے تھے۔ اب ہم اس طرح چلنے لگے تھے۔ جس طرح بدمست شرابی چلتے ہیں۔

مگر فضا نے اس ناہموار حرکت کو اسی قدر خوشگوار بنا دیا تھا۔ جس قدر کہ جھولے کے ہچکولے ہوتے ہیں... ہم بڑھے چلے جا رہے تھے۔ خوش ہوتے چلے جا رہے تھے۔

آفتاب کے اُچھالے ہوئے گلال نے مشرقی اُفق کے دامن کو رنگ دیا، سبز اور کاہی چیزوں پر بھی ہلکی سُرخی دوڑ گئی۔ کہرے میں بنفشی چمک پیدا ہوئی اور راستہ ذرا صاف دکھائی دینے لگا۔ ہم نے قدم تیز کیے... اور تیز کیے۔ خیال تھا ہمارے پہنچنے سے پہلے چڑیاں آ کر پلٹ نہ جائیں۔

پچھی پور نصف میل پر تھا۔ جھیل ایک فرلانگ سے کم پر تھی، آبی چڑیوں کا شور سنائی دینے لگا، کہ اُپلوں کے ٹوکرے سروں پر رکھے دو عورتیں آتی دکھائی دیں۔ ایک جوان اور ایک بوڑھی ۔ جوان عورت کے چہرے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں، آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور پیٹ نکلا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت میانے قد کی دُبلی پتلی تھی۔ چہرے کو جھریوں نے سوکھے ہوئے آم کی قطع کا بنا دیا تھا مگر چال میں بلا کی سرعت تھی۔ وہ بار بار جوان عورت کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتی اور اُسے ہر بار رُک کر ساتھ والی کو ہمّت دلانا اور پکارنا پڑتا تھا۔

ہونے والی ماں آہستہ آہستہ تھوڑی دُور چلتی لڑکھڑاتی، تھمتی اور اُپلوں سے بھرا ہوا اَرہر کا بڑا ٹوکرا ایک ہاتھ سے سنبھالتی، دوسرے سے پیٹ پکڑتی، پھر دو چار قدم چلتی، پھر رُک جاتی تھی۔ جب بوڑھی عورت اُسے پکارتی تو وہ ذرا سا جھجک کر آگے بڑھتی اور اُس کے برابر آ جاتی تھی۔ دس بارہ قدم دونوں برابر چلتیں۔ پھر مُسن آگے اور کمسن پیچھے ہو جاتی۔ گویا یہ روزانہ کا منجا ہوا راستہ نہ تھا، بلکہ دنیاوی زندگی کی کاواک راہ تھی، جس میں بڑے چھوٹوں کو اور بوڑھے جوانوں کو راستہ دکھاتے، ہمّت دلاتے چلتے ہیں۔

ہم اِس سماں کو دیکھتے جاتے تھے، اور اُن سے قریب ہوتے جاتے تھے۔ ہماری آپس میں باتیں خاموشی سے بدل گئی تھیں۔ ہماری ہنسی بالکل مفقود ہو گئی تھی ہمارے قدم آہستہ آہستہ پڑ رہے تھے اور ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر کچھ سوچنے لگا تھا۔

ہمارے برابر آتے ہی جوان اہیرن نے سر سے کھسکی ہوئی ساری کا آنچل کھینچ کر گھونگھٹ نکالنے کی کوشش کی اور آہ کر کے بیٹھتے بیٹھتے گر پڑی۔ جھوا ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اُپلے بکھر گئے۔ ہم ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ مَیں نے اپنی بندوق احمد کو دے دی۔ اور جلدی جلدی اُپلے سمیٹ کر جھولے میں رکھنا شروع کر دیئے۔

ہونے والی ماں کی پیشانی پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے جھلک رہے تھے وہ خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی نظروں سے پلٹتی ہوئی بوڑھی عورت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اُس نے پاس آ کر پوچھا۔ ”کا ہے رے؟“

جوان عورت رُک رُک کر بولی۔ ”اب نا چلا، جات ہے!“

دوسری اہیرن اُس کی بغل میں بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے جھوا سر سے اُتارنے کی کوشش کرنے لگی۔ مَیں نے لپک کر سہارا دیا۔ ٹوکرا اُتار کر علیحدہ رکھ دیا گیا۔

جوان عورت نے کراہ کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ پھر سمیٹ لیں۔ بوڑھی اہیرن نے گھبرا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہم بڑے بڑے دیدے نکالے گھور گھور کر اس سماں کو دیکھ رہے تھے۔

وہ جھڑکنے والے لہجے میں بولی۔ ”ایہاں سے ہٹ جاؤ!“

ہم لوگ شرمندہ و خجل آگے بڑھے، ابھی دو چار ہی قدم گئے ہوں گے کہ کراہتی ہوئی عورت نے کہا۔ ”گھر، کھمر!“

میں نے پلٹ کر پوچھا۔ ”کہاں، چھیدی پور میں؟“ بوڑھی عورت بولی۔ ”سکھو اہیر کے یہاں!“ مَیں نے احمد سے اپنی بندوق لے لی۔ اُن سے اور اشہر سے کہا کہ چھیدی پور سے سکھو کو بلا لائیں۔ ان دونوں نے میری صورت دیکھی۔ سرمایہ داری کی گود میں پلے ہوئے زمینداروں کے لڑکے شکار کھیلنے نکلنے تھے۔ نہ کہ رعایا پرجا کی زچگی میں ہاتھ بٹانے!

مَیں نے کہا: ”جاؤ بھی، خدمت ہی میں عزّت ہے!“

وہ مسکرائے مگر خاموش چھیدی پور کی طرف لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

مَیں اہیرنوں کی طرف پشت کر کے دُور کے ایک کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گیا۔

سورج کی پہلی کرن نے اوس کے ہر قطرے کو موتی کی طرح چمکا دیا، ایک چڑیا پاس والے درخت پر کھیت سے اُڑ کر گھونسلے میں آئی اور بچوں کو دانہ بھرانے لگی۔

بچھی پور کے مندر کے گھنٹوں کے بجنے کی آواز ہلکی ہلکی سنائی دی۔ جوان اہیرن زور سے چیخی۔ ''کہاں کہاں، کہاں'' کی خوش آئند صدا پیدا ہوئی اور بوڑھی عورت نے جھپٹ کر ایک بچہ گود میں اُٹھا لیا۔

اُس نے مجھے پکارا۔ ''بھیا چوکو!''

مَیں نے تھوڑی دُور آگے بڑھ کر اپنا شکاری چاقو اُس کی طرف پھینک دیا۔

چند منٹ بعد پھر اُس نے پکارا۔ ''بھیا، یہاں آوَ!'' میں رُکتا جھجکتا اُدھر بڑھا ماں نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔ بوڑھی عورت بچہ کا منہ اپنے آنچل سے پونچھتی چند قدم آگے آئی اور اُسے میری طرف بڑھا کر بولی!

''اِہ کا جھیل ماں نہلا دوَ!''

میں نے بندوق زمین پر رکھ دی اور بچہ کو ہاتھوں میں لے لیا۔

ماں نے جلدی سے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔ ''ناہیں! ناہیں!''

میں ٹھٹکا۔ دایہ جھڑک کر بولی۔

''اہکا بکے دو! تم اہکا دھولا دو!''

مجھے بڑی گھن معلوم ہو رہی تھی، جی چاہتا تھا اِس چیختے ہوئے گوشت کے لوتھڑے کو وہیں زمین پر پھینک دوں، مگر خیال آیا امانت ہے۔ دل پر جبر کیا اور اُسے شیشے کے برتنوں کی طرح سنبھالتا ہوا چل کھڑا ہوا۔

جھیل کے کنارے پہنچا۔ وہاں آبی چڑیوں کا میلا لگا تھا۔ کچھ اُڑ رہی تھیں اور کچھ آپس میں لڑ رہی تھیں، مَیں نے حسرت سے اُن پر نظر ڈالی، پھر اپنے ہاتھوں پر! وہاں بندوق کی جگہ بچہ تھا۔ زندگیاں ختم کرنے والے آلے کی جگہ زندگیاں قائم رکھنے کی ایک نئی مشین۔

میں نے بچے کو دھویا۔ وہ برابر چیختا رہا۔ مگر جب مَیں نے اُس کا جسم اپنے ریشمی رومال سے پونچھ ڈالا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اور اُس نے اپنی جلد جلد جھپکتی ہوئی آنکھوں سے مجھے

دیکھا۔ اُس بے بسی کے دیکھنے نے میرے دل میں ایک ایسی عجیب کیفیت پیدا کر دی کہ مَیں نے جھک کر اس اہیر کے لونڈے کی پیشانی چوم لی!

مَیں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ میری اس وقتی کمزوری کا دیکھنے والا کوئی انسان نہ تھا۔ چڑیاں تھیں، پَر کھجاتی ہوئی، شور مچاتی ہوئی، لڑتی ہوئی، اور مچھلیاں پکڑتی ہوئی!

مَیں تیز قدم رکھتا ہوا بچہ کو سینے سے لگائے پلٹا۔ زچہ تڑپ اور کراہ رہی تھی، بوڑھی اہیرن اس سے کہہ رہی تھی۔ ''ارے ڈرمت! اولادت ہَن!''

مجھے دیکھتے ہی اُس نے بچے کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیئے۔ ماں بھی مسکرا دی، اُس کا چہرہ اُس طرح چمک رہا تھا، جس طرح آئینہ آفتاب کے سامنے رکھ دینے سے چمک اُٹھتا ہے۔ مَیں ممتا کی اس ضوفشانی کی تاب نہ لا سکا۔ مَیں نے امانت جلدی سے واپس کر دی اور اپنی بندوق اُٹھا کر پچھلی مینڈھ کی طرف پلٹ آیا۔

چھیدی پور کی طرف سے لوگوں کے پکارنے کی آوازیں سنائی دیں اور کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آتے دکھائی دیئے۔ تھوڑی دیر میں چار اہیر ایک ڈولی لیے ہوئے آ پہنچے اور ان کے پیچھے پیچھے احمد و اہیر۔

میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''سکھو کون ہے؟'' ایک جوان ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ ''اس کا چہرہ زرد تھا۔ پیشانی پسینے سے تر تھی اور آنکھوں میں خوف تھا۔

مَیں نے مسکرا کر کہا۔ ''بیٹا مبارک!''

دفعتاً اُس کے چہرے پر بالکل اسی طرح سُرخی دوڑ گئی جس طرح ابھی کچھ دیر قبل اس سے بھیگے ہوئے سبزے پر آفتاب کی سنہری کرنیں دوڑی تھیں۔ اُس نے جھرجھری سی لی، پھر وہ میرے قدم چھونے کے لیے جھک گیا۔ مَیں نے روکتے ہوئے کہا۔

''ارے یہ کیا کرتا ہے! جا اُدھر جا، اپنے بچے اور بیوی کو دیکھ!''

وہ مسکراتا ہوا اُدھر بڑھا جدھر اس کی شریک زندگی کو دوسرے اہیر بوڑھی اہیرن کی مدد سے ڈولی میں لٹا چکے تھے۔ سکھو نے لپک کر بچے کو گود میں لے لیا دو اہیروں نے ڈولی اُٹھائی۔ بوڑھی اہیرن نے اپنا اُپلوں کا ٹوکرا سنبھالا اور چوتھے اہیر نے زچہ کا جھوا سر پر رکھ لیا۔

جب یہ قافلہ ہمارے برابر پہنچا تو میں نے احمد اور اشہر کی جانب دیکھا اور انھوں نے

میری طرف۔ ہم نے اپنی بندوقوں میں کارتوس بھرے اور ایک بار تینوں آدمیوں نے ہوائی فائر کر دیئے!

زچہ ڈولی میں لیٹی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے تھی اُس نے اس فائر پر منہ سے ہاتھ ہٹا لیے۔ ہمارے طرف مسکرا کر دیکھا۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ ہم بندوقیں سیدھی کر کے اسی طرح کھڑے ہو گئے، جس طرح بڑے افسروں کو معمولی سپاہی سلامی دیتے ہیں۔

احمد سے خاموش نہ رہا گیا۔ مسکرا کر بولا۔ ''ارے ہمیں بھولنا نہیں جب اس لونڈے کا کوئی کام کرنا تو ہمیں بھی بلانا۔ اب ہم بھی اس کے آدھے باپ ہیں۔''

سکھو مسکرا دیا۔ بوڑھی عورت زچہ کی طرف سے بولی۔ ''جرور! جرور!''

جب یہ قافلہ آگے بڑھ گیا تو ہم نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا، جھیل کی جانب نظر کی اور تینوں آدمیوں نے ایک ساتھ اپنی گردن ہلائی۔

مَیں نے کہا: ''بس آج کا شکار ہو چکا!''

احمد بولا۔ ''اور کیسا کچھ شکار! انسانی زندگی کا شکار!''

مَیں نے کہا۔ ''نہ جانے شکار ہے یا شکاری!'' احمد نے رجائی آواز میں کہا۔ ''ہمارا ہاتھ لگا ہے کہ کوئی مذاق ہے! اللہ نے چاہا تو معمولی شکاری نہ ہوگا! یزداں گیر!''

مَیں نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ''ہاں یزداں گیری ہی کے سامان تو ہیں ’اُپلوں کا جھوا‘ دھنکر میں پیدائش اور جھیل میں غسل!''

احمد بحث کرنے کے انداز میں بولا۔ ''اِس سے کیا ہوتا ہے، روح اللہ بھی تو اصطبل میں پیدا ہوئے تھے!''

اشہر ابھی تک خاموش تھا۔ جھڑک کے بولا۔ ''میاں احمد تمھاری اور مجید کی یہی باتیں تو مجھے ناپسند ہیں۔ ایک معمولی اہیرن نے، ایک کالا سا لونڈا دھنکر میں اُپلے ڈھوتے ہوئے جنا اور تم دونوں اس کو طرح طرح کے معنی پہنانے لگے۔ روح اللہ، خلیل اللہ اور خدا جانے کن کن بزرگوں سے مثالیں دے کر ایک تکلیف دِہ واقعہ کو خوش آئند صورت میں پیش کرنا... تم دونوں کا خاص حصہ ہے!''

احمد نے کہا۔ ''اجی، آخر اُسے تکلیف دہ سمجھئے ہی کیوں؟''

اُس نے اسی تیور سے کہا۔ ''اس لیے کہ تم میں اب اِس غربت کے احساس کا مادہ بھی نہیں رہ گیا جو اس طرح کے واقعات کا سبب ہے۔ تمھیں یہ نہیں سجھائی دیتا کہ ہندوستان کی غربت اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس طرح کی حالت میں بھی عورتیں جفاکشی کرنے پر مجبور ہیں۔ میں نے سکھو سے پوچھا۔ اُسے ایسی حالت میں کیوں جانے دیا؟ وہ سر جھکا کر بولا، کا کریں بھیا، گھر ماں کوئی پیسہ نا رہا۔ اُو کھس لا دو، اُپلا بیچ لائیں، دو چار آنہ مل جائے تو سیور ماں کام آئی۔''

میرا اور احمد کا سر جھک گیا۔

دُھوپ تیز ہوگئی تھی۔ زمین سوکھی جارہی تھی، درخت اور سبزے سے شادابی غائب ہورہی تھی، اور گاؤں کے قریب مطلع پر غبار سا چھایا ہوا تھا!!

(باسی پھول)

شیو کا باغ

شیو نے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر کہا... ''تھک گیا بھگوان!'' برہما ہنسے۔ آکاش، دھرتی، سورج، چاند، تارے، پہاڑ، سمندر، سب ان کے ٹھٹھے کی آواز سے گونج اُٹھے۔ سامنے کھڑے شیو بھی اس طرح ہلنے لگے جیسے کوئی ستار کے تار پر زور سے اُنگلی مار دے۔

برہما نے اُن کی دَشا دیکھی 'کیوں؟' انھوں نے گرج کر پوچھا۔

''میں نے تمھارے حکم سے اتنے برہمانڈ تیار کیے اور ان میں اتنی شکتیاں رہنے بسنے والی، ان کو آباد اور برباد کرنے والی بھر دی ہیں کہ ان کی گنتی اب مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس تو ہی، جس سے گنتی شروع اور جس پر ختم ہوتی ہے ان کو گن سکتا ہے۔'' انھوں نے کانپ کر کہا۔

برہما کی آنکھیں چمکیں۔ چاند، سورج، تاروں اور برہمانڈوں میں ایسی بجلی کوندھ گئی کہ سب نے یکایک آنکھیں بند کرلیں اور سب کے ہردے سے 'برہما!' کی آواز نکلی۔

سب کے پالنے والے برہما نے آنکھیں بند کر کے پوچھا۔ ''پھر؟'' پھر شیو نے ڈرتے ڈرتے کہا، ''بس میں تم سے اتنی آ گیا لینے آیا کہ میں اپنے لیے ایک باغ لگاؤں اور اس کے ایک کونے میں بیٹھ کر تمھارے دھیان میں سب کچھ بھول جاؤں۔''

برہما نے شیو کو پیار سے دیکھا۔ دیویاں گانے لگیں، دیوتا ناچنے لگے اور آسمان اوس کے موتی برسائے زمین کو کمل، موتیا، چنبیلی، جوہی کے پھولوں نے ڈھک لیا۔ وہ بہت دھیرے سے بولے، ''تم کو آ گیا ہے۔''

شیو نے اپنے بنائے ہوئے برہمانڈوں میں سے ایک استھان بہت دیکھ بھال کر چن لیا جس کے ایک بھاگ میں کڑی دھوپ ہوتی تھی، ایک بھاگ میں بڑی برف گرتی تھی۔ اس کے ایک اوپر بہت بڑا اونچا ٹیلہ تھا، دوسری طرف جل سے بھرے ہوئے کھڈ تھے۔ اس کے ایک

کونے میں ریگستان تھا، دوسرے بھاگوں میں گھاس اور ہریالی سے ڈھکے ہوئے میدان۔ وہاں کی ہوا کے جھونکوں میں گرماہٹ تھی، سردی اور خشکی بھی تھی۔ تراوٹ بھی اس کے کسی نہ کسی کونے میں تھی۔ ہر ایک وہ چیز موجود تھی جو شیو نے سرشٹی رچنا کے سمے کہیں نہ کہیں پیدا کی تھی۔ شیو کا ہردے آنند سے بھر گیا۔ برہما کا دیا یہاں سب کچھ موجود تھا۔ انھوں نے اس کھڈ کے چاروں اور ایک دیوار سی کھینچی اور آپ سب سے اونچے ٹیلے پر جا کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے پھر اس دھرتی پر ایک نگاہ ڈالی۔ ہاتھ سے اشارہ کیا اور آسن جما کر برہما کے دھیان میں آنکھیں بند کرلیں۔ دھرتی کی چھاتی جگہ جگہ سے پھٹ گئی۔ کہیں سے آم کے پیڑ نکلے، کہیں سے سیب اور آڑو کے پیڑ، ہر طرف پھلوں، میووں اور پھولوں کے پودے اُگ آئے۔ کھڈوں کا پانی کچھ پکا، کچھ سڑا، دھراتل پر ایک جھلّی سی پڑی، پھر ان میں حرکت سی ہوئی۔ چھوٹی بڑی مچھلیاں بنیں، کچھ تو وہیں پانی میں رہیں، کچھ کو لہروں نے بھومی پر پھینکا، اُچھلیں، تڑپیں اور مرگئیں یا پھر کچھ سے کچھ ہوگئیں۔ رینگنے والے کیڑے، بڑے جانور، بڑے بڑے سانپ گھٹے بڑھے، ان کے رُوپ بدلے، چوپائے بنے، دوپائے ہوئے۔ چلے، پھرے، اُچکے، پھاندے، پنکھ جمے اور ہوا میں اُڑنے والی چڑیاں بھی چہچہا کر پیڑوں پر آ بیٹھیں۔

شیو نے آنکھیں بند کیں تو پھر نہ کھولیں۔ موسم بدلتے رہے، نظارے بدلتے رہے۔ کبھی ورشا ہوئی، کبھی اُولے گرے، کبھی کھیتوں نے سونا اُگلا اور کبھی جواہرات۔ کبھی کال پڑا، بڑے بڑے ٹکڑے سوکھ گئے، لاکھوں جاندار ڈانگر ہو کر مر گئے۔ کہیں بھونچال آیا، ہزاروں پیڑ گر پڑے، ڈالیاں ٹوٹ گریں اور ٹھنٹھ کھڑے رہے۔ جانوروں نے ایک دوسرے کو کھدیڑا، نوچا، کھسوٹا، کاٹا اور مار ڈالا۔ بل وان نے بل ہین کو کھا ڈالا۔ بڑے گروہ والوں نے چھوٹے گروہ والوں کو دبا لیا۔ راج اور سرکاریں قائم ہوئیں، پر شیو نے بند آنکھیں نہ کھولیں۔ کھولتے ہی کیوں، انھوں نے تو یہ ساری لڑنے والی شکتیاں اپنے دماغ میں بھر دی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ مشین انھوں نے بنا دی ہے۔ اس کے سارے پُرزے اپنا اپنا کام کرتے رہیں گے۔ باغ کے جانوروں میں سب سے چپل ویر ایک جانور تھا، اس نام تھا بندر۔ اوروں کو تو اپنی شکتی، اپنے شریر، اپنے ڈیل ڈول اور اپنے دانت اور پنجوں پر بھروسہ تھا پر اسے کیول اپنے دماغ پر گھمنڈ تھا۔ جیسے جیسے سمے بیتا، اس کی بدھی اور اس کی سوجھ بوجھ بڑھتی گئی۔ اس نے دوسرے جانوروں کو پھنسانے کے لیے پھندے بنائے، اس نے شکار کھیلنے کے لیے نوکیلے ہتھیار تیار کیے، اس کی

آنکھیں تیز تھیں۔ اس کو پینترے خوب آتے تھے۔ وہ جڑی بوٹیوں کا ماہر تھا۔ اس نے اپنی پرتبھا سے باغ کے سارے جانوروں کو دبالیا اور ان کا مالک بن بیٹھا۔

دوسرے جانور تو اس کی چالاکیوں سے ہار کر الگ الگ جگہوں میں جا چھپے پر خود اس کی سنکھیا برابر بڑھتی گئی۔ جیسے جیسے اس کی جاتی میں نئے نئے پودک نکلے، انھوں نے اپنی اپنی ٹولیاں بنانا آرمبھ کر دیں۔ وہ ایک دوسرے کا بھاگ نوچ کھسوٹ کر کھاڈالتے اور ایک دوسرے سے کھوں کھوں کر کے خوب لڑتے۔ بوڑھے بندروں نے جب روک تھام کی تو ان میں سے کچھ بگڑ کر باغ کی دیواریں پھاند کر دوسرے باغوں، جنگلوں اور کھیتوں میں جا بسے۔ ان استھانوں کے ہواپانی کے پربھاؤ سے ان کی صورت، شکل اور ان کا رنگ رُوپ بھی بدل گیا اور وہ بالکل بدیشی ہو گئے۔

بہت سا سمے بیتا۔ شیو کے باغ کا نام دُور دُور پھیلا۔ یہاں کے میووں کی تازگی، یہاں کے جل کی مٹھاس اور یہاں کے پھلوں کی سگندھی کی چرچا ساری دنیا میں ہونے لگی۔ ایسی دشا میں بھوکے ننگے جہاں جہاں تھے، سمٹ سمٹ کر ادھر بڑھے۔ سب سے پہلے اُتر پچھّم سے ایک گروہ آیا۔ وہ بھورے بندروں کا تھا۔ یہ باغ والوں کو کالا بندر کہتے اور اس پر بہت گھمنڈ کرتے کہ یہ کالے نہ ہمارے جیسے سوجھ بوجھ کے ہیں اور نہ ہماری طرح تگڑے اور پھرتیلے۔ پھر اس پر بھی اکڑتے تھے کہ ہم نے کئی انسان پیدا کیے ہیں، یعنی ایسے جانور جنگی دُم گر گئی تھی اور دو پیروں پر کھڑے ہو کر چلتے تھے۔ وہ اس کے آگے انسان کی ودیا کھیا نہیں سمجھتے تھے۔ اگرچہ وہ لوگ جس کی اور سنکیت کرتے تھے وہ انسان ہی نہ تھے بلکہ انسان بنانے والے، انسانیت کو بڑھانے والے تھے۔ کالے، گورے، بھورے، پیلے رنگ مٹانے والے، برہما کے پہچاننے والے، اسی کے بھیجے ہوئے برہمانڈوں کے چاند، سورج ان بھوروں نے اپنے انسانوں سے کچھ نہ سیکھا۔ کالے بندروں کو نیچ سمجھا۔ دیشی بندروں کی آپس کی پھوٹ نے انھیں بھی کبھی ایک نہ ہونے دیا۔ اسی کارَن بھورے بندروں نے انھیں مار کاٹ کر پورے باغ پر ادھیکار جمالیا۔ کالے بندروں کے من میں یہ بات دھیرے دھیرے جم گئی کہ بھورے بندر سچ مچ کوئی نئی قسم کی نسل ہیں۔ انھیں بھرم تھا کہ وہ ان کا مقابلہ کرنے کی کسی طرح طاقت نہیں رکھتے۔ ان کا پورا پورا جھنڈ بھورے بندروں کو دیکھتے ہی، کھیس نکال کر گردن جھکا کر بیٹھ جاتا اور جلدی جلدی آنکھیں جھپکانے لگتا۔

جیسے وہ کہتا ہو، ''حضور ماں باپ ہیں، حضور جو حکم دیں گے ہم سر آنکھوں سے بجا لائیں گے۔''

بھورے بندروں نے ان دیشی بندروں کو اپنایا نہیں بلکہ انھوں نے اپنی چھاپ بنائے رکھنے کے لیے اپنے ہی ساتھیوں میں سارے اچھے کام بانٹ لیے، اور دیشی بندروں سے نیچ کام لینے لگے۔ کام کاج کے اس بٹوارے سے اگرچہ کالے بندر سدا کے لیے نیچے کی اور چلے گئے، پر یہ لابھ ضرور ہوا کہ ہر ایک کو اپنے اپنے کرتویہ کا گیان ہو گیا اور وہ ان کی پورتی میں لگ گئے۔ اس طرح باغ دن پر دن سنورتا گیا اور اس کا نام اور تعریف اور بھی پھیلتی گئی۔ دوسرے استھانوں کے بندروں نے جیسے جیسے یہاں کے پھلوں کی مٹھاس کی تعریف سُنی، انھوں نے اپنے جتھے اکٹھےّ کیے اور بار بار باغ پر ادھیکار کرنے کا جتن کرتے رہے۔ ان نئے آنے والوں میں سے کچھ پہلے بندروں نے سپھلتا پرایت کی اور وہ ایک یگ تک باغ کے پچھمی بھاگ پر ادھیکاری بنے رہے۔ پر دھیرے دھیرے بھوروں نے انھیں باہر نکال دیا اور جو نہ بھاگ سکے انھیں ختم کر ڈالا۔ پھر بھی باغ کی ہریالی بنی رہی، پر جیون کی ضروری چیزوں کے کافی ہونے سے دھیرے دھیرے وہ ولاسی بنتے گئے۔ وہ پرشرم سے گھبرانے لگے۔ ان کا ادھیک سمے اونگھنے اور سونے میں بیتنے لگا۔ ان کی اس سستی اور بے پرواہی سے لابھ اُٹھا کر بالکل ہی نئی طرح کے بندر باغ میں گھس آئے۔ یہ کتھئی رنگ والے بندر تھے۔ ان نئے بندروں کو دو باتوں کا گھمنڈ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نے دنیا کی ساری بندر آبادی سے اُدھیک انسان پیدا کیے ہیں۔ اور ہم سے اُدھیک نہ کسی کے تیز ناخون ہیں نہ دانت۔ ان سے اور بھورے بندروں سے خوب لڑائیاں ہوئیں۔ وہ لڑائی کی کلا میں بھوروں سے سچ مچ اُدھیک چتر ثابت ہوئے۔ اسی کارن انھوں نے باغ پر ادھیکار پا لیا۔ انھوں نے چترائی یہ کی کہ کالوں کو بہت کچھ اپنا بھی لیا اور کچھ ایسی چالیں چلیں کہ کافی سنکھیا ٹوٹ کر ان سے مل گئی۔ انھوں نے بھوروں کو بھی اُدھیک ناراض نہیں کیا بلکہ باغ کے انتظام میں انھیں بھی لگائے رکھا۔ پھر بھی دونوں طرف دِلوں میں یہ بات ضرور چھپی ہوئی تھی کہ ہم ان بھوروں سے تگڑے ہیں اور ہم بھورے ہیں اور برہما کے پیارے ہیں اور اس باغ کے خاص رکھوالے ہیں۔ یہ کتھئی لیکر ہیں ہمارا ان کا کیا مقابلہ۔

اب باغ کا پھل بھورے بندروں کو کم ملنے لگا۔ ایک تو کھانے والوں کی سنکھیا دن پر دن بڑھتی جاتی تھی۔ دوسرے سارے اچھے پھل کتھئی چھین چھین کر کھا جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ دونوں گروہوں پر ایک دوسرے کے اُلٹا پڑا۔ پہلے کے کاہل بھورے دن رات محنت کرنے لگے اور

پچھلے فاقہ کش کتھئی سست اور آرام پسند ہونے لگے۔ پھر بھی پیٹ بھر سب کو مل ہی جاتا اور آپس میں کھوں کھوں اتنی ہی ہوتی جتنی کہ پرکرتی یا فطرت مجبور کرتی۔ باہر کے اور بندروں کو بھی یہ خیال ستاتا رہا کہ ایسا باغ جہاں اس طرح ہُن برستا ہے وہ ہمارے ادھیکار میں کیوں نہیں؟ اس کارن بندروں کا ایک خاص گروہ جنھیں لال بندر کہتے تھے، بھیس بدل کر اس باغ میں آیا۔ انھوں نے یہاں کی دشا دیکھی اور اپنے بھائیوں کو یہاں کی خبر دی۔ ان لوگوں نے بہت سوچ کر ایک خاص طرح کی لکڑی بنائی جسے ہاتھ میں لے کر جس کی طرف کر دیتے بس دھائیں دھائیں کی آواز ہوتی اور اس کی چھاتی میں چھید ہو جاتا۔ لال بندر یہ لکڑیاں لے کر اس باغ میں آئے اور انھوں نے کبھی کتھئی بندروں کے ساتھ ہو کر بھوروں کی چھاتی میں چھید کیا، کبھی بھوروں کے ساتھ مل کر کتھئی بندروں کو چھیدا۔ ان کی لکڑی کا ڈر دھیرے دھیرے سب کے دل میں سما گیا اور انھوں نے تھوڑے دنوں میں سارے بھورے اور کتھئی بندروں پر اپنا راج جما لیا۔

لال بندر سب سے اَدھک چالاک نکلے، انھوں نے باغ کو اپنی ماتر بھومی نہیں بنایا، انھوں نے اپنا پچھلا دیش نہیں بھلایا۔ وہ شیو کے باغ میں کچھ ہی دن ٹکتے اور یہاں جو اچھی سے اچھی چیز پاتے اپنے دیش ضرور بھیج دیتے۔ انھوں نے باغ کو لوٹ کر اس کے سارے پھل، میوے اور ترکاریاں گھر بھیج دیں۔ وہی باغ جہاں کی دھرتی سونا اُگلتی تھی، جہاں کے میوے اور پھل بھومی میں گر کر سڑتے اور اچھی کھاد بنتے، وہی باغ جہاں کا ہر ایک نواسی موٹا تازہ آنند کی بنسی بجاتا دکھائی دیتا تھا، کنگالوں کا دیش اور سوکھے ڈھانچوں کا کھنڈر ہو گیا۔ ایک ایسا ملک جہاں کے رہنے والے بھوک سے بلبلاتے اور گرے پڑے دانوں پر آپس میں کتّوں کی طرح لڑتے تھے۔ اس پیٹ کے کارن بھورے اور کتھئی ساری اکڑ کو بھول گئے۔ انھوں نے ہر گھڑی لال بندروں کا منہ تاکنا اور ان کے اشاروں پر چلنا شروع کیا۔ شیو کے باغ کی یہ دَشا دیکھ کر وہ آتمائیں جو انسان بننے کا گورو پراپت کر چکی تھیں، دُکھ سے چیخ اُٹھیں۔ ان کی آواز میں اتنی کرونا اور درد تھا کہ وہ آکاش کو پار کر گئیں۔ اس نے برہما کے چرنوں کو چھو لیا۔ چونکہ شیو کا دھیان انھیں کمل پدوں سے لگ رہا تھا، انھوں نے بیاکل ہو کر آنکھوں کھول دیں۔ ان کے مستک پر تین کھڑی لکیریں پڑ گئیں۔ انھوں نے باغ کے ایک کونے کو تیز نگاہ سے دیکھا، باغ کا ایک رج کن کسمسایا، اُبھرا، اُڑا اور اس نے گلاب اور لالہ کے تھالوں میں کروٹیں لیں۔

وہاں کی سگندھ سے اس کا خمیر بنا۔ جوہی، چنبیلی، چمپا کا رس اس میں ٹپکا۔ شہد کی ایک بوند اس میں گر کر جذب ہوگئی اور وہ نرمی مٹھاس اور سگندھوں کا ایک پتلا سا بن گیا۔ پاروتی نے اسے گود میں اُٹھالیا، دیوتاؤں نے بڑھ کر منتر جگایا اور وہ پتلا ایک دُبلے پتلے انسان کی صورت میں اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ شیو نے سنتوش کی سانس لی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس انسان نے اپنے نرم اور میٹھے بول میں کالے بھورے اور کتھئی سارے بندروں کو للکارا۔ ''کیا کرتے ہو مورکھو؟ اگر اسی طرح آپس میں لڑتے رہے تو شیو کا باغ سدا کے لیے اُجڑ جائے گا۔ اس باغ کے رکشک تم ہو، لال بندر بدیشی ہیں۔ ان کے قدم یہاں اسی سمے تک ہیں جب تک تم آپس میں جھگڑتے ہو۔ ذرا ایکا کر کے دیکھو۔ لال بندروں سے ڈرنا چھوڑ دو۔ یہ باغ سے خود نہ بھاگ جائیں تو تمھیں کہنا۔'' پر کسی نے اس کی باتوں پر دھیان نہ دیا۔ کالے، بھورے اور کتھئی سب ہنستے رہے۔ ''کیسی ناسمجھی کی باتیں کرتا ہے۔ ہمارے مل جانے سے کیا ہوگا؟ ہم نہتے ہیں، لال بندروں کے پاس دغنے والی چھڑیاں ہیں۔ وہ ہم کو اکڑتے دیکھ کر ہمارے شریر بھر میں چھید کر دیں گے۔'' پھر بھی وہ انسان اپنی ہی سی کہے گیا۔ مٹھی بھر بندر اس کا کہنا ماننے پر تیار ہو گئے۔ لال بندروں نے چھڑیاں اُٹھائیں۔ دھائیں، دھائیں! مگر اس انسان کے ماننے والوں نے ہنس ہنس کر چھاتیوں میں چھید کرالیا۔ دھرتی کانپ اُٹھی، ہر طرف شور ہوا۔ نہتوں پر اس طرح کا اتیاچار! بھورے بندروں میں جوش بھرنے لگا۔ تھوڑے سے لال بندر کس کس کے سینہ میں چھید کریں گے؟ ہم ان جان دینے والوں سے پیچھے کیوں رہیں؟ لال بندر ان کے تیور دیکھ کر گھبرا گئے۔ انھوں نے کئی باغوں میں راج قائم کرلیا تھا۔ اگر اس طرح ہر جگہ سینوں میں چھید کرانے والوں کا گروہ پیدا ہوگیا تو وہ کس کس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگیں گے۔ ان کے خراٹ جغادری جمع ہوئے۔ انھوں نے کتھئی بندروں میں سے ایسوں کو چن کر اپنے پاس بلایا جنھیں وہ پہلے ہی شیشے میں اُتار چکے تھے، جو ان کا دم بھرتے تھے، جو ان کا جام پیتے تھے۔ انھوں نے کہا۔ ''ہم تم ایک دوسرے کو بہت دنوں سے جانتے ہیں۔ ہم سے تم سے سینکڑوں برس سے لڑائی چلی آ رہی ہے۔ نہ جانے کتنے باغوں سے ہم تمھیں مار کر نکال چکے ہیں۔ ہم تمھاری ویرتا کو مانتے ہیں اور تم ہمارے کوشل کو مانتے ہو۔ اس کارن اگر ہمارے بعد کوئی راج کر سکتا ہے تو وہ تم ہی ہو۔ یہ بھورے سدا کے غلام رہے۔ یہ گولر کے کیڑے ہیں۔ ان کو کبھی کچھ نہ آیا پھر بھی آج اس مورکھ انسان کے بہکانے سے ہمارے سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہم بھی اس باغ کو چھوڑنا ہی

چاہتے ہیں۔ ہمارا اب یہاں جی نہیں لگتا۔ ہم نے اس کا سارا رس نکال لیا ہے۔ اب یہ صرف چھلکا ہی چھلکا ہے۔ پھر بھی اگر تم چاہو تو ہم تمھیں یہاں کا راج دِلوا دیں۔"

انھوں نے کہا۔ "اوپر ایشور ہے۔ نیچے آپ ہیں۔ آپ ہم سب کے ماں باپ ہیں۔ آپ جو کچھ حکم دیں گے ہم سرآنکھوں سے اس کا پالن کریں گے۔"

لال بندروں نے کہا۔ "بس تم بھی اپنی جاتی کو اُکساؤ، اُن سے کہو جھوٹ موٹ شور مچادیں۔ دیکھو تو ہم کتنے اچھے پھل اور میوے ان بھوروں سے چھین کر تمھیں دے دیتے ہیں۔"

لال بندروں نے جو اتنی شہ دی تو کتھئی بندروں نے وہ شور مچایا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دی۔ ان کا ایک ساتھ منہ کھلا رہتا اور سوائے اس کے کچھ نہ سنائی پڑتا "باغ بانٹ دو، ہمارا حصہ کردو۔" انسان نے بار بار سمجھایا۔ "یہ لال بندر تمھیں بہکا کر اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ آج باغ کے ہر پھل اور ہر میوے میں تمھارا حصہ ہے۔ جب یہ بٹ جائے گا تو تمھیں بہت تھوڑا ملے گا۔ اتنا بھی تو نہ ہوگا کہ تم اپنے ہاتھوں سے اپنا ہی نقصان کرتے دیکھ کر ہمارا دل پھٹتا ہے۔ بھورے کتھئی دونوں ایک ہیں۔ جب سے تم اس باغ میں آئے تم نے اسے اپنا گھر سمجھا۔ تم نے یہاں کے پودوں سے کوئی بدیشی باغ نہیں بسایا۔ تم باہری کتھئی بندروں سے اس باغ کے لیے بہت لڑے۔ تمھارے کئی ونشوں کی ہڈّیاں گل کر یہاں کی بھومی کی خمیر بن گئی ہیں۔ تم نے بھورے بندروں سے رشتہ ناتہ کیا۔ تم اس باغ کے اسی طرح باسی ہو جس طرح بھورے بن گئے ہیں۔ ایسے میں الگ ہونے کا وِچار چھوڑ دو۔ تم اپنے حصہ سے اَدھک پھل لے لو۔ میوے لے لو، ترکاریاں لے لو پر آپس میں ایک ہو جاؤ۔ بھائی بھائی کی طرح رہو۔ اور اس سے مٹھی باندھ کر لال بندروں کے منہ پر اہنسا کا مُکّا مار دو۔"

یہ بات کتھئی بندروں کی سمجھ سے اونچی تھی۔ وہ اپنی نسل کے بزرگ انسانوں کی تعلیم بھول چکے تھے۔ اُنھیں تو صرف لال بندروں کی چاپلوسی کرنا آتی تھی۔ ان کے لیے تو سب سے بڑی بات اسی میں تھی کہ لوگ اُنھیں دیکھ کر دھوکا کھا جائیں اور کتھئی کی جگہ لال پکار اٹھیں۔ ایسی حالت میں وہ بھلا انسان کی کہاں سنتے۔ انھوں نے کان بند کر لیے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ بس منہ کھول دیا۔ "ہم الگ ہوں گے! ہم الگ ہوں گے! ہم الگ ہوں گے؟" لال بندر پیٹھ ٹھونکتے رہے۔ شاباش اسی طرح چیختے رہو۔ ہم تمھیں پچھلی ساری لڑائیوں اور ساری دشمنیوں کا ایسا بدلہ دیں گے۔ تمھارے ساتھ ایسا نیک سلوک کریں گے کہ تم بھی یاد کرو گے کہ کسی بھلے آدمی

سے پالا پڑا تھا۔“

انسان سمجھاتا رہا۔ کتھئی بندر گیدڑوں کی طرح ایک ساتھ چلاتے رہے، بھورے تھک گئے۔ انھوں نے کہا۔ ”اچھا تم اپنا حصہ لے لو اور ہماری جان چھوڑ دو۔ اگر تمھارے الگ ہونے سے یہ لال بندر یہاں سے چلے جاتے ہیں تو یہ بھی سہی۔ بھائی چھوٹ جائے، ماں کے شریر کا انگ بھنگ ہو جائے، یہ لال بندر تو کسی طرح پنڈ چھوڑیں۔“

حصّہ بٹنے لگا۔ میوے اور پھل ہی کا نہیں بلکہ باغ کا بٹوارہ ہونے لگا۔ بندر تو بندر، نوچ کھسوٹ شروع ہوئی۔ نوبت تُو تُو، مَیں مَیں، ہاتھا پائی تک پہنچی۔ لال بندروں نے چھپے چھپے اس جھگڑے کو بھڑکایا۔ اپنی لائی ہوئی چھریاں بھورے اور کتھئی بندروں کو بانٹ دیں۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے سینوں میں خوب چھید کیے اور لاکھوں کی سنکھیا میں نہ سوکھنے والے خونی فوارے جاری ہو گئے۔ عجیب بات تھی کہ جہاں کہیں بھی ان لڑنے والوں کے لہو کی ایک بوند بھی گرتی، تو باغ میں آگ سی لگتی۔ پھل اور میوے سوکھ کر گر پڑتے۔ پیڑ جل کر خاک ہو جاتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے باغ کے ہر ایک حصّے سے لپٹیں لپک لپک کر اُٹھنے لگیں۔ جلنے اور مرنے والوں کی چرائن اور بدبو سارے باغ میں اس طرح پھیلی کہ دم گھٹنے لگا۔ جہاں کہیں بھی بھورے اور کتھئی تھے ایک دوسرے کو بھنبوڑنے اور کاٹنے لگے۔ ایک دوسرے کے خلاف اس طرح نفرت بھری کارروائی کرتے تھے جو نہ کبھی دیکھی گئی تھی اور نہ کبھی سنی گئی تھی۔ بس چاروں اور ”مارو، مارو، کاٹو، اور برباد کرو“ کی آواز تھی۔ خون تھا، بو تھی، سڑن تھی۔ ایسے میں بھوروں کا نیتا سب سے اونچے پیڑ پر چڑھ کر پوری آواز میں چیخا۔ ”ٹھہرو! سنو!“ جان پڑا کسی نے منتر پھونک دیا، قتل کے لیے اُٹھے ہوئے ہاتھ رُک گئے اور لوٹ کے لیے بڑھے ہوئے قدم تھم گئے۔ اس نے بھوروں سے پوچھا... ”تم کسے مار رہے ہو؟“

انھوں نے کہا... کتھئی بندروں کو۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ دُشٹ ہیں، کمینے ہیں، راکشس ہیں! وہ باغ کے ہر کونے میں جہاں ان کی سنکھیا اَدھک ہے، بھورے بندروں کی بوٹیاں کاٹ کر پھینک رہے ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”اچھا یہ بھی سہی، پر یہ تو بتادو وہاں کے کتھئی بندر دُشٹ ہوئے، اَپرادھی ہوئے، یہاں والے کیسے ہو گئے؟ ان کو نِردوش مارنا تو کوئی دھرم نہیں۔“

"ارے یہ سب سانپ کے بچّے ہیں۔ آج ان کے زہر کے دانت نہیں نکلے ہیں، کل یہ بھی ڈسنے لگیں گے۔" وہ میٹھے سُر میں بولا۔ "پر مجھے تو اس باغ کے رکھوالوں نے یہی بتلایا ہے کہ سانپ کو بھی نہ مارو۔ اسے بھی دودھ چاول کھلا کر اپنا بنا لو۔ اچھا اس کو بھی چھوڑ دو، تم بھورے بندر اس کا دعویٰ کرتے ہو کہ ہم نے سب سے اَدِھک انسان پیدا کیے، کتھئی کہتے ہیں ہم میں سب سے اَدِھک انسان ہوئے اور جانتے ہو انسان کسے کہتے ہیں؟ اسے جو دنیا میں سب سے اَدھک پریم اور محبت کرتا ہے، جس کی نظر میں کالے، بھورے کتھئی کا بھید نہیں، جو ہر ایک کو بھائی سمجھے، جو گرے پڑے ڈربل کو اپنے سے شکتی شالی اور بلوان سمجھے اور اپنے سے اچھا جانے، جو ہتھیارے کو بھی دودھ کا پیالہ دے، جو سینہ پر سوار قتل کرنے والے کے لیے بھی رزوان کی پرارتھنا کرے، وہ جو سولی پر چڑھانے والے کی بھی بھلائی چاہے۔ تم کتھئی بندروں کو دُشٹ کہتے ہو اور وہ تمھیں کمینہ، بتاؤ اس میں سے انسان کون ہے؟"

کچھ سمجھ دار کتھئی اور بھوروں نے، جو انسان کی سنگت میں رہتے تھے، اس کی بولی سمجھتے تھے، اس کی بات مان لی اور آگ کے بجھانے میں لگ گئے۔ پر سموچی بھیڑ سر کھجانے لگی۔ ان کا دل کچھ اور کہتا، ان کا انسان کچھ اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں پر ان میں سے بہت سے نوجوان یہ کہہ کر اُٹھ گئے کہ یہ بھی کتھئی بندروں سے مل گیا ہے۔ جو کچھ کہتا ہے اس میں اُنھیں کا لابھ ہوتا ہے۔ اس کی بات پر کان دھرنے میں سراسر گھاٹا ہے۔ یہ لوگ بڑے بڑے جتھوں کے رُوپ میں گپت استھانوں میں بیٹھ کر کتھئی بندروں کا شکار کھیلنے لگے۔ انھوں نے انسان کی پکار کی اُور سے اپنے کان بند کر لیے۔

بوڑھے انسان نے یہ ساری حرکتیں بہت دھیان کے ساتھ دیکھیں۔ اس نے کچھ سوچا اور کچھ کو سُنا کر کہا۔ "میں دیکھتا ہوں تم شیو کے باغ کو اُجاڑ کر ہی چھوڑو گے۔ ایسی حالت میں مجھے جیتے رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے نشچے کر لیا ہے کہ تم یا تو میرا کہنا مانو گے، آج سے کالے، بھورے کتھئی کا بھید بھول جاؤ گے، تھپڑ کے جواب میں دوسرا گال بڑھا دو گے، کتھئی کی گولی سینے پر کھاؤ گے اور اس کی اور پھول پھینکو گے یا پھر میں آج سے اُپواس کر کے مر جاؤں گا۔ تم اس باغ کے پھل کے لیے ایک دوسرے کو مارتے ہو۔ میرے لیے وہ پھل وِش ہے۔ جس کے لیے کسی کا خون بہے۔" اس نے اس دن سے بھوکا رہنا آرمبھ کر دیا۔ باغ بھر میں تہلکہ مچ گیا۔ جس منہ میں نوالا جاتا گلے میں اَٹک جاتا۔ میٹھے سے میٹھے پھل کڑوے جان پڑتے۔ پانی

کا گھونٹ ٹھیک طرح سے نہ اُترتا۔ ہر ایک نے دوڑنا شروع کیا۔ کالے، بھورے، کتھئی سب نے خوشامد کی کہ برت توڑیے اب ہم آپس میں نہیں لڑیں گے۔ آپ کے کہنے پر چلیں گے۔ ہم بھگوان کو، ایشور کو ساکھی دیتے ہیں۔ ہم آپ ہی کی قسم کھاتے ہیں۔"

جب لاکھوں کروڑوں بندروں نے پرتگیا کی اور بات پر جمے رہنے کا وَچن دیا تو اَمن اور شانت کے دیوتا نے برت توڑا اور مسکرا کر تھوڑا سا پھلوں کا رَس پی لیا۔

ہر ایک نے سنتوش کی سانس لی۔ باغ کا رنگ بدلنے لگا۔ لڑنے والے گلے ملنے لگے۔ پر لٹیروں کا گروہ ناخوش ہی رہا۔ وہ بڑبڑاتا رہا۔ اس انسان نے تو ہمارے سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ یہ چاہتا ہے کہ ہم نے جو لوٹ مار کر حاصل کیا ہے وہ لوٹا دیں۔ نہ ہمارا باغ رہے نہ ہمارے پھل۔ سب کچھ پھر سے دوسروں کا ہو جائے۔ یہ ہمیں اپنا ہی جیسا مورکھ انسان بنانا چاہتا ہے۔ ہم تو اب اسی کو مار کر سانس لیں گے۔

اُنھوں نے نرجن استھانوں میں بیٹھ کر سنبھائیں کیں اور اُن میں کا ایک پاگل جان پر کھیل گیا۔

بوڑھا انسان ہر روز ننھی ٹہنیوں کا سہارا لے کر ایک اُونچے استھان پر بیٹھتا تھا۔ لوگوں کو دھیان اور گیان کی باتیں بتاتا تھا۔ آنکھ والے اسے دیکھتے تھے اور کان والے اسے سنتے تھے۔ ایک دن جیسے ہی اُس نے اس پر تر استھان پر پاؤں رکھا، ایک بھورے بندر نے لال بندروں کی لائی ہوئی چھڑی اُٹھائی اور دھائیں! دھائیں!! دھائیں!!! اس کے سینے پر داغ دی۔

اس زور کا ہاہا کار مچا کہ شیو نے آنکھیں کھول دیں۔ انھوں نے دیکھا بھورے انسان کے چھیدے ہوئے سینے سے خون کا فوارا نکل رہا ہے اور اس کی آتما سفید پنکھوں کے سہارے ہوا میں اُڑ رہی ہے۔ انھوں نے مسکرا کر دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور اسے اپنے میں سمیٹ لیا۔

باغ میں جلے ہوئے پیڑوں کی جڑوں سے نئے پودے نکلے۔ ٹھنٹھ ہرے ہو گئے، گلاب کھل اُٹھے، کمل کی چادر پانی پر دوڑ گئی۔ آکاش اور انگور کی بیلیں آپس میں گندھ کر ایک ہوئیں اور آکاش گنگا سے آنکھیں ملانے لگیں۔

❁❁

عدالت

شوکت حسین کا عنفوان شباب تھا۔ ہاتھ پاؤں میں قوت تھی۔ خون میں حرارت تھی اور کالج کے رنگین مزاج لڑکوں کی صحبت، جہاں انھوں نے انگریزی پڑھی۔ فارسی پڑھی۔ ریاضی پڑھی۔ منطق پڑھی۔ وہیں انہوں نے چشم وابرو کی زبان، دل وجگر کے افسانے اور عورت کے جنسی معنی بھی اچھی طرح سمجھ اور پڑھ لیے۔ فیشن کے لیے روپیہ تھا۔ گانے کے لیے اچھی آواز تھی اور پڑھنے کے لیے واسوخت امانت، اور رینالڈس کے ناول، اعصابی ہیجان نہ ہوتو کیونکر؟ ہر وقت یہی تذکرے، ہر آن یہی فکر، اور ہر لمحہ اسی طرح کے احباب کی صحبت۔ پھر لطف یہ کہ احسان نگر کے سب سے بڑی زمیندار کے لڑکے تھے۔ شہر میں اگر پیسوں کی ضرورت پڑتی تو دیہات میں محض اشاروں ہی کی!

شوکت حسین کے شکاروں میں تین طرح کی نبات النعش تھیں۔ کچھ تو وہ جنہیں اعصاب مجبور کرتے۔ کچھ وہ جنھیں تنگیٔ معاش مجبور کرتی اور کچھ وہ جنھیں اعضائے رئیسہ کا سردار دل مجبور کرتا۔

کالج کے پڑوس میں دو ایک عاشق تن مہ جبینیں ملیں۔ جنہوں نے اس طرح کے جوان رعنا کے شباب سے لذت یاب نہ ہونا خود گناہ سمجھا۔ تھوڑی دور ہٹ کر کوٹھوں پر ایسی حسن فروش ہستیاں دستیاب ہوئیں۔ جنھوں نے اس کی دولت سے متمتع ہونا اپنا فرض عین جانا، مگر احسان نگر کی سادہ مزاج دیہاتنوں نے 'شوکت میاں' کے محض چوڑے چکلے سینے نشلی انکھڑیوں اور میٹھی میٹھی باتوں پر بے قابو ہو کر تن من کی نذر چڑھادی۔

گاؤں کی رہنے والیاں، چھل کپٹ سے ناواقف، رات دن، اندر باہر زمیندار کے ہاں کام کرنے آتی، اُن کی موہنی صورت دیکھتی انہیں آہستہ آہستہ گنگناتے سنتی اور اُن کی شہری

اداؤں پر دل کھو بیٹھتی تھیں۔ وہ ان کے تمتماتے ہوئے چہرے دیکھتے، شہر کے حاصل شدہ تجربات سے فائدہ اُٹھاتے، اپنی نہ فنا ہونے والی محبت کا یقین دلاتے اور نذر قبول کر کے پوجارن کو ٹھکرا دیتے۔

اسی لیے احسان نگر کے اس طبقہ میں جسے دنیا ارذال کہتی ہے، ٹوٹے ہوئے دِلوں کا ایک انبار تھا اور ان کا باعث محمد حسین زمیندار کا یہ اِکلوتا بیٹا۔ دیہاتنیں جب مردود بارگاہ ہوتیں، تو گونگی بن جاتی تھیں، انہیں دیکھ کر کلیجہ مسوستا۔ دل میں درد ہوتا، کیے کا پچھتاوا ہوتا، دیوتا کے شقی القلب ہونے کا یقین آتا، لیکن سینے پر صبر کا بھاری سل رکھ لینے کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ چڑیا کھیت چگ چکی تھی۔ فریاد کرنے سے کیا حاصل ہوتا؟ عصمت و بے عصمتی میں جو دیوار چین حائل ہے اس کی یہ خصوصیت ہے کہ باحیا عورتیں اسے پار کرتے ہی منہ بند کر لیتی ہیں اور زبان سی لیتی ہیں۔ دل میں خواہ کتنی ہی گھٹیں، مگر ساری عمر صرف اسی فکر میں کٹتی ہے کہ کہیں راز افشا نہ ہو جائے۔ کہیں کوئی سن نہ پالے۔ کہیں کسی کو شک و شبہ نہ ہو جائے۔ اسی لیے صیاد سے زیادہ صید کو خود ہی اخفا کی فکر رہتی تھی اور شوکت حسین کے بزرگ ان کی حرکتوں سے بالکل لاعلم رہتے تھے۔

مگر جب چور چوری میں ایک زمانہ تک نہ پکڑا جائے، تو حوصلہ بڑھتا ہے۔ ہمت زیادہ ہوتی ہے۔ اور دل کو یقین آ جاتا ہے کہ ہم سا شاطر کوئی دوسرا نہیں سب کی آنکھوں میں خاک جھونکنا ہمارے لیے ودیعت ہوا ہے۔ اسی وجہ سے احتیاط میں کمی اور بے پروائی میں زیادتی ہونے لگتی ہے۔ ضمیر بھی آہستہ آہستہ گناہ کا عادی ہو جاتا ہے اور شقاوت بڑھنے لگتی ہے، یہی حالت چوری چھپے کی بدمعاشیوں کی ہے۔ پہلے دو ایک بھروسا کرنے والے دِلوں کو دھوکا دینے پر ضمیر ٹوکتا ہے۔ جب اس کی نہیں سنی جاتی ہے تو پھر کوئی آہ و فریاد کرے لیکن اسے خبر ہی نہیں ہوتی۔ وہ اطمینان کی چادر سر سے پاؤں تک اوڑھے پڑا خراٹے لیا کرتا ہے۔

شوکت حسین نے اتنے شیشہ ہائے دل کچلے اور روندے تھے، کہ نہ اب تلوے فگار ہوتے تھے، اور نہ انہیں کسی کو ٹھوکر مار دینے میں کسی طرح کی جھجک ہوتی تھی۔ وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ رعایا پرجا کا جس طرح یہ فرض ہے کہ وہ زمیندار کی خدمت کرے، بیگار دے، نذر چڑھائے اسی طرح اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ زمیندار کے جوان لڑکے کے لیے اپنی بہو بیٹیاں معاف کر دے۔ آخر اس میں ان کا جاتا ہی کیا ہے؟ ان کی کچھ فردیں تو ہونے والے زمیندار

کے پہلو بہ پہلو بیٹھ لیتی ہیں۔ جس کے چرن چھونا دقتوں سے نصیب ہوتا ہے، اس کے بازو پر اُن کی زُلفیں تو پریشان ہو لیتی ہیں! کیا یہ رتبہ کچھ کم ہے، کیا یہ عزّت تھوڑی ہے؟ اور اگر... اگر اس رشتہ کی یادگار بھی کوئی باقی رہ گئی تو پھر تو زمیندار کا خون ان کی رگوں میں پہنچ جاتا ہے۔ گویا بھنگی کے گھر بھگوان نے جنم لیا!

جب اس طرح کے خیالات دماغ میں ہوں، اور نفس رانی کی خواہش دل میں، پھر بھی بدلیا جولاہن، دُور دُور پھٹکی پھرے، یہ کیسے ممکن تھا۔ شوکت حسین کو ممکن تھا کاوش نہ ہوتی۔ لیکن ایک تو پندرہ برس کا سن، پھر شوخ چنچل۔ اس پر غضب کی ملیح! پھیکا شلجم ممکن ہے نہ بھاوے، لیکن چٹ پٹی چیز۔ اے توبہ! دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ پھندے ڈالنا شروع کر دیئے۔ آنکھیں لڑائیں۔ ٹھنڈی سانسیں بھریں، روپیہ دکھایا، لیکن اس نے ناک سکوڑ کے سر ہلا دیا۔ اب تو پرانے شکاری کو صید افگنی میں مزہ آنے لگا۔ چیز تو وہی ہے، جو مشکل سے ہاتھ آئے۔ اس کا ذائقہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ چنانچہ مہینوں فکر رہی۔ بار بار کوششیں کیں۔ متعدد حیلے تراشے لیکن وہ چھلاوا تھی آسانی سے دام میں نہ آئی۔ اب تو واقعی دل پر اثر ہوا۔ سچ مچ بیمار ہو گئے۔ آخر بدلیا بھی عورت تھی، جوان تھی، جاہل تھی، پرجا تھی، پتھر سا دل پسیجنا شروع ہو گیا۔ اگر باپ نے گونا کر کے سسرال بھیج دیا ہوتا تو شاید ماحول کا انقلاب خیالات بدل دیتا، لیکن احسان نگر کا قیام، ہم جنسوں کے قصّے زمیندار کا رُعب وجلال، پھر شوکت حسین کا گاؤں بھر میں حسین ترین جوان ہونا۔ یہ سب اثر کرنے لگا۔ جتنی سخت مدافعت تھی، اتنی ہی سخت شکست بھی ہوئی۔ وہ گری اور بُری طرح گری۔ نہ ناموس کا پاس تھا، نہ عزت و نام کا۔ شوکت حسین کے پیچھے اُس نے سب کچھ تج دیا، وہ اپنے پیار میں غرق ہو گئی۔ اس طرف بھی بڑی کوششوں کے بعد کامیاب ہونے نے انہیں ایک حد تک گم کر دیا اور ایک زمانہ تک یہ بھی کھو گئے۔

دفعتاً باپ کی نگاہِ تند اور لال چہرے نے چونکا دیا۔ سرشاری، رسوائی اور بدنامی کی حد تک کھینچ لائی تھی۔ ہوش آتے ہی، پرانے دستور کے مطابق مٹّی کا سکورا ٹھکرا دیا گیا۔ شراب اس کی آخری حد تک پی لی تھی، اب ساغرِ گِل کی ضرورت؟ وہ توڑنے اور پھینکنے کی چیز ہی تھی! کچھ سونے چاندی کا کاسہ تھوڑے تھا کہ کلیجہ سے لگا رکھا جائے! مگر پینے والا جو کچھ سمجھے، جام خود کو ذلیل سمجھنے سے رہا۔ وہ تو اپنے کو جامِ جمشید ہی سمجھتا ہے!

بدلیا نے جب بدلے ہوئے رنگ کو محسوس کیا، تو وہ دیوانہ وار شوکت حسین کی ماں کے

پاس گھس گئی۔ زمیندارن نے اس کی صورت دیکھتے ہی ماماؤں کو حکم دیا۔ ”نکالو پاجی کو یہاں سے! مالزادی نے میرے بچے کو خراب کر دیا۔“ اب کیا تھا، ہر ایک جوتیاں لے کر دوڑی وہ گھبرا کر بھاگی، اور اس طرح بھاگی کہ زمیندار کے گھر سے ہی نہ نکلی، بلکہ اپنے گھر سے بھی نکل گئی اور گاؤں سے بھی! ناگن چوٹ کھا کر پلٹی نہیں۔

ناگن چوٹ کھا کر پلٹی نہیں بلکہ بھاگی تھی۔ خدا جانے کہاں۔ کس جنگل میں کون سے سوراخ میں جا کر چھپ رہی کہ ماں باپ نے ڈھونڈھا۔ برادری اور گاؤں کے لوگوں نے ڈھونڈھا۔ مگر اس کا پتہ نہ چلا۔ گاؤں میں ہر شخص کہتا۔ ”مر گئی جان دے دی۔“ اس کے ماں باپ خفا بھی ہوئے، روئے بھی۔ گاؤں کے لوگوں نے افسوس بھی کیا، اور ہمدردی بھی کی۔ لیکن شوکت حسین صرف شہر چلے آئے۔ ضرورت تھی کہ اُن کے ماں باپ کے غصّہ کو فرد ہونے کا موقع دیا جائے۔ اس لیے آنکھ سے اوجھل ہی رہنا ابھی بہتر تھا۔ رہا بدلیا کا خیال اور ان کے دل میں! توبہ کیجیے! اُتاری ہوئی پاپوش تھی! گم ہوگئی، ہو جائے، جب استعمال کے قابل تھی، انہوں نے استعمال کر لیا۔ اب ان کی جوتیوں کو غرض؟ انھیں یہ معلوم تھا کہ وہ تنہا نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی ننھی جان بھی ہے، جو انھیں کا عطیہ ہے، لیکن یہ سب تو ہوا ہی کرتا ہے، کون سی نئی بات تھی ’ارذال‘ تو ’اشراف‘ کا برتن ہی ہیں، جب تک جی چاہا اُن میں مزعفر پکتا اور کھایا جاتا رہا۔ جب جی بھر گیا اُن کو یونہی جوٹھا چھوڑ دیا۔ اب اگر انہیں کتّے چاٹیں تو اپنی بلا سے!

بیس برس کا زمانہ گزر چکا تھا۔ ماں باپ بھی مر چکے تھے۔ شادی بیاہ بھی ہو چکا تھا۔ زمینداری کے ساتھ ساتھ ڈپٹی کلکٹری بھی مل چکی تھی۔ اعزاز بھی تھا، ثروت بھی تھی۔ ہاں ایک بات نہ تھی۔ خوشی! اور وہ اس لیے کہ صرف ایک لڑکا پیدا ہوا، اور پیدا ہونے کے پندرھویں دن غائب ہو گیا۔ بیوی پر اس غم کا یہ اثر پڑا کہ وہ قریب قریب دیوانی ہو گئیں۔ دن میں کئی کئی بار اختلاج ہوتا کبھی ہنستیں کبھی روتیں کبھی ان سے جھگڑتیں۔ کبھی خوشامد کرتیں۔ مگر اس روز سے آج تک اس طرح گھبراتیں اور ڈرتیں۔ جیسے ساری آفتیں انہیں کی لائی ہوئی تھیں۔ یہ بھی اپنے پرانے طرزِ عمل پر کاربند رہے۔ مختلف عورتوں سے دل بہلاتے رہے۔ دن بھر کچہری میں ہوتے اور رات کو کسی مہوش کے پہلو میں، لیکن جیسے جیسے سن بڑھتا جاتا تھا۔ اعضا کمزور ہوتے جاتے تھے، مرنے کا دن قریب آتا جاتا تھا اتنا ہی دل میں خلا بڑھتا جاتا تھا۔ محسوس ہوتا کوئی چیز

کم ہے، کوئی شئے گم ہے۔ اس کی جگہ نہیں پُر ہوتی۔ اس کی تمنّا اس کی خواہش بڑھتی ہی جاتی ہے اور دل ناسور کی طرح ٹپکنے لگتا۔

یہی وجہ تھی کہ درد کے چھپانے کے لیے درشت کلامی بڑھادی تھی۔ سختی زیادہ کردی تھی۔ پولیس کے اشارے پر سزا دیتے تھے، بلکہ محض بہانہ ڈھونڈھتے تھے۔ جہاں کسی کے خلاف رپورٹ ہوئی اور انھیں ذرا بھی شبہ ہوا، انھوں نے اس جرم کی سزا دے دی۔ وہ اسی لیے اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ سنگ دل اور سخت مشہور تھے۔

ایک روز پولیس والے ایک نوجوان بنجارے کو پکڑ لائے۔ بیان لیا گیا، معلوم ہوا کہ رات بارہ بجے یہ شہر میں گھوم رہا تھا۔ جب پولیس والوں نے ٹوکا، تو اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ شبہ پر گرفتار کرلیا گیا۔ صبح کو کئی محلوں سے خبر آئی کہ رات میں کئی وارداتیں ہوئیں۔ بظاہر اسی کی حرکت تھی۔ ڈپٹی صاحب کے لیے اتنا کافی تھا۔ بنجارہ بیچارہ ایک بدنام قوم کا فرد تھا۔ اس کا کوئی جاننے والا پہچاننے والا نہ تھا وہ لاکھ اپنی معصومیت اور بے گناہی کی قسمیں کھاتا رہا، لیکن یہ دل میں طے کرکے اُٹھے کہ دو برس سے کم سزا نہ دوں گا۔

گھر پہنچ کر چائے پی رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ ایک عورت ملنے آئی ہے اور کچھ کہنا چاہتی ہے۔ پیشانی پر شکن پڑگئی۔ ''کہاں کی ہے کیوں آئی ہے۔ کس عمر کی ہے؟'' چپراسی سے خفا ہوکر پوچھنے لگے۔ پھر قبل اس کے وہ کوئی جواب دے سکے خود ہی بولے۔ ''اچھا بلالو۔''

ایک پینتیس چھتیس برس کی ادھیڑ عورت، گھونگھٹ نکالے، سامنے آکر کھڑی ہوگئی یہ بغور دیکھتے رہے، لیکن گھونگھٹ سے چہرہ ڈھکا رہا۔ بالآخر ترشروئی سے بولے۔ ''تو کون ہے، کیا چاہتی ہے؟''

عورت نے گھونگھٹ اُلٹ دیا۔ ڈپٹی صاحب بیساختہ بول اُٹھے ''بدلیا۔'' وہ ذرا مسکرائی۔ ''جی ہاں بدلیا۔'' انھوں نے چپراسی کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ کواڑ بند کرکے چپکے سے باہر چلا گیا۔ ڈپٹی صاحب نے پھر بدلیا کو بغور دیکھا۔ واقعی عجیب ملیح صورت پائی تھی۔ عجب دلربا نقشہ تھا۔ عجیب سڈول جسم تھا۔ بیس برس میں اگر کوئی فرق ہوا تھا، تو صرف اتنا کہ اس زمانے میں وہ ناکردہ کار چھوکری تھی۔ ہاتھ پاؤں نرم نرم، بالکل نازک نازک تھے۔ اب چہرے پر متانت تھی۔ اور کھڑے ہونے کا انداز بتاتا تھا کہ جسم میں پھول کی سی نزاکت کی جگہ، بید کی سی لچک نے لے لیا ہے۔ للچائی ہوئی نگاہیں پڑنے لگیں۔ اور اپنے منجھے ہوئے انداز میں بولے۔

''بہت دِنوں کے بعد یاد کیا۔ پھر بھی شکریہ!''

بدلیا نے پھر انھیں دیکھا اور مسکرائی، مگر بالکل اسی انداز سے جس انداز سے کوئی بلّی اپنے پنجے میں چوہے کو دیکھ کر مسکراتی ہے۔ اس مسکراہٹ نے ان کے دل پر بجلیاں گرادیں وہ یکبارگی اُٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''میں ڈپٹی صاحب کے پاس آئی ہوں، شوکت میاں کے پاس نہیں!'' انھوں نے کہا ''اُونہہ باتیں نہ بناؤ۔ آؤ کلیجے لگ جاؤ۔'' وہ پھر مسکرائی اور اس کی مسکراہٹ میں ہزاروں دشنے پنہاں تھے۔ ان کی آنکھیں سُرخ ہونے لگیں۔ اُس نے کہا۔ جو بنجارا آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے اُسے چھوڑ دیجیے۔'' وہ ہنسے اور بولے ''کیوں؟ اُس جوان سے دل اٹکا ہے؟'' بدلیا کا چہرہ غصّہ سے سُرخ ہوگیا۔ وہ ایک قدم اُن کی طرف بڑھی۔ انھوں نے پھر آغوش میں کھینچنے کے لیے ہاتھ پھیلایا، اُس نے ہاتھ جھٹک دیا اور اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''جی نہیں وہ میرا لڑکا ہے!''

اب تک شوکت حسین کی طرح باتیں تھیں۔ اب مجسم ڈپٹی صاحب تھے، ایک مجرم کی ماں ان کو قانون کے خلاف ترغیب دے رہی تھی۔ ساری سختیاں دفعتاً چہرہ اور انداز میں نمایاں ہوگئیں۔ کُرسی پر بیٹھ گئے اور بولے۔ ''ہوں وہ تمھارا لڑکا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''جی ہاں میرا لڑکا ہے اور بالکل بے قصور!''

ڈپٹی صاحب ہنسے سب ہمیشہ یہی کہتے ہیں بھلا بنجارا اور چور نہ ہو۔ بولے۔ ''اچھا تو اصلی چور کہاں ہے؟ اب کی بار بدلیا ہنسی۔ بولی۔ ''کیا اگر اصلی چور پکڑوا دیا جائے تو مرا بیٹا چھوٹ جائے گا۔'' بولے۔ ''یقینی یقینی!''

اس نے کہا۔ ''تو اس کے لیے حضور کو زحمت کرنا پڑے گی۔'' بولے۔ ''وہ کیا؟'' کہنے لگی۔ ''حضور آج بارہ بجے کے بعد میرے ساتھ چلیں، میں چور کو گرفتار کرادوں گی۔'' شبہات پیدا ہونے لگے کہ عورت کہیں دھوکا تو نہیں دے گی۔ چوروں کے ہاتھ سے قتل تو نہ کرادے گی۔ وہ چہرے سے ان کے شبہ اور خوف کو سمجھ کر بولی ''ڈر معلوم ہوتا ہے؟ شاید میرے لیے یا میرے ساتھ کبھی بارہ بجے رات کے بعد گھر سے نہیں نکلے میں چوروں میں پھنسادوں گی! کیوں؟''

غیرت آ گئی بولے۔ ''اچھا میں تنہا چلوں گا۔ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ میرے پاس دو ریوالور ہوں گے۔ اگر ذرا سا شک ہوا تو میں سب سے پہلے تم ہی کو ختم کردوں گا۔''

وہ بیساختہ ہنس پڑی اور بولی۔ ''ابھی میرے مرنے کے دن نہیں آئے... بارہ بجے رات کو آپ کے بنگلے کے دروازے پر ملوں گی۔'' پھر گھونگھٹ نکال کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

بارہ بجے رات کو ڈپٹی صاحب نے برجس پہنی، شکاری کوٹ پہنا، پیٹی کسی اور دو ریوالور کمر میں لگائے۔ پھر ٹارچ اُٹھالی اور آہستہ آہستہ دَبے پاؤں بنگلے سے باہر نکلے دروازہ پر بدلیا کھڑی تھی۔ اُس نے گھونگھٹ ہٹا کر اُن کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''ڈر نہیں معلوم ہوتا؟'' انھوں نے ٹارچ روشن کر کے دونوں ریوالور دکھائے۔ وہ عجیب ترنم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ انھیں غصہ آ گیا اور ڈانٹ کر بولے۔ ''چلو چور کو گرفتار کراؤ پھر ہنس لینا!'' اس نے ہنسی روک کر انھیں پھر دیکھا اور بولی۔ ''بہت خوب۔''

دسمبر کی اندھیری رات تھی۔ اور ہوا تیز چل رہی تھی، اکثر بدلیا کی ساری میں اس طرح بھر جاتی کہ چند ہی قدم کے فاصلے سے ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی کالی دیونی ہے پھر راستہ بھی پیچ در پیچ اور تنگ و تاریک تھا۔ گلیاں اس طرح ناہموار تھیں کہ بار بار ٹارچ روشن کرنا پڑتی تھی۔ غرض ٹھوکریں کھاتے، دونوں کوئی آدھ گھنٹہ تک خاموش چلتے رہے۔ پھر بدلیا نے دفعتاً رُک کر کہا۔ ''بہت دَبے پاؤں آیئے۔ اب ہم لوگ قریب ہی ہیں۔'' چند قدم آگے چلنے کے بعد وہ پھر رُک کر قریب آئی اور بولی۔ ''دیکھئے وہ سامنے داہنے کی جانب بیٹھا چور دیوار کاٹ رہا ہے۔'' انھوں نے آنکھوں پر زور دیا۔ وہاں چاروں طرف گلی سے زیادہ تاریکی معلوم ہوئی، آہستہ آہستہ اور قریب آئے۔ چور اپنے کام میں لگا ہوا تھا، نہایت پھُرتی اور صفائی سے ایک کے بعد ایک اینٹ ہٹاتا جاتا تھا۔ جب یہ کوئی دس قدم پر رہ گئے تو انہوں نے ایک ہاتھ میں ٹارچ لے کر اس کا بٹن دبا دیا اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور لے کر کہا۔ ''اگر ایک اِنچ بھی تم ہٹے تو میں گولی ماردوں گا۔'' چور اُچک پڑا۔ بالکل اس طرح جیسے کسی کے پاؤں کے نیچے دفعتاً انگارہ پڑ جائے۔ روشنی میں اس کی آنکھیں جلدی جلدی جھپک رہی تھیں۔ یہی اُنیس بیس برس کا تھا۔ مگر ستا ہوا چہرہ اور کانپتے ہوئے ہونٹ بتا رہے تھے کہ جرائم کرنے میں ابھی وہ سنگدلی اور سختی نہیں آئی تھی جو پیشہ ور مجرموں کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ ڈپٹی صاحب آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھے، انھوں نے اس کے سینے سے ریوالور لگا دیا۔ پھر بدلیا سے مڑ کر وہ بولے۔ ''دیکھو میری جیب میں ہتھکڑی ہے اسے پہنا دو!'' وہ قریب آئی، لیکن جیسے ہی ٹارچ کی روشنی میں چور نے اُسے دیکھا۔ وہ بیساختہ پکار اُٹھا۔ ''ماں!'' ڈپٹی صاحب ذرا سا جھجک کر پیچھے ہٹے اور

مسکرا کر بولے۔ ''یہ دوسرا ابھی!'' بدلیا نے نہایت اطمینان سے ان کی جیب سے ہتھکڑی نکالی، اور اُس کانپتے ہوئے نوجوان کے ہاتھوں میں پہنا دیں۔ وہ کہتا رہا۔ ''ماں خدا کے واسطے! ماں ہاتھ جوڑتا ہوں! ماں یہ کیا کر رہی ہو؟'' لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ جب ہتھکڑی لگا چکی تو ڈپٹی صاحب کی طرف پلٹ کر بولی۔ ''کیوں حضور اب ہنسوں؟ اب تو چور گرفتار ہو گیا۔''

ڈپٹی صاحب نے جھلاہٹ میں کچھ جواب نہ دیا۔ چور نے پھر کہا۔ ''ماں! ماں خدا کے واسطے!'' وہ دفعتاً پلٹ پڑی۔ ''کیا ماں ماں کی رٹ لگائی ہے! اب باپ باپ کہہ! دیکھ یہ تیرے باپ کھڑے ہیں، جنھوں نے ترے ہاتھ میں ہتھکڑی بھروائی ہے۔ جو ترے سینے سے ریوالور لگائے کھڑے ہیں! میں تیری ماں نہیں۔ تیری ماں ان کے بنگلے میں ہیں۔ وہی جو میری دعاؤں سے سڑن ہو گئی ہیں، سڑن!'' اور وہ دفعتاً ہنسنے لگی۔ ڈپٹی صاحب تھر تھر کانپ رہے تھے۔ چور ہاتھ میں ہتھکڑی پہنے ان کے قدموں پر گرا ہوا تھا۔ لیکن وہ ہنس رہی تھی۔ ڈپٹی صاحب نے دفعتاً طیش میں آ کر ریوالور پیٹی میں کھونس لیا اور ایک طمانچہ اس کے منہ پر مارا وہ اس اچانک حملہ سے لڑکھڑا گئی۔ اگر دیوار قریب نہ ہوتی تو شاید گر پڑتی۔ پھر ایک بار ان کی طرف گھور کر بولی۔ ''بُرا معلوم ہوتا ہے۔ آج جو تمھارے سامنے عدالت میں پیش ہوا تھا۔ وہ تمھارا وہ لڑکا ہے جو میرے پیٹ سے پیدا ہوا تھا یہ تمھارا وہ لڑکا ہے جو تمھاری سڑن کے پیٹ سے ہے۔ میں ہی چرا لے گئی تھی اور اسی دن کے لیے چرا لے گئی تھی۔ یہی دیکھنے کے لیے کہ دونوں کو ایک ہی طرح کی تربیت دی جائے تو فرق ہوتا ہے کہ نہیں۔ وہ رذیل بچہ ہے۔ یہ شریف زادہ ہے۔ فرق ہونا چاہیے تھا مگر دونوں ویسے ہی نکلے، تم ڈپٹی ہو۔ انصاف کرتے ہو۔ قانون پر عمل کرتے ہو۔ لے جاؤ دیکھو قانون میں انصاف ہے کہ نہیں۔ کہ وہاں بھی شریف و رذیل کا فرق ہے۔ ایک کے لیے ذلّت اور دوسرے کے واسطے عزّت!''

ڈپٹی صاحب نے کہا۔ ''جھوٹ! غلط! بہتان!''

وہ پھر ہنسی ''اچھا، اچھا دیکھو تمھارے ایک مہینہ کے بچّے کے سینے پر دو بڑے بڑے سیاہ تل تھے۔ ٹارچ سے بغور دیکھو۔ اس کے سینے پر وہی تل ہیں کہ نہیں؟'' یہ کہتے کہتے اس نے چور کی قمیص پھاڑ ڈالی۔ گردن کی ہنسلی کے نیچے سینہ پر دو بڑے بڑے سیاہ تل، زرد زرد جسم پر بہت نمایاں طور پر دکھائی دے رہے تھے۔

دفعتاً ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ڈپٹی صاحب کی دونوں ٹانگیں کسی نے کاٹ دیں۔ وہ بھد سے زمین پر گر پڑے۔ بدلیا نے زور کا قہقہہ لگایا، اس قہقہے میں نہ معلوم کیا اثر تھا کہ ڈپٹی صاحب کا چہرہ جو غم سے زرد پڑ گیا تھا، دفعتاً غصّہ سے تاریک ہو گیا۔

انھوں نے ریوالور سیدھا کیا اور بدلیا پر فائر کر دیا۔ گولی سینہ کے پار ہو گئی اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑا۔ لڑکھڑائی اور ان کے قدموں کے پاس منہ کے بل گر پڑی۔ گلی میں گولی کی آواز ہزار گونہ زیادہ معلوم ہوئی۔

ڈپٹی صاحب نے گھبرا کر جلدی جلدی اِدھر اُدھر دیکھا۔ صرف منٹوں کا معاملہ تھا۔ پولیس یقینی آتی ہو گی۔ بیٹا اسی طرح ہتھکڑی بھرے، ہاتھ جوڑے سامنے تھا۔ جلدی سے جیب سے کنجی نکال کر ہتھکڑی کھول دی۔ پھر کہا۔ ''بھاگ جاؤ! جلدی!''

وہ مشکل سے گلی سے نکلا ہو گا کہ دوسرے فائر کی آواز سنائی دی... مدعی و مدعا علیہ سب سے بڑی عدالت کے سامنے پیش تھے!

(باسی پھول)

عِدیا تنبولن

عِدیا تنبولن قصبہ بھر میں بدنام تھی، جس وقت دیکھو اُس کی چھوٹی سی پان کی دُکان کے گرد ٹھٹ لگا ہے۔ وہ یا تو لوگوں سے مذاق اور لگاوٹ میں دن کاٹتی یا پھر ایک چھوٹی سی ڈھولک گلے میں ڈالے۔ تھیٹر کی کوئی چیز بے سُرے پن سے الاپتی رہتی تھی، اُسے اس کی پروانہ تھی کہ محلّہ بھر کی عورتیں اس کو بُری نظر سے دیکھتی ہیں یا بڑے بوڑھے اس کے بے ہنگام گانے بجانے سے عاجز ہیں۔ اُسے اپنے پان بیچنے اور دل بہلانے سے کام تھا۔ وہ نہ رسمی اخلاقیات کی پابند تھی اور نہ مروّجہ قانونِ معاشرت کی۔ لیکن اسی کے ساتھ اس میں مروّت بہت تھی۔ یا یوں کہیے کہ مغربی آزاد خواتین کی طرح وہ بھی بااخلاق تھی، جب کسی کی جان جاتے دیکھتی، کسی کو زہر کھاتے سنتی یا کسی کے چھری مار لینے کی دھمکی کی خبر پاتی تو وہ دل دہی ضرور کرتی اور بعض وقت اپنی خودداری کا تھوڑا سا خون کر کے ان آفت کے ماروں کی جان ضرور بچا لیتی، اس قربانی میں نہ تو اُسے کوئی اذیت تھی اور نہ لذّت، یہ صرف انسانی فرض شناسی کا نتیجہ تھی۔ ان حرکات سے نہ تو اُس کی روزمرّہ کی زندگی میں فرق آتا اور نہ معمولات میں، نہ پان کی دُکان قبل از وقت بند ہوتی اور نہ ڈھول بجانے میں کوئی کمی وزیادتی ہوتی۔

ہاں مگر اسے کششِ اعصاب کہیے یا جذبِ دل کہ جب کبھی کریم محمود پور والا، اپنی غرض کا بندہ، بھولا بھٹکا کرشن پور آ نکلتا تو عِدیا کی دنیا میں انقلابِ عظیم دکھائی دیتا۔ اس روز بارہ بارہ بجے تک کھلی رہنے والی دُکان سرِ شام ہی بند ہو جاتی اور ٹوٹے ہوئے مکان کے دروازہ پر خواہ کتنی ہی آوازیں لگائی جائیں مگر وہ کھلتا ہی نہ تھا۔ حالانکہ تھوڑی دیر کے بعد ڈھول کی آواز کے ساتھ ساتھ اس طرح قہقہوں کی آواز آتی تھی جیسے ہنسی پھوٹی پڑتی ہے اور دل کا کنول

کھلا جاتا ہے۔ ہمسائے جب ان قہقہوں کو سنتے تو غصہ کے ساتھ دل میں خوف بھی پیدا ہوتا، اس لیے کہ کریم ان اطراف کا مشہور بدمعاش تھا۔ ایسے آدمی کا قصبہ میں موجود ہونا ہی خطرہ سے خالی نہ تھا۔ نہ معلوم کسی کے گھر میں چوری کرادے۔ کسی کی ناک کاٹ لے یا کسی کی آبرو اُتار لے۔ مارے ڈر کے کوئی دم نہ مارتا تھا، لیکن ہر ایک اپنی جگہ پر گھٹتا ضرور تھا۔ قصبے کی لڑکی خراب کی جارہی تھی اور وہ بھی ایک پرلے سرے کے بدمعاش کے پیچھے۔ انسانی فطرت ہے کہ اگر کسی کی بُرائی سے اپنے کو فائدہ پہنچتا ہو، تو وہ قابلِ عفو و درگزر بنالی جاتی ہے، لیکن اگر وہ کسی غیر کے لیے مفید ہو یا اس سے کوئی دشمن فائدہ اُٹھائے تو وہ نا قابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جو لوگ عِدیا کی اسی طرح کی نیکی یا بدی کی بدولت آج تک زندہ تھے وہی کریم کے سب سے زیادہ مخالف تھے۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ موش دوانیاں کرتے، عِدیا کو سمجھاتے، جھڑکتے، ڈانٹتے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا، جب وہ اُن کے ساتھ اخلاق برتنے میں پورے قصبے کی حمیت کے مجروح کرنے میں پس و پیش نہ کرتی، تو پھر دل کی پیاس بجھانے میں وہ اپنے ان بدوں کے مخزون ہونے کی کیا پروا کرتی! یہ لوگ جلتے اور جی بھر کے جلتے... اور جب کبھی یہ سنا جاتا کہ کریم نے عِدیا کو نکاح کا پیام دیا ہے تو بڑے زور سے سر ہلا کے کہتے۔ ''اجی بالکل غلط! نہ معلوم اس کی ان کی سی کتنی اور ہونے والی بیویاں بیٹھی ہیں، موقع تو آنے دو، وہ اس بُری طرح عِدیا کو دھوکا دے گا کہ اسے بھی عمر بھر یاد رہے گا۔

شیطان تو ایسے کاموں میں شریک ہوتا ہی ہے، اس نے بھی کہیں سن لی اور عِدیا کو کیفرِ کردار تک پہنچانے اور کریم کے رقیبوں کو سچا ثابت کرنے کی صورت پیدا کردی۔ کچھ ہی دنوں بعد عِدیا میں وہ کیفیتیں پیدا ہونا شروع ہوگئیں، جو مردوں کی نظر میں عورت کو حد درجہ مکروہ بنادیتی ہیں۔ مگر جن آثار کے نمایاں ہونے کا ہر محبت کرنے والا شوہر بڑے ارمانوں کے ساتھ منتظر رہتا ہے۔ متلی، دورانِ سر، آنکھوں کے گرد حلقے اور پیٹ کا ستو کھانے والے بنیوں کی طرح پھولنا، غرض عِدیا نے معشوقہ کا جاذبِ نظر جامۂ زرتار اُتار ا اور 'ماں' کی بھدّی مگر تخلیقی وضع اختیار کی۔

اب نہ تو میاں کریم کے وعدوں کا کہیں پتہ تھا۔ اور نہ اُن کی اکڑتی برتتی ہوئی صورت کا۔ دن گزرے ہفتے گزرے۔ مہینے بیت گئے۔ عِدیا کی دُکان کئی کئی دن بند رہتی۔ مکان سے

کئی کئی وقت دُھواں بلند ہوتے نہ دکھائی دیتا۔ لیکن کریم نظر نہ آتا۔ وہ شہد کی مکھی کی طرح بور کے زمانے تک تو دکھائی دیا لیکن ثمر آتے ہی روپوش ہو گیا۔ نہ شرع نے ہاتھ پکڑایا تھا، نہ رسم و رواج نے مانگ بھروائی تھی۔ اب اس بار کو کون اپنے ذمہ لے؟ قصبہ کے وہ نوجوان جو آئے دن زہر کھایا کرتے تھے اب وہ بھی پان کھانے تک کے لیے تیار نہ تھے۔

لیکن انہیں میں ایک بے وقوف بھی تھا، بقرعیدی نام۔ وہ ایک رئیس کے ہاں چوکیداری کے فرائض ادا کرتا تھا۔ رات کی نیند اُس نے اپنے مالک کے مکان کے گرد چکّر لگانے کی نذر کر دی تھی، اور دن کا آرام عِدیا کی دُکان کے طواف پر چڑھا دیا تھا۔ ساتھ ہی اُس نے کبھی نہ زہر کھانے کی نیت ظاہر کی تھی، نہ چھرا مارنے کا اعلان کیا تھا اور نہ جان دینے سے بچایا گیا تھا۔ وہ خاموش پرستش کرتا رہا تھا۔ محبوبہ کی بے بسی دیکھ کر اُس کا دل بہت کڑھا، اور اُس نے جی کڑا کر کے عِدیا کو نکاح کا پیام دے ہی دیا۔ عِدیا تو کریم کے پیچھے دیوانی تھی، اُس نے صاف انکار کر دیا۔ بقرعیدی کو ہر ایک نے سمجھایا۔ طعنہ دیا۔ بُرا بھلا کہا۔ لیکن اس کے سر پر کسی معمولی پری کا سایہ نہ تھا، اُس نے ایک نہ سنی، وہ برابر اصرار کیے ہی گیا اور بالآخر عِدیا نے، فاقوں کے ڈر اور کریم کی اُمید خبر گیری سے مایوس ہو کر، ہامی بھر لی۔ بقرعیدی دوسرے ہی دن دو ڈھول اپنے گھر باندھ لایا۔

کریم اس کے لیے تو تیار نہ تھا کہ ساجھے کی ہانڈی کی طرح عِدیا چوک کے چوراہے پر ہو، لیکن اس کے لیے آمادہ نہ تھا کہ اس پر مالکانہ تصرف کا حق کوئی دوسرا حاصل کر لے۔

اِس لیے جب تک اُس کا ڈر رہا کہ عیش و عشرت کی قیمت زچہ خانے کے اخراجات کی صورت میں کہیں ادا نہ کرنا پڑ جائے، اس نے کرشن پور کا رُخ ہی نہ کیا۔ وہ ایک آزاد کردہ، داغے ہوئے سانڈ کی طرح دوسرے کھیتوں کو چرتا رہا لیکن جب عِدیا کی کفالت کا زمانہ گزر گیا اور وہ پھر اپنی دُکان پر بیٹھنے لگی۔ تو ایک دن موچھوں پر تاؤ دیتا اس کوچہ سے پھر نکلا، جس میں عِدیا کی دُکان تھی۔ دل میں دُگدھا تھا۔ ممکن ہے ملتفت ہو یا نہ ہو اس لیے پہلے ہی سے اکڑا ہوا تھا کہ جھینپ نہ ہونے پائے۔ مگر عِدیا اسے دیکھتے ہی اس طرح بیساختہ مسکرا دی جس طرح نسیمِ سحر کے اولیں جھونکے میں غنچۂ ناشگفتہ مسکراتا ہے۔ کریم سو گز کے فاصلہ سے اِس طرح تن کر زمین پر پاؤں رکھنے لگا، جس طرح لقا کبوتر چلتا ہے، وہ خراماں خراماں آیا، اُس نے عِدیا کی

ٹھوڑی کے نیچے دو انگلیاں لگا کے اُس کے اُٹھے ہوئے سر کو اور بلند کیا۔ پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔ ''کہو اچھی تو رہیں؟''

سوال نہ تھا بلکہ شکوہ و شکایت کے دفتر کھولنے کی درخواست لیکن جب محبت کا حیوانی عنصر سب عناصر پر غالب کی حیثیت رکھتا ہو تو عورت بھی قربانیوں پر آمادہ ہو جاتی ہے، ایسے موقع پر اس پورے دفتر میں دو چار رسمی فقروں سے زیادہ کچھ نہیں ملتا چند ہی منٹ میں ''سارے گلے تمام ہوئے۔'' شکوہ شکریہ میں بدل گیا اور شکایت احسان مندی میں! راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ کریم نے کچھ عہد لیا، کچھ عہد کیا اور گھر کی سدھ بھری۔

اس دن سے پھر یہ معمول سا ہو گیا، کہ جب بقرعیدی شب کو نو بجے کے قریب کھا پی کر چوکیداری کے فرائض ادا کرنے چلا جاتا، تو پشت کے مکان والی کھڑکی سے کریم چلا آتا، اور پھر نا کتخدائی والے دَور کی طرح تھوڑی تھوڑی دیر رُک رُک کے ڈھول کی آواز سنائی دیتی، یا پھر ایسے قہقہوں کی جو کاسۂ میخوار میں شراب ڈھالتے وقت صراحی کی گردن سے نکلتے ہیں یا جو پتھریلی زمینوں پر شیریں چشموں کے بہنے میں پیدا ہوتے ہیں!

بقرعیدی اس نئی زندگی سے بہت زیادہ دِنوں تک ناواقف نہ رکھا جا سکا۔ کریم خاں کے پچھلے رقیبوں میں سے ایک نے جواب عِدیا کی نگاہ میں ٹوٹے ہوئے قلم سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا، چغلی کھا کر گویا ہمسائیگی کے فرض سے سبکدوشی حاصل کی۔ بقرعیدی دانت پر دانت بٹھائے سر جھکائے سب سنتا رہا۔ ہمدردی جتانے والے دوست نے بے غیرت و بے حمیت سمجھ کر طعنہ و تشنیع کی برچھیاں چلائیں، اُس نے خاموشی کی سپر پر یہ وار بھی لیے اور اپنے کاموں میں لگ گیا، البتہ یہ خاص اثر ضرور ہوا کہ بقرعیدی جو باوجود کم گو ہونے کے عدیا کی صحبت میں خاصا چہکنے لگا تھا۔ اب پھر بُت سا بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے بانسری کے منہ میں اِس طرح میل بھر گیا تھا کہ باوجود کوششوں کے آواز نکلتی ہی نہ تھی! ممکن تھا عِدیا دوسروں کی طرح اس فرق کو محسوس کر لیتی، لیکن وہ تو خود دونوں کے عوض چہکتی پھرتی تھی۔ دن کو آنکھوں کا تارا، راج دُلارا، اُس کی گود میں ہوتا اور شب میں وہ خود محبت کے دیوتا کے آغوش میں۔ اُس پر اس کا کیا اثر کہ بقرعیدی نے ادھر پھر منہ میں گھنگھنیاں بھر رکھی ہیں۔ وہ تو اس کے نزدیک اس مضبوط ڈنڈے کی حیثیت رکھتا تھا جس کے سہارے وہ کنوار پنے کے بوجھ کو سنبھال کے ازدواجی زندگی کے ساحل

تک پہنچی تھی۔ سو وہ کٹھن منزل کٹ چکی تھی۔

اب تو وہ 'سپکسر' تھی، اسے بقرعیدی کی 'سرگرانی' کی کیا پروا؟

لیکن اس ہیزمِ خشک بقرعیدی میں آگ اچھی طرح لگ چکی تھی، وہاں نہ شعلہ تھا، نہ دھواں، اور نہ دل کی کھولن میں آواز۔ بس اتنا تھا کہ چہرے پر مسکراہٹ نے ایک کھلے زخم کی صورت اختیار کر لی تھی اور موقع بے موقع ہنسی نے کوہ آتش فشاں کے سینے میں پکنے والے لاوا کی آواز کی حیثیت! کسی کو کیا خبر تھی کہ:

جگر میں درد تھا لب پر ہنسی تھی

پریشاں خواب ہے قصہ یہاں سے

بقرعیدی کے مکان کی پشت کی جانب دُور تک بوسیدہ، افتادہ کھنڈروں کا ایک سلسلہ تھا ان کے عقب میں گھنی بنسواڑی اور اس کے بعد خودرو کانٹے دار درختوں کا میلوں تک کا جنگل، اندھیرا ہونے پر قصبہ کا کوئی شخص کبھی اُدھر نہ جاتا تھا، مشہور تھا بنسواڑی میں سینکڑوں زہریلے سانپ رہتے ہیں اور جنگل میں چور ڈاکوؤں کے اڈّے ہیں۔

لیکن کریم جب بھی آتا تو اُدھر ہی سے کھنڈروں کی جانب سے محمود پور قریب پڑتا تھا، پھر کریم کو چور ڈاکوؤں کا کیا ڈر۔ وہ تو اُن ہی میں کا تھا۔ عِدیا البتہ اس خواہ مخواہ کی جسارت پر سہمتی، جھنجھلاتی، سمجھاتی اور اسی سلسلے میں دل کا مدعا بھی کہہ ڈالتی۔ ''جان جوکھم ہے کیوں صدر دروازے سے نہ آؤ، مجھے کیا کسی کا ڈر پڑا ہے تم جس دن کہو تمھارے ساتھ ساری دنیا کو دکھا کے نکل چلوں!''

کریم ہنس کر ٹال دیتا، وہ شب پرندوں کی طرح پھل کھانے کے لیے تھا، نہ کہ باغ کی رکھوالی کے لیے! اُس کا کام دادِ عشرت دینا تھا نہ کہ ذمہ داریوں کا اپنے سر لینا! وہ اسی لیے کبھی یوں بات بناتا کہ ''تمھارے ہاں آنے میں اگر تھوڑا سا بھی خطرہ نہ ہو تو پھر لطف ہی کیا؟'' اور کبھی بناوٹ اور ظاہر داری سے کہتا۔ ''ارے تمھارے پہلو تک پہنچنے کے لیے اگر آگ میں سے بھی ہو کر آنا پڑے تو تمھارا کریم نہیں جھجکنے کا۔'' اور عِدیا سارے پچھلے تجربات بھول کر، اس لیے اس کی باتوں کا یقین کر لیتی کہ اس کا یقین کرنے کو جی چاہتا تھا!

ایک بار کوئی دو بجے شب کے قریب جبکہ کالی اندھیری ڈراؤنی رات اچھی طرح بھیگ

چکی تھی اور عِدیا و کریم چہل میں مشغول تھے، دفعتاً بقرعیدی نے دروازہ کھٹکھٹا کر پکارا، کریم بولنا ہی چاہتا تھا کہ عِدیا نے آواز پہچان کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور خود پوچھا "کون ہے؟" بقرعیدی نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔ "میں ہوں بقرعیدی اور کون!" بقرعیدی کا نام سنتے ہی کریم چور کی سی سراسیمگی کے ساتھ پلنگ سے اُچک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے جلدی جلدی مکان کے گوشے گوشے پر نظر ڈالی، گویا چھپنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ عِدیا بھی گھبرا اُٹھی تھی۔ بقرعیدی کے اچانک آ جانے نے حواس پریشان اور جرأت مقاومت سلب کر لی تھی، اُس نے جلدی سے پشت کے مکان والی کھڑکی کی جانب اشارہ کر دیا، کریم نے جھپٹ کر کھڑکی کھولی اور باہر نکل بھاگا۔

بقرعیدی نے اس درمیان میں کئی آوازیں لگا ڈالیں۔ "ارے کواڑ کھول کیا کر رہی ہے؟" عِدیا نے کریم کے باہر جاتے ہی دھڑکتے دل کو سنبھالا۔ ذرا تیور بدل کر بولی۔ "ارے آ رہے ہیں۔ خواہی نخواہی دروازہ ہلا ہلا کر توڑے ڈال رہے ہو۔"

کواڑ کھلے، بقرعیدی اُس انداز سے داخل ہوا جیسے گھر میں رکھا ہوا کوئی ہتھیار لے کر کسی سے جنگ کرنے جا رہا ہے، وہاں حسبِ منشا مکان خالی تھا اور کھڑکی کھلی تھی۔ زیرِ لب اِس طرح مسکرایا جس طرح صیاد صید کو جال سے قریب ہوتے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ بیوی سے پلٹ کے پوچھا۔ "ایں یہ کھڑکی کیسے کھلی ہے؟" وہ سٹ پٹا کے بولی۔ "میں کیا جانوں۔ میں تو سو رہی تھی۔" وہ بولا "مجھے تو کھٹکا معلوم ہوتا ہے!" اور جو ٹارچ بائیں ہاتھ میں لیے تھا اُسے جلا کر اپنی لاٹھی زمین پر ٹپکتا، کھڑکی سے نکل کے کھنڈر کی طرف چلا۔

عِدیا نے وقتی اضطراب سے مجبور ہو کر قدرے چیخ کر پوچھا۔ "ارے تم اُدھر کہاں جا رہے ہو؟" وہ کچھ نہ بولا۔ اور اپنی لاٹھی کو اسی طرح زمین پر پٹکتا آگے بڑھ گیا۔

کریم، ڈرپوک، بودا نہ تھا، لیکن چور کا دل آدھا ہوتا ہے، آج بقرعیدی نے اُسے اپنی چوری کرتے گویا پکڑ لیا تھا۔ وہ اس کے مکان سے نکل کر کھنڈروں میں جا چھپا۔ لیکن کچھ ہی منٹ بعد اُسے بقرعیدی کی لاٹھی کی آواز سنائی دی۔ تعاقب کے خیال نے رہے سہے حواس اور بھی مختل کر دیئے، بنسواڑی اندھیرے میں حد درجہ خطرناک معلوم ہوتی تھی، مگر عِدیا کے شوہر کی لاٹھی اُس سے خطرناک تر تھی کہ الامان والحفیظ، وہ پتلی سی پگڈنڈی جو اُس میں سے ہو کر جنگل

تک گئی تھی، مطلقاً بجھائی نہیں دیتی تھی، لیکن خوف بُری طرح مسلّط تھا، دن میں اکڑ نے بررنے والا کریم، اس وقت نہیں بھاگ رہا تھا اور نہ سیدھا سادھا بقر عیدی اُس کا تعاقب کر رہا تھا، بلکہ اس وقت کریم چور، خوفزدہ لرزاں، ترساں و گریزاں تھا اور اس پر جو خوف طاری تھا وہ عِدیا کے شوہر کا تھا، جس نے گویا اُسے اپنی عزیز ترین شئے کا سرقہ کرتے اپنے گھر میں گرفتار کرلیا تھا۔ یہ دوسرا خوفزدہ کریم، بے تکان پیچھے پلٹ کے دیکھتا ہوا، بنسواڑی میں گھسا۔ اُس نے دو چار قدم جلدی جلدی رکھے ہی ہوں گے کہ دفعتاً اس کا پاؤں جھوٹا پڑا اور وہ ایک گڑھے میں گر پڑا۔

اس کا منہ مٹی سے بھر گیا۔ اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے اور اس کے سارے جسم میں حددرجہ تیز، نوکیلے، سخت بڑے اور مضبوط جنگلی کانٹے گھس گئے۔ وہ آہ آہ کر کے ایک کروٹ گرا۔ سارا پہلو فگار ہو گیا، اُس نے ہاتھوں پر زور دے کر اُٹھنا چاہا۔ کانٹے ہتھیلیوں کو توڑ کر نکل گئے۔ اس نے پوری قوت سے جھٹکا دے کر ہاتھوں کو اس شکنجے سے علیحدہ کیا، پھر پاؤں پر سنبھل کر کھڑے ہونے کی کوشش بلیغ کی، جوتوں نے بڑی حد تک اُن کی حفاظت کی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اُس نے زخمی ہاتھوں سے گڑھے کے کنارے ٹٹولے۔ بارے وہ مل گئے، گڑھا اس کے قد ہی بھر عمیق تھا۔ ایک ایک کر کے کنارے سے کانٹے ہٹائے۔ پھر ان ہی خون آلودہ ہاتھوں کے سہارے بڑی مصیبتوں بڑی کاوشوں سے گڑھے سے باہر نکلا ایک قدم لڑکھڑا کے چلا پھر منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ معلوم ہوا کوئی چکنی، نرم مگر سرکتی ہوئی شئے داہنے ہاتھ میں لپٹ گئی۔ کریم نے بدحواسی میں ہاتھوں کو زمین پر پٹک پٹک کر اپنے کو چھڑانا چاہا، مگر چھٹکارا نہ ملا۔ محسوس ہوا جیسے گرم گرم سلاخیں نرم کر کے ہاتھ میں لپیٹ دی گئی ہیں، وہ دفعتاً سمجھ گیا کہ یہ شئے سانپ ہے، وہ ایک بار خوف اور بے بسی سے چیخا اور بے ہوش ہو گیا۔

بقر عیدی نے کھنڈروں سے چیخ سنی، ٹارچ کی روشنی ڈالی، کریم کو زمین پر دراز بے حس و حرکت دیکھا۔ پھر زیرِ لب ہنسا، بالکل اسی طرح جیسے بلّی چوہے کو مار کر مسکراتی ہے۔ اطمینان کی سانس لی، گھر پلٹا۔ عِدیا اسی طرح 'آہٹ پہ کان' دھرے کھڑکی پر کھڑی ملی۔ بقر عیدی نے بہت ہی بے پروائی سے کہا۔ ”کوئی بھی نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے تم ہی بھولے سے کھڑکی کھلی چھوڑ کر سو گئیں!“

یہ فقرہ عِدیا کے دھڑکتے ہوئے دل کے لیے ٹھنڈا پانی بنا، ذرا سکون ہوا۔ فوراً تریا چلتر

سے بولی۔ ’’اے تو آج یہ پہرہ دیتے دیتے کیوں میں نگوڑی یاد آ گئی، جو مالک کا دروازہ چھوڑ اپنے گھر کی کھڑکی دیکھنے چلے آئے؟‘‘

بقرعیدی نے خاموشی سے کھڑکی بند کی، کنڈی لگائی، پھر بولا۔ ’’اجی کچھ نہیں بیڑی ختم ہوگئی، سوچا چلو اسی بہانے گھر ہوآؤں۔ تمھیں بھی دیکھ لوں گا اور بچے کو بھی، ایک پنتھ دو کاج۔‘‘

وہ بولی۔ ’’تو یہ موئی بیڑی لے آئی تھی۔ میں تو سمجھی تھی کہ...‘‘

بقرعیدی نے سنی کو اَن سنی کر کے بیڑی کا بنڈل طاق سے اُٹھایا، پھر بیوی سے کہا۔ ’’لے اب تم کواڑ بند کر کے سوؤ، میں جاتا ہوں۔‘‘ اور اپنی لاٹھی اور ٹارچ لے کے چلتا بنا۔ عِدیا دروازہ بند کر کے پلنگ پر بیٹھی اس طرح کی آواز سے ہنستی رہی جس طرح کی آواز سے مرغیاں اپنے بچوں کو چیل کے جھپٹے سے بچا لینے کے بعد اظہارِ مسرت کرتی ہیں۔

صبح دس بجے کے قریب عِدیا دُکان پر بیٹھی ڈلی کاٹ رہی تھی اور بقرعیدی بچہ کو گود میں لیے اس کی خوش فعلیاں دیکھ رہا تھا، کہ دفعتاً محلّہ کا ایک لڑکا دوڑتا، ہانپتا کانپتا آیا اور خوفزدہ گھبرائی ہوئی آواز سے بولا۔ ’’ارے عِدیا بنسواڑی میں کریم مرا ہوا پڑا ہے۔‘‘

عِدیا کے ہاتھ سے سروتا ڈلی کی ٹوکری میں آ رہا اور وہ خود تیورا کے برگِ خزاں دیدہ کی طرح لہراتی ہوئی زمین پر گر پڑی۔ اُسی لڑکے نے لپک کے اُٹھایا۔ بقرعیدی نے لڑکے کو گودی سے علیحدہ کر کے جلدی سے سہارا دینا چاہا۔ عِدیا نے اُسے پھیلے ہوئے دیدوں سے گھور کے دیکھا اور اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ زمین پر بیٹھی تھوڑی دیر جھومتی اور لمبی لمبی سانسیں لیتی رہی، پھر لڑکے سے پوچھا۔ ’’کہاں بنسواڑی میں؟‘‘ اس نے کہا۔ ’ہاں‘ وہ ایک بار لڑکھڑا کے کھڑی ہوگئی۔ اُس نے ایک ہاتھ سے لہنگے کا اگلا حصّہ سمیٹ کر زمین سے بالشت بھر بلند کر لیا اور دوڑتی ہوئی بنسواڑی کی طرف چلی، وہ ہانپتی جاتی تھی۔ اِس کے منہ سے ایک بے معنی سی آواز نکلتی جاتی تھی اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں سمٹ سمٹ کر اِس طرح پھیلتی تھیں۔ کہ معلوم ہوتا تھا کہ حلقۂ چشم سے باہر نکل پڑیں گی!

وہ اسی بدحواسی، نیم دیوانگی کے عالم میں بنسواڑی پہنچی۔ وہاں دو چار آدمی جمع ہو گئے تھے۔ لوگ کریم کی لاش کو دُور سے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ کسی کی ہمّت نہ پڑتی تھی کہ قریب جاتا۔ اُس کے ہاتھوں کے پاس چوٹ کھایا ہوا افعی اب بھی پھن اُٹھا اُٹھا کے پھنکاریاں مار رہا

تھا، عِدیا اس مجمع کو چیرتی اس طرح ہانپتی اسی کریم کے بے حس مجسمہ کے قریب پہنچی۔ جس کو اُس نے اکثر بڑی سج دھج سے دیکھا تھا۔ اُس وقت اس کے کپڑے پھٹے تھے اور وہ خون میں لت پت تھا۔ ٹانگیں بے قرینہ اینٹھی ہوئی تھیں، داہنا ہاتھ کہنیوں تک سیاہ تھا اور اس سے سیاہی مائل پانی بہ رہا تھا۔ عِدیا نے ایک چیخ ماری اور پورے قد سے اس طرح کریم کے لاشے پر گر پڑی جس طرح سوکھے درخت کا وہ تنا خاک پر آ رہتا ہے، جسے آرے سے کاٹ کر ڈھکیل دیں۔

بقرعیدی بھی پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ بچہ اب تک گلے سے چمٹا تھا۔ وہ اُسے اِس طرح بہ حفاظت لا رہا تھا جیسے بچہ گوشت و پوست کی جگہ نازک ترین شیشے کا بنا ہے۔ بنسواڑی میں پہنچ کر اس نے بیوی کو کریم کی لاش پر پڑا ہوا پایا۔ اُس نے بچے کو مجمع کے قدموں میں ڈال دیا اور بیوی کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پکارنا شروع کیا۔ ”عِدیا! ارے عِدیا! کیا کر رہی ہے! ہوش میں آ عِدیا۔“ ...عِدیا نے آنکھیں کھولیں۔ پہلے تو دیدوں سے ظاہر ہوا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں، بالکل سادے دُھلے ہوئے کپڑوں کی طرح سپید، بے آب تھے، پھر دفعتاً ان میں ایک سیاہی نما سُرخی جھلکی، بالکل اس طرح کی جیسی کالے بادل پر شفق گلگوں کی چھوٹ! اس کی نظر کریم، گڑھے، سانپ سے ہوتی ہوئی بقرعیدی کے چہرہ پر آ کر تھمی۔ وہ بیساختہ ہنسنے لگی اس طرح ہنسنے لگی جو دیوانوں کی خصوصیت ہے۔ وہ بقرعیدی سے بولی۔ ”اس لونڈے کا باپ یہی ہے۔ تم نہیں ہو! ہی! ہی! تم نہیں ہو! تم نہیں! ہی! ہی! میں اپنے کریم کی بیوہ ہوں! تمھاری بیوی نہیں! ہی! ہی! ہی!

بقرعیدی نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر لیں اور کانپتے ہونٹوں سے کہا۔ ”اچھا، اچھا، گھر چل، اب تو وہ مر ہی گیا، اب گھر چل۔“ وہ دیوانہ وار بولی۔ ”گھر! تمھارے گھر! ہی! ہی! ہی! خونی کے گھر! ہی! ہی! ہی! میں تو اپنے پیارے کے گھر جاؤں گی! ہی! ہی! ہی!“

اور اسی طرح بھیانک طور پر ہنستے ہنستے اُس نے لپک کر وہ کمر شکستہ سانپ پکڑ لیا، جو بار بار حملہ کرنے کی کوشش کر چکا تھا، مگر ابھی تک عِدیا کے جسم تک نہ پہنچا سکا تھا۔ افعی جان سے بیزار پہلے ہی خون کا پیاسا تھا اب جو نرم ہاتھوں کی ڈھیلی گرفت میں آیا، تو اس نے پلٹ کر اس قوت سے کاٹا کہ پشت دست لہولہان ہو گئی! لوگ جب تک ”ہائیں ہائیں“ کہہ کر لپکیں عِدیا کی غرض پوری ہو چکی تھی، سانپ اپنا پورا زہر اس کے جسم میں منتقل کر چکا تھا! بقرعیدی نے آگے بڑھ کر

افعی کو ایک لکڑی سے مار کر گرادیا اور بیوی کا ہاتھ تھام کر کہنی کے پاس سے باندھ دینا چاہا۔ عِدیا نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑالیا۔ ایک بار اُچھل کر وہ کریم کی لاش پر پھر گر پڑی۔ اُس نے دونوں باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ اُس کے خون آلودہ منہ پر منہ ملا، ہونٹوں اور آنکھوں کا پیار کیا اور سانپ کے زخمی کیے ہوئے ہاتھ سے بہتے پانی کو چاٹ گئی۔ پھر وہ ہرنی کی طرح زقند بھرتی 'ہی! ہی! ہی!'' کرتی جنگل کی طرف چلی۔ مشکل سے بنسواڑی سے نکلی ہوگی کہ اس نے ٹھوکر کھائی۔ ایک خاردار درخت میں اُلجھی اور اسی طرح ہنستی ہوئی زمین پر گر پڑی۔ روح کی چادر رُکتی ہوئی سانس کے کانٹوں میں پھنسی اور ایک جھٹکے میں تارتار ہوگئی!

بقرعیدی پر خون کا مقدمہ چلا۔ دورانِ مقدمہ میں کریم وعِدیا کی محبت کی یادگار، ان کا بچّہ سوکھے کے مرض میں گرفتار ہوا اور مر گیا۔ بقرعیدی کو سات برس کی سزا ہوگئی۔

قابیلی تجربے

ججری اپنے دوسرے ساتھیوں سے کچھ زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ وہ ہمیشہ نئی نئی چیزوں کی کھوج میں لگا رہتا تھا۔ وہ بابا کے بنائے ہوئے آلو میں برابر ترمیم کرتا رہتا، گول کو چپٹا، چپٹے کو نوکیلا بنا کر دیکھتا کہ ان سے کون کون سے دوسرے کام لیے جاسکتے ہیں۔ ایک دن اس نے سوچا سارے آلے پتھر ہی کے کیوں رہیں۔ کوئی آلہ لکڑی کا کیوں نہ بنایا جائے۔ اس کے دماغ میں ایک کاٹھ کی موگری کا دُھندلا سا خاکہ آیا۔ اُس نے ایک چوکور چپٹی لکڑی میں ایک نوکیلی لمبی لکڑی پہنانا چاہی۔ اُس نے پتھر کے نوکیلے آلے سے چپٹی لکڑی میں بڑی کوششوں سے ایک چھوٹا سا سوراخ کیا، مگر لمبی لکڑی اس سوراخ میں نہ جاپاتی تھی۔ اس نے لمبی لکڑی کی نوک سوراخ پر رکھ کر زور زور سے گھمانا شروع کیا۔ وہ پسینے پسینے ہوگیا، مگر گھماتا رہا، گھماتا رہا۔ دفعتہً چپٹی لکڑی سے مکڑی کے جال جیسی ایک مہین سی چیز نکلنے لگی۔ ججری نے لمبی لکڑی اور تیزی سے گھمائی۔ مکڑی کا جال کہرے جیسا سیاہی مائل ہوگیا۔ ججری نے کبھی کسی لکڑی کے ٹکڑے سے اس طرح کی چیز نکلتے نہ دیکھی تھی۔ پھر اس نئے کہرے میں ایسی بو تھی کہ اس کا جی متلانے لگا۔ آنکھوں میں بھی مرچیں سی لگیں اور ان سے پانی بہنے لگا۔ وہ ڈر گیا اور آنکھوں سے آنسو پونچھتا اور تھوتھو کرتا بھاگ کر دُور کھڑا ہوگیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ اس لکڑی میں کوئی پریت چھپا ہوا ہے۔ وہ کسی بھالو یا بھیڑیے کی شکل میں نکلنے والا ہی ہے۔ وہ گردن بڑھائے ہوئے بڑے بڑے دیدے نکالے لکڑی کے ٹکڑوں کو گھورتا رہا، مگر لکڑی کا کہرا ہوا میں غائب ہوگیا اور وہ پھر جیسی کی تیسی دِکھائی دینے لگی۔

ججری سوچنے لگا، یہ کیا بات ہے۔ پھر اسے خیال آیا لکڑی میں چھپا پریت باہر نکل کر چلا

گیا ہوگا۔ جب ہی وہ اپنے پیٹ سے کچھ نہیں نکالتی۔ وہ ڈرتا، سہمتا، جھجکتا، ٹھٹکتا پھر اس طرف بڑھا۔ اُس نے قریب آ کر دونوں ٹکڑوں کو پھر غور سے دیکھا اور ہلکی سی ٹھوکر ماری۔ لمبی لکڑی چپٹی لکڑی سے الگ ہو کر گر گئی۔ اُس نے گردن جھکا کر انھیں غور سے دیکھا۔ وہ بے ضرر محسوس ہوئیں۔ اس نے اب ڈرتے ڈرتے اُنھیں چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اُس نے چپٹی لکڑی کو ایک اُنگلی سے چھوتے ہی جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا، جہاں سے کہر انکلا تھا وہ حصہ سیاہی مائل بھی تھا اور گرم بھی۔ اُس نے اُسے اُٹھا کر اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اُسے سونگھا، پھر جی متلانے لگا۔ پھر ڈرنے لگا، مگر کھوج لگانے والی خواہش بڑھتی ہی گئی۔ وہ جی کڑا کر کے اُکڑوں بیٹھ گیا اور اُس نے چپٹی لکڑی کو پاؤں کے انگوٹھوں سے دبا لیا اور لمبی لکڑی کی نوک سوراخ پر رکھ کر زور زور سے گھمانے لگا۔ اب کے جو دھواں نکلا تو اُس نے پروا نہ کی، وہ برابر گردن ٹیڑھی کیے لکڑی پر لکڑی رگڑتا ہی چلا گیا۔ دفعتہً دھویں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ ایک گرم رواس کی اُنگلیوں میں آ کر لگی۔ ان میں ایک جلن سی پیدا ہوئی۔ اس نے لمبی لکڑی ہاتھ سے چھوڑ دی اور چپٹی میں سے نکلتی ہوئی چمک کو بجھانے کے لیے اُس کے پاؤں کے پاس جو سوکھی پتیاں پڑی تھیں، مٹھی بھر اُٹھا کر اس پر ڈال دیں اور وہ خود اُچھل کر دُور کھڑا ہو گیا، مگر ان سوکھی پتیوں نے تو اس لال لال چمکتی چیز کو اور بھی بڑھا دیا۔ اب تو ہلکے دھویں کے پیچھے ہر طرف لمبی لمبی زبانیں نکالے وہ چیز دوڑنے لگی۔ یہ زبانیں پتیوں ہی کو نہ کھا گئیں بلکہ آس پاس کی سوکھی شاخوں کو بھی چٹخارے لے کر کھانے لگی اور ہوا کا جو بھی جھونکا ادھر سے حجری کی طرف آتا محسوس ہوتا اُسے یوں لگتا جیسے وہ بھی جل اُٹھے گا۔

اسی پریشانی میں اسے یاد آیا کہ اس کے بھائی سَنگی نے ایک خاص طرح کے دھویں کا ذکر کیا تھا جو نذر والے پتھر سے نکلتا تھا۔ ’بابا‘ سال میں ہر فصل کی پیداوار کا ایک حصہ یا بھیڑوں کے گلے میں سے سب سے اچھا میمنہ اس پتھر پر رکھ دیتے۔ دھویں کا ایک حلقہ سا پیدا ہوتا اور اپنے ساتھ ان چیزوں کو اُڑا کر لے جاتا، مگر کبھی کسی نے اس چیز کا ذکر نہ کیا تھا جو مینہ کے کوڑے جیسی چمکتی ہوتی ہے اور جو آسمان پر دہاڑنے چنگھاڑنے کی جگہ زمین پر رینگتی، شاخوں پر چڑھتی، لال لال زبان سے پتیوں، گھاسوں، لکڑیوں، پیڑوں کو چٹ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے وہ بھاگا ہوا سَنگی کے پاس ان کھیتوں میں گیا جہاں وہ کھڑا اپنے غلّے کی زرد زرد بالیاں توڑ رہا تھا۔

سنگی بھائی سے یہ انوکھی روداد سن کر زیادہ نہ گھبرایا۔ اُس نے ایک بار مینہ کے کوڑے کو کالے بادلوں میں سے نکل کر ایک درخت میں لپٹ جاتے دیکھا تھا۔ اس پیڑ سے بھی اسی طرح کی لال لال زبانیں پھوٹ نکلی تھیں اور اس کی ڈالیوں کو چبانے لگی تھیں، مگر تھوڑی ہی دیر میں بادلوں نے اس سینکڑوں زبان والے پریت پر اتنے تیر برسا دیئے تھے کہ وہ سرد آہیں بھرتا جلد ہی روپوش ہوگیا تھا اس لیے حجری کے ساتھ آتے ہی سنگی نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور پاس ہی جو چشمہ تھا اس میں سے دونوں چلوؤں میں پانی بھر بھر کر اس لال پریت پر چڑھانا شروع کر دیا۔ پانی جہاں پڑتا پریت ٹھنڈی سانسیں بھر کر غائب ہو جاتی۔ حجری بھی بھائی کا ساتھ دینے لگا۔ اُس نے دیکھا اس کی دونوں لکڑیاں اپنی صورت بدل کر راکھ کا ڈھیر ہوگئی ہے۔ آس پاس پڑی ہوئی سوکھی پتیوں اور ٹہنیوں کا بھی یہی حال ہے جس چیز پر پانی پڑتا وہ چھن چھن کر کے راکھ ہو جاتی یا لال کی جگہ کالی ہو جاتی۔ اس سلسلے میں اس کی نظر بالشت بھر لمبی ایک چیز پر پڑی جو لال بھبوکا ہو رہی تھی مگر زبان نکال کر کسی کو کھاتی نہ تھی۔ حجری نے اس پر بھی پانی ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ پتھر کے نیچے اس طرح چھپی بیٹھی تھی کہ اس تک پانی نہ پہنچتا تھا۔ حجری نے درخت کے تنے سے لگے ہوئے پتھر والے گرز کو اُٹھا لیا اور زور کر کے اسے چٹان کے نیچے گھسایا اور اس دبے ہوئے ٹکڑے کے پاس لے گیا۔ پھر اس نے ایک جھٹکا دیا۔ بالشت بھر کا لال ٹکڑا اُچھل کر چٹان پر جا پڑا اور اس کے جسم بھر سے چنگاریاں اُڑیں۔ حجری ذرا جھنجھلایا۔ یہ ٹکڑا تو کچھ عجیب حرکتیں کر رہا ہے، اس نے اس پر گرز کا ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ وہ پھر اُچھلا۔ اُس نے پھر چنگاریاں اُڑائیں اور قد میں پہلے سے کچھ بڑھ گیا۔ حجری اسے غور سے دیکھنے کے لیے پاس ہی اُکڑوں بیٹھ گیا اور اپنے گرز سے آہستہ آہستہ چوٹیں دینے لگا۔ اس نے دیکھا ہر چوٹ پر وہ چیز پہلے کی نسبت کچھ نہ کچھ پھیل جاتی ہے، بڑھ جاتی ہے۔ اُس نے ایک پتھر اُٹھا کر اس انوکھی چیز کا ایک کونہ دبا لیا اور بقیہ حصّے کو گرز سے وہ آہستہ آہستہ پیٹنے لگا۔ وہ چیز برابر بڑھتی، پھیلتی پتلی ہوتی چلی گئی۔

سنگی جو لال پریت کو پانی ڈال کر وہاں سے بھگا چکا تھا، بھائی کے پاس اس آخری لال ٹکڑے کو دیکھ کر لپکا ہوا آیا۔ اُس نے دیکھا مگر مچھ کے بچّے کے برابر یہ ٹکڑا حجری کے ہاتھوں کے نیچے دبا ہوا پھڑک رہا ہے اور ہر بار اُس کے ہاتھ پر وار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گرز پر

گرز اس کی پیٹھ پر پڑتے جاتے ہیں مگر نہ وہ مرتا ہے اور نہ بھاگ جاتا ہے۔ اسے ڈر لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ واقعی حجری کو کاٹ کھائے۔ اس نے دوڑ کر چشمے سے اوک بھر پانی لیا اور اس پر بھی ڈال دیا۔ چھن چھن آواز ہوئی، دھواں اُٹھا اور وہ چیز لال کی جگہ کالی ہو گئی۔

سنگی تو پریت بھگا کر چلا گیا، مگر حجری اب بھی بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ ہاتھ میں پتھر کے نیچے دبے ہوئے کالے ٹکڑے کو آہستہ آہستہ چوٹیں دیتا رہا، مگر اب نہ وہ بڑھا، نہ پھیلا۔ اس نے اسے ہاتھ میں اُٹھا کر دیکھا۔ اس میں نوک پیدا ہو گئی تھی اور وہ ایک پہلو سے زیادہ چپٹا ہو گیا تھا۔ حجری نے چپٹے حصّے کو پانی سے گیلے پتھر پر گھسنا، رگڑنا شروع کیا۔ اس کی سیاہی کم ہوتی گئی اور اس میں چمک سی پیدا ہو گئی مگر وہ سوت بھر بھی نہ بڑھا۔ حجری نے کچھ سوچ کر پہلے جیسے لکڑی کے دو ٹکڑے لیے، چپٹی لکڑی میں اس نئے آلے کی نوک سے سوراخ کرنے کی کوشش کی۔ وہ پتھر والے آلے سے زیادہ جلد لکڑی میں گھس گیا۔ حجری ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے مسکرا دیا۔ اُس نے سوراخ کے منہ پر نوکیلی لکڑی رکھ کر اسے زور زور سے گھمانا شروع کیا، جیسے ہی اس میں سے دھواں نکلا اور چمک پیدا ہوئی، اُس نے اسے سوکھی پتیاں اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کھلانا شروع کر دیے۔ پھر لال لال زبانیں آس پاس کی چیزوں کو کھانے کے لیے نکل پڑیں۔ اُس نے اپنے نئے آلے کو ان پر رکھ کر بہت سی سوکھی پتیاں اور گھاس نوچ کر اس پر ڈال دیں۔ کالا ٹکڑا پھر لال لال ہو گیا۔ حجری نے پھر اسے گرز سے اُچھال کر چٹان تک پہنچایا اور پھر اسے پتھر سے دبا کر وہ اسے پیٹنے لگا۔ وہ بڑھتا گیا، پھیلتا گیا اور اس کے چپٹے حصّے میں دھار سی پیدا ہو گئی۔ مگر لال زبانیں اس تک بڑھتی چلی آ رہی تھیں، جو ہوا کا جھونکا اُدھر سے آتا اسے محسوس ہوتا وہ جھلس جائے گا، بھن جائے گا، حجری نے اس پریت کو بھگانے کے لیے بھائی کے طریقے پر عمل کیا۔ اس نے چلوؤں میں پانی بھر بھر کر ان زبانوں پر لا کر چھوڑا۔ یوں اس پریت کو اپنے اوک سے پانی پلانے پر وہ منہ چھپا کر چلا گیا۔ گرمی ٹھنڈک میں بدل گئی اور لال آلہ پھر کلموہا بن گیا۔ اب وہ اس کلموہے کو پھر پتھر پر رگڑنے لگا۔ تھوڑی دیر میں اس کی کالک دوڑ گئی اور وہ نوک اور دھار کے پاس چم چم چمکنے لگا۔ حجری اس کی یہ چمک بھڑک دیکھ کر خوش ہو گیا۔ وہ اسے ہاتھ میں لے کر گھمانے لگا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جتنے پودے، لمبی گھانسیں یا پتلے تنے والے درخت بیچ میں آئے وہ سب کٹ کر ڈھیر ہو گئے۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اُس نے سارے موجودہ آلوں سے بہتر کاٹنے والا آلہ بنالیا، مگر ساتھ ہی دل میں خیال آیا اسے کسی جاندار پر آزما کر دیکھنا چاہیے۔ جاندار کے اندر جو پریت چھپا ہوا ہے ممکن ہے وہ انھیں اس صفائی سے کاٹنے نہ دے۔ اس نے جلدی جلدی اِدھر اُدھر نظر ڈالی، تھوڑے فاصلے پر ایک جھاڑی میں ایک بوڑھی، لنگڑی بھیڑ کے بال اس طرح پھنس گئے تھے کہ وہ اس سے نکل نہ سکتی تھی اور بڑی بے بسی سے کھڑی 'میں، میں' کرر ہی تھی۔ اس کے مالک کا کہیں پتہ نہ تھا، البتہ دو چار گدھ ابھی سے منڈلاتے دِکھائے دے رہے تھے۔ ججری کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ لپکتا ہوا بھیڑ کے پاس پہنچا اور اس نے اپنے نئے تیغے کا بھرپور ہاتھ اس کی گردن پر مارا۔ سر کٹ کر دھڑ سے دُور گر پڑا۔ ججری خوشی سے اُچھل پڑا اور اُس نے خون بھرے تیغے کو چوم لیا۔ ساتھ ہی خیال آیا لاؤ تیغے کے اس پہلے شکار کو نذر والے پتھر پر چڑھا دیں۔ مفت مفت کی نذر بھی ہو جائے گی اور پتھر سے کیونکر دھواں نکلتا ہے یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ اس نے تیغہ بغل میں دبایا اور بھیڑ کا سر اور دھڑ دونوں ہاتھوں میں اُٹھائے وہ نذر والے پتھر کی طرف چلا۔

راہ میں اُس نے دیکھا کہ اس کا بھائی سنگی بھی اپنے غلّے کی بالیوں کا ایک موٹا سا گٹھا سر پر رکھے چلا آرہا ہے۔ ججری ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے بڑے فخر سے سنگی کو اپنے تیغے کا پہلا شکار دِکھایا۔ پھر وہ اکڑ کر بولا: ''آؤ ہم تم دونوں اپنی اپنی نذر چڑھائیں، دیکھیں کس کی قبول ہوتی ہے!''

دونوں نے پتھر کے الگ الگ کونے پر اپنی اپنی نذر رکھ دی۔ سنگی گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ جوڑ کر نذر کے قبول کیے جانے کی دُعا مانگنے لگا، مگر ججری ہاتھ میں تیغہ لیے اکڑا کھڑا رہا۔ دفعتہً جس حصے پر گیہوں کی سنہری بالیاں رکھی تھیں وہاں سے دھواں نکلنے لگا اور آنکھ جھپکتے ہی اتنا گہرا اور گھنا ہو گیا کہ اُس کے اندر کی کوئی چیز دِکھائی نہ دیتی تھی۔ چند منٹ بعد جب یہ دُھواں غائب ہوا تو سنگی کی نذر کا ایک ایک دانہ ساتھ لیتا چلا گیا مگر ججری کی بھیڑ اسی طرح پڑی رہی۔ ججری کی آنکھیں غصّے سے چمکنے لگیں۔ اُس نے سنگی کو مڑ کر دیکھا، اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے۔ وہ لو لگائے تھوڑی دیر بیٹھا جھومتا رہا، پھر وہ 'شکر! شکر' کہتا بابا کی طرح سجدے میں گر پڑا۔ ججری کا غصہ بھڑک اُٹھا۔ جی چاہتا تھا سنگی کی نذر قبول کرنے والا سامنے ہوتا تو اس پر

وار کر کے دیکھتا کہ وہ بھی کٹتا ہے یا نہیں۔ پھر اس نے سوچا، لاؤ اس سجدے میں جھکی ہوئی گردن پر تیغے کا وار آزما کر دیکھوں وہ کٹتی ہے کہ نہیں۔

اس نے بھائی کی گردن پر تیغے کا بھرپور ہاتھ مار دیا۔ بھیڑ کے سر کی طرح سنگی کا سر بھی دھڑ سے الگ ہو کر دُور گر پڑا اور اس کی لاش خاک و خون میں لتھڑ کر زمین پر پھڑ کنے لگی۔

بوڑھے بابا کو جب سب سے پہلے اس خونی تجربے کی خبر دی گئی تو اُس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر حجریوں سے کہا: ''آج سے تمھارے قبیلے والا جب بھی کوئی کاٹنے، مارنے والا آلہ ایجاد کرے گا تو وہ اسے اپنے بھائیوں ہی پر ضرور آزمائے گا۔''

مقدس کتابوں کی زبان سے ہم نے بابا کا نام آدم، حجری کا قابیل اور سنگی کا ہابیل سنا ہے۔ اور ہم جو اپنے کو آدمی کہتے ہیں یہ برابر دیکھ رہے ہیں کہ کوئی 'قابیلیا' جب بھی کوئی نیا آلہ ایجاد کرتا ہے تو وہ نہتے ہابیلیوں کی تاک میں لگ جاتا ہے کہ کوئی بہانہ ہاتھ آجائے اور وہ اسے اپنے بھائی پر آزما ڈالے۔

(ماہنامہ آج کل، دہلی، اگست ۱۹۶۱ء)

کچھ ہنسی نہیں ہے

مجھے علی کبیر موسوی کی اُس دن کی باتیں حرف بحرف یاد ہیں، جس روز ہم لوگ رام سیلا کے مندر کے سامنے اِملی کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔

اس وقت کے مناظر قدرت کی طلسم کاریوں کا نمونہ تھے۔ مقابل میں پھلگو ندی اور اس کے اُوپر ریل کے دو دو پُل، داہنی جانب گیا کا شہر، اِس کے اِرد گرد متعدد پہاڑیاں، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بساطِ قدرت کے بچھانے والے نے موقع موقع سے میرِ فرش رکھ چھوڑے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سارا خطہ گیا سمٹ کر 'بدھ' کے قدموں میں آ رہے اور سارے نظامِ عالم میں رخنہ پڑ جائے۔

بائیں جانب کسی صاحبِ دل، روشن ضمیر کا بنوایا ہوا، برص کے مرض کے لیے شفاخانہ، اُس کی بغل میں مستطیل و مربع کھیت، اور ان میں مٹر اور ہرا ہرا چنا۔ اُن کھیتوں میں جابجا کھجور اور تاڑ کے درخت۔ اِن درختوں کا اُتار چڑھاؤ اور اُن کے باقاعدہ کھڈّے معشوق کی اُنگلیوں کی طرح سڈول اور خوشنما معلوم ہوتے تھے۔

ہم سب، یعنی مَیں (کاظم دلاّل) نواب زادہ حمید خراسانی، پرنس اختر گردیزی اور علی کبیر موسوی، اپنی اپنی طبیعت اور مذاق کے مطابق، اس منظر کی دیدہ زیبی سے لطف لینے لگے۔

پرنس اختر، جن کی شادی ابھی حال ہی میں ہوئی تھی، دفعتاً حد درجہ افسردہ لہجے میں بولے۔ ''خدا بُرا کرے ہندوستانی رسم و رواج کا کہ ایسا تو دلکش منظر ہے، اور میری بیوی اُسے نہیں دیکھ سکتی!''

ہم سب پرنس کی اس بے ساختگی پر ہنس پڑے۔ اس زمانے میں اُن کے دل و دماغ پر

اُن کی بیوی بے طرح مسلّط تھیں اور موقع بے موقع ان کا ذکر وہ ضرور کرتے تھے، وہ ہم لوگوں کی ہنسی پر جھنجھلائے اور ہمیں معقول کرنے کے لیے کہنے لگے۔ ''اچھا بھئی تم لوگ ہنس لو۔ لیکن خدارا کبھی انصاف بھی کرو، اگر وہ غریب بھی ہمارے ساتھ یہاں تک آتی تو کون سا ہرج تھا؟ تازہ ہوا، بہترین فضا، پھر اس طرح کا منظر، کیا وہ انسان نہیں؟ کیا وہ زندہ نہیں؟ آخر کاہے کی عقوبت ہے؟ کس بات کی سزا ہے؟''

مَیں نے تو چپکے سے یہ کہہ کر 'آدم کو خلد سے نکلوانے کی!' گفتگو کو سنجیدہ ہونے سے روکا، لیکن میاں موسوی بات کاٹ کر بولے۔ ''ارے یار پرنس تم بھی ہندوستان میں ان باتوں کا ذکر کرتے ہو! میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ مَیں تمام دُنیا کی عورتوں سے نفرت کرتا ہوں اور صنف کی صنف کو حد درجہ ذلیل سمجھتا ہوں، مگر غریب ہندوستانی عورتوں پر تو مجھے بھی رحم...''

بھلا اس طرح کا مبحث ملے اور ہم جنسوں میں بات تمام ہو سکے، ناممکن! اس لیے علی کبیر صاحب موسوی ایم.اے (کینٹب) کا نظریہ ناتمام ہی رہا کہ مَیں نے اپنے خاص انداز میں جسے احباب 'بھیگی بلّی والا انداز' کہتے ہیں، اُن سے پوچھا ''اچھا تو خیر سے آپ صنفِ لطیف سے نفرت بھی کرنے لگے؟ ستّر چوہے کھا کر؟ کیوں؟''

پرنس جلدی سے بولے۔ ''اور آپ کا اخلاق تو دیکھئے کہ آپ نے پوری صنف سے اظہارِ نفرت بھی کیا تو میری بیوی ہی کے تذکرے کے سلسلے میں۔''

نواب زادہ حمید، جو ہم سب میں حد درجہ سنجیدہ تھے، قدرے غصّہ ہو کر پرنس سے بولے۔ ''خیر آپ اپنی بیوی کو تو ہر وقت اُچھالتے نہ پھریئے... ہاں بھئی موسوی، سچ سچ بتاؤ، کیا واقعی تمھیں عورتوں کی پوری صنف سے نفرت ہے؟''

اُنھوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''بالکل سچ عرض کرتا ہوں۔ یہ صنف حد درجہ قابلِ نفرت ہے۔''

نواب زادہ نے کہا۔ ''کوئی دلیل؟''

وہ بولے: ''غور سے دیکھئے ارتقائی مدارج میں عورتوں کا درجہ حیوانی صفوں سے کسی طرح آگے نہیں بڑھتا۔''

مَیں نے پھر اپنے خاص انداز میں کہا: ''اچھا تو میاں ڈارون کا ارتقا یہاں بھی موجود ہے؟''

موسوی ذرا جھلّا کر بولے۔ ''جی ہاں! جہاں کہیں نمو ہے، وہاں ارتقا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں عورتیں ذی حیات مخلوق میں داخل ہیں۔ اِس لیے ان میں بھی ارتقا ہے۔ ارتقائے ذہنی، ارتقائے جسمانی، ارتقائے روحانی!''

نواب زادہ نے کہا: ''ارے میاں تم بھی دلاّل کی باتوں میں آ گئے۔ وہ یوں ہی چھیڑتا ہے۔''

مَیں نے نواب زادہ کی یہ بات سن کر اپنے دفاع میں یہ کہنا ضروری سمجھا۔ ''بڑی مشکل ہے کہ انسان جو بات نہ سمجھے وہ پوچھے بھی نہیں، مَیں نے تو کیمبرج کی صورت بھی نہیں دیکھی! مَیں...''

اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ پرنس نے اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے میرا چھوٹا سا منہ بند کر دیا اور بولے: ''ہاں بھئی موسوی قابلِ نفرت ہونے کا ثبوت؟''

موسوی نے کہا: ''اس کے لیے ثبوت کی کیا ضرورت ہے، یہ تو ایک واضح سی بات ہے، تم ہی دیکھو کہ انسان کی سب سے بڑی صفت یہی ہے کہ وہ خود غرض نہ ہو، بلکہ بے نفس ہو۔ صحیح معنوں میں 'بیخود' ہو۔ یہاں اس پوری صنف کا خود غرضی خاص شیوہ ہے۔ بلکہ مَیں تو کہوں گا کہ 'مارکہ' ہے۔ انھیں نے ازل ہی سے اس صفت پر رجسٹری کرا لی ہے، مہد سے لحد تک آرائشوں کا، زینتوں کا مبدا، منبع، مرکز یہی ہیں۔ سولہ سنگار، بتیس ابرن انھیں کے لیے ہیں۔ انھیں کی بوٹی بوٹی شقاوت کا گھر ہے۔ انھیں کے ابرو خنجر، انھیں کی آنکھیں نشتر، انھیں کے اشارے دِلوں کا خون کرنے والے، انھیں کے غمزے سیکڑوں کو بسمل رکھنے والے ہوتے ہیں۔ مرد غریب ایک صید محض ہے۔ اور یہ حد درجہ سفاک صیّاد۔ اس کی حیثیت اُس مکھی کی ہے، جو مکڑی کے جال کی چمک اور خوبصورتی دیکھنے جائے اور اُسی میں گرفتار ہو کر رہ جائے۔ اِن شاطر عیاروں نے اس طرح کے خس پوش کنوئیں بنا رکھے ہیں کہ بڑے سے بڑا چالاک و ہوشیار مرد بھی گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

موسوی کی تقریر کے جوش نے ہم سب لوگوں کو خاموش کر دیا تھا، لیکن وہ سانس لینے کے لیے رُکے ہی تھے کہ پرنس بولے۔ ''ماشاءاللہ میرے ڈی ماستھینز ماشاءاللہ! فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے۔ لیکن یہ نہ سوجھی کہ یہ ساری باتیں یورپ کے لیے ہیں، جہاں کا تمھیں تجربہ ہے، جہاں ہندوستان میں ان باتوں کا وجود نہیں۔ میری بیوی ہی کو لے کر...''

ہم سب اس پر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ موسوی نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر کہا۔

''بھئی پہلے پوری بات سن لو، پھر اعتراض یا مخالفت کرنا... غور سے دیکھو، انصاف کرو۔ لڑکی پیدا ہوئی، ابھی مشکل تُتلی زبان میں بولنے پائی ہوگی کہ اس کی نمائش شروع ہوگئی، لڑکوں کے لیے ایک کُرتہ، اس کے لیے تین تین کپڑے۔ ذرا اور بڑھی اور کان ناک چھدے اور سونے چاندی کے زیورات پور پور میں دکھائی دینے لگے۔ ابھی جوان بھی نہ ہونے پائی تھی کہ نسبتوں کی تلاش کی فکر دامن گیر ہوگئی۔ خیر خدا خدا کر کے بات پکّی پوڑھی ہوئی تو برات بیاہ کی ٹھہری۔ اِس میں کم از کم اتنا خرچ کرنا پڑا کہ جتنے میں چار لڑکوں کی شادیاں ہو جائیں۔ اب چوتھی چالے کا سلسلہ چلا۔ باپ غریب بک جائے، بھیک مانگے، لیکن یہ سب پورا کرے۔ اچھا صاحب باپ کو مفلس، قلانچ بنا کر میاں کے گھر آئیں، یہاں پہنچتے ہی پاؤں پھیلا دیے۔ میرے لیے دوسرا گھر بناؤ۔ مَیں ان ساس، نندوں کے ساتھ ایک گھڑی بھی نہیں رہ سکتی۔ وہ مجھے کوس کوس کر کھا جائیں گی۔ لیجیے صاحب ماں، باپ، بہن، بھائی، سب کو چھوڑ کر علیحدہ گھر بنا۔ اب آرائش و زینت کا سامان مہیا کرو۔ یہ بھی ہوا۔ اُمید ہوئی کہ اب شاید چین ملے۔ جی نہیں طبیعت ناساز ہوگئی۔ حکیم ڈاکٹر بلواؤ۔ نو مہینے ایک حد درجہ بدنما صورت دیکھ کر آنکھوں کے دُکھنے کی شکایت نہ کرو، بلکہ ظالموں کو یہی یقین دلائے جاؤ کہ 'تم اب پہلے سے بھی اچھی معلوم ہوتی ہو' غرض کسی طرح صاحبزادے بھی ہوئے۔ اب کیا تھا پوری قیامت آ گئی۔ دائیاں، کھلائیاں، دودھ پلائیاں اور نہ معلوم کتنی 'آیاں، جائیاں' ضروری ہوگئیں۔ 'وہ' پلنگ پر لیٹی رہیں، چوزے کھائیں، سیروں گھی پی جائیں، منوں مقویات اُڑا جائیں۔ تم دَبے پاؤں آؤ اور دَبے پاؤں چلے جاؤ۔ اگر مرد غریب ان آلام اور مصائب کو نہ برداشت کر سکا اور بیوی کی خوش قسمتی سے مر گیا تو پھر کیا پانچوں گھی میں ہیں۔''

مَیں نے کہا: ''اب تو مبالغہ و مغالطہ دونوں اپنی حدوں سے بھی گزر چکے۔''

موسوی بولے: ''نہیں حضت یہ بات نہیں۔ مَیں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بیانِ واقعہ ہے۔ دیکھیے نا، ہیں تو بیوہ، شوہر نے ٹکا نہیں چھوڑا، کوئی ذریعہ معاش نہیں، لیکن بیوی صاحبہ ہیں کہ اب سوائے سیاہ کے دوسرے رنگ کا کپڑا ہی نہیں پہن سکتی ہیں۔ شوہر نے زندگی میں جتنے کپڑے بنائے وہ سب بلا مصرف سڑیں، لیکن اُن کی بیوگی کے اظہار کے لیے نئے نئے جوڑے ضرور تیار ہوں۔ بغیر ان کے رونے میں مزہ ہی نہیں آتا۔ زرد زرد چہرے اور سُرخ سُرخ

آنکھوں پر سیاہ ہی پھبتا ہے۔ دوسرے رنگ کے کپڑے پہن کر نہ تو آنسو نکل سکتے ہیں اور نہ دردِ دل کا اظہار ہو سکتا ہے! کیوں صاحب، جھوٹ ہے؟ دلال صاحب آپ ہی فرمائیے؟"

میں نے کہا: "واللہ تمھیں مغالطہ دینا اور تصویر کا ایک رُخ دکھانا خوب ہی آتا ہے۔"

موسوی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں بھئی تم ایسا کیوں نہ کہو گے۔ تم نے بھی تو اسی مسموم آب و ہَوا میں تربیت پائی ہے! پھر کہتا ہوں، سچ مانو! یہ پوری صنف، بڑی ذات شریف ہے۔ جب ان کا جی چاہا تمہیں انہوں نے بُرا بھلا کہہ لیا! ان کا جواب دینا تمہارے لیے غیر شریفانہ ہے۔ عورت کے منہ کون لگے؟ اتنا ہی نہیں، بلکہ جب ان کی خوشی کرو تو خود اپنی نظروں میں اپنی وقعت گھٹتی ہے، خودداری کو تکلیف ہوتی ہے اور قوّت ارادی کمزور ہوتی ہے۔ جب وہ تمہاری خوشی کریں گی، تو محض کسی غرض سے، تم خوش ہوئے اور انہوں نے ایک فرمائش رسید کی۔ 'ہمارے لیے موتیوں کا ہار خرید دو۔ اوں اوں! فلاں کے پاس بڑا اچھا ٹیکہ ہے ویسا ہی ہمارے لیے بنوا دو۔ اوں، اوں...' کیا کیا بتاؤں۔ اگر انہیں پردہ میں رکھو تو بیمار ہو کر گھلنے لگیں گی، دق و سل میں مبتلا ہو جائیں گی..."

مَیں نے کہا: "یہ بھی کوئی اختیاری اَمر ہے۔"

وہ بولے: "بیٹھی بیٹھی پلنگ کے بانده توڑیں گی، خود اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کریں گی۔ غذا میں حد درجہ بد پرہیزی برتیں گی۔ پھر بیمار نہ ہوں گی تو کیا اچھی رہیں گی؟"

نواب زادہ نے اُکتا کر کہا "اچھا بھئی، اچھا، یہ سب صحیح، پردہ میں رکھو تو یہ کرتی ہیں کہ بیمار ہو جاتی ہیں اور اگر پردہ میں نہ رکھو تو؟"

اُنھوں نے کہا: "اگر پردہ سے باہر نکالا تو باپ دادا، ملک، تربیت، تعلیم، کسی اَمر کا پاس نہ کریں گی۔ مردوں کا بے دھڑک منظرِ عام پر شکار کریں گی، غرض ہر طرح آفت، ہر نہج سے بلا ہیں!"

مَیں نے چپکے سے پوچھا۔ "تو پھر آپ کے نزدیک یہ صنف کسی طرح کے مراعات کی مستحق نہیں؟"

وہ نہایت جوش سے بولے: "ہرگز نہیں۔ ان کی جس بات پر، جس نہج سے، جس پہلو سے غور کیجیے، وہ خود غرضی اور محض خود غرضی پر مبنی نکلیں گی۔ میری تو دُعا ہے کہ خدا ہر شریف و رذیل کو ان کے مکروں سے بچائے!"

ہم لوگ جب اُس دن پہاڑ سے پلٹے تو ہوٹل میں داخل ہوتے وقت منیجر نے موسوی کو ایک خط دیا۔ وہ اسی طرح بحث میں مشغول خط ہاتھ میں لیے کمرہ تک پہنچے۔ وہاں پرنس نے ٹوک کر کہا۔ ''مردِ خدا خط تو پڑھ لو پھر بحث کرتے رہنا۔''

اُنھوں نے اُن کے ٹوکنے پر چونک کر لفافے پر نظر ڈالی، اور یہ کہہ کر کہ ''ارے یہ تو والد کا خط ہے'' لفافہ چاک کیا اور جلد جلد پڑھنے لگے۔ ہم لوگ بھی اُنھیں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس لیے کہ اُن دنوں اُن کی والدہ سخت علیل تھیں۔ خیال تھا کہ شاید اس خط سے ان کی کچھ خیریت معلوم ہو۔ ہم لوگوں نے دیکھا کہ خط پڑھتے پڑھتے موسوی کا چہرہ دفعتاً بالکل زرد ہو گیا۔ ہم لوگوں کا دل دھڑکنے لگا کہ خدا ہی خیر کرے۔ ہم اُن سے سبب پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ پھر اُن کا چہرہ بالکل سُرخ ہو گیا۔ اب کی پرنس سے نہ رہا گیا، وہ ان کے عزیز بھی تھے، اِس لیے اُنھیں ہم لوگوں سے زیادہ حق بھی تھا۔ وہ خط پر ہاتھ ڈال کر بولے۔ ''کیوں خیریت تو ہے؟ کیا لکھا ہے کہ تم گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہے ہو؟''

موسوی کا چہرہ تمتما اُٹھا اور وہ خط اُنھیں دے کر بولے: ''جی لیجیے، آپ خود ہی ملاحظہ فرمالیجیے۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ۔ من در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال!''

پرنس نے جلدی جلدی خط پڑھا اور بولے ''جی نہیں، آپ نے مصرع پڑھنے میں غلطی کی۔ ہونا یوں چاہیے۔ ''من در چہ خیالیم و پدر در چہ خیال!''

یہ کہہ کر انھوں نے قہقہے لگانا شروع کر دیے۔ ایک انسان کی زندگی کی بربادی تمہارے لیے دل لگی ہے۔ بڑا اچھا مذاق ہے کہ تم ہنسی سے بیتاب ہو۔ لطف یہ کہ یہ جتنا بگڑتے تھے اتنی ہی اُن کی ہنسی بڑھتی جاتی تھی۔

بالآخر نواب زادہ نے، جو تمام عالم کی سنجیدگی کے ٹھیکیدار ہیں، گھبرا کر پوچھا۔ ''ارے بھئی آخر اس خط میں کیا لکھا ہے کہ تم جس قدر اظہارِ غم و غصّہ کر رہے ہو، پرنس اُسی قدر ہنس رہے ہیں؟ کچھ ہم لوگوں کو بھی بتا!''

موسوی جھلا کر بولے: ''لکھا کیا ہے۔ میرے والد صاحب نے میری قسمت کے فیصلہ کی ٹھہرائی ہے، اور میری شادی احمد نبی سیٹھ کی لڑکی سے طے فرمادی!''

پرنس نے ذرا ہنسی روک کر کہا۔ ''اور مزہ یہ کہ میں ان صاحبزادی کے خیالات سے اچھی

طرح واقف ہوں۔ وہ میری بہن کے ساتھ پڑھتی تھیں۔ اُن کو مردوں سے اسی قدر نفرت ہے جتنی کہ انہیں عورتوں سے! خیر خوب گزرے گی۔'' اور پھر ہنسنے لگا۔

مَیں نے موسوی کے بڑھتے ہوئے غصّہ کو فرو کرنے کے لیے کہا ''تو آخر اِس میں اس قدر غم و غصّہ کی کیا بات ہے؟ اگر تمہیں نامنظور ہے تو انکار کر دو۔''

نواب زادہ پُرانے ریت رسم کے پابند، بھلا ایسی بات کہاں سن سکتے تھے، مجھے بڑے زور سے ڈانٹ کر بولے۔ ''کاظم تم بھی بعض وقت پکّے سودائیوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ بھلا شرفا میں بھی کہیں یہ ہوتا ہے کہ والدین شادی طے کر دیں اور لڑکا انکار کر دے۔ توبہ! توبہ! کتنی معیوب بات ہے!''

میں نے کہا: ''جی ہاں بے حد اس لیے کہ ان کی جگہ ان کے والدین ہی تو اس لڑکی کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ جو صاحب معاملہ ہے وہ تو عورت کے نام سے متنفر ہے، اور بڑے میاں ہیں کہ زبردستی گلے منڈھے دیتے ہیں۔ بس یہ گردن جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ اور سب کو دل ہی دل میں کوسا کریں، یہی شرفا کا دستور ہے اور یہی سب سے اچھا طریقہ ہے!''

پرنس نے کہا: ''تو اس کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتے ہیں؟ اگر انکار کر دیں تو ان کے والد عاق ہی کر دیں۔ زندگی بھر ان کا منہ نہ دیکھیں۔ یہ لاکھوں روپیہ کی دولت اِدھر ہاتھ سے جائے اُدھر وہ سیٹھ کی ایک ہی لڑکی ہے اور صرف پچاس لاکھ اس کے نام سے بینک میں جمع ہیں۔''

موسوی ذرا اکڑ کر بولے۔ ''مجھے نہ والد کے روپیوں کی ضرورت ہے اور نہ سیٹھ جی کے! اُن لوگوں کو اپنی دولت مبارک رہے۔ میں نے اتنا پڑھ لکھ لیا ہے کہ میں اپنی قوتِ بازو سے اپنے کھانے بھر کو پیدا کر سکتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں کسی کا محتاج نہیں!''

نواب زادہ نے، جو ہمیشہ اُلجھتی ہوئی بات کو سلجھانے اور بڑھتے ہوئے غصّے کو ٹھنڈا کرنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے، پرنس کو ایک جانب لے جا کر کچھ آہستہ آہستہ باتیں کیں۔ پھر موسوی کے پاس پلٹ کر آئے اور اُن سے کہا: ''اچھا ذرا ہاتھ منہ دھو لو۔ کچھ کھا پی لیں تو پھر اس مسئلہ پر غور کیا جائے۔''

موسوی نے کہا: ''اس میں تم لوگوں کے غور کی کیا ضرورت ہے؟ میں اپنا بُرا بھلا خود سمجھتا ہوں اور میں نے فیصلہ کر لیا۔''

نواب زادہ انہیں حمام کی طرف ڈھکیل کر بولے: ''اچھا تو تم پہلے منہ ہاتھ دھو آؤ اس

کے بعد ہم لوگ تمھارا فیصلہ سُنیں گے۔"

جب وہ حمام میں چلے گئے تو نواب زادہ میری طرف پلٹے اور مجھے دھمکانے کے لیے گھونسا تان کر بولے: "کاظم اگر تم نے ذرا بھی میری مخالفت کی، تو میں تمہاری یہ پھولی ناک مارے گھونسوں کے بالکل چپٹی کر دوں گا۔"

مَیں خوف زدہ انداز سے ذرا پیچھے ہٹا تو وہ تھوڑا سا مسکرا کر بولے: "ذرا سنجیدگی سے کام لو۔ بھلا موسوی کے لیے اِس سے بہتر اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ لڑکی اعلیٰ تعلیم یافتہ، ایرانی نژاد، اور ایک بھلے گھر کی، پھر لاکھوں روپے کی مالکہ۔ اب کیا آسمان سے کوئی تارہ ٹوٹ کر آئے گا، یا میاں موسوی کے لیے زہرہ مشتری آ جائے گی؟"

مَیں نے دَبی زبان سے کہا: "بھئی مجھے تو اصولی اختلاف ہے۔ میں تو عقلاً والدین کو یہ حق دینا ہی نہیں چاہتا کہ وہ جہاں اُن کا جی چاہے بیٹے بیٹیوں کا گلا پھانس دیں، آخر اُنھیں اِس کا کیا حق ہے؟"

نواب زادہ نے کہا۔ "مَیں اِس وقت تم سے بحث کرنے کے لیے تیار نہیں اور نہ مجھے تمہارے ناممکن العمل نظریوں کی ضرورت ہے۔ لیکن میں تم سے پھر صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ اگر تم میری اور پرنس کی اس معاملے میں تائید نہیں کر سکتے ہو تو چپکے ہی بیٹھے رہو۔ دیکھو مخالفت نہ کرنا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

مَیں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "بہت خوب سرکار۔ حضور کے گھونسوں کے ڈر سے منظور کیے لیتا ہوں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ آپ حضرات چند زرد سپید سکّوں کے لیے دو زندگیاں برباد کر رہے ہیں۔"

پرنس ترش رُو ہو کر جھڑک کر بولے: "دو زندگیوں کی احتمالی بربادی کو تو آپ بے حد اہمیت دے رہے ہیں، لیکن چار بوڑھے بوڑھیوں کی یقینی موت کا خیال ہی نہیں کرتے!"

مَیں نے بھی پرنس کے لب ولہجے سے اثر لے کر ذرا سختی سے جواب دینا چاہا تو نواب زادہ نے مجھے روک کر کہا۔ "ارے یار کاظم، ذرا خط تو پڑھ لو، دیکھو موسوی کے والد نے کن الفاظ میں لکھا ہے، سنو لکھتے ہیں: 'میاں مَیں تمھاری آزاد خیالی سے واقف ہوں۔ لیکن تمھاری ماں بسترِ مرگ پر ہیں۔ مَیں خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں، ہم دونوں کی اُمیدیں اور خوشیاں صرف تمھاری ذات سے وابستہ ہیں۔ سیٹھ کی لڑکی کو مَیں نے گود میں کھلایا ہے، سیٹھ میرے منہ

بولے بھائی ہیں اور ساری عمر کے دوست۔ مَیں ان کے گھر کے چلن سے واقف ہوں۔ وہ میرے گھر کے طور طریقے سے آگاہ ہیں۔ خدارا کہیں ایسا نہ کرنا کہ جلد بازی سے کام لے کر انکار کر بیٹھو۔ اس لیے کہ اس سے ہم بوڑھوں کے دل پر اتنا کاری زخم لگے گا کہ اس کا اندمال محال ہو جائے گا۔' اب تمھیں بتاؤ کہ اس کے بعد کیا فیصلہ کرتے ہو؟''

مَیں نے کہا: ''سچ پوچھو تو یہ بڑے میاں کی خود غرضی ہے، اپنی ذراسی خوشی کے لیے بیٹے کی ساری زندگی برباد کرنے کے لیے تیار...''

مَیں ابھی جملہ تمام بھی نہ کرنے پایا تھا کہ موسوی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ مَیں نواب زادہ کی خاطر ساکت ہو رہا۔

کھانے پر اور اُس کے بعد قریب قریب تمام شب نواب زادہ پرنس اور موسوی سے اس معاملے پر ہر حیثیت اور پہلو سے بحث ہوتی رہی۔ مَیں چپکا سُنا کیا۔ نہ مَیں نے موسوی سے اس رشتہ کے منظور کرنے پر اصرار کیا اور نہ اُنھیں انکار کرنے کی ترغیب دی، بلکہ میں حد درجہ استقلال سے بیٹھا اس تماشہ کو دیکھا کیا لیکن پھر بھی صبر کہاں تک؟ اور وہ بھی جبکہ موضوع بحث ایک ہی ہو، اِس لیے میں نے کوئی دو بجے کے قریب عاجز آ کر موسوی سے کہا۔ ''ارے میاں خدا کے لیے اب کسی اَمر کا قطعی فیصلہ کرلو۔ ساری رات گزر گئی اور یہ بات ہی نہیں طے پاتی۔ میری دانست میں تو تم کو یہ شادی محض اِس لیے کر لینا چاہیے کہ اس میں تمہارے نظریہ کے اثبات کے ہر طرح امکانات موجود ہیں۔ تم عورتوں سے متنفر اور مس صاحبہ مردوں سے۔ نام کی شادی ہوگی۔ نہ تم اُن کے میاں، نہ وہ تمہاری بیوی، نہ تمھیں اُن سے مطلب، نہ اُنھیں تم سے کوئی سروکار۔ جب انسان کو اس طرح کی بیوی ملے اور اسی کے ساتھ کئی لاکھ روپے، تو اس کی خوش قسمتی کی کوئی حد ہی نہیں! ایسی حالت میں انکار کفرانِ نعمت ہے، کفرانِ نعمت!''

پرنس، نواب زادہ، اور اُن کی دیکھا دیکھی موسوی، تینوں مجھ پر پِل پڑے، اور اتنے تکیوں، لحافوں، کمبلوں اور چادروں کی مجھ پر بارش ہوگئی کہ مَیں تو ان کے نیچے دب کر سو ہی گیا۔ اور یہ سب نہ معلوم کب تک بحث کیا کیے!

کلکتہ پلٹنے پر مَیں اپنے پیٹ کے 'دھندے' میں اس طرح مشغول ہو گیا کہ اِن احباب سے بالکل مل ہی نہ سکا۔ کوئی دو ہفتہ بعد ایک روز پرنس میرے جھونپڑے پر پانچ بجے شام کے قرب آئے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے ''ارے بھائی دلال، تم تو اس طرح غائب ہوئے جیسے

گدھے کے سر سے سینگ!"

مَیں نے کہا: "جی مَیں نہ تو پوتڑوں کا رئیس ہوں اور نہ باپ دادا نے مزدوروں کا گلا کاٹ کر اتنا سرمایہ چھوڑا ہے کہ ساری عمر کھاتا اور لٹاتا پھروں اور پھر بھی کم نہ ہو۔ مَیں تو ایک غریب مزدور ہوں۔ دن بھر محنت کرتا ہوں تو کہیں چار پیسے مل جاتے ہیں۔"

وہ ہنس کر بولے: "اچھا بھئی، ہم پوتڑوں کے رئیس اور تم پشتہا پشت کے مفلس! مگر تم نے یہ بھی سنا کہ موسوی کی شادی آخر ہم لوگوں نے طے کرا ہی دی؟ اِن صاحبزادے کو آخر راضی ہونا ہی پڑا۔"

مَیں نے کہا: "خوب! لیکن صنفِ نازک کے متعلق ان کے نظریوں کا کیا حشر ہوا؟"

پرنس نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا پھر وہ بولے "تم بھی کہاں کی باتیں کر رہے ہو۔ ہندوستان میں کہیں ایسے نظریے وزریے چلتے ہیں؟ سب یوں ہی بکا کرتے ہیں لیکن جہاں معاشرتی پھندوں میں پھنسے سب بھول جاتے ہیں۔"

میں نے کہا: "تو میاں موسوی کی باتیں بھی زبانی ہی تھیں، وہی یورپ کے غیر منہضم خیالات؟"

پرنس نے متانت سے جواب دیا۔ "نہیں صاحبزادے تو اب تک نئے گرفتار جنگلی جانور کی طرح 'فوں، فاں' کر لیتے ہیں۔ لیکن یارانِ طریقت کب سنتے ہیں۔ ان کی اتنی جرأت نہیں کہ باپ کے سامنے صاف صاف کچھ کہہ سکیں۔ اگر پسِ پشت مجھ سے کچھ کہا بھی تو مَیں مذاق میں ٹال دیتا ہوں۔ وہ لاکھ کوشش کریں، پھندا مضبوط ہے۔ وہ چھوٹ نہیں سکتے!"

مَیں نے کہا: "تو اگر انھیں کے ہاں چلتے ہو تو مَیں بھی تمھارا ساتھ دوں۔ تعزیت کے فرائض ادا کرنے ہیں۔ اِس سے جس قدر جلد سبکدوشی حاصل ہو اُتنا ہی اچھا۔"

وہ اس پر بہت ہنسے، پھر کہنے لگے۔ "نہیں وہاں سے بہتر جگہ تمھیں لے چلنے کا ارادہ ہے۔ سیٹھ نے آج پورے 'طائفہ وزدانِ عرب' کو ڈنر دیا ہے۔ چونکہ تمھارا پتہ وہ نہ جانتے تھے، اس لیے تمہارا خط بھی میرے ہی پاس اُنھوں نے بھیج دیا ہے، یہ دیکھو میری جیب میں ہے۔"

مَیں نے دیکھا تو واقعی سیٹھ نے پتہ نہ جاننے کی معذرت کی تھی اور مجھے سات بجے کھانے پر بلایا تھا۔ مَیں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور پرنس کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر سیٹھ کی کوٹھی پر پہنچا۔ اتفاق یہ کہ ہمارے موٹر کے رُکتے ہی نواب زادہ اور موسوی دوسری موٹر سے

اُترتے دِکھائی دیے۔ آپس میں مصافحہ کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم پہنچے۔

ہر میز پر سگار، سگریٹ، الائچی، پان وغیرہ رکھے تھے۔ کمرے بھر میں بجلی کی روشنی تھی۔ اور کمرے کی سنہری منقش دیواریں عجیب خوشنمائی سے چمک رہی تھیں۔ سیٹھ سے ہم لوگوں سے پہلے ہی سے تعارف تھا۔ وہ ایک پچاس پچپن برس کے دراز قد آدمی تھے۔ ہم لوگوں سے اُنھوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا، اور رسمی مزاج پُرسی کی۔ مَیں نے دیکھا کہ اُس روز اُن کے چہرے سے دو طرح کے جذبات نمایاں تھے۔ ایک تو خوشی کے، دوسرے شرمندگی کے، خوشی غالباً موسوی کو فرزندی میں لینے کی تھی، البتہ شرمندی کی کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی تھی۔ مَیں اِسی پر غور کر رہا تھا کہ اُنھوں نے نواب زادہ کو مخاطب کر کے کہا۔ ''میری بیٹی زینت اور علی کبیر موسوی کے درمیان جس رشتہ کا تذکرہ ہوا ہے، اُس کا حال آپ لوگوں کو معلوم ہی ہے۔ چونکہ آپ حضرات ان کے اعزا و احبابِ خاص ہیں، اِس لیے مَیں چاہتا ہوں کہ مَیں آج ایک اہم معاشرتی اصلاح کو بیان کر دوں، جس کا میں پابند ہوں۔ میرا خیال ہے، اور زینت میرے اس خیال کی سختی سے پابند ہے کہ پردہ بدترین شے ہے اور ہمیں اس مذموم رسم کے جلد سے جلد اُٹھا دینے کی کوشش کرنا چاہیے!''

نواب زادہ، پُرانے خیال کے آدمی، وہ ذرا گھبرائے۔ میں چپکا مسکرایا۔ پرنس ناسمجھی سے ہنس پڑے۔ سیٹھ ان کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔ ''کیوں صاحب، کیا آپ کو اس سے اختلاف ہے؟''

وہ چپ ہو کر بغلیں جھانکنے لگے۔ نواب زادہ نے بگڑتی ہوئی بات بنائی اور نہایت متانت سے سیٹھ سے کہا: ''آپ کے خیالات سے اختلاف یا اتفاق، موجودہ صورت میں، دو ہی شخصوں کا قابلِ التفات ہے۔ اوّل تو موسوی کا، دوسرے اُن کے والد کا۔ اگر ان حضرات کو آپ سے اتفاق ہے تو ہمارا اختلاف یا اتفاق کوئی وزن نہیں رکھتا ہے۔''

سیٹھ مسکرا کر بولے: ''مَیں نے اِن کے والد سے گفتگو کر لی ہے۔ وہ میرے ہم خیال تو نہیں ہیں، لیکن میرے مخالف بھی نہیں ہیں۔ اب رہے میاں علی کبیر، تو اُن کی رائے سے مجھ سے زیادہ آپ لوگ واقف ہوں گے۔

مَیں نے نواب زادہ کے کان میں جھک کر کہا: ''اگر پردہ سے باہر نکالو تو ہر شخص کے ساتھ...'' اُنہوں نے زہر کی چتونوں سے مجھے دیکھا۔ مَیں نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے

لیے ایک سگریٹ جلدی سے جلائی اور کنکھیوں سے موسوی کو دیکھنے لگا۔ اس بیچارے کی عجیب حالت تھی۔ پیشانی پر عرق کے چھوٹے چھوٹے قطرے دکھائی دیے تھے۔ گھبراہٹ یہ کہ نظریہ تو یہی تھا، لیکن اگر اس وقت صاف صاف سیٹھ کی طرفداری کرتے ہیں، تو ہم لوگوں کے سامنے مس زینت بلالی جاتی ہیں۔ ہندوستانی تربیت اور حمیت اس سے متنفر، مغربی معاشرت وفلسفہ پر مصر، عجیب گومگو کی حالت تھی۔ گردن جھک گئی اور نظر فرش پر جم گئی۔

سیٹھ نے انہیں استعجاب سے دیکھا۔ انہیں خیال تھا، اور صحیح خیال تھا کہ کیمبرج کا تعلیم یافتہ، عقل کو جھوٹی حمیت پر ترجیح دے گا۔ اور اس 'معاشرتی اصلاح' میں ان کا بہت بلند آہنگی سے ساتھ دے گا۔ موسوی کے اس طرح کے سکوت نے انھیں بالآخر متوحش کردیا اور اُنہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیوں میاں، کیا تم میرے ہم خیال نہیں ہو؟''

پرنس نے آہستہ سے موسوی کا زانو دبایا۔ اُنھوں نے سر اُٹھا کر کہا ''جی نہیں، مجھے آپ کی رائے سے اختلاف نہیں...''

سیٹھ مسکرائے اور بولے: ''الحمدللہ، تو مَیں زینت کو ابھی لیے آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

ادھر نواب زادہ کی برہمی شروع ہوئی۔ ''لاحول ولاقوۃ۔ یہ تم لوگوں کے سر میں نہ معلوم کیا سمائی ہے۔ توبہ، توبہ، نہ شرافت کا خیال، نہ شرع کا پاس!''

پرنس نے متین بن کر کہا ''حضور بہ قصد نکاح غیر محارم پر نظر ڈالنا جائز ہے۔''

نواب زادہ بولے ''تو بھئی اُن کے لیے نا، ہم لوگ کیا آنکھیں بند کرلیں گے؟''

مَیں نے اپنے منجھے ہوئے لب ولہجہ میں کہا۔ ''نہیں ہم لوگ بہ قصد بھابھی بنانے کے دیکھیں گے۔''

موسوی نے اس پر ایک مخملی تکیہ جو وہیں کوچ پر رکھا تھا۔ کھینچ مارا۔''

مَیں نے کہا: ''اچھا مَیں سمجھا۔ یہ مجھے میرے فرض کی یاد دہانی ہے۔ مَیں آپ کی خدمت میں باقاعدہ طور پر دلی تعزیت پیش کرتا ہوں۔''

اس پر موسوی، نواب زادہ اور پرنس تینوں نے مجھے ایک ساتھ ایک ایک گھونسا اس زور کا رسید کیا کہ میرے منہ سے ''دُہائی ہے زینت بی بی کی'' بے ساختہ نکل گیا۔ معاً کواڑ کھلے اور سیٹھ صاحب مع اپنی بیٹی کے آتے ہوئے دِکھائی دیے۔ یہ خیال کرکے کہ میری چیخ باپ بیٹی

نے کہیں نہ سن لی ہو، مَیں بالکل جھینپ گیا۔ اور مَیں نے گردن جھکالی۔ نواب زادہ نے اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے ذرا سا منہ پھیر لیا۔ لیکن پرنس اور موسوی دونوں ٹکٹکی باندھے دیکھا کیے۔ جب یہ لوگ قریب آ گئے تو مَیں نے اُوپر نظر اُٹھائی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ایک بقعہ نور میرے سامنے ہے۔ مَیں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نوری مجسمہ سے مبہوت کیفیت کے ساتھ تعارف کے بعد ہاتھ ملایا۔

مجھے نہیں یاد کہ مَیں نے اس شب کی کئی گھنٹہ کی صحبت میں زینت سے کیا باتیں کیں، یا نواب زادہ اور پرنس نے کیا کہا۔ موسوی البتہ میری نظر میں قابلِ رشک تھے اور اِس لیے میں اُن کی افعال و حرکات بغور دیکھتا رہا۔ وہ اُن کا شرمانا، وہ اُن کا جھلاّنا، وہ اُن کی آنکھوں کی مسکراہٹ، وہ اُن کی نظروں کی لگاوٹ، وہ اُن کی زینت سے رُکی رُکی باتیں مجھے سب یاد ہیں۔

اسی کے ساتھ میں یہ بھی نہیں بھول سکتا کہ زینت نے موسوی سے سب سے کم باتیں کیں اور مجھ سے سب سے زیادہ۔ اور جب ہم لوگ رخصت ہونے کے لیے اُٹھے تو ہاتھ ملاتے وقت مجھ سے بولیں۔ "مَیں آپ سے مل کر بے حد خوش ہوئی پھر ضرور ملئے گا۔"

ممکن ہے کہ یہی فقرہ زینت نے پرنس یا نواب زادہ سے بھی کہا ہو۔ لیکن میرے لیے اس فقرے میں ایک عجیب طرح کا اثر بھرا تھا، جس نے میرے دل میں انواع و اقسام کے جذبات برانگیختہ کر دیے، وہی فقرہ جو دوسروں کے منہ سے روکھا، پھیکا، سیٹھا، محض اخلاقی معلوم ہوتا، اس کے منہ سے خاص التفات اور مخصوص عنایتوں کا مجموعہ بن گیا۔ صرف ان چند الفاظ کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں تین شبانہ روز اُنہیں کے خیال میں غرق رہا۔ دل قابو سے باہر تھا، دماغ اس طرح چل گیا تھا گویا واقعی پری کا سایہ ہو گیا ہو۔

چوتھے دن اِس انوکھی کیفیت سے عاجز آ کر مَیں نے ایک بہانہ نکالا اور سیٹھ کے گھر پہنچا۔ وہ تو جیسا مجھے یقین تھا اپنے دفتر میں تھے، البتہ مس صاحبہ موجود تھیں۔ اطلاع کرائی، تشریف لائیں اور تپاک سے ملیں، مَیں گھبرایا گھبرایا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب اُٹھنے لگا تو اُنھوں نے اصرار سے پھر بٹھایا۔ مَیں اپنی خوش قسمتی پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ موسوی مع پرنس کے آ گئے۔

مَیں اس کا مقر ہوں کہ مَیں نے اُس وقت موسوی کو بالکل ویسی ہی تیکھی چتونوں سے دیکھا جن سے وہ مجھے گھور رہے تھے۔ پرنس البتہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔ "اخاہ بھئی

دلاّل۔تم یہاں کہاں۔یہ تو تمھارے کام کے اوقات ہیں؟"

مَیں نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ "کام ہی سے آیا تھا۔" لیکن اُس ظالم کے دوبارہ مسکرا دینے پر دل میں کٹ کٹ گیا۔

اسی شرمندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ مَیں پھر اُٹھ کر چلا۔اب کی پھر زینت نے پہلے سے بھی زیادہ اصرار کے ساتھ بٹھایا۔

مَیں نے دیکھا کہ موسوی کو یہ تپاک ناگوار گزرا۔لیکن پرنس نے مسکرا کر زینت ہی کی ہاں میں ہاں ملائی اور مجھے بیٹھ جانا پڑا۔جب چند منٹ بعد موسوی چلنے کے لیے اُٹھے تو زینت یک گونہ بے رُخی سے پیش آئیں اور بولیں کیوں، کیا تشریف لے جایئے گا؟ پھر پرنس کی طرف مڑ کر بولیں۔"اور آپ بھی؟"

اُنھوں نے شرارت سے مسکرا کر جواب دیا۔"ہاں!جی تو نہیں چاہتا لیکن مَیں تو اِن کے ساتھ بندھا ہوا ہوں۔آج کل،اِن کی شاہی ہے نا!"

اس پر ذرا وہ شرمائیں، لیکن فوراً میری طرف متوجہ ہوگئیں، مجھے اس التفات نے کسی طرح اُٹھنے نہ دیا۔اور اس طرح جم کر بیٹھا کہ گو پرنس چٹکیاں لیتے رہے، لیکن مَیں نے جنبش نہ کی۔جب یہ لوگ چلے گئے تو زینت تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہیں، پھر بولیں "میرے سر میں نہ معلوم درد کیوں دفعتاً ہونے لگا۔"

مَیں یہ کہتا ہوا کرسی سے اُٹھا "ہم لوگوں کی بیکار کی باتوں کی وجہ سے!ذرا سر میں ایڈی کلون لگا لیجیے اور آرام فرمایئے۔" اب کی جو چلا تو زینت نے روکا تو نہیں، لیکن پھر ملنے کا وعدہ مجھ سے لے لیا۔اور دروازے تک مجھے رخصت کر گئیں۔

غرض مختلف بہانوں اور موقعوں سے زینت سے پندرہ دن کے اندر کوئی دس بار ملا،اور ہر بار ملنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا!جیسے میری گردن میں پڑا ہوا پھندا اور مضبوط ہوتا جاتا ہے۔لیکن مَیں بجائے اس کے کہ اس کشش اور اِس آگ سے بھاگنے اور بچنے کی کوشش کرتا، پروانہ وار قریب ہوتا جا رہا تھا اور اس پر خوش بھی تھا کہ یوں قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہوں۔شاید نظامِ قدرت وفطرت یونہی ہے۔ورنہ اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔کون مفت میں جل کر جان دیتا اور کون قید تاہل قبول کرتا؟

ایک روز جبکہ موسوی کی شادی کو صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا، مَیں چورنگی اپنے موٹر پر ایک کام سے گیا، اتفاق کہیے یا خوبی قسمت، مس زینت 'وہائٹ وے' کی دُکان سے تنہا نکلتے دکھائی دیں۔ مَیں نے موٹر روک کر صاحب سلامت کے بعد پوچھا "کہاں تشریف لے جانے کا ارادہ ہے؟ چلیے، میں پہنچادوں۔"

وہ بولیں۔ "کہیں نہیں۔ دَم اُلجھ رہا تھا تفریح کرنے نکلی ہوں۔"

مَیں نے موٹر سے اُتر کر دروازہ کھول کر کہا "پھر تشریف لائیے، گھمالاؤں۔" وہ خاموشی سے موٹر میں میرے ساتھ بیٹھ لیں۔ مَیں نے گاڑی وِکٹوریہ میموریل کی طرف موڑ دی۔ ہندوستان میں انگریزوں نے جتنی عمارتیں بنائی ہیں ان میں اس سے زیادہ نہ کوئی اچھی ہے، اور نہ کسی میں تفریح کے لیے اتنے ساماں ہیں۔ لیکن مس زینت نے اُس دن نہ تو تصویریں دیکھیں اور نہ عجائب خانہ، بلکہ گاڑی سے اُتر کر سیدھی پشت کے حصّے پر چلی گئیں اور وہیں سنگِ مرمر کے فرش پر بیٹھ کر اپنے خیالات میں محو ہوگئیں۔

مَیں تھوڑی دیر تو بیٹھا انہیں دیکھا کیا، پھر ان کی افسردگی سے متاثر ہوکر پوچھ بیٹھا کہ "خیریت تو ہے؟ آج یہ آپ پریشان سی کیوں ہیں؟"

میرے سوال پر وہ چونک کر بولیں۔ "جی کچھ نہیں! آج پرنس کی بیوی کے پاس گئی تھی، اُن سے دورانِ گفتگو میں آپ کے دوست کے متعلق کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئیں، جن سے مَیں اِس فکر میں مبتلا ہوگئی کہ والد کا اس شادی پر اصرار کوئی معقول بات بھی ہے یا نہیں۔"

مَیں نے کہا: "اگر آپ مجھے قابلِ اعتبار سمجھتی ہوں تو مجھے بھی وہ باتیں بتادیجیے، شاید مَیں آپ کے فیصلے میں کوئی مدد دے سکوں۔"

مِس زینت بلا پس و پیش کیے بولیں۔ "وہ کہتی تھیں کہ مسٹر موسوی کو عورتوں سے بڑی نفرت ہے۔ اور سارے جہان کی عورتوں کو بُرا سمجھتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر ایسا ہی ہے تو اُنھوں نے شادی کیوں منظور کرلی۔"

مَیں نے دل پر جبر کر کے موسوی کے متعلق کچھ نہ کہا۔ وہ اب تک میرے دوست تھے، ان کے خلاف کوئی لفظ منہ سے نکالنا گناہ تھا۔ اِس لیے جواب کا دوسرا پہلو سوچ کر مَیں نے سوالیہ انداز سے کہا: "آپ کے متعلق بھی تو لوگ مشہور کرتے ہیں کہ آپ کو مردوں سے نفرت ہے؟

وہ متانت سے بولیں ''ہاں شہرت تو غلط نہیں ہے۔ میں یقینی صفتِ ذکور کو عیوب سے بھرا ہوا پاتی ہوں۔ عورتوں کے ساتھ ان کے جتنے روابط و تعلقات ہوتے ہیں وہ سب خود غرضی پر مبنی ہیں۔ بچپن اور عنفوانِ شباب میں اُن سے محبت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اچھے اچھے کھانے کھلاتی ہیں۔ باپ کے غصّے سے بچاتی ہیں اور ہر لحہ صدقے قربان ہوتی رہتی ہیں۔ لڑکیاں غریب دال روٹی کھالیں، لیکن صاجزادے کے ہاں بغیر گوشت، مچھلی، دودھ، دہی کے حلق سے نوالہ نہیں اُترتا۔ بہنیں پیوند دار کرتے، پائجامے، ساڑیاں پہنیں، گھر میں جھاڑو دیں، برتن دھوئیں، چولہا پھونکیں۔ بھائی صاحب اگر صاف ستھرا کپڑا پہن کر، بستہ بغل میں دبا کر اسکول تک چلے گئے تو اُنھوں نے خاندان بھر پر احسان کیا۔ گھر واپس آئے تو وہ فرعونیت، وہ تلاطم، وہ ہنگامہ ہے کہ خدا تیری پناہ! ہزاروں روپیہ باپ کا صرف کر کے کسی طرح بڑھے، جوان ہوئے اب عورتوں کو گھورنا، غزلیں گانا شروع کردیا۔ دوسرے کی بہو بیٹیاں، ٹولے محلّے کی لڑکیاں سب ان کا شکار ہیں۔ والدین نے عاجز آ کر شادی کردی۔ اے لیجیے بیوی کیا آئی زر خرید کنیز آئی۔ بس اس کا فرض ہے کہ ہر وقت ان کا منہ دیکھا کرے۔ میاں کا جو جی چاہے کریں، جو دل میں آئے بکیں۔ وہ منہ نہیں کھول سکتی، وہ محض انہیں کے لیے بنائی گئی ہے۔ نہ اس کے جسم میں روح ہے، نہ اس کے دل میں خواہش، یہ جو پہنادیں پہن لے، یہ جو کھلادیں کھالے۔ نہ اپنی نیند سوسکتی ہے، نہ اپنی بھوک کھاسکتی ہے۔ اگر لڑکے پیدا کیے تو نو مہینے کی بیگار اور پیدائش کے وقت کا احتضار، کافی نہیں۔ جی اب دایہ کا بھی کام کرے، گھر کا کھانا پکائے، بچہ کو دودھ پلائے، میاں کے پاؤں دبائے اور سارے جتن کرے، پھر سیدھے منہ بات نہیں۔ گھر سے باہر نکل ہی نہیں سکتی۔ سر سبز میدانوں کی تازی ہوا کھا ہی نہیں سکتی۔ اسکول، کالج میں پڑھ ہی نہیں سکتی۔ بس گھٹے مرے اور راکشش صفت مردوں کی اطاعت میں جان دے۔ مسٹر دلاّل میں آپ سے سچ عرض کرتی ہوں، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کی صنف نے میری صنف کے سینے پر سوار ہو کر اس کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔''

مجھے مس زینت کی تقریر سن کر موسوی کی تقریر یاد آ گئی۔ وہ سارا منظر، وہ موسوی کا سُرخ چہرہ، وہ نواب زادہ کا منغص ہونا، سب کچھ آنکھوں میں پھر گیا، اور میں بیساختہ ہنس پڑا۔

مس زینت کا گلاب سا چہرہ شنجرفی ہوگیا، وہ جھلا بولیں ''مسٹر دلاّل یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ رونے کی بات ہے! عورتیں گل کہلاتی ہیں۔ انھیں سر پر طرّہ میں لگایئے، گلے کا ہار

بنائیے، کوٹ میں آویزاں کیجیے۔ لیکن خدارا اُنہیں جوتے کے فیتے میں نہ باندھیے۔ مردوں نے تو اس سے زیادہ اُن کی گت بنا رکھی ہے۔ وہ تو اندھے گُل چینوں کی طرح اِن پھولوں کو روندتے کچلتے پھرتے ہیں!"

میری ہنسی اس صاعقہ کی چمک سے خود بخود غائب ہوگئی۔ مَیں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "تو آخر آپ نے شادی کیوں منظور کرلی؟"

وہ سر جھکا کر بولیں "صرف والد کی خاطر۔ مَیں جانتی ہوں کہ اُنہیں یہ رشتہ دل سے منظور ہے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اُن کا دل حد درجہ کمزور ہے۔ اگر میں کہیں انکار کردوں تو اُنھیں اختلاجی دَورہ ہو جائے گا۔ تمام ڈاکٹروں نے سختی سے تاکید کی ہے کہ کسی اَمر میں ان کی مخالفت نہ کی جائے۔ اگر ذرا سا بھی پریشان ہوئے تو دَورہ یقینی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ موت بھی! اِس لیے میں چپکی قربانی کے لیے تیار ہوں۔ لاکھوں کروڑوں قربانیاں ہو چکیں، ایک اور سہی! کسی طرح ان راکششوں کا پیٹ تو بھرے!"

میں نے چپکے سے کہا "میں بھی مرد ہوں!"

وہ شرما گئیں۔ پیشانی پر ننھے ننھے قطرے دُرِ نایاب کی طرح جھلنے لگے۔ پھر خجل آواز سے بولیں "معاف کیجیے گا، مَیں جب آپ سے باتیں کرنے لگتی ہوں تو مجھے کسی قسم کی رکاوٹ نہیں محسوس ہوتی۔ مجھے اس وقت یہ تک یاد نہیں رہتا کہ میں آپ کے منہ پر آپ ہی کی صنف کی برائی کر رہی ہوں، میں بہت شرمندہ ہوں۔"

اِس شرمندگی اور حجالت نے نہ معلوم میرے دل کے ساتھ کیا قیامت ڈھائی کہ مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور مَیں نے دل کی بات یوں پوچھ لی "آپ نے کبھی اس اَمر پر بھی غور کیا۔ کہ آخر وہ کون سی بات ہے، جس کی وجہ سے آپ مجھ سے اِس قدر صفائی سے باتیں کر لیتی ہیں؟ وہ یہ سنتے ہی چپ ہوگئیں اور ان کے چہرے پر رنگ آ گیا۔ نظریں نیچی ہوگئیں۔ جھکی ہوئی گردن اور جھک گئی۔ مَیں نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ "اگر موسوی میرے دوست نہ ہوتے، تو میں بھی کچھ اپنی حالت کہتا!"

انھوں نے دُزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا، آنکھوں سے استعجاب و خوف ٹپکا پڑتا تھا۔ لیکن ان دونوں پر سوال کی کیفیت غالب تھی۔ مَیں نے بھی منہ سے کچھ نہ کہا، صرف گردن ہلا کر ہامی بھرلی۔ ان کی نظریں اور نیچی ہوگئیں اور چہرہ زرد ہوگیا۔ مَیں نے اپنے کوٹ میں

آویزاں پھول کاج سے نکالا اور اُس کی پتیاں نوچ کر اُن کے قدموں کے پاس ڈال دیں۔ اُنھوں نے میری صورت دیکھی، پتیوں کو دیکھا اور چاند سا چہرہ ہاتھوں سے چھپالیا! مَیں نے ان کی طرف سے منہ پھیرلیا اور کانپتے ہاتھوں سے جیب سے سگریٹ نکال کر جلائی اور پینے لگا۔ دو کش کے بعد معلوم ہوا جیسے کوئی گلا گھونٹے دیتا ہے۔ سگریٹ پھینک دی اور ٹہلتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔

کوئی دس منٹ بعد جب مَیں اپنے جذبات پر قابو پا کر پلٹا، تو مَیں نے دیکھا کہ پتیاں غائب ہیں اور وہ اُٹھنے کا ارادہ کر رہی ہیں۔ مَیں نے قریب جا کر پوچھا ''کیا آپ واپس چلیں گی۔'' اُنھوں نے سر ہلایا۔ ہم دونوں ٹہلتے ہوئے چپ چاپ موٹر تک آئے۔ مَیں نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ وہ اب کے میری بغل میں نہ بیٹھیں، بلکہ پچھلی سیٹ پر۔ مَیں انہیں اُن کے بنگلہ تک لا کر پہنچا گیا۔ نہ انہوں نے مجھ سے اندر آنے کے لیے کہا، نہ خود مجھ سے موٹر سے اُتر گیا۔

گھر واپس آ کر مَیں نے دفتر میں ٹیلی فون کر دیا کہ میری طبیعت ناساز ہے مَیں نہ آؤں گا اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سارا دن ٹہل ٹہل کر کاٹ دیا۔ جب ٹانگیں تھک جاتیں، پلنگ پر گر پڑتا، جب قلب کی حرکت تیز ہوتی، پھر وحشیوں کی طرح کمرے کا چکّر لگانے لگتا!''

دوسرے ہی دن صبح کو میاں موسوی میرے پاس پہنچے لیکن عجیب حالت سے۔ نہ سر میں کنگھا کیا گیا تھا، نہ داڑھی بنائی گئی تھی اور نہ ٹائی اور کالر درست کیا گیا تھا۔ عجیب بدحواسی اور وحشت چہرے سے عیاں تھی۔ آتے ہی صاحب سلامت کی جگہ انہوں نے سخت سست کہنا شروع کر دیا۔ مَیں نے اپنے جذبات کو اُبھرنے نہ دیا اور اُن سے متانت سے پوچھا۔ ''کاہے کا غصہ اور کس بات کی خفگی ہے؟ پہلے اسباب شکایت بیان کیجیے پھر گالیاں دے لیجیے گا۔''

وہ دانت پیس کر بولے: ''کیسے بھولے بن رہے ہیں! گویا کچھ جانتے ہی نہیں! کیوں صاحب آپ میرے دوست ہیں نا، دوست؟''

مَیں نے چپکے سے عرض کیا ''جی ہاں، مَیں آج تک اس مغالطہ میں گرفتار تو ضرور تھا۔''

وہ اور خفا ہو کر بولے ''خدا کی مار تمہاری دوستی پر! تم جانتے ہو کہ زینت سے میری پانچ ہی سات دن میں شادی ہونے والی ہے۔ لیکن تم اسے گھورتے ہو، اُس سے تخلیہ میں باتیں کرتے

ہو، اور کل کئی گھنٹے تک اُسے اپنے موٹر میں لیے گھوما کیے!''

مَیں نے پھر متانت سے کہا، لیکن اس میں میرے مخصوص انداز کی جھلک بھی تھی۔ ''تو اِس میں کیا خرابی ہوئی؟ وہ آپ کی منسوبہ ہیں اور آپ میرے دوست۔ میں اُنھیں سیر و تفریح کے لیے یقینی لے جا سکتا ہوں۔ آپ تو ماشاء اللہ مغربی معاشرت کے پیرو ہیں۔ اِس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے؟ دوست کی منسوبہ سے تو اس طرح کا اخلاقی برتاؤ فرض ہے!''

وہ بولے: ''اس طرح چبا چبا کر باتیں کر رہے ہو جیسے کچھ جانتے ہی نہیں! سارا شہر مجھ پر ہنس رہا ہے کہ بی صاحبہ ابھی سے ماشاء اللہ جب اس قدر آزاد ہیں، تو شادی کے بعد نہ معلوم کیا کیا آفت ڈھائیں گی۔ اور یہ سب تمھاری ذات سے، تمھاری وجہ سے!''

مَیں نے کہا: ''مَیں تو مرد ذات ہوں، آپ کے نظریے کے مطابق تو میرا اس میں قصور ہی نہیں۔ اس کی ذمہ دار تو کلیتاً مس زینت ہیں۔ آخر مجھ بیچارے کو آپ کیوں الزام دیتے ہیں؟''

وہ اس پر حد سے زیادہ چراغ پا ہوئے اور اُن کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مار پیٹ کے لیے تیار ہیں۔ مَیں نے بھی لب و لہجے بدل کر کہا۔ ''سنیے حضت۔ میں عورتوں کی صنف کو خدا کی خاص نعمتوں میں سے سمجھتا ہوں، اور آپ نفرت! مَیں نے آج تک آپ کی دوستی کا خیال کیا اور اس سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن مَیں اب آپ سے کہے دیتا ہوں کہ وہ آپ کی خود غرضی اور نفس پرستی کا فدیہ نہ ہوگی۔ مَیں اس سے اظہارِ عشق کروں گا اور اُس کی غلامی میں زندگی بسر کروں گا۔ مَیں اس سے اصرار کروں گا کہ وہ اپنے کو آپ کی قید بیجا سے بچائے، اور میرے گھر کو رشکِ جنت بنائے! اب آپ کا جو جی چاہے کیجیے!

موسوی نے کوٹ کے بٹن کھولے اور مجھے لال لال دیدوں سے گھورنا شروع کیا۔ حیوانیت انسانیت پر غالب آ رہی تھی۔ کیمبرج کا تعلیمی چھلکا اُتر رہا تھا، اور درندگی و وبہمیت کا مغز نمایاں ہو رہا تھا۔ مَیں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا: ''آپ تو ماشاء اللہ بہت پڑھے لکھے ہیں۔ مَیں آپ کے مقابلہ میں جاہل محض۔ جہاں تک مَیں آپ کے نظریہ کو سمجھ سکا ہوں، عورت اس قابل نہیں کہ دو شریف اس کے لیے آپس میں کشت و خون کریں۔ یہ آخر آپ اپنے کو اس وقت اتنا گرانا کیوں چاہتے ہیں؟''

مَیں جانتا تھا کہ میرا ہر فقرہ موسوی کے لیے تیر و نشتر کا کام دے رہا ہوگا لیکن مجھے اس

وقت ان کے ستانے میں مزہ آ رہا تھا۔ اس لیے مَیں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔
''گھر تشریف لے جایئے، نہادھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنئے، پھر ٹھنڈے دل سے میرے اور اپنے معاملات پر غور کیجیے۔ شریفانہ فعل آپ کے لیے یہی ہے کہ آپ اب اس خیال کو ترک کردیں اور زینت کو مجھے حوالے کردیں۔ اوّل تو آپ کو پوری صنف سے نفرت ہے۔ دوسرے آپ خود زینت کو ذلیل وکمینہ خیال کرتے ہیں!''

موسوی نے ایک بار کانپ کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا اور بھرائی ہوئی آواز میں وہ بولے ''بھائی کاظم یہی تو نہیں ہے۔ مَیں تو اس سے اب محبت کرنے لگا ہوں!''

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ موسوی نے میرا رنگ بدلتے دیکھ کر گڑگڑانا شروع کیا۔ ''کاظم! کاظم! خدا کے واسطے دوستی کا کچھ حق ادا کرو۔ ہم لوگ ایک ساتھ پلے، پڑھے اور بڑھے ہیں۔ آج تک کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی کہ کسی کو کوئی شکایت ہوتی۔ کیا اب اتنے دنوں کی دوستی کے بعد ہم میں رقابت بھی ہوگی۔

مَیں سناٹے میں تھا۔ ایک ایک کر کے پادر ہوا، قلعے گر رہے تھے۔ خیالی پلاؤ کا مزہ بگڑا جاتا تھا۔ کیا کہتا۔ وہ کہہ چلے۔

''خدارا تم اب دخل انداز نہ ہو، بنی بنائی بات نہ بگاڑو۔ میرے سارے نظریے زبانی تھے۔ مَیں تم سے سچ کہتا ہوں، مَیں بغیر اس کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ میری زندگی کی ساری مسرتیں، ساری خوشیاں بس اسی کے دم سے وابستہ ہیں۔ اگر وہ نہ ملی تو میرے لیے جینا محال ہے!''

مَیں عجیب مصیبت میں تھا۔ جو کچھ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے وہی مَیں اُن سے کہہ سکتا تھا۔ مَیں اُن سے کہیں زیادہ قابلِ رحم تھا۔ اُن سے غریب، اُن سے کم پڑھا لکھا، اُن سے کمسن، پھر بھی رحم کی اُمید مجھی سے تھی۔ میں اپنی بے بسی پر رو دیا۔ وہ مجھے پسیجتے دیکھ کر اور خوشامد کرنے لگے۔

''دیکھو واللہ اگر یہ شادی نہ ہوئی تو والد، والدہ اور سیٹھ تینوں کی موت ہے۔ پھر مَیں بھی ایسا ہی بے حیا ہوں گا جو جیوں گا۔ ذرا اپنی خواہش کو ایک پلّے میں رکھو اور دوسری جانب یہ چار چار پُر ارمان دل! کس کا وزن زیادہ ہے؟

مَیں کانپ کر کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ عجیب لجاجت سے مجھے دیکھا کیے۔ مَیں نے بالآخر گھبرا کر کہا۔ ''اچھا جو تم کہتے ہو وہی ہوگا، میں کوئی رخنہ اندازی نہ

کروں گا۔ لیکن ایک شرط ہے۔"

اُنھوں نے گھبرا کر پوچھا "وہ کیا ہے؟"

مَیں نے کہا: "وہ مجھے لکھ بھیجیں کہ اُنھیں اس ہونے والی قید سے آزادی منظور نہیں!"

اُنھوں نے تھوڑی دیر غور کر کے کہا۔ "اچھا یہ بھی منظور! آج شام تک خط بھیجوا دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

شام کو نواب زادہ آئے اور بہت دیر تک دنیا کا نشیب و فراز مجھے سمجھاتے اور شرافت و نجابت کے معیار پر لکچر دیتے رہے۔ مَیں نے عاجز آ کر کہا:

"بھئی خدا کے لیے دنیا کے لٹیروں کا ذکر چھوڑو۔ یہاں ہمیشہ قوی کمزور کا گلا کاٹتا ہے۔ صاحبِ زر غریب کو کچل دیتا ہے۔ یہاں نہ شریف بستے ہیں نہ ایماندار، یہ صرف ڈاکوؤں کا نگر ہے، اور ڈاکہ ہی یہاں کا پیشہ ہے۔ اس لیے ان باتوں کو چھوڑو، اگر مس زینت نے کوئی خط دیا ہو تو مجھے دو۔ لکچر نہ دو!"

اُنھوں نے جیب سے ایک سر بمہر لفافہ نکال کر دیا، میں نے جلدی سے اُسے چاک کیا، تو اُس میں میرے پھول کی سوکھی پتیاں رکھی تھیں، اور ایک پرزے پر یہ شعر لکھا تھا:

"عمر بصفیرِ قفس دوام گزشت است
من زمزمہٴ درخورِ گلزار ندانم!"

(کچھ ہنسی نہیں اور......۱۹۳۰ء)

کوڑا گھر

صبح کے سات بج رہے تھے، مسجدوں سے تسبیح وتہلیل کی صدا، مندروں سے ناقوس اور گھنٹوں کی آواز اب نہ سُنائی دیتی تھی، وولن مل کی ساڑھے چھ والی سیٹی بھی کب کی بج چکی تھی۔ مزدوروں کا دَل بھی جاچکا تھا۔ میونسپلٹی کی کوڑا گاڑی بھی اپنا پیٹ بھر کر ڈکارتی سدھار چکی تھی۔ اب سڑک پر سناٹا تھا، اس طرح کا سناٹا جیسا بیوہ کے دل میں ہوتا ہے۔ بھیانک، اُجاڑ، زندگی کے ہنگاموں سے خالی!

دفعتاً اس خاموش سڑک پر گھڑگھڑاہٹ ہوئی اور تین مہترانیاں چھوٹی چھوٹی آہنی ٹھیلا گاڑیاں لیے ہوئے نمودار ہوئیں، اُن کی منزل وہی کوڑا گھر تھا۔ جواب سے پہلے مہتروں کے جھنڈ کو خوش آمدید کہہ چکا تھا۔

مہترانیوں کی پوشاک قریب قریب ایک ہی طرح کی تھی۔ لہنگا، شلوکا، دوپٹہ کثیف، گندہ، متعفن! پھر بھی اُن میں چھیڑ چھل برابر جاری تھی۔

سِنوں میں یوں ہی سا اَل بل تھا۔ تیس، پچیس، بیس۔ بجھتی ہوئی دُھوپ، ڈھلتی ہوئی دُھوپ اور چڑھتی ہوئی! مگر گرمی سب میں تھی۔ کسی میں نرم، کسی میں مدھم، کسی میں تیز!

تینوں آکر اپنی منزل پر ٹھہریں، وہی کوڑا گھر!

ایک ٹھیلے گاڑی سے پھاوڑا نکالا گیا۔ آپس میں ہنس کر بحث ہونے لگی۔ سوال یہ تھا کہ کوڑا گھر میں گھس کر پھوڑے سے گاڑیاں لادے کون؟

سب سے بڑی نے کہا۔ ''آج تو کوڑا اسکھو کی ماں کو لادنا چاہیے۔''

منجھلی بولی۔ ''واہ بھوجی واہ! ہر سٹے مجھی سے محنت لینا چاہتی ہو، رات بھر تمھارے

بھتیجوں اور بھائی کی سیوا کروں، دن بھر تم پھاوڑا چلواؤ! واہ بھوجی واہ، اچھی کہی!''

بڑی نے آنکھ مٹکا کے کہا: ''تو تم رات بھر بھائی کی سیوا کرو ہی کیوں؟ بھڑوا دے ہی کیا دیتا ہے! جب دیکھو تاڑی پی کے اول فول بکتا پھرتا ہے۔ یا پھر ہر چھٹے مہینے تمھارے مرنے کو ایک لڑکا کھڑا کر دیتا ہے!''

چھوٹی ہنس کر بولی۔ ''اور جو سکھو کی ماں ہی کا من چاہتا ہو کہ وہ سکھو کے ساتھ ساتھ منگلو کی ماں بھی بنیں۔ جھگڑو کی بھی اور للّو کی بھی!''

سکھو کی ماں غصّہ کا چہرہ بنا کر اُس کی طرف جھپٹی ''رہ تو جا، پاجی، بانڑی! بانجھ!''

بڑی بولی۔ ''تو اس کے کوئی چیتھڑا بھی نہ ہوا تو اس میں اِس کا کیا دوش؟ رام لال بیچارہ جوان ہوتے ہی چل بسا، اور یہ اب تک یونہی بیٹھی ہے۔''

سکھو کی ماں نے کہا: ''دوش کیوں نہیں؟ سب اسی کا پاجی پن ہے۔ ارے یہ بڑی نٹ کھٹ ہے۔ اِس نے چار حرف ہندی کے جو پڑھ لیے ہیں بس اب یہ شہزادے کی آس لگائے بیٹھی ہے۔ کسی شہزادے کی! اس کے یہاں تو وہی مثل ہے: صورت چڑیل کی اور دماغ پریوں کا!''

جوان مہترانی نے ہنس کر سکھو کی ماں کا ہاتھ تھام لیا، اور کلائی مروڑ کر بولی۔ ''کیوں ری، ہمارا دماغ پریوں کا ہے؟''

وہ چیخی، ''ارے کلائی ٹوٹی! چھوڑ کلائی! بانڑی نگوڑی! بھلا بھینس ہو رہی ہے! ارے، آہ!''

بڑی تالی بجا کے تھرکنے لگی۔ ''ارے سیّاں، میں تورے لگوں پیاں، چھوڑ موری بہیاں، چھوڑ موری کلیّاں، ارے چھوڑ موری کلیّاں!''

سکھوں کی ماں نے کراہتے، آہ آہ کرتے، گالی دیتے ہوئے ایک بار گھبراہٹ کا چہرہ بنایا۔ ''ارے دیکھ، وہ جمیندار آ رہا ہے۔''

جوان مہترانی کے ہاتھ سے منجھلی کی کلائی بالکل اسی طرح چھوٹ گئی، جس طرح نور جہاں کے دستِ سیمیں سے کبوتر چھوٹ گیا تھا۔

وہاں اگر معصومیت، بھولے پن اور سادگی نے گرفت کو ڈھیلا کیا تھا، تو یہاں پیٹ کے

ڈر، نوکری کے خطرے نے! اس نے پلٹ کر دیکھا۔ خالی سڑک اسی طرح دُھوپ میں چمک رہی تھی جیسے کسی بوڑھی بیگم کے سفید بال! دونوں مہترانیاں ہنسنے لگیں۔ اور وہ کھسیانی سی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر جھینپ کے بعد والا غصّہ جھلکنے لگا۔

اس غصّے کی وجہ صرف یہی نہ تھی کہ وہ چرکا کھا گئی تھی اور سکھو کی ماں نے اُسے بیوقوف بنالیا تھا، بلکہ اس غصّے کی تہہ میں ''بانڑی اور بہلا بھینس کے لفظوں کی چبھن تھی، یہ دونوں لفظ کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے، آج اگر اس کے پاس جھگڑو، للّو، سکھو کے ایسے دو چار چوہے ہوتے تو بھلا اُسے کیسے کوئی بانڑی کہتا، کیسے بہلا بھینس پکارتا۔ وہ اس وقت سکھو کی ماں کو تو مزا چکھا ہی دیتی! وہ جھپٹ کے آگے بڑھی۔

بڑی مہترانی پھرتی سے بیچ میں آگئی۔ وہ بات رفع دفع کرنے والے لہجے میں بولی۔

''اب تو تم نے سکھو کی ماں کے ہاتھ مروڑ مروڑ کے توڑ ہی دیے۔ اب تم ہی ٹھیلے بھرو!''

جوان مہترانی نے خاموشی سے پھاوڑا اُٹھالیا۔ کوڑا گھر کا پھاٹک کھولا، لہنگا اُٹھا کر آگے سے سمیٹا اور پیچھے کھونس لیا، پھر وہ کوڑے کے انبار پر بالکل اسی طرح پل پڑی جس طرح معلم سُرخ پنسل لے کر طلاّب کے مضامین کی اصلاح پر جھک پڑتے ہیں!

اس نے ایک منٹ دَم نہ لیا۔ اُس نے چند ہی لمحوں میں تینوں ٹھیلے بھر دیے۔

بڑی اور منجھلی اپنے اپنے ٹھیلے لے کر اس طرف چل دیں جدھر میونسپلٹی پُرانا تالاب پٹوا کر ہریجن نگر بنانے والی تھی۔ وہ دروازہ بند کرنے اور لہنگے اور پاؤں سے گندگی جھاڑنے کے لیے رُک گئی۔ اُس نے کوڑا گھر سے نکل کر لہنگے کا ازار بند کھولا، اور پیچھے کھسے ہوئے حصے کو جھٹکا دے کر آگے لائی اور نیفے کی شکن برابر کر کے کمر بند باندھنے لگی۔

''ارے بھوجی یہ نازک کمر اس طرح نہ کسا کرو، نہیں تو ٹوٹ جائے گی! یہ ایک نوجوان مہتر تھا۔ ٹانگوں میں میلی سی دھوتی، جسم پر پھٹا ہوا کرتہ، گردن میں ایک لال چٹ، اور کان میں آدھی جلی ہوئی بیڑی — سوکھا، بدصورت، ہو بہو مہتر، سر سے پاؤں تک مہتر، بالکل مہتر — مگر جوان — رانڈ کے لیے سانڈ!

جوان مہترانی کمر بند میں گرہ لگاتے ہوئے ٹھنک کر ''تم تو ہمیں چھیڑو گے'' والے انداز میں بولی ''منتو یہ تمھارا ہر سٹّے کا چھیڑنا ہمیں نہیں بھاتا!''

وہ اپنے میلے دانت نکال کر بولا۔ ’’تو بھو جی ہم سے قسم لے لو، جو ہم خالی خولی دِلگی کرتے ہوں، ہم تو تم سے سگائی کرنا چاہتے ہیں۔ تم ہی تو نخرے کرتی ہو — ارے پگلی یہ جوانی کے دن بہت جلد بیت جائیں گے۔‘‘

وہ تنک کر بولی۔ ’’تو بیت جائیں کس کو پروا ہے!‘‘

وہ ذرا متانت سے بولا۔ ’’تم کیا جانو کہ پُرش استری کے ملاپ میں کیسی آگ ہے، جس سے گھر جلتے نہیں، بستے اور بنتے ہیں!‘‘

وہ آنکھیں چمکا کر بولی۔ ’’ارے ہم کچھ نہیں جانتے، پر اتنا جانتے ہیں کہ تم کو شہر میں رہ کے باتیں اچھی بنانا آ گئی ہیں۔‘‘

وہ مسکرا کر بولا۔ ’’ارے بھو جی، ہم بات ہی نہیں بناتے، ہم استری بھی اچھی بناتے ہیں، تم بن کے دیکھ لو!‘‘

وہ لاجواب ہو کر بولی۔ ’’تم کیا ہمیں استری بناؤ گے، ہم تو تمھارے منہ پر تھوکیں بھی نہیں!‘‘

نوجوان مہتر بالکل اُسی شان سے آہستہ آہستہ بڑھا جس شان سے مُرغ نئی مرغی کی طرف بڑھتا ہے۔

مہترانی ’’دیکھو، اچھا نہ ہوگا‘‘ کہتی پیچھے ہٹی۔ مہتر نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی تھام لی۔ ’’کان کھول کے سن لو جی۔ خوشامد سے نہ مانو گی تو میں زبردستی کروں گا!‘‘

وہ آنکھیں پھیلا کے بولی۔ ’’دن دِہاڑے، سڑک پر!‘‘

وہ بے پروائی سے بولا۔ ’’اونہہ، کیا ہوا! پکڑے جائیں گے تو سب یہی کہیں گے کہ مہتر، بھنگی ہے نیچ ذات! جیل بھی جائیں گے تو وہاں بھی یہی کام کرنا ہوگا!‘‘

’’اور میرا کیا ہوگا؟‘‘

’’تم کو سب برادری سے نکال دیں گے۔‘‘

’’ہم کاہیکو نکالے جائیں، تم نکلو!‘‘

’’اچھا تو پھر قول دو کہ آج رات کو بمپلس کے پیچھے ملو گی۔‘‘

’’اچھے آئے قول لینے والے!‘‘

اس نے کلائی مروڑی ''دے زبان!'' شتر گربہ سہی، مگر لب ولہجہ پیار کا اصرار تھا۔ مہترانی اِس طرح ہانپنے لگی جیسے وہ سر پر وزنی بوجھ لادے ایک ختم نہ ہونے والے زینے پر چڑھ رہی ہو۔ مہتر کی آنکھیں اور چمکنے لگیں۔ مہترانی کی پلکیں بھیگ چلیں۔

اتنے میں موٹر کا ہارن سُنائی دیا۔ دونوں نے پلٹ کے دیکھا۔ دُور سے اگلا حصّہ سورج کی کرن میں اس طرح چمک رہا تھا جیسے تاریکی میں جنگلی جانور کی آنکھیں۔ مہتر نے کلائی چھوڑی، آہستہ سے کہا۔ ''آئے گی نا! ہاں کہہ دے! بھگوان قسم ابھی بازار سے تیرے لیے وہ پھڑ کتا ہوا لہنگا خریدوں کہ برادری بھر میں کسی کے پاس نہ نکلے!''

مہترانی نے سر جھکا کر گردن ہلادی۔

مہتر کی باچھیں کھل گئیں، وہ جھومتا ہوا، گنگناتا ہو، چمکتے ہوئے موٹر سے آنکھیں لڑاتا ہوا چل دیا۔ مہترانی اُس کی پیٹھ کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی، کہ آہستہ چلتا ہوا موٹر اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اس پر چھلتی ہوئی نظر ڈالی، آگے کی سیٹ پر ڈرائیور تھا۔ پیچھے کی سیٹ پر تین ہندوستانی عورتیں 'آپ ٹو ڈیٹ' قسم کی۔ انگریزی شان کے بال، گالوں پر پاؤڈر، ہونٹوں پر لالی، کانوں میں ہیروں کے بندے، اور جسم میں خوبصورت ریشمی ساڑیاں۔

مہترانی کو اتنی بیش قیمت ساڑیاں ایک ساتھ دیکھ کر کچھ اچنبھا سا ہوا وہ منہ کھولے، ٹکٹکی باندھے ان عورتوں کو دیکھنے لگی۔ موٹر والیاں مہترانی کی اس حیرت وحسرت بھری نگاہ پر مسکرادیں۔ اُن میں سے ایک نے 'چھی چھی!'' کہا اور موٹر کے باہر تھوک دیا...اور سب نے سینٹ سے بسے ہوئے ریشمی رومالوں سے نتھنے چھپالیے!

مہترانی کا جسم کسی خاص جذبے سے کانپنے لگا۔ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں اس کے پاؤں پر جم گئیں۔ وہ ننگے تھے اور کیچڑ گوبر اور گندگی سے اَٹے ہوئے۔ اُن کی اُنگلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اُن کی جلد پھٹی ہوئی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا، ہتھیلیوں میں جگہ جگہ گھٹّے پڑے ہوئے، انگوٹھی اور چھلے کی جگہ گوڑے اور مٹّی کے گول اور لمبے دھبّے تھے۔ وہ پھر ایک بار کانپی اور اُس نے پھاوڑا زمین پر پھینک کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا!

اُسے خشک سسکیاں سی آنے لگیں، وہ تیورا کے زمین پر بیٹھ گئی۔ بیٹھنے میں اُس کا پاؤں اسی تھوک پر پڑ گیا، جو موٹر والیوں کی طرف سے اُس کی صورت اور اُس کے کام کے صلے میں

انعام کے طور پر ملا تھا، اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کا پاؤں سانپ پر پڑ گیا ہو، وہ جھجک کے پیچھے ہٹی۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر وہ پھاوڑا کندھے پر رکھ کے چند قدم موٹر کے پیچھے لپکی۔ اس نے دیکھا تو وہ دُور نکل گیا تھا، اس نے 'اَخ تھو' کر کے سڑک پر تھوک دیا۔ پھر وہ مسکراتی ہوئی ٹھیلے گاڑی کی طرف آئی۔ اور اُسے ٹھیل کے سڑک پر چلی۔ وہ کوڑے گاڑی کو ٹھیلتی جاتی تھی اور آپ ہی آپ مسکراتی جاتی تھی۔ شاید وہ بمپلس کے پیچھے اپنے کو ایک پھڑکتا ہوا لہنگا پہنے اپنے مہتر شہزادے کے سامنے ناچتی ہوئی دیکھ رہی تھی!

(کچھ ہنسی نہیں اور......۱۹۴۰ء)

کیے کا بھوگ

کنور اِندر بلی سنگھ ریاست لکھن پور کے ولی عہد تھے۔ اٹھارہ برس کا سن، مسیں بھیگتی ہوئی، جوان رعنا، کھیل کود، سیر وشکار کے شوقین، چیفس کالج اجمیر کے طالب علم، بچپن ہی سے محلات کے باہر رہنے کے عادی، کالج کی دوڑوں اور اُچک پھاند میں اوّل آنے والے۔ یہ سب خوبیاں تھیں بس عیب تھا تو ایک اور وہ یہ کہ کان کے کچے تھے۔ آج اگر کسی کے دوست ہیں تو کل اس کے دشمن، جہاں کسی نے کوئی بات دوسرے کے خلاف کان میں ڈال دی، انھیں یقین آ گیا اور پرانے آشنا سے بگڑ بیٹھے۔ اب اس کی سنتے تک نہیں۔ اور نہ کسی طرح صفائی ہو سکتی ہے۔ اس میں ان کا قصور بھی نہ تھا۔ یہ بات اُن کو وراثتاً ملی تھی۔ باپ دادا ہمیشہ کے راجا ''گہے بہ سلامے برنجند و گہے بدشنامے خلعت دہند'' کے مقولہ پر عمل پیرا۔ یہ بھی اپنے اسلاف ہی کے بیٹے تھے، انھیں بھی طوطا چشمی کرنے میں کاہے کا عار۔

باوجود اس اَمر کے، کنور اندر بلی پھر بھی ہم چشموں میں ممتاز تھے۔ اور ریاست کی سوتیلی بہنوں، شراب اور عورت، سے اب تک بیگانہ محض تھے۔ بلکہ اس حد تک محترز تھے کہ ہمسن اور ہم جماعت طلبا اگر دونوں میں سے کسی کی تعریف میں رطب اللسانی فرماتے تو کنور صاحب ان کے مجمع سے اُٹھ کر چلے آتے۔ وہ اکثر اپنی جگہ پر یہ کہتے سنائی دیتے تھے کہ ''میں تو ان لوگوں کی ذہنیتوں سے عاجز ہوں، جب دیکھو اسی طرح کی باتیں ہیں گویا دنیا میں شراب اور عورت کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔''

کنور صاحب کا اخلاقی اور دماغی ارتقا ابھی اسی درجہ تک پہنچنے پایا تھا کہ رواں سال قریب ختم پہنچا۔ اور لکھن پور میں سالگرہ کے جشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس تقریب کے لیے یہ بھی کالج سے گھر بلائے گئے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ سالگرہ کے ساتھ ہی ساتھ رسم منگنی بھی

ہے۔ اوران کی شادی ریاست دیبی پور کے راجہ کی لڑکی کے ساتھ طے پا گئی ہے۔ کنور صاحب نے اپنے مجمع میں تو کسی عورت کے شریکِ زندگی بنانے پر بہت کچھ ناک بھوں چڑھائی لیکن مہاراجہ یا مہارانی کے سامنے خاموشی سے سر جھکا لینے کے سوا کچھ بس نہ چلا۔ مہاراج پہلے ان کے قیافہ سے تو یہ سمجھے کہ ان کو یہ رشتہ پسند نہیں، لیکن جب انھوں نے، ان کے مصاحبوں سے پوچھنے پر یہ سنا کہ کنور صاحب کو عورت ہی سے نفرت ہے، تو وہ بہت ہنسے۔ ایک خاص انداز سے ایک چھٹے گرگے سے بولے۔ ''اچھا تو ذرا کو اس دنیا کی سیر کرادو۔'' اُس نے مسکرا کر جھک جھک کر سلام کیے اور ''بہت خوب مہاراج!'' کہہ کر فکروں میں مشغول ہو گیا۔

جب جوہری اپنے لعل و جواہر بکھیرے اور خود ہی چور اور ڈاکوؤں کو دعوت عام دے تو پھر کمزور فطرتیں اگر فائدہ نہ اُٹھائیں تو کیا کریں؟ حق نمک کا خیال عین ایمان سہی، مگر ایسے وقتوں میں قرین عقل نہیں!

یارِ شاطر کے اشارے، اور احباب کے اصرار پر رام دلاری نامی، دلی والی، کنور صاحب کے خاص کمرے میں بلائی ہی گئی۔ ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی پیشواز زیب جسم، حسن خداداد پر بناؤ سنگار۔ ہونٹوں پر مسی کی دھڑی، آنکھوں میں سُرمہ دنبالہ دار، اُٹھتی جوانی، رسیلی آواز، دلربا ادائیں، لچکتی کمر، اُبھرتا جوبن جب ذرا شوخی سے بہاؤ بتاتی مصاحبین 'ہائے وائے' کے نعرے بلند کرتے۔ کنور صاحب چیں بجبیں، لیکن دل میں اُلجھتے ہوئے بیٹھے دیکھا اور سنا کیے گھنٹہ بھر رقص رہا، پھر کنور صاحب انگڑائی لیتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے رقاصہ نے سلام کیا، ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ انھوں نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھائے اس نے کچھ شرما کر، گھونگھٹ نکال کر 'نظروں کا بان' چلا کر، نوٹ جس ہاتھ سے پائے اُسے چوم لیا۔

غیر صنف کے نفسانی مس میں جو آتشِ سیال مخفی ہوتی ہے، اس کی ایک لہر سی کنور صاحب کے جسم میں دوڑ گئی۔ ان میں ایک عجیب طرح کا اعصابی تموج پیدا ہو گیا۔ انھوں نے اس کی انوکھی کیفیت سے کچھ گھبرا کر، کچھ منفعل، مجمع پر نظر ڈالی اور وہاں سے مضطر، جلدی جلدی دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

رام دُلاری ان کو اس نظر سے دیکھتی رہی، جس سے کوئی مشاق شکاری سے بچ نکلنے والے صید کو دیکھتا ہے۔ اس نگاہ میں اس وقت کے داؤں کے خالی جانے کا افسوس بھی تھا اور آئندہ فتح پانے کی اُمید کی جھلک بھی تھی۔ مصاحبوں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھا ایک نے

آنکھ ماری، دوسرا مسکرایا، تیسرا ہنس پڑا... لیکن یارِ شاطر، مہابیر، ایک ہی گرگِ باراں دیدہ تھا۔ وہ نہ ہنسا نہ مسکرایا۔ نہ رام دُلاری سے بولا، بلکہ سیدھے اس کمرے میں پہنچا، جہاں کنور صاحب بھاگ گئے تھے۔ جھانک کر دیکھا تو وہ اس ہاتھ کو بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں، جسے رام دُلاری نے چوما تھا۔ گویا اس مقام پر اس طرح کی سوزش اور اس عنوان کی ٹیس اُٹھ رہی تھی، جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو یا ناگن نے ڈس لیا ہو۔ جب انھوں نے مہابیر کو دیکھا، تو اس ہاتھ کو شیروانی کی جیب میں چھپالیا۔ وہ مونچھوں مونچھوں میں ذرا مسکرایا، اور بہت ہی ادب سے سلام کر کے بولا ''چھوٹے مہاراج کیا اُسے یہاں بھیج دیا جائے؟''

کنور صاحب اس سادے سے سوال پر اور گھبرائے۔ برسوں کی صنفِ نازک کی نفرت ایک جانب۔ یہ نئی تکلیف دوسری جانب، بیچ میں ان کی قوتِ فیصلہ۔ غریب عجیب کشمکش میں ساکت رہے۔ مہابیر اُلٹے پاؤں پلٹا۔ رام دُلاری کو آہستہ سے قریب بلایا، کان میں کچھ کہا پھر کنور صاحب کے کمرے میں اُسے ڈھکیل کر کواڑ بند کر دیے۔ 'من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم' ہر اشارے سے کہتی داخل ہوئی اور کنور صاحب کے سے ناکردہ کار، نئے نویلے خریدار کے ہاتھ بک گئی۔

رام دُلاری کو کنور صاحب نے تو جو کچھ دیا وہ دیا ہی لیکن خوش مہاراج نے، بیٹے کی پہلی شکست پر مسرور ہو کر، مہابیر اور رام دُلاری دونوں کو مالا مال کر دیا۔ کئی دن بے حد خوش رہے، اپنے مصاحبینِ خاص کے مجمع میں اکثر یہ کہہ کر ہنسی سے بیتاب ہو جاتے تھے۔ ''کنور جی اس جنم میں عورت سے بھاگتے تھے گویا یہ ہم سے بھی نیک ہیں!''

یہ سب تو تھا لیکن مہاراج کو یہ بالکل یاد نہ رہا کہ شکاری جانور کے دانت میں خون لگنا شرط ہے پھر تو خدا کی پناہ۔ کنور صاحب نے ایک ہفتہ مسلسل رام دُلاری سے دل بہلایا۔ پھر مہابیر کے ایک رقیب نے ایک دوسرا مال پیش کر دیا۔ پلاؤ قورمہ چھوڑ کر متنجن مزعفر کی طرف جھک پڑے، اب تو چاٹ پڑی ہر طرح کے میوے چکھنے لگے۔ کبھی باغِ گجرات کا کوئی ثمر نوچکیدہ ہوتا، تو کبھی بستانِ کشمیر کا کوئی گلِ نورسیدہ۔

غرض کنور صاحب، عورت سے متنفر کنور صاحب، ایک غضب ناک خونخوار جانور تھے، جسے نرم گوشت و پوست والے شکار کی فکر رہتی، اور ایک منقار دار طائر تھے جسے ہر چمن میں، ہر طرح کے پھولوں کی جستجو رہتی تھی۔

ایک ماہ گھر پر اس طرح کی زندگی بسر کر کے جو کالج پلٹے، تو یاروں نے دو ہی چار گھنٹے کی باتوں میں بھانپ لیا کہ معصومیت کھو آئے۔ اور اب ان سے بھی کچھ زیادہ ہی تجربہ کار ہیں۔ پرنسپل اور پروفیسروں کے منشا کے خلاف، شہر کی سیر ہونے لگی اور رام دُلاری تھوڑے دنوں بعد وہیں آ کر جم رہی۔

فطرت نے اپنا کام کیا اور رام دُلاری کے پیٹ میں بچہ رہا، اُس کی بوڑھی نائکہ تو پیٹ گرا دینے پر مصر تھی، لیکن رام دُلاری محض کنور صاحب کے ڈر سے نہ مانی، اور کسی طرح نو مہینے کاٹ گئی، دسویں مہینے بچی پیدا ہوئی، نہایت خوبصورت، نکھ سکھ سے درست۔ نائکہ نے کہا ''لو بی بی مبارک اب بڑھاپا بھی چین سے کٹا۔'' رام دُلاری چیں بجبیں ہوئی اور جب کنور شام کو آئے تو ان سے اس نے شکایتاً یہ بات دھرائی۔

وہ غصہ ہو کر بولے: ''حرامزادی کی ناک ہی کاٹ لوں گا، میری بیٹی، راجپوت کی بیٹی کے متعلق ایسا کہتی ہے۔''

نائکہ کی شامت ہی آ جاتی لیکن خیریت یہ گزری کہ اوّل تو وہ اس وقت وہاں موجود نہ تھی، دوسرے رام دُلاری نے انھیں دوسری باتوں میں لگا لیا۔ لیکن افراطِ محبت اور جوشِ ملکیت میں کنور صاحب نے یہ وعدہ کیا کہ وہ دوسرے ہی روز لڑکی کے شانے پر اپنا نام کھدوا دیں گے۔ دوسرے ہی دن اس فن کا ماہر بلایا گیا اور اس ننھی سی جان کے بازو پر 'آئی بی اندر بلی' کے انگریزی مقطعات گود دیئے گئے۔

ادھر یہ تو احباب کو جلسہ دینے کی تیاری میں مشغول تھے۔ اُدھر پرنسپل نے سارے حالات مہاراج کو لکھ کر بھیجے اور ان سے تاکید کی کہ کنور صاحب کو جلد سے جلد لکھن پور میں بلا لیا جائے۔ تیسرے ہی دن کنور صاحب کو حکم ملا کہ ریاست آ ؤ۔ رام دُلاری سے بہت سے وعدے کر کے گھر پہنچے۔ وہاں مہاراج کئی دن بولے تک نہیں اور مہارانی نے بڑی نصیحت کی۔ جب یہ بھی ملول و غمگین دکھائی دیئے، تو مہابیر کے ذریعہ طوائفیں بلا دی گئیں رام دُلاری کے پاس تھوڑا سا روپیہ بھیج دیا گیا۔ اور اسے حکم دیا گیا کہ ''کنور صاحب سے کسی طرح ملنے ملانے یا پرانے تعلقات کو قائم رکھنے کی ہرگز ہرگز کوشش نہ کرے۔''

وہ بیٹی کو حسرت سے دیکھ کر تھوڑا سا روئی، پھر نائکہ کی کہی ہوئی بات یاد کر کے تھوڑا سا مسکرائی۔ پھر آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر بڑے زور سے ہنس پڑی!

پندرہ برس بعد، اندر بلی سنگھ، دلّی وائسرائے سے ملنے آئے، تو خیر سے مہاراج بھی ہو چکے تھے، شراب بھی پینے لگے تھے۔ اور عیاشی کے لیے خاص مصاحبین بھی ساتھ لائے تھے۔ انھی میں سے ایک مصاحب نے شہر سے پلٹ کر، ایک غنچہ ناشگفتہ کی تعریف کی۔ ''مہاراج اس شہر میں ایک مال ہے رام کنور نامی، سارا شہر اس کے گانے کا معترف اور اس کے حسن کا دیوانہ ہے، برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن! دیکھتے ہی جی چاہتا ہے کلیجہ میں رکھ لو! بس سرکار! کیا عرض کیا جائے کیا چیز ہے!'' غرض اس چرب زبانی سے اس کی مدح سرائی کی کہ مہاراج کے منہ میں پانی بھر آیا حکم دیا۔ بلاؤ اور فوراً بلاؤ۔ جتنا مانگے اتنا دو۔ پہلے مجرا ہوئے ہم بھی دیکھ بھال لیں، تو اور باتیں بھی طے ہوں۔''

بی رام کنور آئیں۔ جتنی تعریف کی گئی تھی۔ کچھ اس سے بھی سوا نکلیں۔ بوٹا سا قد، گول بدن، پتلی کمر، صبیح و ملیح رنگ، غزالیں آنکھیں، ہلالی ابرو، گلاب کے پھول سے گال، پتلے یا قوتی ہونٹ۔ غرض ہر عضو دل میں کھبا جاتا تھا۔ مہاراج دیکھتے ہی جھومنے لگے۔ بے ایک گھونٹ پئے دو بوتلوں کا نشہ آنکھوں سے ظاہر ہونے لگا۔ ادھر ساز پر ہاتھ پڑا اور گلا ملایا جانے لگا، ادھر یہ لڑکھڑاتے اُٹھے اور رام کنور کی بغل میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہ گھبرائی لیکن گائے گئی، ابھی اچھی طرح گا بھی نہ چکی تھی کہ انھوں نے نائکہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''آج کی رات ہماری... کتنا؟'' وہ بولی ''سرکار! ایک لاکھ نقد اور پانچ سو مہینہ!'' انھوں نے کہا ''خزانچی سے دلوا دو۔'' اور رام کنور کو گود میں اُٹھائے کمرے میں لے کر بھاگ گئے۔

صبح تڑکے رام کنور ابھی سو رہی تھی کہ مہاراج اُٹھے اور اس محو ناز کو سر سے پاؤں تک جی بھر کے دیکھنے کے لیے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ بال چھٹکے ہوئے تمام تکیہ پر پھیلے ہوئے تھے، گردن ذرا ایک جانب کو جھکی ہوئی تھی، چھوٹا سا دہانہ کھلا ہوا تھا، گلے کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ انگیا مسک گئی تھی اور... اور... کہ اتنے میں ان کی نظر داہنے شانے پر جا پڑی تو دیکھا کہ کچھ گدا ہوا ہے۔ غور سے پڑھا 'آئی، بی' لکھا تھا۔ آنکھیں مل ڈالیں، پھر وہی مقطعات دکھائی دیے۔ تھر تھر کانپنے لگے۔ اسے جلد سے جلد جگایا۔ وہ ناز سے ''اونہہ اب نہ چھیڑو!'' کہہ کر کروٹ لینے لگی۔ انھوں نے زور سے جھنجھوڑ دیا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔

انھوں نے انگلی سے وہ الفاظ دکھلا کر پوچھا ''اس... س... کے... ک... ک... کیا معنی؟''

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''تمھیں یہ آخر ہوا کیا ہے؟ اماں نے مرتے وقت بتایا تھا کہ یہ

میرے باپ کے نام کے حرف ہیں!''

مہاراجہ وہاں سے اُٹھے۔لڑکھڑاتے، گرتے پڑتے، بکس کے پاس پہنچے۔اُسے کھولا اس میں سے ریوالور نکالا۔دو کارتوس رکھے، پلنگ کے پاس آئے۔رام کنور اب تو انھیں خوف زدہ آنکھوں سے دیکھنے لگی۔انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر عجیب بھیانک آواز سے کہا ''ارے تو جانتی ہے کہ میں کون ہوں؟ میں ہی ترا باپ ہوں۔''

رام کنور کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ آہستہ آہستہ جھومنے لگی۔اس انداز سے جیسے اس کی آنکھوں میں ساری دنیا گھوم رہی ہو، اس کے بعد اس نے مہاراجہ کو سر سے پاؤں تک ایک نظر دیکھا اور اس کا حسین چہرہ نفرت سے حد درجہ کریہہ اور بدصورت بن گیا۔اس طرح کا خوفناک کہ مہاراجہ ڈر سے کانپنے لگے۔ابھی یہ کانپ ہی رہے تھے کہ وہ شیرنی کی طرح جھپٹی اور ان کے ہاتھ سے ریوالور چھین کر اس نے ان کے سینے پر فیر کر دیا۔انھوں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑا اور مسہری پر گر پڑے، فیر کرتے ہی رام کنور کا چہرہ بدلا۔نفرت کی جگہ محبت تھی۔لیکن فضا ہی محبت کی نہ تھی۔بیٹی اور معشوقہ کی جگہ! اب باپ عاشق باپ کے چہرے پر حقارت و غصّہ کے آثار تھے وہ رُک رُک کر بولے۔کیا تو...اب...اپنی...جان...بچا...لے گی؟''

رام کنور کا چہرہ پھر بدلا۔اس نے زہر خند کر کے کہا ''نہیں میری رگوں میں بھی راجپوت خون ہے!'' یہ کہتے کہتے اس نے نال اپنے سینے کی طرف پھیری۔گھوڑا گرا دیا، آواز ہوئی...اور وہ سسکتے ہوئے باپ کے قدموں کے پاس گر کر دم توڑنے لگی!

بجھتا ہوا چراغ بھڑک اُٹھا۔مہاراج کی آنکھوں میں آخری چمک پیدا ہوئی۔انھوں نے رُک رُک کہا ''بھگوان...شکر ہے! مجھے میرے...کیے کا بھوگ...اسی جنم...میں...مل گیا!

گائے امّاں

تم بچوں نے کہانی کے لیے کان کھائے ہیں تو اچھا لو سنو!

آنکھوں کی دیکھی کہتی نہیں، کانوں کی سنی کہتی ہوں۔ جھوٹ سچ کا عذاب اصلی کہنے والے کے سر۔ مَیں تمھاری خاطر صرف کہانی دہرانے کی ذمہ دار۔ مَیں نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں جوڑی۔

ایک ملک میں ایک بادشاہ تھا، ہمارا تمھارا خدا بادشاہ۔ وہ بادشاہ بڑا بہادر تھا، وہ اسی لیے اپنے کو سپاہی کہتا تھا۔ اسے اپنی رعایا کا بڑا خیال تھا۔ وہ کبھی محل کے اندر نہ سوتا تھا۔ ہمیشہ محل کے باہر صحن میں خیمہ ڈال کر اس میں آرام کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا سپاہی کو ہمیشہ ہوشیار سونا چاہیے اور رعایا کے حال سے باخبر رہنا چاہیے۔

اُس بادشاہ کے چھپر کھٹ کے پہریداروں میں ایک شخص نادر تھا۔ رات بھر شاہی خیمہ کا پہرا دیتا، دن کو اپنے گھر چلا جاتا۔ اُس نے شہر میں ایک چھوٹا سا مکان لے رکھا تھا، اُسی میں اس کی بیوی رات کو اکیلی اور دن میں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے تھے۔

نادر کی بیوی کے ہاں خوشی کے ڈھنگ دِکھائی دیئے اور نو مہینے پیچھے اُس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ یہ بچی ایسی خوبصورت، ایسی حسین تھی کہ چاند سورج اُسے دیکھ کر شرماتے۔ چاند میں دھبّہ ہے، اس کے مکھڑے میں کوئی نہیں۔ جو دیکھتا بلائیں لینے اور منہ چومنے کو جھک پڑتا تھا۔ ماں باپ دونوں اُس کے عاشق۔ ہر وقت اُس پر جان چھڑکتے اور اس کو کلیجہ سے لگائے رہتے۔ خدا کا کرنا ایسا کہ بچی ابھی سال بھر کی نہ ہوئی تھی کہ نادر کی بیوی بیمار پڑی اور جنت کو سدھاری۔

نادر کو بڑا دُکھ ہوا، رویا پیٹا مگر خدا کی مرضی میں کسی کو کیا دخل۔ اُس کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اِس ننھی سی جان کو کون پالے پوسے گا، کون اُس کی دیکھ بھال کرے گا، کون اُسے وقت پر دُودھ پلائے گا، راتوں کو جب وہ اپنے کام پر جائے گا تو بچی کس کے پاس رہے گی۔ کون اُسے سنبھالے گا۔ مگر محلے والیوں نے اس مصیبت میں اُس کا بڑا ساتھ دیا۔ رات کو کوئی نہ کوئی بچی کو اپنے یہاں سلا لیتا، لڑکیاں اُس کے کپڑے سی کر پہنا دیتیں اور بوڑھیاں اُس کے پوتڑے دھو اور بدل دیتیں۔ دن کو نادر خود یہ سب اپنے ہاتھوں سے کرتا۔

بچی کے دُودھ کے لیے نادر نے ایک گائے خریدی۔ بھورے رنگ کی، چھوٹا سا قد، کالے کالے گھومے ہوئے سینگ، بڑی بڑی کاجل لگی ہوئی آنکھیں، تھن دُودھ سے بھرا ہوا۔ دو مہینہ ہوا تھا بچہ دیئے ہوئے، بچھڑا مر گیا تھا، دونوں وقت ملا کر دو ڈھائی سیر دودھ دیتی تھی۔ بچی کو اس گائے کا دودھ ایسا راس آیا کہ وہ دن بہ دن موٹی تازی اور اچھی تندرست نکلنے لگی۔ مہینے دو مہینے تو نادر نے گائے کا دُودھ دوہ کر بچی کو پلایا پھر تھن میں منہ لگا کر اسے پینے کا عادی بنا دیا۔ گائے بھی ایسی سیدھی تھی کہ وہ بالکل ماں کی طرح پاس آکر کھڑی ہو جاتی اور جب تک بچی چپڑ چپڑ پیتی رہتی وہ چپکی کھڑی رہتی۔ جب بچی شکم سیر ہو کر منہ ہٹا لیتی تو گائے اُس کے پاس کھڑی اس طرح پیار سے دیکھا کرتی جیسے وہ اس کی سچ مچ کی ماں ہے۔

نادر نے بچی کا نام سکندر رکھا تھا۔ وہ رینگی، بڑھی، گھٹنوں چلی، صندل کے پاؤں پر لڑکھڑا لڑکھڑا کر کھڑی ہوئی اور تتلا کے بولنے لگی۔ نادر کو وہ ابا جان اور گائے کو گائے اماں پکارنے لگی۔

اب محلے والیوں نے نادر کو گھیرا۔ ''ہم سب نے مل کر تمھاری بچی تو پال دی، اب وہ ماشاء اللہ اپنے پیروں پر چلنے لگی اور کچھ ہوں ہاں بھی کرنے لگی ہے، اب تم کو چاہیے کہ اپنا گھر بسا لو۔ تم بھی تو کچھ آرام اُٹھاؤ۔ بے گھر والی گھر سُونا رہتا ہے۔''

نادر نے کہا ''سب سے کٹھن وقت تو آپ لوگوں کی مدد سے کٹ گیا، اب ایسی کیا ضرورت آپڑی ہے کہ میں اپنی سکندر کے لیے سوتیلی ماں لا کر بٹھا دوں اور اپنی پیاری بچی کی جان عذاب میں ڈال دوں؟ پھر مرنے والی کو بھولنا بھی ایسا آسان نہیں!''

بڑی بوڑھیوں نے کہا ''سارے رنڈوے مرد یہی کہتے ہیں، مگر ہم لوگ جانتے ہیں کہ مردے کے لیے بیوی کی موت اور کہنی کی چوٹ برابر ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کی ہائے وائے پھر

کچھ نہیں! یہ بھی تو سوچو کہ سکندر بیٹی ذات ہے، اس کا پالنا، اس کی دیکھ بھال کرنا خالی مرد کا کام نہیں۔ تم کو اپنے لیے نہ سہی، اسی کے لیے سہی گھر میں عورت لانا ضروری ہے۔''

غرض سب کے کہنے سننے سے نادر بھی راضی ہو گیا۔ ایک جگہ بات بھڑ گئی اور وہ سکندر کی سوتیلی ماں بیاہ لایا۔ وہ عورت مزاج کی اچھی نہ تھی، بڑی نٹ کھٹ تھی۔ اُس کو چھکے پنجے خوب آتے تھے۔ وہ چھلنی میں ڈال چھاج میں اُڑانا خوب جانتی تھی۔ کچھ دِنوں تو میاں کو شیشے میں اُتارنے کے لیے اُس نے سکندر سے دِکھلاوے کا بڑا چاؤ پیار کیا، پھر اُس نے اپنا رنگ جمایا اور وہ سکندر کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی۔ وہ سکندر سے بھی جلتی تھی اور اُس کی گائے اماں سے بھی۔ اُس کے جلاپے کی وجہ یہ تھی کہ جب نادر گھر میں آتا تو سب سے پہلے وہ بیٹی ہی کو پکارتا۔ کوئی نہ کوئی کھلونا یا مٹھائی کا دونا ہاتھ میں ہوتا۔ سکندر باپ کی آواز سنتے ہی دوڑی ہوئی آتی، وہ اسے گود میں اُٹھا لیتا، پیار کرتا، زانو پر بٹھا کر اسے کھلونا دیتا، اپنے ہاتھ سے اُس کے منہ میں برفی کی ڈلی ڈال دیتا۔ پھر سیدھا سکندر کی گائے اماں کا سر کھجاتا۔ جب نادر بیٹی اور گائے سے اس طرح محبت کی باتیں کر چکتا تب جا کر وہ بیوی کی طرف متوجہ ہوتا اور اُس کی خیر صلاّ پوچھتا۔ بیوی جل بھن کر کباب ہو جاتی۔ بھلا اس سے کیسے دیکھا جاتا کہ نادر کی نظر میں بچی اور گائے کا لاڈ پیار اس سے بڑھ چڑھ کر ہو، اور وہ بالکل تیسرے درجے پر سمجھی اور مانی جاتی۔

اللہ کے کرشمے دیکھیے کہ کلموہی بیوی بھی دو بستہ ہو گئی اور نو مہینے بعد اس کے یہاں بھی لڑکی پیدا ہوئی۔ مگر بیٹی ماں کے کرتوتوں کا پھل تھی۔ کالی کلوٹی اور کالی۔ اب تو اس کے ہاں جلن اور بھی بڑھی۔ بے ماں کی سکندر ایسی خوبصورت، ایسی بھولی بھالی کہ باپ ہی کا نہیں ہر دیکھنے والے کا جی چاہے کہ اسے اُٹھا کر کلیجے میں رکھ لے اور خود اس کی رحیمن کا یہ رنگ رُوپ کہ دوسروں کو کون کہے خود باپ صورت دیکھتے ہی منہ پھیر لے۔ مگر ماںتا تو اندھی ہوتی ہے، اُس کے لیے تو رحیمن ہی چاند کا ٹکڑا تھی۔

نادر کی بیوی نے پہلے تو یہ کیا کہ گائے کا دُودھ سکندر کی جگہ رحیمن کو پلانے لگی۔ ایک تو وہ اب تھوڑا لبی ہو گئی تھی۔ اس پر گائے بھی ایسی سُرتی تھی کہ وہ سکندر کے لیے تھن میں دُودھ چرا لیتی تھی اور جب سکندر اُس کے پاس پہنچتی تو وہ سب سے چھپا کر اُسے پلا دیتی۔ سوتیلی ماں اس سے اور جلنے لگی۔ اُس نے نادر سے سکندر اور گائے کی جھوٹی شکایتیں کرنا شروع کر دیں۔ لیکن نادر چکنا گھڑا بنا رہا۔ وہ سب کچھ ایک کان سے سنتا، دوسرے سے نکال دیتا۔ وہ جھلا کر اپنی جان

کوکوسنے لگتی۔ ''ہائے ہائے ہم بیاہتا تھوڑے ہیں، ہمیں تو کہیں سے نکال بھگا کے لائے ہیں اور نہ رحیمن تمھاری بچی ہے، اسے تو تم نے کہیں گرا پڑا پایا تھا۔ ہم ماں بیٹی تو بس تمھاری چہیتی پر سے صدقے اُتارنے کے لیے رہ گئے ہیں۔ ہم تو اس لاڈلی کی جوتیوں کے برابر بھی نہیں!''

نادر گھبرا کر باہر بھاگ جاتا اور محلّہ والیوں سے شکایت کرتا ''لو دیکھو، جس دن کو میں ڈرتا تھا وہ آگے آیا۔ تمھارے ہی کہنے سے میں یہ بلا اپنے گھر لے آیا۔'' محلّہ والیاں اس کی بیوی کو سمجھاتیں ''دیکھو ایسا نہ کرو۔ اپنی لڑکی کو کم جانو سکندر کو بہت سمجھو۔ یاد رکھو جو کرے سیوا وہ کھائے میوہ۔ باپ بیٹی کو خوش رکھو گی تو میاں بھی خوش رہے گا اور خدا بھی!''

مگر اس پر کسی کے سمجھانے کا کوئی اثر کیوں ہونے لگا۔ اُس کے لیے تو وہی مثل تھی ''جب اوڑھ لی سوئی تو کیا کرے گا کوئی۔'' اس پر وہ کالی رحیمن بھی بہن کی ترائی کرنے لگی۔ آخر وہ بیٹی کس کی تھی، جس کی ماں جلے گی اس کی جائی پہلے جلے گی۔ سکندر رات دن گھر کے کونے کونے میں جھاڑو دیتی پھرتی، ہر چیز قرینے سے صاف ستھری رکھنا چاہتی، یہ پھوہڑ ہر جگہ مٹی اُچھالتی چلتی۔ اِدھر کی چیز اُدھر پھینکتی رہتی۔ اس پر جو کبھی کبھی سکندر آنکھ دِکھاتی، ڈانٹتی تو یہ بھوں بھوں روتی ماں کے پاس دوڑتی ''باجی نے ہمیں مارا ہے، باجی نے ہم سے فلاں چیز چھین لی'' چلو قیامت آ گئی۔ بی اماں دہاڑنے لگیں اور جوتی اُٹھا کر سکندر کو مارنے کو دوڑیں۔ سکندر ایسے وقتوں میں بھاگ کر گائے کے پیچھے پناہ لیتی، وہ فوں فوں کر کے اور سینگ جھکا کر کچھ اس طرح ان ماں بیٹیوں پر جھپٹتی کہ یہ دونوں بھاگ کر کمرے میں پناہ لیتیں۔

اب اس عورت نے میاں سے اصرار شروع کیا کہ اس گائے کو نکال ڈالو۔ اُس نے میری رحیمن کو لات ماری، آج اُس نے مجھے سینگ مار دیا۔ یہ گھر میں رہے گی تو ایک نہ ایک دن ہم میں سے کسی نہ کسی کو ضرور مار ڈالے گی۔ نادر نے کہا ''میری سکندر اس کے دودھ پر پلی ہے، وہ اس کی ماں ہے، تم چاہے جو کچھ کہو اب یہ اس گھر سے مر کر ہی نکلے گی۔''

لیکن گائے بھی یہ روز روز کی جھک جھک سنتے سنتے رُک گئی۔ ایک دن اُس نے خدا سے دُعا مانگی، اے سب کے پالنے والے! اب میں یہاں اپنا کام کر چکی، اب مجھے اس دُنیا سے اُٹھا لے۔ مگر اے مالک! مرنے سے پہلے مجھے زبان دے دے کہ میں اپنی سکندر سے کچھ باتیں کرلوں۔''

پہلا زمانہ بڑا سچا تھا۔ اللہ سب کی سن لیتا تھا۔ اللہ نے گائے کی دُعا سن لی۔ اُس رات

جو سکندر آئی تو گائے نے کہا ''بیٹی سکندر! میری زندگی کے دن پورے ہو گئے، اب میں کل اس دُنیا سے اُٹھ جاؤں گی۔ دیکھو زیادہ رونا دھونا نہیں، ایک دن سب کو مرنا ہے۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ میرا مردہ کہیں اِدھر اُدھر نہ پھینکا جائے۔ تم اپنے ابا سے کہہ کر یہیں اپنے گھر کے پاس کسی گڑھے میں اسے پٹوا دینا، اور جب بھی تم کو کسی چیز کی ضرورت پڑے، مجھے وہیں آ کر پکار لینا، میں تمھاری ہر خواہش پوری کر دوں گی۔''

دوسرے دن ایسا ہی ہوا۔ جب لوگ سو کر اُٹھے تو گائے مری ہوئی ملی۔ سوتیلی ماں اور رحیمن نے بڑی خوشیاں منائیں۔ اچھے اچھے پکوان پکے، مٹھائیاں تقسیم ہوئیں، مگر سکندر ایک کونے میں بیٹھی رویا کی۔ نہ دن بھر اُس نے کچھ کھایا پیا، نہ کسی کام میں ہاتھ لگایا۔ جب نادر آیا، اُس کی بیوی تو کہتی تھی یہ مری ہوئی گائے کہیں پھنکوا دو، مگر سکندر مچل گئی۔ اُس نے اس کا مردہ گھر کے پاس ہی ایک گڑھے میں گڑوا دیا۔

رات کو جب سب پاؤں پھیلائے خرّاٹے لے رہے تھے وہ پلنگ سے اُٹھی اور دبے پاؤں گڑھے پر آئی۔ اُس نے پکارا ''گائے اماں، گائے اماں! دیکھو ان لوگوں نے تم کو مجھ سے چھڑا دیا۔ انھوں نے خوش ہو ہو کر آج بڑے اچھے کھانے کھائے، مگر مَیں نے تمھارے غم میں نہ کچھ کھایا نہ پیا ہے۔ ایک کِھیل بھی تو میرے منہ تک اُڑ کر نہیں گئی ہے۔ لیکن گائے اماں میں بہت بھوکی ہوں، مجھے تم کچھ کھلاؤ۔'' آواز آئی ''بیٹی، لو دیکھو یہ پوری پتیلی پلاؤ سے بھری رکھی ہے، خوب سیر ہو کر کھاؤ!''

سکندر نے جو مڑ کر دیکھا تو بغل میں ایک پتیلی رکھی پائی۔ ڈھکنا جو اُٹھایا تو زعفران کی وہ خوشبو آئی کہ مست ہو کر جھومنے لگی۔ چاول لمبے لمبے مگر باریک، مڑ مڑ کر بالکل چھیلا بن گئے تھے۔ رنگ اور ذائقہ ایسا کہ ایک نوالہ کھانے کو ہو تو چار نوالے کھائے۔ بے بھوک کو بھوک لگ آئے۔ سکندر نے ڈٹ کر کھایا، گائے اماں کا شکریہ اور خدا کا شکر ادا کیا اور پتیلی اور برتن وہیں رکھ دیئے۔ جس طرح وہ اُن کی آن میں آموجود ہوئے تھے اسی طرح غائب ہو گئے۔

اُس دن سے یہی ہوتا رہا کہ جب بھی سکندر کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی وہ سب کی آنکھ بچا کر رات کو گڑھے پر آ جاتی، گائے اماں سے مانگتی اور وہ پوری ہو جاتی، یا جس دن ہتھ چھٹ ماں خوانخواہی کوئی بہانہ ڈھونڈ کر اُس کو مار بیٹھتی تو وہ گائے اماں کے پاس آ کر ضرور روتی۔ گائے اسے تسلی دلاسہ دیتی اور اُس کی ڈھارس بڑھاتی اور وہ خوش خوش جا کر اپنے پلنگ پر لیٹ

کر سو رہتی۔

ایک دن نادر نے آ کر خوشخبری سنائی کہ بادشاہ کے ہاں شادی ہے، تمام خلقت جائے گی، تم بھی جانا چاہتی ہو تو تیاری کرو۔ بیوی نے کہا میں ضرور جاؤں گی۔ اور اپنے اور رحیمن کے لیے بھاری جوڑے نکالے، اُن پر کچھ اور سیا ٹانکا، درست کیا۔ سکندر سے پھوٹے منہ بھی نہ پوچھا کہ بی بی تمھارا بھی شاہی محل میں جانے کو جی چاہتا ہے یا نہیں۔ جب چلنے کا دن آیا تو نادر کے یہ پوچھنے پر کہ کیا سکندر نہ جائے گی وہ جھٹ سے بولی ''ارے ماشاء اللہ سے وہ سیانی ہوئی، اس کا شادی بیاہ میں لے جانا ٹھیک نہیں۔ نہ جانے کس کی کیسی نظر پڑے۔'' نادر کو ناگوار ضرور ہوا مگر وہ چپ ہو رہا۔ جب میاں کے ساتھ سوار ہو کر چلی تو سکندر سے تاکید کر گئی کہ ''دیکھو سویرے ہی سے اندر سے کنڈی بند کر لینا۔ نہ کہیں آنا جانا اور نہ کسی کو مکان میں دھنسنے دینا، نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' سکندر سر جھکا کر چپ ہو رہی۔

جب ماں چلی گئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا تو اکیلا گھر کاٹنے کھانے لگا۔ بچی گھبرائی بھی ڈری بھی۔ دوڑی ہوئی گڑھے پر پہنچی۔ گائے اماں کو پکارا۔ آواز آئی ''کیا ہے بیٹا؟ کیوں گھبرائی ہوئی ہو؟'' اُس نے کہا ''گائے اماں سب بادشاہ کے ہاں شادی میں گئے، مجھے نہ لے گئے۔ اکیلے گھر میں مجھے ڈر لگتا ہے۔'' گائے نے کہا ''تو تم بھی جاؤ شادی میں ہو آؤ۔'' سکندر نے کہا ''گائے اماں میں کیسے جاؤں؟ میرے پاس تو تن ڈھکنے کو ٹھکانے کے کپڑے بھی نہیں۔'' وہ بولی ''تم اس کی فکر نہ کرو۔ تم جاؤ، نہا دھو کر آؤ، میں سب انتظام کیے دیتی ہوں۔''

سکندر نے گھر جا کر نہایا دھویا، کنگھا کیا، پھر وہ گڑھے پر آئی۔ دیکھا تو ایک کشتی میں بہت بھاری جوڑا رکھا ہے اور پاس ہی ایک صندوقچی بھی ہے۔ اسے کھولا تو جڑاؤ گہنوں سے بھری پڑی تھی۔ اُس نے اپنے پھٹے پرانے چیتھڑے اُتار کر رکھ دیئے، وہی جوڑا پہنا، زیور پہنے، عطر لگایا۔ اب وہ حور کی بچی معلوم ہونے لگی۔ آواز آئی ''اب بیٹی خوش خوش بادشاہ کے ہاں سدھارو۔'' اُس نے پوچھا جاؤں کیسے؟ گائے بولی ''ارے تمھاری ڈیوڑھی پر فینس لگی ہے۔ کہار، مہریاں، ماما ئیں، دائیاں سب موجود ہیں۔ تم جا کر دیکھو تو۔'' سکندر چلنے لگی تو پھر آواز آئی ''دیکھو بیٹی، محل میں نہ کسی سے ڈرنا، نہ جھجکنا، نہ خوانخواہی شرمانا۔ اللہ نے چاہا تو سب تمھیں شہزادی سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیں گی۔ ہاں مگر اس کا خیال رکھنا کہ اپنی ماں سے پہلے ہی پلٹ آنا۔ ایسا نہ ہو کہ اسے کانوں کان خبر ہو جائے، ورنہ قیامت ہی برپا کر دے گی۔''

سکندر گھر جو آئی تو اُس نے دیکھا دروازے پر فینس، کہار، کہاریاں، مہریاں، پنکھا، چھاتا، بابی مراتب، کل شاہی سامان موجود ہے۔ سکندر پردہ کرا کے سوار ہوگئی۔ کہاریاں مہریاں پنکھا جھلتی، ہٹو بچو کرتی، فینس کا پردہ پایہ پکڑے ساتھ ساتھ دوڑتی رہیں۔ اس شان سے شاہی محل میں پہنچی۔ بڑے اہتمام سے سواری اُتروائی گئی۔ سب سمجھیں کہیں کی شہزادی آئی ہے۔ سچ ہے اُنڑی میں رُوپ اور بچی میں چھب۔ صورت شکل، چال ڈھال، کپڑے لتے سے ہر طرح وہ شہزادی معلوم ہوتی ہی تھی۔ شہزادیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ملکہ نے اپنے پہلو میں بٹھایا۔ اپنے خاصدان سے نکال کر گلوری دی۔ غرض بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ رات بھر وہ سب کے ساتھ ڈومنیوں کا ناچ دیکھتی اور گانا سنتی رہی۔ ماں محل کی نوکرانیوں کے پاس کہیں بیٹھی تھی۔ اُس کا بھلا ملکہ کی خاص محفل میں کہاں گزر تھا۔ پھر بھی دھڑ کا لگا تھا کہ کہیں وہ اِدھر نہ آ نکلے۔ اس نے صبح تڑکے ہی اپنی سواری منگوائی اور ملکہ سے اجازت لے کر سوار ہونے چلی۔ فینس میں بیٹھتے وقت دُور سے کالی رحیمن کی آواز سنائی دی۔ جلدی سے بیٹھ کر پردے گرا دیئے اور کہاروں سے کہا تیز قدم بڑھا کر نکل چلو۔ اسی جلدی میں ایک پاؤں کی جوتی کہیں گر گئی، گھبراہٹ میں اس کو ڈھونڈنے کی بھی فکر نہ کی۔ گھر پلٹ کر جلدی سے گائے اماں کے گڑھے پر گئی، وہاں جوڑا اور گہنا واپس کیا، ایک جوتی کے کھو جانے کی روداد سنائی اور اپنے چیتھڑے پہن کر گھر میں آ کر جھاڑو دینے لگی۔

اتنے میں اماں جان بھی پہنچیں۔ پوچھا ”ایں، اتنے سویرے سے تم کیسے جاگ گئیں؟“ سکندر نے کہا ”اکیلے میں ڈر لگتا تھا، رات بھر پلک سے پلک نہ لگی۔ پرچھا ہوا تو سوچا لاؤ گھر میں جھاڑو دے کر آگ جلادوں۔ آپ آتی ہوں گی، کچھ ناشتہ کریں گی ہی۔“ وہ بولیں ”ہاں ہم بھی رات بھر جاگے ہیں، جلدی سے روٹیاں سینک لو اور دو انڈوں کا چلاّ تل دو تو ہم ناشتہ کر کے سو رہیں۔“ اور جب سکندر باورچی خانہ کی طرف بڑھی تو بولی ”ارے ہاں، وہ تمھارے باپ بھی تو آتے ہوں گے، اُن کے لیے بھی کچھ پکا لینا۔“ غرض سکندر چولہا جلا کر سب کے لیے ناشتہ اور کھانا پکانے لگی۔

اب اِدھر کی بات اُدھر چھوڑو۔ اُدھر محل کی سنو۔ صبح کو جب مہمان چلے گئے تو ایک ماما کو سکندر کی جوتی پڑی ملی۔ مخمل پر کارچوبی کام کیا ہوا، جگہ جگہ پر ہیرا زمرد ٹکا ہوا اور پنجے کے بیچوں بیچ میں ایک بڑا سا لعل۔ ہزاروں ہزار کی مالیت۔ دو چار روپے کی چیز ہوتی تو ماما اونے پونے

کر کے بیچ لیتی اور ہضم کر جاتی۔ اتنی قیمتی جوتی گھما دینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اُس نے شہزادیوں کو دِکھانا اور پوچھنا شروع کیا۔ ہر ایک نے کہا ہمارے پاس ایسی قیمتی جوتی کہاں۔ ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ بادشاہ کا جوان بیٹا، سلطنت کا ولی عہد آ گیا۔ اُس نے جو جوتی دیکھی تو ماما کو انعام دے کر اس سے لے لی اور وزیر زادہ کو بلا بھیجا۔ اُس سے کہا ''دیکھو وزیر زادے! یہ جوتی کتنی خوبصورت ہے، بھلا سوچو تو وہ کتنی خوبصورت ہوگی جس کے پاؤں میں ایسی جوتی ہوگی۔ میں تو بس اب اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ تم میرے دوست ہو، میری سلامتی چاہتے ہو تو اس شہزادی کو ڈھونڈ نکالو۔ نہیں تو میں اس کے فراق میں تڑپ تڑپ کر جان دے دوں گا۔'' یہ کہا اور اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہا۔

وزیر زادے کو بڑی فکر ہوگئی کہ یا اللہ! کون سی تدبیر کروں کہ اپنے شہزادے کی جان بچاؤں۔ سوچتے سوچتے ایک ترکیب سوجھی۔ اُس نے شہر بھر میں کٹنیوں کو بلا بھیجا اور اُن سے پوچھا تم کیا کام کر سکتی ہو؟ ایک بولی کہ میں پرائی بہو بیٹی نکال بھگا لا سکتی ہوں۔ اُس نے کہا تمھارا کام نہیں اور کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا۔ دوسری سے پوچھا تم کیا کرتی ہو؟ اُس نے کہا میں آسمان میں تھگلی لگاتی ہوں۔ اُس نے کہا تم بہت اُونچی اُڑتی ہو۔ مجھے تمھاری بھی ضرورت نہیں، اور کچھ دے دلا کر رخصت کیا۔ اب تیسری سے پوچھا، وہ بولی میں زمین میں گھس کر جس چیز کی آپ کو ضرورت ہو وہ لا سکتی ہوں۔ وزیر زادے نے کہا بس تمھارا ہی کام ہے۔ یہ کہہ کر وہ جوتی کٹنی کو دی اور کہا یہ جوتی جس کی ہے اُس کو ڈھونڈ نکالو کہ کہاں کی شہزادی ہے اور وہ کیسے مل سکتی ہے۔ یہ کام کر ڈالو تو میں تمھیں عمر بھر کے لیے مالا مال کر دوں گا۔ کٹنی وہ جوتی لے کر بولی ''حضور، اطمینان رکھیں، یہاں سے پرستان تک جہاں بھی وہ ہوگی میں پتہ لگا کر چھوڑوں گی۔''

کٹنی نے اُسی دن سے اپنا کام شروع کر دیا۔ کوئی ٹھکانہ ایسا نہ تھا جہاں وہ نہ گئی ہو۔ کسی امیر رئیس کا گھر نہ بچا جہاں وہ جوتی والی شہزادی کی تلاش میں نہ پہنچی ہو۔ لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ ادھر شہزادہ کا ہر منٹ تڑپ تڑپ کر گزرتا تھا۔ ہر وقت بستر پر پڑا رہتا تھا۔ کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا تھا، سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ وزیر زادہ گھبرا گھبرا کر کٹنی کے ہاں آدمی پوچھنے کو بھیجتا تھا کہ کچھ پتہ چلا یا نہیں۔ وہ کہلاتی کہو اطمینان رکھیں، میں اسے زمین سے کھود کر نکالوں گی۔ شہزادے کو یقین دلائیں وہ مل کر رہے گی۔

ایک دن وہ کٹنی ایک بڑھیا کے بھیس میں کچھ گڑیاں ایک صندوقچے میں رکھ کر اس محلے

میں پہنچی جہاں نادر کا مکان تھا۔ جب محلے کے سارے کھاتے پیتے لوگوں کے ہاں ہو آئی تو دل میں آیا لاؤ ان جھونپڑوں کو بھی دیکھ لوں۔ کہیں گدڑی میں لعل نہ ہو۔ نادر کے مکان میں اندر جو داخل ہوئی تو سب سے پہلے نظر سکندر ہی پر پڑی۔ شہر بھر کی بہویں بیٹیاں دیکھ آئی تھی، ایسی صورت ایک کی بھی نہ تھی۔ دل نے کہا ہو نہ ہو یہی ہے۔ نادر کی بیوی اور رحیمن ہمسائی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ بس کٹنی کو موقع مل گیا۔ اُس نے سکندر کو باتوں میں لگایا اور گڑیاں دِکھانے کے بہانے جوتی کی بھی ایک جھلک دِکھائی۔ وہ بھولی پوچھ بیٹھی "یہ میری جوتی ہے تم نے کہاں پائی؟" کٹنی نے کہا "جھونپڑیوں میں رہنا اور محلوں کے خواب دیکھنا اسی کو کہتے ہیں۔ یہ تو ایک شہزادی کی جوتی ہے۔" سکندر نے کہا "نہیں میرے پاؤں سے بادشاہ کے محل میں گر گئی تھی۔" اُس نے کہا "سچی ہو تو دوسرے پاؤں کی لا کر دِکھاؤ۔" وہ دوڑی دوڑی گئی اور گائے اماں سے دوسری جوتی مانگ لائی۔ کٹنی کو یقین ہو گیا کہ یہی وہ پری ہے جس کے لیے شہزادہ تڑپ تڑپ کر جان دے رہا ہے۔ اُس نے بات بنائی، کہا "یہ جوتی جس نے پائی ہے وہ اسے بیچنا چاہتا ہے۔" سکندر نے کہا "تم اس سے دام پوچھ کر آؤ، جو مانگے گا میں دوں گی۔"

کٹنی نے کہا "بہت اچھا۔" اور صندوقچہ لے باہر بھاگی۔ محلّہ میں دریافت کیا یہ کس کا گھر ہے۔ سب نے بتایا نادر پہریدار کا۔ بس وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی اور شہزادے کے حضور میں حاضر ہو کر بولی "سرکار، میں نے سب پتہ چلا لیا۔ ملکوں ملکوں کی خاک چھانی اور نکلی وہ اسی شہر میں۔ اسی کو حضور کہتے ہیں گود میں لڑکا شہر میں ڈھنڈورا۔"

شہزادہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ بولا "بھلا بتا وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ کس امیر کی بیٹی ہے؟ بیاہی ہے کہ بن بیاہی ہے؟" وہ ہاتھ پھیلا کر بولی "اے ہے سرکار، ایک منہ اور ہزار باتیں، کن کن باتوں کا جواب دوں۔ سب کا جواب دوں گی، مگر سرکار منہ مانگا انعام لوں گی۔"

وزیر زادہ بولا "ارے ہم تیرا منہ موتیوں سے بھر دیں گے، مگر بتا تو کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے؟" مگر وہ نٹ کھٹ بھلا باتوں میں کہاں آنے والی تھی۔ آنچل پھیلائے کھڑی رہی اور انعام انعام کی رٹ لگائے رہی۔ شہزادہ نے وزیر زادہ کو اشارہ کیا۔ اُس نے ہزار ہزار کی پانچ تھیلیاں اس کی گود میں ڈال دیں۔ جب وہ بولی "کیا بتاؤں سرکار، اس کی تلاش میں کہاں کہاں پھری ہوں۔ سارے امیروں رئیسوں کے گھر دیکھ ڈالے کہیں نہ ملی۔ دل نے کہا اب غریبوں کے جھونپڑے بھی دیکھو، بس سرکار کے سپاہیوں میں سے ایک کے گھر گئی اور جاتے ہی

خدا کی قدرت نظر آئی۔ ایک لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ سچ کہتی ہوں میں سمجھی پرستان کی پری ہے۔ کسی طرح آدم زاد نہیں معلوم ہوتی۔ مدرے میں سیندور ملا ہوا رنگ، ہرن جیسی آنکھیں، بید کی طرح لچکتی کمر، وہ چھل بل، وہ رُوپ رنگ کہ بس دیکھتے ہی رہ جائے۔ اس پر سیدھی، نیک، بالکل گائے۔ چہرے پر وہ بھولا پن کہ دیکھتے ہی جی چاہے کہ ہزار جان سے واری صدقے ہو جائے۔ مجھے دیکھ کر صاحبزادی نے کہا، بوا ہم کو بھی گڑیاں دِکھاؤ۔ میں نے گڑیاں دِکھاتے دِکھاتے تہہ میں رکھی ہوئی جوتی کی جھلک دِکھادی۔ بس پوچھ بیٹھی ایں، میری جوتی کہاں پائی۔ مَیں نے پوچھا آپ کی کیسے۔ بچہ تو تھی ہی، فوراً قبول کرلیا کہ میں ہی بادشاہ کی شادی میں اسے پہن کر گئی تھی، واپسی پر پاؤں سے گر گئی تھی۔ میں نے کہاں ایسا ہے تو دوسرا پیر کہاں ہے، وہ دِکھاؤ۔ وہ فوراً دوسرے پاؤں کی جوتی لے آئی۔ اب میں کیا کرتی، بات بنائی کہ جس نے پائی ہے اس سے قیمت پوچھ آؤں۔ اور حضور وہاں سے سیدھی چلی آ رہی ہوں۔"

شہزادے نے کہا "بڑی بی۔ بس اس کا مجھے گھر دِکھادو، میں سارا انتظام کرلوں گا۔"

کٹنی نے کہا "سرکار، وہ آپ کے پہریدار نادر کی بیٹی سکندر ہے۔"

شہزادہ اُٹھ کھڑا ہوا، وزیر زادے نے کہا "میرے سرکار، بھوجھونے کی لڑکی اور کیسر کا ملک، سپاہی کی بیٹی اور شہزادیوں کا جوڑا اور جوتی، بھوس کے جھونپڑے میں پری، کچھ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی بھید ہے۔ جلدی نہ کیجیے، ہوگا وہی جو آپ چاہیں گے، مگر مَیں ذرا ہر بات کی جانچ پڑتال کرلوں۔" شہزادے نے بات مان لی۔ کٹنی کو انعام واکرام دے کر روانہ کر دیا اور وزیرزادہ باپ کے پاس پہنچا۔

وزیر سارا حال سن کر بڑی سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا "بڑی مشکل یہ ہے کہ ولی عہد کی شادی ایک معمولی سپاہی کی لڑکی سے کیسے ہو سکے گی۔" وزیر زادے نے کہا "یہ سب آپ جانئے، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ یہ بیاہ نہ ہوگا تو ولی عہد اپنی جان دے دیں گے۔" وزیر سوچا کیا، پھر اُس نے بیوی کو بلا کر سمجھایا کہ دیکھو مہریوں، کہاریوں، قلمقاریوں کو لے کر فینس پر سوار ہو جاؤ اور نادر کے گھر جا کر اس کی لڑکی سکندر کو اپنے قبضے میں کرلو۔ میں تمھارے پیچھے پیچھے سپاہیوں کے ساتھ آتا ہوں۔ پھر جیسا مناسب سمجھوں گا کروں گا۔"

وزیر بیگم نے ایسا ہی کیا۔ فینس سے اُترتے ہی درّانہ اندر گھس گئی۔ دیکھا تو سکندر باورچی خانے میں بیٹھی کڑھائی میں سالن بھون رہی ہے۔ نادر کی بیوی جھلنگے پر بیٹھی چھالیا کتر

رہی ہے اور اس کی کانی لڑکی زمین پر بیٹھی دھول کے لڈو بنا رہی ہے۔ وزیر بیگم نے سکندر کی طرف دیکھ کر قلمقاریوں کو اشارہ کیا۔ انھوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ نادر کی بیوی یہ ماجرا دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگی۔ جھک کر سلام کر کے پوچھا ''ہم سے کیا قصور ہوا کہ آپ زنانی فوج کے ساتھ اس طرح اندر گھس آئیں۔'' اتنے میں کہاریوں میں سے ایک نے بیگم کے لیے ایک کرسی لا کر رکھ دی، وہ اس پر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے نادر کی بیوی سے کہا ''یہ بتاؤ کہ یہ پری لڑکی کس کی ہے اور تمھیں کہاں سے ملی؟'' اُس نے کہا ''سرکار، یہ آپ ہی کے غلام کی بچی ہے۔ کیا اُس نے کوئی گستاخی یا بدتمیزی کی ہے؟'' انھوں نے کہا ''نہیں، ہمیں اس سے کام ہے، تم اس کے باپ کو بلواؤ۔'' اتنے میں خبر ملی کہ وزیر بھی سپاہیوں، نوکروں چاکروں کے ساتھ آ گئے۔ اب محلے میں نادر کی ڈھونڈیا پڑی۔ وہ سنتے ہی دوڑا ہوا آیا۔ اُس نے وزیر کو جھک جھک کر سلام کیے۔ پھر ہاتھ جوڑ کر پوچھا ''حضور مجھ سے کون قصور ہوا ہے کہ میرا گھر فوج نے گھیر لیا ہے؟'' وزیر اُسے الگ لے گیا ''ارے میاں، تمھارے نصیب جاگے، تمھاری سکندر پر بن دیکھے ولی عہد بہادر ہزار جان سے عاشق ہو گئے ہیں۔ اب تم بادشاہ سلامت کے سمدھی بنو گے۔''

نادر نے کہا ''سرکار، مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔ میری سکندر اور شہزادی، دونوں کا کیا جوڑ ہے۔ میں ایسے جھوٹے خواب نہیں دیکھنا چاہتا۔'' وزیر نے کہا ''اسی لیے تو یہ رائے دینے آیا ہوں کہ آج سے نوکری چھوڑو، شہر سے باہر جا کر رہو، اپنے کو کسی پرائے دیس کا تاجر مشہور کر دو۔ پھر شادی بیاہ کی بات کرو۔''

نادر نے کہا ''حضور، میں ٹکے کا آدمی، ان کاموں کے لیے بڑے روپے چاہئیں، وہ میں کہاں سے لاؤں گا۔'' وزیر نے کہا ''پہلے اپنی سکندر سے تو پوچھو کہ وہ بادشاہ کے ہاں شادی میں جانے کے لیے شہزادیوں جیسا جوڑا اور سامان کہاں سے لائی تھی؟''

نادر گھبرایا ہوا اندر آیا۔ سکندر کو الگ لے جا کر پوچھا۔ اس کی حالت یہ کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ بید کی طرح کانپ رہی ہے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ کیسر کی طرح زرد ہو گئی ہے، پسینے چھوٹ رہے ہیں۔ باپ نے جو بادشاہ کی شادی میں جانے کا حال پوچھا تو اُس نے آنسو بہا کر ایک ایک بات کہہ دی۔ نادر نے تعجب سے کہا ''ارے تو یہ سب تیری گائے اماں کا کیا دھرا ہے۔ وہ اب بھی تیری مدد کو تیار رہتی ہے۔'' اُس نے کہا ''جی ہاں، جو کچھ اب تک اُن سے مانگا وہ ملا۔'' نادر نے کہا ''اچھا تو مجھے بھی وہاں لے چلو، میں ان سے دو بدو باتیں کروں

گا۔"

باپ بیٹی دونوں گڑھے تک آئے۔ سکندر نے گائے اماں کو پکارا۔ آواز آئی "بیٹی میں موجود ہوں۔ بتا کیا چاہیے؟" اُس نے کہا "آج ابا جان ساتھ آئے ہیں، وہ آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔" اور وہ خود شرما کر الگ ہٹ کر دُور کھڑی ہوگئی۔ گائے نے پوچھا "کہیے مالک آپ نے کیسے تکلیف کی؟" نادر نے وزیر کے آنے اور شہزادے سے سکندر کا پیغام دینے کی کہانی سنائی۔ گائے اماں نے کہا میں پہلے ہی دن سے یہ سب جانتی تھی۔ اب آپ بتائیں آپ کیا چاہتے ہیں؟" نادر نے کہا "اس سے بڑھ کر اور خوش قسمتی کیا ہوگی کہ میری سکندر ولی عہد بہادر سے بیاہی جائے، مگر میرے لیے تو یہ ہاتھی سے گنا کھانا ہے۔ میں کیا نچوڑوں گا کیا باندھوں گا۔"

گائے اماں نے کہا "خیر، فقیر کی جھولی میں سب کچھ، پھر سکندر آپ ہی کی نہیں میری بھی بچی ہے۔ میں سب کچھ دیکھ لوں گی۔ آپ وزیر سے کہہ دیجیے کہ آپ آج ہی شادی کا انتظام کریں گے اور شہر کے باہر جو جنگل ہے اسے صاف کرائیے۔ جتنے مزدور لگیں لگائیے۔ سب درخت کاٹ ڈالے جائیں۔ جھاڑیاں صاف کردی جائیں، گڑھے پاٹ دیے جائیں، زمین ہر طرح برابر کردی جائے۔ پھر اچھے سے اچھے اور ہوشیار سے ہوشیار آدمی لگا کر اس شہر سے بھی اچھا ایک شہر بسائیے، اور اس میں میری سکندر کے لیے محل بنوایئے اور باغ لگایئے، اور سب کچھ ایسا ہو کہ کہیں کسی ملک میں ان کا جواب نہ ہو۔ اور ان کاموں کے لیے جتنے روپیوں کی ضرورت ہو وہ ہر شام کو یہاں آکر مجھ سے لے جایئے۔"

سپاہی یہ سن کر خوش خوش وزیر کے پاس آیا۔ اُس نے عرض کیا "حضور، اطمینان رکھیں، میں چھ مہینے کے اندر ہی اس شہر کے باہر دوسرا شہر بناؤں گا تب اپنی سکندر کی شادی بڑے دھوم دھام سے آپ کے شہزادے سے رچاؤں گا۔ اُدھر وزیر اور اس کی بیگم خوش خوش اپنے گھر گئیں اِدھر نادر نے نوکری چھوڑی اور شہر بسانے کے انتظام میں لگ گیا۔ اُس نے ملک کے نامی آدمیوں کو چنا، انھیں جنگل لے جا کر دِکھایا اور محل اور بازار بنانے کا حکم دیا۔ دوسرے ہی دن سے ہزاروں آدمی چیونٹیوں کی طرح اس کام پر پل پڑے۔ ایک طرف جنگل کٹنے لگا، دوسری طرف محل کی دیواریں، نئے شہر کے بازار، نئی نئی سڑکیں بننے لگیں۔ روپیہ ہو تو ہتھیلی پر سرسوں جمائی جاسکتی ہے۔ گائے اماں کا حکم تھا روپیہ پانی کی طرح بہایا جائے اور سارے کام جلد سے

جلد انجام پائیں۔ ویسا ہی ہوتا رہا۔ تھوڑے ہی زمانے میں محل بھی تیار ہو گیا اور شہر بھی بن کر کھڑا ہو گیا۔

اب نادر نے وزیر کو خبر دی۔ جو کچھ ہوا ہے اپنی آنکھوں سے آ کر پہلے دیکھ لیجیے۔ پھر بادشاہ سلامت کو لا کر دِکھلائیے۔ وہ آیا، اُس نے ایک ایک چیز دیکھی اور ہر چیز بہت پسند آئی۔ اور نادر کو تاجروں کا لباس پہنوا کر ہاتھی پر بٹھا کر اپنے ساتھ بادشاہ کے پاس لے گیا۔ اُس نے کہا ''جہاں پناہ! یہ دوسرے ملک کا تاجر ہے، اُس نے اس شہر سے قریب ہی ایک شہر آباد کیا ہے، دیکھنے کے قابل ہے۔ سلطان عالی بھی اگر ایک نظر اسے دیکھ لیں تو اس کی قسمت کھل جائے۔'' بادشاہ نے منظور کیا۔

نادر نے سارے شہر کی آئینہ بندی کرائی۔ بازار خوب سجوائے، جگہ جگہ پر پھولوں سے لدے بڑے بڑے پھاٹک بنوائے اور سارے محل کو اس طرح خوشبوؤں، عطروں سے بسایا کہ معلوم ہوتا تھا دلہن کا کمرہ ہے۔ بادشاہ جب اس شہر میں داخل ہوا تو اس کی رونق، اُس کی بڑی بڑی دُکانیں، دورویہ اس میں رہنے والوں اور کام کرنے والوں کا مجمع، اور نادر کے آدمیوں کی زرق برق وردیاں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جب شاہی سواری محل کے قریب پہنچی تو سلامی کی توپیں داغیں اور سونے چاندی کے سکوں سے بھرے ہوئے طبق سر پر سے نچھاور کیے گئے۔ محل میں اُترا تو جس کمرے میں جاتا ہے ایک سے ایک قیمتی سامان اس طرح ڈھیر کا ڈھیر موجود ہے اور سب کچھ اس سلیقے سے لگایا گیا ہے کہ واہ واہ!..................(نامکمل)

گونگا ہری

ٹھاکر اَجیت سنگھ بہت غصہ میں تھے، اُن کے رئیسانہ غرور کو حد درجہ صدمہ پہنچا تھا۔ اُن کی شرافت مجروح ہوگئی تھی۔ اُن کی خاندانی نجابت کی نظر میں یہ قصور نا قابلِ عفو تھا۔ یہ دھبّا صرف خون بہا کر ہی دھویا جا سکتا تھا اُسے درگزر کرنا بزرگوں کی روحوں سے شرمندہ ہونا تھا۔ انہیں محسوس ہوتا، اُن میں سے ہر ایک ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھ رہی ہے۔ بس اسی وقت فیصلہ ہوگا کہ اسلاف کا پاک خون اب تک اُن کی رگوں میں چھلکتا ہے یا وہ محض نام ہی کے سورج بنسی ہیں۔ بھلا بزرگوں کے وقت کسی شودر کی مجال تھی کہ وہ اُن سے آنکھ ملاتا۔ آنکھیں پھوڑ دی جاتیں، آج لاکھ بیسویں صدی ہو، بدیسیوں کا راج ہو، پر کیا اتنے گئے گزرے تھے کہ ان کی اِکلوتی چاندسی خوبصورت اِندرا کو انھیں کی ریاست میں بسنے والے سنگتراش کا گونگا لڑکا گھورے......اور اُس کی پتھر اور مٹّی کی مورتیاں بنا بنا کر اپنے پاس رکھے!

دیوی اور دیوتا شودر کے گھر میں جانے سے نجس نہیں ہوتے، سورج دیوتا کا عکس گنگا جی اور گندے پانی میں یکساں طور پر پڑتا ہے، اُن سے اُن کی جلا، اُن کی تُرہت، اُن کی پاکیزگی پر حرف نہیں آتا۔ لیکن گندا نالہ آپ سے تو سورج کو اپنے میں نہیں اُتار لیتا، وہی چاہتے ہیں دکھائی دیتے ہیں۔ چاہتے ہیں اپنا منہ بادلوں میں چھپا لیتے ہیں، پھر تم لاکھ چاہو اُن کی جھلک نہیں دکھائی دیتی! پر یہاں تو اس گونگے شودر لونڈے نے، اُن کے چاند کی بے خبری میں اپنے سینے میں اس کی تصویر اُتار لی۔ پھر ڈھٹائی دیکھو کہ چھپائے بھی نہ رہا۔ اُس کی مورتی بنا بنا کے قصبہ بھر میں ڈھنڈورا پیٹتا رہا، گاؤں کے ٹھاکر کی بیٹی اور اس کی طرف نظر اُٹھائے کون کہ سنگ تراش کا لونڈا!!

مانا کہ ابھی اِندرا کا سن ہی کیا تھا، یہی دسواں سال، اور وہ لونڈا ابھی مشکل سے پندرہ

سولہ برس کا ہوگا۔ مورتی بنانا، تصویر بنانا کوئی ایسا عیب نہیں، کسی کا محبت کرنا بھی بُرا نہیں، مگر بعض وقت محبت بھی ذلت محسوس ہوتی ہے، ہندوستانی شرافت اور راجپوتی غیرت یہ سننا بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ بن بیاہی اِکلوتی بیٹی پر ایک شودر لونڈا عاشق ہے۔

انہوں نے اِسی لیے ہری کو پکڑوا بلوایا، دو پیادے اُس کو گھسیٹتے ہوئے لائے۔ پندرہ سولہ برس کا لڑکا گندمی رنگ، سر منڈا ہوا۔ بڑی سی چٹیا۔ دُبلا پتلا، فاقہ کش، چہرا زرد، منہ پر ہوائیاں اُڑتی ہوئی، معمولی سے زیادہ چوڑی پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلکتے ہوئے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں فریاد کرتی ہوئی۔

ٹھاکر صاحب دیکھتے ہی برس پڑے۔ ''کیوں بے... تیری مجال، اتنی ہمّت کہ تو میری بیٹی کی مورتی بنادے اور اُسے گلی گلی کوچے کوچے تشہیر کرے۔''

ہری، گونگا ہری، ہاتھ جوڑ کر غیں غیں کرنے لگا۔ خدا جانے کیا کہتا تھا۔ اپنی بے گناہی کا اظہار مقصود تھا یا جرم کا اقرار، ٹھاکر صاحب نے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ انہوں نے قریب رکھی ہوئی بید کی چھڑی اُٹھائی اور سڑ کا چلے، راجپوتی ہاتھ کی قوت، بید کی لچک اور مضبوطی، ہری کا سوکھا ہوا جسم، معلوم ہوا صندل کے درخت پر کلہاڑے پڑنے لگے۔ وہ یوں ہی خوف سے لرزاں جھکا ہوا تھا، دو چار ہی ہاتھ میں زمین پر جامن کی بودی شاخ کی طرح ڈھیر ہوگیا۔ اور کچھ اس بیتابی، بے چینی اور کرب سے تڑپا کہ دیکھنے والے بھی آبدیدہ ہوگئے۔ ظلم کا چلتا ہوا ہاتھ عواقب کے خیال نے تھام لیا۔ ہاتھ رُکتے ہی ہری بدحواس روتا ہوا اور چوٹ کھائے ہوئے کتّے کی طرح پیں پیں کرتا کوٹھی سے نکل کر بھاگا۔

اُس نے اُس وقت تک دم نہ لیا۔ جب تک کہ قصبے کی سرحد سے باہر نہ نکل گیا۔ وہ اس طرح بھاگا۔ جیسے کبوتر بہری کے پنجے سے چھوٹ کر، اور فاختہ بلی کے منہ سے پھڑ پھڑ کر بھاگتی ہے۔

غرور ونخوت نے بے زبان محبت پر فتح پائی! محبت کی یہ باقاعدہ پسپائی نہ تھی۔ بلکہ وہ سراسیمگی کی بھگدڑ تھی، جو ہندوستانی کی قسمت میں اکثر موقعوں پر مقدر رہی ہے۔ مادیت کے سامنے اکثر روحانیت یونہی بھاگ نکلتی ہے۔ تاریکی اسی طرح آفتاب کو زرد رو بنا کر جھکا دیتی ہے۔ کالی راتوں سے چاندنی اسی طرح فرار کر جاتی ہے، سیاہ و دراز زُلفیں اسی طرح افشاں کی

پتلی لکیر کو ڈھک لیتی ہیں۔ ظلمات اسی طرح آبِ حیات کو چھپا دیتی ہے!

داتا کی دین کی عجیب لیلا ہے۔ جس طرح بخشش اُن سے عجب نہیں، اسی طرح ہر ایک کو تول تول کے دینا بھی اُنہیں کا کام ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے اگر کسی سے کوئی چیز چھین لی۔ تو دوسری چیز دوسروں سے زیادہ دے دی۔ کسان سے ریاست لے لی قناعت دے دی۔ غریب سے امیری لے لی سچائی دے دی! سرمایہ دار سے ایمان لے لیا، عشرت دے دی! پھول کو قوتِ پرواز نہ دی، رنگ و بو عطا کر دیئے! ہوا کو صرصریت تو رنگ و بو غائب، ہیرے کو چمک دی تو مشک کی سی خوشبو نہ دی! بلبل کو چہکنا دیا تو عقابی پرواز غائب، عقاب کو آسمان سے آنکھ لڑانا سکھایا تو خوش گلوئی ندارد!

انسانی خصوصیات پر اگر ایک نظر ڈالیے تو یہاں بھی یہی کیفیت دکھائی دے گی، جہاں عقل کم ہوئی دل بڑا سا دے دیا، جہاں عقل کی زیادتی ہوئی دل کی آواز مدھم پڑ گئی، جس کو آنکھ نہ دی اس کا حافظہ تیز کر دیا۔ جس کا ایک ہاتھ بیکار ہو گیا! دوسرے میں دونوں کی قوت دے دی، جس کے اعضا کمزور ہوئے دماغ تیز ہو گیا!

ہری کو بھی نطق کی عوض ایک خاص چیز عطا ہوئی تھی، ہاتھ میں سنگ تراشی کا خاص سلیقہ اور دماغ میں اسی فنِ لطیف کے ماہرین کا سا مادہ ایجاد۔ وہ ایک بے زبان ناتراشیدہ ہیرا تھا۔ جسے جوہر شناس نگاہوں نے اب تک پرکھا نہ تھا، ٹھاکر صاحب کی چھڑی نے دنیا پر یہ احسان کیا کہ اس ''کوہِ نور'' کو خاکستر سے نکال کے باہر؟

ہری گھر چھوڑ کر بھاگا۔ اپنے قصبہ سے دور تین کوس، پر ایک برادری والے کے ہاں دو تین دن ٹکا۔ ہلدی چونے سے جسم کی لیپ پوت ہوئی، پھر وہاں سے کچھ اوزار لے کر چل کھڑا ہوا۔ راستہ میں سِل کوٹتا، مورتیاں بناتا، بنارس پہنچا۔ وہاں ہم قوموں کے ساتھ کچھ دنوں رہا۔ لوگ اگر اس کی بات نہ سمجھتے تو اپنا مدعا ہندی میں لکھ دیتا۔

اتنی ہندی اسے اِندرا کی محبت نے سیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ سب اس کی کاریگری سے فائدہ اُٹھاتے اور دو روپیہ کا کام لے کر ایک روپیہ دے دیتے۔ وہاں چند مہینے رہ کر اس نے اتنا کما لیا کہ وہ کلکتہ جا سکے۔ ایک ساتھی لے کر اسٹیشن پہنچا۔ اس کی مدد سے کلکتہ کا ٹکٹ لیا اور ریل میں

سوار ہو گیا۔

ہری اس سے واقف تھا کہ کلکتہ میں بنارس ڈویژن کی ایک نوآبادی ہے۔ ہوڑا چلے جایئے۔ آپ کو ہر قوم، ہر پیشہ، ہر مذہب کے اور ہر ضلع، ہر قصبہ کے آدمی مل جائیں گے۔ ہری پُرزوں پر لکھ لکھ کے دریافت کرتا ہوا ہوڑا پہنچ گیا۔ وہاں قصبہ ہی کے ایک شخص کے پاس ٹکا اور کام کرنے لگا۔ ہر روز اپنے کھانے بھر کو کماتا اور شہر میں گھومتا پھرتا۔ تسکینِ قلب ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کا اس اژدہام میں کہیں پتہ نہ تھا۔

ایک دن اسے ایک مجسمہ ساز بت تراش کی...دُکان نظر پڑی، وہ ٹھٹک کے باہر کھڑا ہو گیا، خوبصورت اور حسین مجسمے آئینوں میں سے اپنی طرف بلا رہے تھے، مگر اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی، اس وقت یہاں صاحب لوگ ہیٹ کوٹ پہنے ہوئے نظر آتے تھے یا اُن کی لیڈیاں قیمتی گاؤن زیبِ جسم کیے! اس کو اندر جاتے ہوئے اس سے بھی زیادہ خوف معلوم ہوتا تھا، جتنا کہ کالی جی کے مندر میں معلوم ہوا تھا۔ دیوی جی تو پھر بھی ذرا دیر میں خفا ہوں گی، ممکن ہے اسے شودر سمجھتے ہوئے بھی اس کے گونگے پن کی وجہ سے اس کی جسارت معاف کر دیں۔ لیکن یہ انسان جانتے ہوئے بھی کالا آدمی کہہ کر ممکن ہے مار بیٹھیں۔ پھر اگر یہی معلوم ہو کہ یہ لوگ ماریں گے ہی، تو کوئی ایسی بات نہیں، جو پیٹھ ٹھاکر صاحب کی بید کی مار کھا کر نہ ٹوٹی تھی۔ وہ دو چار گھونسوں یا ٹھوکروں سے کیا ٹوٹے گی، خوف جو تھا وہ سزا کی صورت کے عدم تعین کا۔ نا معلوم کا ڈر، انسانی دل کو موت سے بھی زیادہ لرزاں کر دیتا ہے۔ ہری کو کیا معلوم کہ اگر ایک گونگا سنگ تراش میلا سا کرتا پہنے، میلی سی دھوتی باندھے، ایک تھیلے میں اپنے اوزار کاندھے پر لٹکائے، ننگے سر، اُن کی دُکان میں داخل ہو، تو صاحب لوگ اس سے کیونکر پیش آئیں گے۔ ڈر کہتا یہاں سے بھاگ چلو! آرٹ کی کشش قدم اُٹھنے نہ دیتی یہ اسی حیص بیص کی دلدل میں پھنسا گھنٹوں یونہی دُکان کے باہر کھڑا دیکھتا رہا۔ پچیسوں آدمی کالے اور گورے آئے گئے، دُکان میں سے کچھ خریدا، کچھ آرڈر دیئے۔ مگر یہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ مالک دُکان نے جو ایک بنگالی تھے، اس کی یہ کیفیت محسوس کر لی اور آدمی بھیجا کہ اندر بلا لاؤ۔ ہری ڈرتا سہمتا اندر گیا۔ انہوں نے پوچھا۔ "تم کیا چاہتے ہو، کیوں اتنی دیر سے باہر کھڑے ہو؟"

ہری نے غیں غیں کر کے اِن پر اپنا گونگا پن ظاہر کیا، اُسی کے ساتھ اشاروں سے بتایا

کہ وہ خود سنگ تراش ہے اور اُن کے ہاں کے مجتسمے دیکھنا چاہتا ہے، دُکاندار چونکہ خود صناع تھے، اس لیے انھوں نے اس کشش فن کو محسوس کر لیا، جو اس وقت ہری کو اُن کی مورتیاں دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ خود اُٹھ کے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ہری کو مجسّمے دکھانا شروع کیا۔ وہ ہر مجتسمے پر ٹھیک اسی مقام پر انگلی رکھ دیتا۔ جہاں باریک اور نازک کام کامیابی سے بنایا گیا ہو۔ گو وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکتا مگر اس کے چہرے کی چمک، مالک دُکان کے لیے روحانی مسرّت کا اتنا سامان بہم پہنچا رہی تھی، جو شاید اُن کی عمر بھر کے لیے کافی تھا۔ آرٹ صاحبِ فن سے داد چاہتا ہے، یہ وہ بھوک ہے جو فن سے نا آشنا حضرات کی معمولی تعریفوں سے نہیں سیر ہوتی، یہ وہ پیاس ہے جو آرٹ سے ناواقف نہیں بجھا سکتا، مونی موہن بابو کی یہ بھوک اور یہ پیاس آج ایک کندہ ناتراش، دیہاتی سنگ تراش، صرف اپنی انگلیوں کے اشارے اور چمکتے ہوئے چہرے سے بجھا رہا تھا، جو اُن کے نزدیک اُن کے آرٹ کے اعلیٰ ترین نمونے تھے، بالآخر وہ اُسے ایک مورتی کے پاس لے آئے جس پر انہوں نے ایک سیاہ غلاف ڈال رکھا تھا۔ یہ اُن کے فن کی تکمیل تھی، انھوں نے ہری سے کہا: ”دیکھو یہ چیز دیکھو“ اور ڈرامائی انداز سے وہ غلاف اُلٹ دیا۔ ایک مرمری مجسمہ تھا۔ نسائیت کا مجموعہ ُ حسن صورت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی شرم وحیا کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اجودھیا کی وضع کی ساڑی پہنے گھونگھٹ نکالے، لجانے شرمانے میں بھی ایک شانِ خودداری عیاں! نیچے لکھا تھا۔ ’سیتا!‘ ہری نے ہاتھ جوڑ کر مورتی کو پرنام کیا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ انگلی کے اشاروں سے چہرے کے کٹ، ساری کے بل ٹانگوں کی تراش کی تعریف کی مگر پاؤں کی انگلیوں پر آ کر ٹھٹک رہا۔ مونی بابو نے پوچھا کیا ہے؟ کوئی عیب ہے؟ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف چہرے سے وہ پچھلی بشاشت جاتی رہی، مونی بابو کو محسوس ہوا کہ واقعی انگلیاں بھدّی ہیں، وہ ایسی عورت کی بن گئی ہیں جو تمام عمر ننگے پاؤں چلی ہو، حقیقت خواہ یہی ہو لیکن اس سے اس تخیل کو ٹھیس لگتی ہے، جو سیتا کے نام کے ساتھ ہندوستانی دماغوں میں راسخ ہے۔ ہری اس درمیان میں وہیں فرش پر بیٹھ گیا تھا، اس نے اپنے تھیلے میں سے ٹٹول کر ایک چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی مورتی کوئی آٹھ اِنچ بلند نکالی۔ اس نے کپڑے کی دھجیاں الگ کر کے وہ مجسمہ سیتا کی مورتی کی بغل میں رکھ دیا۔ ایک دس برس کی ہندوستانی گھر کی شریف لڑکی تھی، بلا کا تناسبِ اعضا، بھولا پن، الھڑپن، چلبلا پن، شوخی شرارت، معصومیت، نسوانیت، بچپنا

ہر شئے اکٹھا، پھر عضو عضو سانچے میں ڈھلا ہوا، یہ محسوس ہوتا تھا کہ صانع نے اس ایک مورتی پر برسوں ریاضت کی ہے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے ہر دم اسی کے خیال میں محو رہا ہے۔ اس لیے کہ اس میں وہ حسن تھا، جو تخئیل ہی بخش سکتی ہے، وہ لطافت تھی جو عشق ہی عطا کر سکتا ہے۔ اور وہ طہارت تھی جو ایمان واعتقاد ہی میں دستیاب ہوتی ہے! تھی تو پتھر کی۔ مگر معلوم ہوتا تھا اب بولی اب بولی بس تبسم پنہاں قہقہے کی آواز میں تبدیل ہوا ہی چاہتا ہے! مونی بابو اپنی مورتی بھول گئے، انھوں نے اس مورتی کو اُٹھا لیا، دیکھنے لگے، دیکھتے رہے... اُن کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ تصویر کسی قدیم، بے نظیر، ہندی صناع کی بنائی ہے، شاید گپت زمانہ کے اُن استادانِ فن میں سے کوئی ہو، جنھوں نے اجنتا میں غیر فانی کمالات کے نمونے چھوڑے ہیں۔ انھوں نے ہری سے گھبرا کر پوچھا۔ ''تم نے یہ مورتی کہاں پائی؟'' اُس نے اپنی طرف اشارہ کیا کہ مَیں نے بنائی ہے!

اُن کو یقین نہ آیا۔ بولے ''تم نے، ارے تم نے؟''

ہری مسکرا دیا۔ اُس نے اپنی اوزار تھیلے سے نکالے اور قریب ہی پڑے ہوئے سنگِ مرمر کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا اُٹھا لیا۔ مونی بابو نے سیتا کی تصویر پر کپڑا ڈال دیا، دُکان پر کام کرنے والے آدمیوں میں سے ایک کو بلا کر کہا۔ ''تم لوگ گاہکوں کو دیکھنا اس گوشے میں کوئی نہ آئے'' انھوں نے ایک اوٹ لا کے اس طرح کھڑا کر دیا کہ وہ حصّہ دُکان سے علیحدہ تخلیہ کا مقام ہو گیا اور خود سگار جلا کے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

ہری تین گھنٹے مسلسل مورتی بنانے میں لگا رہا، ہاتھ اس قدر صفائی اور نرمی سے چلتا تھا کہ مونی بابو کو حیرت ہوتی تھی، وہ خود ہندوستان کے سب سے بڑے بت سازوں میں سے سمجھے جاتے تھے، اُنھوں نے اب تک بلا مبالغہ ہزاروں مجسّمے بنا ڈالے تھے۔ مگر اس لڑکے کی سی پتھر میں زندگی پیدا کر دینے کی صلاحیت ان میں مطلقاً نہ تھی۔ پھر لطف یہ کہ نہ تو کہیں ناپا، نہ نشان بنائے اور نہ جس کی مورتی بن رہی تھی وہ ہی سامنے تھی۔ تین گھنٹہ میں دوسری مورتی تیار تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ پہلی مورتی سی بات اس میں ہو بہو پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن چند گھنٹوں کے کام نے موہنی بابو کو اس اُمر کا یقین دلا دیا کہ پہلی مورتی بھی اسی گونگے ہی کی بنائی ہے۔ ان کے دل نے تسلیم کر لیا کہ اس سے بڑا صناع ہندوستان نے اس وقت تک نہیں پیدا کیا۔

مونی بابو کی آنکھوں نے اپنی بین الاقوامی شہرت، کمال اور فن میں مہارتِ تامہ اس

جاہل گونگے دیہاتی کے قدموں میں ڈال دی، کلک قدرت نے اپنی خوبیاں، اپنی صلاحیتوں اس کے بھدّے ہاتھوں میں منتقل کر دی تھیں۔ اُن کا کمال مصنوعی تھا۔ اِس کا خلقی و وہبی ان کا انسانی تعلیم کا نتیجہ تھا، اس کا قدرت کا ودیعت کردہ! مقابلہ جسارت تھا اور غیظہ کمی ایمان کی دلیل۔ انہوں نے ہری کو گلے سے لگالیا، بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''میرے ساتھ رہوگے؟'' وہ کھلتی ہوئی کلی کی طرح مسکرایا۔ حاجی کے لیے کعبہ میں اقامت کی دعوت تھی، یاتری کے لیے کاشی میں رہنے کی استدعا، تھکے ماندے مسافر کے لیے منزلِ مقصود میں قیام کرنے کی خواہش، داتا کے دین کی لیلا!

ہری نے مونی بابو کا پاؤں تھام لیا!

پھسلتے ہوئے برف کے ٹکڑے کو پہاڑ کا سہارا مل گیا!

مونی بابو نے نہ شادی کی تھی، نہ اُن کے کوئی اولاد تھی، انھوں نے ہری کو لڑکے کی طرح رکھا۔ انگریزی معلموں سے بہترین تعلیم دلوائی، بڑے بڑے ڈاکٹروں کو گونگے پن کے علاج کی طرف متوجہ کیا، بالآخر اسے اپنے ساتھ امریکہ لے گئے۔ وہاں کے مشہور ترین سرجن نے گونگے کو زبان بخش دی۔ ہری ایک ہلکی سی ہکلاہٹ کے ساتھ بولنے لگا۔ مونی بابو کو دونوں جہان کی نعمتیں مل گئیں۔ انھوں نے مادرِ ہند کے سب سے بڑے سنگتراش کو معرکۃ الآرا غیر فانی مجسّمے دکھائے، دنیا کے عظیم ترین صنّاعوں سے ملاقاتیں کرائیں اور اُن کی دُکان میں ہری کے آنے کے ٹھیک دس برس بعد اُسے ایک مکمل انسان بنا کر ملک و قوم کی خدمت کے لیے ساتھ لے کر پلٹے۔

وہی دُکان تھی وہی مونی بابو اور وہی ہری، شخصیت وہی رُوح وہی جسم وہی، لیکن دماغ جو پہلے ایک ناتراشیدہ ہیرا تھا۔ اب ایسا مجلی، اتنا درست، اتنا خوش آب بن گیا تھا کہ مادرِ ہند کی درخشاں پیشانی پر آویزاں کیا جا سکتا!

اُن کی دُکان پر اب کلکتہ ہی کے آرڈر نہ آتے تھے، بلکہ تمام ہند کے، اقصائے عالم کے، جو چیز پیرس و اطالیہ، انگلستان و جاپان میں میسّر نہ تھی، وہ اس کلجگ میں بھی ہندوستان، پیارے ہندوستان کو ہری کی بدولت نصیب تھی۔ حسن اُس کی جاگیر تھا، تخیل اس کی ملکیت، صنعت اس کی لونڈی اور سنگ تراشی اس کا آلۂ کار! وہ دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیاں

بناتے بناتے خود ہی دیوتا بن گیا تھا۔ لوگ اس کا نام لیتے، تو اسی عزت، اسی محبت اور اتنے ہی احترام سے، جیسے دیوتاؤں کا۔ اُسے خوش ہونا چاہیے تھا۔ اُسے گھمنڈی ہونا چاہیے تھا۔ اُسے اپنے پر ناز ہونا چاہیے تھا۔

لیکن...

لیکن جب دن بھر کے تخلیقی کاموں، اور ہزاروں آدمیوں سے طرح طرح کی تعریفیں سننے کے بعد، وہ اپنے کمرے میں جاتا، تو سرہانے کے طاق پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹاتا۔ ایک دس سالہ لڑکی کے مجسمہ کو حسرت سے دیکھتا، عقیدت کے پھول چڑھاتا۔ محبت کی شمع جلاتا اور گھنٹوں کی پرستش کے بعد اپنے دل میں ایک روحانی تسکین محسوس کر کے سو رہتا۔ صبح سویرے جب چڑیاں بیٹھے سروں میں چہکنا شروع کر دیتیں، مسجدوں سے اذان اور مندروں سے گھنٹوں کی آواز سنائی دیتی، آنکھیں بند کیے طاق تک آتا، اپنی دیوی کے چہرے پر سب سے پہلے نگاہ کرتا، ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا، اُس کے چہرے کی مسرّت سے خوش ہو کر اپنے میں نئی نئی طرح کی قوتیں محسوس کرتا۔ اور دنیا کے لیے کوئی نادر ہدیہ تیار کرنے چلا جاتا تھا۔

مونی سا سرپرست سر پر تھا۔ ہاتھ میں صناعی کی بے انتہا قوت تھی، دنیا کے ہر گوشے میں نام تھا۔ پھر بھی دل خالی تھا، خیال تصویر میں اپنے چہیتے رنگ بھر دیتا تھا۔ لیکن شباب کی گرمی، نسائیت کی آتشِ سیّال مفقود تھی، روح اپنا شریک اپنا جوڑا ڈھونڈھ رہی تھی وہ بات مورتی میں کہاں؟

ایک دن دُکان کے سامنے ٹیکسی آ کر رُکی، اِندرا ہمہ حسن، ہمہ شباب، ہمہ رعنائی بنی ہوئی اُتری۔ ٹھاکر صاحب بھی ساتھ تھے، بیٹی گریجویٹ ہو چکی تھی شادی کی فکر تھی، خواہشمندوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن اُسے کوئی پسند نہ آتا تھا، خود نہ سمجھتی تھی کہ کیا چاہتی ہے۔ بس ایک خلش تھی جیسے دل کا مندر سونا ہو، لاکھ تصویریں اس میں رکھو۔ لیکن کوئی ٹھیک نہ اُترتی، پرمیشور نے کوئی دیوتا اس کے لیے بھی ضرور بنا رکھا ہے۔ مگر وہ کہاں ہے، اس کا علم نہیں؟ جگہ جگہ بوڑھے، انگلیوں پر ناچنے والے، باپ کو لیے پھرتی، جستجو اپنے دل کے دیوتا کی تھی، بہانہ بڑے شہروں کی سیر کا تھا۔ کلکتہ اِسی لیے آئی تھی، پھر وہاں آ کر مونی بابو کی دُکان نہ دیکھنا، ہری بابو مجسمہ ساز کی زیارت نہ کرنا، ایک فنّی معصیت ہوتی جس کا ارتکاب اِندرا ایسی صاحبِ ذوقِ سلیم، تعلیم یافتہ

خاتون سے ناممکن تھا۔

وہ ٹھاکر صاحب کو لیے ہوئے دُکان میں داخل ہوئی، ہری اس وقت ایک عیسائی کی فرمائش سے حضرت مریم کا ایک مجسمہ تیار کر رہا تھا۔ وہ تخیل پر زور دے کر اُس بت کے خط و خال میں حد درجہ معصومیت پیدا کر رہا تھا، کہ دفعتاً نگاہ اُٹھی اور اِندرا نظر آئی۔ معلوم ہوا جیسے دیوتاؤں نے فردوس نگاہ کے لیے کوئی اندر کے دربار کی پری بھیج دی ہے۔ وہ اسے نصف منٹ تک نہ پہچان سکا، کلی پھول بن گئی تھی، ہلال بدر کامل ہوگیا تھا۔ صبح کا شخبرفی آفتاب اب مہر نصف النہار تھا، آنکھوں کی خیرگی آہستہ آہستہ رفع ہوگئی، دل نے پہلے ہی پہچان لیا تھا، اب آنکھوں نے بھی اچھی طرح دیکھ لیا، سر سے پاؤں تک، دل، زُلف سیاہ کے ہر بال میں، خط و خال کے ہر بانکپن میں ساڑی کے ہر بل میں، بیل کے ہر پھول میں اٹکتا رہا، بارے پورا سر وقد دیکھ لیا گیا، نظر قدموں میں آ کر جم گئی، وہی کنول سے پاؤں، جن کا مثل نہ بنانے کی وجہ سے مونی بابو سے تعارف کی ابتدا ہوئی تھی۔ دل وہیں لوٹنے لگا۔ مونی بابو نے اِس درمیان میں آنے والوں کا استقبال کرلیا، اُن سے ٹھاکر صاحب کی شناسائی تھی، انھوں نے بے تکلفانہ اِندرا کی ہری سے ملنے کی خواہش کا ذکر کیا۔ مونی بابو نے ہری کو پکارا، کچھ یہ بڑھے کچھ وہ، تعارف ہوگیا، نہ تو اُنھیں اِندرا نے پہچانا اور نہ ٹھاکر صاحب نے البتہ...

البتہ اِندرا کی بار بار دُزدیدہ نگاہی یہ کہتی کہ وہ اپنے من کے مندر میں اِس دیوتا کو مختلف صورتوں سے بٹھا کر دیکھ رہی ہے، کسی فیصلہ پر، نتیجہ پر پہنچنا ہی چاہتی ہے مگر دُکان پر اس کا قطعی طے کرنا محال تھا، ہوٹل کے کمرے کی تنہائی میں رات کے سونے کے وقت، پلنگ پر کروٹیں بدل بدل کر یہ مرقع مختلف زاویوں سے دیکھا جاسکتا تھا، اِندرا نے اِس کی کوشش کی، تقریباً ہر روز اب دُکان پر آتی، ایک نہیں کئی مورتیاں بنوائی جارہی تھیں، بظاہر اُن کے متعلق کوئی نہ کوئی بات بتانا، اُن کی تیاری کی مختلف منزلیں دیکھنا ضروری تھا، لیکن اصل میں ہری بابو کی شستہ ورفتہ، علم و ہُنر سے بھری ہوئی گفتگو میں، ہلکی سی ہکلاہٹ کی آمیزش سننا پسند تھا، جب وہ ہکلاتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ دودھ اور شہد کا چشمہ رواں ایک ہلکے سے پتھریلے ٹکڑے سے اُلجھتا ہوا گزر رہا ہے، اس میں وہی دلآویزی تھی جو بڑے گویوں کے ہاں ٹکری میں پیدا ہوئی ہے، وہی جو پیارے صاحب کے ریکارڈ میں 'منادی' کے لفظ میں موجود ہے۔ یہ ہکلاہٹ ویسی ہی بھلی۔ اتنی ہی

رسیلی، اسی قدر دلفریب تھی جتنا کہ چھوٹے بچوں کا تتلانا۔ علم و ہنر کے ساتھ معصومیت کی یہ آمیزش من موہے لیتی تھی، اِندرا جس چیز کی اتنے دِنوں سے جستجو کر رہی تھی وہ اس نے پالی! فریم میں تصویر ٹھیک اُتری، مندر میں دیوتا براجمان ہو گئے! ہری، چند دنوں کے لیے اپنی نسلی خرابی اور ٹھاکر صاحب کی نسبی برتری بھول گیا، وہ تو اِندرا کا بچپن ہی سے دیوانہ تھا اس نے موقع پاتے ہی اس طرح خلوص، ایثار اور حاضر باشی دکھائی کہ اِندرا بھی اُس کی دیوانی ہو گئی، ٹھاکر صاحب نے اُس کی یہ کیفیت محسوس کی، اُنھیں فکر دامن گیر ہوئی۔ کلکتہ کا شہر، پرایا دیس، بے جانے بوجھے لوگ، کس سے صلاح لیں، کس سے مشورہ کریں، بالآخر مونی بابو سے ایک دن چائے پر بلا کر، پوچھ بیٹھے کہ ''ہری کون ہے، کیا ذات پات ہے'' انھوں نے کہا: ''میں ذات پات کچھ نہیں جانتا، ایک سنگ تراش کے بھیس میں آیا تھا، میری دانست میں تو کرشن نے نیا رُوپ لیا ہے، اُن کے سوا دیوتاؤں میں بھی کوئی فنونِ لطیفہ کا اتنا ماہر نہیں!''

ٹھاکر صاحب ذرا چراغ پا ہوئے، راکھ کے ڈھیر میں ابھی چنگاری باقی تھی۔ بولے ''بابو صاحب ہم راجپوت ہیں، ایسے ویسوں کو بیٹی بہن نہیں دیتے۔ آپ کی بات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شودر ہے؟''

مونی بابو بھی جھلا گئے۔ پاؤں کے نیچے دبنے پر چیونٹی بھی کاٹتی ہے، وہ بولے۔ ''ٹھاکر صاحب شودر اور چھتری، اچھوت اور چھوت سب پرمیشر ہی کے بنائے ہوئے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں سے ایک صدیوں کا مظلوم ہے اور دوسرا صدیوں کا ظالم، ایک کمزور تھا دوسرے نے دبالیا۔ اب اس صدی میں یہ زور و ظلم نہیں چلنے کا۔''

ٹھاکر صاحب کھڑے ہو گئے۔ بولے: ''میں اپنی لڑکی کا اپنے ہاتھ سے گلا گھونٹ دوں گا۔ مگر اسے کسی بدقومے کمینے سے بیاہ نہ کرنے دوں گا۔'' مونی بابو نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ ''ٹھاکر صاحب ہری آپ کی لڑکی کو تو کیا۔ اندرلوک کی اپسرا کو بیاہ سکتا ہے، آپ کو اپنی شرافت مبارک، آپ سوکھی ہوئی ہڈیاں چچوڑیئے۔ علم و ہنر کے بادہ خوار جسے اپنے پہلو میں بٹھالیں، برہمنیاں اور راجپوتنیاں اُن کے پاؤں نہیں چھو سکتیں!'' غرض محلّے میں رہنے والے دو مرغوں کی طرح دونوں نے ایک دوسرے کو خوب خوب زخم دہاں دیئے اور اپنی اپنی جگہ گردن پھلا پھلا کر چلے آئے۔

وہاں اِندرا اور ہری سینما میں تھے۔ جب وہاں سے ٹیکسی میں پلٹے تو ہری نے اِندرا کی ایک نظر سے یہ سمجھ لیا کہ اس کی ریاضت کے باغ میں پھل آ گیا۔ دیوی نے چڑھاوا قبول کرلیا۔ منت بر آئی، مگر ایک لحہ کی حیاتِ جاوید بخشنے والی خوشی کے بعد دفعتاً وہ قوم ونسل کی دیواریں یاد آ گئیں۔ جو درمیان میں حائل تھیں، اس نے اپنے بڑھتے ہوئے جوش کو فولادی پنجہ سے روکا۔ اِندرا کی نشست کا انداز، اس کا ہری کی طرف بار بار دیکھنا یہ صاف صاف بتا رہا تھا کہ دیوی پوجاری کا مدعا سننے کی منتظر ہے۔ وہ عقدہ براری کے لیے ہمہ تن تیار ہے۔ مگر ہری اس طرح خاموش بیٹھا تھا۔ جیسے مجالِ سخن نہ ہو۔ وہ زبان پانے پر بھی گونگا بن گیا۔ اِندرا کو یقین ہوگیا کہ اسے دھوکا ہوا۔ اس کا مندر سونا ہی رہے گا۔ اس نے کھڑکی کی طرف منہ کرلیا، اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے! جب ٹیکسی ہوٹل کے سامنے رُکی تو ہری اِسے اُتار کر پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اِندرا نے پوچھا۔ ''بابو جی سے نہ ملئے گا۔'' وہ بولا۔ اس وقت معاف فرمائیے اب کل!'' اس نے سلام کر کے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا حکم دے دیا۔

افسردہ دل اِندرا جب ہوٹل میں پہنچی تو ٹھاکر صاحب اپنے کمرے میں منتظر ملے۔ تمتماتے ہوئے چہرے سے سخت آواز اور تلخ لہجے میں بولے۔ ''میں ہری بابو کے ساتھ تمھارا گھومنا نہیں پسند کرتا، نیچ کمینہ!''

اِندرا ٹھٹک کے کھڑی ہوگئی، اُس نے بھی باپ ہی کے تیور سے پوچھا۔ ''وہ نیچ اور کمینہ کیسے ہوگئے!''

وہ بولے ''سنگ تراش کا لونڈا ہے، بالکل اسی طرح کا جیسا کہ وہ گونگا بدمعاش تھا نا! وہی جسے میں نے پیٹ کے گاؤں سے نکال دیا تھا۔'' اِندرا جلدی سے کُرسی پر بیٹھ گئی۔ دل میں جو کھٹک تھی دفعتاً جاتی رہی، اُس نے ہری کو پہچان لیا۔ یہ وہی پرانا پجاری، وہی خاموش عبادت گزار ہے۔ پہلے گونگا تھا۔ اب بھی ہکلا ہے۔ اُسے یاد آیا کہ کہیں نہ کہیں اس کے سوانح کے سلسلے میں اس نے پڑھا تھا کہ ہری کبھی گونگے تھے یہی وجہ تھی کہ آنکھیں اُن کی خواہ کچھ بھی کہیں، لیکن زبان سے اظہارِ مدعا کرتے ڈرتے تھے، ٹھاکر صاحب کی بید کا ڈر، جسم سے بڑھ کر روح میں سرایت کرگیا۔ بس بس! نگینہ جہاں سے گرا تھا، انگوٹھی میں وہیں ٹھیک بیٹھ گیا، وہ ایک بار روحی انبساط سے مسکرادی۔ دنیا کتنی خوشی آنند اور کتنی موسیقیت سے لبریز ہے! پھر باپ کے گلے میں

باہیں حمائل کر کے بولی۔ ''آپ بیکار اِن باتوں پر دل کڑھاتے ہیں، مَیں تو ان چیزوں کو مانتی ہی نہیں!'' اور قبل اس کے کہ وہ کچھ کہہ سکیں وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے دن دُکان کھلتے ہی وہاں وہ موجود تھی۔ ہری نے رات بھر دل سے جنگ کرنے میں گزار دی تھی، مونی بابو نے ٹھاکر صاحب سے گفتگو کا خلاصہ سنا دیا تھا۔ ہری نے اپنی اصلیت بتا دی تھی۔ دونوں مایوس تھے۔ دونوں کو یقین تھا کہ ہندوستانی ذات پات کا آہنی قلعہ محبت کے انجھر وں سے فتح نہیں ہوتا، پروگرام طے ہو گیا تھا، کہ پسپائی کی ٹھہرے اور یورپ و امریکہ میں سیر ہو، اِندرا کے دفعتاً آ جانے نے دونوں کو پریشان کر دیا۔ مونی بابو بوڑھے تھے۔ اختلاج کا شکار ہوئے اور پاس والے دواخانہ میں دوا پینے چلے گئے۔ ہری ہمہ تمنا ہمہ مایوسی، ہمہ آرزو، ہمہ حسرت بنا ہوا، کوہستانی استقلال سے ڈٹا رہا۔ وہ بھاگنا بھی چاہتا تو اِندرا سے کہاں بھاگ کر جاتا؟ اُس نے رسماً سلام کر کے پوچھا۔ ''فرمایئے کیا حکم ہے؟''

اِندرا نے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''پتا جی کا اصرار ہے کہ اب مجھے گھر چلنا چاہیے۔ اس لیے مَیں نے کہا چلوں آپ سے مل لوں اور اس دُکان کی وہ چیزیں بھی دیکھ لوں جو آپ نے مجھے اب تک نہیں دکھائی ہیں۔''

ہری نے زبان ہونٹوں پر پھراتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ آج ہی تشریف لے جا رہی ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''نہیں آج تو نہیں، لیکن دو ہی ایک روز میں! تو مجھے وہ چیزیں تو دکھایئے جو مَیں نے اب تک نہیں دیکھی ہیں!''

ہری نے کہا۔ ''ساری چیزیں آپ کے سامنے ہی ہیں۔ آپ اِن میں سے ہر ایک کو کئی بار ملاحظہ فرما چکی ہیں!''

وہ ہنسی، اس کی ہنسی سے دلی بے چینی چھپانے کی کوشش ظاہر ہوتی تھی، اس نے کہا۔ ''مَیں ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے سارے کمالات دکھا دیئے ہیں!''

ہری نے کہا۔ ''میں سچ کہتا ہوں کہ کوئی ایسی چیز... اس جملے کو وہ ناتمام چھوڑ کر رُک گیا۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا، اس کی پیشانی پر عرق آ گیا۔ اس نے زبان دانتوں سے دبا لی۔ اِندرا پھر ہنسی، اس کی ہنسی سے صاف فاتحانہ جھلک آ رہی تھی! وہ زینہ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ''یہ

زینہ تو آپ ہی کے کمرے میں جاتا ہے نا!''

ہری نے گھبرا کر کہا۔''جی ہاں۔''

اس نے اس طرف بڑھتے ہوئے کہا، تو آیئے آپ مجھے اپنے کمرے کی چیزیں دکھایئے ہری کچھ سہما کچھ شرمایا سا ساتھ ہولیا۔ وہ کھٹ کھٹ کرتی اُوپر چڑھ گئی۔ پہلا کمرہ ڈرائنگ روم تھا۔ دروازہ کھول کے جھانکا بند کر دیا، دوسرا کمرا ہری کے سونے کا کمرہ تھا، اس نے کواڑ کھولے۔ ہری نے بڑھ کر کہا۔''جی یہ میرے سونے کا کمرا ہے، آپ اسے دیکھ کر کیا کریں گی۔''

وہ پھر ہنسی اس طرح جس طرح بلبل گل سے ہم آغوش ہو کر ہنستا ہے، اس طرح جس طرح دشمن کے بم پھینکنے والے ہوائی جہازوں کو گرا کر فوجی قدر انداز ہنستے ہیں۔ اور وہ درانہ اندر چلی گئی، سادا سا بستر، صاف اُجلی چادر، پروں کے دو تکیے، پائینتی ایک قیمتی رگ، پلنگ کی بغل میں ایک ڈریسنگ میز ایک کرسی، میز پر بُرش کنگھے اور دو ایک قسم کے تیل کی شیشیاں، وسطِ دیوار میں ایک دروازہ تھا اُسے کھول کر دیکھا، حمام کرنے، کپڑے بدلنے کا کمرہ تھا، پلٹی چاروں طرف نظر دوڑائی، طاق پر نظر پڑی، اِس پر چھوٹا سا مخملی زرکار پردہ پڑا ہوا دیکھ کر مسکرائی۔

ہری بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اِندرا نے پلٹ کے پوچھا۔''یہ کیا ہے!'' وہ ہکلا کے بولا۔''میرا راز ہے!''

اس نے بڑے دعوے سے پوچھا۔''مجھ سے بھی!''

ہری نے پھر ہکلا کے کہا۔''آپ... پ... سے سب سے زیادہ!''

اس نے آنکھوں سے بجلیاں گرا کے دریافت کیا۔''اور اگر میں جانتی ہوں تو!''

ہری نے جلدی سے آنکھیں... جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔''تو مجھ سے پوچھنے کی ضرورت!''

اس نے عجیب شوخی سے، عجیب شرارت سے عجیب ظرافت سے، عجیب دلربائی سے گھبرائے ہوئے ہری کو منہ چڑھا کر ہنسا دیا۔ اور خود طاق کے پاس جا کر پردہ اُلٹ دیا۔ وہی ایک مرمریں ٹکڑے پر دس برس کی ایک لڑکی کا مجسمہ!

اِندرا نے دونوں ہاتھوں سے اُس مورتی کو اُٹھالیا۔ اس کے گلے سے شام کو چڑھایا ہوا باسی ہار نکال لیا، اور اِسے اپنے جوڑے میں رکھ کر بولی۔''اب تو آپ گونگے نہیں ہیں!''

ہری نے محسوس کرلیا کہ وہ اچھی طرح پہچان گئی ہے، اور اس پر بھی وہ اظہارِ مدعا کی اجازت دیتی ہے، پھر بھی ہمّت نہ پڑی، پہلو بدل کر سوال کیا۔ ”آپ کو کب معلوم ہوا۔“

وہ بولی۔ ”کل رات بابو جی کی باتوں سے مجھے سب یاد آ گیا۔ ہری نے کہا: ”کیا اس کے بعد بھی آپ کو میرے آج تک گونگے رہنے پر کوئی تعجب ہوتا ہے؟“

وہ بولی۔ ”ہاں اس لیے کہ دیویاں جب کسی کی منت براری کرنا چاہتی ہیں۔ تو پھر انھیں حاجت مند کی خاموشی بُری معلوم ہوتی ہے۔“

ہری نے کانپ کر کہا۔ ”دیوی! دیوی! میں کیسے کہوں کہ میں تمھاری پوجا کرتا ہوں۔ اور صبح کو اسی کی زیارت کر کے کام شروع کرتا ہوں! لیکن میں شودر ہوں، تم راجپوتن ہو۔ ٹھاکر صاحب اگر سن لیں گے تو میرا کام تمام ہی کر دیں گے!“

وہ ہنسنے کی جگہ متین ہو کر بولی۔ ”تم اور شودر! تم تو دیوی دیوتاؤں کے بنانے والے ہو، اور اب... اب ایک پوتر راجپوتن کے دیوتا!“ ہری نے گھبرا کر کہا۔ ”ارے ٹھاکر صاحب کیا کہیں گے؟“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”ان سے اتنا مت ڈرو۔ اُن کو بھی منالوں گی۔“ ”اور اگر نہ بھی مانے تو کیا! بیٹی کی حیثیت سے اکیس بائیس سال تک باپ کی خدمت کر چکی، اب استری بن کے اُس کی سیوا کروں گی، جو آج دس سال سے ہر روز گلے میں محبت کا ہار ڈالتا ہے؟“

ہری نے اِندرا کو اسی عزّت، اسی احترام، اسی محبت سے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا، جس سے وہ اس کی مورتی کو روزانہ پرنام کیا کرتا تھا۔ اور اِندرا نے جھک کر ہری کے پاؤں چھو لیے!

(باسی پھول)

لچھمی کا عجائب گھر

لچھمی بوڑھیا کو گاؤں والے عام طور پر لکھّی کہتے تھے۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کی عمر کیا ہے۔ بوڑھے پھوس بھی یہی کہتے کہ ہم نے اسے سدا سے ایسا ہی دیکھا۔ یہی سفید اُلجھے ہوئے بال، یہی پیشانی پر موٹی موٹی لکیریں، یہی جھریاں پڑا پوپلا منہ اور یہی سوکھی لمبی ٹھوڑی۔ بس اپنی یاد میں اتنا فرق آیا ہے کہ پہلے یہ پٹسن جیسے بال ذرا دائیں بائیں اور پھیلے ہوئے تھے، اب وہ چھوٹے ہو کر دونوں طرف سے سمٹ گئے ہیں، مگر چلی آ رہی ہے یہ بوڑھیا اور اس کی پھوس کی جھونپڑی پرکھوں کے سمے سے۔

جھونپڑی گاؤں کے ایک کونے پر تھی۔ پشت پر ایک ٹھیلا، سامنے مثلث نما ایک کھیت، ان کی اغل بغل جھیل، جھونپڑی کیا تھی مٹّی کی، نونا' لگی ہوئی دیواروں پر پھوس کے چھپّر سے ڈھکی ہوئی ایک کوٹھری تھی۔ اندر جانے کے لیے بس ایک پانچ فٹ اونچا، گز بھر چوڑا دروازہ، نہ کوئی کھڑکی نہ سوکھا۔ داخل ہوتے ہی ہوا کا بھی دَم گھٹنے لگتا۔ یہی کال کوٹھری لکھّی کا گودام بھی تھی، رسوئی گھر بھی اور آرام کا کمرہ بھی۔ یہیں اس کی وہ تجوری تھی جس کے پُر ہونے کی وجہ سے وہ لکھّی کہلاتی تھی۔

اس کوٹھری کا ساز و سامان دیکھنے کے قابل تھا۔ ایک جھلنگے بسکھٹ پر ایک میلا پھٹا گدا۔ اس کی پائینتی ایک موٹا کھردرا گاؤں کے گڈریے کا بنا ہوا کمبل۔ ایک الگنی پر ایک پیوند لگی ساڑی اور کھادزے کا ایک شلوکا۔ ایک کونے میں مٹی کے دو مٹکے اور تین گھڑے، ان میں کچھ اناج، آٹا اور دالیں رکھی ہوئیں، دروازے کی ایک بغل میں رسوئی کا سامان، مٹی کا ایک چولہا، لوہے کا ایک گگرا، ایک جگہ جگہ سے پچکا ہوا بے ٹونٹی کا لوٹا، مٹی کی ایک ہانڈی، ایک توا، ایک تھالی اور ایک چمٹا۔ دوسری بغل میں ایک چرخا، ایک ڈالیا میں کچھ کتا ہوا سوت اور تھوڑی سی دُھنکی

رُوئی۔

کوٹھری کا چھپّر دروازے کے رُخ پر دو گز آگے نکلا ہوا تھا۔ یہیں گویا برآمدہ تھا، لکھی نے اس حصّے کو آس پاس کی مٹی سمیٹ کر کوٹ کر لیپ دی تھی جس سے ایک چبوترا بن گیا تھا۔ اس چبوترے پر دن میں وہ خود بیٹھ کر چرخا چلاتی یا چٹائی بچھا کر لیٹی رہتی۔ رات میں وہ اس کے پالتو جانوروں کا بسیرا بن جاتا۔ یہیں اس کی بکری منّی بیٹھ کر جگالی کرتی، اونگھتی اور کان پھٹپھٹا کر اپنے منہ کے قریب بھنکنے والی مکھیوں کو بھگاتی۔ یہیں لکھی کا نیم وحشی کتا 'جبرا' بیٹھا اونگھا کرتا، یہیں اس کی سرمئی رنگ کی بلّی 'خیلا' آنکھیں بند کیے خرخر کرتی اور یہیں برسات میں اس کا مرغ 'بانکے خاں' اپنے سارے محلوں کے ساتھ بیٹھ کر کڑ کڑاتا رہتا۔ اس زندہ عجائب گھر کا ایک اور رکن 'بالک رام' کوٹھری کی چھت میں بانس اور پھوس کے درمیان بیٹھا لکھی کی تجوری کی نگہبانی کرتا۔ اس کے اِرد گرد بانس کے پیچھے چیتھڑوں میں لپٹی لکھی کی چھوٹی بڑی رقمیں رکھی رہتیں۔ اُن تک سوائے لکھی کے کسی کی رسائی ناممکن تھی۔ وہ لکھّی کی سوکھی انگلیوں کی خوشبو سے مانوس تھا۔ وہی تو اس کے لیے منّی کا دودھ ایک چینی میں ہر روز صبح شام اپنے بسکھٹ کے نیچے رکھ دیتی تھیں۔ اس احسان نے زہر کو امرت میں بدل دیا تھا۔ ناگ 'بالک' بن گیا تھا اور لکھی ماتا۔

لکھی کی آمدنی کے کئی ذریعے تھے۔ وہ کئی کھیتوں کی مالکن تھی جو اس نے بٹائی پر اُٹھا رکھے تھے۔ ان میں گیہوں، چنا، جو، مٹر اور ارہر کی کاشت ہوتی تھی۔ فصل کٹنے پر لکھّی کا حصہ ایمانداری سے چھان بنا کر ہر کاشتکار اس کے گھر پہنچا جاتا تھا۔ یہ ایمانداری کسی خدا ترسی یا رحم کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ پورے گاؤں پر لکھّی کا ڈر چھایا ہوا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ وہ جادوگرنی ہے اور وہ دلیل میں پیش کرتے اس کے زندہ عجائب گھر کو۔

وہ کہتے کون نہیں جانتا کہ ہر ہری چیز کو دیکھ کر بکری کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ وہ بیچ کھیت اُسے چر لے گی۔ مگر بڑھیا کی منّی نہ تو اِرد گرد کے لہلہاتے کھیتوں کی طرف دیکھتی ہے اور نہ خود لکھی نے جو جھونپڑی کے سامنے ترکاریاں لگا رکھی ہیں اس کی ایک پتی ٹونگتی ہے۔ وہ تو کھیتوں میں گھس کر نکائی کا کام کرتی ہے، یعنی وہی گھاس کھاتی ہے جو پودوں کو بڑھنے اور پنپنے سے روکتی ہے۔ بکری کیا ہے کہ کوئی ملّائے مسجدی ہے کہ ہر قدم پر جائز ناجائز، حلال حرام دیکھتی چلتی ہے۔ کتے کا راتب چھیچھڑا اور ہڈّی ہے، مگر لکھّی کی کا 'جبرا' صبح شام روٹی دال پر قناعت کرتا ہے اور سوائے مخصوص دِنوں کے کسی نے اسے گاؤں میں اندھیرے اُجالے کسی کتیا سے رومانس

لڑاتے بھی نہیں دیکھا۔ لکھّی کا برآمدہ ہی اس کے لیے درِ محبوب ہے۔ وہ سنگِ آستانہ پر سر رکھے وہیں پڑا رہتا ہے۔ بلّی کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا بن بلاؤ ہے۔ اتنی خونخوار ہے کہ کتا تک اس سے ڈرتا ہے۔ کوئی کہتا اس پر کسی جن یا پریت کا سایہ ہے۔ کتے بلّی کا بیر دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں یہ حالت ہے کہ کتا جب زمین دُم سے جھاڑ کر لیٹ جاتا ہے تو بی خیلا خرخر کرتی آتیں اور اس کے سینے سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ اپنی پتلی زبان نکال کر اپنا منہ اور پنجے چاٹ کر صاف کرتیں اور یوں گویا غسل فرما کر اور بن سنور کر مٹکتی ہوئی چلتیں اور دودھ پلانے والی منّی کی گود میں جا کر لیٹ رہتیں۔

بانکے خاں اور ان کی بیوی کی عادت تھی کہ وہ برسات کے علاوہ سامنے والے نیم پر رات کو بسیرا کرتے اور دن میں آس پاس کے کھیتوں میں چگتے رہتے۔ جب کسی مرغی کے درد اُٹھتے تو وہ کڑکڑاتی، کولھے مٹکاتی، بلّی کو کنکھیوں سے دیکھتی بڑھیا کی کوٹھری میں چلی جاتی اور وہیں اپنا تحفہ رکھ کر باہر چلی آتی۔ واپسی میں برآمدے کو وہ دبے پاؤں پار کرتی۔ ہاں چبوترے کے کنارے پہنچتے ہی وہ خوش خبری کا نقارہ پیٹتی اُڑتی ہوئی اپنی ہم جنسوں کے پاس پلٹ جاتی۔ نذر چڑھانے کے علاوہ مرغیوں کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اگر وہ بغیر اطلاع راج محل میں داخلے کی کوشش کرتیں تو خیلا جھپٹ کر سامنے آجاتی اور مرغی چیختی، چلاتی، پھڑپھڑاتی، بھاگتی۔ جب کبھی ایسا حادثہ پیش آتا تو بانکے خاں دوسرے محلوں کو چھوڑ کر بے تحاشہ دوڑ پڑتے اور پر پھٹ پھٹا کر اور گردن پھلا کر بلّی کا مقابلہ کرنے کے لیے جھک جاتے۔ دونوں ایک دوسرے پر وار کرنے کے لیے پینترے بدلتے ہی ہوتے کہ جبرا بھونک کر بیچ میں آجاتا اور بڑھیا چونک کر ڈانٹتی۔ ''کیا شور مچا رکھا ہے پاجیو! چلو اپنی اپنی جگہ!'' اس کی آواز سنتے ہی خیلا خاموشی سے اُچک کر برآمدے میں آبیٹھتی اور بانکے خاں کٹ کٹ کر کے سارے محلوں کو پاس بلا لیتے اور بلّی کو زہر کی نگاہوں سے دیکھتے۔ گردن ٹیڑھی کیے پنجوں کے بل چلتے، کھیتوں کی طرف نکل جاتے۔

مرغیوں کے یہ انڈے گاؤں کے ٹھاکر صاحب روزانہ منگا لیا کرتے اور یہ لکھّی کی مستقل آمدنی کا ذریعہ تھے۔ زاید غلے کی فروخت اور انڈوں کے پیسوں کے علاوہ لکھّی کو کھادی بھنڈار سے بھی کچھ آمد تھی۔ اس کے کارندے لکھّی کو رُوئی دے جاتے اور وہی اس کا کاتا ہوا سوت ہر ہفتے آکر لے جایا کرتے۔ ان ذریعوں سے اسے جو کچھ ملتا وہ اسے چیتھڑوں میں

لپیٹ کر بانس کے پیچھے والی تجوری میں رکھ دیتی جہاں بالک رام کا پہرا تھا اور کسی دوسرے کی دسترس ممکن ہی نہ تھی۔

گاؤں کے تاڑی خانے میں بدمستی کی حالت میں اکثر لکھی کی دولت کے متعلق پھبتیاں پکتیں۔ سال میں دو چار سو ضرور بناتی چلی آتی ہے۔ کیا کرے گی یہ سب روپیہ۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ پھر بعض منصوبے بھی بناتے "چلو کسی اندھیری رات میں کتا بلی ایک ایک ہاتھ میں ختم کیے جاسکتے ہیں۔ بڑھیا کا گلا گھونٹ دینا کون سی بڑی بات ہے۔ پھر اُس نے جو کچھ گاڑ چھپا رکھا ہے وہ سب یاروں ہی کا ہے۔" دو ایک شاطروں نے جھونپڑی کے قریب تک جانے کی ہمت بھی کی مگر وہاں پہنچتے پہنچتے نشہ ہرن ہو جاتا۔ ایک نامعلوم سا ڈر دل پر چھا جاتا اور ایک دوسرے کو بُرا کہتے پلٹ آتے۔

مگر جھونپڑی کے ہمسایے میں دو جانور بھی تھے۔ ان کا لالچ ان کے ڈر پر غالب آ گیا۔ ان میں سے ایک تو نیولا تھا جو جھونپڑی کی پشت والے ٹیلے پر رہتا تھا۔ یہ بانکے خاں اور ان کے حرم کو ہمیشہ للچائی نظروں سے دیکھتا۔ اس کو ان کے انڈوں کی بڑی فکر تھی۔ وہ بھی فطرتاً ان کا رسیا ہے۔ ایک دن یہ نیولا انڈوں کی ٹوہ لگاتا برآمدے تک پہنچ گیا۔ اس وقت لکھی اپنی چٹائی پر لیٹی سو رہی تھی اور جبرا اور خیلا بھی اونگھ گئے تھے۔ نیولے نے موقع کو غنیمت جانا اور جھٹ کوٹھری میں جا گھسا۔ وہاں سامنے ہی بسکھٹ کے نیچے ایک ڈلیا میں چار انڈے دِکھائی دیئے۔ گو چور کا دل آدھا ہوتا ہے مگر نیولے نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ اُس نے جھپٹ کر ایک انڈے پر منہ مار دیا۔ اسے خبر نہ تھی کہ کوئی اوپر والا بھی ٹکٹکی باندھے اُسے گھور رہا ہے۔ نیولے نے انڈا دانت سے کتر کر ذرا سی سپیدی چاٹی ہی تھی کہ بالک رام نے پٹ سے اپنے کو بسکھٹ پر گرا کر زور سے پھپکاری ماری۔ نسلوں سے آتی ہوئی پرانی دشمنی لالچ پر فتح پا گئی۔ نیولے نے انڈا منہ سے گرا دیا اور پینترے بدل کر وہ سانپ پر حملہ کرنے لگا۔ اس ردّو بدل میں جو کھٹ پٹ ہوئی تو جبرا آنکھ کھول کر غرّایا۔ لکھی بڑبڑائی "اپاہج! پڑا سو رہا ہے، دیکھتا نہیں کوٹھری میں کیا ہو رہا ہے!" قبل اس کے کہ جبرا انگڑائی لے کر کوٹھری کی طرف بڑھے، خیلا نے چھلانگ ماری اور اندر پہنچ گئی۔ نیولے نے جیسے ہی اس نئے محافظ کی صورت دیکھی وہ کوٹھری سے نکل کر بھاگا۔ بڑھیا نے جبرا کو للکارا "پکڑ لا!" بس اب کیا تھا، نیولے اور کتے کی دوڑ ہونے لگی۔ نیولا جھکائیاں دینے میں بہت ہوشیار تھا۔ اکیلا جبرا ہوتا تو وہ غالباً اسے نہ پکڑ سکتا، مگر خیلا نے بھی اس

دوڑ میں حصہ لیا اور وہ لڑنے، گھومنے، جسم کو سمیٹنے، منہ کو گھما لینے میں نیولے سے بھی دو قدم آگے تھی۔ نیولا اس کے وار کی چوٹ سے اپنے کو بچانے کے سلسلے میں ایک کانٹے دار پودے سے ٹکرایا اور قلابازیاں کھا گیا۔ جبرا نے لپک کر گردن منہ میں دبائی اور اسے لا کر بڑھیا کے سامنے ڈال دیا اور اس طرح دُم ہلانے لگا جیسے مجرم کو پکڑنے میں اس نے انتہائی کامیابی حاصل کی ہے، مگر خیلا اپنے حصّے کو آسانی سے نظر انداز کر دیئے جانے پر تیار نہ تھی، اُس نے مالکن کی سوکھی پنڈلیوں میں اپنی پیٹھ رگڑ کر اس مہم میں اپنے حصّے کی طرف متوجہ کیا۔ لکھّی نے اپنی کیچڑ بھری آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا اور سر ہلاتی ہوئی نیولے پر جھک پڑی۔

وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کی باچھوں میں انڈے کی جگہ خون بھرا تھا۔ گرنے میں اس کے تیز دانتوں نے اس کی زبان کو مجروح کر دیا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں وحشت سے جلد جلد گھماتے جا رہا تھا۔ گویا موقع کی تلاش میں تھا کہ ان سپاہیوں کی ذرا آنکھ جھپکے، وہ اُچک کر نکل بھاگے۔ لکھّی نے اس کی گردن پکڑ کر اسے ہلکے ہلکے دو طمانچے لگائے۔ ''تم نے چوری کی، ڈاکا ڈالا! پکڑے گئے نا؟ اب کہو جبرا کو حکم دے دوں تمھیں تکے بوٹی کر ڈالے؟ میرے جانوروں کے ساتھ بھائی بھائی کی طرح رہتا تھا اور یہ حرکت!'' جبرا غرّایا، خیلا نے غے غے کر کے زمین پر پنجہ مارا۔ لکھّی نے کانپتے ہوئے نیولے کو پھر ایک طمانچہ مارا۔ ''اچھا جاؤ، اب کے چھوڑے دیتی ہوں، پھر کبھی کوٹھری میں نہ گھسنا'' اور اُس نے نیولے کو چھوڑ دیا۔ جبرا نے غصّے سے جھڑکا، خیلا نے پھر زمین پر پنجہ مارا اور نیولا اُچھل کر بے تحاشا اپنے ٹیلے کی طرف بھاگ گیا۔

دوسرا حملہ آور ایک گیدڑ تھا۔ یہ جھونپڑی کی داہنی جانب جو جنگل نما حصہ تھا اس میں اکثر راتوں کو ''ایہاں، وہاں'' کی پکار پر اپنے ہم جنسوں کو دعوتِ شعر خوانی دیا کرتا تھا۔ ایک رات جب زور کی بارش ہو رہی تھی اور اس کا دیوان خانہ بھی گڑھیّا کی صورت اختیار کرنے لگا تھا تو وہ ہمت کر کے جھونپڑی کے برآمدے تک پہنچا۔ کوٹھری کے بھڑے دروازے سے روشنی چھنتے دیکھ کر اور اس کے پاس ہی سے مرغیوں کی بو پا کر اُس نے دبے پاؤں اندر داخل ہونے کی جسارت کی۔ وہاں جو نظر ڈالی تو لکھّی سوتی دِکھائی دی۔ کتا اور بلّی دِکھائی نہ دیئے۔ البتہ سامنے ہی کئی مرغیاں نظر آئیں۔ کئی دن کا بھوکا تھا۔ منہ سے رال ٹپک پڑی۔ وہ بے ساختہ ایک مرغی پر جھپٹ پڑا۔ مرغی کی دُم ہی منہ میں آئی اور وہ چیخ کر پھڑ پھڑائی۔ بانکے خاں نے اُڑ کر پورے زور سے لات ماری۔ داہنی 'کھانگ' آنکھ کے ایک کونے میں لگی۔ بوکھلا کر پلٹا۔ ویسے ہی جبرا

نے پلنگ کے نیچے سے نکل کر ٹانگ پر حملہ کیا۔ گیدڑ اُچھلا، لکھی اُٹھ رہی تھی، وہ اُس کے سینے پر گرا۔ بڑھیا آہ کر کے گری۔ اس کا سر پایہ سے ٹکرایا اور وہ نیم بے ہوش ہو کر بے سُدھ ہو گئی۔ ادھر خیلا اور بالک نے ایک ساتھ گیدڑ پر حملہ کیا۔ خیلا کے پنجے نے جبڑے کے پاس سے ایک بوٹی نوچ لی۔ وہ پلنگ سے نیچے کود کر بھاگا۔ دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ بانکے خاں نے پھر اُڑ کر لات ماری۔ ادھر مُنّی نے اس زور کی ٹکر لگائی کہ وہ دروازے سے اُچھل کر برآمدے کے باہر کیچڑ میں جا کر گرا اور کیچڑ سے لت پت کانپتا کانپتا بے تحاشا بھاگا۔

بالک پھپکاری مارتا ہوا پلنگ پر سرسراتا ہوا چڑھا اور لکھی کے جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر رینگا۔ جبرا خوشی سے بھونکا اور لکھی کا منہ چاٹنے لگا۔ خیلا نے خُرخُر کر کے اس کے جھرّی دار گالوں پر پیٹھ اور دُم رگڑی۔ ان کے بال لکھی کے نتھنوں میں گھسے اور وہ چھینکتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ بانکے نے پر پھڑپھڑا کر نعرۂ فتح بلند کیا اور مُنّی نے بے خوشی میں 'میں میں' کر کے ساز ملایا۔ لکھی نے ڈانٹا۔ ''کیا شور مچا رکھا ہے پاجیو! چلو اپنی اپنی جگہ۔''

بالک سرکا، خیلا دُبکی، جبرا دُم دبا کر کھسکا، مُنّی کان پھڑپھڑا کر کونے میں بیٹھ گئی۔ بانکے خاں ایک پر لٹکا کر ایک مرغی کے گرد ناچا۔ لکھی نے اپنے عجائب گھر پر پیار کی نظر ڈالی اور اطمینان کی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

(ماہنامہ آج کل، دہلی، جون ۱۹۶۲ء)

لیڈر

بہرام نگر کا سب سے بڑا میدان آدمیوں سے بھرا پڑا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں کسان جمع تھے۔ ہفتوں سے بیل گاڑیوں، ٹٹوؤں اور بہلیوں کا تانتا بندھا تھا، ہزاروں آدمی پچیس پچیس، بیس بیس، کوس سے پیدل آئے تھے۔ ان میں بوڑھے بھی تھے، جوان بھی، بچّے بھی تھے، اور عورتیں بھی۔ بعض کسان اتنے خوشحال تھے کہ اُن کے گلوں میں سونے کے کنٹھے اور کانوں میں ''مُرلیاں'' پڑی تھیں۔ لیکن زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی کہ جن کے جسم پر ایک پھٹی پُرانی دھوتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ عورتوں میں کچھ تو سُرخ شہانی ساڑیاں اور بھدّے سل دیہاتی زیور پہنے تھیں۔ کچھ سپید صاف ستھری کنارے دار ساڑیاں زیبِ جسم کیے تھیں، لیکن اکثر کا صندلی رنگ اُنہیں کے ہاتھ کی دھوئی اور رنگی ہوئی گاڑھے کی ساڑی میں روپوش ہو کر افلاس و معصومیت کا دادخواہ تھا۔ بچوں میں بعض کے جسم پر کُرتہ اور دھوتی دونوں چیزیں تھیں، مگر اکثر کے لیے صرف دھوتی ہی ستر پوش تھی، چھوٹے ننھے معصوموں کے لیے تو ان جھگڑوں کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ فطرتِ عریاں کی مکمل تصویریں تھے۔

آدمیوں کے اس جنگل کو 'مہاشے جی' کے درشنوں کا بڑا شوق تھا اور یہی جذبۂ بے اختیار گلوں کا پھندا بن کر سب کو بہرام نگر کھینچ لایا تھا۔ مہاشے جی تھے بھی اسی قابل۔ اپنے صوبے کے بڑے مشہور وکیل، ہزاروں روپے روز کمانے والے وکیل رہ چکے تھے۔ متعدد شہروں میں بڑی بڑی کوٹھیاں اور عالی شان دُکانیں تھیں۔ مگر دیس کی سیوا کے لیے اس مجسم ایثار نے راحت و آسائش کو لات ماردی تھی، اُنہیں بس ایک ہی دُھن تھی۔ جس طرح ہو مظلوم کسانوں کو، ظالم اور خونخوار زمینداروں کے پنجوں سے چھڑانا چاہیے۔ اس عفریت مآب جماعت نے

بھوکے کسانوں کی زندگیاں جہنم بنا رکھی ہیں! ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ ایسے کسانوں کو جو واقعی مفلس اور فاقہ کش تھے۔ مہاشے جی 'نئے اوتار' جان پڑے۔ انہوں نے اُن کے قدم کی خاک کو سرمۂ چشم بنایا اور اُن کے منہ سے نکلے ہوئے شبدوں کو وید کے منتروں کی طرح دِلوں میں جگہ دی۔ وہ مہاشے جی کی تقریر کا ایک ایک لفظ اس طرح پی جاتے تھے، جس طرح سوکھی زمین پہلے پانی کی بوندیں جذب کر لیتی ہے۔ جھونپڑے میں رہنے والے کسانوں کو پہلی بار محلوں کا خواب دکھائی دینے لگا تھا!

آج بہرام نگر میں یہ بھیڑ بھاڑ اسی لیے تھی۔ مہاشے جی کی تقریر تھی۔ بھوکے پیاسے کسان اسی آبِ حیات سے سیراب کیے جانے کی تمنا میں اکٹھا ہوئے تھے۔ بارے مہاشے جی آئے۔ بھوں بھوں کرتے، دُھول اُڑاتے، گاؤں کے مطلع کو غبار آلود کرتے، موٹر پر تشریف لائے۔ سیکڑوں کیلوں کے پھاٹکوں میں سے ہو کر، پچاسوں گیندے کے ہار پہن کر، سجدہ کرتے ہوئے دیہاتیوں کو آشیر باد دے کر، اونچے چبوترے پر رکھی ہوئی کرسی پر آ کے براجمان ہوئے۔ کسان سنگھ کے مقامی سیکریٹری نے ایڈریس پیش کیا اور مہاشے جی نے جے جے کے فلک شگاف نعروں میں تقریر شروع کی۔ تقریر کیا تھی سرمایہ داری کے ہاتھوں کچلی ہوئی انسانیت کے آنسوؤں کا دریا تھا۔ وہ مدّ و جزر، وہ اُتار چڑھاؤ کہ اللہ تیری پناہ! تان اس پر ٹوٹی کہ زمیندار کسانوں کا خون پی پی کر موٹے ہوتے جاتے ہیں، ان کا قلع قمع کر دو، اُن کا گھر پھونک دو، ان سے زمینداریاں چھین لو۔ یہ اگر بیوی بچوں کا خیال دلائیں تو کہہ دو "تمھاری بیویاں ناگنیں اور تمھارے بچے سنپولیے ہیں! ان موذیوں کے مر جانے میں ملک کی رکشا ہے!"

مہاشے نے تقریر ختم کی۔ اپنے سفری دفتر میں تشریف لے گئے۔ پرائیویٹ سیکریٹری نے چاندی کی کٹوری میں چھٹانک بھر پسا اور گھسا ہوا بادام پیش کیا۔ دو اُنگلیوں میں وہ اُسے چاٹ گئے۔ پھر آدھ سیر تازہ دودھ پی کر آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ پرائیویٹ سیکریٹری کو تقریر کا خلاصہ اخبارات میں شائع ہونے کے لیے لکھوانے لگے۔ دفعتاً رُک کے اُنہوں نے پوچھا۔ کیوں جی آج کوئی خط یورپ سے تو نہیں آیا؟

سیکریٹری نے کہا: "جی دو آئے ہیں۔ ایک تو پیرس کے بینک کا ہے دوسرا ہالینڈ کا۔"

پوچھا "تم نے پڑھا، کیا لکھا ہے؟"

وہ بولا "جی ہاں، پیرس بینک نے تو یہ اطلاع دی ہے کہ اس سال کا سود ملا کر اب اس

کے فکسڈ ڈیپازٹ میں آپ کے نام گیارہ لاکھ روپے پورے ہوگئے ہیں۔"

مہاشے جی نے کہا: "ہوں!" پھر کچھ سوچ کر پوچھا "اور ہالینڈ بینک نے کیا لکھا ہے؟"

سیکریٹری بولا۔ "جی اُس نے لکھا ہے کہ آپ کے نام سے تین سال سے جو رقم چلی آتی ہے اُس میں آپ نے نہ تو حسبِ وعدہ اب تک کوئی اضافہ ہی کیا ہے، اور نہ اُس کے متعلق ہدایت کی کہ وہ کس طرح کی کمپنیوں میں لگایا جاسکتا ہے!"

مہاشے جی پھر 'ہوں' کہہ کے کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ سیکریٹری نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "محمد پور مل سے بھی ایک خط آیا ہے۔" مہاشے نے چونک کر پوچھا "کیوں کیا کوئی خاص بات ہے کیا لکھا ہے؟"

سیکریٹری بولا "جی منیجر نے لکھا ہے کہ کانپور اور احمد آباد کی وبا یہاں بھی اب پھیلنے لگی ہے، مزدوروں کا خیال اب آپ کی طرف سے روز بروز خراب ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں، اگر مزدوری نہ بڑھائی گئی تو ہم اسٹرائک کر دیں گے۔"

مہاشے جی بگڑ پڑے "سخت پاجی ہیں۔ نیچ ذات، چھ آنہ روزانہ میں صرف آٹھ گھنٹے کام لیا جاتا ہے۔ اب اُنھیں کیا چاہیے۔ غریب کسانوں کو نہیں دیکھتے کہ بارہ بارہ گھنٹے سخت محنت کرنے پر بھی چھ پیسے روزانہ سے بھی کم اُن کی اوسط آمدنی ہے۔"

سیکریٹری نے کہا "لیکن وہ کہتے ہیں کہ مل کے مالک زمینداروں سے کئی گنا زیادہ کماتے بھی تو ہیں۔"

مہاشے جی بپھر کر بولے۔ "وہ کیا جانیں، زمیندار دیس کا دشمن ہے، اور ہم... ہم ملکی صنعت وحرفت کو ترقی دیتے ہیں۔"

سیکریٹری نے اپنی مسکراہٹ کو چھپا کر پوچھا "تو میں منیجر کو کیا لکھ دوں؟"

مہاشے بولے۔ "بس یہی لکھ دو کہ مجھے کسانوں کی سیوا سے اس وقت فرصت نہیں کہ میں اس طرح کی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ کرسکوں۔ وہ خود مزدوروں کو سمجھائیں کہ ہڑتال کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے، مہاتما جی نے ابھی حال میں ملوں میں دھرنا دینا عدم تشدد کے خلاف بتایا ہے۔ اگر وہ لوگ نہ مانیں گے تو مَیں مہاتما جی کو چٹھی لکھوں گا۔ سب مزدوروں سے خفا کرادوں گا۔ پھر وہ کہاں کے رہیں گے! ہونہہ! بڑے آئے اسٹرائک کرنے! اب اگر ہم ہی لوگوں کے کارخانوں میں ہڑتال ہونے اور دھرنا دیا جانے لگے تو پھر دیس کی رَکشا کا کام

ہو چکا!"

سیکریٹری باہر جانے لگا۔ مہاشے نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک کے کہا۔ "اور دیکھو! آج ہی ہالینڈ بینک کو لکھ دینا کہ میرے روپیوں سے مختلف ملکوں کی اسلحہ ساز کمپنیوں میں حصّے خریدے جائیں۔ سمجھے نا؟ مختلف ملکوں کی کمپنیوں میں اس کے نیچے لکیر کھینچ دینا!"

سیکریٹری نے کہا۔ "بہت خوب۔"

مہاشے بولے۔ "ہاں بھائی آج کل جنگ کے بادل یورپ بھر پر منڈلا رہے ہیں۔ خوب ہتھیار بنائے اور خریدے جا رہے ہیں۔ بس اب ان کمپنیوں سے زیادہ کسی سے نفع نہیں مل سکتا!"

سیکریٹری "بہت اچھا" کہہ کر باہر چلا گیا۔ اور مہاشے جی کسانوں کی فلاح و بہبود کی اسکیمیں سوچنے لگے۔

(کچھ ہنسی نہیں اور......۱۹۳۷ء)

مُردار چمڑا

سعیدہ شاعرہ تھی، ادیبہ تھی، فنکار تھی، نازک مزاج تھی، صاحبِ ذوق تھی، دولتِ حسن و جمال سے آراستہ تھی۔ اس کی حساس طبیعت پر ادب وفن، علم و ہنر کا روغن چڑھا تھا۔ اس کا سیلون اور اس کی لائبریری دیکھنے کی چیزیں تھیں۔ سیلون ایک ہشت پہلو بڑا سا ہال تھا۔ سنگِ مرمر اور سنگِ موسیٰ کے فرش پر اتنا موٹا ایرانی قالین کہ چلنے والوں کے ٹخنوں تک پاؤں چھپ جائیں۔ دیواروں پر قدِ آدم حلبی شیشے اور اُن پر مینا کا کام، نازک بیلوں میں مختلف رنگوں کے ایمی ٹیشن، چھوٹے بڑے نگ، ان سے اُوپر یورپ اور ایشیا کے کلاسیکی مصوّروں کے تیار کردہ مرقعے، چھت پر پوری بہار آئی ہوئی۔ ثمر دار درختوں سے خوشۂ انگور کی طرح ہزار بتی لٹکتے جھاڑ، کوئی فرانس کی شاہی کی یادگار، کوئی چک صنعت کا نمونہ، صوفے، کرسیاں، کوچ مختلف صدیوں کی نایاب یادگاریں تھیں۔ ان کی بغلوں میں اطالوی فنکاروں کے بنائے ہوئے مجسّمے تھے۔ آٹھوں کونوں پر منگ خاندان کے زمانے کے چینی مرتبان رکھے تھے۔ چھوٹی چھوٹی میزیں، اسٹول جو اکثر کرسیوں کے سامنے تھے، وہ روس، مصر اور جاپان کی یاد دلاتے تھے۔ غرض سیلون کیا تھا خاصا نمائش کا کمرہ تھا، جہاں کی ہر چیز دیدہ زیب تھی اور تاریخی بھی۔

سعیدہ کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اس کا یہ سیلون ہر وقت تازہ بہ تازہ، نو بہ نو ادیبوں، مصوّروں اور فنکاروں سے بھرا رہے اور ہر وقت شعر و ادب، آرٹ اور جمالیات پر گفتگو ہوتی رہے۔ یہی اس کی جنت تھی، یہی اس کے لیے فردوس کی آخری منزل۔

اور بے چارے مصنف، شاعر، فنکار اس کے ہاں آنے میں پس و پیش ہی کیوں کرتے؟ اسٹوڈی بیکر چھ سیٹر موٹر ان کے لانے اور گھر چھوڑنے کے لیے موجود رہتی۔ شربت،

چائے، کافی سے ضیافت کی جاتی۔ بنارسی سفید پان کی گلوریاں، چاندی سونے کے ورق میں لپٹی ہوئی بنارس کی پتی، مشکی تمباکو، قوام کے ساتھ چبانے کے لیے، اچھی سے اچھی سگریٹیں، قیمتیں سے قیمتی ہوانا سگار پینے کو، کیک، بسکٹ، پیسٹری، تازہ تازہ پھل کھانے کے لیے ملتے۔ بس اتنا ہی تو ہوتا کہ اپنا ہی کلام نہ سنانا پڑتا بلکہ سعیدہ کے سڑے گلے اشعار بھی سننا پڑتے اوراس کی خالص رومانی کہانیوں پر بھی جھوم جھوم کر واہ واہ کرنا پڑتی۔ تو اتنی خاطر مدارات، تواضع وتکریم کے بعد تعریف کے دو چار کلمے کہہ دینے میں زبان تو نہ گھستی تھی؟ مصنف وفنکار فرض شناس ہوتے ہیں، وہ دوسروں کوادائے فرض کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ وہ خود ہی فرض ادا کرنے سے کیسے غافل رہ سکتے تھے؟ جھوٹ موٹ کی تعریف بھی تو ایک قسم کا فرض ہے اور وہ بھی جبکہ اس کے دام میں موٹر کی سواری بھی ملتی ہو، خاطر تواضع بھی کی جاتی ہواور اپنے 'دردِزہ' کا مفت علاج بھی ہوتا ہو۔

سعیدہ خوش تھی، بہت خوش تھی۔ وہ ہر روز ایک غزل، ایک نظم کہہ لیتی یا ایک کہانی لکھ ڈالتی۔ تعریف ہمیشہ تخلیق کی رفتار کو بڑھا دیتی ہے اور تعریف ہمیشہ خریدی جاسکتی ہے۔ دام میں کبھی کبھی خونِ دل دینا پڑتا ہے مگر اکثر سپید وزرد سکّوں ہی سے کام نکل جاتا ہے۔ اسی لیے صاحبانِ فن ہم عصر بھی کبھی تعریفوں کے پھول سعیدہ کے صندلی تلوؤں کے نیچے بچھاتے، کبھی تعریفوں کے تاج اس کے سر پر پہناتے، اور کبھی تعریفوں کے ہار اس کے نازک گلے میں ڈال دیتے۔ ذہنی حیثیت سے نہ سہی مگر صورت شکل کے لحاظ سے سعیدہ اس قصیدہ خوانی کی مستحق بھی تھی۔ ساڑھے پانچ فٹ قد، متناسب اعضا، گورا رنگ، آفتابی چہرہ، لمبے لمبے کالے بال، چوڑی پیشانی، بڑی بڑی غزالی آنکھیں، ستواں ناک، پتلے عنابی ہونٹ، موتی کی طرح چمکتے ہوئے دانت اور چھوٹی پتلی ٹھوڑی پر ایک سیاہ تل، جب وہ براکیڈ کے غرارے، زری کے جمپر اور قوس وقزحی رنگ کے کامدانی کے دوپٹے میں ملبوس ہو کر مہمانوں کی پذیرائی کے لیے تیز قدم کمرے میں چلتی تو محسوس ہوتا مور ناچ رہا ہے۔ تتلی اُڑ رہی ہے اور ڈوبتا سورج بھاگتے ہوئے لکۂ ابر کو مختلف رنگوں میں ڈوب دے رہا ہے۔

سعیدہ کی آواز بھی سُریلی تھی اور اس کے بات کرنے اور کلام سنانے کا انداز بھی پیارا تھا۔ لوگ پیٹھ پیچھے جو چاہیں کہیں مگر سعیدہ کا سامنا ہوتے ہی ہر ایک کا جی یہی چاہتا کہ وہ اسی سے

مخاطب رہے، اسی سے باتیں کرتی رہے اور اسی سے مسکرا کر کہے۔ "آپ نے بڑی زحمت کی۔ مجھے بڑا ڈر تھا کہ آپ مجھ ناچیز کے ہاں آنے کے لیے شاید وقت نہ نکال سکیں گے۔ آپ کو زحمت تو ہوئی مگر میری بڑی سرفرازی بھی!"

سعیدہ ہر چھوٹے بڑے مصنّف، شاعر اور فنکار سے یہی کہتی۔ یہ اس کا روزمرہ تھا، مگر اس میں آورد کم اور آمد زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر مسرّت کی لہریں دوڑنے لگتی تھیں، اس کی آنکھوں سے خوشی ٹپکی پڑتی تھی اور اس کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ مہمان کو ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کے آتے ہی سعیدہ کو سارے جہان کی نعمتیں مل گئیں اور وہ خوشی میں جامے سے باہر ہوا چاہتی ہے۔

لیکن سعیدہ کی خوشیوں اور مسرّتوں کے ہرے بھرے باغ میں ایک جُھلسا، سوکھا ہوا ٹھونٹھ بھی تھا اور وہ تھی اس کے شوہر اشرف کی ذات۔ اشرف کوئی کم رُو جوان نہ تھا۔ وہ چھ فٹ کا چوڑے چکلے ہاتھ پاؤں والا مرد تھا۔ سعیدہ کی ساری سہیلیاں سعیدہ کی نظر بچا کر اسے دو ایک بار گھورتیں ضرور، مگر اشرف کی نظر میں تو صرف سعیدہ ہی سعیدہ تھی۔ اس کی موجودگی میں دوسروں کا وجود و عدم سب برابر۔ بس وہ بیوی ہی کو آنکھوں سے پئے جاتا، کھائے جاتا، شربت کی طرح، شراب کی طرح کتاب کی طرح۔

اشرف چمڑے کا بہت بڑا تاجر تھا۔ مختلف شہروں میں اس کے گودام تھے، خود بمبئی میں اس کی ٹینری تھی۔ صبح آٹھ بجے سے دس بجے رات تک وہ کھالیں خریدتا، اس کی دباغت کا کام دیکھتا، تیار کھال مختلف کمپنیوں کے لیے لدواتا اور بھیجتا رہتا تھا۔ اگر اسے ان کاموں سے آدھ گھنٹے کی بھی فرصت مل جاتی تو وہ موٹر تیز بھگاتا ہوا سعیدہ کے سیلون میں ضرور آتا۔ اسے ادیبوں کے مجمع میں دیکھ کر سعیدہ کے چہرے پر سراسیمگی اور آزردگی کی لہر ضرور دوڑ جاتی۔ وہ جو پہلے موم کی بنی ہوئی تھی یک لخت پتھر کی بن جاتی تھی۔ اس کی آمد ہمیشہ محفل کا رنگ بدل دیتی تھی۔ وہ آتے ہی کہتا: "ہیلو! ہیلو! ہیلو! ارے میاں کچھ کھانے کو بھی ملا کہ محض شاعری ہی سے پیٹ بھر رہے ہو تم لوگ؟"

اب آپ ہی بتائیے کہ کسی غزل کے درمیان یا کسی کہانی کے بیچ میں کھانے پینے کا ذکر کرنا کتنی مہمل سی بات ہے۔ پیٹ تو ہر وقت بھرا جا سکتا ہے۔ پلاؤ قورمہ نہ سہی سادا کھانا تو سب

ہی کومل جاتا ہے، لیکن روح کی پیاس مٹانے اور بجھانے کے لیے تو مخصوص ساعتیں ہیں۔ جہاں وہ گھڑی گزر گئی روح ہمیشہ کے لیے پیاسی بھوکی رہ گئی۔ یہ نازک سی بات جو سعیدہ کا جزوِ زندگی بن چکی تھی، چمڑے کے تاجر کے دماغ میں کیسے آتی۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ اپنے سوال کے بعد ہی خود ہی قہقہہ بھی لگایا جاتا۔ گویا اپنے اوچھے پن پر ڈھول پیٹ پیٹ کر خوشی کا اظہار بھی ضروری تھا۔

اس قہقہے میں دوسرے سننے والوں کو کتنی ہی آسودگی، کتنا ہی اطمینان اور کتنی ہی دل نواز موسیقیت محسوس ہوتی ہو مگر سعیدہ کے روحانی انبساط کے لیے تو وہ صورِ اسرافیل کا کام دیتا۔ سعیدہ کو محسوس ہوتا جیسے اس کے جسم و جان کا ہر تار جھنجھنا اُٹھا۔ وہ 'شی شی' یا 'ہش ہش' کہہ کر اور اپنے پھڑکتے لبوں پر اُنگلی رکھ کر اشرف کو خاموش تو کر دیتی تھی مگر پچھلی فضا بالکل برباد اور خراب ہو جاتی۔ اب ہر دماغ میں شعر و نغمہ کی جگہ میز پر چُنی ہوئی نعمتیں ہوتیں اور ہر نظر میں معشوق و محبوبِ خیالی کی جگہ کیک اور پیسٹری گھومنے لگتی۔ سعیدہ کو ادبی جلسہ جلد سے جلد ختم کر کے اس نشست کو کھانے پینے کی پارٹی میں تبدیل کر دینا پڑتا اور سعیدہ کی جگہ اشرف اس جلسے کی جان بن جاتا۔

مگر اشرف سعیدہ کی آزردگی محسوس کر لیتا اور کسی نہ کسی شاعر یا ادیب سے حسنِ تدبیر سے اس پر اصرار کرا دیتا کہ چائے کا دَور ختم ہوتے ہی سعیدہ اپنی نئی تخلیق ضرور سنائے اور ہر سننے والا حقِ نمک ضرور ادا کرے۔ سعیدہ اس حسنِ اخلاق کا سہرا محرک کے سر باندھتی، خاموش اشرف اس سے بھی محروم رہتا، بلکہ جب وہ بے اعتنائی سے اُکتا کر کام کا بہانہ کر کے سیلون سے نکل جاتا تو سعیدہ یہی کہتی: ''انھیں نہ تو ادب سے کوئی لگاؤ اور نہ ان کے لیے شعر میں کوئی مزہ۔ بس کھانا پینا ہو یا مُردار چمڑے کا کام! توبہ!''

نوجوان ادیب ایسے مواقع پر اظہارِ ہمدردی کر کے مخصوص نوازشوں سے سرفراز کیے جاتے، ان کو سعیدہ کے ساتھ سینما، ڈانس اور دوسری تفریحوں میں مفت شرکت کی عزّت ملتی اور وہ 'دوست' کے مخصوص لقب سے پکارے جاتے۔ وہ اپنے طور پر بڑبڑاتی: ''کیا ضرورت ہے ایسے جلسوں میں ان کے تشریف لانے کی؟ پھر آتے ہیں تو دس منٹ کے لیے، اپنے کمرے میں جا کر نہا دھو کر کپڑے بدل کر کیوں نہیں آتے۔ جس مصنّف اور شاعر کو دیکھو بن ٹھن کر آتا ہے۔

سر میں خوشبو دار تیل، کپڑے صاف ستھرے، سُرمہ لگائے ہوئے، عطر ملے ہوئے، تازہ شیو بنائے ہوئے اور یہ ہیں کہ نہ ڈھنگ کے کپڑے نہ بال میں کنگھا، خصی کی بو، بالکل حیوان صورت، ہیوان سیرت!"

یہی رونا وہ سہیلیوں سے روتی۔ جب وہ اس کے سیلون، اس کی محفل نما کوٹھی، اس کے ساز و سامان، اس کی نصف درجن موٹروں کا ذکر کرتیں تو وہ مسکرا مسکرا کر اُن کی باتیں سنتی، مگر جب وہ اسے اتنے دولت مند اور چاہنے والے میاں کے ملنے پر مبارک باد دیتیں تو اس کے ہلالی ابرو تلواروں کی طرح کھنچ جاتے۔ وہ کہتی: "ہے ہے بی بی، دیکھتیں نہیں کہ میں کتنی پیلی پڑگئی ہوں، کیسی گھُلی جارہی ہوں، ہر روز میری روح تحلیل ہوتی جارہی ہے۔ تم کو کیا معلوم کہ اللہ نے مجھ کو کیسا جوڑا دیا ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ چوڑے چکلے ہاتھ پاؤں ہیں، گورا چٹا رنگ ہے تو بس وہ سب کچھ ہوگئے۔ ارے اُن میں آدمیت چھو تک نہیں گئی ہے۔ ایک شعر بھی تو موزوں نہیں پڑھ سکتے۔ تشبیہ، استعارہ، صنعتیں، تلمیحیں، زبان و بیان کی باریکیاں، لطافتیں، روزمرّہ و محاورہ، کچھ بھی تو ان کے پلّے نہیں پڑتا۔ کبھی کوئی بات شاعرانہ انداز سے نہ کہیں گے۔ کسی مجسّمے، کسی تصویر کو دیکھ کر اُن کے چہرے پر انبساط کی لہر نہ دوڑے گی۔ منہ سے واہ نہ نکلے گی!"

سہیلی کہتی: "ارے نہ مسکراتے ہوں گے ان مردانہ تصویروں اور سنگی مجسّموں پر، تم کو تو دیکھ کر بک جاتے ہیں۔ تمھاری ادنیٰ مسکراہٹ حاصل کرنے کے لیے لمبی لمبی چکیں تو کاٹتے ہیں۔ مٹھی بھر بھر کر سونا تو تمھارے قدموں تلے ڈال دیتے ہیں!"

سعیدہ اور بھی چراغ پا ہوجاتی۔ وہ کہتی: "ارے تم کیا جانو، یہ سب کاہے کے لیے کرتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو مجھے سمیٹ کر اپنے سینے میں بھر لیں۔ میری ہڈیاں پسلیاں بھینچ بھینچ کر توڑ ڈالیں۔ جب اکیلے ہوں گے تو مجھے بس اس طرح گھوریں گے کہ دَم گھٹنے لگتا ہے۔ چیخ کر بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ پھر گھر میں رہیں گے تو ہر وقت بنیان تہمد پہنے رہیں گے۔ لاکھ صبح شام بنیائن بدلواتی ہوں مگر جہاں جسم پر پڑی اور سڑی ہوئی مچھلی کا جال بن گئی۔ معلوم ہوا ہے مردار چمڑے کی ساری بو ان کے جسم میں سرایت کر گئی ہے۔ بس وہ قریب آئے اور ناک سڑنے لگی!"

ایک سہیلی بولی: "مجھے تو مردانی بنیائن کی وہی کھٹی کھٹی بو پسند ہے۔"

سعیدہ نے اس کو بڑی حقارت سے دیکھا۔ وہ صوفے سے اُچک کر سنگار میز کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اپنے کپڑوں میں بہت سا سینٹ لگایا اور لیونڈر کی شیشی لے کر سہیلیوں تک آئی۔ ہر ایک کے جسم ہی پر نہیں بلکہ ہوا پر بھی بہت سا لیونڈر اُنڈیلا جب جا کر اسے تسکین ہوئی۔ وہ کیا کرے مُردار چمڑے کی بو سے اسے ہمیشہ متلی ہونے لگتی تھی۔

اِن دِنوں اشرف سے سعیدہ کی ناخوشی ایک خاص وجہ سے اور بڑھ گئی تھی۔ اسے ایک دوست نے اطلاع دی تھی کہ ایک ہز ہائینس چغتائی کی تصویروں کا ایک سیٹ نکالنا چاہتے ہیں۔ ہز ہائینس نے اسے لیا تھا پچاس ہزار میں، لیکن اب جو ریاست کے نکل جانے سے تنگی محسوس ہوئی تھی تو وہ اسے پچیس ہی ہزار میں نکالنے کے لیے تیار تھے۔ سعیدہ ان کے اس سیٹ کی تعریفیں مختلف لوگوں سے سن چکی تھی۔ وہ ایسے زرّیں موقع کو ہاتھ سے نکل جانے دینا نہ چاہتی تھی۔ وہ اشرف سے مصر تھی کہ اس پچیس ہزار کا بندوبست فوراً ہونا چاہیے۔ یہ تصویریں ضرور لے لی جائیں، مگر اشرف برابر ٹالتا رہا۔ کہتا تھا آج کل پیسوں کی کمی ہے۔ پچیس ہزار کی رقم تفریحی کاموں میں نہیں لگائی جاسکتی۔ سعیدہ اشرف کا یہ عذر روپیہ نہ دینے کا بہانہ سمجھتی تھی، مگر تھی یہی حقیقت۔ اشرف اس وقت بالکل کنگال ہو رہا تھا۔ وہ سعیدہ پر دل و جان سے عاشق تھا وہ اس کی خوشی کے لیے سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنی بساط سے کہیں زیادہ سعیدہ کی خوشی پر صرف کیا تھا۔ تین برس کی شادی شدہ زندگی میں وہ سنجیدہ کو پچیس تیس لاکھ روپیہ دے چکا تھا۔ شروع شروع میں تو اپنی ہی پونجی سے کام چلا تھا۔ پھر اُسے قرض اُدھار بھی لینا پڑا اور وہ ہر طرف سے ہار کر اسی سفید ہاتھی کا بوجھ اُٹھانے کے لیے تجارتی جوا کھیلنے لگا۔ اس نے گھوڑ دوڑوں میں بازی لگائی، اُس نے سٹا کھیلا اور وہ شیئر مارکیٹ کا کھلاڑی بن گیا۔ یہ تجارتی جوا ایسا روگ ہے جسے پال کر کبھی کوئی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اس کے لیے کروڑوں کا سرمایہ ہونا چاہیے۔ اور سیکڑوں کی تعداد میں بے ایمانیاں کرنے والے خفیہ ساتھی اور مددگار۔

اس زہریلی شراب کا چسکا لگایا اشرف کے اس سیٹھ دوست نے جو اس کے کارخانوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ شروع شروع میں اس نے اشرف کو چھوٹی چھوٹی ٹپیں دیں، ان میں اسے پچیس تیس ہزار کا فائدہ ہوگیا۔ یہ سمجھا سعیدہ کے خوش رکھنے کا ٹوٹکا ہاتھ لگا۔ سیٹھ کی گھر پر دعوت کی۔ سعیدہ سے ملاقات کرادوں تو یہ اور بھی خیال رکھے گا۔ وہاں سعیدہ کو اپنی تفریح سے کہاں

فرصت۔ نہ اُس نے دعوت کا کوئی انتظام کیا اور نہ میز پر وہ ساتھ بیٹھی۔ اُس کا اپنا پہلے سے ہی پروگرام بن چکا تھا۔ وہ کچھ نوجوان ادیبوں اور فنکاروں کو ساتھ لے کر سنیما دیکھنے چلی گئی۔ سیٹھ نے اس بے اعتنائی کو اپنی انتہائی ذلّت سمجھا۔ اسے اشرف سے اور کد پیدا ہو گئی۔ خود غرضی میں بدلہ لینے کے خیال نے نمک مرچ کا اضافہ کیا۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا کا مصداق بنا۔ اُس نے مخلص بن کر ایک دیوالیہ کمپنی میں لاکھوں روپے اشرف سے لگوا دیئے۔ دو ایک دن تو اس کے حصوں کا بھاؤ خود ہی بڑھاتا رہا۔ جب اشرف پوری طرح پھنس گیا تو اُس نے سارے حصے کوڑیوں کے مول بکوانا شروع کر دیئے۔ کمپنی ٹوٹ گئی اور اشرف کا دیوالہ نکل گیا۔

اشرف جانتا تھا بیوی کو تجارتی کاروبار کے ذکر ہی سے اُلجھن ہونے لگتی ہے۔ وہ سعیدہ سے کیا کہتا۔ وہ اسے بہانہ سمجھ کر اور ناخوش ہو جاتی۔ اس کا دماغ پھٹا جاتا تھا، اس کا دل بیٹھا جاتا تھا، مگر اس نے لب سی لیے، اُس نے کچھ نہ کہا۔ اتفاق یہ کہ اسی شام کو راجہ کا پیغام آیا۔ اگر آپ تصویروں کا سیٹ لینا چاہتی ہیں تو بارہ گھنٹے کے اندر لے لیجیے ورنہ مجبوراً دوسرے گاہک کو دے دینا پڑے گا۔ بس صبح اُٹھتے ہی سعیدہ نے حکم جاری کر دیا: ''جس طرح بنے مجھے آج پچیس ہزار مل جانا چاہئیں۔ فوراً چیک کاٹ کر مجھے دو۔''

اشرف نے کہا: ''بیگم چیک کاٹ کر کیا کروں گا، بینک میں ایک پیسہ نہیں!''

سعیدہ پاؤں پٹک کر بولی: ''میں کچھ نہیں جانتی! قرض لو، کارخانہ بیچو، اپنے کو بیچو مگر مجھے روپے لا کر دو!''

اشرف گھبرا کر باہر جانے لگا۔ وہ بولی: ''گھر پلٹنا تو روپے لے کر آنا، خالی ہاتھ ہرگز نہ آنا۔''

اشرف نے سعیدہ کو حسرت بھری نظر سے دیکھا اور گردن جُھکائے نکل گیا۔ کارخانے پہنچا تو وہاں قرض خواہوں کا پورا گروہ منتظر ملا۔ سب کا تقاضہ تھا روپے ادا کرو ورنہ قرقی لاتے ہیں۔ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ وعدہ کر کے ٹالا۔ اشرف کرے تو کیا کرے۔ روپیوں کا بندوبست تو کرنا ہی تھا۔ مختلف جگہوں پر ٹیلی فون کیا، جن سے لین دین بیوہار تھا اُن سے قرض مانگا، ٹکا سا جواب ملا۔ کمپنی کے منیجروں اور ایجنٹوں سے ملاقات کی، سب نے قرض دینے سے انکار کر دیا، سب کو جیسے یقین تھا کہ اس ڈوبتے کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھاتے ہی وہ خود بھی ڈوب جائیں گے۔

شام کو تھکا ماندہ وہ اِدھر اُدھر گھومتا پھرا۔ آٹھ بجے کے قریب وہ گیٹ وے آف انڈیا کی طرف جانکلا۔ برسات کا زمانہ تھا، پانی برس چکا تھا، مگر ہوا تیز تھی اور سمندر کا مد پورے زور پر تھا۔ وہ سمندر کے کنارے والی دیوار پر کہنیاں رکھ کر بپھرے ہوئے بحر کے سماں سے لطف لینے لگا۔ خود اُس کے دل و دماغ میں کچھ اسی طرح کا تموّج تھا۔ زندگی میں کبھی سکون نہ پیدا ہوا۔ خود سے چھوٹے پیانے کی تجارت کو بڑھا کر سرمایہ داروں کی ٹولی میں گھسا۔ نہ جانے کتنی دشوار گزار منزلوں کو پار کرنا پڑا۔ کیسے کیسے ہفت خواں طے کیے۔ ابھی فروغ حاصل ہو چکا تھا کہ سعیدہ کے عشق نے دیوانہ بنایا۔ کوششیں کی، تدبیریں کیں، اُس بت کو رام کیا، بیوی بنا کر گھر لایا، مگر وہ معشوقہ کی معشوقہ ہی رہی۔ اس کی خوشی کے لیے اچھے خاصے چلتے ہوئے دھندے کو بگاڑا۔ اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلایا، سعیدہ کی فرمائشیں پوری کرنے میں بال بال مقروض ہوا۔ سب کچھ داؤں پر لگا کر ہار گیا۔ اس قربانی کے بدلے میں ہاتھ کیا آیا، کچھ بھی نہیں۔ نہ رفاقت ملی، نہ خدمت کرنے اور درد دُکھ بٹانے کی خواہش۔ وہی تنہائی، وہی اکیلا پن۔ سعیدہ نے نہ تو اس کی روح کی تڑپ کو پہچانا، نہ اس کے لہکتے ہوئے جذبات کی گرمی بٹائی۔ دونوں کے جسم یقینی ملے مگر کبھی ایک نہ ہوئے۔ کھانے کو ٹکڑا ملا ضرور مگر اسی انداز سے جیسے بھوکے کتّے کے سامنے ہڈّی پھینک دی جائے۔ جیسے دہکتے تنور میں چلو بھر پانی کا چھینٹا مارا جائے۔

اشرف کے کھولتے ہوئے دماغ میں کچھ اس طرح کے خیالات اُبھرتے اور مٹتے تھے کہ دفعتہً اُبلتی، بل کھاتی، اُچھلتی موج آئی اور پشتے سے ٹکرا کر وہ فوارہ اُڑایا کہ اشرف کے کپڑے بھیگ گئے۔ ساتھ ہی میٹھی سریلی آوازوں میں بچوں اور عورتوں کی ہلکی ہلکی چیخیں سنائی دیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، اسی کی طرح اس طوفانی منظر سے لطف لینے والے بچّے، عورتیں، جوان، بوڑھے سب موج کے اس آبشار سے بچنے کے لیے سڑک تک پیچھے بھاگتے دکھائی دیئے۔ اسے تعجب بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی، غصّہ بھی آیا، جھنجھلاہٹ بھی محسوس ہوئی۔ واہ یہ لوگ بھی کچھ سعیدہ ہی کے سے ہیں۔ سمندر کی چمک بھڑک سے لطف اندوز تو ہونا چاہتے ہیں، اُونچی عمارتیں کی روشنیوں کا عکس اُس کے سینے میں جو سنہری دیئے جلاتا ہے اس سے آنکھ تو سینک سکتے ہیں مگر اس کے آغوش میں جا کر اس کے دل کے داغ کو نہیں مٹا سکتے۔ اس کے منہ سے غم و غصّہ کا کف نہیں پونچھ سکتے۔ اور ویسے ہی اس کے کان بجنے لگے۔ "گھر آنا تو خالی ہاتھ نہ آنا! خالی

ہاتھ ہرگز ہرگز گھر نہ آنا! ہرگز ہرگز نہ آنا!'' اور اس کے پاس خالی ہاتھوں کے سوا اب اور کیا تھا۔ نہ کارخانہ نہ گودام، نہ دُکان، نہ ملازم نہ دوست، اور... اور... اور نہ بیوی!

ویسے ہی سمندر دونوں ہاتھ پھیلائے آواز دیتا ہوا بڑھا۔ ''آ، میرے پاس چلا آ! تیرا گھر یہاں ہے! تیری جگہ میرے دل میں ہے۔ ہر قطرے کو ایک نہ ایک دن یہیں آنا ہے۔ تو کیوں بھٹکا بھٹکا پھرتا ہے۔ کیوں ناقدروں میں گھرا کھڑا ہے، کیوں اجنبیوں سے آسرا لگائے بیٹھا ہے، آ، جلد آ، میری گود میں!''

اشرف کھل کر ہنسا اور پشتے پر چڑھ کر پلٹتی موجوں کے ساتھ ہولیا۔

سعیدہ کو غش پر غش آتے رہے، مگر کوٹھی بھی بکی اور سیلون کا پورا عجائب خانہ بھی، نہ کوئی مجسمہ بچا، نہ کوئی تصویر، نہ فرنیچر، نہ قالین، نہ جھاڑ، نہ فانوس، سب کچھ کوڑیوں کے مول نیلام ہوگیا اور اب سعیدہ ایک اسکول میں ساٹھ روپیہ ماہوار پر آرٹ مسٹریس ہے۔ اور وہ ایک ایسے مکان کی پہلی منزل پر رہتی ہے جس کے صحن اور نچلے حصّے میں دباغت کا کام ہوتا ہے اور اسے اس کی بو سے نہ تو قے آتی ہے نہ چکّر آتا ہے اور نہ دردِ سر ہوتا ہے۔ شاید وہ اب خود ہی مردار چمڑا ہے!

ناکردہ گُناہ

لڑکیوں نے منوّر کو بری طرح گھیرا تھا جیسے سبھوں نے سازش کی تھی کہ آج اس ٹینی کے پروبال نوچ ہی کے چھوڑیں گے۔ وہ ہمیشہ ان کے راستے سے کترا کے چلا۔ درجہ میں سدا ان سے دُور ہی بیٹھا، مگر آج شامت کا مارا گردن جھکائے، خیالی پلاؤ پکاتا وہ چلا آرہا تھا کہ دفعتہً پریوں کا پورا پرا حلقہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مرغِ نوگرفتار کی طرح ان پر خوفزدہ نظر ڈالی۔

رشیدہ گڑگڑا کے بولی: ''اللہ منوّر صاحب، ہم غریبوں سے کبھی تو دو گال ہنس بول لیا کیجیے۔''

فیروزہ نے ہاتھ چمکا کر کہا: ''نہ جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو، مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟''

منوّر نے رومال جیب سے نکال کر پسیجتے ہوئے ہاتھ پونچھے۔ اس کی زبان سے سوائے 'جی، جی' کے کچھ نہ نکلا۔

جمیلہ عطر بیز ہوئیں: ''ہم اپنی یونیورسٹی کے راجہ اِندر سے پوچھنے آئے ہیں کہ ان کی باندیوں سے کیا قصور سرزد ہوا ہے۔''

رشیدہ نے بڑی لمبی سانس لی: ''بہن میں نے تو آج تک اس شکل صورت، اس قد و قامت کا جوان نہیں دیکھا۔''

فیروزہ نے منوّر کے سر سے ایک فٹ بلندی پر اس طرح نظر جمائی جیسے وہ سچ مچ چھ فٹ ہی کا تو ہے۔ ''ہاں بہن اس نگوڑے ملک میں جسے دیکھو سوا بالشت کا ہے، اب جو یہ ماشاءاللہ ذرا بلند و بالا قد و قامت کے ہوئے......''

منوّر نے زبان ہونٹوں پر پھرا کے کہا: ''آخر.... آخر.... آپ..... آپ..... لوگو..... لوگوں کا مط.... مطلب کیا ہے؟''

انور چمک کے بولی: ''اے ہے، بہن دیکھو تو کیسی شیریں زبان ہے۔ اللہ اللہ کیا طاقت ہے، کیا روانی ہے!''

شیلا نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔ ''چہ.... چہ.... چہ....! اب اگر یہ ذرا ہکلاتے ہیں تو اس میں ان غریب کا کیا قصور....''

انور جھٹ گل ریز ہوئی: ''قصور کی بھی ایک ہی کہی۔ یہی تو اُن کا سب سے بڑا حسن ہے۔ سچ مانئے منوّر صاحب، مجھے آپ کا ہکلانا اتنا ہی پسند ہے جتنا کہ حضرت موسیٰ کا ہکلانا اللہ میاں کو پسند تھا.....!''

اور منوّر بھاگا، بے تحاشا بھاگا، تیز تیز قدم رکھتا، اٹھارہ سال کا نوجوان پر یمی ہانپتا، خشک سسکیاں لیتا گھر پلٹا۔ اُس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا، اس نے کتابیں میز پر پھینک دیں، اُس نے شیروانی اور ٹوپی کرسی پر ڈال دی۔ اُس نے خود کو بستر پر گرا دیا۔ نقرئی قہقہوں کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ لپ اسٹک سے رنگین ہونٹوں کی کمانیں اب بھی کھنچ رہی تھیں۔ بازوؤں پر بل کھاتی ہوئی لپٹیں اب بھی منوّر کے حلق کا پھندا بن رہی تھیں۔ ''یونیورسٹی کے راجہ اِندر نے سر سے پاؤں تک لحاف اوڑھ لیا۔

سنیما ہال میں اندھیرا ہوگیا، ہمایوں نے تاریخ کو جھٹلانے کے لیے بابر کی زندگی ہی میں حمیدہ سے عشق شروع کر دیا۔ اُس نے چوری بھی کی اور سینہ زوری بھی۔ اُس نے معمولی آدمی بن کر حمیدہ سے بے باکی کی، اور وہ شہزادہ بن کر قابل معافی بھی ٹھہرا۔ منوّر کی بغل میں بیٹھی ہوئی ایک حمیدہ کے دل میں ہمایوں کی پکار اُٹھی۔ اُس کا ہاتھ خود بخود منوّر کے زانو پر اس طرح آ گرا جس طرح گلاب کی پنکھڑی گلے کے ہار سے ٹوٹ کر حلقے کھاتی گود میں آ پڑتی ہے۔ منوّر نے اسے اپنی مٹھی میں اسی طرح بند کرلیا جس طرح بچے ناچتی ہوئی تتلی پکڑ لیتے ہیں۔ ایک برقی رو رگوں میں دوڑ گئی۔ ایک معطر جسم قریب تر کھسک آیا۔ کندھے سے کندھا، زانو سے زانو مل گیا۔ منوّر نے کان میں کچھ کہا، مسکرا کر اثبات میں جواب ملا۔ انگلیوں میں انگلیاں پھنستی رہیں، گرم گرم سانسیں نکلتی رہیں، تماشا ہوتا رہا، بابر نے لعل سی جان صدقہ کر دی، ہمایوں اور حمیدہ کا عشق جاری رہا....''

کمرے میں پلنگ کے پائینتی دیوار پر قدِ آدم آئینہ نصب تھا۔ چہرہ نظر پڑا، سوکھا، لمبوترا، فاقہ زدہ سا۔ اس شکل صورت کا جوان۔''

''جھٹپٹا وقت ہے۔ دن کے نورانی چہرے کو رات نے اپنی زلف مشکیں سے چھپانا شروع کر دیا ہے۔ چڑیاں شفق کے رنگین دامن میں اڑتی اپنے گھونسلوں کی گود میں جا رہی ہیں۔ منوّر اپنی نئی 'بائک' ڈرائیو کرتا ہوا نکلا ہے۔ آج اس نے حیدر آباد کی سلی ہوئی ہمیرو کی نئی شیروانی پہن رکھی ہے، اسے خود محسوس ہو رہا ہے کہ وہ حسین ہے، جوان ہے، دولتمند ہے، لیکن اس کے دل میں مسرت وطمانیت کے جذبات سے ملی جلی ہوئی ایک بے اطمینانی بھی ہے۔ اس کے ان آثارِ دولت وشباب سے لطف اندوز ہونے والا کوئی۔ ایسا شریک نہیں جو چند پیسوں میں خریدا جا سکے۔ وہ بھی نہیں جو وعدوں میں بہلایا جا سکے بلکہ وہ جس کی خوشی ہی رونے کو پیشکش بنانا ہو، وہ جو قربانی کو تحفہ وہدیہ سمجھے، وہ جو ہوا میں ناچتے ہوئے ذرّوں کی طرح ملے، ایک لمحہ کے لیے بغلگیر ہو کر رقص کرے اور پھر فضا کے وسیع ودامن میں اس طرح غائب ہو جائے کہ نہ تو اس اضطراری قرار کے بعد پھر ملنے کی تمنا ہو نہ خواہش، نہ جستجو، نہ بدنامی کا ڈر، نہ رسوائی کا خطرہ اور نہ بعد کی ذمہ داریاں۔ منوّر اس سے ملے، بالکل اسی طرح جیسے دو مغنّیوں کی آوازیں مل کر کچھ دیر کے لیے ایک لے، ایک سُر، ایک تان بنتی ہیں، پھر الگ ہو کر دو بن جاتی ہیں۔ وہ چنگاری اور لکڑی کی طرح مل کر آگ لگائیں اور شعلہ جوالہ بن کر الگ ہو جائیں وہ دو ساتھ ٹوٹے ہوئے شہاب ثاقب بن کر اپنے دلوں کو پرنور بنائیں اور پھر نظروں سے غائب ہو جائیں۔ ان کی اتحادی چمک جگنو کی چمک ہو، وقتی، غیر پائندہ، اگیا بیتالی۔

منوّر نے اپنی موٹر شہر سے باہر موڑ دی ہے۔ مضافات سے نکلتے ہی اسے گرانڈ ٹرنک روڈ مل گئی ہے۔ آم، اِملی، برگد، پیپل کے سایہ میں پروان چڑھتی ہوئی، بیوہ کی مانگ کی طرح سپید، دودھ کی دُھلی، موٹر فاصلہ کو پھانکتی چلی جا رہی ہے۔ وہ خود سیٹی بجا رہی ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ مگن ہے بلکہ اس لیے کہ سیٹیاں اکثر بلانے میں دعوت نامہ کا کام دیتی ہیں۔ دفعتہً بیچ سڑک پر ایک ارغوانی گاؤن میں ملبوس ایک مغربی دوشیزہ ریشمی رومال ہلاتی کھڑی دِکھائی دیتی ہے۔ خواب کی تعبیر مل گئی۔ جاودانی وابدی لمحہ عشرت! ایک غیر فانی، مستقل، بھینی بھینی خوشبو!''

لحاف چہرے سے ہٹا، کان بجنے لگے۔ ''اب جو یہ ماشاء اللہ ذرا بلند وبالا قد وقامت کے ہوئے۔'' شرم نے پردہ ڈال دیا۔

''لکھنؤ میں دنگل ہے، ساری دُنیا کے پہلوان سمٹ کر آئے ہیں۔ ہر ایک چیل وہاں، ہر ایک رستم زماں، جو چلتا زمین ہلتی، ڈر لگتا، بوجھ نہ اُٹھا سکے گی۔ لوگ جوق در جوق ان کی کشتیاں

دیکھنے آئے ہیں، منوّر بھی ایک کونے میں بیٹھا ہے، کبھی زبسکو کے تن و توش پر ہنسی آتی ہے، کبھی کریمر کی اکڑ پر، کبھی تعجب سے گاما کو دیکھتا ہے، کبھی غلام حسین کو، کبھی ہربنس سنگھ کو۔ کشتی شروع ہوئی، چھوٹے پٹھے لڑ رہے ہیں۔ ان چھوٹے جوڑوں میں مزہ نہیں آرہا ہے۔ بارے کریمر کی باری آئی۔ مقابل چنگیز ہے۔ دیو کا دیو، اکھاڑے میں آتا بھی ہے تو چنگھاڑتا ہوا۔ ہندوستانی سمجھ رہے ہیں کہ اب جرمن کی شامت آئی۔ یہ دیو اسے مٹھی میں سمیٹ کر منہ کا نوالہ بنا ڈالے گا، مگر ہاتھ ملاتے ہی معاملہ دگرگوں ہو گیا۔ کریمر کی بغل میں چنگیز کی گردن اس طرح دبی تھی جس طرح بلّی کے منہ میں مرغی کی گردن، اور ہندوستانی پہلوان پھڑ پھڑاتا کمان کی طرح دہرا ہوتا ہوا زمین سے مل گیا۔ پچاس ہزار ہندوستانیوں کا مجمع شرم سے عرق عرق ہو گیا۔

جرمن نے للکارا: ''ہندوستانی پہلوان آئے، گاما خود آئے ہمیں پچھاڑ دے، ہم دس ہجار کی چیک دے گا!'' سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ گاما کے بھائی بھتیجے کسمسائے، گاما نے انھیں آنکھوں کے اشارہ سے روک دیا۔ پہلوانوں کی قطار پر نظرِ حقارت ڈال کر جرمن پھر بولا: ''ہم گاما سے کشتی مانگتا ہے، ابھی یہیں!''

منوّر کو تابِ ضبط نہ رہی۔ وہ ملکی توہین برداشت نہ کرسکا۔ اُچکتا پھاندتا، اچکن کے بٹن کھولتا اکھاڑے کے پاس پہنچ گیا۔ سب لوگ استعجاب سے دیکھ رہے ہیں، اس نوجوان کو کیا ہوا ہے اس نے جرمن کریمر سے کہا: ''میں تم سے لڑوں گا۔'' وہ ہنسا: ''ہم بچوں سے نہیں لڑتا۔'' منوّر نے امپیریل بینک کی چیک بک نکالی۔ دس ہزار کا چیک لکھ کے اکھاڑے کی مینڈ پر رکھ دیا۔ ''اگر مجھے چت کر دو تو یہ دس ہزار تمھارے۔'' جرمن اتنی بڑی رقم دیکھ کر تیار ہو گیا۔ لوگوں نے کہا: ''بھیا، کرتا پائجامہ تو اُتار ڈالیے، چٹ لنگوٹ باندھ لیجیے۔'' منوّر نے کہا: ''اس جرمن سے لڑنے میں میرے کپڑے مٹی میں نہ بھرنے کے۔'' اکھاڑے میں اس طرح اُترا جیسے گلگشت چمن کو جا رہا ہے۔ جرمن گھبرا گیا۔ مور چیل سے لڑنے آئی ہے کوئی بھید ضرور ہے۔ ہندوستانی جادو کا کوئی لٹکا یقینی ہے۔ دل کہتا ہزار آنکھیں پیدا کر کے ہر طرف کے وار کو دیکھتا رہے۔ منوّر نے زیادہ غور کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ہاتھ ملاتے ہی اکھیڑ ماری اور جرمن کوہ کو کاہ کی طرح زمین پر چت پٹکا۔ سراسیمہ جرمن کے سینے پر پاؤں رکھ کر وہ بولا: ''اب پھر ہندوستانیوں کو اس طرح نہ للکارنا!'' شیروانی پہن کر جب وہ اپنی چیک بک جیب میں ڈال کر چلا تو گاما نے لپک کر اسے کندھے پر بٹھاتے ہوئے کہا: ''میں نے دُنیا بھر کے پہلوانوں کو زیر کیا مگر اتنی صفائی، اتنی

پھرتی میں بھی آج تک نہ دِکھا سکا۔"

پھر وہی بے بسی، وہی دَم گھٹنے والی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ وہی موجوں کے تھپیڑوں سے سانس رُک جانے والا احساس۔ "باندیوں سے قصور" ضرور ہونے والا فقرہ دماغ میں گونجنے لگا۔ اس نے کروٹ لی، لب بند، مٹھیاں بند، آنکھیں بند....!

"کل ہند کرکٹ ٹیم سے اور آسٹریلیا والوں سے میچ ہے۔ آسٹریلیا والے پہلے بیٹنگ کر چکے ہیں۔ ہندوستانیوں کی بالنگ اچھی خاصی پٹی ہے۔ آسٹریلیا والوں نے چار سو رن کیے۔ اب ہندوستانیوں کے کھیلنے کی باری ہے۔ ہندوستانیوں کو بڑا ڈر ہے کہ اب کے ضرور ہارے۔ ابتدا بھی کچھ اچھی نہیں ہوئی۔ بارہویں رن پر ایک لڑکا آؤٹ ہو گیا۔ اب منوّر جاتا ہے۔ اُس نے پہنچتے ہی وہ رنگ جمایا کہ سب دنگ رہ گئے، اُس نے وہ وہ ہاتھ نکالے کہ بار بار تحسین و آفریں کے نعروں اور تعریفی تالیوں سے میدان گونج اُٹھا۔ اُس نے اکیلے تین سو پچھتّر رن کیے اور ایک بھی مشکوک ہاتھ نہ مارا۔ اُس نے پچیس باؤنڈریاں لگائیں اور دس چھکے جھاڑے۔ جب وہ بغیر آؤٹ ہوئے شام کو میدان سے پلٹا تو ہندوستانی ٹیم کے کپتان مرچنٹ نے اسے گود میں اُٹھا لیا اور آسٹریلیا کے کپتان ہیٹ نے کہا: "آج تم نے بریڈ مین کو بھی مات کر دیا۔"

کھیل سے زیادہ اس کی انگلیاں کالج کی لڑکیوں کی ڈائریوں اور نوٹ بکوں پر دستخط کرتے کرتے دُکھ گئیں۔ اور لوسی، وہی جو کسی ہندوستان لڑکے سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتی تھی، آپے سے باہر ہو گئی۔ وہ اسے زبردستی موٹر میں بٹھا کر گھر لے گئی۔ وہ بڑے پیار سے بولی: "تم تھک گئے ہو گے، گرم پانی سے نہالو۔" وہ منوّر کو اپنے سونے کے کمرے میں سے ہو کر حمام میں لے گئی۔ اُس نے سنگِ مرمر کے بڑے ٹب میں گرم پانی کا نل کھول دیا۔ منوّر اس عجیب طرح کی گرفتاری پر گھبرایا گیا اور کھڑا رہا۔ لوسی نے ہنس کر اسے کرسی پر بٹھایا اور خود جھک کر اس کے جوتے کے فیتے کھولنے لگی۔ منوّر نے روکتے ہوئے کہا: "ارے یہ کیا کر رہی ہو؟" وہ اپنی لٹوں کو چہرے سے ہٹاتی ہوئی بولی: "میں ایک حمامی کی طرح تمھیں آج اپنے ہاتھوں سے نہلاؤں گی، میرے دیوتا!"

منوّر نے آنکھیں کھول دیں، پھر وہی ہنستے ہوئے چہرے، وہی اشارہ کرتی ہوئی آنکھیں، وہی زہر اُگلتے ہوئے شیریں لب، کیسی شیریں زبان ہے، اللہ، اللہ کیا طلاقت ہے، کیا

روانی ہے!"

یونیورسٹی میں تقریر کا مقابلہ ہے، ہال کھچا کھچ بھرا ہے۔ ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں کے طلبا آئے ہیں۔ ڈھاکہ، کلکتہ، پٹنہ، بنارس، الٰہ آباد، آگرہ، علی گڑھ، دلّی، لاہور، بمبئی، ناگپور، حیدرآباد، مدراس سب جگہ کے بولنے والے بلائے گئے۔ دُنیا کے مشہور مقرر، چرچل، بیون، لاسکی، اسٹالن، مالٹو، ٹرومین، مادام شنکائی شیک، مسز پنڈت، سروجنی نائیڈو، گاندھی، پٹیل، راج گوپال آچاریہ، سری نواس شاستری، سرت چندر بوس، مسانی، پنتھ، جناح، کچلو، ذاکر حسین، آزاد، ہادی حسن، غلام السیدین، کلب عباس، سب ہی موجود تھے۔ ریزولیشن ہے۔ اُس ایوان کی رائے میں سائنس کی جدید ایجادات دشمنِ انسانیت ہیں۔"

منوّر اس ریزولیشن کی تحریک کرنے کھڑا ہوا۔ چند ہی منٹ کی تقریر میں اس نے مجمع کو مسحور کر دیا۔ لوگ جھومتے تھے، تالیاں پیٹتے تھے، ہنستے تھے، روتے تھے، غصہ سے بوٹیاں نوچتے تھے، ہوا سے لڑتے، آگ میں پھاندنے کے لیے تیار تھے۔ معلوم ہوا فیاض خاں کے خیال کے بعد مایا بنرجی نے ایک فلمی گانا گایا۔ اسی کی یہ گت نہ بنی بلکہ ایک ایک کر کے سب بولے۔ چھوٹے بڑے، ملکی غیر ملکی، مگر سب کی تقریر اس کے آگے بالکل ویسی ہی تھی۔ جیسے کہکشاں کے سامنے پھلجھڑی! منوّر نے آخر میں جوابی تقریر کی۔ تمام اعتراضوں کے مسکت جواب، اس البیلے انداز، اس اچھوتے ڈھنگ سے پیش کیے کہ شک نے یقین کا درجہ حاصل کر لیا۔ دشمنی دوستی میں تبدیل ہو گئی اور مخالفت موافقت بن گئی۔ لڑکوں نے نعرے لگائے، لڑکیوں نے ہار برسائے۔ لیڈروں نے تعریفیں کیں۔ شاستری نے کہا: "مجھے اس نوجوان کے ہندوستانی ہونے پر فخر ہے۔" آزاد نے کہا: "میرے بعد کانگریس کی صدارت اسی کو ملنا چاہیے۔" جناح بولے: "میرے پاکستان کا پہلا وزیر اعظم وہی ہوگا!" گاندھی جی نے کہا: "اس کی زبان میں میرے برتھ سے زیادہ زور ہے۔" چرچل نے کہا: "اگر میری جگہ یہ نوجوان برطانیہ کا وزیر اعظم ہوتا تو جنگ عظیم چٹکیوں میں ختم کر دیتا اور باتوں باتوں میں ہٹلر کا قلع قمع کر دیتا۔" اسٹالن نے مونچھوں میں مسکرا کر کہا: "اس کی باتوں میں اسٹیلن گراڈ سے زیادہ استحکام ہے۔" ٹرومین عینک سیدھی کر کے بولے: "اس کی زبان میں ایٹم بم سے زیادہ زور ہے۔"

اس نے شان سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ شیروانی اور ٹوپی کرسی پر، کتابیں کاپیاں میز پر بے ترتیب پڑی تھیں۔ دیکھتے ہی پھر گھبراہٹ عود کر آئی۔ فیروزہ نے کس طرح شعر پڑھا تھا:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟

''شکیلہ کو اپنی حاضر جوابی اور شعر خوانی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ نہ جانے کتنے دیوان حفظ تھے اس کو، اس پر آواز بھی غضب کی پائی تھی۔ گانے کے فن سے بھی واقف تھی۔ خود بھی اچھا خاصا کہہ لیتی تھی، اسی لیے تو کہتی: ''اگر کوئی مجھ سے اچھے اشعار برمحل پڑھ کر سنا دے تو میں اس کی عمر بھر کے لیے کنیز بن جاؤں گی۔'' ایک دن لڑکیوں نے زبردستی اس کا منوّر سے مقابلہ کرا دیا۔ کئی گھنٹے دونوں شعر پڑھا کیے۔ منوّر پہلے تو شعر کے جواب میں شعر پڑھتا رہا، پھر اس نے پورے پورے قصیدے، مثنویوں کے پورے پورے باب سنانا شروع کر دیے۔ شکیلہ سمجھ گئی، یہ بھوت اس کے قابو کا نہیں۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں منوّر سے کہا: ''مَیں ہار گئی، مَیں تمھاری کنیز ہوں، لیکن ہم چشموں میں ذلیل نہ کرو!'' منوّر اس کا پیغام سمجھ گیا۔ اس نے ایک عجیب طرح کا مدہوش کن سرور محسوس کیا۔ اُس نے اپنے دل کو قابو میں لانے کے لیے گلے کا بٹن کھولنا چاہا، وہ نہ جانے کیوں اُلجھ گیا اور منوّر کے جھٹکا دینے پر ٹوٹ کر الگ جا گرا۔

شکیلہ نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے سراج دکنی کا شعر پڑھ دیا:

شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے وہ لباسِ برہنگی
کہ جنوں کی جامہ دری رہی، نہ خرد کی بخیہ گری رہی

منوّر یہ کہتا اُٹھ آیا کہ ''اگر اس شعر کے بعد ٹکوں گا تو کپڑے پھاڑ ڈالنا پڑیں گے۔'' اسی شب میں جب وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹا تو تھوڑی دیر بعد شکیلہ آئی۔ شب خوابی کے کپڑے پہنے، لٹیں جھکائے، چہرہ گلزار کیے، جام بدست مے بجام، منوّر نے کنکھیوں سے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اور قریب آئی، خراماں خراماں، گل بکھیرتی، فضا کو معطر کرتی، اپنی مسکراہٹوں سے ہر چیز کو جگاتی، وہ آہستہ سے اس کے سرہانے بیٹھ کر جھکی۔ اُس نے گدگدانے والی آواز میں پوچھا: ''کالے عاشق شوریدۂ من خوابست ہست؟''

ماں نے دروازہ کھٹکھٹایا: ''منوّر! منوّر!''

اُس نے لحاف ہٹا کر جواب دیا: ''کیا ہے امّی؟''

''ارے تو یہاں لحاف میں منہ لپیٹے کمرہ بند کیے پڑا ہے، وہاں تیری بہن نے آج کالج کی ساری لڑکیوں کو چائے پر بلا رکھا ہے۔ وہاں چل۔ سب تیرا انتظار کر رہی ہیں۔'' ماں نادری

حکم سنا کر چلی گئی۔ سنگ آمد وسخت آمد۔

منوّر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے مٹھیاں کس لیں، دانت بھینچ لیے، سر اُونچا کیا اور سینہ تان کر دروازے کی طرف اسی شان، اسی تمکنت اور اسی خودداری کے ساتھ چلا جو دار پر چڑھتے وقت چارلس اوّل نے دِکھائی تھی۔ اُس نے بڑی بے پروائی سے دروازہ کھولا۔ نقرئی قہقہوں کے ساتھ جانی پہچانی آواز میں کوئی کہہ رہا تھا: ''وہ بھاگے! بے تحاشا بھاگے!'' منوّر نے جلدی سے دروازہ بند کرلیا، وہ کیواڑوں کے سہارے کھڑا ہو کر جھلملاتے چراغ کی لو کی طرح کانپنے لگا۔

(ماہنامہ آج کل، دہلی یکم اگست ۱۹۴۶ء

نبی

میکو بہو رسّی ہاتھ میں لیے، کمر پر ٹھلیا رکھے، خراماں خراماں کنویں کی طرف چلی۔ ایک تو یونہی نازک اندام، اس پر 'پاؤں بھاری' ساتواں مہینہ، کیوں نہ آہستہ چلے۔ پھر کوئی جلدی بھی نہ تھی۔ میکو شیخ رحمٰن زمیندار کی بیگار کرنے غازی پور گیا تھا۔ گھر میں وہی اکیلی تھی۔ آہستہ آہستہ دن بھر میں سارے کام ہو رہیں گے۔ ہاں قدم اس وقت البتہ سرعت سے پڑنے لگے جب کنویں پر اس کی 'سکھی' اور منہ بولی بہن دھنپتیا، رام کھلاون کی لڑکی، بھی گھڑا لیے کھڑی دکھائی دی۔

میکو نے بیاہ کے بعد جو سب سے پہلا کام کیا تھا وہ یہ تھا کہ اپنی بیوی کو تاکیداً منع کیا کہ رام کھلاون اور اُس کی 'بٹیا' دھنپتیا سے نہ ملے۔ رام کھلاون کی گاؤں بھر میں نہ بنتی تھی۔ وہ ذات کا 'بٹیا' تھا۔ اس کے ہاں جولاہے کا کام ہوتا تھا۔ پھر اس پر شریر، بڑا اکھڑ الڑاکا۔ کسی زمیندار کے ہاں 'گورو بچھرو' مرا اور وہ سب سے پہلے حصہ لگانے کے لیے تیار۔ اگر نہ دیجیے تو اوکھ پھونک دے۔ جو کاٹ لے جائے، دھان اوکھاڑ کر پھینک دے۔ انھی باتوں سے عاجز آ کر گاؤں کے تمام چماروں نے پنچایت کر کے اُسے ذات باہر کر دیا تھا اور حقّہ پانی سب بند کر دیا تھا۔

دھنپتیا باپ کی سزا میں شریک تھی۔ ''جوان جہان'' ہوگئی، کوئی سگائی کرنے کو تیار نہیں! جہاں کہیں بات ٹھہرنے والی ہوتی میکو اور اُس کے دوسرے ہم خیال چمار اُدھر والوں کو بھڑکا دیتے۔ رام کھلاون گالیاں دیتا۔ لڑنے مرنے کے لیے آمادہ ہوتا۔ لیکن نہ معافی مانگتا اور نہ اپنی حرکتوں سے باز آتا۔ دھنپتیا بذاتِ خود نہایت متین، ملنسار، اور خاموش لڑکی تھی۔ لیکن جب پوری 'چمر ٹولی' خفا ہو تو وہ کیا کرے؟ انسانی دل، محبت کا بھوکا دل، پہلو میں ضرور تھا، مگر اس محبت کے اظہار کا نہ تو موقع تھا اور نہ کسی کو اس پریم کی خواہش تھی۔

میکو بہو نے جو اس بھولی بھولی صورت کو ذرا ہمدردی سے دیکھا تو سینہ میں محبت کے تمام سوتے پھوٹ بہے اور وہ سیلابی کیفیت پیدا ہوئی کہ شوہر کے حکم کے باوجود وہ اس بہاؤ کو روک نہ سکی۔ پتی ڈانٹا کیا لیکن 'چمرٹولی' کا ہر شخص اس راز سے واقف ہوگیا کہ میکو بہو اور دھنپتیا میں 'دانت' کاٹی روٹی ہے' اور دونوں ایک دوسرے کی 'سکھی' اور فدائی ہیں۔ بڑی بوڑھیاں اس افراط محبت پر سر ہلا کر کہتیں ''ایک نہ ایک دن رام کھلاون کی بٹیا دَگا دے ہے، تب میکو بہو کو چیت آئی'' مرد دن بھر کھیت کھلیان میں لگے رہتے، لیکن وہ بھی رات کو نریل پیتے وقت رائے زنی ضرور کرتے اور اپنی اپنی بیویوں کی ہاں میں ہاں ضرور ملاتے۔ غرض ساری چمرٹولی اس بات کا یقین واثق کیے بیٹھی تھی کہ ایک نہ ایک دن یہ 'سکھاپا' رنگ ضرور لائے گا۔ لیکن ان دونوں پر نہ اس کا کوئی اثر تھا اور نہ وہ اُن کے توہمات سے ڈرتی تھیں، بلکہ گنگا جمنا کی طرح باہم شیر و شکر ہو کر زندگی بسر کر رہی تھیں۔

اس دن بھی جب میکو بہو کنویں پر پہنچی تو دھنپتیا نے محض شرارت سے، جلدی جلدی اپنا گھڑا رسی میں پھنسا کر کنویں میں لٹکا دیا اور بولی ''جاؤ جاؤ، گھاٹ نا کھالی ہے۔''

میکو بہو نے مسکرا کر اپنی 'ٹھلیا' اور رسی وہیں کنویں کی جگت پر رکھدی اور دھنپتیا کے پیچھے رسی پکڑ کھڑی ہوگئی۔ پھر بولی ''اچھا خالی نہ سہی۔ تمھارا اگگری تو بھر جائی۔''

وہ گھڑا جب پانی سے بھر چکا تو دونوں نے ایک ساتھ مل کر کھینچنا شروع کیا۔ دو سرو قد نازنینیں ایک ساتھ جھکی تھیں۔ چار نازک ہاتھ ایک ساتھ بڑھتے تھے، دو بارور شاخیں ایک ساتھ جھکتی تھیں اور چار نازک ہاتھ ایک ساتھ بڑھتے تھے، دو بارور شاخیں ایک ساتھ سیدھی ہوتی تھیں اور رسی گراری پر سانپ کی طرح دوڑتی اور رُک جاتی۔ پھر کلائیاں لچکتیں، پھر سر جھکتے، پھر گرفت مضبوط ہوتی اور پھر گھڑا ایک ہاتھ اوپر آ جاتا۔ عجیب دلکش منظر تھا۔ دُور سے دیکھنے والا ہوا میں اُڑتی ہوئی ساڑیوں کو دیکھتا اور بیساختہ گنگانے لگتا۔ لیکن وہ اس خوشی کا اندازہ کسی طرح نہ کر سکتا تھا۔ جوان دونوں 'سکھیوں' کے دِلوں میں بھری پڑی تھی! وہ ہر جھٹکے کے ساتھ ایک دوسرے پر اعتراض کرتیں، بے تکلف قہقہوں کے ساتھ پانی کھینچتی جاتیں اور ایک دوسرے سے بگڑ کر ہنستی تھیں۔

جب دونوں نے اپنے اپنے گھڑے بھر لیے تو پھر وہیں کنویں کی 'جگت' پر بیٹھ گئیں، اور

آپس میں میٹھی میٹھی چٹکیاں چلنے لگیں۔ موضوعِ گفتگو شیخ رحمٰن زمیندار کے یہاں کی شادی تھی۔ ان کی لڑکی کا 'بیاہ' تھا۔ باہر سے برات آنے والی تھی۔

یہ زمانہ گاؤں بھر کی عورتوں اور خاص طور سے رعایا پرجا کی عورتوں کے لیے بڑی دلچسپی کا ہوتا ہے۔ انھیں انعام واکرام ملے گا، کپڑے ملیں گے، سیدھا ملے گا، غلّہ ملے گا اور سب سے زیادہ گانے بجانے، ہنسنے ہنسانے کی آزادی ملے گی۔ پھر دھنپتیا اور میکو بہو دونوں کا ہر موقع پر ساتھ ہوگا، اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی تھی؟

گفتگو کے سلسلہ میں میکو بہو نے دھنپتیا سے پوچھا "کاہے سکھی جمندار کیہاں (کے یہاں) تم کا کون کپڑ املا؟"

وہ بولی "ٹون کی ساری چاندی کا چھاپا۔ ایسی جگمگ جھمگ جھمکت ہے دیکھو تو آنکھ نہ ٹھہرے بجہ گھڑی اوہکا دھوپ مان باندھو، جانو جیسے تتری چمکے!"

میکو بہو نے جلانے کے لیے کہا "واہ ٹون ہی پر ٹرکائن ناہم کا بھائی ٹون کی چیج ناپسند!"

دھنپتیا نے مسکرا کر پوچھا۔ "اور تم کا کا ملا۔"

میکو بہو بولی "ہم سے بھی سیکھائن یہی کہن۔ پرنتو ہم کہا، نابی بی ہم ٹون پہنب، تب ہم کا کوردار ساری سہر سے منگا کے رنگریج سے گلابی رنگا کے دہن ہیں۔" دھنپتیا نے اپنی ساری کی توہین کا بدلہ لیا۔ وہ بولی "بھایا ہمکا کوردار ساری ناپسند۔ ہم کا تو ٹون کا چتری جیادہ پسند!" اس پر دونوں خوب کھل کھلا کر ہنسیں۔

پھر میکو بہو نے یاد دلایا آج تو میاں کیہاں دنچھوا ہے، دھان کوٹے کا ہے موپ نے کے چلے کا ہے۔ تم چلھیونا؟ راستہ ماں کھوب گاوت چلیں گے؟

دھنپتیا بولی۔ "جرور، پرنتو ہمکا بلا لیہو۔ بابا ایسے ناجائے دہن۔"

جب وعدہ ہو چکا تو دونوں نے جھک جھک کر اپنی رسی سمیٹی۔ اور گرہ دے کر سر میں لٹکائی۔ پھر تھلیا اُٹھا کر کمر پر رکھی اور 'چرٹولی' کے کچے پھوس والے مکانوں میں چلی گئیں۔

(۲)

رات کے نو بجے کے قریب شیخ رحمٰن دروازہ پر بیٹھے تھے اور ان کے گرد اعزا واحباب اور گاؤں کے دوسرے شرکا کا مجمع تھا۔ حقہ اور پان کا دَور چل رہا تھا۔ آنے والی برات کے لیے

انتظام ہو رہا تھا۔ علیحدہ علیحدہ ہر چیز کی فہرست تیار ہو رہی تھی۔ چاول آٹھ من، آٹا سولہ من، گھی چار من وغیرہ وغیرہ، سب لوگ انھی باتوں میں مصروف تھے کہ اتنے میں چمارنیں گاتی بجاتی 'نگارہ' پیٹتی مکان میں داخل ہوئیں اور اندر زنانے مکان میں چلی گئیں۔ وہاں صدر دروازہ پر کھڑی ہو کر دیر تک شیخائن کو گا گا کر گالیاں دیتی رہیں۔ جب انھوں نے سب کی گودیں، دھان اور گڑ سے بھر دیں اور سوا روپیہ علیحدہ میکو بہو کے ہاتھ پر رکھ دیا تو ذرا جوش کم ہوا۔ لیکن یہ سکون ہوا کی طرح رُخ بدلنے کے لیے تھا۔ یعنی اگر پہلے شیخائن کی شامت تھی تو اب کی جگہ ان کے اشارے پر اُن کی بھابھیوں اور نندوں پر بارش ہونے لگی۔ ہر ایک نے جب روپیہ اٹھنّی، چونی سے خاطر کی تو جان بچی۔ پیسے 'کھونٹ' میں گنٹھیانے کے بعد، سب کے سب مل کر صحن میں شامیانے کے نیچے بڑی سی کاٹھ کی اوکھلی اٹھا لائیں۔ پہلے اس میں ایک ناڑہ باندھا گیا۔ پھر اس پر سیندور کے ٹیکے لگائے گئے۔ تب شیخائن نے دھان لا کر اس میں ڈالا اور کوٹنے کا حکم ملا۔ اب کسی چمارن سے موسل اُٹھتا ہی نہیں۔ ہر ایک پیل تن نازک اندام بنی جاتی ہے۔ وہ چمارنیں جو دس دس سیر دھان تنہا کوٹ کر پھینک دیتی تھیں، آج موسل نہیں اُٹھا سکتیں۔ خیر پھر خاطر کی گئی۔ حقوق ملے اور کام شروع ہوا۔ اب پھر گیت چھڑا۔ موسلوں کی دھما دھم گویا تھاپ کی آواز تھی۔ اور دھان کی ہیر پھیر جھانجھ کی صدا۔

دھنپتیا اور میکو بہو کی باری دیر میں آئی۔ لیکن لطف انھی کے کوٹنے میں تھا۔ دونوں خوش آواز، دونوں جوان دونوں ہم عمر۔ موسل چلائے جا رہے تھے۔ گانا جاری تھا اور پھر ایک دوسرے پر فقرے بھی چست ہو رہے تھے۔ دماغ کہیں اور تھا آنکھیں کہیں اور۔ اور موسل مشین کی طرح 'اوکھلی' میں کہ دفعتاً اسی بے خیالی میں دھنپتیا کا پورا موسل میکو بہو کی انگلیوں پر پڑ گیا۔ انگلیاں پچی ہو کر رہ گئیں اور وہ 'آہ' کر کے دھم سے وہیں گر پڑی۔ دھنپتیا 'ہائے' کر کے جو اسے سنبھالنے کے لیے بڑھی تو پوری اوکھلی لڑھک کر میکو بہو کے پیٹ پر آ رہی، ساری عورتیں، شریف ورذیل "ارے کیا ہوا؟" کہتی دوڑیں، دیکھا گیا تو ناخن کے قریب کا چڑہ تین چار جگہ سے پھٹ گیا تھا، زندہ ناخن بھی بیچ سے شگافتہ ہو گیا تھا اور لہو بہہ رہا تھا۔ ادھر میکو بہو تو اس دہری چوٹ سے بیہوش ہو گئی۔ ادھر چمارنوں اور بیبیوں نے چاروں طرف سے اسے گھیر لیا۔ دھنپتیا سر تھام کر وہیں بیٹھ گئی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، آج ساری محبت اور سکھاپے پر پانی

پھر گیا۔ کس سے کہے کہ یہ چوٹ اس کی سکھی کو نہ آئی تھی۔ بلکہ اس کے دل پر پڑی تھی۔ اس کا سمجھنے والا کون تھا؟ چمارنیں تو رام کھلاون کی بٹیا کی دشمنِ جانی تھیں۔ چنانچہ دو ایک نے فوراً اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور چیخ اُٹھیں ''ارے کھلونا کی بٹیا آ کھر دگا کر گئی نا'' دوسری چمارنوں نے میکو بہو کو ہوش میں لانے کی جگہ دھنپتیا کو بُرا بھلا کہنا اور کوسنا شروع کر دیا۔ شیخائن کہیں مطبخ میں تھیں جلدی سے ''کیا ہوا لوگو؟'' پوچھتی مجمع کو چیرتی بے ہوش چمارن تک پہنچیں اور جلدی جلدی سب کو ڈانٹ کر ہٹایا، کپڑے کی ایک چٹ منگائی اور انگلی پر بہت سا پانی ڈال کر کتھا لگا کے باندھ دی۔ ایک ماما سے پنکھا جھلنے، دوسری سے منہ پر پانی جھڑکنے کے لیے کہا۔ کوئی دس پندرہ منٹ بعد ہوش آیا تو میکو بہو نے کراہنا اور تڑپنا شروع کیا۔ ایک چمارن چمر ٹولی دوڑی ہوئی گئی۔ اور جلدی سے میکو کو خبر کر آئی، وہ اپنے بہنوئی کے ساتھ دوڑا ہوا آیا اور بیوی کو ڈولی پر لاد کر لے گیا۔

رات بھر میکو کی یہ حالت رہی کہ وہ کبھی تڑپتی اور کراہتی ہوئی بیوی پر برہم ہوتا ''ہم ہمیسا سے جانت رہین کہ ایک نہ ایک دن وہ چھوکریا ان کا دھوکا دے اِی، پر نتو اِن کا کون سمجھائے۔ او ہکا باپ... رام کھلونا ہم سے آنٹ رکھت ہے اکی بٹیا کا ہے ہاتھ نہ توڑ دے!'' کبھی بیوی کا ہاتھ پاؤں دَباتا، اور کبھی نریل بھر کر پیتا اور رام کھلاون اور دھنپتیا سے بدلہ لینے کی تدبیریں سوچتا۔

میکو بہو کی یہ کیفیت کہ انگلیوں میں درد بھی تھا اور بخار بھی تھا۔ دو ہی تین گھنٹے میں سرسامی کیفیت ہونے لگی، عجیب بے چینی اور تکلیف میں رات کٹی۔ صبح سویرے میکو دُکھت کمہار کو بلا لایا۔ بیمار 'بیچاری' سے زیادہ 'رام کھلونا کی بٹیا' کے ٹوٹے ٹوٹکے 'کارن' کا ڈر تھا اور دُکھت 'اوجھائی' میں بہت مشہور تھا ''عجب نہیں دھنپتیا کا جادو کاٹ دے!'' دُکھت نے آتے ہی پتا در کے دو برابر ٹکڑے ایک ہاتھ اور چار انگل لمبے لیے اور کچھ چپکے چپکے پڑھنا اور میکو بہو کو جھاڑنا شروع کر دیا۔ پھر چولھے کی راکھ منگوائی اور 'کالی مائی' کی دہائی دے دے کر اُسے بازو پر باندھ دیا۔ غرض مرض کو ہر طرح باندھ اور 'پھونک کر' کچھ اناج لے کر چلا گیا، وہاں مرض نہ بندھنے والا تھا نہ رُکنے والا۔ ایک طرف ہاتھ سوجنے لگا دوسری جانب پیشاب کے ساتھ خون آنا شروع ہوا۔ تیسرے دن مرا ہوا بچہ ہوا اور چوتھے دن اسی شب میں، جس میں کہ میکو بہو کی سرکار میں شیخ

رحمٰن کے ہاں برات کی 'پیٹھالی' ہو رہی تھی یم دیوتا اسے بیاہ لے گئے اور شیخ جی کی بٹیا کی طرح اس کے لیے بھی وہ رات 'شبِ اوّل' بن گئی۔ میکو چیخا پیٹا کیا۔ یم نے ایک نہ سنی۔ وہ انسانی رقیبوں کی خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ ان کی پسند کی ہوئی چیز ''ماتا کی لی ہوئی آنکھ ہے!'' پلٹ نہیں سکتی۔

(۳)

جس وقت سے کہ میکو بہو کو چوٹ آئی تھی ساری چمرٹولی نے دھنپتیا کو ملزم ہی نہیں بلکہ مجرم قرار دے لیا تھا۔ عورت مرد یہی کہتے کہ اس نے میکو بہو کے مارنے ہی کے لیے یہ سب سوانگ بھرا تھا اور اتنے 'پینگ بڑھائے تھے'' یہ سب رام کھلاون کی سکھائی پڑھائی بات تھی۔ خود رام کھلاون نے جب میکو بہو کے زخمی ہونے کی خبر سنی تو اس نے بیٹی سے اظہارِ ہمدردی نہ کیا بلکہ اُلٹا خفا ہوا اور کہنے لگا ''انکھیا کہاں رکھ دہلے رہلی کہ بھرپور موسل اکے ہاتھ پر مار دہلی؟ سوجھت نا رئل؟'' دھنپتیا نے جب دوسروں کی طرح باپ کو بھی مخالف پایا تو اس نے بڑی حسرت و یاس سے اپنے 'بابو' کی صورت دیکھی اور گردن جھکا کر رونے لگی۔ وہ کیسے سمجھائے کہ اس کا فعل عمداً نہ تھا بلکہ گانے اور چھیڑ چہل میں اتفاقاً موسل پڑ گیا اور سچ پوچھو تو قصوروار میکو بہو ہی تھی وہ کوئی 'ننھی نادان' نہ تھی کہ اتنا بھی نہ جانتی کہ دیر تک اوکھلی میں ہاتھ نہ رکھنا چاہیے ہر ''کوٹنے چھاننے والے والی'' اس سے واقف ہے کہ یہ سرعت اور پھرتی کا کام ہے۔ جہاں ذرا آنکھ چوکی اور ہاتھ گیا۔

مگر وہ کہے کیسے؟ ہمیشہ کی چپکی، پھر سکھی کا معاملہ! وہ سکھی کا قصور سہی، لیکن چوٹ تو لگی اسی کے موسل سے۔ صبح کو ہمت کر کے اُس کے چھپر کی طرف چلی۔ راستہ ہی میں میکو کی بہن دکھائی دی اور اس نے صورت دیکھتے ہی ڈائن، جادوگرنی اور نہ معلوم کیا کیا کہہ ڈالا۔ دھنپتیا لڑنا جانتی ہی نہ تھی، وہ جلدی سے بھاگ کر اپنے گھر چلی آئی اور پھر بیٹھی اپنی بے بسی پر روتی رہی، اس کی حالت اس بے زبان بچہ کی تھی جو درد اور تکلیف سے بے چین ہو لیکن اپنی حالت کا اظہار نہ کر سکے۔

وہ اس پر پچھتاتی تھی کہ اس نے چاول کوٹتے وقت اوکھلی سے نظر ہٹائی ہی کیوں۔ پھر اس پر پچھتاتی کہ اس نے 'سکھی' کے ساتھ چاول کوٹے ہی کیوں۔ پھر اس پر کہ اس وقت دل لگی

ہی کیوں کی؟ پھر اس پر کہ اسے سکھی ہی کیوں بنایا اور پھر اس پر کہ خود وہ پیدا ہی کیوں ہوئی۔ اور پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہ گئی۔ غرض پچھتاوے کا ایک سلسلہ تھا جو شیخ جی کے ہاں 'دھن چھوئے' کی رات سے شروع ہوتا اور اس کی پیدائش کی صبح تک منتہی ہوتا۔ ''اب پچھتاوت کا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔''

دن میں وہ کئی دفعہ سکھی کی عیادت کے لیے گھر سے نکلی اور جب نکلی تب ایک نہ ایک عورت نے کوئی ایسا فقرہ کہہ دیا کہ تیر سا کلیجہ پر لگا اور وہ صیدِ زخمی کی طرح پھڑ پھڑاتی، پھڑکتی اپنی جھونپڑی میں پناہ لینے بھاگ آئی اور زخمی دل دیر تک آنسوؤں سے دھوتی رہی۔ دو دن نہ اس نے کھانا کھایا نہ لیٹی، سوئی باپ زمیندار کے ہاں شادی کے کاموں میں 'پھنسا' ہوا تھا، بیٹی اپنے آلام میں گرفتار تھی۔ یہ دو دن کیا تھے گویا برسات کی راتیں تھیں۔ اندر رہتی تو تپش دل سے دم گھٹتا، باہر آتی تو طعن و تشنیع کی بارش ہوتی ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' عجیب طرح کا کرب تھا اور طرفہ مصیبت تھی 'سکھی' مر رہی تھی۔ لیکن اُسے پاس جانے کی اجازت نہ تھی۔ گھر سامنے جل رہا تھا اور خود بجھا نہ سکتی تھی!

دو دن اور دو راتیں جب اِس طرح سے گزریں اور تیسرے دن 'بھور' کے وقت میکو کے چھپر سے رونے پیٹنے کی آواز آنے لگی اور اُسے یقین ہو گیا کہ سکھی کا ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوٹ گیا تو اس نے عجیب بے بسی سے آہ کی۔ تیورا کے بیٹھ گئی اور اس طرح جھومنے لگی جس طرح مار گزیدہ جھومتا ہے۔

وہ اِسی طرح تنہا بیٹھی تھی کہ میکو دیوانہ وار اندر داخل ہوا اور اس کے سر کے بال پکڑ کر گھسیٹتا باہر لے چلا۔ باوجود حملہ کے اچانک ہونے کے دھنپتیا اتنی قوی تھی کہ اگر چاہتی تو میکو سے لڑ بھڑ کر اپنے کو چھڑا لیتی، لیکن میکو کی صورت دیکھتے ہی اس کی وہ کیفیت ہوئی جو بلی کو دیکھ کر کبوتر کی ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں قوت ہی نہ رہ گئی۔ وہ نہ کچھ منہ سے بولی نہ سر سے کھیلی، میکو اُسے زمین پر گھسیٹتا، گالیاں بکتا، اپنی جھونپڑی میں لے گیا۔ وہاں سارے مجمع کے سامنے اور اس کی سکھی کی لاش کے 'پائینتی' اس نے دھنپتیا کے دونوں ہاتھ سل پر رکھے اور بٹہ اٹھا کر اس کی انگلیاں اس طرح کچل ڈالیں جیسے عورتیں ہلدی کچلتی ہیں۔ دھنپتیا نے درد اور تکلیف سے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔

جب گھنٹوں کے بعد ہوش میں آئی تو وہ اپنی جھونپڑی میں پڑی تھی اور رام کھلاون اس کے ہاتھوں کو دھو دھو کر پٹی باندھ رہا تھا، دھنپتیا نے اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھا کہ اس کے 'باپو' کا منہ 'لال انگارہ' ہو رہا ہے۔ آنکھیں خون کبوتر ہیں اور نتھنوں سے گرم گرم شعلے نکل رہے ہیں۔ بیٹی کے آنکھ کھولتے ہی بولا "کیے کا بھوگ ملانا؟ اور سکھا پا کر! اچھا تنک جل میں ہاتھ ٹھنڈا کر ہم ابہن آوت ہیں۔ جرا میکو کا مارے کا مجا چکھا دیں۔" اور یہ کہتے کہتے ڈنڈا اُٹھا کر باہر چلا۔ دھنپتیا 'باپو، باپو' پکارا کی، اس نے ایک نہ سنی۔ اس پر اس وقت غصہ کا بھوت سوار تھا۔ رام کھلاون کی بٹیا کو مارنا معمولی بات نہ تھی۔ اس کی سزا واجب تھی۔ جان جائے یا رہے "پرنتو ایسی بات نا سہی جات!" دھنپتیا کو یقین ہو گیا کہ اس وقت خون ہوا۔ میکو بہو کی جان جا چکی تھی اب میکو کی باری تھی۔ ساری لڑائی اس کے دم سے اور وہ خود اس قدر بے بس کہ اُٹھ نہیں سکتی۔ لیکن پھر دل نہ مانا۔ کہنی پر ٹیک لگا کر کسی طرح اُٹھی۔ رگیں جو تنیں تو ہر ناخن سے خون ٹپکنے لگا۔ اِس نے اس کی کچھ پروا نہ کی اور لڑکھڑاتی رام کھلاون کے پیچھے "بابو، بابو مور بابو" کہتی ٹھوکریں کھاتی دوڑی۔ رام کھلاون نے جو اسے اس طرح آتے دیکھا تو ٹھٹک رہا اور غصہ ہو کر بولا "اب کا ہے رے؟" وہ اس کے پاس ہانپتی ہوئی آ کر گر پڑی اور دونوں باہیں ٹانگوں میں ڈال کر بولی "مورا بابو میکو سے لڑائی مت کرو۔ او بکی مہریا اور ہمار سکھی بت گئی۔ او اِہ گھڑی دوانا ہے۔" وہ پہلے تو غصہ سے بولا۔ "تہون دوانی ہے" پھر بیٹی کو تھوڑی دیر غور سے دیکھ کر بولا "اچھا اچھا مارس، تہکے ہے ہمکا کا۔ تیں لڑائی نا چہتی نا سہی، جا تیں اپنی انگریا کی سیوا کر ہم گاؤں ماں جات ہیں" وہ بولی "گنگا کرے؟" اس نے کہا "ہاں رے ہاں جا ہم تاری کھانے (تاڑی خانہ) جات ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے تو تاڑی خانے کا رُخ کیا اور اِدھر روانہ ہوا یہ وہیں زمین پر 'دھرتی ماتا' کے سینے سے لپٹی لپٹی نہ معلوم کیا کیا سوچا کی پھر اُٹھی اور ٹیڑھے سیدھے قدم رکھتی ایک طرف چلدی۔

(۴)

شام کو جب گنگا کے کنارے میکو بہو کی لاش پھونکی جا رہی تھی اور گھی کے چھڑکاؤ سے شعلے بھڑک بھڑک کر اُٹھ رہے تھے، دھنپتیا دوڑتی ہانپتی مرگھٹ پر پہنچی۔ اور قبل اس کے کہ لوگ سمجھ

سکیں کہ وہ کیا کرنے والی ہے۔ وہ جھپٹ کر جلتی چتا میں گھس گئی اور "ہائے مار سکھی جلت ہے" کہتی لاش لیے دریا کی طرف دوڑی اور مع اس کے جھم سے پانی میں پھاند پڑی۔ تو ہم پرست چماروں کا سارا گروہ کنارے پر کھڑا بڑے بڑے دیدے نکالے دریا میں گھورا کیا۔ دھنپتیا میکو بہو کو لیے دوبارا اُبھر کر سطح پر آئی پھر اس نے تیسرا غوطہ کھایا۔

"گنگامائی" نے ادھر اپنی ان دو بچھڑی ہوئی بچیوں کو آغوش میں سمیٹ کر زُلفیں سنوارنا اور پریم کی حضوری کے قابل بنانا شروع کیا، ادھر گاؤں میں "شیخ رحمٰن کی بٹیا بدا" ہونے لگی۔ رام کھلاون نے جہیز کا پلنگ سر پر 'انگوچھا' لپیٹ کر اُٹھایا۔ دُلہن کا 'ڈولا' گھر سے نکلا اور بانسری والے نے بابل چھیڑ دیا۔

نقل

صبح کا وقت تھا، آفتاب کا لال لال چہرہ دیکھ کر پتیوں، پھولوں کے منہ پر دُھواں سا اُڑنے لگا تھا، سبزے کا نم آنچل سُوکھ چلا تھا۔ ٹھنڈی ہَوا بھی گرما گئی تھی۔ چڑیاں چہچہانا اور لڑنا چھوڑ کر چارہ چگنے کی فکر میں لگ گئی تھیں، ملوں کی سیٹیاں ہو چکی تھیں۔ مزدوروں کا ریوڑ سڑک سے گاتا، گنگناتا، لپکتا، ہانپتا، کھانستا، گالیاں بکتا جا چکا تھا۔ مہتر، مہترانیاں سڑکوں پر جھاڑو دے کر کوڑوں کا انبار جگہ جگہ لگا چکے تھے۔ گنگا گھاٹ پر تڑکے اشنان کے لیے جانے والے اپنے کو پاک وصاف کر کے پلٹ رہے تھے۔ جھنڈ کے جھنڈ، غول کے غول ٹیکا لگائے، مالا جپتے، بھجن گاتے، کوئی بھگوان کے دھیان میں، کوئی جل پری کی یاد میں، کوئی سُود بیاج کی فکر میں، کوئی اپنی ٹھکرانی کے پیچھے حفاظت کرتا ہوا، کوئی اُچکا ہر نوجوان عورت کو گھورتا ہوا، یکّے تانگے بھی اِکّا دُکّا چلنے لگے تھے۔ یکہ بانوں کی ٹخ ٹخ، موٹر لاریوں کی پوُں پوُں سنائی دینے لگی تھی۔ اور بسوں اور لاریوں کے انجن گرمائے جانے لگے تھے۔ گویا رات کے سکوت کی چادر کو دن کا شور آہستہ آہستہ چاک کرتا جا رہا تھا۔ مگر سکوت میں جو جمود ہوتا ہے وہ اب تک باقی تھا۔ شہر کی ہر شے گویا ابھی تک خواب آلود انگڑائی میں تھی۔

سِدھوا بھنگی رات رہے سے جھاڑو دینے نکلا تھا۔ وہ اپنی ایک دروالی کوٹھری میں بیٹھ کر ایک چلم نریل پی چکا تھا، اب کوڑا گھر جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس کی بھنگن بھی میونسپلٹی کی ملازم تھی، وہ میاں سے پہلے ہی تھوڑا سا کام کر کے چھوٹے بچوں کا خیال کر کے اپنی کالی کوٹھری میں واپس آ گئی تھی۔ چار برس کا ڈُلوا کب کا رات کی بابو جی کی دی ہوئی دال اور بھاجی سوکھی روٹیوں کے ساتھ اُڑا چکا تھا۔ ڈیڑھ برس کی بسنتی البتہ اب تک ماں کی چھاتی سے کیڑے کی طرح لپٹی تھی۔ ادھر اس کا چار اُنگل کا پیٹ کسی طرح نہ بھر چکتا، اُدھر بھنگن کو کوڑا گھر جانے کی

جلدی۔ ذرا دودھ چھڑایا اور وہ لگی ٹیں ٹیں کر کے چیخنے۔

سِدھوا نے کہا۔ ''یہ چھوکری جان کا روگ ہے، ایک نہ ایک دن تم کو نکلوا کے چھوڑے گی۔''

میکیا بولی، ''کیا کریں، آج اس نگوڑی کا کسی طرح پیٹ ہی نہیں بھر چکتا۔''

''پیٹ کیسے بھرے دودھ بھی تو ہو، نا۔''

''دودھ کیا خاک ہو گا جب پیٹ بھر کھانے ہی کو نہیں ملتا۔''

''تو اسے روٹی ووٹی چٹانا شروع کر دو۔''

''اس وقت تو وہ بھی نہیں، یہ ڈُلوا پاجی سب چٹ کر گیا۔''

''تو تم جانو اپنا کام، میں تو چلا، نہیں تو وہ سالا جمیندار کھا ہی جائے گا۔''

''وہ اپنی کوٹھری سے نکلا۔ سامنے لوہے کا ٹھیلا میلا ڈھونے والا کھڑا تھا۔ وہ ادھر بڑھا۔ ننگا ڈُلوا ایک پھٹی قمیص پہنے دوڑا۔

''دادا ہم بھی تلیں گے، دادا ہم بھی تلیں گے!''

سِدھوا نے ڈانٹا ''ارے تو کہاں جائے گا پاجی! تیری ماں کو بھی جانا ہے، تو بہن کو تاکنا، ہم دونوں ابھی پلٹ کر آتے ہیں۔''

بچہ مچلا، ''نہیں ہم تلیں گے۔'' بھنگن بھی باپ بیٹے کی جنگ دیکھنے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔

اتنے میں سامنے سے ایک جوڑا آتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک ہندوستانی صاحب اور اُن کی میم، صورت شکل میں کچھ ان غریبوں سے اچھے نہ تھے۔ ہاں مگر کپڑے ستھرے تھے۔ صاحب صبح کے گرم سوٹ میں منہ میں چرُٹ دبائے تھا، میم ریشمی ساڑی پر ایک لال بیر بہوٹی کے رنگ کی سوئٹر کوٹ ڈالے تھے۔ ان کا ننھا بچہ ایک پریمبولیٹر میں تھا۔ دونوں اُسے ٹھیلتے چلے آرہے تھے۔ انھوں نے پاس آ کر بھنگی، بھنگن اور ان کے بچوں پر ایک پھسلتی ہوئی نظر ڈالی۔ گویا نظر بھر کر دیکھنے میں آنکھوں کے گندہ ہو جانے کا ڈر تھا۔

میم صاحبہ نے کہا: ''اوہ، یہ لوگ کتنا میلا ہے۔'' اور ایک ہلکی تحقیر آمیز ہنسی کے ساتھ ایک چھوٹے سے سفید رومال سے ناک چھپالی۔

ڈُلوا نے تالی بجا کر کہا: ''دادا ہم گاڑی میں تلیں گے! ہم بھی گاڑی پر تلیں گے۔''

سِدھوا نے مسکرا کے میکیا کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں بھی ایک چمک پیدا ہوئی اور وہ

کوٹھری کی کنڈی چڑھا کے آ کر برابر کھڑی ہوگئی۔ سدھوا نے ڈلوا کو اُٹھا کر میلے والے ٹھیلے میں بٹھادیا۔ میکیا نے بسنتی کو اُس بچے کی گود میں دے دیا پھر دونوں قدم سے قدم ملاتے ہوئے ٹھیلے کو ٹھیلتے بالکل صاحب لوگوں کی طرح کوڑا گھر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔

پاجی ڈلوا راستہ بھر اس طرح ٹخ ٹخ کر کے یکوں تانگوں کی اور پوں پوں کر کے موٹر لاریوں کی نقل کرتا کہ دونوں کی خوشی سے باچھیں کھل جاتی تھیں اور ایسا جان پڑتا جیسے وہ میلے کے ٹھیلے کو نہیں لیے جارہے ہیں بلکہ پنڈتوں پروہتوں کا بنایا ہوا، پھولوں سے لدا آسمانی رتھ ہنکار ہے ہیں!

(کچھ فنی نہیں اور......۱۹۴۰ء)

نئی ہمسائی

نئی ہمسائی جب سے بغل والے مکان میں تشریف لائیں، مَیں نے اپنے اور اُن کے مکان کی درمیانی کھڑکی بند کرادی۔ مَیں یہ نہیں پسند کرتا تھا کہ میری بیوی اُن کی طرح کی عورتوں سے میل جول بڑھائے۔ مَیں خود اُن کے 'میاں' سے ملنے میں زیادہ قباحت نہیں سمجھتا تھا۔ مردوں کی علیک سلیک 'سینکڑوں قسم کے آدمیوں سے ہوتی ہے۔ مرد کپڑوں میں لپیٹ کر نہیں رکھا جاسکتا۔ چاقو کی طرح رگڑ سے اُس میں تیزی بڑھتی ہے۔ وہ ادنیٰ کپڑا ہے جسے دُھوپ نہ دکھایئے تو کیڑے چاٹ جائیں۔ مگر عورت پھول ہے، نازک، لطیف، خوشبودار! جہاں ہمسایہ خراب ملا۔ بوباس میں فرق آیا۔ جہاں ہم نشیں بُرے ہوئے اور رنگ رُوپ بدل گیا!

پھر مَیں اشرف صاحب سے ایک زمانے سے واقف تھا۔ وہ ایک رنگیلے مزاج کے آدمی تھے، وہ ہر سال 'تقویم پارینہ' علیحدہ کردیتے اور نئی جنتری سے دل بہلاتے۔ اب کے، نظرِ انتخاب بی ہمسائی پر پڑی اور وہ بغل والے مکان میں لاکر اُتاردی گئیں۔ اشرف صاحب کا خود گھر موجود تھا۔ بزرگوں میں کوئی مرد اور عزیزوں میں کوئی عورت نہ تھی۔ مگر اپنا مکان چھوڑ کے یہ عنایت میرے ہی ہمسائے پر کیوں کی گئی، اس کی حقیقت سے نہ مَیں واقف تھا اور نہ میری بیوی۔ وہ اشرف صاحب سے مجھ سے بھی زیادہ خفا تھیں۔ وہ کہتیں۔ "اگر انھوں نے یہ مکان نہ لیا ہوتا۔ تو کوئی بھلامانس اس میں آکے اُترتا اور مجھ نگوڑی کا ہمسائی سے دل بہلتا۔ مگر ان نئی بی صاحبہ کو تو رات دن سوائے گانے بجانے کے کوئی کام ہی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ڈھاریوں اور کسبیوں کا گھر ہے!"

اُن کا غصّہ بجا تھا۔ اس لیے کہ گھر میں جتنے سمجھ دار تھے وہ سب نماز کے عادی تھے ہم

میاں بیوی کی دیکھا دیکھی سہی، مگر مامائیں بھی نماز پڑھتی تھیں اور ملازم بھی۔ بچوں میں صرف ایک منیر تھا، جو پیار سے 'بھیّا' پکارا جاتا تھا۔ اس کی عمر اس وقت مشکل سے چار برس کی ہوگی۔ بیگم سوائے بھیّا کے کھلانے اور ماماؤں کو حدیث قرآن پڑھ کے سنانے کے اور کوئی کام نہ کرتیں۔ اُن کے ہاں مذہبیت کا وفور تھا۔ اب ہمسایہ ملا اس طرح کا، بالکل ہی ان کی ضد! ایک طرف تو تہلیل و تسبیح کا دور اور دوسری جانب سا، رے، گا، ما پا، دھا، نی کی رٹ!

پھر مفتیوں کے خاندان سے ہونے کی وجہ سے ہم قدامت پسند بھی تھے۔ ہماری معاشرت وہی تھی جس پر ہمارے بزرگ کار بند رہ چکے تھے۔ ہم لوگوں سے عام طور پر ملنا جلنا پسند نہ کرتے تھے اور ہماری عورتیں ان گھروں میں نہیں آتی جاتی تھیں، جن پر جدید تعلیم کا رنگ چڑھ چکا تھا اور جہاں دنیاوی ترقی کی غرض سے مغرب پرستی کی شدّت تھی۔

اب تک جو بی بی پڑوس میں رہتی تھیں، ان کے میاں کسی دُکان پر کام کرتے تھے وہ سیدھے سادھے نیک مسلمان تھے۔ دنیا کے جھگڑوں سے انہیں کوئی مطلب نہ تھا، مقررہ وقت پر اپنے کام سے جاتے۔ مقررہ وقت پر واپس آتے۔ اپنے بال بچّوں کے ساتھ جو دال دلیا میسر آتا خوش خوش کھاتے اور خدا کا شکر بجالاتے۔ خود بی ہمسائی کی یہ حالت تھی کہ گھر کے کام کاج سے جہاں فرصت پاتیں، ٹوپیاں لے کر بیٹھ جاتیں۔ ایسے ایسے گل بوٹے کاڑھتیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے، دس بارہ آنے کی روزانہ، میاں کے علاوہ، مزدوری کر لیتی تھیں۔ اس پر ملنسار ایسی کہ دن میں دو مرتبہ محض بھیّا کی خیریت دریافت کرنے کے لیے ہمارے ہاں آیا کرتیں جب ہمارے ہاں کوئی کام ہوتا تو اس میں بیگم کا اِس طرح ہاتھ بٹاتیں کہ محسوس ہوتا کہ کوئی غیر نہیں بلکہ اپنی قریب ترین عزیز ہیں۔ بیگم انہیں 'بہن' پکارتی تھیں اور ننھا منیر اپنی تتلی زبان میں انھیں 'کھالا جان' کہنا اچھی طرح سیکھ گیا تھا۔

وہ جب سے چلی گئی تھیں ہم لوگوں کو خاصی تکلیف تھی۔ بچہ بھی کڑھتا تھا اور بیگم بھی اُداس رہتی تھیں۔ تسکین صرف اتنی تھی کہ ممکن ہے نئی ہمسائی ویسی ہی یا اُن سے بہتر مل جائیں اور اب آئیں یہ ذاتِ شریف! معاملہ بالکل ہی برعکس ہو گیا۔ وہ تو کہیے کہ بڑی خیریت ہوئی کہ میں نے اشرف صاحب کو اس وقت دیکھ لیا جبکہ وہ مکان کا معائنہ کرنے آئے تھے ان کی جھینپی جھینپی باتوں سے مَیں تاڑ گیا کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ مَیں نے اس لیے نئی ہمسائی

کے ورود کے پہلے ہی کھڑکی میں قفل ڈلوا دیا تھا۔ اگر کہیں بے تکلفی بڑھنے کے بعد بیگم کو معلوم ہوتا کہ نئی ہمسائی کس قماش کی عورت ہیں تو حد درجہ بے لطفی ہوتی!

جب نئی ہمسائی آئیں تو انہوں نے ایک دن کھڑکی پر آ کر خوب کھٹکھٹایا۔ ماما سے کہلا دیا گیا کہ "میاں کا حکم نہیں کہ کھڑکی کھولی جائے۔" انھوں نے کہا۔ "اچھا بیگم صاحبہ سے سلام کہو اور کہو ذری کھڑکی تک کھڑی ہو جائیں۔ ہم تو اُن سے ملنے آئے ہیں اور وہ اپنی جگہ سے ہلیں تک نہیں۔"

بیگم نے صاف صاف کہلا بھیجا کہ "مجھے نہ اُن سے ملنے کی فرصت ہے اور نہ مَیں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔" اس تلخ جواب پر وہ بہت آزردہ ہوئیں اور یہ کہتی ہوئی چلی گئیں کہ: "اچھا تو ان سے کہہ دینا بی بی! اگر آپ نہیں ملنا چاہتیں تو یہاں کس کی جوتی کو غرض ہے۔ نہ ہم ان کے بسائے ہوئے ہیں اور نہ ہم ان کا دیا کھاتے ہیں۔ ہونھ، کیا مزاج پایا ہے... اے ہم نے کہا پڑوس میں آ کے ٹکے ہیں، چلو اپنی ہمسائی سے مل لیں۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ بڑی نک چڑھی ہیں۔ اے ہوں گی خاص رسول اللہ کے گھرانے کی۔ ہماری پاپوش کو غرض!"

اِسی درمیان میں مجھ سے اور اشرف صاحب سے ایک دن سامنا ہو گیا۔ صاحب سلامت کے بعد انھوں نے جس قدر تپاک برتا، مَیں اتنی ہی رکھائی سے پیش آیا۔ بالآخر وہ گھبرا کے بولے۔ "کیوں مشہور صاحب مجھ سے کیا قصور ہوا ہے جو آپ خاص طور سے خفا معلوم ہوتے ہیں۔

میں فطرتاً سیدھا آدمی ہوں اور گفتگو میں صفائی زیادہ پسند ہے، مجھے طعن و تشنیع و طنز سے کوئی لگاؤ نہیں لیکن اشرف صاحب کی حرکتوں سے اس قدر جلا ہوا تھا کہ اس دن مَیں نے اُن سے کچھ اسی طرح کی باتیں کیں۔ اُن کے جواب میں مَیں نے کہا۔ "آپ اور قصور واللہ آپ کیا فرماتے ہیں اجی حضرت آپ نے تو مجھ پر وہ احسان کیا ہے کہ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ آپ کے صدقے میں مجھے سرود ہمسایہ اور حسن رہ گزر دونوں میسر ہیں، بھلا میں آپ سے خفا ہو سکتا ہوں۔ میری اور یہ مجال؟"

وہ مسکرا کر بولے۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔ مگر آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں اُسے آپ کے ہمسائے میں محض اسی لیے لایا ہوں کہ میں اسے ایک بیسوا کی جگہ ایک نیک اور پارسا

عورت بنانا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا: ''مجھے آپ کی ذات سے یہی اُمید ہے! مگر میری یہ نہیں سمجھ میں آیا کہ میرے ہمسائے میں ایسی کون سی خصوصیت ہے؟''

وہ بولے: ''بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ مَیں نے اس حسن اس گلے اور اس مزاج کی رنڈی آج تک نہیں دیکھی، مَیں نے اسی لیے اس سے یہ خواہش کی کہ وہ مجھ سے نکاح کرلے مگر وہ آزادی کی زندگی کی اس قدر عادی ہوگئی ہے اور گھریلو زندگی سے اس قدر گھبراتی ہے کہ کسی طرح راضی نہیں ہوتی ہیں۔ اسی لیے اسے آپ کے ہمسائے میں لایا ہوں کہ وہ آپ کے گھر کی زندگی اور آپ میاں بیوی کی محبت و آشتی کو دیکھ میری بات مان لے۔''

میں نے کہا۔ ''تو اتنا بڑا شہر ہے، آپ کو سینکڑوں اس طرح کے میاں بیوی مل جاتے یہ مجھ ہی پر کرم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

وہ بولے: ''آپ لوگوں مولویوں کے گھرانے سے ہیں نا، آپ کا اثر دوسروں سے زیادہ جلد اور گہرا پڑے گا۔''

میں نے اپنی فطری صاف گوئی سے کام لے کے اُن سے کہہ دیا۔ ''تو حضرت اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کسی حالت میں اپنی بیوی کو آپ کی رنڈی سے ملنے دوں گا تو آپ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ اگر آپ میرے ہمسایہ سے نہ اُٹھ جائیں گے تو مَیں خود اس مکان کو چھوڑ دوں گا۔'' مَیں نے اس کے بعد اُن کی کوئی بات نہ سُنی اور جھلایا ہوا گھر واپس چلا آیا۔

اس دن سے مَیں نے محسوس کیا کہ شور وہنگامے میں بہت کمی ہوگئی۔ گانا ہوتا ضرور تھا۔ مگر مقررہ اوقات پر اور ٹھٹھے اب بھی لگتے تھے مگر اس طرح کی آوازوں میں جو ہمارے کاموں میں مخل نہ ہوں۔ البتہ بیگم سے یہ معلوم ہوا کہ ہر روز 'بھیّا' شام کے وقت گود سے اُتر کر اپنے 'صندلی' پاؤں سے کھڑکی تک ضرور جاتا اور لاکھ منع کیا جاتا مگر وہ کھڑکی کو خوب پیٹ پیٹ کے 'ہمچائی، ہمچائی، کہہ کے ضرور پکارتا۔ وہ بھی کھڑکی پر آتیں اور اُسے غالب کی مشہور غزل آشیاں کیوں ہو۔ آسماں کیوں ہو۔'' گا کے سناتیں اور ذیل کا شعر بار بار دہراتیں:

وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

بیگم یہ بھی کہتی تھیں کہ آواز میں اِس بلا کی کشش ہے کہ بیساختہ دل کھنچتا ہے اور ان کا بھی یہ جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ بھی کھڑکی کے پاس جا کے کھڑی ہو جائیں۔ بلکہ کھڑکی کھول کر گانے والے کو کلیجہ سے لگالیں۔ مَیں نے طے کیا کہ اس نئی چھیڑ کا فوری تدارک ضروری ہے اس لیے مَیں نے اشرف صاحب کو اسی وقت خط لکھا۔

''مکرمی! تسلیم بی صاحبہ سے میری جانب سے عرض کر دیجیے کہ میرے گھر کے لوگوں کو ہر روز کھڑکی پر آ کے پریشان نہ کریں۔ مَیں ممنون ہوں گا۔'' انھوں نے جواب میں لکھا۔''وہ کہتی ہیں انھیں آپ کے بچے سے محبت ہے۔ دن میں تھوڑی دیر کے لیے وہ اُسے بند کھڑکی کے دراڑوں سے جھانک لیتی ہیں۔ اگر آپ اس بچے کی ہر روز میرے ہاں آدھ گھنٹے کے لیے بھیج دیا کریں تو وہ وعدہ کرتی ہیں کہ وہ آج سے کھڑکی پر ہرگز ہرگز نہ جائیں گی۔'' مجھے ان کی اس شرط پر حد سے زیادہ غصّہ آیا۔ مَیں نے جھلا کے لکھ بھیجا۔''میرا بچہ نہ اس طرح کے ناشائستہ گھروں میں جا سکتا ہے اور نہ اس طرح کی ناپاک گودوں میں!''

اسی دن کھڑکی میں دوسری جانب سے بھی قفل پڑ گیا اور دراڑوں میں کاغذ کے ٹکڑے چپکا دیئے گئے، نہ کھڑکی کے پاس پھر گانا ہوا اور نہ بھیّا کے چیخنے اور پکارنے پر کسی نے اعتنا کی۔ مجھ سے اور اشرف صاحب سے بھی صاحب سلامت بند ہو گئی، غرض بائیکاٹ پورے طور پر ہو گیا۔

مگر بھیّا ہر روز کھڑکی پر جانے کے لیے مچلتا ضرور تھا اور رو کے جانے پر فیل لاتا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ ماندہ سا بھی رہنے لگا۔ لیکن مَیں نے کسی اُمر کی پروا نہیں کی۔ مَیں اپنے ناسمجھ معصوم بچّے کو گانے بجانے کا عادی نہیں بنا سکتا تھا اور نہ مَیں اس کی ضد پر اُسے ہمسائی کی سی عورت کے پاس بھیج سکتا تھا۔ مَیں نے اِس لیے یہ طے کر لیا کہ مہینہ ختم ہوتے ہی اس مکان اور اس ہمسائے کو خود ہی چھوڑ دوں گا۔

اسی فیصلے کے دو ہی چار دن بعد مجھے دفعتاً ایک سرکاری کام سے دیہات جانا پڑا۔ گو تقریباً تیس میل کا سفر تھا مگر میری فٹن کا گھوڑا کافی تیز اور مضبوط تھا اور مجھے یقین تھا کہ مَیں شام تک واپس چلا آؤں گا۔ بھیّا کی طبیعت حسبِ معمول ست تھی۔ مَیں نے کوئی وسوسہ دل میں نہ آنے دیا اور اطمینان سے اپنا فرض ادا کرنے دَورہ پر چلا گیا۔ وہاں قصبہ میں خلافِ معمول دیر

ہوگئی اور رات کے آٹھ بج گئے۔ شہر سے پندرہ میل کا فاصلہ تھا اور نصف کے قریب سڑک خام تھی۔ مگر بھیّا کی ماندگی کا خیال، جواب تک فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں بالکل ذہن میں نہ تھا، آتے ہی دل گھبرا اُٹھا۔ اور گو اہلِ قریہ مجھے روکتے رہے مگر میں اسی وقت روانہ ہوگیا۔ ابھی گاؤں سے مشکل سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچا ہوگا کہ دفعتاً شمال و مشرق کی جانب سے گھٹا اُٹھی۔ سائیس نے گھبرا کر کہا۔ ''ہجور پانی آن والا ہے۔ گاؤں پلٹ چلیں۔'' میں نے گھوڑے کو تیز کر کے کہا۔ ''نہیں جی برسے گا نہیں۔ پھر لوگ ڈیڑھ گھنٹے میں تو گھر پہنچ جائیں گے۔''

مجھے خیال تھا کہ اس گھٹا کی بھی وہی حالت ہوگی جو اس سال لکھنؤ کے لیے روایت ہوگئی تھی۔ تین تین چار چار دن متواتر اَبر آتا تھا مگر بلا تامل سیدھا پچھم کو بھاگتا چلا جاتا تھا۔ گویا منزلِ مقصود کہیں مغرب میں تھی اور لکھنؤ محض گزرگاہ تھا۔ لیکن میرے اس یقین کو چند ہی منٹ بعد پانی کی چادر نے پاش پاش کر دیا۔ پانی برسا اور اس طرح سے برسا کہ جسم پر چوٹ لگتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی آسمانی دریا میں سیلاب آگیا ہے اور اس نے سارے بند توڑ ڈالے ہیں۔ بجلی علیحدہ چمکتی تھی اور گرج اس آفت کی تھی کہ الامان والحفیظ۔

اب آپ ہی خیال فرمائیے کہ رات کا وقت، کچی سڑک، بھڑکنے والا گھوڑا، سنسان میدان اور پانی کا یہ شور۔ مزید مصیبت یہ آئی کہ گھوڑے کے جھٹکوں اور ہوا کے جھونکوں نے فٹن کی لالٹینیں بھی بجھا دیں۔ بس کچھ نہ پوچھئے کہ راستہ کیونکر طے ہوا۔ اور جان کیونکر بچی موت خود ہی حفاظت کر رہی تھی۔ ورنہ مر جانا یقینی تھا۔

خیر خدا خدا کر کے پختہ سڑک پر پہنچے، تھوڑے ہی فاصلے پر بیڑی سگریٹ بیچنے والوں نے کچھ پھونس کے چھپر لبِ راہ ڈال رکھے تھے۔ جب ہم لوگ ان کے قریب پہنچے، تو سائیس نے سردی اور خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔ ''ہجور! یہاں دم لے لیجیے جرا پانی رُکے تو پھر چلیں'' ۔ میرا بھی سردی سے بُرا حال تھا۔ دوسرے گھوڑے کی منہ زوریوں سے دونوں ہاتھ شل ہوگئے تھے۔ مَیں نے اب کے سائیس کی رائے پر عمل کیا اور فٹن روک کے اُتر پڑا۔ اور ایک چھپر کے نیچے جہاں پانچ سات دیہاتی آگ جلائے بیٹھے تھے، مَیں بھی جا کے کھڑا ہوگیا۔ سائیس بھی گھوڑے کو ایک پاس ہی کے درخت میں اٹکا کے جلدی سے بھاگ آیا۔ دیہاتی میرے متعلق سائیس سے یہ معلوم کر کے کہ میں سرکاری افسر ہوں تھوڑا بہت سہم گئے اور سمٹ کے مجھ سے

تھوڑی دُور پر بیٹھ گئے، دُکاندار نے ایک چھوٹی سی پتائی مجھے بیٹھنے کے لیے دی اور آگ کو لکڑیاں بڑھا کر تیز کر دیا۔ مَیں اپنا کوٹ اُتار کر اسی پر سکھانے لگا۔

پانی کی شدت میں کسی طرح کمی نہ ہوئی، یہاں تک کہ رات کے گیارہ بج گئے۔ دیہاتیوں میں کئی ایک وہیں گٹھری بن کے پڑ رہے اور ان کے خراٹوں کی آوازیں پانی کی آواز میں مل کے اسے اور بھیانک بنانے لگیں۔ دُکاندار بھی اونگھ رہا تھا۔ بھوک اور نیند سے میری خود بُری حالت تھی۔ مگر پانی کی وجہ سے سب مجبور تھے، نہ کسی طرح کھلتا تھا اور نہ رُکتا تھا۔ بالآخر ایک بجے کے بعد کچھ کم ہوا۔ میں نے سائیس سے کہا۔ بھئی گاڑی کی لالٹینیں جلا لو اب ہم چلیں گے۔ غرض ہم لوگ پھر بھیگتے ہوئے گھر چلے۔ گھوڑے نے بھی اب کے تیزی نہیں کی، بظاہر وہ بھی تھک گیا تھا یا نیند کی غنودگی میں تھا۔ بہرنوع ہم نے ہلکی دُلکی کی رفتار سے بقیہ راستہ طے کیا اور کوئی تین بجے صبح کو گھر پہنچے۔

خیال تھا کہ وہاں سب خرّاٹے لے رہے ہوں گے اور دروازہ کھلوانے کے لیے کافی چیخنا پڑے گا۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مردانے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور دروازے کھلے ہوئے تھے۔ مَیں نے کمرے میں جا کے دیکھا تو اشرف صاحب بیٹھے ہوئے ایک ناول پڑھ رہے ہیں۔ مَیں اپنے گھر میں انھیں اس طرح دیکھ کے حد درجہ گھبرا گیا۔ مَیں نے اُن سے پوچھا۔ ”کیوں آپ اس وقت یہاں کہاں؟ خیریت تو ہے؟“ انہوں نے کہا۔ ”ہاں سب خیریت ہے آپ اندر جا کے فوراً کپڑے بدل ڈالیے۔“

مَیں بھی گھبرایا ہوا زنانہ خانے میں چلا گیا۔ وہاں جا کے دیکھا تو سارے گھر کی روشنیاں جل رہی ہیں، بیگم اپنے پلنگ پر لیٹی ہیں۔ ماما ظہورن پاؤں سہلا رہی ہیں اور بھیّا کو ایک بیس برس کی حسین دوشیزہ گود میں لیے کلیجے سے لگائے بیٹھی ہے۔ میں ایک اجنبی عورت کو اپنے گھر میں بے نقاب دیکھ کے پہلے تو جھجھکا۔ مگر جب مَیں نے دیکھا کہ اس کی ساری توجہ بچہ کی طرف مبذول ہے، تو میں استعجاب اور گھبراہٹ کا بُری طرح شکار ہو کر بیگم کے پلنگ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی گھبرا کے اُٹھ بیٹھی تھیں، مَیں نے اُن سے پوچھا۔ ”کیوں خیریت تو ہے؟“ میرے اس معمولی سے سوال پر وہ 'بھیّا' کہہ کے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ماما نے کہنا شروع کیا۔ ”نا بی بی، نا! آج شام سے آپ رو رو کے بے فضول کو اپنے کو

ہلکان کر رہی ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ بچّہ اچھا ہے دل کو سنبھالیے نا آنکھیں لال انگارہ ہو رہی ہیں۔"

مَیں نے دیکھا کہ بیگم کے منہ سے اس وقت پورا واقعہ سن لینا محال ہے اس لیے ماما ظہورن سے کہا۔ "تم ہی بتاؤ کہ ہوا کیا۔ کیا بھیّا بیمار ہو گیا تھا؟ کیا بات ہوئی آخر؟" اس نے کہا۔ "اے حضور کوئی بات نہیں۔ بی بی ابھی ماشاء اللہ خود ہی بچّا ہیں، اسی لیے ذرا سی بات سے گھبرا اُٹھتی ہیں۔ بھیّا کی طبیعت ماندی تھی مجھے حکم ہوا کہ ڈاکٹر کو بلواؤ، وہ موا امّن گیا تو ڈاکٹر نہ ملے۔ وہ کہیں نکل کھڑے ہوئے تھے اپنی پھیری پر۔ میں ابھی باہر ہی تھی کہ لڑکے کے چیخنے کی آواز سنائی دی، اب جو آ کے دیکھتی ہوں تو لڑکا تو خیر لڑکا ہی ہے۔ بیگم صاحبہ بھی بچپنا کر رہی ہیں۔ بھیّا مچلا تھا کہ ہم کھڑکی ہی پر جا کے دم لیں گے، اور یہ اَڑی تھیں کہ اپنا اور تیرا خون ایک کر دوں گی، مگر کھڑکی پر نہ جانے دوں گی۔ بچّہ زمین پر لوٹ رہا تھا اور یہ اسے گھڑک رہی تھیں۔ جب وہ کسی طرح نہ مانا تو انھوں نے حضور اس کو دھوئیں دھوئیں پیٹ ڈالا۔"

مَیں نے دیکھا کہ میرے ہی چہرے پر آثار غم و غصّہ نہ تھے بلکہ اجنبی دوشیزہ نے بھی ایک بار بیگم کو بہت ہی غصّے سے دیکھا اور پھر گردن نہوڑا لی۔ بیگم نے دیکھا کہ ظہورن بچّے کی صفائی میں ان کے سر سارا الزام منڈھے دیتی ہے۔ تو جھڑک کر بولیں۔ "تمھیں بات کا بتنگڑ بنانا خوب ہی آتا ہے۔ مَیں نے تو اسے ایک ہلکا سا طمانچہ مارا اور تم کہتی ہو کہ مَیں نے اسے پیٹ کے رکھ دیا۔ بالشت بھر کا تو لونڈا ہے، لیکن ایسے ایسے فیل لاتا ہے اور ایسی ایسی ضدیں کرتا ہے کہ جان عذاب ہو گئی ہے!"

ظہورن نے بات کاٹی۔ "ہاں تو بی بی اب روتی کیوں ہو؟ اب جب اس کے دُشمنوں کا یہ حال ہے تو دونوں آنکھوں سے گنگا جمنا کیوں بہہ رہی ہیں؟"

مَیں نے دیکھا ان دونوں میں لڑائی چھڑی اور ظہورن نے دایہ ہونے کی حیثیت سے ماں کی زیادتیاں گنوانا شروع کیں۔ مَیں نے ڈانٹ کے کہا۔ "اچھا ظہورن تم خاموش رہو، ہاں جی بیگم۔ خدا کے لیے بیان کرو کہ کیا ہوا؟"

انھوں نے کہا۔ "اے ہوا کیا۔ میں کیا جانتی تھی کہ آج یہ کھڑکی پر جانے کے لیے ایسا شور مچائے گا۔ مَیں نے اسے کھڑکی پر نہ جانے دیا۔ بس اس نے چیختے چیختے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

ڈاکٹر کو بلوایا وہ ملا نہیں جب شام ہونے کو آئی تو سارا پنڈا اس طرح جلنے لگا کہ معلوم ہوتا کہ اگر دانہ ڈال دو تو بھُن جائے گا۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں، ظہورن کے طعنوں نے دل پکّار کھا تھا۔ میں سوائے دعائیں دم کرنے اور رونے کے کر ہی کیا سکتی تھی؟'

ظہورن نے پھر بات کاٹی ارے تو مَیں طعنے کیوں نہ دیتی، خود ہی بچے کو مار پیٹ کے اس حال کو پہنچایا، اور خود ہی بیٹھ کے ٹسوئے بہاتی تھیں۔ مَیں نے کہا اب بی بی بسورنے سے کیا فائدہ جب نہ سوچا جب دھوئیں دھوئیں اُسے پیٹ رہی تھیں۔''

مَیں نے غصّہ میں کہا۔ پھر تم لڑنے لگیں۔ مَیں واقعہ پوچھتا ہوں اور تمھیں طعنوں سے ہی فرصت نہیں ملتی، صرف واقعہ بیان کرو اور کچھ نہیں۔

ظہورن نے آزردہ ہو کر کہا۔''ارے تو ہوا کیا بچے کی ایک چیخ آسمان پر تھی تو ایک زمین پر۔ کچھ نہ سمجھ میں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اتنے میں خدا بھلا کرے ان کا یہ جو بی ہمسائی بیٹھی ہیں اِن کے میاں کو، انہوں نے باہر آ کے آواز دی اور پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے ان سے داستان کہہ سنائی انہوں نے کہا۔ گھبراؤ نہیں، مَیں ابھی ڈاکٹر کو لیے آتا ہوں۔ وہ یہ کہہ کر جانے کو ہی تھے، کہ یہ نگوڑا مَنہ پھٹ پڑا اور ٹھٹک کے کھڑے ہو گئے کہ ذرا پانی رُکے تو میں جاؤں۔ ایسے عالم میں تو ڈاکٹر حکیم کوئی نہ ملے گا۔ ادھر بھیّا کی یہ حالت تھی کہ جب کوندا لپکتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کوئی اسے کوڑے لگاتا ہے۔ بس ایک چیخ اوپر ایک نیچے۔ بس اسی سے سمجھ لیجیے کہ ان ہمسائی سے اس کی چیخ نہ سُنی گئی اور بیتاب ہو کر اسی پانی برستے میں، چھتری لگا کے کھڑکی پر آئیں اور چیخ چیخ کر کھڑکی کھلوائی۔ ان کو دیکھتے ہی بھیّا ان کی گود میں چلا گیا اور اس طرح سسک سسک کر رونے لگا، جیسے مدتوں کے بچھڑے مل کے روتے ہیں۔ انھوں نے لیتے ہی جیسے جادو کر دیا۔''

بی ہمسائی اب تک خاموش تھیں۔ جادو کے لفظ پر چمک کے بولیں۔''تو بی مَیں نے کوئی جادو نہیں کیا، بیگم صاحبہ کی مار دھاڑ کھینچا تانی میں بچے کی کلائی کی رگیں کھنچ گئی تھیں۔ تم میں سے کسی نے اُدھر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔''

ظہورن نے پھر بات کاٹی''اے اللہ جیتا رکھے۔ بیٹا تم نے میرے منہ کی بات ٹوک لی۔ میں تو خود یہی کہنے والی تھی کہ بچے کھلاتے کھلاتے میرا چونڈا سفید ہونے کو آیا۔ اور اتنی

بات نہ سوجھی۔ تم نے جو ذرا سا تیل کلائی میں مل کے اسے سینک کے لپیٹ دیا تو گویا جان میں جان آ گئی۔ پھر بھی جب سے تم ہی لیے بیٹھی ہو، چیخ تو بالکل کم ہو گئی مگر بخار اسی طرح ہے۔ پھر تم نے کیسا کیسا بہلایا کیسا کیسا گانا سنایا...''

گانے کا نام سنتے ہی مجھے بی ہمسائی کا پیشہ یاد آ گیا اور بے ساختہ میرے چہرے پر ان جذبات حقارت ونفرت کے آثار نمایاں ہو گئے، جو میرے دل میں اس پیشے کی عورتوں کی طرف سے بھرے پڑے تھے۔ اللہ اللہ میں اور ایک قحبہ کا احسان مند! میرا گھر اور ایک بازاری رنڈی، میرا بچہ اور ایک فاحشہ کی گود!

ہمسائی نے میرے چہرے کو غور دیکھا۔ نظریں نیچی کر لیں اور بچے کو آہستہ سے اُٹھا کر ماں کی گود میں دے دیا، ایسا معلوم ہوا جیسے پھولوں کی سیج سے اُٹھا کر اُسے کانٹوں کے بستر پر لٹا دیا گیا۔ اس لیے کہ بھیّا نے ایک بار آنکھیں کھول کے ماں کا چہرہ دیکھا اور پھر چیخنے لگا۔ بیگم نے لاکھ جتن کیے، چمکارا پیار کیا۔ گلے سے لگائے اُٹھ کے کھڑی ہو گئیں۔ ٹہلا ٹہلا کے لوری دیتی رہیں، مگر بقول ظہورن کے اس کی چیخ 'ایک اُوپر تھی تو ایک نیچے۔''

ہمسائی اپنی جگہ سے اُٹھ کے کمرے کے باہر دالان کے کنارے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں گویا اس انتظار میں تھیں کہ پانی کم ہو تو وہ گھر واپس چلی جائیں۔ مَیں اب تک اسی طرح بھیگا کھڑا تھا۔ مجھے غصّہ بھی تھا اور ڈر بھی۔ استعجاب بھی تھا اور تکلیف بھی، غرض اتنے قسم کے جذبات بیک وقت میرے دل میں جمع تھے کہ مجھے اپنی جسمانی اذیتوں کا خیال تک نہ تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ہمسائے کی خوشامد کر کے بھیّا کو گود میں لے لینے پر راضی کر لوں۔ مگر اپنے معصوم کو ایک معصیت پرور آغوش میں دینے سے کراہت معلوم ہوتی تھی، مَیں اسی حیص بیص میں تھا کہ مامتا نے خودداری پر فتح پائی اور بیگم نے ہمسائی سے گڑگڑا کے کہا۔ ''بہن تم پھر لے لو۔ یہ تمھاری ہی گود میں چپ رہے گا۔''

ہمسائی نے میری طرف ایک بار دیکھا۔ میرا چہرہ بھی بجائے حقارت ونفرت کے اب عاجزی اور خوشامد کے آثار ظاہر کر رہا تھا۔ انہوں نے اپنا آغوش پھیلا کے بھیّا کو لے لیا اور انبساط سے گنگنا کے اسے چمکارنا شروع کیا۔ بچے کی چیخ میں آہستہ آہستہ کمی ہونے لگی۔ وہ آنکھیں کھول کے ہمسائی کا منہ اس طرح تکنے لگا جیسے وہ ان کی زبان سے کوئی خاص چیز سننے کا

مشتاق ہے، ہمسائی اس پر مسکرائیں اور کرسی پر بیٹھ کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غالب کی وہی غزل گانے لگیں:

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

بچہ اطمینان سے مسکرایا اور آنکھیں جھپکانے لگا۔

مَیں خود فراموشی کی حالت میں یہ سب دیکھ رہا تھا کہ بیگم نے میرا شانہ ہلا کے کہا۔ ''یہ بھیگے کپڑے کب تک پہنے رہیے گا؟'' مَیں اس طرح چونک پڑا جیسے میں گہری نیند سے جگایا گیا ہوں، مجھے اس وقت اپنی حالت کا خیال آیا۔ یہ دوسری بار ایک ہی شب میں بُری طرح بھیگا تھا اور دونوں بار سارے کپڑے جسم ہی پر قریب قریب خشک ہو گئے تھے۔ سویا بھی نہ تھا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ بھی تھا اور بھوکا بھی۔ مجھے اس وقت یاد آیا کہ مجھے بڑی دیر سے ایک غیر معمولی ٹھنڈک سی بھی محسوس ہو رہی ہے۔ مَیں جلدی سے دوسرے کمرے میں کپڑے اُتارنے چلا گیا۔

مَیں کپڑے بدل ہی رہا تھا کہ مجھے سخت سردی معلوم ہوئی۔ ساتھ ہی کچھ چکّر سا بھی محسوس ہوا۔ مَیں جلدی سے اپنے پلنگ پر آ کے کمبل اوڑھ کے پڑ رہا۔ سردی بڑھتی ہی گئی۔ میرے جسم پر گھر بھر کی رضائیاں، دلائیاں اور کمبل لا کے ڈال دیئے گئے۔ مگر میری سردی کم نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ بیگم کو بجائے 'بھیّا' کے ساری توجہ میری طرف مبذول کرنا پڑی اور وہ ہمسائی کے سامنے ہی ساری دلائیاں و کمبل دبا کے میری پیٹھ سے لگ کے بیٹھ گئیں۔ آدھ گھنٹے کے سخت لرزے کے بعد مجھے تیز بخار آ گیا اور میں بیہوش ہو گیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ تین دن تک مَیں کس عالم میں تھا۔ کسی وقت ایک سو چھ ڈگری سے بخار کم نہیں ہوا۔ سرسامی بک جھک علیحدہ تھی۔ بار بار یہی کہتا تھا۔ ''میرا بچہ اور بیسوا کی گود! بھیّا اور ناپاک آغوش میں! میرا پھول اور میلے کے ڈھیر پر! یہ اشرف سے ذلیل شخص سے ملنے کا نتیجہ ہے! ہائے ابّا جان زندہ ہوتے تو کیا کہتے! گانے بجانے والی رنڈی اور میرا گھر۔ مولویوں کا خاندان، مفتیوں کا گھرانا!'' ہمسائی اور اشرف دونوں نے یہ سرسامی بڑ بار بار سنی۔ مگر باہر اور اندر یہ دونوں میری اور بچے کی خدمت میں حد درجہ خلوص سے منہمک و مشغول رہے۔ اشرف صاحب ڈاکٹر کو بلاتے تھے۔ دوائیں لاتے تھے۔ اور روپیوں کا بندوبست کرتے تھے، اس لیے

کہ گھر میں جتنے روپے تھے وہ سب خرچ ہو چکے تھے اور بینک سے بغیر میرے دستخط کے نکل نہ سکتے تھے۔ اندر ہمسائی کی یہ حالت تھی کہ دن بھر بھیّا کو لیے رہتیں اور تیمارداری اور خدمت میں بیگم کا ہاتھ بٹاتیں۔ بیگم تو کبھی کبھی تھک کے میرے پاس والے پلنگ پر سو جاتیں مگر ان کا بیان ہے کہ بی ہمسائی خواہ دن میں سوئی ہوں تو سوئی ہوں۔ لیکن تین راتیں تو اس اللہ کی بندی نے پلک سے پلک نہیں ملائی۔''

چوتھے دن مجھے ہوش آیا۔ اور سول سرجن جس کا علاج ہو رہا تھا بولا اب ''کوئی خطرے کی بات نہیں۔'' دو دن اور اشرف صاحب باہر اور ہمسائی اندر دونوں میرے مکان میں آتے جاتے رہے۔ تیسرے دن ہمسائی تھوڑی دیر کے لیے آئیں۔ جب وہ جانے لگیں تو بیگم اتفاق سے ان سے باتیں کرتیں کھڑکی تک چلی گئیں۔ جب ہمسائی اپنے مکان میں پہنچ گئیں تو انھوں نے کھڑکی اپنی جانب سے بند کر کے قفل ڈال دیا اور کواڑوں کی آڑ سے بولیں۔ ''بیوی اب ماشاء اللہ بھیّا بھی اچھا ہے اور اس کے باپ بھی۔ مولوی صاحب کو ضعف البتہ ہے، وہ بھی دو چار دن میں چلا جائے گا۔ مگر میری اتنی بات یاد رکھئے گا کہ جس دن ان کا غسلِ صحت ہو، تو بیسن اور صابون کا ذرا زیادہ انتظام کیجیے گا۔ اور ان سے کہہ دیجیے گا کہ اپنے کو اور بھیّا کو اچھی طرح سے پاک کر لیں۔ ایک میری ناپاک گودوں میں ہفتہ بھر رہا ہے اور دوسرے کو مَیں نے اپنے نجس ہاتھوں سے کئی بار چھوا ہے۔''

بیگم ''بہن، بہن ارے کھڑکی تو کھولو بہن!'' کہتی ہی رہیں! مگر انھوں نے ایک نہ سُنی۔ یہ بھی وہاں سے حد درجہ رنجیدہ پلٹ آئیں اور گھر کے کسی کام میں لگ گئیں۔

اس واقعے کے دوسرے ہی دن صبح کو جب میں اُٹھا تو طبیعت چاق تھی، محض ضعف تھا اور کسی قسم کی کوئی شکایت نہ تھی، مَیں نے اس دن بیگم سے گھر کی حالت اور بیماری کی ساری کیفیت سُنی، جب مجھے اپنی سرسامی بک جھک کی خبر ملی اور یہ معلوم ہوا کہ اشرف اور ہمسائی نے باوجود ان تمام باتوں کے، عزیزوں سے زیادہ محبت و موانست برتی، تو مجھے حد سے زیادہ خجالت و ندامت ہوئی، مجھے اس روز محسوس ہوا کہ رذیل و شریف کا فرق حد سے زیادہ مشکل ہے اور سوسائٹی کے قوانین کی پابندی میں افراط بعض وقت خود ہمیں بداخلاق و بدتہذیب بنا دیتی ہے۔ چنانچہ مَیں نے حد درجہ شرمسار و منفعل ہو کے بیگم سے کہا۔ ''للّٰہ ہمسائی کو بلاؤ میں اُن سے

معافی مانگوں گا۔ میری اخلاقی حالت اُن سے پست تر ہے۔ مجھے اُن کو ذلیل کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔"

بیگم نے کھڑکی خوب خوب کھٹکھٹائی اور 'بہن بہن' کہہ کے پکارا مگر صدائے نہ برنخاست۔ مَیں نے ظہورن سے کہا کہ امامن کو بھیج کے اشرف صاحب کو بلواؤ۔ وہ تھوڑی دیر میں واپس آیا۔ معلوم ہوا وہ لوگ کل شام ہی کو اس مکان سے اُٹھ گئے!

میں اپنے ضعف کی وجہ سے مجبور تھا، ورنہ اسی وقت اُن لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ دو دن اور اسی مجبوری میں گرفتار رہا۔ تین دن کے بعد ڈاک سے ایک لفافہ ملا۔ چاک کر کے پڑھا تو لکھا تھا۔

"مکرم مولانا تسلیم امید ہے کہ آپ کا مزاج اب بالکل اچھا ہوگا۔ بخار تو ہمارے سامنے ہی اُتر گیا تھا۔ صرف ضعف تھا۔ یقین ہے کہ اب جبکہ ہمسائے سے ناپاک ہستیاں اُٹھ گئی ہیں تو وہ بھی جاتا رہا ہوگا۔ بھیّا البتہ اپنی خالہ کے لیے کڑھتا ہوگا۔ مگر مَیں کیا کروں مجھے اس سے زیادہ تکلیف ہے وہ تو بچہ ہے بہل ہی جائے گا مگر خود میرے پہلو میں ایسا ناسور ہے کہ جس کا اندمال محال ہے، مجھے اس کی 'خالہ' اور آپ کی 'نئی ہمسائی' سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے۔ اور اُس نے محض آپ کی وجہ سے ہم دونوں کو چھوڑ دیا۔ میں نے آپ سے درمیان گفتگو میں ایک بار کہا تھا کہ میں نے اس صورت کی، اس گلے کی، اور اس دل کی رنڈی نہیں دیکھی، صورت تو آپ نے دیکھ لی ہے۔ آپ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں، گلے بازی کی حالت آپ کیا جانیں۔ مولوی آدمی، مگر اتنا تو شاید آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ بھیّا کیسی ہی تکلیف میں کیوں نہ ہو کتنا غصّہ ہی کیوں نہ ہو۔ جہاں 'خالہ' نے کچھ گنگنا دیا اور وہ خاموش ہو جاتا تھا۔ رہا دل! ہائے کیسے کہوں۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے گا۔ مگر اس نے آج تک باقاعدہ پیشہ نہیں کیا۔ وہ محبت کی بھوکی اور اپنے مادری پیشے سے متنفر ہے۔ پھر اتنی ملنسار اتنی خوش خلق، اتنی فطرتاً نیک ہے کہ شاید ہی کوئی 'شریف زادی' اس کے مقابلہ میں پیش کی جا سکے۔ بس اسی سے سمجھ لیجیے کہ آپ کی اور بھیّا کی بیماری میں مَیں نے روپے نہیں خرچ کیے ہیں۔ میرے پاس اتفاق سے ایک پیسہ نہ تھا۔ اسی نے کئی سو روپے اپنے زیورات رہن رکھ دیئے ہیں! اس طرح کی عورت اور اس کے ساتھ آپ کا یہ ظالمانہ برتاؤ کہ اُٹھتے بیسوا، بیٹھتے قحبہ واللہ دل پھٹ گیا! جس دن وہ آپ کے ہاں سے

آئی ہے، اسی دن شام کو وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر کے ماں کے ہاں چلی گئی۔ میں نے ہاتھ جوڑے، قسمیں دیں کہ مجھ سے نکاح کر لے مگر اُس نے کہا۔ ''نہیں میں بیسوا کے گھر میں پیدا ہوئی، بیسوا ہی بن کے رہ سکتی ہوں۔ شریف نہیں بن سکتی! خدا توبہ قبول کر سکتا ہے مگر انسان نہیں بخش سکتا ہے، وہ اور اس کے قانون خدائی قانون سے بھی زیادہ سخت ہیں! مَیں نے غلطی کی کہ مَیں نے شریف بننے کی کوشش کی مجھے اپنے کیے کا پھل ملا۔ مجھے مولوی صاحب کے بچے سے محبت ہے۔ میں تم دونوں کو کبھی نہ بھولوں گی۔ مگر مَیں تم دونوں کو اب کبھی گلے نہیں لگا سکتی۔ اس لیے کہ میں رذیل ہوں اور تم شریف، میں ناپاک ہوں اور تم پاک!''

مَیں اس دن کے بعد سے اس وقت تک اس کی ماں کے کوٹھے کے کوئی دس پھیرے کر چکا ہوں۔ مگر وہ مجھ سے نہ ملی، اُس نے کہلا دیا۔ ''سمجھ لیں کہ مر گئی۔ مَیں ان سے زندگی بھر نہ ملوں گی!'' مَیں نے اسی لیے یہ حتمی عہد کر لیا ہے کہ چونکہ آپ میرے لیے اس 'عذابِ الیم' کا باعث ہوئے ہیں لہٰذا مَیں بھی آپ سے زندگی بھر نہ ملوں گا۔ مَیں یہ خط آپ کو اسی لیے لکھ رہا ہوں تا کہ آئندہ آپ مجھ سے ملنے کی کوشش فرما کر مجھے رنج نہ پہنچائیں۔ زیادہ والسلام۔

خیر طلب 'اشرف'

مَیں نے اسی وقت فٹن کسوائی اور بھیّا کو ساتھ لے کر اشرف صاحب کے ہاں پہنچا۔ جب اطلاع ہوئی تو انھوں نے کہلا بھیجا مَیں نہیں مل سکتا۔ جو لڑکا پیغام لایا تھا مَیں نے اس کے ہاتھ میں بھیّا کا ہاتھ دے دیا اور کہا اسے اُن کے پاس لے جاؤ۔ بھیّا جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ مگر مَیں نے سمجھا بجھا کے اسے اندر بھجوا دیا۔ تھوڑی دیر بعد اشرف صاحب بچہ کو گود میں لیے ہوئے باہر آئے اور مجھ سے منہ پھیر کے حد درجہ غصّے سے بولے۔ ''فرمایئے کیا ارشاد ہے؟'' مَیں نے اپنے سر سے ٹوپی اُتاری اور ان کے قدموں کی طرف بڑھا کے کہا۔ ''بھئی معاف کر دو!'' اور ہم آبدیدہ ہو کے ایک دوسرے سے لپٹ گئے!

جب آنکھوں میں مچلتے ہوئے آنسو پی چکا تو مَیں نے کہا۔ ''بھئی میں اس کی کوشش کرنا چاہتا ہوں کہ غلطیوں کی تلافی ہو جائے اور بچھڑے مل جائیں!''

انھوں نے کہا۔ ''مگر اس کے لیے آپ کو اس کی ماں کے کوٹھے پر چلنا ہوگا!''

مَیں نے کہا: ''مَیں اس کے لیے تیار ہو کے آیا ہوں۔ آپ میری رہنمائی کریں، انشاء

اللہ ناکام نہ پلٹوں گا، آخر بی ہمسائی یہ تو دیکھ لیں کہ میں نرا مولوی نہیں ہوں، بلکہ انسان بھی ہوں!" غرض ہم لوگ فٹن پر سوار ہوئے اور چوک پہنچے، اور عمر میں پہلی بار میں سارے بازار کے سامنے دن دھاڑے اپنے معصوم بچے کو لیے ہوئے ایک رنڈی کے مکان پر چڑھ گیا، پاؤں میں رعشہ ضرور تھا، اور میری پیشانی پر پسینے کے قطرے یقینی طور پر موجود تھے اور میری آنکھیں شرم سے بلاشبہ جھکی جاتی تھیں، مگر میرا دل ہر ذلت کے لیے آمادہ تھا، مَیں خوش تھا کہ آج مَیں محبت و انسانیت کی دیوی کے حضور میں اپنی خود بینی و خودداری کی قربانی چڑھا رہا ہوں!

ہم لوگ ایک تنگ زینے سے ہو کر ایک چھوٹے سے صحن میں پہنچے۔ سامنے والے کمرے میں ایک ادھیڑ عورت بیٹھی تھی اور اس کے گلے سے چمٹی ہوئی بی ہمسائی رو رہی تھیں۔ ہم لوگوں کے پاؤں کی آواز سن کے، ہمسائی ماں کے سینہ سے آنسو پونچھتی علیحدہ ہوئیں، اور مجھے دیکھ کر گھبرا کے کھڑی ہو گئیں، مَیں نے جلدی سے بھیّا کو گود میں اُٹھا کے ان کی طرف بڑھایا اُن کا ہاتھ فطرتاً پھیل گیا، مگر وہ کچھ سوچ کے جھجکیں مَیں نے کہا۔ "یہ اپنی خالہ کی تلاش میں یہاں تک آئے ہیں۔ بچے نے بھی دونوں باہیں پھیلا دیں۔ بڑی محبت سے 'خالہ! خالہ' کہا۔ اور ہمسائی نے روتے ہوئے اُسے آغوش میں لے کے گلے سے چمٹا لیا۔

بڑی بی نے اشرف صاحب سے کہا۔ "اشرف میاں، بٹیا نے جب آپ سے کہہ دیا کہ وہ اب آپ سے نہیں ملنا چاہتی تو پھر آپ اسے کیوں پریشان کرتے ہیں؟"

مَیں نے آگے بڑھ کے کہا۔ "آپ پہلے میری دو باتیں سن لیجیے۔ پھر اشرف صاحب سے کچھ کہیے گا۔" بڑی بی بولیں۔ "فرمایئے۔"

مَیں نے کہا: "یہ تو آپ شاید جانتی ہوں گی کہ اشرف صاحب کو آپ کی صاحبزادی سے محبت ہے۔ وہ ان سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ ماشاء اللہ رئیس ہیں، صاحبِ جائداد ہیں، بن بیاہے ہیں، ایک سے ایک اچھی لڑکی انہیں مل سکتی ہے۔ لیکن وہ انہیں کے گرویدہ ہیں۔ اور انہیں کے عاشق اور وہ بھی غالباً ان سے محبت کرتی ہیں۔ کیا ایسی صورت میں ان دونوں کا عقد بہتر اور ضروری نہیں؟"

بڑی بی بولیں۔ "میاں مَیں نے کب کہا کہ بہتر نہیں، مگر خدا جانے کیوں وہ اب ان سے نہیں ملنا چاہتی، حالانکہ انہیں کے لیے روتی بھی ہے، کُڑھتی بھی ہے..."

ہمسائی نے کہا: ''اماں، اماں...''

بڑی بی بولیں۔ ''چل چھوکری، مَیں نے دُھوپ میں بال سفید نہیں کیے ہیں۔ اس وقت میری باتوں میں دخل نہ دے۔''

مَیں نے کہا: ''آپ کی صاجزادی کو میری ذات سے بڑی تکلیف پہنچی ہے۔ اسی لیے وہ اشرف صاحب سے بھی خفا ہوگئی ہیں۔ مَیں نے انھیں بیسوا اور قحبہ کہا اور انھیں اپنی عورتوں سے نہ ملنے دیا، وہ اسی پر آزردہ ہیں۔''

بڑی بی بولیں۔ ''تو میاں آپ نے بڑی زیادتی کی آپ مجھے یہ سب کہہ سکتے تھے مگر اسے نہیں۔ قسم لے لیجیے جو سوائے اشرف میاں کے...''

مَیں نے گھبرا کر بات کاٹی اور کہا۔ ''تو مَیں اسی لیے تو آج معافی مانگنے آپ کے کوٹھے پر آیا ہوں...''

مَیں یہ کہہ کے ہمسائی کی طرف پلٹ پڑا۔ وہ اس وقت تک بھیّا کو کلیجے سے لگائی تھیں، وہ بھی ان کی صورت دیکھ کر کھلا جاتا تھا اور بس ایک بات کی رٹ لگائے تھا۔ 'کھالا گھر چلو! کھالا گھر چلو۔''

مَیں نے ہمسائی سے، بہت ہی لجاجت سے کہا۔ ''بی ہمسائی اب خدا کے لیے میرا قصور معاف کردو، واللہ تم میرے ایسے لاکھ شریفوں سے بہتر ہو! دیکھا بھیّا تم سے کس کس طرح گھر چلنے کو کہہ رہا ہے۔ تمھاری بہن سخت انتظار کررہی ہیں۔ مجھے حکم ہے کہ مَیں تمھیں لے ہی کے پلٹوں۔ مَیں خالی ہاتھ واپس نہیں جاسکتا، پھر اپنی اور اشرف صاحب کی زندگی میری غلطیوں کی وجہ سے کیوں برباد کرو! تم ہمسائے میں نہیں۔ میرے گھر چلو تمھاری بہن اپنے ہاتھوں سے تمھیں دُلہن بنائیں گی۔ میرے ہی گھر سے تمھاری شادی ہوگی۔ میرے ہی پڑوس میں تم دونوں ہمیشہ رہوگے اور مَیں زندگی بھر تمھیں اپنی حقیقی سالی اور چھوٹی بہن سمجھوں گا اور تمھاری خدمت کروں گا۔''

ہمسائی نے میری طرف تعجب سے دیکھا۔ بھیّا نے پھر کہا۔ ''کھالا گھر چلو۔'' مَیں نے کہا: ''دیکھو تمھارا بھانجا کیا کہہ رہا ہے۔ اگر میری بات نہیں مانتیں تو اس کی بات مان لو۔'' ہمسائی نے گھبرا کے ماں کا منہ دیکھا۔ وہ بولیں ''بی بی میں تمھاری باتوں میں دخل دینا نہیں

چاہتی مگر اتنا کہے بغیر بھی جی نہیں مانتا کہ اشرف میاں کا سا چاہنے والا میاں اور مولوی صاحب سے ایسے شریف ہمسائے رنڈیوں اور کسبیوں کو نصیب نہیں ہوتے!"

مَیں نے کہا۔"اشرف صاحب! خاموش کھڑے ہم لوگوں کا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ کسی سے کہہ کے ڈولی منگواؤ۔" انھوں نے ہمسائی کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھا۔ ان کی مسکراتی ہوئی آنکھوں پر بھیّا نے اپنا پھول سا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اس کی اس شوخی پر کھل کھلا کے ہنس پڑیں۔

مَیں نے اشرف صاحب سے پھر کہا۔"ارے یار ڈولی منگواؤ! تم اب تک کھڑے منہ دیکھ رہے ہو!"

بڑی بی نے کہا:"اے تو یونہی نہ سر میں کنگھا، نہ بال میں تیل، نہ زیور پہنے، نہ کپڑے بدلے!"

مَیں نے کہا:"ہاں، ہاں یونہی! میرے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے! اور پھر میں تو بی ہمسائی کا قرضدار بھی ہوں۔"

بڑی بی نے گھبرا کے میری طرف دیکھا۔ ہمسائی نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے کچھ کہنے سے منع کیا۔ اور جلدی سے بولیں۔"تو ڈولی منگوایئے!"

بھیّا نے خوش ہو کے اپنی خالہ کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ گویا گلاب پر گلاب رکھا تھا۔ کس کی مجال تھی کہ کہتا ایک نجس ہے، دوسرا طاہر، ایک ناپاک ہے، دوسرا پاک؟ محبت کی شعاعیں دونوں کے چہروں کو نورانی کر رہی تھیں۔ اور دونوں کی آنکھیں روحانی مسرت سے چمک رہی تھیں۔

میں نے دل میں کہا:'مولویانہ پن ان پر سے قربان اور قدامت پرستی ان پر سے نچھاور!'

نئے کھلونے

سیٹھ دھنی داس اسم با مسمّٰی تھے۔ دھن دولت کی افراط تھی۔ اللہ نے کیا نہیں دیا تھا۔ ملیں، کارخانے، محل، کوٹھیاں، مکانات، باغات، کاریں، گاڑیاں، موٹر لانچ، ہیلی کاپٹر، کیا تھا جو اُن کے پاس نہ تھا۔ جب قارون جیسا خزانہ قبضے میں ہو تو دُنیا جہان کی نعمتیں قابو میں ہوتی ہی ہیں۔ سارا وہ ساز و سامان موجود تھا جو پونجی پتی کا مارکہ ہے۔ بس اگر کوئی کمی تھی تو اولادِ نرینہ کی۔ کوئی بیٹا نہ تھا۔ لے دے کے ایک بیٹی تھی سرلا۔ صورت صانعِ قدرت کی بنائی ہوئی، سیرت سیٹھ سیٹھانی کی بگاڑی ہوئی۔ اِدھر نظر کیجیے تو گلاب کی پنکھڑی، بلجیم کا تراشا ہوا ہیرا، ٹیگور اور چغتائی کا بنایا ہوا جمالیات کا ایک رنگین ورق۔ اُدھر دیکھیے تو کڑوا کریلا، نیم کا پھول، تتیا مرچ، ست گلو! عادتیں بگڑتی سنورتی بچپن ہی میں ہیں۔ طبیعتیں بنتی سدھرتی تعلیم و تربیت ہی سے ہیں۔ کچے لوہے کو جدھر چاہو جھکا دو، مگر جب سیٹھ سیٹھانی اپنی گڑیا کی ہر 'چیں' پر سونا لٹائیں، اور ہر 'میں' پر جواہر برسائیں تو وہ ضدی، نٹ کھٹ کیوں نہ بنے؟ تیسرے ہی برس سے دس بیس نئے کھلونے ہر صبح اور پانچ سات تفریحی سامان ہر شام۔ ہر گھنٹے آدھ گھنٹے پر کوئی نہ کوئی چیز سرلا کو ضرور پیش کی جاتی۔ سینکڑوں روپے روزانہ انھیں کی تلاش اور انھیں کے مہیا کرنے میں اُٹھتے۔ ہر بڑے شہر اور ملک میں ایجنٹوں کو حکم تھا جہاں بھی کوئی چیز بچوں کی دلچسپی کی دِکھائی دے، فوراً بھیجو۔ بمبئی کے صدر دفتر میں ایک منشی انھیں پارسلوں کے وصول کرنے اور دو چپراسی ان کو محل تک پہنچانے کے لیے الگ سے مقرر تھے۔ اور سرلا کے تلوّن کا یہ حال تھا کہ ابھی کسی کھلونے کو کلیجے سے لگائے چوم چاٹ رہی ہے، ابھی اسے زمین پر پٹک کر پاؤں سے کچل رہی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اپنے کھیلنے کے کمرے میں ریل کی ننھی ننھی پٹریاں بچھائیں، چھوٹے سے

انجن میں کنجی دے کر اور ڈبے اسی قد و قامت کے جوڑ کر دوڑائے، تالی بجا بجا کر، اپنے منہ سے سیٹی دے دے کر اسے چکر لگاتے دیکھا، اور ابھی جو وہ خلافِ مزاج دو ایک جگہ بے موقع رُک گیا تو اس پر آج ہانگ کانگ سے آئے ہوئے نادر کھلونوں کا پورا ڈبہ اس زور سے کھینچ مارا کہ مرض و مریض ہی نہ گیا بلکہ حکیم جی بھی سدھارے۔ یہ تلوّن مزاج چیزوں کے ضائع کرنے اور توڑنے پھوڑنے ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ لباس میں، کھانے پینے میں، لکھنے پڑھنے میں، سرلا کی زندگی کے ہر شعبے میں اسی کا راج تھا۔ صبح اُٹھتے ہی بار بار لباس پہنا اُتارا جاتا، دس بیس دیکھا جاتا، اندازا جانا جاتا جب جا کر ایک پر رائے ٹھہرتی۔ گھنٹے بھر اسے پہن کر جی خوش رہتا، پھر وہ نظروں سے اُتر جاتا، فوراً دوسرا پہن لیا جاتا۔ یہ بھی گھنٹہ دو گھنٹہ اچھا لگتا، پھر ماما دائیاں دوڑتیں، شہزادی دوسرا جوڑا اب زیبِ تن کر لیتی۔ غذا میں بھی یہی حالت تھی۔ بند گھروں کے بچے سیر آدھ سیر دودھ ضرور پی ڈالتے ہیں۔ سرلا کے لیے یہ محال تھا۔ بہت کیا تو ایک وقت خالص دودھ پی لیا، دوسرے وقت ہارلکس، تیسرے وقت ملنس، چوتھے وقت اب اسے ربڑی بالائی میں تبدیل ہونا چاہیے، پانچویں دفعہ کھیر ہو یا اولیٹن ملا ہوا، چھٹی بار دلیا میں دَلیا میں ڈال کر یا کسی اور نئی صورت میں، مگر ساتویں دن دودھ کے نام سے نفرت ہے۔ یہی حالت پھلوں، ترکاریوں، گوشت، مچھلی، انڈا ہر چیز کی۔ آم کی فصل میں کھانے پر آم نت نئے ذائقے کے ہونا چاہئیں۔ نہ الفانسو ایک وقت سے زیادہ چل سکتا تھا، نہ دسہری، نہ لنگڑا، نہ کالا پہاڑ اور نہ ثمر بہشت۔ خیریت یہ تھی کہ یوپی بہار کے تخمی آموں کے پارسل اس بدلتی ہوئی طلب کو پورا کر دیتے تھے مگر اور پھلوں ترکاریوں میں نت نئے ذائقے روزانہ کہاں سے آتے؟ پڑھنے لکھنے کا یہ حال کہ گورنس اور اُستانیاں محل میں ساتھ رہتی تھیں، ماسٹر صاحب اور اُستاد جی بھی الگ سے آتے تھے۔ مصوری سکھانے کے لیے آرٹسٹ جدا مقرر تھا۔ صبح کو آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک، سہ پہر کو دو بجے سے چار بجے تک، شام کو سات سے ساڑھے آٹھ بجے تک پڑھنے لکھنے، ناچ گانے سیکھنے کے اوقات تھے، مگر اس نظام کی پابندی انھیں توڑنے ہی میں برتی جاتی تھی۔ گورنس انگریزن تھی، بچوں کی تعلیم کی ماہر، مگر قدغن تھی کہ سرلا کے پاس وہ جب ہی آئے جب یاد کی جائے۔ اس لیے ہفتوں باریابی کی نوبت نہ آتی تھی۔ آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک اُس کا وقت کسی دوسرے مشغلے میں صرف کر دیا جاتا، مگر کبھی جو وہ یاد آ جاتی تو پھر پورے بارہ بارہ گھنٹے

اسے دَم مارنے کی چھٹی ہی نہ ملتی۔ لنچ بھی ساتھ ہوتا، چائے بھی ساتھ پی جاتی اور ڈنر بھی ایک ہی میز پر کھایا جاتا۔ اور یہ دورہ ایک دو دن کے لیے نہ پڑتا، اس کا سلسلہ ہفتوں جاری رہتا۔ پھر جو وہ بھلائی گئی تو اُتاری ہوئی جوتی، پھینکی ہوئی چپل بن گئی۔ اب ماسٹر صاحب کی شامت آئی۔ کولھو کے بیل کی طرح اب وہ جُتتے ہیں۔ دو بجے کی جگہ آٹھ ہی بجے سے وہ بلائے جا رہے ہیں، اسکول کالج کی ملازمت سے چھٹی لے کر سارا وقت سرلا کے ساتھ صرف کر رہے ہیں۔ اے لیجیے، دو ہفتے کے بعد ان سے بھی طبیعت اُوبی، اب اُستاد جی پر نظرِ عنایت ہوگئی۔ صبح شام، دوپہر سہ پہر، دن رات، راگ راگنیاں ہیں، سُر تال ہے، تھاپ ہے، توڑے ہیں، کتاب پڑھنے پر آئی تو بمبئی کے سارے کتب فروشوں کی دُکانیں چھان ماری۔ انگریزی، ہندی، مراٹھی، گجراتی، بنگلہ، اُردو، تامل اور تلگو زبانوں میں بچوں کی ساری مصوّر کتابیں خرید لائی۔ جب تک سب پڑھ نہ لیں، کھانے پینے، کپڑے لتے، کھیل کود کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ اُٹھتے بیٹھتے، لیٹتے سوتے ایک نہ ایک کتاب ہاتھ میں ضرور رہی۔ ہر زبان کا جاننے والا ماسٹر حاضر رہا، وہ کہیں اٹکی اور اُس نے جھٹ بتایا، معنی مطلب سمجھایا۔ مہینے بھر سے زیادہ یہ دلچسپی قائم رہی، پھر طبیعت سرد ہوگئی۔ اب حساب لگنے لگا۔ سلیٹ پنسل سامنے ہے، کاپی فاؤنٹین پین ہاتھ میں ہے، سخت سے سخت سوال حل کیے جا رہے ہیں۔ ذہین بلا کی تھی، جو دوسرے مہینوں میں سیکھتے وہ گھنٹوں میں سیکھ لیتی۔ بس اصول سمجھا دیجیے، قاعدے بتا دیجیے، پھر تو مشکل سے مشکل سوال پانی ہے۔ یہی حالت ناچنے گانے میں تھی، یہی انداز گھوڑ سواری، پیراکی اور موٹر ڈرائیوری میں تھا۔ وہ ہر علم، ہر ہنر، ہر فن کو سیکھتی نہ تھی، پھانکتی تھی۔ اور حق تو یہ ہے کہ اپنے ہم سنوں میں ہر پہلو سے سب سے اچھی دِکھائی دیتی تھی۔

سات برس کے سن میں ایک اچھے پبلک اسکول میں داخلہ کی کوشش کی گئی۔ خوشی خوشی داخلے کے امتحان میں سب سے اوّل آئی۔ جس درجے کے لیے جانچا گیا تھا اس سے اُونچے کلاس میں پرنسپل نے بڑی خوشی سے نام لکھ دیا۔ ایک ہفتہ تک تو بڑی گہما گہمی رہی۔ اسکول جانے اور وہاں سے لانے کے لیے اسی طرح کا اہتمام رہا، جس طرح نئی دلہنیں چوتھی چالوں میں آتی جاتی ہیں، مگر دسویں ہی دن سرلا رُوٹھ کر گھر بیٹھ رہی۔ ارے واہ وہاں روز روز ایک ہی کتاب پڑھائی جاتی ہے اور استانیاں بھی بدلتی نہیں۔ جب دیکھو، ہی ایک اُستانی چلی آ رہی

ہے۔ میں نہ جاؤں گی، میرا وقت ضائع ہوتا ہے۔ میرا جی اُوب گیا! سٹھانی نے ذرا ڈانٹنا چاہا، سیٹھ جی بھی موجود تھے۔ جلدی سے بول اُٹھے "ہاں، ہاں، کیا کرے گی وہاں جا کے۔ کوئی امتحان پاس کرنا ہے کہ کوئی ڈگری لینی ہے۔ دیکھتی نہیں ہو کہ گجراتی، مراٹھی، ہندی، اُردو سب ہی تو فر فر بول لیتی ہے، پھر انگریزی تو ہماری بیٹی ایسی بولتی ہے کہ انگریزن 'مس بابا لوگ' بھی شرمائیں۔ بس اور کیا چاہیے۔ مفت مفت میں کیوں ہلکان ہو، اسکول کالج دوڑتی پھرے۔ جس ڈھنگ پر وہ چلنا چاہتی ہے اسی پر چلنے دو۔" چلیے جب ماں باپ کی لگام اپنے ہی ہاتھوں میں ہو تو من مانی کیوں نہ کی جائے۔

مگر یہ ساری باتیں والدین کو جتنی بھی شیریں معلوم ہوں دوسروں کو تو کڑوی کسیلی لگتی ہی تھیں، جن کا ہاتھ سیٹھ سے نیچا تھا، جو اُن سے متوسل تھے وہ چاہے سرلا کی زیادتیاں انگیز کر لیں، مگر برابر والے کیوں نکتوڑے توڑنے لگے۔ چنانچہ جب سرلا سیانی ہوئی اور سولہ برس سے آگے سن نکل گیا تو دوسرے سیٹھوں کے لڑکے لڑکیوں سے بھی ملنا جلنا، آنا جانا ہوا۔ لڑکیوں میں سے کچھ سہیلیاں بنیں، لڑکوں نے للچائی نظروں سے دیکھ کر پینگ بڑھانے کی کوشش کی۔ سرلا کا یہ حال کہ جس سے نئی نئی دوستی کر لی دو تین ہفتے تو اس طرح سر چڑھاتی کہ معلوم ہوتا ہیر رانجھا کے جوڑے نے پھر سے جنم لیا ہے، رومیو جولیٹ، قیس و لیلیٰ کا رومان دہرایا جا رہا ہے، مگر جب نشہ اُترا تو وہی جس پر جان چھڑکتی تھی وہ صدقے کا کالا کوا بن گیا۔ اب خط پر خط آ رہے ہیں، ٹیلی فون کی گھنٹی پہ گھنٹی بج رہی ہے، لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ نوکرانیوں کی زبانی بس یہی جواب ملتا ہے "کہہ دو اُس بور سے میرے پاس وقت نہیں۔" لیکن اس طرح کا سلوک برابر والوں میں نہیں چل سکتا۔ ایک نہیں سینکڑوں دھنی سیٹھ بمبئی میں ہیں، اُن میں آپس میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ "صاحب یہ تو آپ کے بیہوہار کے خلاف ہے۔ اس لڑکی نے اپنے کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس لڑکی سے کوئی بیاہ شادی نہ کرے۔ جس کے گھر جائے گی زندگی دُوبھر کر دے گی۔"

لیکن جس کا جی چاہے جو کہے، جس کے لڑکی ہوگی وہ تو ہزار طرح کے جوڑ توڑ کرے گا ہی۔ پھر سرلا کا وہ سن بھی آ گیا تھا جب اسے ایک نئے کھلونے کی صورت میں ایک پتی بھی پیش کیا جانا ضروری تھا۔ اس لیے سیٹھ دھنی رام نے اب اپنے بیوپار کا دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ کسی کو

کاروبار میں شرکت کا سبز باغ دِکھایا، کسی کو سارا کاروبار سونپ دینے کا لالچ دلایا، اور جب اس پر بھی کوئی بیٹا چڑھانے پر تیار نہ ہوا تو وہ بھی جھلا کر برابر والوں کو سینگ مارنے لگے۔ کسی کی کمپنی کے شیئرز کا بھاؤ گرا کر دو تین لاکھ کا نقصان کرادیا، کسی کے ٹینڈر کے مقابلے میں سستا ٹینڈر دے کر اُس کا ٹھیکہ تڑوادیا، کسی کے مل کے بہتر سے بہتر کاریگروں کو زیادہ تنخواہیں دے کر اپنی ملوں میں بلالیا، اور اس کی مل کی ساری شہرت خاک میں ملادی۔ کسی کے خلاف کچھ ایسی چالیں چلیں کہ اس کا دیوالہ ہی نکل گیا۔ ہر طرف چرچا ہونے لگی، ذات برادری میں ایک غوغا سا مچ گیا کہ بیٹی بیاہنے کی خاطر سیٹھ دھنی رام کٹکھنا کتا بن گئے ہیں۔

سٹھانی نے جو یہ حالت دیکھی تو ایک دن انھیں سمجھایا ''ہمیں تمھیں دھن دولت کی ضرورت نہیں، پڑھا لکھا سمجھدار لڑکا چاہیے۔ سو ذات برادری میں ایسے ہی کو ڈھونڈو۔ آسمان میں اُڑتے ہوئے عقابوں کو دیکھ چکے، اب زمین پر دانہ چگتے ہوئے کبوتروں پر بھی نظر ڈالو۔ سرلا کی صورت اور تمھاری دولت ایسا پھندا نہیں کہ اس میں کوئی بھی نہ پھنسے۔''

سیٹھ جی کو بیوی کی یہ رائے بھائی اور انھوں نے ذرا بڑا جال ڈالا۔ اپنی ہی برادری کا ایک شریف صورت گریجویٹ غریب لڑکا مل ہی گیا۔ موتی چگنے والا ہنس ہاتھ آ ہی گیا۔ انھوں نے دھوم دھام سے شادی کی اور سرلا کو جگ موہن داس نام کا نیا کھلونا پیش کردیا۔ لیکن یہ کوئی بے جان روبوٹ نہ تھا۔ یہ ایک ہوشمند انسان تھا، پڑھا لکھا جن۔ اُس نے نفسیات پر بھی کتابیں پڑھی تھیں اور جنسیات پر بھی۔ وہ شیکسپیئر کے بتائے ہوئے نسخوں سے بھی واقف تھا اور فرائڈ کی مجرب دواؤں سے بھی۔ اُس نے پہلے ہی دن سے سرلا کو ایک طبیب کی نظر سے دیکھا۔ جذبات کی رَو میں نہ بہا۔ وہ ساحل پر کھڑے ملاح کی طرح سمندر کے جزر و مد کو دیکھتا رہا۔ اُس نے طے کیا اس جدت پسند فطرت کو انسانی تعلقات کا جلال و جمال سکھانا ہے۔ اُس کی صحیح قدریں بتانی ہیں۔ اسے مشاہدہ کرانا ہے کہ سب کچھ بدل سکتا ہے، مگر انسانی تعلقات میں کچھ قدریں نہیں بدلتیں۔ نہ ماں باپ بدلتے ہیں، نہ بھائی بہن، نہ بیٹا بیٹی۔ شوہر اور بیوی کا رشتہ بھی ہندو دھرم میں بہت حد تک نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے۔ روز نت نیا مرد مل سکتا ہے اور نئی نویلی عورت بھی مہیا ہوسکتی ہے، مگر روز روز شوہر نہیں ملتا، آئے دن پتی نہیں بدلتا۔ ان کے لیے تو وفاداری واستواری دونوں شرطیں ضروری ہیں۔ اس لیے وہ خاموشی سے سرلا کا نیا معلم بنا۔ اُس

نے طے کیا کہ آدھا پیٹ کھانے سے ہمیشہ بھوک باقی رہتی ہے، چلّو چلّو پینے سے جلدی سے پیاس نہیں بجھتی، اس لیے اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ چند گھنٹوں کے لیے سرلا کے پاس آتا پھر کئی کئی دن نہ آتا۔ ایک دن سسرال میں رہتا تو دس دن شہر کے باہر چلا جاتا۔ سرلا ہمیشہ اس سے بے تکلف بننے کی کوشش کرتی لیکن وہ اسے اس کا موقع ہی نہ دیتا کہ وہ اسے اچھی طرح پہچان بھی سکے۔ سرلا نے ایک دن ماں سے جھلا کر کہا ''یہ اچھے کے ہاتھ میں آپ لوگوں نے میرا ہاتھ دیا کہ وہ پہلے ہی دن سے ہاتھ چھڑا کر الگ کھڑا ہو گیا۔'' ماں تو منہ دیکھ کر چپ رہی لیکن اُستانی قریب بیٹھی تھی، اُس نے ہنس کر کہا ''بیٹا، یہ نیا کھلونا ہے، اس سے کھیلنے کا ڈھنگ تمھیں خود سوچ کر نکالنا پڑے گا!''

سرلا اُستانی کی بات بالکل نہ سمجھی۔ پاؤں پٹکتی اپنے کمرے میں چلی آئی، مگر تھوڑی دیر میں غصہ رفع ہوا تو سوچا کہ پتی کے برتاؤ میں ایک نیا پن ضرور ہے۔ اس خیال سے مزہ لینے لگی۔

اتفاق سے اسی شام کو جگ موہن ٹہلتا ہوا آ نکلا۔ بس سرلا نے اسے پکڑ لیا۔ اسے سارے کھلونے دِکھا ڈالے، کتابیں دِکھا ڈالیں، سارے گہنے دِکھا ڈالے، مگر جب کپڑوں کی باری آئی تو جگ موہن نے کہا ''یوں نہیں، اس کمرے کی الماریوں میں جتنے موجود ہیں اُنھیں پہن پہن کر پہلے دِکھاؤ، پھر دوسری الماریوں بکسوں کو کھولنا اور انھیں دِکھانا۔''

سرلا نے بڑی اچھی بنارسی ساڑی پہنی، جگ موہن نے سامنے سے دیکھا، پیچھے سے دیکھا، داہنے سے دیکھا، بائیں سے دیکھا، پھر منہ بنا کر کہا ''کچھ جچی نہیں!''

سرلا نے اس سے بھی قیمتی پہنی۔ وہ بولا ''بال اُلجھ گئے ہیں، انھیں ٹھیک کر لو تو کوئی رائے قائم کروں۔'' سرلا نے قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر بال برابر کیے۔ خود کو ایسی خوبصورت معلوم ہوتی تھی کہ یقین آ گیا اب اس کے پتی متوالوں کی طرح جھومنے لگے گا۔

مگر اُس نے سر ہلایا ''اونہوہ! یہ بھی کچھ یوں ہی سی رہی!''

سرلا بگڑ پڑی ''واہ، پانچ ہزار کی ساڑی ہے، بالکل نیا ڈیزائن ہے......''

جگ موہن نے ہاتھ اُٹھا کر روکا ''دیکھو بھائی، پرانے لوگ گزر گئے، کھانا وہ جو اپنے کو بھائے اور کپڑا وہ جو دوسروں کو بھائے۔ سو مجھے تو یہ نہیں پسند۔''

سرلا نے جھٹ اس سے بھی قیمتی ساڑی اُٹھا کر دِکھائی ''تو یہ پسند ہے!''

جگ موہن نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا ''پہن کر دِکھاؤ۔''

سرلا نے پوچھا ''ایسے نہیں بتا سکتے؟''

جگ موہن نے کہا ''دُکان پر سب کپڑے اچھے لگتے ہیں مگر جسم پر ہر کپڑا اچھا نہیں لگتا۔''

سرلا نے وہ ساڑی بھی پہنی۔ جگ موہن نے وہ بھی نامنظور کی۔ اور یہ سلسلہ اتنی دیر تک چلتا رہا کہ سرلا تھک کر چوُر ہوگئی اور ایک کم قیمت جارجٹ کی ساڑی پہنے پلنگ پر گر پڑی۔ جگ موہن نے اس کی بڑی تعریف کی۔ وہ بولا ''اہاہا، دیکھو تو اس کا رنگ تمھارے رنگ سے کتنا میل کھاتا ہے، اور یہ تم نے پہنی بھی اس طرح ہے کہ تمھارے جسم کی ساری خوبیاں چمک اُٹھی ہیں۔ واہ، واہ! یہ ہے ساڑی!''

سرلا خوش ہوگئی۔ اس کے دل میں نہ جانے کون سی ترنگ پیدا ہوگئی، اُس نے انگڑائی لی۔ جگ موہن اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''اچھا تو تم آرام کرو، میں چلا۔''

سرلا نے ہاتھ پکڑلیا۔ ایک بچّے کی طرح مچل کر کہا ''میں تمھیں آج نہ جانے دوں گی۔''

جگ موہن رُک گیا۔ اُس نے وہ رات سسرال ہی میں کاٹی، مگر صبح تڑکے ہی جبکہ سرلا سو رہی تھی وہ چل دیا۔ سرلا جب اُٹھی تو اُس نے پہلو خالی پایا۔ پہلے سمجھی حمام میں ہوگا، مگر جب معلوم ہوا وہ چلا ہی گیا تو بہت جھلاّئی۔ صبح کی بیڈٹی واپس کردی۔ نہانے کے بعد حسب معمول دوسرے کپڑے پہنے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد نہ جانے کیوں انھیں اُتار کر پھینک دیا، اور پھر وہی جارجٹ والی ساڑی پہن لی۔ دن بھر اسی کو پہنے رہی، شام کو بار بار کھڑکی تک جاکر جھانکا کی۔ جیسے جگ موہن کا انتظار کر رہی ہے، اس سے اسی ساڑی میں ملنا چاہتی ہے، مگر وہ نہ آیا۔ ٹیلی فون اُٹھایا کہ اس کے گھر کھٹکھٹائے، مگر وہاں ٹیلی فون لگا ہی نہ تھا۔ غریب کے گھر میں یہ سازوسامان کہاں؟ جی چاہا خود جاکر پکڑ لائے۔ پہلے شرمائی، کیا کہیں گے سسرال والے۔ پھر یاد آیا وہاں ہے کون؟ ساس سسرے سب پہلے ہی سورگ باش ہو چکے تھے۔ بس ایک بوڑھا نوکر مرلی تھا۔ طے کرلیا، آؤ چلیں۔ پتی کو اس کے گھر سے گرفتار کرکے لانا بھی تو ایک نئی بات ہے۔ خیال ہی سے مزہ آنے لگا۔ جلدی جلدی موٹر نکلوائی۔ خود ہی ڈرائیو کرتی ہوئی جگ موہن کے گھر پہنچی۔ دیکھا دروازے میں قفل پڑا ہے۔ سارا شوق حرمان میں بدل گیا۔ اپنا سامنہ لے کر پلٹ آئی۔

آج پہلی دفعہ کئی ہزار کھلونوں کی موجودگی پر بھی تنہائی محسوس ہوئی۔ الماریوں پر نظر ڈالی، ساری کتابیں پڑھی ہوئی تھیں، کوئی دل بستگی کی چیز نئی نہ تھی۔ کمرے سے باہر نکل آئی۔ بڑی موٹر نکلوائی، ڈرائیو کو حکم دیا کتابوں کی بڑی بڑی دُکانوں پر لے چلو۔ جتنے نئے ناول ملے سب خرید ڈالے۔ اُنھیں موٹر میں لاد کر گھر لائی۔ ماں نے کھانے پر بلایا، کہہ دیا طبیعت ٹھیک نہیں، لیٹ رہی۔ ایک کے بعد ایک کتاب اُٹھائی، کسی کی دو سطریں، کسی کی چار پڑھیں، کسی کا پورا صفحہ پڑھ ڈالا، کسی کے دو ورق، مگر کسی میں بھی جی نہ لگا۔ ایک ایک کر کے سب کو سرہانے کی طرف فرش پر پھینکتی چلی گئی۔

رات گئے ماں خیر خیریت پوچھنے آئی۔ ''کیا بات ہے جو کھانا نہیں کھایا؟'' ان کی گود میں سر ڈال کر عمر میں پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ وہ پیٹھ سہلاتی، سر تھپکتی رہیں۔ ''کیا ہوا بیٹی؟ کیا ہوا میرا لعل؟'' کہہ کر بار بار اس آہ وزاری کا سبب پوچھتی رہیں۔

سرلا نے آنسو پونچھ کر کہا ''کچھ نہیں، طبیعت گھبراتی ہے۔''

وہ اُسے گود میں لے کر لیٹ گئیں۔ سرلا کو وہی راحت ملی، وہی اطمینان محسوس ہوا، جو بچپن میں اس سینے سے لگ کر سونے میں محسوس ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر میں اسے نیند آ گئی۔ ماں کب سوئیں، کب اُٹھ کر چلی گئیں، اسے نہیں معلوم۔ صبح کو جو اُٹھی تو پھر پہلو خالی پایا اور پہلی دفعہ اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ عورت کے لیے اس کا شوہر، پتی ہی سب کچھ ہے۔ اور یہ سوچتے ہی وہ مسکرائی۔ اس طرح مسکرائی جس طرح شبنم کا قطرہ پہلی کرن کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ وہ ایک عجیب طرح کے سرور میں کچھ جھومتی اُٹھی، اور حمام میں جا کر اُس نے دو دن پہنی ہوئی جارجٹ کی ساڑی اُتاری۔ مگر اسے میلے کپڑوں کے ڈھیر میں نہیں پھینکا بلکہ اسے اپنے ہاتھ سے تہہ کیا اور الماری میں سب ساڑیوں کے اوپر اس انداز سے رکھ آئی جیسے اسی کو سب سے اُونچی جگہ ملنا چاہیے، جیسے وہ سب ساڑیوں کی ملکہ ہے، جیسے وہ کوئی پاکیزہ مذہبی کتاب ہے جس سے اُوپر کوئی دوسری چیز نہیں رکھی جا سکتی!

شام کو جگ موہن پھر آیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی رات کی لائی ہوئی کتابیں پڑھ رہی تھی۔ وہ محل میں ساس کے پاس جا کر اُن سے باتیں کرنے لگا۔ ایک مہری نے جلدی سے سرلا کو خبر کی۔ دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ پسینہ سا چھوٹنے لگا۔ اُس نے پھر بھی جلدی سے کتاب پھینکی اور

قیمتی نئی ساڑی اُتار کر وہی میلی جارجٹ والی ساڑی پہن لی اور دل میں نہ جانے کتنی شکایتوں کا انبار اکٹھا کر کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ یہ کہوں گی، وہ کہوں گی، انھوں نے مجھ کو کیا سمجھ رکھا ہے، جب جی چاہا آئے، جب جی چاہا بیٹھ رہے، نہ گھر پر پتہ، نہ سسرال میں اطلاع۔

مگر جب وہ آیا اور اُس نے اپنے خاموش انداز سے سرلا کو مسکراتی آنکھوں سے دیکھا تو ایسا جان پڑا کہ جیسے سارے گلے شکوے جاتے رہے۔ اُس نے سب کچھ وہ پالیا جس کی وہ بھوکی تھی۔ اب اسے نہ کچھ کہنا ہے اور نہ کچھ اور مانگنا۔

پھر اس پر جگ موہن کے پہلے ہی فقرے نے گفتگو کی ساری رَو بدل دی۔ وہ آتے ہی اسے کچھ متعجب سے دیکھ کر بولا ''ایں تم نے آج ابھی تک کینچلی نہیں بدلی؟''

سرلا سوائے اس کے کچھ نہ کہہ سکی کہ ''تم ہی کو تو یہ ساڑی بہت پسند ہے۔''

وہ ہنس کر چپ رہا، مگر اس کی آنکھیں اس طرح چمکنے لگیں جیسے اُن میں چھوٹے موٹے ستارے ٹانک دیئے گئے ہوں۔

رات میں جب اُس نے دبی زبان میں دو دن نہ آنے کی شکایت کی، تو وہ بولا ''تمھارے اس کمرے میں جب آتا ہوں تو جان پڑتا ہے گھر والی کے پاس نہیں آیا ہوں بلکہ کسی عجائب گھر میں!''

بس اس پر تو وہ ٹوٹ پڑی ''کیسا تو کمرہ سجا ہے۔ ایسی نادر چیزیں کسی کے ہاں بمبئی میں نہ نکلیں گی۔ نہ جانے کہاں کہاں سے تو پتاجی نے میرے لیے یہ چیزیں منگا منگا کر اکٹھا کی ہیں، اور تم ہو کہ اس کی ہنسی اُڑاتے ہو۔''

وہ بولا ''میں ہنسی نہیں اُڑاتا۔ میں تو اپنے دل کا حال کہتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن میں بھی انھیں کی طرح کسی نہ کسی میز پر رکھ دیا جاؤں گا اور تم مجھے اپنی سہیلیوں کو دِکھاتی پھروگی۔ دیکھو بابو جی نے یہ کتنا اچھا کھلونا میرے لیے منگایا تھا۔ میں نے اسے کتنا سنبھال کر رکھا ہے!''

وہ اس کے طنز کو نہ سمجھ کر خوب ہنستی رہی۔ پھر بے فکری کی نیند سوگئی۔ صبح کو جب جگ موہن جانے لگا تو اُس نے پوچھا ''شام کو آؤ گے نا؟''

جگ موہن یہ کہہ کر کہ ''دیکھا جائے گا'' چلا گیا۔

سرلا تھوڑی دیر تو شوہر کی بے پروائی کے انداز سے لطف لیتی رہی، اس لیے کہ یہ اس کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ وہ کسی سے کسی بات کی خواہش کرے اور وہ یوں ٹال دے، جیسے اس میں کوئی وزن ہی نہیں۔ جیسے اس کی بات بھی خالی دی جاسکتی ہے اور اسے اپنے اس انوکھے شوہر پر بڑے زور سے پیار آیا۔ وہ اُچھل کر کھڑی ہوگئی اور ناچتی تھرکتی حمام میں چلی گئی۔ وہاں آج وہ نہانے کے دوران میں برابر گاتی رہی، جب وہاں سے ایک اچھی ساڑی پہن اور بن سنور کر نکلی تو اُس نے کمرے پر ایک نئی نظر ڈالی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اتنے سارے کھلونوں سے اُس کی طفلانہ ذہنیت کی شہادت ملتی ہے، اور اُس نے پہلی بار سوچا کہ واقعی دوسرے لوگ اسے کیا کہتے ہوں گے۔ اُس نے مہریوں کی مدد سے سارے کھلونے اُس کمرے میں منتقل کرادیئے جس میں اور تفریحی سامان رکھا تھا۔ پھر کمرے کی ہر چیز صاف کر کے، جگہ بدلوا بدلوا کر سلیقہ سے لگوائیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کمرہ ہنسنے لگا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ آج آئیں گے پتی دیو تو انھیں یہ گھر معلوم ہوگا۔

پھر اپنی ساڑی پر نظر کی، اچھی خاصی قیمتی ساڑی صفائی میں میلی ہوگئی تھی۔ سوچنے لگی لاؤ اسی ساڑی کو پہن لوں جو انھیں پسند ہے، مگر وہ اب واقعی پہننے کے قابل نہ تھی۔ کیا کیا جائے۔ شلوار، جمپر اور دوپٹہ پہن گاڑی منگوائی، بازار میں پہنچی اور اسی رنگ اور ڈیزائن سے ملتے جلتے ڈیزائن کی درجن بھر ساڑیاں خرید لائی۔ ایک ایک کر کے سب کو پہن کر دیکھا، ہر ایک حُسن پر صیقل کا کام دیتی تھی۔ کسے چنے، کسے انتخاب کرے۔ بالآخر جو ساڑی مہریوں ماماؤں کی رائے میں سب سے اچھی لگتی تھی وہ پہن لی۔ مالی سے تاکید کر کے سارے گلدانوں میں اچھے سے اچھے پھول لگوائے، شوہر کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے کئی موٹے موٹے ہار گوندھے، مسہری میں بہت سے ہار لٹکائے اور نئی ساڑی پہن کر انتظار کرنے لگی۔

بار بار کھڑکی تک جاتی، بار بار گردن نکال کر باہر دیکھتی، بار بار ٹہلتی، بار بار گنگناتی، بار بار جوڑے کا پھول درست کرتی، بار بار مسہری کے ہار سلجھاتی۔ یوں ہی وقت گزرتا گیا اور آفتاب دریچوں سے جھانکتا ہنستا، آنکھیں مارتا نئے دیس چلا گیا۔ شام نے اپنے سیاہ جوڑے کے پیچ کھولنا شروع کیے اور سرلا کے ہاں آہٹ پر کان، در پر نظر تھی کہ ناگہانی مرلی آتا دِکھائی دیا۔ مہری اس کالایا ہوا ایک خط لا کر دے گئی۔

''دیوی جی! میں آج دوپہر کی گاڑی سے باہر جا رہا ہوں۔ شاید کچھ دنوں آپ کے درشن نہ ہو سکیں گے۔''

سرلا کی آنکھوں میں مرچی سی لگ گئی۔ تلملا اُٹھی، تڑپ گئی۔ رنج اور غصہ کے اظہار کا بہانہ بوڑھا مرلی بنا۔ پیشی ہوئی، سوالات کی بوچھار کر دی گئی۔

''کب گئے، خط کب لکھا، تم اب تک کہاں مرتے رہے، شام کو خط کیوں لائے، کیا تمھارے پاؤں ٹوٹ گئے تھے، جلدی نہ چلا جاتا تھا۔ ہر قدم پر بیٹھتے ہوئے آئے ہو؟''

بوڑھا بہت سی برساتیں کھا چکا تھا۔ ان معمولی چھینٹوں کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ہمالیہ کی طرح خاموش کھڑا رہا۔ جب سرلا سانس لینے کے لیے رُکی تو وہ بولا ''بابو جی نے یہ چٹھی گاڑی میں بیٹھ کر لکھی اور تاکید کی تھی کہ سانجھ (شام) سے پہلے نہ جانا۔''

اب اس کا جواب سرلا کے پاس اس کے سوا کیا تھا کہ حد درجہ کھسیانی ہو کر حکم دے ''دُور ہو جا میرے سامنے سے! اور خبردار پھر کبھی نہ آنا۔'' اُس نے وہ بھی سن لیا اور سلام کر کے چلا گیا۔

اب کمرے کی سج دھج کون دیکھے اور اہتمام سے گوندھے ہوئے ہار کون پہنے؟ اُس نے انھیں توڑ پھوڑ کر فرش پر پھینک دیا۔ پھر نئی ساڑی اس طرح نوچ نوچ کر اُتاری کہ وہ کئی جگہ سے مسک گئی اور شلوار اور لمبا کرتا اور دوپٹہ شانوں پر ڈال کر وہ موٹر میں سوار ہو گئی۔ سب سے پہلا جو سنیما ہاؤس میں اُس میں گھس گئی۔ وہاں جو ایک ہندوستانی فلم میں کئی گانے ایک ساتھ سننے پڑے تو اُکتا کر بھاگی اور ایک انگریزی فلم میں بیچ سے جا کر بیٹھ رہی۔ اتفاق سے ٹارزن لگا تھا۔ جنگل کی وحشیانہ زندگی میں اس طرح محو ہوئی کہ دل کے درد کو بھول گئی۔ گھر پہنچی تو ماں باپ نے کھانے پر بلا لیا۔ اُن کی نہ بدلنے والی محبت میں عجیب طرح کا مزہ محسوس ہوا۔ خوش خوش جا کر سو رہی۔

صبح کو اُٹھی تو جگ موہن یاد آنے لگا۔ خود اپنا جائزہ لینے لگی۔ یہ ہے کیا؟ ان کے اس بھاگنے میں مجھے کیوں مزہ ملتا ہے۔ خفا ہونے والی بات ہے کہ لطف لینے کی۔ مجھے کیا، وہ آئیں یا نہ آئیں۔ لیکن نہیں، مجھے تو ان کے کچھ دینے میں ایک لذت سی محسوس ہوتی ہے۔ ساڑی اُنھی کی پسند کی پہننا چاہتی ہوں، کمرہ اسی طرح سجانا چاہتی ہوں جس میں انھیں گھر محسوس ہو۔ ان کا

انتظار دل میں دن دن بھر چھپا بیٹھا رہتا ہے۔ وہ اُلجھنے لگی، وہ اب تک کسی کی خواہش کی محکوم اور پابند نہ بنی تھی۔ ماتا پتا، ملنے جلنے والیاں، نوکر چاکر وہ سب کی اب تک حاکم رہی تھی۔ اب یہ کسی کی پابند بنی کی عجیب خواہش کیسی؟ لیکن ہے تو وہ نئی۔ اس کی بھی آزمائش ضروری ہے۔ آؤ پھر کچھ دنوں اس نئے جذبے سے کھیل کر اس کا تجربہ کیوں نہ کریں؟ لیکن وہ تو چلا گیا، جس نے اس نئے جذبے سے روشناس کرایا، جس کی وجہ سے یہ نئی خواہش پیدا ہوئی۔ اونہہ، مگر ماتا پتا تو ہیں، جنھوں نے عمر بھر نخرے اُٹھائے۔ آؤ انھیں سے اس آزمائش کی ابتدا کیوں نہ کی جائے۔ انھیں کی اطاعت کرکے، انھیں کا کہا مان کر دیکھا جائے کہ کیسا لگتا ہے۔ اپنے ماتا پتا کی اگر وہ ہندوستانی بیٹی بن جائے تو کیسا رہے؟

اُس نے اسی دن سے ایک نیا رُوپ بدلا۔ وہ صبح اُٹھتے ہی ان کی پالگی کو جاتی، باپ کو چائے پلاتی، ناشتہ کراتی اور دن بھر ماں کا گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتی۔ رات کو بھی ان کے پاؤں سے لگی جب تک وہ سو نہ جاتے بیٹھی رہتی۔ دونوں کے چہرے خوشی سے چمکنے لگتے۔ ماں کی چھاتی ممتا سے پھٹنے لگتی۔

ایک رات کچھ طبیعت ست ست سی تھی، کھانا نہ کھایا، کچھ عجیب طرح کی تکلیف تھی کہ نیند ہی نہ آتی تھی۔ ماں نے جب آ کر خوب سر دبایا، تھپکا، پھسلایا، بہلایا جب کہیں جا کر سوئی۔

(مسودہ، تاریخ درج نہیں)

وراثت

نصیر اور نسرین کی ملاقات چوبیس برس بعد پالم کے ہوائی اڈّے پر ہوئی۔

نصیر اس طویل مدت کے بعد ہندوستان پلٹا تھا۔ وہ وطن سے بھاگا تھا اسی نسرین کو بھلانے کے لیے۔ وہ نہ جانے کتنے ملکوں میں مارا مارا پھرا، اس نے اَن گنت تکلیفیں اُٹھائیں، سختیاں جھیلیں، اسی نسرین کے ہجر میں۔ اسی غم میں وہ دوسری جنگِ عظیم میں ایک معمولی سپاہی کی طرح بھرتی ہوگیا۔ سیکڑوں بار گولیوں کی بوچھار سے گزرا، کئی بار زخمی ہوا، مرتے مرتے بچا۔ جب آخری بار پاؤں کی ہڈّی ٹوٹنے سے ہلکا سا لنگ صحت یاب ہونے پر بھی باقی رہ گیا، تو اسے فوج سے فارغ خطی مل گئی۔ پھر وہ اپنے طور پر ایشیا، افریقہ، جنوبی و شمالی امریکہ، الاسکا، کناڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، انڈونیشیا، ملیشیا میں سیر کرتا رہا۔ کہیں چھوٹی چھوٹی تجارتیں کیں، کہیں اپنے فرم کی شاخیں بھی کھولیں، کہیں اپنے کارخانوں کے بنے ہوئے مال کے لیے نئے نئے معاہدے بھی کیے۔ اس لیے کہ نصیر حقیقتاً ہندوستان کے بڑے پونجی پتیوں میں سے تھا۔ بمبئی اور احمد آباد میں اس کی کاٹن ملیں تھیں۔ کانپور میں ایک ٹینری تھی، گورکھپور میں ایک شکر مل، بھدوہی میں قالینوں کا کاروبار اور کلکتہ میں جوٹ مل۔ اس کی ایک ٹی اسٹیٹ آسام میں تھی اور ایک کیرالہ میں۔ اس کی غیر حاضری میں یہ سارا کاروبار اس کے اعزاء اور اس کے معتمد ملازمین بڑے سلیقے سے چلاتے رہے۔ اس کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ اس کے پاس بہت سے کام تھے۔ اس کے پاس دل بہلانے اور غموں کے بھول جانے کے بڑے ذرائع تھے۔ لیکن اس نے لاکھ چاہا کہ نسرین کا خیال دل سے نکال دے، پر وہ نہ نکلا۔ ایک تہہ نشین کانٹے کی طرح رگِ جاں میں گھسا وہ ہمیشہ کھٹکتا رہا۔

نسرین اس کی محبوبہ و معشوقہ نہ تھی، اس کی سچی عاشق بیوی تھی۔ کیسے پیار اور محبت کے تین مہینے دونوں نے ساتھ گزارے تھے! سچ مچ دن عید تھے اور راتیں شب برات۔ جو دیکھتا یہی کہتا کیسا اچھا جوڑا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر فدا۔ دونوں حسین، دونوں پڑھے لکھے مہذّب اور دونوں دولت مند۔ نصیر احمد آباد کے سب سے بڑے تاجر کا اکلوتا بیٹا اور نسرین سیٹھ عبدالکریم کروڑپتی کی واحد چشم و چراغ تھی۔ مگر بے عیب ذات خدا کی۔ نصیر میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ شراب پیتا تھا اور وہ بھی اس انوکھے طور پر کہ یا تو مہینوں ایک قطرہ نہیں، یا جب پینے پر آیا تو پانچ سات دن سوائے شراب کے اور کچھ نہیں۔ وہی کھانا وہی پینا، وہی اوڑھنا وہی بچھونا، وہی زمین وہی آسمان، وہی عزیز وہی دوست، وہی معشوق وہی بیوی! پلنگ اور اس کے اِردگرد کا حصہ ہر طرح کی آلائش سے پُر، ڈاکٹر کھڑے ہیں، نرسیں نگرانی کر رہی ہیں، مگر اس دوران میں کوئی چیز سوائے شراب کے حلق سے اُترتی ہی نہیں۔ اسے لوگ کہتے تھے ''برسٹ ہونا'' یعنی شراب نوشی کے خلاف سارے بندھن ٹوٹ جاتے تھے اور مستی و بے خودی کے اس سیلاب میں نصیر کی غیرت، حمیت، شرافت، انسانیت، محبت تک بہہ جاتی تھی اور وہ ایسی ایسی حرکتیں کر بیٹھتا تھا جن کا اس جیسے آدمی کے بارے میں وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

نہ نسرین اس کمزوری سے واقف تھی اور نہ نصیر کے سسر سیٹھ کریم کو اس کی خبر تھی۔ نصیر کے ہواخواہوں نے انھیں اس کی ہوا تک نہ لگنے دی تھی۔ سیٹھ پابند مذہب و حاجی ہی نہ تھے بلکہ نئے ڈھنگ کے بزنس مین ہونے پر بھی حد درجہ پرانے ڈھنگ کے آدمی۔ وہ بھلا ایسے شرابی کو اپنا داماد کیسے بناتے؟ خود نسرین کو شراب سے الرجی تھی۔ اسے اس کی بو سے قے آتی تھی۔ دُور سے دیکھ لینا ہی اس کے دردِ سر کے لیے کافی بہانہ ہوتا تھا۔ کسی مے خانے یا بار کے سامنے سے گزر جانا ہی اس کو مضمحل بنا دیتا تھا۔

ایسی نازک مزاج بیوی پر نصیر نے اچانک 'برسٹ' کی آفت ڈھائی۔ وہ ایک شب میں ایک دوست کے ہاں دعوت میں اکیلا ہی گیا۔ نسرین کی اِدھر پندرہ بیس دن سے کچھ طبیعت ماند تھی۔ لیمو چاٹنے، کھٹی چیزیں کھانے کا شوق بڑھ گیا تھا۔ اس رات میں گرانیٔ سر کی وجہ سے شوہر کے ساتھ نہ جا سکی تھی۔ نو ہی بجے سے بستر پر لیٹی نیند بلاتی رہی تھی۔ وہ بڑے ناز نخرے سے آئی۔ سر تین مہینے سے کسی کے بازو اور سینے کو تکیہ بنانے کا عادی ہو گیا تھا، وہ شادی کے بعد

اس شب پہلی دفعہ پہلو میں نہ تھا۔ غرض بڑی دقتوں سے گیارہ بجے کے قریب نیند کی دُلہن بڑی منتوں، سماجتوں کے بعد خراماں خراماں آئی اور اب وقت تھا بارہ کا کہ دفعتہً نسرین کو محسوس ہوا کہ پورا اسنڈ اس کسی نے منہ پر اُنڈیل دیا۔ وہ تڑپ کر جا گی۔ دیکھا تو نصیر شراب میں نہایا دو بوتلیں ہاتھ میں لیے اس پر پیار کرنے کو جھکا ہے، محسوس ہوا شوہر نہیں گندگی سے شرابور کوئی بنڈیلا ہے۔ وہ بھڑک کر نصیر کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی گرفت سے نکلی اور تھوکتی باتھ روم میں بھاگی۔ نصیر نے لڑکھڑاتے ہوئے پیچھا کیا۔ نسرین بیسن میں منہ کی تلخیاں اُگل رہی تھی کہ نصیر نے پیچھے سے آ کر اُسے دبوچنا چاہا۔

''اب کہاں شائے گی میری فری!'' نصیر نے نشے میں چوُر آواز سے کہا۔

نسرین باز کے چنگل میں پھنسی ہوئی کبوتری کی طرح پھڑکی اور اس نے میاں کو پوری قوت سے دھکیل دیا۔

نصیر لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور زمین پر گر پڑا۔

وہ بولا: ''اُشا، اَم سے لڑنا شاہتی ہے، تو فر یہ لے! یہ لے!'' اور اُس نے نسرین کی ٹانگ اس زور سے کھینچی کہ منہ کے بل حمام کے مرمریں فرش پر گرتے ہی اس نے چوٹ لگنے پر ہائے کی تھی کہ ''یہ لے'' کی ہر لئے کے ساتھ منہ پر طمانچے پر طمانچے پڑے۔ پہلے تو وہ تڑپ رہی تھی لیکن طمانچے نے اُسے بت کی طرح ساکت اور بے حرکت بنا دیا۔

نصیر شراب کے نشے میں سمجھا دشمن کو زیر کرلیا۔ دو ہاتھ اور جھاڑ کر گالی دے کر بولا: ''اَم سے لڑتی ہے.... نکل جا اس گھر سے! نکل! ابھی نکل!''

نسرین خاموشی سے اُٹھی اور اُس نے بیڈروم میں جا کر باہر نکلنے والے کپڑے پہن لیے۔ وہ اپنا پرس اُٹھا کر جا رہی تھی کہ نصیر منہ سے بوتل لگائے باتھ روم سے جھومتا نکلا۔ نسرین کی تیاری دیکھ کر دہاڑا۔

''اُشا جا رہی ہے، تو جا! ہمیشہ کے لیے جا! میں نے تجھے طلاق دی!''

اور جب وہ اس پر حسرت بھری نظر ڈال کر چلی گئی تو نصیر آدھی بوتل ایک سانس میں خالی کر کے بولا: ''شلی گئی، شالی شلی گئی!'' اور ہنستے ہنستے رونے لگا اور بوتل پر بوتل خالی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بے ہوش ہو گیا۔

نسرین نے پالم کے ایرَ ڈروم پر جب نصیر کو ٹیکسی سے اُترتے دیکھا تو وہ اسے مشکل سے پہچان سکی تھی۔ بیس برس کا جوان رعنا اب چوالیس برس کے ایک سوکھے سے بوڑھے میں تبدیل ہوگیا تھا۔ گورا رنگ جھلس گیا تھا، کنپٹیوں کے پاس کے بال سفید ہوگئے تھے اور وہ جس کا ہر قدم مضبوط پڑتا تھا اب ہلکا سا لنگڑانے لگا تھا۔ چہرے پر گہرے نشانات تھے، اور اس کی بڑی بڑی مست آنکھیں پھیکی اور بے آب تھیں۔

چوبیس برس کا زمانہ ایک عمر ہوتا ہے۔ کم سے کم نسرین کو تو وہ ایک جگ محسوس ہوا۔ وہ سترہویں میں تھی کہ اس کی شادی ہوئی تھی۔ صرف تین مہینے اُس نے خوشی، عیش اور محبت کے دیکھے، پھر چوبیس برس کا بے آب وگیاہ صحرا شروع ہوگیا اور دل کی پیاس بجھانے والی ایک بوند بھی نہ ملی۔ یہ پیاس کیسے بجھتی اس لیے کہ نسرین ان بیبیوں میں سے تھی جو زندگی بھر ایک ہی جام سے پی سکتی تھیں اور وہ پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا، ٹوٹ گیا تھا۔ اسے اب بھی نصیر سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اسی رات احمد آباد سے بمبئ چلی گئی تھی اور اس نے سیٹھ عبدالکریم کی کوٹھی میں پہنچتے ہی غصہ اور غم کے زیر اثر باپ سے ساری رُوداد سنادی تھی۔ انھوں نے دوسرے ہی دن ایک وکیل کے ذریعہ نصیر کو نسرین کے مہر کا نوٹس بھیج دیا تھا۔ نصیر نے بے عذر ڈیڑھ لاکھ کا دین مہر کا چیک بھیج دیا تھا اور ڈاکٹروں کی اجازت ملتے ہی وہ یورپ چلا گیا تھا اور جہاں تک نسرین کو علم تھا آج وہ پہلی بار وطن کی پاک زمین پر دِکھائی دے رہا تھا۔

نسرین کے دل میں جو غم وغصہ کا طوفان اس رات کے واقعہ سے اُٹھا تھا وہ کب کا ختم ہو چکا تھا، بس ایک آندھی تھی جس نے تھوڑی دیر رنجشوں کی گرد اُڑائی، پھر آنسوؤں کا چھینٹا پڑتے ہی غبار چھٹ گیا۔ دل کا مطلع صاف ہوگیا تھا۔ اس صفائی کا باعث مہر کی بے عذر ادائیگی ہی نہ تھی بلکہ اس میں سب سے بڑا ہاتھ دونوں کی محبت کے پھل منیر کی پیدائش کا تھا۔

نصیر کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی نشانی نسرین کے ہاں چھوڑ گیا تھا اور نہ سوائے چند لوگوں کے سیٹھ نے اس کی کسی کو کانوں کان خبر ہونے دی۔ طلاق کے چھٹے مہینے جب منیر پیدا ہوا تو نانا نے گویا اولادِ نرینہ پالی تھی۔ اسے آنکھوں کا تارا سمجھا۔ وہی اس کے باپ اور اس کی ماں بلکہ سارے خونی رشتوں کا ذخیرہ بن بیٹھے۔ کسی کو منیر کی پرورش وپرداخت کے سلسلے میں ایک پیسہ خرچ کرنے کی اجازت نہ دی۔ نسرین تک کو وہ اس معاملے میں رقیبانہ نظر سے دیکھتے تھے، وہ

اس کے روادار نہ تھے کہ نسرین اپنے پیسے سے منیر کے لیے کوئی قمیص، کوئی نیکر، دودھ کا ڈبّہ، کوئی کھلونا یا کسی طرح کی کوئی چیز خرید سکے۔ ایسے میں بھلا وہ اس کی کیسے اجازت دیتے کہ پاجی نصیر کو اس کی اطلاع مل جائے کہ سیٹھ جی کی کوٹھی میں اب بھی کوئی ایسی شے ہے جس پر اس شرابی کا بھی کوئی حق ہے جسے وہ شرعاً اور قانوناً اپنا سکتا ہے اور سیٹھ جی سے چھین لے جا سکتا ہے۔ انھوں نے نواسے کی جگہ اسے اپنا ہی بیٹا کہہ کر لوگوں سے اس کا تعارف کرایا اور نسرین کو بھی 'ممّی' اور 'امّی' کی جگہ منیر سے 'آپا' ہی کہلوایا۔

خود منیر کو بھی چودھویں سال تک اپنے حقیقی باپ کا نام نہیں معلوم تھا۔ اتفاقاً اسے اس سال جونیئر کیمبرج کے امتحان کا فارم بھرنا تھا۔ سیٹھ جی کو مجبوراً منیر کو اس کے باپ کا نام بتانا پڑا۔ مگر نصیر کا نام جس تمہید کے ساتھ اُنھوں نے منیر پر ظاہر کیا اُس نے منیر کے دل میں نصیر کی طرف سے ہمیشہ کے لیے نہ دُور ہونے والی نفرت بھر دی۔ سیٹھ جی نے بیٹی اور نواسے کو بڑے اہتمام سے کرسیوں پر بٹھایا، پھر منیر کو ایک گمنام شرابی کی کہانی سنائی جو اپنی بیوی پر طرح طرح کے ظلم کرتا تھا، اور جس نے آخر ایک رات کو بارہ بجے شراب کے نشے میں اسے خوب پیٹا اور طلاق دے کر گھر سے نکال دیا اور ایسی حالت میں اُسے گھر سے نکالا جب بیچاری کے بطن میں اُس پاجی کا تین مہینے کا بچہ بھی تھا۔ پوری کہانی اس ڈرامائی انداز میں کہی گئی اور شوہر کے کردار کی اتنی تاریک تصویر پیش کی گئی کہ چودہ سالہ منیر غصّے سے بوٹیاں نوچنے لگا۔

جب اس کی یہ حالت دیکھی تو سیٹھ نے عجیب طرح مسکرا کر کہا: ''یہ ہیں تمھارے باپ کے کرتوت، اس کا نام ہے نصیر!''

منیر چیخ پڑا: ''نہیں، نہیں! وہ میرا باپ نہیں! میں ایسے سؤر آدمی کو اپنا باپ نہیں مان سکتا۔'' اور وہ نانا کی گود میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

نسرین کے دل پر دو طرح کی چوٹیں لگیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے منہ پر اُس کے چہیتے میاں کی ذلّت کی گئی، نصیر اتنا تو بُرا ہرگز نہ تھا جتنا بھیانک بنا کر سیٹھ جی نے اُسے پیش کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ منیر بجائے اس کے کہ ماں کی گود میں سر ڈال کر سسکتا، نانا کے زانو سے لپٹا اور رو رہا تھا۔ اس کا بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ وہ منیر کو سیٹھ کی گود سے کھینچ کر دو طمانچے مارے کہ تیرا باپ اتنا گرا ہوا نہیں ہے کہ تو اسے 'سؤر' کہے اور پھر بیٹے کو چھاتی سے لگا کر اُس کے اور اپنے

آنسوؤں سے ساری دُنیا کو جل تھل بنا دیا۔ مگر اس نے چودہ سال میں وہ ہمّت کھو دی تھی جس سے وہ منیر کو اپنے باپ سے چھینتی یا شوہر کے متعلق اسے جھٹلاتی۔ عورت ہمیشہ مرد کی پشت پناہی کی طالب ہوتی ہے، یہ اس کی فطرت ہے۔ نسرین کی زندگی کے دو مردوں میں سے ایک نصیر تھا اور دوسرا سیٹھ۔ نصیر، جس کی محبت دل سے نکالے نہ نکلتی تھی، اس کی زندگی سے اس طرح غائب ہوا تھا جیسے جلتے توے سے ٹھنڈے پانی کی بوند۔ اب جو کچھ سہارا تھا وہ سیٹھ کا تھا۔ اس لیے وہ اس رسّی کو مضبوط پکڑے تھی۔ اگر یہ بھی ہاتھ سے چھوٹی تو نہ جانے وہ کس کھڈ میں جا کر گر پڑے۔ اس لیے وہ نصیر کی برائی خاموشی سے سنتی رہی اور بیٹے کے دل میں باپ کی طرف سے حقارت ونفرت کے بیج کو سرسبز ہوتے، پودے سے درخت بنتے اور اس میں شاخیں اور پھول نکلتے دیکھتی رہی۔ بے بس عورت! شوہر سزا دے چکا تھا، اب اپنا ہی باپ، اپنا ہی بیٹا، اس کے 'چست' وکیل بن کر اسے سزا دے رہے تھے۔

سیٹھ کے انتقال کے بعد جب اکیسویں سال منیر نے نانا کے کارخانے اور اس کی دولت پر مالکانہ تصرف شروع کیا تو نسرین کو زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ وہ دل میں اسی پر کڑھتی رہی کہ منیر اس سے بھی زیادہ جائداد اور دولت کا صحیح طور پر حقدار ہونے کے باوجود اس کا دعویدار بننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ اپنے وجود میں باپ کی شرکت نہ چاہتا تھا۔ گویا وہ بن باپ ہی کے پیدا ہو گیا تھا۔ نسرین نے دو ایک بار بیٹے کے دل سے باپ کی نفرت نکالنے کی کوشش کی، لیکن اس پر تو نصیر کے تذکرے ہی سے جیسے بھوت سا سوار ہو جاتا تھا۔ اب کے البتہ جب وہ بیمار ہوئی اور اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا تو اُس نے بیٹے کا دل باپ کی طرف سے نرم کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کی تھی۔ اسے بے کم وکاست سچّے سچّے واقعات سنا دیئے تھے، اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ اسی شرابی کی یاد تھی جس نے سیٹھ کے اصرار کے باوجود اسے دوسرے نکاح پر آمادہ نہ ہونے دیا۔ ماں کی زبان سے چند مہینوں کی خوشی وغم سے لبریز زندگی کا حال سن کر منیر کے ہاں تھوڑی دیر کے لیے ایک غیر شعوری نرمی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب چودہ برس کے لڑکے کی جگہ تیئیس برس کا تعلیم یافتہ نوجوان تھا، وہ انسانی کمزوریوں سے واقف ہو گیا تھا اور اس میں ایک طرح کی رواداری سی آ گئی تھی۔ پھر بھی باپ سے نفرت نانا نے اس کے خمیر میں ڈال دی تھی۔ اسے اس نفرت سے محبت تھی۔ پہلی ہی کوشش میں اس نفرت کا دل سے نکل جانا آسان نہ تھا اس

لیے گو ماں کی خاطر باہری سطح ٹھنڈی پڑ گئی تھی مگر ہانڈی کے اندر وہی کھولن باقی رہی جو سیٹھ جی کے زمانے میں تھی۔

نسرین بمبئ سے صحت یاب ہو کر اپنے مخصوص ماہرِ قلبی علاج کو دِکھانے دِلّی آئی تھی۔ آج وہ اس کے سینی ٹوریم سے بالکل ہی تندرست ہو کر نکلی تھی اور ہوائی جہاز سے بمبئ واپس جارہی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ایسے موقع پر اگر نصیر آجاتا تو باپ بیٹے میں بہ آسانی وہ صلح کرادیتی اور شاید اس کی اُجاڑ زندگی پھر سے آباد ہو جاتی۔ اُس نے نئی تعلیم یافتہ ہونے پر بھی سیٹھ جی کی خاطر یہ برقعہ نہ چھوڑا تھا اس لیے گو اُس نے نصیر کو پہچان لیا، لیکن وہ اُسے پہچان نہ سکا۔ نقاب نے اس چہرے پر پردہ ڈال رکھا تھا جس کی تصویر دل کے پردوں پر کھنچی ہوئی تھی۔ نصیر نے اسباب توقلی کے حوالے کیا اور خود اپنی نشست کے لیے جگہ ڈھونڈنے لگا۔ سبھی صوفے اور کرسیاں بھری تھیں، صرف برقعہ پوش نسرین کی بغل میں ایک کرسی خالی دِکھائی دی۔ وہ اس پر ایک تھکے ہوئے مسافر جیسی لمبی سانس لے کر بیٹھ گیا۔

وہ آج ہی صبح کلکتہ سے دلّی آیا تھا۔ دن بھر اُس نے نئے بھارت کی نئی راجدھانی کے دیکھنے میں اپنا وقت صرف کیا تھا۔ چوبیس برس پہلے کی دلّی پہچانی نہ جاتی تھی۔ وطن کے یوسف 'جواہر لعل نہرو' نے اس زلیخا کو پھر سے جوانی بخش دی تھی۔ بڑھاپے کے جو آثار کہیں کہیں باقی رہ گئے تھے وہ اس کے نکھار کو بڑھاتے تھے۔ انھیں میں وہ قطب مینار بھی تھا جسے اُس نے آخری بار نسرین کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس سیر سے ایک خاص یاد وابستہ تھی جو نسرین کی کمزوری کی صورت میں ظاہر ہو کر اس کے لیے بہت ہی شیرین بن گئی تھی۔ وہ نصیر کے ساتھ ہنستی بولتی قطب مینار کے سب سے اُونچے حصّے تک چڑھ گئی تھی، لیکن جیسے ہی اُس نے وہاں سے جھانک کر نیچے دیکھا تھا وہ کانپنے لگی تھی۔ خوف نے اس میں اس بلا کی کمزوری پیدا کر دی تھی کہ وہ تقریباً سات بار مختلف جگہوں پر رُکتی ہوئی نصیر کے سہارے سے نیچے اُتری تھی۔ نصیر نے اس وقت بار بار یہی سوچا تھا کہ قطب مینار کو باقاعدہ تفریح و سیر گاہ بنانے کے لیے اس میں اسی طرح کی لفٹ کیوں نہ لگادی جائے اور اسی طرح ریستوراں کیوں نہ کھول دیا جائے جیسا کہ پیرس کی آئفل مینار میں ہے۔ اگر سرکار اس خرچ کے لیے تیار نہ ہو تو ایک پرائیویٹ کمپنی کے ذریعے یہ ضروری کام کیوں نہ انجام دے دیا جائے، لیکن پونا پہنچتے ہی اس کے 'برسٹ' ہونے نے زندگی ہی تہ و

بالا کر دی تھی۔

وہ انھیں خیالات میں ڈوبا برقعہ پوش نسرین کی بغل میں آ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اسے اس مخصوص سینٹ کی خوشبو محسوس ہوئی جو نسرین کا دل پسند تھا۔ اُس نے گھبرا کر نسرین کی طرف دیکھا۔ برقعہ میں لپٹی ایک سکڑی سکڑائی خاتون نظر آئی۔ وہ اپنے خیالات و جذبات سے پریشان ہو کر کرسی سے اُٹھ کر لانچ کو میدان سے جدا کرنے والی ریلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور مختلف طرح کی یادوں میں کھو گیا۔

نسرین کے دل میں پنکھے لگے تھے۔ جب نصیر بغل میں آ کر بیٹھا تھا تو وہ کانپنے لگی تھی۔ اب جبکہ نصیر اُٹھ کر ریلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر نصیر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اس سے گفتگو کا بہانہ ڈھونڈنے لگی۔ نصیر جو ستاروں سے آنکھیں لڑائے اُن کی متحرک چمک میں نسرین کی آنکھوں کے ڈبڈبائے آنسو دیکھ رہا تھا، پھر اسی محبوب خوشبو سے چونکا۔ اُس نے پلٹ کر برقعہ پوش کو دیکھا۔ نسرین نے کانپتے ہاتھوں سے نقاب اُلٹ دی۔ وہی پیارا چہرہ، مگر چوبیس سال کا غمزدہ، وہی غزالی آنکھیں مگر مستی کی جگہ درد بھرے دو کٹورے، وہی برگِ گل ہونٹ مگر اب خزاں دیدہ مرجھائی ہوئی پنکھڑیاں۔

نصیر کے جسم میں زلزلہ سا آ گیا۔ بوٹی بوٹی کانپی، مشکل سے منہ سے آواز نکلی "نسرین!"

اُس نے گھٹی آواز میں جواب دیا: "ہاں، وہی تمھاری لونڈی!"

نصیر بہ مشکل اپنے کو قابو میں رکھ سکا۔ اُس نے ریلنگ دونوں ہاتھوں سے زور سے پکڑ لی اور میدان کی طرف رُخ کر کے کہا: "بس یہی ایک آرزو تھی کہ تم سے ایک بار معافی مانگنے کا موقع مل جائے۔ اسی اُمید میں آج بمبئی جا رہا تھا، اِسی کا اقرار کرنے چوبیس برس بعد وطن آیا ہوں کہ میں نے تمھیں دھوکا دیا، اپنی شراب نوشی چھپائی اور نشے کی حالت میں تم پر بڑے بڑے ظلم کیے۔ مَیں نے اپنے جرموں کی پاداش میں اپنے کو خود کافی سزا دی ہے۔ ہندوستان سے جاتے ہی چھ مہینے آسٹریا کے ایک کلنک میں پڑا رہا۔ شراب کی لت پر فتح پا کر ہی وہاں سے نکلا۔ اس رات کے بعد سے آج تک ایک بوند حلق سے نہیں اُتاری۔ کتنا دُکھ ہوتا ہے اُن نشوں کے چھوڑنے میں اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ لیکن میں نے ان تکلیفوں کو اپنے جرم کی سزا سمجھ کر مردانہ وار برداشت کیا۔ پھر بھی زندگی بے کار سی معلوم ہوئی۔ میں فوج میں بھرتی ہو گیا۔ نہ

جانے کتنی بار گولیوں کی بوچھار سے گزرا۔ سوائے ٹانگ ٹوٹنے کے حسبِ خواہش سزا نہ ملی۔ سچ ہے موت کا وقت معین ہے!''

نسرین نے اس کے ہاتھ کو اپنے نازک ہاتھ سے تھپک تھپک کر کہا: ''شراب ترک کرنے کے بعد کاش تم نے مجھے اطلاع دے دی ہوتی! پھر ہماری زندگیاں اس طرح اُجاڑ نہ گزرتیں۔''

نصیر نے تعجب سے پوچھا: ''کیا تمھیں مجھ سے نفرت نہیں؟''

اُس نے نظریں نیچی کر کے کہا: محبت میں نفرت کی گنجائش نہیں!''

نصیر نے اسے اور بھی گھبرا کر دیکھا: ''ارے کیا سیٹھ جی نے تمھاری دوسری شادی نہیں کر دی؟''

نسرین نے غرور سے سر اُونچا کر کے کہا: ''انھوں نے شروع میں تو زور دیا، مگر جب ہمارا منیر پیدا ہو گیا تو پھر ہم دونوں اسی کی خدمت و پرورش میں لگ گئے۔''

اُس نے کانپتے ہونٹوں سے پوچھا: ''یہ منیر کون؟''

وہ آہستہ سے بولی: ''تمھارا بیٹا! وہ تین مہینے کا پیٹ میں تھا جب میں گھر سے نکالی گئی۔''

نصیر نے ''اُف اُف!'' کہہ کر اپنے ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ ''ارے میرا بیٹا تمھاری امانت میں اور مجھے کچھ خبر نہیں۔ مجھ سے یہ بات چھپا کر سیٹھ جی نے مجھ کو سب سے بڑی سزا دی۔''

نسرین نے کہا: ''انھیں یقین تھا تم اسے ان سے چھین لے جاؤ گے اور اپنا ہی جیسا بنا دو گے۔''

وہ بولا: ''غلط نہ تھا ان کا یہ اندیشہ! مگر یہی بچہ شاید میری زندگی یوں برباد ہونے سے بچا لیتا۔ وارث کے نہ ہونے سے ہر مرد حد درجہ بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ نہ کسی پر اس کی ذمہ داری اور نہ اس پر کسی کی ذمہ داری۔ مجھے ہر وقت محسوس ہوتا رہا کہ میں ایک بے سود سی زندگی بسر کر رہا ہوں.... مگر اپنا بیٹا، اپنا وارث....!'' اور وہ بڑی بے چینی سے پوچھنے لگا: ''اب تو وہ جوان ہو گیا ہوگا؟ شکل صورت کیسی ہے؟''

وہ مسکرا کر بولی: ''ہو بہو باپ کی جوانی کی تصویر!''

وہ آب دیدہ ہو کر بولا: ''خدا نہ کرے کہ باپ جیسی سیرت بھی ہو!''

وہ فخر سے سر اُٹھا کر بولی: ''کون کہتا ہے اس کے باپ کی سیرت کو برا؟''

اتنے میں ہوائی جہاز کے چھوٹنے کا اعلان ہوا۔ اندر جانے کے لیے پھاٹک کھول دیا گیا۔ دونوں جہاز میں دو پاس پاس کی سیٹوں پر بیٹھے۔ گلے شکوے بھی ہوئے اور میٹھی میٹھی پیار کی باتیں بھی۔ کئی گھنٹے کا راستہ آنکھ جھپکاتے میں کٹ گیا۔ آپس میں طے ہو گیا کہ وہ ہفتہ عشرہ بمبئی میں ضرور ٹھہرے گا اور بیٹے کو اپنے سے مانوس کرنے کی آہستہ آہستہ کوشش کرے گا۔ پھر نسرین کسی مناسب موقع پر باپ بیٹے میں میل کرا دے گی۔

سانتا کروز میں وہ اُترے تو منیر ماں کو لینے نہ آیا تھا۔ گاڑی لیے غفور ڈرائیور موجود تھا۔ وہ سیٹھ جی کا پرانا ملازم تھا اور نصیر کو بھی پہچانتا تھا۔ اُس نے جو 'دولہا میاں' کو 'بٹیا' کے ساتھ دیکھا تو باغ باغ ہو گیا۔ نسرین نے اُس سے پوچھا: ''منیر کیوں نہیں آیا؟''

وہ کچھ سٹپٹا کر بولا: ''کسی دعوت میں گئے ہیں۔ مجھے حکم دیا کہ میں جا کر آپ کو لے آؤں۔'' اُس نے نسرین کا اسباب ڈکی میں رکھوایا پھر نسرین کے خاموش اشارے پر نصیر کا اسباب بھی وہیں رکھوا دیا۔ نصیر نے ہوٹل میں قیام کا نام لیا اور موٹر میں سوار ہونے سے عذر کرنا چاہا تو نسرین بولی: ''کوٹھی میرے ہی نام ہے۔ اب وہ میرا گھر ہے یا تمھارے بیٹے کا۔ ہمارے گھر میں ٹھہرنے میں عذر کا کون سا پہلو ہے!'' اسے خاموش ہو کر نسرین کے ساتھ بیٹھ جانا ہی پڑا۔ اس کا دل خود بھی تو یہی چاہتا تھا۔

موٹر اسی جانی پہچانی سہ منزلہ عمارت کے سامنے پورٹیکو میں رُکی جہاں آتے جاتے، سیٹھ جی کی موجودگی میں بھی، اسے ہمیشہ مسرّت ہوتی تھی۔ نئی نئی قلعی اور مرمّت ہوئی تھی اور اس کے پرانے پن میں ایک خاص طرح کا حسن تھا۔ نسرین اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ دروازے کے بالکل مقابل ہی سیٹھ جی کی قد آدم تصویر لگی تھی۔ نصیر کو محسوس ہوا جیسے سیٹھ جی کھڑے اسے بڑی نفرت اور حقارت سے دیکھ رہے ہیں۔ جیسے تصویر کے بے جان لب ہل رہے ہیں اور ان سے آواز آ رہی ہے: ''بے شرم، بے غیرت، شرابی! تو پھر اس گھر میں اسے برباد کرنے آیا!'' اور نصیر دروازے ہی پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

نسرین اپنے غیرت دار شوہر کی رگ رگ سے واقف تھی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچتی ہوئی بولی: ''اندر آؤ! اب ڈیڈی ہمارے درمیان نہیں آ سکتے!''

نصیر پشت کی جانب جو کھڑکی تھی وہاں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُدھر ایک چھوٹا سا چمن تھا، اس

میں چھٹکی چاندنی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس چمن کی بہاریں اس نے کئی بار نسرین کے ساتھ لوٹی تھیں اور ان کی آپس کی چھیڑ چھاڑ پر وہاں کے اکثر پھول مسکرائے اور ہنسے تھے۔ شیریں یادوں کا یہ سلسلہ غفور کے دروازہ کھولنے اور اندر جھانکنے نے توڑ دیا۔ اُس نے پوچھا ''بٹیا، دولہا میاں کا سوٹ کیس کس کمرے میں رکھ دوں؟''

نسرین نے کچھ شرما کر، کچھ سٹپٹا کر کہا: ''مہمان والے کمرے میں!''

جب غفور دروازہ بھیڑ کر چلا گیا تو وہ نصیر سے اپنی صفائی میں بولی: ''میں چاہتی ہوں کہ منیر تم سے آہستہ آہستہ ہل مل جائے تو اسے تمھارا نام بتاؤں۔''

نصیر نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا: ''ہاں، نہ جانے کتنا بِس سیٹھ جی نے اس کے دل میں میری طرف سے بھر دیا ہوگا.... مگر اپنے لیے کوئی نیا نام بھی سوچ لینا پڑے گا!'' وہ بڑی تلخی سے مسکرایا۔

اتنے میں ایک موٹر زور زور سے ہارن دیتی پورٹیکو کی طرف بڑھتی سنائی دی۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے دو موٹروں میں ہلکی سی ٹکر ہوئی اور شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی اور غفور کی ہلکی سی چیخ۔

نسرین ''ارے کیا ہوا؟'' کہتی کمرے کے باہر لپکی۔ نصیر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ منیر ٹکّر مارنے والی موٹر سے دہاڑتا ہوا نکلا۔ ''یو ڈیم فول! اَم ہارن پر ہارن بجاتا ہے۔ تم بہرا راستہ کیوں نہیں دیتا؟''

غفور جو دونوں موٹروں کے درمیان کچھ دبا سا کھڑا تھا بولا: ''بھیّا میں ڈکی سے بٹیا اور دولہا میاں کے اسباب اُتار رہا تھا، میں موٹر کیسے ہٹاتا؟''

منیر بولا: ''بٹیا، بٹیا، بٹیا، او، اَم سمجھا، آپا۔''

نسرین نے قریب آ کر پوچھا: ''ارے کیا ہوا غفور؟''

منیر اس کی طرف لڑکھڑاتا ہوا بڑھا: ''تم آ گیا آپا! اَمارا پیارا آپا!''

لیکن جیسے ہی وہ نسرین کے قریب آیا، وہ غصّے سے بھڑک کر بولی: ''ارے تو نے شراب پی ہے! تھو! بے غیرت! بے شرم! تھو! تھو.....''

وہ ہنس کر بولا: ''بہت نہیں پی آپا! بس تمھاری صحت کے.... تین جام! ڈیئر آپا! ڈارلنگ

آپا!''

نسرین منہ پر رومال رکھ کر اُبکائی لیتی ہوئی بولی: ''ارے باپ کی وراثت مل گئی تجھ کو! ہائے اللہ! باپ کا خون رنگ لا کر ہی رہتا ہے۔''

اور وہ ''اُواُو، تھوتھو' کرتی قریب ترین باتھ روم کی طرف بھاگی۔

شراب کے نشے نے منیر کے سچّے جذبات زبان سے کہلوا دیے۔ وہ ماں کے پیچھے لپکتا ہوا بولا: ''میرے شوٗر باپ کا نام تم نے کیوں لیا آپا! اُش کی وراشت! اُس شوٗر کا خون، نہیں! ہرگز نہیں! آژ تو ہر مہذّب.... نوژوان... تھوڑی بہت پیتا ہے! یہ تہذیب کا ورشہ!''

اور دفعتہً اُس نے باتھ روم کے قریب رکھے ہوئے گملوں میں سے ایک سے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل آ رہا۔

غفور اپنی چوٹ بھول کر اُسے اُٹھانے دوڑا، مگر نسرین نے باتھ روم کا دروازہ دھڑا کے سے بند کر لیا اور نصیر رومال سے چہرہ پونچھتا ہوا سب کی نظریں بچا کر تیزی سے کوٹھی کے باہر نکل گیا۔

(ماہنامہ آج کل، دہلی، افسانہ نمبر، اگست ۱۹۶۴ء)

ویران آبادیاں

'ہوم' کے ایک برآمدے میں ایک آرام کرسی پر نصف دھڑ سے دراز سلمیٰ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

'ہوم' میرا اپنا ہی گھر تھا، جو کشمیر کی دُکھیاروں کا 'گھر' بن گیا تھا۔ اُن کے قتل اور عذرا کی گمشدگی کے بعد میں اگر تن تنہا اتنے بڑے لق و دق مکان میں رہتی تو یقینی پاگل ہو جاتی۔ اس لیے میں نے سرکاری ایما سے اپنے گھر کو اغوا شدہ عورتوں کا 'گھر' بنا دیا تھا۔ چاہتی تھی ہر نگوڑی نگھری اُسے اپنا گھر ہی سمجھے۔ اس لیے یہاں کسی کا رونا، بلبلانا، بلکنا، ٹسوے بہانا، کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ یہ 'گھر' تو ایسے آتشیں آنسوؤں کے بہانے کی جگہ ہی تھی۔ یہ عورتیں وہ تھیں جو قتل و غارت کے خونی دریاؤں میں ڈوب کر فنا ہو جانے سے بچالی گئی تھیں۔ انھیں تو زبردستی نگلے ہوئے پانی کو اُگلنا ہی تھا، لمبی لمبی، سینوں میں اٹکتی سانسیں لے کر تھکے پھیپھڑوں کو سکون دینا ہی تھا۔ ہر تباہ شدہ زندگی اس 'گھر' میں آ کر سسکتی بلکتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ خود زندگی ہی اسے زندہ رہنا سکھا دیتی تھی۔

مگر یہ لڑکی سلمیٰ جس دن سے اس گھر میں لائی گئی تھی، بس ایک بت تھی، سنگ مرمر کا بت، اس کے سفید بکھرے بال، اس کی پُر شکن پیشانی، اس کی چڑھی ہوئی بھویں، اس کی سرخ سرخ آنکھیں، اس کے پتلے پتلے سوکھے عنابی ہونٹ، اس کی مضبوط ٹھوڑی، اس کے جبڑے پر ایک لمبا داغ اور اس کی گردن کی تنی ہوئی رگیں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ جیسے غموں اور مصیبتوں کے پہاڑوں کے بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے وہ خود بھی پتھر کی بن گئی ہے۔ جیسے کسی نے اس کے سارے جسم کو گیلی تانت سے کس کر باندھا اور دھوپ میں سکھایا ہے۔ اس میں نہ نرمی تھی نہ نزاکت، نہ لچک تھی نہ لوچ۔ وہ ایک ایسا نشتر تھی جو زنگ آلود ہونے کی وجہ سے اپنی تیزی تو کھو چکا تھا مگر

اس کی سختی میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ توڑی جا سکتی تھی، جھکائی نہیں جا سکتی تھی۔

پہلے دن ہوش میں آنے کے بعد، اس لیے کہ وہ بیہوشی ہی کے عالم میں 'گھر' میں لائی گئی تھی۔ بس اُس نے اتنا بتایا تھا کہ اس کا نام سلمیٰ ہے۔ کس شہر یا قصبہ میں گھر تھا، کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی، تعلیم یافتہ ہے یا جاہل، جاہل ہے یا مظلوم، قاتل ہے یا مقتول، خونی ہے یا شہید، یہ سب اُس نے کچھ نہ بتایا۔ ہمارا اصول بھی زیادہ چھان بین کی اجازت نہ دیتا تھا، ہمارا کام تھا کہ ہم تھکے ہاروں کو ستانے، آرام لینے کا موقع دیں، مسافر کو منزل تک پہنچنے میں سہارا دیں، نہ کہ تفتیش، جانچ پڑتال کریں۔ 'ہوم' پولیس کا تھانہ نہ تھا، وہ بپتا کی ماریوں کا رُوحانی اسپتال تھا، یہاں سراغ نہیں لگایا جاتا تھا، یہاں علاج کیا جاتا تھا، اس لیے زخموں پر ٹھنڈے پھائے رکھے جاتے تھے، کھوئی ہوئی انسانیت واپس لانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

اسی لیے ہم نے سلمیٰ کو اسی کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ خود سے نہ کسی کام کے کرنے کی خواہش کرتی اور نہ وہ کسی تفویض کیے ہوئے فرض کے انجام دینے میں کوئی غور کرتی۔ سینے پرونے، بُننے کاتنے کا جو کام اسے دے دیا گیا اُس نے خاموشی سے انجام دے دیا اور دوسروں سے اچھی طرح کرا دیا۔ تیچی، بخیہ، کروشیا، زردوزی، کسی کام میں وہ بند نہ تھی۔ جتنے پیسے اس پر اُٹھتے تھے اس سے کہیں زیادہ کام کر دیا کرتی تھی۔ اس لیے ہمیں اس سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اگر وہ خاموش رہنا چاہتی ہے تو اس میں ہمارا کیا نقصان؟ اس کی گفتگو ''بہت اچھا، جی ہاں، جی نہیں، حاضر ہوئی'' وغیرہ وغیرہ چند فقروں اور حکموں تک محدود تھی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ سب سے الگ ہے۔ اس کا دل دُنیا کے انسانوں سے بھر گیا ہے۔ وہ اس عالم کے حالات میں بس اسی حد تک دلچسپی لینا چاہتی ہے جتنی کہ زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔ اس پر نہ کسی خوشی کا اثر ہوتا ہے نہ کسی غم کا۔ نہ اسے کسی کے غصہ کا ڈر ہے، نہ کسی کی خفگی کا، نہ کسی کی سرپرستی کی ضرورت ہے، نہ کسی کی ہمدردی کی۔ وہ معمولی انسانوں سے بالاتر، اس کی کمزوریوں سے منزّہ خاص شخصیت کی مالک تھی۔

اس لیے مجھے تعجب ہوا۔ سلمیٰ اور یوں روئے، اور بات بھی ایسی ہو جس پر دوسری لڑکیاں مسکرا رہی ہوں، قہقہے لگا رہی ہوں۔

کچھ لڑکیاں 'ہوم' کے صحن میں کھڑی تھیں، کچھ برآمدوں اور کمروں سے جھانک رہی تھیں۔ سب کی نظر چھت کے ایک حصّے کی طرف تھی اور سب کے چہرے ہنسی کی دھوپ سے

چمک رہے تھے۔ بس ایک سلمیٰ تھی کہ اس کے ہاں خاموش آنسوؤں کی جھڑی ہی نہ جاری تھی بلکہ وہ اس طرح سسک رہی تھی کہ ہر جھٹکے پر اس کا بند بند ٹوٹتا محسوس ہوتا، ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی رہ رہ کے اس کی رگوں میں سوئیاں چبھو رہا ہے۔

منظر بھی ایسا تھا جس پر عام طور پر لوگ مسکرا ہی دیتے ہیں۔ چھت پر منڈیر سے لگی ایک خارشی سی بندریا بیٹھی تھی۔ نہ جانے دوسرے بندروں نے اسے اپنی ٹولی سے نکال دیا تھا یا وہ خود سب سے لڑ جھگڑ کر، رُوٹھ کر اِدھر چلی آئی تھی۔ وہ بہر حال اکیلی تھی، اور بار بار جسم کے مختلف حصوں کو کھجا کر کچھ سوچنے لگتی تھی۔ لیکن اسے بہت سے کوّوں نے گھیر رکھا تھا۔ وہ ایک حلقہ بنائے ہوئے کائیں کائیں کر کے اس کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ بعض وقت ان میں سے ایک دو تین آوازیں لگانے کے بعد دفعتہً اپنی جگہ سے پرواز کرتا اور بندریا کو پنجوں یا چونچ سے مارنے کی کوشش کرتا، کوئی اس کی پیٹھ پر اپنے پروں سے ایک دھول رسید کر کے نکل جاتا، کوئی چھپتا ہوا پشت سے آتا اور بندریا کے سر پر ایک چپت رسید کرتا نکل جاتا۔ غرض پورے منظر سے یہی محسوس ہوتا کہ بندریا کو اکیلا پا کر کوّے اسے بیوقوف بنا رہے ہیں۔

انسانی زندگی میں ایسے منظر اکثر اسکولوں میں نظر آجاتے ہیں، جہاں لڑکوں کو کوئی سچ مچ کا گدھا مل گیا، بس ان کی شرارتیں دیدنی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس طرح کے واقعات میں آپ کو کتنی ہی ہنسی آئے لیکن غریب گدھے سے آپ کو ہمدردی ہو جاتی ہے مگر بندروں کے معاملے میں یہ ہمدردی نہیں پیدا ہوتی۔ اگر اُن کا جغادری کسی مخمصے میں پھنس جائے، یا کسی موقع پر کوئی جانور ان سے بھی زیادہ شریر نکلے اور ان پاجیوں کی گت بنا دے تو ہمیں ہنسی آتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ نقّال کو کوئی نہیں پسند کرتا اور یہ ٹھہرے انسان کے سب سے بڑے نقّال۔

وجہ کچھ بھی ہو، اس وقت 'ہوم' میں سلمیٰ کے سوا سب ہی اس بندریا پر ہنس رہی تھیں۔ سب ہی بندریا کو ستانے میں گویا کوّوں کی شریک تھیں۔ میں خود بھی ان سب کو ہنستی دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ یہ وہ ہنس رہی تھیں جن کی زندگیوں سے ہنسی خوشی بچپن کی شرارتوں اور جوانی کی حرارتوں کی طرح کافور ہو چکی تھی۔ ان کے پژمردہ، روکھے سوکھے چہروں پر مسکراہٹیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے برف، بادل اور کہرے سے ڈھکی ہوئی وادی میں سورج کی پہلی کرن دوڑ جائے۔ آفتاب کی کرنوں ہی کی طرح یہ مسکراہٹیں بھی ذخیرہ کرنے والی چیز تھیں۔ ان پر نظر

ڈالنے سے استقلال بڑھتا تھا، تحمل بڑھتا تھا، مامتا بڑھتی تھی، انسانیت بڑھتی تھی، اور اسی لیے مسکراہٹوں کی اس فضا میں سلمیٰ کے آنسو کسی طرح اچھے نہ لگتے تھے۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے بیاہ برات کے موقع پر عروس کی کوئی سہیلی ماتمی لباس پہن کر پہلو میں آ کر بیٹھ جائے۔ میں دلہنوں کی ماں کی طرح سلمیٰ کی اس اشک فشانی پر ایک بار دل میں ضرور کڑھی، لیکن اس کے نڈھال جسم اور اس کے اینٹھتے ہاتھوں نے فوراً مجھ میں مامتا کے اس جذبے کو اُبھار دیا جو مجھ میں سلمیٰ کو دیکھتے ہی پیدا ہو جاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ سلمیٰ میری عذرا سے بہت مشابہ تھی۔ ہائے کیسی منحوس شام تھی وہ بھی، باپ بیٹی دونوں گھر سے قریب والی پہاڑیوں پر چہل قدمی کے لیے نکلے تھے، اور میں ابھاگن ان کے ساتھ نہ جا سکی تھی۔ کیا معلوم تھا کہ آج وہ سیر کرنے نہیں جا رہے ہیں بلکہ موت سے ملنے جا رہے ہیں۔ جب نو بجے شب تک دونوں نہ پلٹے تھے تو میں دو ملازموں کو ساتھ لے کر ڈھونڈنے نکلی تھی۔ وہ تو ملے، مگر خون میں نہائی ہوئی بے جان لاش کی صورت میں، مگر عذرا زمین میں سما گئی کہ آسمان پر اُڑ گئی، آج تک پتہ نہ چلا۔ 'ہوم' میں میرا انہماک خدا ترسی کا ضرور نتیجہ تھا، مگر سچ کہوں تو دل میں چھپی ہوئی یہ خواہش بھی ضرور تھی اور ہے، شاید میری چڑیا بھی پھڑ پھڑاتی اِدھر آ نکلے۔ کبھی کوستی تھی خدا کرے وہ مر گئی ہو، کبھی دُعا مانگتی تھی وہ جیسی بھی ہو مجھے پھر سے مل جائے۔ میں ایک بار اپنے چودھویں کے چاند کو چھاتی سے لگا لوں بس ایک بار اور اس کے منہ سے اپنے لیے 'امی' کا لفظ سن لوں۔ عقل کہتی، وہ بڑی نازک مزاج تھی، کسی کی آدھی بات تو اسے برداشت نہ تھی، وہ سردیوں کے بھیانک چہرے دیکھتے ہی پھڑک کر مر گئی ہو گی، مگر مامتا ڈھارس بندھاتی رہتی، جب اتنی ساری دُکھیاریاں ٹھوکریں کھاتی میرے قائم کیے ہوئے 'گھر' میں چلی آئیں تو وہ جس کا یہ سچ مچ گھر ہے، وہ کیوں نہ آئے گی۔ اور سلمیٰ کے آنے نے تو اس اُمید کو اور بڑھا دیا تھا۔ بالکل ایسی ہی تھی عذرا۔ بس اتنا ہی تو فرق ہے کہ اُس کے بال کالے تھے، اس کے مجھ سے بھی زیادہ سفید۔ اس کے گال بے داغ تھے اور اس کے چہرے پر چھرے کا داغ ہے جو کنپٹی سے ہونٹ تک پھیلا ہوا ہے۔

اس لیے سلمیٰ کو روتے دیکھ کر مامتا نے مجھے پاس والی کرسی پر بیٹھ جانے پر مجبور کیا۔ میں نے جھک کر اس کا سر سینہ سے لگا لیا اور پوچھا ''کیا ہوا بی بی؟ کون سی بات کہ آج میری سلمیٰ رو رو کر اپنے کو بے جان کر رہی ہے؟''

وہ اٹک اٹک کر بولی ''جی...... جی، وہ...... بندریا!''

میں نے کہا ''اے لو، سب تو اسی پر ہنس رہی ہیں۔''

وہ بولی ''ہاں، مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں درختوں کے نیچے کھڑی اپنے ابّا جان کے ساتھ بندروں کو لڑتے دیکھ رہی ہوں۔'' اور وہ دفعتہً دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر چیخنے لگی ''ارے بچاؤ! بچاؤ! ارے یہ ڈاکو ابّا کو مارے ڈالتے ہیں...... ہائے! اُف!'' اور وہ کرسی سے بیہوش ہو کر برآمدے کے فرش پر گر پڑی۔

ساری لڑکیاں رو پڑیں، مگر مَیں خود بھی اپنے آپے میں نہ تھی۔ سلمیٰ جس طرح چیخی تھی وہ آواز عذرا کی تھی۔ میں نے جلدی جلدی سلمیٰ کے کپڑے نوچنا شروع کیے۔ میری عذرا کے داہنے بازو کے نیچے بچپن میں 'اے، زیڈ' اُس کے باپ نے گدوا دیا تھا۔ ان کا نام عظیم تھا۔ وہ ہنس کر کہا کرتے تھے، میں نے یہ حروف گدوا کر مہر لگا دی ہے کہ یہ عذرا ہی نہیں، عظیم کی جان ہے۔ میں نے اسی لیے اس کا داہنا ہاتھ اُٹھا کر اس کی بغل کے پاس کے ٹانکے توڑ دیئے۔ مَیں نے دیکھا...... مَیں نے دیکھا، وہی اے، زیڈ اس کے گورے گورے بازو میں گدا تھا۔ ایک بار تو میرا سر چکرایا، ایسا معلوم ہوا جیسے سارا گھر، سارے چہرے، گھوم رہا ہے، دھندلا ہوتا جارہا ہے، مٹتا جارہا ہے اور میں ایک اتھاہ اندھیارے میں ڈوبتی چلی جارہی ہوں۔ پھر مجھے ہوش نہیں کہ کیا ہوا۔ مجھے بھی غش آ گیا۔

جب میں نے تھوڑی دیر بعد آنکھ کھولی تو دیکھا ڈاکٹرنی میرے بازو میں انجکشن دے کر اسپرٹ میں تر روئی سے ہاتھ پونچھ رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ بغل والے پلنگ پر اب بھی سلمیٰ بے سدھ پڑی تھی۔ میں چیخ پڑی ''ڈاکٹر، ڈاکٹر! میری بچی!''

وہ بولی ''گھبرایئے نہیں، وہ بیہوش ہے، مَیں نے اسے ابھی انجکشن لگا دیا ہے، اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ وہ اب ہوش میں آیا چاہتی ہے۔ اب آپ اسے سنبھالیے۔''

سلمیٰ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں، جھپکائیں، جیسے آنکھوں میں چکا چوندھ ہو، پھر میری طرف مڑی۔ مجھے غور سے دیکھا۔ ایک سال میں مَیں نے جو جو غم اُٹھائے تھے انھوں نے میرے چہرے پر جھرّیاں ڈال دی تھیں، میری نظریں کمزور کر دی تھیں۔ میں مستقل طور پر عینک لگانے لگی تھی۔ وہ مجھے بغور دیکھتی رہی، جیسے وہ بار بار کسی بات کو یاد کرنا چاہتی ہے اور ہوش آتے ہی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے کہا ''عذرا، کیا تو اپنی ماں کو بھی نہیں پہچانتی؟'' اور وہ ''امی'' کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

ڈاکٹرنی سب کو کمرے سے باہر نکال لے گئی۔ ہم دونوں ماں بیٹی نہ جانے کب تک ایک دوسرے کو لپٹائے دیکھتے اور روتے رہے۔ پھر دفعتہً اسے کچھ خیال آیا اور وہ ہاتھوں سے منہ چھپا کر بولی۔

''امی، امی، مجھے مر جانے دیجیے۔ میں بے غیرت زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتی۔''

میں نے کہا ''بی بی تم نے زندگی ہی میں شہید کا مرتبہ پایا، بے غیرت ہوں تمھارے دشمن!''

وہ سسک کر بولی ''امّی ......مگر......مگر......دُنیا......''

میں نے کہا ''دُنیا موئی کیا کہے گی۔ وہ اپنے کو جانور نما انسانوں سے خالی کرے، پھر کچھ کہہ سکتی ہے!— تو فکر نہ کر، ملک کی آزادی کے لیے کوئی مال اور جان قربان کرتا ہے، کوئی عزت و آبرو......''

وہ بلک کر بولی ''مگر یہ تو دشمن کا بیج ہے۔''

''بات تو تیری میرے کلیجے میں لگی''، لیکن میں نے ڈھارس بندھانا فرض سمجھا۔ مَیں نے کہا ''پھر اس میں بھی تو جیت ہماری ہی ہوئی۔ دشمن کی نسل اس کی جگہ ہماری ہی ہو کر رہی! ہم نے اس سے اس کا ایک آدمی چھین لیا!''

اور عذرا میرے سینے سے لگ کر مسکرا دی۔

(مسودہ، تاریخ درج نہیں)

✡✡

ہار جیت

چھیدی پور کی اہیر ٹولی سے جو ملا ہوا آموں کا باغ ہے اُس میں بڑی چہل پہل تھی۔ نوبتیا اہیر کے یہاں رام گڑھ سے جو برات آئی تھی وہ اُسی میں اُتاری گئی تھی۔ متعدد چولہے روشن تھے۔ بڑی بڑی کڑھائیاں چڑھی تھیں، پوریاں ''چھن رہی تھیں'' ترکاریاں بنائی جارہی تھیں۔ براتیوں کے سامنے کیلے کے پتّے اور بڑے بڑے پتّر رکھے تھے۔ گھراتی گرم گرم پوریاں اور بھاجی ہر ایک کے سامنے پروس رہے تھے۔ نوجوان براتیوں میں 'لاگ ڈانٹ' تھی کہ دیکھیں کون سب سے زیادہ کھاتا ہے۔ جناتیوں نے بھی پوری پر پوری پیش کرنا شروع کردی۔ کسی نے آدھ سیر، کسی نے تین پاؤ، کسی نے سیر بھر پوریاں کھائیں۔ مگر رام دُلارے کا پیٹ تھا کہ مٹکا، کسی طرح بھرتا ہی نہ تھا۔ وہ ایک 'بیٹھک' میں ڈیڑھ سیر پوریاں چڑھا گیا۔ پھر جب ہارنے والے مقابل نے کہا کہ ''اس کی سند نہیں، پوریاں گھی میں تر تھیں، مزے کی تھیں، گرم گرم اور نرم نرم تھیں، تان کے کھا گئے، روٹی کھاؤ تو البتہ جانیں مرد ہو۔'' اس نے لڑکی والوں سے دو سیر آٹا، آدھ سیر دال، اور پچیس تیس اُپلے منگائے۔ دال ایک ہانڈی میں چڑھادی، آٹا کیلے کے پتّے پر اپنے ہاتھ سے گوندھ ڈالا، اور اُپلوں کو مربع صورت میں ایک کے اُوپر ایک ''سریا کے'' رکھا اور اُن میں آگ دکھادی۔ جب اُپلے جل کے لہکتے ہوئے کوئلے کے مانند ہو گئے تو اُس نے گندھے ہوئے آٹے کی دس بارہ بھوریاں بنائیں۔ اور انہیں اُس آگ میں ڈال کے ڈھک دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب دال اور بھوریاں تیار ہوگئیں تو وہ چار زانو بیٹھ کے نہایت ہی اطمینان سے اُنہیں بھی اُڑا گیا۔ مقابل نے کان پکڑ کے کہا ''بابا میں ہارا، تم آدمی نہیں راکشش ہو!''

نوجوان جناتیوں نے طعنہ دیا، بہت سا کھالینا بڑی بات نہیں، ہمارے ہاں بھینسیں ناند کی ناند صاف کر جاتی ہیں۔ کوئی گن ہو تو بات ہے۔ رام دلارے ہنس کے برہا گانے بیٹھ گیا۔ اب جناتیوں کی طرف سے باقاعدہ مقابلہ شروع کر دیا گیا۔ جب یہ ایک برہا گا چکتا، وہ جواباً دوسرا گاتے۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوتے یہ تیسرا شروع کر دیتا۔ غرض یوں ہی سوال و جواب کا سلسلہ گھنٹوں جاری رہا۔ مگر اُن میں اور رام دُلارے میں فرق یہ تھا کہ وہ سُنی سنائی چیزیں گاتے تھے اور یہ خود فی البدیہہ کہتا اور گاتا جاتا تھا۔ کئی کئی آدمیوں نے مل مل کے مقابلہ کیا، مگر اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونے والا دوسرے کے سہارے پر بھروسہ کرنے والوں کو ہمیشہ مار گراتا ہے، اِس لیے رام دُلارے کے آگے ایک کی بھی نہ چلی اور سب کے سب سیلی ہوئی آتش بازی کی طرح پھسپھسا کے رہ گئے۔

جناتیوں نے جب یہ دیکھا کہ برہے میں جیتنا محال ہے تو مقابلہ کا رُخ بدل دیا۔ لُرکی چھیڑ دی، یہ بلا کی چیز ہے، اس کا نہ اور ہے نہ چھور! مہابھارت و رامائن کے زمانہ سے قصہ شروع ہوتا ہے اور انتہا ہوتی ہے آج کل کے زمانے پر۔ جتنے قصے اور فسانے دیہاتوں میں بھولے بھٹکے یادرہ گئے ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں اور سب کی تان اہیروں کی تعریف پر ٹوٹتی ہے۔ اس کا سلسلہ ہفتوں جاری رہ سکتا ہے۔ اس لیے جب جناتیوں نے لُرکی چھیڑی، تو رام دُلارے مسکرانے لگا، وہ جانتا تھا کہ حریف نے برہے میں شکست کھانے کے بعد باقاعدہ پسپائی کے لیے یہ صورت نکالی ہے۔ وہ خاموش تو ہو گیا مگر موقع موقع سے اپنے وار سے باز نہ آیا۔ جہاں مقابل چوکا یا کوئی کڑی بھول کے اٹکا، اُس نے فوراً تصحیح کر دی یا لقمہ دے دیا۔ غرض لُرکی میں بھی جیت کا سہرا اُسی کے سر رہا اور جناتی کئی محاذ پر شکست کھانے کی وجہ سے جھلاّنے لگے۔

جب دولہا کے باپ نے دیکھا کہ جناتیوں کے تیور اچھے نہیں ہیں اور رنگ میں بھنگ ہونے والا ہے تو اُس نے اپنے ہفتاد سالہ تجربے سے کام لیا اور اپنے ساتھی نوجوانوں کو سمجھایا کہ رات زیادہ آئی، تھوڑی تھوڑی دیر سب لوگ سو رہیں، پھر صبح مقابلہ ہو رہے گا۔ بارے سب نے اس کا کہنا مان لیا۔ چلمیں بھری گئیں، اُکڑوں بیٹھ کے، ہاتھ کا چونگا بنا کے اور اُس میں چلم رکھ کے سب نے دو دو چار چار لمبے لمبے کش مارے اور وہیں درختوں کے نیچے، تاروں کی

چھاؤں میں انگو چھا بچھا بچھا کے لمبی تانی۔ جا گا ہوا فتنہ یوں تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔

صبح سویرے ہی گاؤں میں شب کے مقابلے اور گاؤں والوں کی شکست کی خبر گرمیوں کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر شخص چمار ہو یا پاسی، شیخ ہو یا برہمن، پرجا ہو یا زمیندار، اپنی اپنی جگہ بل کھانے لگا۔ گاؤں کی عزّت کا ہر ایک کو خیال تھا۔ یہ ناک کٹنے والی بات ہی تھی کہ چار کوس سے برات آئے اور چھیدی پور والوں کو ہر بات میں ہَرا کے چلی جائے۔ رام دُلارے کھانے میں بھی جیتے اور گانے میں بھی۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ جگ ہنسائی نہیں سہی جاتی تھی، اسی لیے اس سورما کو نیچا دکھانے اور اپنے یہاں کے اہیروں کا دل بڑھانے کے لیے ہر فرقے اور پیشے کا آدمی باغ میں آ کے جمع ہو گیا۔

وہاں وقتی اکھاڑہ کھودا گیا تھا۔ جناتی اور براتی مل جل کے ورزش کرنے والے تھے۔ کوئی لنگوٹ کس رہا تھا، کوئی جانگھیا پہن رہا تھا، کسی نے ایک معمولی سی چیٹ سے ستر پوشی کر لی اور کسی نے لنگی ہی کا کاچھا باندھ لیا۔ جوان ڈنڈ، بیٹھک، سپاٹے میں مشغول ہوئے۔ لونڈے اپنی کسرت کے کرتب دکھانے لگے۔ ان میں سے کوئی چند قدم دَوڑ کے آتا اور بڑی پھرتی سے ہاتھوں پر ٹیک لگا کے ایک ساتھ کئی کئی قلابازیاں اس صفائی سے کھاتا کہ سوائے ہتھیلیوں اور پنجوں کے کوئی حصّہ جسم خاک سے مس نہ ہوتا۔ کوئی دوڑ کے زمین سے ڈیڑھ دو گز بلند اُچکتا اور ہَوا میں گرہ لگاتا، کوئی لاٹھی کے سہارے بہت لمبا اور بلند پھاندتا، اور کوئی 'جھٹہرا' ایسے صحیح نشانے سے پھینکتا کہ درخت کی جو نسی پتّی تاکتا وہی ٹوٹ کے زمین پر گرتی اور دوسروں پر 'ریپ' تک نہ آتا۔

رام دُلارے بھی انگڑائی لیتا ہوا اُٹھا اور لنگوٹ باندھ کے اکھاڑے میں اُتر گیا۔ پہلے اُس نے شانوں اور گردن پر مٹّی لگائی، پھر ڈنڈ کرنے شروع کیے۔ جب اُن کی تعداد دو ڈھائی سو سے زائد ہو چکی تو وہ بیٹھک اور سپاٹا لگانے لگا۔ جب اُن کے اعداد بھی ڈنڈ کے قریب قریب پہنچ گئے تو وہ مگدروں کی اُس جوڑی کی طرف متوجہ ہوا، جسے چھیدی پور میں دو ہی ایک آدمی اُٹھا سکتے تھے اور جو محض قوت کی آزمائش ہی کے لیے بنوائی گئی تھی۔ رام دُلارے اس جوڑی کو آدھ گھنٹے تک طرح طرح سے ہلاتا رہا۔ پھر براتیوں کے اصرار سے اُس نے دس بارہ نوجوانوں

کوزور کرایا اور اکھاڑے میں قدم گاڑ کے مبارز طلب نگاہوں سے جناتیوں کو دیکھنے لگا۔ چھیدی پور والوں میں سے دو تین جوان جنھیں اپنے ورزشی جسم اور داؤ پیچ پر گھمنڈ تھا مقابلے کے لیے اکھاڑے میں اُترنے کا قصد رکھتے تھے، مگر رام دُلارے کی ورزش اور قوت کا حال دیکھ کے خاموش ہو رہے۔

رام دُلارے اور اُس کے ساتھی جب اکھاڑے سے نکلے تو جناتیوں نے تازے دودھ سے بھری ہوئی بالٹیاں اور ایک جھوا بھر بھیگا ہوا چنا لا کے رکھ دیا۔ ہر ایک چنا چابنے لگا۔ رام دُلارے بھی ٹہل ٹہل کے جسم سکھاتا اور چنا کھاتا رہا۔ جب جسم خشک ہو گیا تو وہ ایک پوری بالٹی دودھ پی گیا اور کپڑے پہن کے ایک درخت کے تنے سے سہارا لگا کے زمین پر بیٹھ گیا اور لڑکوں کی اُچک پھاند دیکھنے لگا۔

مگر اہیروں کی برات میں اُن کا ہیرو نچلا نہیں بیٹھ سکتا، یہ بات نہ لڑکے والوں کے بھاتی ہے اور نہ تماشائیوں کو۔ براتیوں کو یہ کد ہوتی ہے کہ جناتی کسی بات میں نہ جیتنے پائیں۔ جناتیوں کو یہ خیال رہتا ہے کہ ان کو کسی نہ کسی مقابلے میں تو ہرانا ہی چاہیے۔ اِس لیے اس موقع پر بھی اب اصرار شروع ہوا کہ ناچ میں مقابلہ ہونا چاہیے۔ رام دُلارے اِس فن میں بھی براتیوں کی نظر میں یگانۂ روزگار تھا، اب اس سے بہتر موقع اس کرتب کے دکھانے کا اور کیا ہو سکتا تھا۔ قریب قریب گاؤں بھر جمع تھا، سب اس ہیر کے گن دیکھنے آئے تھے، بھلا یہ وقت خاموشی کا تھا؟ رام دُلارے باوجود شدید اصرار کے پہلے تو ٹالتا رہا مگر جب اہیر ٹولی سے اہیرنوں نے اپنے اپنے گھروں کے سامنے کھڑے ہو کے طعنے دینا شروع کیے اور دو ایک ناچنے تھرکنے بھی لگیں تو اُسے بھی جوش آ گیا اور وہ اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر بھی ابتدا اس نے بھجن والے برہے سے کی:

رام رام کی بھجن کرو ، رام پر دھرو دھیان
محرم ہوے وہی پہچانے ، ایسا دیس ہمارا ہے
جہاں جہاں جائے بیرن ہو بیٹھے، کھجن کھجن سے نیارا ہے
جات برن پوچھے نا کوئی ، پوچھت نا گھر بہوارا ہے
کلک بوند گرے جل ہی ماں ، نا میٹھا نا کھارا ہے
سندر مدل بیچ نوبت باجے ، مُرلی بین ستارا ہے

محرم ہوئے وہی پہچانے ، ایسا دیس ہمارا ہے
رام رام کی بھجن کرو ، رام پر کرو دھیان!

ترجمہ: رام رام کرو اور اسی کا دھیان رکھو۔ ہم جہاں کے ہیں اسے سوائے محارمِ اسرار کے کوئی نہیں جانتا۔ ہم (اس دنیا میں) جہاں جاتے ہیں اجنبی ہی معلوم ہوتے ہیں۔ نہ کوئی ہم سے ہماری ذات کی بابت دریافت کرتا ہے اور نہ کوئی ہمارا وطن پوچھتا ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) کہ ہم جہاں کے ہیں اُسے سوائے محارم اسرار کے اور کوئی نہیں جانتا۔ جب پانی کی بوند پانی ہی میں مل جاتی ہے تو اُس کے ذائقے میں کوئی فرق نہیں ہوجاتا۔ اور جب مختلف باجے ایک ساتھ بجتے ہیں تو اُن کی آوازوں میں تفریق نہیں کی جاسکتی۔ (حقیقت یہ ہے کہ) ہم جہاں کے ہیں اُسے سوائے محارم کے کوئی نہیں بتا سکتا۔ اس لیے بس رام رام کرو۔ اور اُسی کا دھیان رکھو۔

مگر جوں جوں جوش بڑھتا گیا اور اہیرنوں کی طرف سے جواب ملتا گیا، وہ فی البدیہہ برہے موزوں کرتا گیا۔ ہر برہے کے بعد وہ اہیروں کا ناچ ناچتا تھا، کبھی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کے محض سر و سینہ زور زور سے ہلاتا تھا، کبھی صرف کولہے اور کمر کو حرکت دیتا تھا اور کبھی ایک پاؤں کی ایڑی پر لٹو کی طرح بڑی تیزی سے گھومتا تھا۔

اہیرنیں بھی ہاتھ چمکا کے اور گالیاں دے دے کے ناچتی تھیں، اور ہر برہے کا جواب گیت سے دیتی تھیں، مگر کیلے کے درختوں میں کھجور کے پیڑ کی مضبوطی کہاں؟ جہاں سخت جھونکے آئے اور وہ دُہرے ہو گئے!

جب اہیرنوں نے دیکھا کہ اُن کے یہاں گیتوں اور گالیوں کا ذخیرہ ختم ہو چلا ہے، اور بیاہ کا سارا کام مقابلہ کی وجہ سے بند ہوا چاہتا ہے تو اُن میں سے دو تین دوڑی ہوئی نولاکھی کے پاس پہنچیں۔ اُس نے عمر کی صرف اٹھارہ بہاریں دیکھی تھیں کہ اچانک گرفتارِ خزاں ہو گئی تھی۔ جوان شوہر گونا کراتے ہی سُرگ باش ہو گیا تھا، وہ اب بیوہ تھی، نہ اُس کی مانگ میں سیندور تھا، نہ ہاتھوں میں چوڑیاں، اور نہ بر میں رنگین ساڑی۔ اس کے لیے تو اب گھر کا ایک کونا تھا، خاموشی تھی اور سپید کپڑے۔ وہ بیاہ برات میں کیا منہ لے کے جاتی۔ ایسے گھر میں تو اس کی موجودگی ہی بدشگونی کے کے لیے کافی سمجھی جاتی۔

مگر سکھیاں بھلا اس وقت ان باتوں کو کہاں دھیان میں لاتی تھیں۔ گاؤں بھر کی ناک کٹ رہی تھی۔ رام دُلارے ہر بات میں جیتنا چلا جا رہا تھا۔ اہیر اس کے مقابلے سے عاجز آ چکے

تھے، اب کیا اہیرنیں بھی اپنے مردوں کی طرح کم ہمت تھیں کہ ہاتھ پاؤں ڈال کے بیٹھ رہتیں۔ نولاکھی ناچنے گانے کی ماہر تھی، جوان تھی، بال بچوں والی نہ تھی، شادی بیاہ کا اُسے کام کاج نہ کرنا تھا، اِس سے زیادہ اس مقابلے کے لیے کوئی موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ بس سب مل کے اُسے کھینچ لائیں۔

نولاکھی کو پس وپیش اِس لیے تھا کہ اس کی بیوگی کے زمانے میں اُس کے پاس، بہت سے منچلے اہیروں کی طرح رام دُلارے کا بھی پیغام آچکا تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ کشتی اور پہلوانی کی طرح ناچنے گانے میں بھی مشاق ہے۔ شب سے وہ اس کا تذکرہ سن سن کر اس کی جھلک دیکھنے کے لیے بے چین بھی ہو رہی تھی۔ اس کا یہ بھی جی چاہتا تھا کہ وہ رام دُلارے کو اس مقابلے میں ہرا کے یہ دکھادے کہ اس کا حوصلہ کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ مگر جتنی رام دُلارے تک پہنچنے اور اُس کے مقابلے کی خواہش بڑھتی، اُتنی ہی شرم بھی بڑھتی تھی۔ وہ اسی ہَیس بَیس میں تھی کہ سکھیوں نے زبردستی ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ اور وہ دل ہی دل میں جھینپتی، شرماتی، نظریں نیچی کیے چلی۔

آموں کے باغ کے پاس پہنچ کر اُس نے پہلی بار مقابل پر نظر ڈالی، دیکھا ایک جوان کھڑا ہے۔ گندمی رنگ، گول چہرہ، چمکتی ہوئی انکھیں، کانوں میں موٹی موٹی مُرکیاں، گلے میں اشرفیوں کا کنٹھا، سانڈ کا سا سینہ، باگھ کی سی کمر، ساری سج دھج پہلوانوں کی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے دل میں بڑے زور سے چٹکی لی۔ یہ تو مَرے ہوئے سوامی سے ملتی جلتی ہوئی صورت تھی! گھبرا کے جھجکی، مگر سکھیوں نے دھکیل کے سب کے آگے کر دیا۔

براتیوں میں سے کئی ایک نولاکھی کو پہچانتے تھے، اُس کے حسن اور اُس کے ناچ کے اکثر گھائل تھے۔ اِس لیے رام دُلارے کے گرد بیٹھے ہوئے مجمع میں ایک اضطرابی لہر سی دوڑ گئی۔ رام دُلارے نے اِس کیفیت کو محسوس کیا اور وہ ناچتے ناچتے ٹھٹک کے رُک گیا۔ اہیروں نے ایک دوسرے کے پہلو میں کہنیاں ماریں اور بولے۔ ''اب مکالبہ برابر کا بھوا، رام دُلارے ایک ترپھ، نولاکھی دوسری ترپھ!'' (اب مقابلہ برابر کا ہوا، رام دُلارے ایک طرف نولاکھی دوسری طرف)

رام دُلارے نے نولاکھی کا نام سنتے ہی اُسے بغور دیکھا۔ بادل ماں جیسے چندرما چمکے۔ ویسا ہی میلی ساڑی میں اُس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس پر آفت گٹو ایسی بڑی بڑی مدھ بھری آنکھیں اور ہنس ایسی لمبی اور ٹیڑھی گردن۔ سڈول بھرا بھرا جسم، نئے پودے کی طرح نرم نرم

ہاتھ پاؤں، پھر تیلے بچھڑے کی ایسی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی۔ بڑی سُندر جان پڑی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس نے نولاکھی کو دیکھا ہی نہیں، بلکہ ساتھ ہی ساتھ کئی لبریز جام بھی چڑھا لیے۔ اس لیے کہ وہ اپنے میں عجیب طرح کی سرخوشی محسوس کر کے ایک پُرانا برہا ناچ ناچ کے گانے لگا:

ایک سمے میں ہری روپ بدل لال، دھیلیں بیدا کا بھیس
کھوری کا کھوری گھومے بیدوا، سہرماں کونو ہے بیماری؟
اپنے محل سے نکلن رادھکا، دِکھلن بیدا صورت تمھاری
آؤ نہ بیدا میری نگریا، پہچانو میری بیماری
نادیکھوں توری سردی گرمی ، نادیکھوں توری بیچاری
تم ناری اِس بھنگ بھئی ، بگڑ گئی ہے سب ناری
آؤ نہ بیدا میری نگریا ، کھدمت کربے تمھاری
آؤر دیب ہم دَھن دولت ، اور جاگہ جمیداری
اور دیبا گوکلاکار جوا ، بیٹھل کریہا بیہاری
ناچاہوں تورو دھن دولت ، نالیوں تور جگہ جمیداری
نا چاہیں گوکلاکار جوا ، ناہیں کربے بیہاری
ہم چاہیں رسوں کا کلیا ، ہم ہی پُرس توں ناریا

ترجمہ: ایک بار کرشن نے بھیس بدلا اور وید بن کے گلی گلی گھومنا اور پکارنا شروع کیا کہ اس شہر میں کوئی بیماری تو نہیں ہے؟ (یہ صدا سنتے ہی) رادھا اپنے محل سے نکل پڑیں، اور وید کی صورت دیکھ کے پہچان کے بولیں۔ ''اے وید جی، ادھر آیئے، ذرا میری بیماری تو پہچانئے۔'' انھوں نے کہا ''میں تمھاری بیماری بھلا کیا پہچانوں گا، تم تو خود ایسی آفت روزگار ہو کہ تمھیں دیکھتے ہی میری نبضیں چھوٹی جاتی ہیں۔'' اس پر رادھا بولیں۔ ''اچھا میرے پاس تو آیئے، میں آپ کی خدمت کروں گی۔'' ''آپ کو روپیہ پیسہ، جگہ زمینداری سب کچھ دوں گی۔ گوکل کا راج نذر کروں گی، بس ٹھاٹھ سے بیٹھ کے حکومت کیجیے۔ وید نے جواب دیا۔ ''مجھے تمھاری دولت، تمھاری زمینداری، اور تمھارے راج کی خواہش نہیں۔ میں تو محبت کا بھوکا ہوں، سو اگر تم مجھے اپنا شوہر بنالو تو البتہ راضی ہوں!

آخری ٹکڑا ''ہم ہی پُرس توں ناری'' رام دُلارے نے آگے بڑھ کے اور نولاکھی کی طرف اشارہ کر کے اس طرح کو لہے کر حرکت دے کے گایا کہ سارا مجمع ہنستے ہنستے بیتاب ہوگیا۔

نولاکھی بھی دل ہی دل میں کٹ گئی۔ مگر حریف کے پہلے ہی وار میں جھجک کے پیچھے ہٹ جانا شکست ماننے کا پیش خیمہ تھا۔ اور وہ اس کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ ہمیشہ اس طرح کے مقابلوں میں 'ورٗ ہی رہی تھی، اس لیے قبل اس کے رام دُلارے کچھ اور کہہ سکے، اُس نے اس برہے کی آخری کڑی حد درجہ تحقیر آمیز لہجہ میں ہاتھ چمکا کے گا دی۔

"نیا پر چڑھ کے گول کاٹے لا کنھیا آ کھر جتیا کا توں اہیر۔"

(کنہیا پر چڑھ کے چکر لگاتے ہو، یعنی ہر پھر کے اپنے ہی مطلب ہی کہتے ہو۔ آخر تم ذات کے اہیر ہی ہونا!)

اہیرنوں اور جناتیوں نے اس حاضر جوابی پر اس زور کا قہقہہ لگایا کہ رام دُلارے اور اُس کے ساتھی بالکل ہی جھینپ گئے۔

ناگن نے سپیرے کا پہلا وار خالی ہی نہیں دیا بلکہ خود چوٹ کر گئی!

گھنٹوں مقابلہ ہوتا رہا۔ دونوں نے اِس قدر برہے اور گیت گائے کہ گلے پڑ گئے، اب خاموش ناچ کا جواب ناچ سے دیا جا رہا تھا۔ رام دُلارے نے کُرتہ اُتار کر پھینک دیا تھا۔ دھوتی کا کاچھا کس لیا تھا۔ نولاکھی نے ساڑی کا آنچل کمر میں لپیٹ لیا تھا اور پھبتی لنگی کی طرح یوں کھینچ کر پیچھے کھونس لی تھی کہ گوری گوری پنڈلیاں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں گلاب کی پتیوں پر شبنم کے قطروں کی طرح جھلک رہی تھیں، آنکھیں خون سے بھری کٹوریاں ہو رہی تھیں۔ ہونٹ بالکل بنفشی تھے، مگر مسکراہٹ سے دانتوں کی بتیسی بار بار چمک اُٹھتی تھی، اور کمر اور کولہے کی حرکت برابر مشین کی طرح جاری تھی۔

رام دُلارے کو زیادہ تکان تھی، وہ مرد تھا، پہلوان تھا، بن بیاہا تھا، وہ دس بارہ گھنٹے ایک طرح ناچ سکتا تھا۔ مگر مقابل کوئی مرد نہ تھا، ایک نازک اندام سیمیں عورت تھی، پھر بھی وہ گھنٹوں سے کھڑی برابر کا مقابلہ کر رہی تھی۔ ہر برہے کے جواب میں کوئی برہا یا گیت گاتی۔ جب تک گلا نہ پڑا تھا، خاموش نہ ہوئی تھی۔ ناچتی بھی اس خوبی اور دلفریبی سے تھی کہ جسم کی ہر حرکت اور اعضا کی ایک ایک جنبش بوڑھے پھونس اہیروں کے دل و دماغ میں آگ لگا دیتی تھی۔ اس کا استقلال یہ بتاتا تھا کہ وہ بات پر جان دے دے گی، مگر ہار نہ مانے گی۔ انداز کہتا تھا کہ تھک کے چور ہو گئی ہے، مگر مسکراہٹ بتاتی تھی کہ جب تک دم میں دم ہے ناچے جائے گی۔ رام دُلارے نادیدہ عاشق تھا، پیغام بھیج چکا تھا، آج اس باہمت مقابلے نے اس کے دل میں وہ جذبۂ ایثار

پیدا کر دیا جو وفورِ محبت ہی کے بعد ممکن ہے۔

اس نے دفعتاً انگڑائی لی اور مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ نولاکھی ناچتے ناچتے گھبرا کے ٹھٹکی، پھر تن کے کھڑی ہوگئی۔ رام دُلارے نے اس کے قدموں کی طرف ہاتھ لے جا کے کہا۔ ''دیوی جی، ہم ہار گئی لیں۔ تہار ایسن ناچ اِہ دیس ماں کیہوں کا نا آوت!'' (دیوی میں ہار گیا۔ تمھارا سا ناچ اِس ملک میں کسی کو نہیں آتا) جناتیوں نے اس پر خوب تالیاں بجائیں اور فقرے کسے۔ اہیرنوں نے گالیاں دے دے ''ہار گوا! ہار گوا!'' کا شور مچایا، مگر نولاکھی نے رام دُلارے پر ایک چھلکتی ہوئی نظر ڈالی اور سر جھکائے چپکی اپنے جھونپڑے میں چلی گئی۔ نگاہیں کہتی تھیں کہ رام دُلارے کی شکست مان لینے نے جیت کو ہار بنا دیا اور ہار کو جیت!

سپیرے نے ناگن کو جڑی سنگھا کر مدہوش کر دیا تھا، اب وہ اس کے قابو میں تھی۔

اس واقعے کے پندرہویں دن رام دُلارے چھیدی پور پھر آیا۔ دن بھر اہیر ٹولی میں رہا، شام کو جب رام نگر واپس جانے لگا تو نولاکھی سُرخ چادر اوڑھے اس کے پیچھے پیچھے تھی اور سکھیاں بابل گا رہی تھیں۔ مگر رام دُلارے کا انداز ہی نرالا تھا، وہ بائیں کاندھے پر لاٹھی رکھے اُسے اُلٹے ہاتھ سے سنبھالے تھے، اور داہنا ہاتھ کبھی کان پر کبھی کمر پر رکھتا اور مستانہ وار ناچتا اور گاتا جاتا تھا:

رام رام کی بھجن کرو ، رام پر دھرو دھیان
محرم ہوئے وہی پہچانے ، ایسا جوڑ ہمارا ہے
جہاں جہاں جائے اپنی ہو بیٹھے، ایسے موہن پیارا ہے
انکھیاں اِہ کی کھنجر ایسی ، چلیا اِہ کی دھارا ہے
دیکھو پنچو ایہر دیکھو ، ای ہی ہمرا پیارا ہے
اِہی سے ہار کے اِہ کے جیتا، اِی ہے گھات کٹارا ہے
ایسی گھتیا نا کوئی جانے ، جانے رام دُلارا ہے
محرم ہوئے وہی پہچانے ، ایسا جوڑ ہمارا ہے
رام رام کی بھجن کرو ، رام پر دھرو دھیان

ترجمہ: رام رام کرو اور اُسی کا دھیان رکھو، میرے کفو کو سوائے خاص خاص لوگوں کے ہر ایک نہیں پہچان سکتا۔ وہ جہاں جاتی ہے اپنی موہنی اور پیاری صورت کی وجہ سے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ اُس کی آنکھیں خنجر ہیں، اُس کی چال میں دریا کی روانی ہے۔ اے پنچو ادھر دیکھو، یہی میری پیاری ہے۔ اِسی سے ہار کے میں نے اسے جیت لیا۔ یہی ترکیب سب سے زیادہ کارگر تھی۔ ایسی چالیں سوائے رام دُلارے کے دوسروں کو نہیں آتیں۔ (یہی تو وجہ ہے کہ) میرے کفو کو بھی سوائے مخصوص لوگوں کے ہر کس و ناکس نہیں پہچان سکتا۔ (اور اسی لیے فرض ہے کہ) رام رام کرو اور اسی کا دھیان کرو۔

وہ ہر کڑی پر رُک کے کھڑا ہو جاتا، کولہے اور کمر کو حرکت دیتا، پھر ناچتا ہوا نولاکھی کے گرد گھومتا اور آگے بڑھتا۔ نولاکھی شرماتی، لجاتی، بدن چراتی، مگر گھونگھٹ سے تیرِ نیم کش مارنے سے باز نہ آتی تھی۔

ہاں ہاں، سپیرے کے منتروں نے ناگن کو ایسا رام کیا تھا کہ وہ اب اس کے گلے کا ہار تھی!

(کچھ ہنسی نہیں اور......۱۹۳۳ء)

ہنستے ہی گھر بستے ہیں

سمن حد درجہ پریشان تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ دو طرح کی محبتوں میں رسّہ کشی تھی۔ ایک جانب جان سے پیارا مہندر تھا، دوسری طرف اس پر جان چھڑکنے والی بوڑھی ماں اور باپ کی نشانی چھوٹا بھائی راجو۔ کس کو چھوڑے، کس کا ساتھ دے۔ وہ جانتی تھی وہ کوئی خوبصورتوں میں نہیں، نہ اس کے گال چاند سورج، نہ اس کی آنکھیں چشم آہو، نہ اس کے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیاں، نہ اس کی گردن ہنس کی سی، نہ اس کا قد سروشاداب جیسا اور نہ اس کے پاؤں کھلتے کنول کی مانند۔ پس وہ ایک گندمی رنگ کی اوسط قد والی تندرست و جوان عورت تھی۔ اس شکل صورت کی ہندو عورت کے لیے اپنی ذات والوں میں صرف ایک ہی صورت مل بر مل سکتا ہے، اور وہ یہی کہ باپ یا بڑا بھائی دولھا کے قدموں پر اشرفیوں کا ڈھیر لگا دے۔ لیکن سمن کے معاملے میں تو اشرفیاں خواب میں بھی نظر نہ آتی تھیں۔ اپنے باپ کی زندگی ہی میں وہ جوان ہو چکی تھی۔ ہائی اسکول پاس کر کے اس نے انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے لیا تھا۔ ماں نے کئی بار اُس کے ہاتھ پیلے کرنے کا شوہر سے ذکر چھیڑا تھا، مگر ڈیڑھ سو پانے والے اسکول ماسٹر نے یہی کہہ کر بات ٹال دی تھی کہ اسے تعلیم حاصل کر لینے دو، پھر دیکھا جائے گا۔ اسے اُمید تھی سمن اعلیٰ تعلیم حاصل کر لے تو شاید کوئی پڑھا لکھا لڑکا اتنا سمجھدار نکل ہی آئے جو علم کو زر و جواہر پر ترجیح دے۔ جو حسنِ سیرت سے حسنِ صورت کا پلّہ بھاری سمجھے۔ مگر باپ کو خواب کی تعبیر نہ مل سکی۔ وہ اسکول جاتے وقت ایک دن ٹرک سے کچل کر مر گیا۔ سمن پر مصیبتوں کا پہاڑ گر پڑا۔ اسے کالج سے نام کٹوانا پڑا اور دمے کی مریض ماں اور چھوٹے راجو کا بوجھ اپنے نازک کندھوں پر اُٹھانا پڑا۔ لیکن اس بوجھ اُٹھانے کے لیے نہ تندرستی کافی ہوتی ہے

اور نہ جوانی۔ اس طرح کا ستون بننے کے لیے روپیوں کی سیمنٹ درکار ہے۔ وہ بغیر کسی طرح کی مزدوری اور چاکری کے ممکن نہیں۔ مزدوری کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی، نوکری ملنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ایسے زمانے میں جب سینکڑوں بی اے مارے مارے پھرتے ہیں، ایک ہائی اسکول پاس سترہ برس کی بے یارومددگار لڑکی کو کون سی جگہ مل جاتی۔ مگر اس کے باپ کا مقدمہ جس مجسٹریٹ کے سامنے پیش تھا، اس کے دل میں خدا نے نیکی ڈال دی۔ اس کی سفارش پر سمن کو دوسرے ہی مہینے بس کنڈکٹری مل گئی۔ ڈوبتے خاندان کو تنکے کا سہارا ہو گیا۔

مگر ڈوبتے ہوئے دل کا سہارا کہاں تھا۔ سمن خوبصورت و حسین نہ سہی مگر جوان تھی۔ اور جوانی خود ہی سب سے بڑا حسن ہے۔ بس کے مسافر طرح طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ بوڑھے بھی، جوان بھی، نیک بھی شریر بھی، بااخلاق بھی، بدتہذیب بھی، انسان بھی جانور بھی۔ کوئی اسے بیٹی کہہ کر بزرگانہ شفقت ظاہر کرتا، کوئی اسے بہن جی کہہ کر نرم لب و لہجے میں گفتگو کرتا۔ بعض ایسے بھی ہوتے جو اسے دیکھتے ہی سیٹی بجاتے۔ سب کی آنکھ بچا کر آنکھ مارتے اور بس پر چڑھنے یا اُس سے اُترنے میں شانے سے شانہ ضرور لڑاتے۔ خیر بس تو بس ہی تھی۔ اس پر سوار ہونے والے سب ہی مسافر، تھوڑی دیر کا ساتھ، راہ چلتوں کی ملاقات۔ ان کی چھچھوری حرکتیں تو انگیز ہو جاتیں، مگر دفتر والے، پھر ڈرائیور، انسپکٹر اور وہ جو اس کی ملازمت سے وابستہ تھے یا جن کے ہاتھوں میں اس کی مستقلی و ترقی تھی، ان میں سے کچھ چڑچڑے تھے، کچھ منچلے تھے، کچھ خود بین تھے، کچھ نفس پرست تھے اور کچھ رشوت خور۔ ہر طرح کی رشوت کا مطالبہ تھا، روپیوں کا، چیزوں کا، جسم کا۔ ان سب سے سمن کا تنہا نپٹنا مشکل تھا۔ اسے قدم قدم پر کمزوری محسوس ہونے لگی۔ پاؤں کانپنے لگے۔ سہارا بننے کے لیے جس پامردی اور استقلال کی ضرورت ہے وہ کافور ہونے لگا۔ بارے پھر بخت نے یاوری کی اور ایک سہارے کی صورت میں مہندر مل گیا۔ وہ اسی بس کا ڈرائیور تھا جس کی وہ کنڈکٹر تھی۔ اس کی شکل صورت بھی کسی اُردو ناول کے ہیرو جیسی تھی۔ پانچ فٹ دس اِنچ قد، سانولی رنگت، جو اَب دھوپ اور محنت سے سیاہی مائل ہوتی جاتی تھی۔ اوسط بھوری آنکھیں، چوڑے کلّے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی، پھیلی ناک، بڑا دہانہ، موٹے ہونٹ، نوکیلی ٹھوڑی، بھری بھری گردن، چوڑا سینہ، مضبوط بازو۔ ایک جفاکش محنتی مزدور جیسے ہاتھ پاؤں۔ اس کی سب سے بڑی خوبصورتی اس کی ہنسی تھی۔ اس ہنسی میں اتنی خوداعتمادی

تھی، اتنا مشکلوں سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ تھا، اتنی انسانی ہمدردی تھی کہ دوست دشمن سب ہی اس کی ہنسی میں شریک ہو جاتے اور اپنا غم وغصہ بھول جاتے۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ کس قوم و قبیلے کا ہے، اس کی نجی زندگی کیا ہے، کہاں رہتا ہے، کہاں کھاتا پیتا ہے، لیکن ہر ایک کو اس پر اس قدر اعتماد تھا کہ سارے ڈرائیور، کنڈکٹر بلکہ انسپکٹر اور بعض پرانے افسر تک اسے اپنے خفیہ رازوں میں شریک کر لیتے تھے۔ وہ سب کی باتیں خاموشی سے سن کر ہنس دیتا اور کہتا ''واہ! یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہے! سب ٹھیک ہو جائے گا، گھبرائیے نہیں۔'' اور اس کی ہنسی دوسروں میں بھی خوداعتمادی پیدا کر دیتی۔ اسی مہندر کی پیدا کی ہوئی خوداعتمادی نے سمن کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ مسافروں کے جھمیلے جھیل گئی تھی۔ دفتر والوں کے غرّے ڈلے سہہ گئی تھی اور دل پھینک ساتھیوں کی فقرے بازیاں اور بے موقع چھیڑ چھاڑ مسکرا کر برداشت کر گئی تھی۔

مہندر کی اس ہنسی اور اس کی بروقت ہمدردیوں نے جس طرح سمن کو خوداعتمادی دی اسی طرح دل کے مندر میں مہندر کو ایک دیوتا بھی بنا کر بٹھا دیا۔ مگر یہ دیوتا نہ تو غیر مرئی تھا کہ جسے وہ روز نہ دیکھتی ہو، نہ پتھر لکڑی یا مٹی کا بنا تھا جس میں نہ نرمی ہو نہ گرمی، بلکہ ایک جوان تھا دوسری جنس کا۔ اسی کی طرح کا گوشت پوست والا انسان۔ اس لیے یہ دیوتا محبوب بھی بنا، معشوق بھی اور لاشعور کی کئی تہوں میں چھپا ہوا پتی بھی۔

مگر عورت ذات سب کچھ دل میں چھپائے رہی۔ حیا کی دیوی تھی اپنے جذبات ظاہر کیسے ہونے دیتی؟ نہ جانے مہندر کے کیا خیالات تھے۔ وہ بھی اسے پسند کرتا تھا یا نہیں۔ اس کی مروّت، اس کی ہمدردی تو عام تھی۔ وہ اپنی ہنسی تو ہر طرف بکھیرتا پھرتا تھا۔ اُس نے تو اشاروں کنایوں میں کبھی کسی خصوصیت کا اظہار نہیں کیا۔ پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ شادی شدہ تھا یا بن بیاہا۔ اچھی چال چلن کا ایسا سجیلا جوان کاہے کو اب تک بن بیاہا بیٹھا رہا ہوگا۔ بیوی بھی ہوگی، بچے بھی ہوں گے۔ غرض وہ دل ہی دل میں سوچتی اور جی ہارے خاموش پرستش پر ہی رضامند رہی۔ لیکن مہندر نے پچھلی شام کو ایک بات کہہ کر دل میں طوفان اُٹھا دیا تھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح اس کو گھر تک پہنچانے کے لیے ساتھ ہو لیا تھا، مگر گھر والی گلی کے موڑ پر دفعتہً رُک کر اُس نے کہا ''میں آج ماتا جی سے ملنے نہ جاؤں گا، ایک ضروری کام ہے۔'' لیکن جب سمن ''اچھا تو رام رام!'' کہہ کر آگے بڑھی تو وہ اسے روک کر اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ بولا

''تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح ہم ایک ساتھ روز سرکاری بس چلاتے ہیں اسی طرح اگر ہم زندگی کی گاڑی بھی ساتھ ساتھ چلائیں تو کتنا اچھا ہو!''

وہ شرم سے پسینے پسینے ہوگئی۔ اُس نے گردن میں پڑے ہوئے ساڑی کے پلّو کو سر پر گھونگھٹ نما ڈال لیا۔ مہندر ہنسا ''تم ہاں کہو تو میں سب انتظام کر ڈالوں۔''

سمن نے نیچی نظریں کیے کیے کہا ''میں کیا جانوں، ماتا جی سے پوچھیے۔''

وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ اُس نے مہندر کو ایک ہتھیار ڈالے ہوئے مفتوح کی نظر سے دیکھا اور تیز بھاگ کر اپنے گھر میں گھس گئی۔ مہندر اس کے اس طرح بھاگنے پر پھر ایک بار ہنسا تھا اور وہ ہنسی سمن کے جسم و جان میں اس وقت تک قند گھولتی رہی تھی جب تک اُس نے یہ نہ سوچا کہ مہندر سے شادی میں کیا دقتیں ہیں۔ وہ اس کی ذات، اس کے خاندان سے واقف نہ تھی، اور ماں کو سب سے زیادہ اسی کا خیال تھا۔ وہ مر جائے گی مگر کسی دوسری ذات والے سے شادی کی اجازت نہ دے گی۔ خود سمن کو بس کی نوکری نے اُونچی نیچی ذاتوں کے فرق سے بالاتر کر دیا تھا۔ وہ روزانہ مسافروں کی ریل پیل میں اُونچی ذات والوں کو نیچی حرکتیں اور نیچی ذات والوں کو اُونچے افعال کرتے دیکھتی تھی۔ وہ جانتی تھی سیرت ذات سے نہیں بنتی، کردار سے بنتی ہے اور اس کی نظر میں مہندر کا کردار فرشتوں جیسا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا مہندر کسی ایسی ویسی ذات کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں، اس کی خود اعتمادی، اس کی نڈری، اس کا کسی سے مرعوب نہ ہونا، اس کا بے جھجک اُونچی ذات والوں سے ملنا جلنا یہ سب اس بات کا یقین دلاتے تھے کہ وہ کسی چھوٹی ذات کا فرد نہیں۔ وہ شادی میں پڑنے والی اس گتھی کو سلجھا کر مطمئن ہوگئی۔ لیکن وہ ذات پات کے ہیر پھیر سے نکلی ہی تھی کہ وہ خاندان اور کہنے والوں کی بھول بھلیوں میں پھنسی۔ نہ جانے ہندوستان جیسے ملک میں جہاں پورے پورے خاندان ایک کمانے والے کے سر کھاتے اور پلتے ہیں، خاندان بیوی اور معشوقہ سے بھی زیادہ اہم ہوتا ہے، پرورش پانے والے افراد چاہتے ہوں گے کہ اس کی بیوی جب آئے تو اپنے ساتھ بہت سا جہیز لے کر آئے، ڈھیروں سونے چاندی گھر بھر دے اور یہاں سمن کے پاس کیا تھا۔ اسکول ماسٹر باپ کے زمانے ہی میں تنخواہ کھانے اور کپڑے کے لیے ناکافی تھی۔ وہ بچا کر رکھے کیا۔ سو پچاس جو ماں نے پیٹ کاٹ کاٹ کر بچا کے رکھے تھے وہ ان کے جسم کے ساتھ ساتھ دوا کی شیشیوں نے کھا لیے۔ بس

کنڈکٹری میں اسے مشکل سے پچاسی ملتے تھے، اتنے میں تین جانوں کا کھانا، کپڑا اور راجو کی تعلیم۔ کتنی مہنگی ہوتی جاتی تھی روز بروز اس ملک میں تعلیم۔ ہر سال بدلنے والی نئی نئی ڈھیروں کتابیں، کاپیاں، پنسلیں، فاؤنٹین پین، طرح طرح کی فیسیں، چندے اور سب سے بالاتر یونیفارم۔ چاہے تن ڈھانکنے کو کپڑا نصیب نہ ہو، لیکن اگر اسکول میں پڑھنا ہے تو تین جوڑے یونیفارم والے ضرور بنواؤ۔ پچاسی روپے کی تنخواہ میں یہ سب اُٹھائے نہیں اُٹھتا، وہ بچائے کہاں سے پیسہ؟ خیر، مہندر یہ سب جانتا تھا۔ اس پر بھی اُس نے یہ تجویز پیش کی۔ اس خیال نے ڈھارس بندھائی، مگر ایک قدم آگے ہی وہ دلدل ملی جس سے نکلنا ہی محال تھا۔ لڑکی کے لیے شادی کے معنی ہوتے ہیں اپنا گھر چھوڑ کر دوسرے کے گھر جانا۔ سمن اگر یہاں سے چلے جائے گی تو ماتا جی اور راجو کا کیا حشر ہوگا؟ اس کے کمزور اور نازک سہارے کے علاوہ ان کا اور کیا سہارا ہے۔ مانا کہ سر ڈھانکنے کو اپنا گھر ہے، مگر تن ڈھانکنے اور پیٹ پالنے کا تو اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔ وہ مہندر کی بن کر اس کے ساتھ چلی جائے گی تو ماں اور چھوٹا راجو کیا کھائیں گے، کیا پہنیں گے؟ بس لاکھ ہنسنے کی کوشش کی، وہ اس دلدل میں گڑتی دھنستی ہی چلی گئی۔ اس کے لیے سہاگ نہیں، تیاگ ہی تیاگ تھا۔ لیکن جب جسم کی پکار سے دماغ و دل گونج رہے ہوں، جب مہندر کی شیریں ہنسی سے کان بج رہے ہوں تو تیاگ کوئی آسان چیز نہیں۔ دم گھٹنے لگا، حلق میں کانٹے پڑ گئے، اُٹھ کر صراحی سے اُنڈیل کر پانی پیا۔ صراحی ماں کے کمرے میں تھی، وہ بیٹھی ضربیں لگا رہی تھی، اس کی دمے کی دھونکنی چل رہی تھی۔ اُس نے گھٹنے سے سر اُٹھا کر پوچھا ''کیا ہے سمن؟ کیا اندر نیند نہیں آتی؟'' وہ بولی ''نہیں، پیاس لگی تھی۔'' اُس نے پھر گھٹنے پر سر رکھا اور یہ کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی۔

اکتوبر کا مہینہ تھا، جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ صحن کی ٹھنڈک اس کے گرم جسم کو بھلی معلوم ہوئی۔ دالان سے ایک کرسی اُٹھا کر وہیں بیٹھ گئی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ اندھیری رات تھی، آسمان پر تارے خوب جھٹکے ہوئے تھے، سوچنے لگی وہ ہماری زمین سے کتنی دور ہیں، پھر بھی ایک دوسرے کی کشش پر قائم ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کی کشش کم ہو جائے اور کسی کی زیادہ تو پھر کیا ہو۔ ایک دوسرے سے ملیں گے اور اس گرم جوشی سے ملیں گے کہ پاش پاش ہو جائیں گے۔ معاً خیال آیا، اسی طرح وہ بھی تو دو کششوں کے درمیان ہے۔ ماں اور ماں جائے کی

کشش، اور ہنستے ہوئے مہندر کی کشش۔ وہ کسی ایک کی ہو کر رہ جائے گی تو ان کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا یقینی ہے۔ ایسے میں ایک ستارہ ٹوٹا اور دُور تک ایک چمکتی سڑک دِکھاتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی، دو موٹے موٹے آنسو پلکوں سے نکل کر گال پر بہہ آئے۔ اُس نے ایک انگلی سے انھیں پونچھ کر آنگن کی کچی مٹی پر پھینک دیا۔ بڑے عزم سے اُٹھ کر کرسی دالان میں رکھی اور اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر کر سو رہی۔

حسب معمول جب صبح سویرے اُٹھ کر ماں کے لیے دودھ گرم کرنے اور اپنے اور راجو کے لیے چائے بنانے کی غرض سے اسٹو جلایا تو یاد آ گیا آج ڈیوٹی سات بجے کی جگہ دو بجے سے ہے۔ کام کی تیزی میں ذرا سستی پیدا ہو گئی اور سستی پیدا ہوتے ہی مہندر کا وہی سوال یاد آ گیا جس نے رات کی نیند حرام کر دی تھی۔ وہ اُلجھنے لگی۔ ماں دودھ پی کر چولھے کی طرف چلی تو اُس نے روک دیا "تم بیٹھو ماتا جی، میں کھانا پکاؤں گی۔" اور رسوئی گھر میں جا کر کاموں پر پل پڑی۔ نو بجے کے بعد جب راجو کھا پی کر اسکول جانے لگا تو ماں نے پکار کر کہا "سمن اسے میری دوا کے دام دے دو، وہ واپسی میں خرید تا لائے گا۔" اُس نے اپنے کمرے میں آ کر پرس سے روپیہ نکالا اور ماں کو دینے کے لیے اس کی طرف بڑھی۔ ویسے ہی راجو نے لپک کر کہا "دیدی دو کاپیوں کے دام بھی دے دو نا۔ آج ماسٹر جی نے منگائی ہیں۔ اس نے ایک اُٹھنی نکال کر چھوٹے بھائی کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دی۔ اور جب راجو دوڑتا ہوا باہر نکل گیا تو وہ آپ ہی آپ بڑبڑائی "تم جو کچھ چاہے کہو، میں 'ہاں' نہیں کہہ سکتی! میں 'ہاں' نہیں کہہ سکتی!" اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

وہ یوں ہی اتھاہ مایوسی کے سمندر میں ڈوبی سسک رہی تھی کہ کسی موٹر کے آنے اور رُکنے کی آواز سنائی دی اور راجو ہانپتا ہوا آ کر چیخا "دیدی! دیدی! مہندر بھیا موٹر پر آئے ہیں۔ اپنے ساتھ سوٹ کیس اور ہولڈال بھی لائے ہیں اور ایک بڑے سے ٹوکرے میں مٹھائی اور موٹے موٹے ہار بھی لائے ہیں اور ایک پنڈت جی بھی ان کے ساتھ ساتھ آئے ہیں۔

وہ ماں کے ساتھ اس معمے کو سمجھنے آنگن میں نکلی ہی تھی کہ مہندر ایک بغل میں سوٹ کیس، دوسرے میں ہولڈال دبائے اور دونوں ہاتھوں میں مٹھائی کی ٹوکری اور ہار لیے آ پہنچا اور اس کے پیچھے ایک تلک دھاری پنڈت جی ایک پوتھی ہاتھ میں لیے داخل ہوئے۔

سمن کی ماں نے تعجب سے مہندر کو دیکھا۔ وہ اپنی خاص دلکش ہنسی ہنسا۔ ماں نے پوچھا ''کیا بات ہے مہندر؟ یہ کس کا سامان لے کر آئے ہو؟''

وہ مسکرا کر بولا ''یہ سامان میرا ہی ہے ماتا جی، میں نے کل سمن سے کہا تھا بس میں تو ساتھ رہنا ہی، اب گھر پر بھی ساتھ رہے تو کیسا ہو؟ وہ بولی میں کیا جانوں، ماتا جی سے پوچھو۔ میں جانتا ہی تھا آپ کو ایک جوان بیٹے کی سخت ضرورت ہے۔ آپ بھی ٹھاکر، میں بھی ٹھاکر۔ میرے نہ پتا، نہ ماتا، نہ بھائی، نہ بہن۔ اب جو کچھ ہیں آپ ہی لوگ ہیں۔ بھلا آپ اپنے چرنوں میں جگہ نہ دیں گی تو کون دے گا؟'' اور وہ پھر ہنسا، وہی دلکش ہنسی جو دلوں کو موہ لیتی تھی۔

ماتا جی نے گھبرا کر کہنا چاہا ''مگر......مگر......''

وہ بولا ''آپ یہی تو کہنا چاہتی ہیں کہ بیاہ کی کوئی تیاری نہیں۔ دن، تاریخ، ساعت، گھڑی نہیں دیکھی گئی۔ تو مَیں سیدھا صبح سویرے ہی ان پنڈت جی کے پاس گیا تھا۔ انھوں نے سب کچھ وچار کر کے بتایا کہ آج کے دن دس بجے سے پہلے کی گھڑی میری اور سمن کی کنڈلی میں اس کے لیے سب سے شبھ گھڑی ہے۔ مَیں نے اپنے اسباب کے ساتھ ان کو بھی لادا اور جو کچھ انھوں نے اپنے کاموں کے لیے مال مسالہ بتایا وہ بھی لادا اور آپ سے سمن کی بھیک مانگنے آ گیا۔''

اور قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کہہ سکیں اُس نے مٹھائی کا ٹوکرا میز پر رکھا، اٹیچی اور ہولڈال دھم دھم زمین پر گرائے اور ماتا جی کا پاؤں پکڑ کر کہا ''جیون کی بس پر سوار ہونے کے لیے دیر تک سوچنے کا موقع نہیں ملتا ماتا جی، آپ جلدی ہاں کہہ دیں تو میں بھی اس گھر کی گاڑی میں لٹک چلوں!''

وہ بیچاری گھبرا کر زمین پر اُکڑوں بیٹھ گئیں۔ وہ ہنسا، اُس نے جلدی جلدی ہولڈال کھولا۔ بالکل نیا مخملی قالین، ایک لال رنگ کی شال چادر نکالی۔ قالین وہیں بچھا کر ماتا جی کو اس کی ایک طرف بٹھایا۔ سمن کو جو بت بنی یہ تماشا دیکھ رہی تھی شال چادر پر کھینچ کر بٹھا دیا اور خود بھی اس پر بیٹھ کر کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی، پھر مصنوعی گھبراہٹ سے بولا ''ارے دس بجنے میں پندرہ ہی منٹ رہ گئے ہیں پنڈت جی۔ جلدی کیجیے جلدی! شبھ گھڑی نکلی جاتی ہے۔''

پنڈت جی نے بغل میں دبی پوتھی کھول کر منتر پڑھنا شروع کرنے والے ہی تھے کہ

ماتا جی نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ جلدی جلدی رسوئی گھر سے ایک پیالی میں گھی اور ایک توے میں بہت سی آگ لاکر پنڈت جی کے سامنے رکھ دی۔ پھر آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے سمن سے بولیں ''اس کے گلے میں ہار ڈال دے بیٹی۔'' مہندر نے گردن جھکا کر کانپتے ہاتھوں سے اپنے گلے میں ہار ڈلوایا اور خود ہنستے ہوئے سمن کے گلے میں ہار ڈال دیا۔ پنڈت جی نے اس کے کرتے اور سمن پر پڑی ہوئی لال چادر کے کونے پکڑ کر ایک گرہ دے دی اور آگ پر گھی ڈال کر منتر پڑھنا شروع کر دیا۔

جب پنڈت جی بہت سی مٹھائی اور روپے لے کر جا چکے تو مہندر بولا ''ارے راجو تو کھڑا کیا دیکھتا ہے، جوان آدمی اور یہ سُستی! بس یہ سوٹ کیس اور یہ ہولڈال اپنی دیدی کے کمرے میں ڈال آ! اب آج سے ہم بھی تو ماتا جی کے داس بن کر اسی گھر میں رہیں گے!'' اور وہ اس طرح ہنسا کہ راجو ہی کے دانت نکل آئے اور ماتا جی کے چہرے پر بھی مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ جلدی سے داماد کے لیے اچھے اچھے کھانے پکانے رسوئی گھر میں مسکراتی گھس گئیں۔

(مسودہ تاریخ درج نہیں)

یہ ڈائن فکر

(جرمنی کے سدر مین سے استفادہ)

کسی زمانے میں ایک عورت تھی، بڑی غریب، دُکھیاری، کوکھ جلی۔ میاں اس کا مزدوری کرتا تھا۔ دن بھر کی محنت مشقت کے بعد مشکل سے آنے دو آنے کما لاتا۔ اسی میں انھوں نے آپ اپنا ایک جھونپڑا بنا رکھا تھا۔ دونوں ایک وقت روکھا سوکھا کھا کر اور موٹا جھوٹا پہن کر بسر کر لیتے تھے، اس لیے کہ وہ سستی کا سے تھا۔ بس دونوں کو فکر اگر کسی بات کی تھی تو وہ پیٹ کی نہ تھی اولاد کی تھی۔ یہ نہیں کہ ان کے بچے نہیں ہوئے۔ ایک اور ایک پانچ اولادیں ہوئیں اور سب بیٹے! لیکن ایک بھی پندرہ دن کا نہ ہونے پاتا کہ نہ جانے کون سا روگ لگ جاتا کہ بس گھڑی دو گھڑی کی بیماری میں وہ چٹ پٹ ماں کی گود سے چھوٹ کر گور گڑھے کو بساتا۔ ماں بیچاری ہر مذہب کے پیروں، فقیروں، سنتوں، مہنتوں، ملاّؤں اور ملانوں کے پاس جاتی، ہاتھ جوڑتی، گڑگڑاتی، گنڈے تعویذ لاتی، مسجدوں میں طاق بھرتی، مندروں میں پرشاد چڑھاتی، گرجاؤں میں موم بتّیاں جلاتی، مگر کسی کی آئی نہ ٹلتی۔ موت اس کی گود خالی ہی کرتی چلی جاتی۔

جب چھٹا پیٹ میں آیا تو ماں نے منّت مانی کہ اگر اب کے اصل خیر سے نو مہینے کٹ گئے تو میں اس بچّے کو پیدا ہوتے ہی کسی اور کو دے دوں گی۔ بس میں اس کی دائی کھلائی ہی کہلاؤں گی۔ 'ماں' کہہ کے وہ اسی کو پکارے گا جو اسے گود لے لے گی۔ میں جھوٹوں بھی اس کی ماں ہونے کا دعویٰ نہ کروں گی! مگر چھٹا تو بھن پیرا بھی نکلا۔ صبح کو وہ ہوا اور دوپہر ہی کو اس کا باپ دو منزلے مکان کی مرمّت کے سلسلے میں اونچی سیڑھی سے پھسل کر گرا اور چند منٹ میں پھڑک کر ٹھنڈا ہو گیا۔ دُکھیاری بیوہ سوِرے سے نکل پڑی، اسی حالت میں اسے میاں کی مٹّی ٹھکانے لگانے کا سامان کرنا پڑا۔ جب بڑی رات گئے وہ خاک کے ڈھیر کو خاک میں ملا کر شمشان سے

پلٹی تو چھاتی سے لگے بچّے کی فکر ہوئی۔ سوچتی تھی اب تو اس کے جینے کی اور بھی ضرورت ہے۔ شوہر کا نام اسی سے تو چلے گا۔

رات تو جوں توں کروٹیں بدل بدل کر اُس نے کاٹی، صبح سویرے ہی ناقوس کی صداؤں، گھنٹوں کی آوازوں اور اذان کی تکبیروں میں وہ اپنے بچّے کے لیے ماں ڈھونڈنے نکلی۔

جسم پر میلے چکٹ، سِوَر والے کپڑے تھے، بالوں پر مرگھٹ کی خاک تھی، کلیجے سے چمٹا ہوا بچہ بھی چیتھڑوں ہی میں لپٹا تھا، بالکل چوہے کا بچّہ معلوم ہوتا تھا۔ جہاں جاتی بھکارن سمجھ کر دُھتکاری جاتی۔ صورت دیکھتے ہی ہر عورت اُسے جھڑک دیتی۔ ''جا جا، کہیں اور لے جا، ہمارے ہاں ایسے نالی کے کیڑے کی ضرورت نہیں۔''

وہ گڑگڑاتی ''دیوی! میں تم سے اس کا خرچ اُٹھانے کو نہیں کہتی، نہ اپنے لیے روٹی کا کوئی ٹکڑا مانگتی ہوں۔ میں اپنے گھر رہوں گی، ہر تیسرے چوتھے گھنٹے آ کر اس کو دودھ پلا جایا کروں گی، دھوؤں گی، نہلاؤں گی اور جو چیتھڑا لتا آپ دیں گے اسے پہنا دوں گی۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ آپ اس کو اپنا بیٹا کہہ دیں اور اس کی ماں بن جائیں۔'' مگر اس ملک میں جہاں مذہب کے بھید ہوں، ذاتوں کے بھید ہوں، دولت غربت کے بھید ہوں، غریب بیوہ کا بیٹا کون اپناتا؟''

وہ برابر ہفتوں اپنے ہی شہر میں نہیں، آس پاس کے قصبوں، دیہاتوں میں بھی ٹھوکریں کھاتی پھری، مگر ہر جگہ سے صاف جواب ملا۔ کوئی گدڑی میں لپٹے لعل کو گود لینے کے لیے تیار نہ ہوا۔

ایک دن جھٹپٹے کے وقت، جب وہ تھکی ہاری بیٹھی سوچ رہی تھی کہ شاید بھگوان کو یہی منظور ہے کہ اس کی کوکھ بھی اس کی مانگ کی طرح اُجڑی رہے، اسے ایک سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اُس نے گھبرا کر اُدھر نظر ڈالی جدھر سے یہ آواز آ رہی تھی۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک بی بی کالے کپڑے پہنے اور کالی نقاب منہ پر ڈالے اس کی طرف چلی آ رہی ہیں۔ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور وہ بچّے کو چھاتی سے لگا کر بھاگنے کے لیے پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

آنے والی نے کہا ''ٹھہرو، ڈرو نہیں، میں تمھاری مدد کو آئی ہوں!''

ماں نے تھرّاتے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر بچہ لے لیا اور بولیں: ''میں تمھارے بچّے کی ماں بننے کے لیے تیار ہوں۔ میں اس کی بھی ذمہ داری لے سکتی ہوں کہ

تمھارا بچّہ زندہ رہے، بڑا ہو، ایک اچھا انسان بنے اور ساری عمر تمھاری خدمت اور اطاعت کرے۔"

ماں خوشی سے بوکھلا کر بولی: "دَھنیہ ہیں آپ دیوی، دَھنیہ ہیں۔"

وہ ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک کر بولی: "مگر ایک شرط بھی ہے!"

وہ اسی طرح خوش خوش بولی: "مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے!"

دیوی بولیں: "تو شرط یہ ہے کہ اپنے بیٹے کا جسم ہی نہیں، اس کی رُوح بھی مجھے دے دو۔"

رُوح کا نام سنتے ہی ماں کی جان ہی تو نکل گئی۔ وہ تلملا گئی۔ اُس نے بڑی مشکل سے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھرا پھرا کے پوچھا: "بی بی، آپ کون ہیں؟"

خاتون نے کہا: "میں فکر کی ڈائن ہوں!"

بچّے کی ماں اس ڈائن کا نام سنتے ہیں ڈر اور تکلیف سے کانپنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل پڑے۔ ڈائن بولی: "رونے دھونے سے کوئی کام نہیں۔ غریب بچوں کا میری گود کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اپنے بیٹے کی جان بچانا چاہتی ہو تو میری شرط قبول کرو، نہیں تو تم جانو اور تمھارا کام!"

یہ کہہ کر اس نے بچّے کو کھرّے پلنگ پر ڈال دیا اور اس کے انداز سے یہ ٹپکنے لگا کہ وہ اب غائب ہوا ہی چاہتی ہے۔ ماں کی ممتا پھڑ پھڑائی، اس نے لپک کر پاؤں پکڑ لیے، وہ گڑ گڑا کر بولی: "بس یہ جیتا رہے، مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔ آپ ہر طرح اس کی جی جان کی مالک ہیں۔"

ڈائن نے جھک کر بچّے کے سر پر ہاتھ پھیرا، دو تین بار "بیٹا بیٹا" کہہ کر چٹکی بجائی اور وہ نظروں سے غائب ہوگئی۔

اس دن سے دُکھیاری ماں کو کچھ نہ کچھ کام ضرور مل جاتا، کبھی کچھ کوٹنے پیسنے کو، کبھی کچھ سینے پرونے کو، مگر بس اتنا ہی کہ وہ اپنا اور بچے کا پیٹ پال لے اور اس کی دیکھ بھال کر سکے۔ بچّہ بڑھنے لگا، گھٹنوں چلا، تتلا کے بولا، آہستہ آہستہ اس لائق بھی ہوا کہ ہلکے پھلکے کاموں میں ماں کا ہاتھ بھی بٹالے، دُکھیاری بیوہ اسے تعلیم نہ دلوا سکی، اس سے تعلیم گو مفت تھی، پر وہ اُونچی ذات والوں کا اجارہ تھی، نیچی ذات والے بس باپ دادا کا پیشہ ہی اختیار کر سکتے تھے، اس لیے اس بچّے کو بھی آٹھ دس برس کے سن سے محنت مزدوری کے کاموں میں لگ جانا پڑا۔ ماں بھی دُکھ

جھیلتے جھیلتے اتنی کمزور ہوگئی تھی کہ اب اسے نہ اچھی طرح ڈوب سوجھتے تھے اور نہ ہاتھوں کے رعشے کی وجہ سے چکی ہی پیسی جاتی تھی۔ اس لیے جیسے ہی بچّے نے جوانی میں قدم رکھا وہ کام کرنا چھوڑ بیٹھی۔ اب وہ بیٹے ہی کی کمائی پر بسر کرتی تھی۔ روکھا پھیکا پھر پیٹ بھر ملنے لگا تھا اور بیٹا صحیح سلامت تھا اور ہر وقت اس کی خدمت اور اطاعت میں لگا رہتا تھا۔ بس ایک بات تھی کہ ماں کے کلیجے کو ہر وقت برماتی رہتی تھی۔ بیٹے کے چہرے پر نہ تو جوانی کی چمک آتی تھی اور نہ اس کے کاموں سے کوئی پھرتی، تیزی ٹپکتی۔ زردی نے اُس کے چہرے پر گھر بنالیا تھا اور قہقہے ہنسی سے تو گویا اس سے جنموں جنموں کا بیر تھا۔ کبھی کبھی وہ مسکراتا ضرور تھا، مگر جب بھی اس کے پپڑائے ہونٹ ایسی مسکراہٹ کے لیے کھلتے تو یہ نہ جان پڑتا کہ کلی پھول بن رہی ہے، بلکہ یہ معلوم ہوتا کہ گہرے گھاؤ کے منہ سے سوکھی پیپ صاف کی جارہی ہے۔ ایسی مسکراہٹوں پر ماں کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل پڑتے۔

بیوہ ماں نے سوچا لاؤ اس کا بیاہ کردوں، اپنی عورت آجانے سے شاید اس کا دل کھل اُٹھے۔ یہ ہر وقت کا مرجھانا، کمھلانا شاید چلا جائے۔ وہ لاٹھی ٹیکتی ہوئی اُٹھی اور ذات برادری میں ہر جگہ اپنے بیٹے کے لیے دُلہن مانگتی پھری۔ اسی ملک میں جہاں بیٹی والے روپے دے کر، بڑے بڑے جہیز دے کر لڑکیوں کے لیے بر حاصل کرتے ہیں، وہ جہاں جاتی لوگ اس کے لڑکے کا نام سنتے ہی کان پر ہاتھ دھرتے ”نابی بی، جیتے جی مکھی کون نگلے گا۔ سب کو معلوم ہے کہ تمھارا بیٹا بے رُوح کا ڈھانچہ ہے۔ ایسے میں کون جان بوجھ کر اپنی جائی کو بھاڑ میں جھونکے گا!“

جب ہر جگہ سے ٹکا سا جواب ملا تو وہ انسانوں کی دُنیا سے نکل کر، دیوتاؤں کی دُنیا میں اپنی فریاد لے کر چلی۔ اس نے پورے چالیس دن سورج دیوتا کو پانی چڑھایا۔ پھر گڑگڑا کر دُعا کی: ”اے سورج دیوتا! تیری روشنی گوارا ہو کہ کالا، اچھوت ہو کہ برہمن، محل ہو کہ جھونپڑی، پھلواری ہو کہ کوڑا گھر، ہر ایک پر یکساں طور پر پڑتی ہے، مجھ دُکھیاری بیوہ کی بھی سن لے! میرے بیٹے کو ایک رُوح دے دے۔“

سورج کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا۔ اُس نے بیوہ سے جھڑک کر کہا: ”کیا بکتی ہے بڑھیا، ہم اسی کو اُگاتے بڑھاتے ہیں جس میں خود سے پھیکنے اور آگے جانے کی ہمت ہو۔ تیرا لڑکا تو اتنا بزدل ہے کہ اس کے دل میں مجھ سے آنکھ لڑانے کا خیال تک نہ آیا۔“ اور اس نے بادلوں کی

نقاب اپنے چہرے پرڈال لی۔

ماں بے چاری اب چاند کے درشن کے لیے دوڑی۔ چودھویں کی چاندنی میں وہ ندی کے پانی میں گردن تک ڈوب کر کھڑی ہوگئی اور اس نے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کی: ''اے چندر ما دیوتا! تم تو استریوں پر خاص طور پر مہربان رہتے ہو، تم ہی اس کوکھ جلی پر دیا کرو اور میرے بیٹے کے لیے ایک رُوح دے دو!''

چاند ہنسا: ''ارے بڑھیا پاگل ہوگئی ہے؟ تو رُوح کس کے لیے مانگتی ہے۔ تیرے بیٹے نے تو بچپنے میں بھی ہمیں توڑ لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ ایسے کم ہمت کے لیے میرے پاس کوئی رُوح نہیں ہے!'' اور وہ راہل کے منہ میں چھپ کر بیٹھ رہا۔

وہ پہاڑوں کے پاس گئی۔ چلتے چلتے جو پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے، وہ نوکیلے پتھروں سے چھل گئے، ہموار چٹانوں پر اس کے خون سے بھرے تلوے پھول بوٹے بنانے لگے تھے، مگر وہ لاٹھی ٹیکتی کراہتی اُوپر چڑھتی ہی چلی گئی۔ ایک اُونچی چوٹی پر پہنچ کر اُس نے فریاد کی: ''اے پہاڑو، تم میں سے بہتیروں کی چوٹیوں پر دیوی دیوتا رہتے ہیں۔ تم اتنے مضبوط ہو کہ تم اتنی بڑی بڑی طاقتوں کو اپنے کندھوں پر بٹھائے ہوئے ہو، تم ہی میرے بیٹے کے لیے ایک روح دے دو!''

پہاڑوں میں ایک گرج ہوئی۔ انھوں نے لفظوں کی صورت اختیار کی جیسے کوئی کہہ رہا ہے ''کیا بکتی ہے بڑھیا! تیرے بیٹے میں ہمیں کاٹ کر نہر نکالنے کا حوصلہ نہیں، ہماری چوٹیوں پر چڑھ جانے کی ہمت نہیں۔ وہ اتنا کمزور ہے کہ اگر ہماری فضا میں پلی ہوئی رُوح اس کے جسم میں ڈال دی جائے تو وہ نازک شیشے کی بوتل کی طرح ٹوٹ کر چوُر چوُر ہو جائے گا!'' اور اس کی ایک سل اس طرح ٹوٹ کر گری کہ اگر بیوہ ماں جلدی سے دُور نہ بھاگ گئی ہوتی تو وہ پس کر چٹنی ہی ہوگئی ہوتی۔

وہ مضبوط، تناور، چھتنار درختوں کے پاس گئی۔ اس نے ان سے لجاجت سے کہا: ''تم ہرے بھرے رہو! اپنے پھلوں پھولوں کا صدقہ میرے بچّے کے لیے مجھے ایک روح دے دو!''

ان کی پتیاں ہوا سے سرسرائیں اور ان سے آواز پیدا ہوئی۔ ''تیرے بیٹے نے ہم پر چڑھ کر نہ تو کبھی چڑیوں کے گھونسلے اور انڈے بچّے تلاش کیے اور نہ ہماری پھنگیوں سے کبھی کوئی پھل توڑا۔ ایسے کم ہمت کے لیے ہمارے پاس کوئی روح نہیں۔'' اور ایک شاخ اس طرح چرچرائی کہ

محسوس ہوا کہ اس کے سر پر آ رہے گی۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھی بھاگی۔

وہ اب بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ اس کو یقین آ گیا تھا، اس پر اور اس کے بچّے پر رحم کرنے والا کوئی اس دُنیا میں نہیں۔ بس ایک دریا رہ گیا تھا، وہ اس کے کنارے بھی حجت تمام کرنے کے لیے پہنچی۔

پہلے تو اس نے اس میں ڈُبکیاں لگا لگا کر اشنان کیا، کپڑے دھوئے، نچوڑے، پھر وہ کمر تک پانی میں جا کر ہاتھ جوڑ کر بولی: ''اے ماں، اے دیوی! تو اپنے کناروں پر ہر آنے والے کی پیاس بجھاتی ہے، ہر ایک کو سیراب کرتی ہے، تو ہی اس پیاسی کو بھی اپنی دَیا کی ایک بوند دے دے! میرے لڑکے میں روح ڈال دے!''

دریا غرّایا، موجوں نے پیچ و تاب کھایا، کنارے کی لہروں کے منہ میں کف آ گیا۔ انھوں نے بیوہ ماں پر تھوک کر کہا: ''تو ہم سے اپنے ڈرپوک بچّے کے لیے کیا رُوح مانگتی ہے، ہمارا سینہ موتیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس سے آج تک یہ نہ ہو سکا کہ وہ ہم میں غوطہ لگا کر ایک موتی بھی اُن میں سے نکال لے جاتا!'' اور ایک بڑا سا موجہ آیا، بوڑھی ماں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ دھارے کے ساتھ تنکے کی طرح بہنے لگی۔

وہ اسی طرح ڈوبتی، اُبھرتی بے سُدھ بہی چلی جا رہی تھی کہ اچانک کنارے کے سِوار میں اُلجھی۔ اُس نے پانی سے سر نکال کر لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ بیچ دریا میں ایک چٹان ہے۔ اس پر ایک پری بیٹھی ہے۔ ایک گال سورج، ایک چاند، لٹیں چھٹک کر اس طرح پھیلی ہیں کہ دونوں کناروں پر سِوار کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ہاتھ میں ایک بانسری ہے جسے اس طرح بجا رہی ہے کہ چرند و پرند سب اس کی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں اور کناروں پر اُگے ہوئے درخت بھی تھرکتے جھومتے محسوس ہوتے ہیں۔

بوڑھی ماں ڈوبنے کو بھی نہ ڈری۔ وہ پھلانگتی چھلانگتی، غوطے کھاتی، پانی پیتی، چٹان پر پہنچ گئی۔ اُس نے پری کے صندلی پاؤں آنکھوں سے لگا کر کہا: ''دیوی! دیوی! بس اب ایک اکیلے تم سے آسرا رہ گیا ہے! مجھ پر رحم کھاؤ اور مجھے میرے بیٹے کے لیے ایک رُوح دے دو۔''

پری کھلکھلا کر ہنسی، معلوم ہوا موتی کی لڑیاں پانی میں گر رہی ہیں۔ وہ بیوہ کے جھکے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی: ''بس اتنی سی بات کے لیے تو جہان بھر میں ماری ماری پھرتی ہے؟ جا، اپنے جوان بیٹے کو میرے پاس لے آ۔ میں دیکھوں تو اس نے اپنے آپ کو کیسا بنایا ہے۔ گھبرا نہیں،

میں اسے اب اپنی روح دے دوں گی۔"

ماں نے خوشی کے آنسو بہا کر پوچھا: "دیوی، آپ کا نام کیا ہے؟"

وہ بولی: "مجھے خوشی کی دیوی کہتے ہیں۔" اور وہ اس طرح مسکرا دی کہ سارے میں اُجالا سا پھیل گیا۔ ہر چیز جگمگ جگمگ کرنے لگی۔

ماں نے دیوی کے پاؤں چومے اور خوش خوش گھر پلٹی۔ جو پیر پہلے من بھر کے تھے، اب اُن میں پر لگ گئے تھے۔ وہ دوڑتی، تیز تیز قدم رکھتی، ہانپتی، خوشی سے متوالی جب گھر پہنچی تو اُس نے دیکھا کہ اس کا جوان بیٹا گھٹنوں میں سر رکھے خاموش بیٹھا ہے۔ بڑھیا نے اسے بازو سے پکڑ کے جھنجھوڑا: "لے جلدی سے اُٹھو، نہاؤ، دھوؤ، خوشی کی دیوی کے پاس چلو، وہ تمھیں اپنی روح تک دینے کے لیے تیار ہیں۔"

بیٹے نے ماں کی طرف آنکھ اُٹھائی۔ سفید سفید دیدے دِکھائی دیئے۔ ماں گھبرا کر پیچھے کھسک گئی۔ "ارے کیا ہوا میرے لعل! تم بولتے کیوں نہیں؟" وہ چیخی۔

لڑکے نے سسک کر کہا: "میں خوشی کی دیوی کے پاس جا کر کیا کروں گا ماں! ہر وقت کی فکر نے تو میری آنکھیں تک لے لیں، ارے اب تو میں تمھارے درشن بھی نہیں کر سکتا۔"

اور اُس نے ماں کے پاؤں ٹٹولنے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ بڑھیا نے ایک دلدوز آہ کی، اس کا کلیجہ پھٹ گیا اور وہ زمین پر گر کر مر گئی۔

اور 'خوشی کی دیوی' اس بے روح فکر مند جوان کا آج تک انتظار کر رہی ہے۔

(ماہنامہ آج کل، دہلی، نومبر ۱۹۵۹ء)

علی عباس حسینی مشاہیر ادب کی نظر میں

احتشام حسین:

اُردو دنیا کے مشہور ترین افسانہ نگار جناب حسینی کی وفات حسرت آیات دنیا کا ایک عظیم حادثہ ہے۔ان کی مرنے سے اُردو ادب، بالخصوص افسانہ نگاری میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اُس کا مستقبل میں پُر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔مرحوم ایک عہد آفریں افسانہ نگار، صاحبِ نظر نقاد اور انسانیت دوست ادیب تھے۔اپنی شخصی اور فنی خصوصیات کی بنا پر وہ اُس بلندی پر فائز تھے جہاں تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔مرحوم واحد صاحبِ قلم تھے جو ۴۷ برس سے مسلسل لکھتے رہے۔اور وقت کے ہاتھوں اور عہدِ حاضر کی بصیرتوں کو فکر وفن کے سانچے میں ڈھالتے رہے۔ انہوں نے نہ صرف لاثانی افسانے لکھے بلکہ اپنی ضخیم تنقیدی کتاب ''ہماری اُردو شاعری'' لکھ کر بھی اُردو ادب کو مالا مال کر دیا ہے۔حسینی صاحب آج ہمارے درمیان موجود نہیں مگر وہ اُردو دنیا میں ہمیشہ زندہ و پائندہ رہیں گے۔

(علی عباس حسینی حیات اور ادبی کارنامے از ڈاکٹر تہمینہ اختر ص ۳۰۔ بیٹے مہدی عباس حسینی، سابق ایڈیٹر آج کل نئی دہلی کے نام احتشام حسین صاحب کا خط ۲۰ ستمبر ۱۹۶۹، صفحہ ۳۰)

انوار احمد:

حسینی کے ہاں عورت کا افضل روپ تو وہی ہے جو پریم چند اور راشد الخیری کے یہاں ہے۔ یعنی ماں پتی ورتا عورت کا۔گویا قربانی، ایثار خدمات اور اخلاص۔تاہم اُن کے افسانوں میں عورت جسم کی پکار بن کر آئی ہے۔وہ کبھی عدیا تنبولن ہے، جو طوائف اور ماں کا امتزاج ہے، اور کبھی ''میلہ گھومنی'' جو پیاس کا صحرا ہے۔اور بس۔اس طرح حسینی اُن افسانہ نگاروں میں شامل ہو جاتے ہیں جنھوں نے نفسیاتِ انسانی کی مدد سے کرداروں کے بطن میں جھانکنے کی کوشش کی......حسینی عورت کے لئے مغربی معاشرت کی دی ہوئی آزادی کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی چھپا نہیں سکتے۔

علی عباس حسینی کا دوسرا بڑا موضوع ذات پات کا نظام ہے جسے 'دھرم' کی تائید حاصل رہی ہے۔اور اس کے سہارے اکثریت کو اقلیت کی غلامی میں دے دیا گیا ہے اور ہر طرح کے استحصال، شرف آدمیت کی پامالی کے ہتھکنڈے اور ظلم وستم کو برداشت کرنا مقدر بنا۔'حق نمک'

(باسی پھول) میں اسی 'مقدر' کا ذکر حسینی تلخی سے کرتے ہیں۔

(اُردو افسانہ۔ایک صدی کا قصہ از ڈاکٹر انوار احمد صفحہ ۷۔۱۰۶)

تہمینہ اختر:

اُردو افسانہ نگاری میں علی عباس حسینی اہم مقام رکھتے ہیں۔ان کا فن اُردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔اور ہم بلاشبہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے فکروفن میں اضافے کئے ہیں۔ادب کی نئی وسعتوں اور فن کی نئی منزلوں کا پتہ لگایا ہے۔ہیئت، وتکنیک میں بھی نئے تجربے کئے ہیں۔اظہار و اسلوب کے بڑے خوبصورت نمونے پیش کئے ہیں، اس کے ساتھ ہماری پیاری زبان کو اور دلکش و حسین بنایا ہے

علی عباس کوئی خاص پیغام لے کر نہیں آئے تھے اور انہوں نے کبھی دنیائے ادب میں پیغمبری کا دعویٰ نہیں کیا۔وہ بدلتی ہوئی ادبی فضا سے متاثر ضرور ہوئے مگر مرعوب نہیں۔......انہوں نے پڑھنے والوں کی چاہ دیکھ کر گویا ناقدانہ واہ واہ کے لئے اپنا مقصد وانداز قلم نہیں بدلا۔اُن کی دنیا بہت وسیع نہ سہی لیکن جتنی بھی ہے وہ جیتی جاگتی دنیا ہے۔اُن کی دنیا سینکڑوں مفلسوں، فاقہ زدوں، بیماروں، کسانوں اور زمینداروں کی دنیا ہے اور ان سب کو انہوں نے اپنے افسانوں میں سمو کر زندہ جاوید کر دیا ہے

(علی عباس حسینی: حیات اور ادبی کارنامے۔ڈاکٹر تہمینہ اختر ص ۲۔۱)

سید شبیہ الحسن:

علی عباس حسینی کے فن میں پریم چند کے فن کا لہو شامل ہے۔حسینی اس کا اعتراف چاہے نہ کریں۔مگر دیہی شعور اور دیہاتی زندگی کو گرفت میں لینے کا ہنر اور نئی اقدار کا ادراک یہ سب کچھ پریم چند کے ورثے سے حسینی کو ملا ہے۔مختصراً علی عباس حسینی کے فن میں یلدرم کے فن کا تجدد اور پریم چند کے سیاسی نقطوں کا فیض نظر آتا ہے۔ (حسینی صاحب کا فن اور شخصیت از سید شبیہ الحسن ص۔۱۵۱)

عبادت بریلوی:

حسینی کی نگاہِ دُوربین اور دُور رس ہے۔وہ ہمارے سماج اور ہماری زندگی کے تمام مسائل پر نظر رکھتے اور دلچسپی لیتے ہیں۔اگرچہ رومانیت نے اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا لیکن اس کے باوجود حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کرتے۔اُن کو یہ معلوم ہے کہ موجودہ نوجوان کے شعور کی بیداری نے اُن کے مسائل کو کتنا پیچیدہ کر دیا ہے۔اور حسینی کا فن آج انہیں چیزوں کا حامل ہے۔باوجود اس کے وہ قدیم اسکول سے تعلق رکھتے ہیں اُن کی جدت کا یہ حال ہے کہ اُن کے قلم سے ''بھوک'' کے افسانے کی تخلیق ہو سکتی ہے۔.....فنی اعتبار سے حسینی صاحب کی افسانہ گری اگر دیکھنا ہے، تو ''رفیق تنہائی'' کے بعد دیکھیے ...... ''باسی پھول''، ''آئی سی ایس'' وغیرہ افسانے حقیقتاً افسانے معلوم ہوتے ہیں۔ورنہ اس سے قبل تو اُن کی تکنیک میں قصیدہ گوئی اور داستان سرائی کا سا انداز تھا۔آج

کا حسینی ایک چابکدست افسانہ نگار ہے۔اُس کی بڑائی کی ایک دلیل تو یہی ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو قدامت کے شکنجوں سے چھڑا کر جدت کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔...... حسینی کے طرزِ ادا اور اسلوبِ بیان نے اُن کے فن کو اور بھی دلکش و دلفریب بنا دیا ہے۔

("اُردو افسانہ نگاری پر ایک نظر" از عبادت بریلوی ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور شمارہ ۳،۴ ۔ ۱۹۶۵ء صفحہ ۷۹ ۔ ۸۰)

فراق گورکھپوری:

علی عباس حسینی قابل قدر افسانہ نگاروں میں صفِ اول میں نظر آتے ہیں۔اُن کے افسانوں میں زندگی کوٹ کوٹ کر بھری رہتی ہے، نہ کہ فکریات ونظریات۔اور یہی خصوصیات دنیا کے بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے یہاں ملتی ہیں۔اُن کے افسانے ہمیں ہندوستانی زندگی کا مرکزی احساس کراتے ہیں اور ایک خاموش، لیکن نا قابلِ فراموش اثر ہمارے دلوں پر چھوڑ جاتے ہیں۔اُن کے افسانوں میں ایک ٹھوس پن اور جسامت ہوتی ہے۔حسن، انسان اور حسنِ بیان مل کر اُن کے یہاں ایک ہو جاتے ہیں۔ (مصنفین اُردو از سید سرفراز حسین، حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر دہلی جنوری ۱۹۳۹ء)

مرزا حامد بیگ:

علی عباس حسینی کے حقیقت پسندی میں رومانیت کے گہرے رنگ نمایاں ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس روایت کا معتبر نام بھی علی عباس حسینی ہی کا ہے۔اس کا باعث حسینی کا طویل ادبی سفر ہے جو ساٹھ سالہ قلمکاری پر محیط ہے،۔...... علی عباس حسین کے افسانوں کی ابتدا خالصتاً رومانیت اور شاعرانہ اندازِ نگارش سے ہوئی۔جس کی مثالیں "جذبِ کامل" اولین افسانہ تخلیق ۱۹۱۷ء یا ۱۸ء) اور "پژمردہ کلیاں" ہیں۔جذب کامل رسالہ کانپور میں ۱۹۲۴ء میں چھپا۔...... علی عباس حسینی کے افسانے طبعی تلون اور بے باک حقیقت نگاری کی مثالیں بھی سامنے لاتے ہیں (مثال۔مجموعہ "باسی پھول") جبکہ شگفتگی تحریر کا باعث اُن کی طبعی ظرافت بنی۔...... حسینی نے ہندوستان کے شہر اور دیہات کی اجتماعی تحریکات کو موضوع بنایا۔(مثالیں "وکیل اور منشی" اور "میخانہ") جبکہ نفسیات کے بھرپور ادراک کی مثالوں میں افسانہ "بوڑھا بالا" اور "بہو کی ہنسی" ہیں۔ حسینی کے ہاں کرداروں کا تنوع قابلِ لحاظ ہے۔خصوصاً! "بیٹی" کی اینگلو انڈین لڑکی، "بدلہ" کی انگریز خاتون، "حُسنِ رہ گزر" کی نا معلوم محبوبہ، "سیلاب کی راتیں" کا مرکزی کردار اور "پہرے دار" کے شوہرِ نامدار کی کردار نگاری۔ (اُردو افسانے کی روایت از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صفحہ ۵۱)

وقار عظیم:

علی عباس حسینی کے دردمند دل نے دیہات کی زندگی میں درد و غم کے ان گنت موقعے تلاش کر لئے اور اُس میں اپنے دل کی تڑپ، کسک اور درد و غم کی تاثیر شامل کر کے دوسروں کو بھی اپنا شریکِ غم بنایا۔حسینی نے پریم چند کی ڈگر پر چل کر دیہاتوں کے گلی کوچوں میں پہنچنا سیکھا اور اپنی

باریک بین نظروں سے وہ مناظر دیکھے جو پریم چند کی نظر سے بھی پوشیدہ تھے۔مناظر کو حسینی نے فن کے ساتھ رس میں بھر کر سب کے سامنے پیش کیا۔اس طرح حسینی نے بھی زیادہ دیہات کے متعلق ہی افسانے لکھے ہیں۔اور پھر حسینی تو ایک حساس ماحول کی پیداوار تھے۔انہوں نے اپنے ماحول کی کے دل کی دھڑکن صرف سُنی ہی نہیں بلکہ محسوس بھی کی ہے۔اس لئے تو اُن کا دائرۂ قلم کا مرکز شعوری یا تحت الشعوری طور پر متعین ہو چکا تھا۔زمیندار کا ظلم اور رعایا کی مصیبت۔

اس حساس نے کہ افسانے میں صرف زندگی کے حقائق اور معاشرتی زندگی کے چھوٹے بڑے ہر طرح کے مسائل کی عکاس ہونی چاہیے۔افسانہ نگاروں کو اپنے لئے مشاہدہ کے مخصوص میدان اور گوشے اختیار کرنے کی طرف مائل کیا۔...... حسینی کے افسانے یوپی کے ایک اور علاقے کے دیہات اور وہاں کے زمینداروں اور تعلقہ داروں کی خارجی اور داخلی زندگی کی داستانیں ہیں۔

وہاب اشرفی:

یوں تو علی عباس حسینی ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف ہیں لیکن انہوں نے ڈرامے اور تنقیدی مضامین بھی قلمبند کئے ہیں اور ناول نگار بھی کی ہے۔اس سلسلے میں اُن کے دو ناول ہمیشہ یاد کئے جاتے ہیں۔ایک کا نام ''سر سید احمد پاشا یا قاف کی پری'' اور دوسرے ناول کا نام ''شاید کہ بہار آئی'' ہے۔دوسرا ناول زیادہ مشہور ہے۔علی عباس حسینی مثال پسند نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قاف کی پری کے کردار ہر حال میں نیک اور غیور رہتے ہیں، حسینی کو شرم و حیا اور شرافت کا بڑا پاس تھا۔لہٰذا اُن کے کردار بھی انہیں اوصاف سے متصف ہیں۔

علی عباس بنیادی طور پر پریم چند اسکول کے ہی ایک فرد ہیں۔اور ایک لحاظ سے انہوں نے حقیقت پسندی کی جوت جگانے میں اہم رول انجام دیا ہے۔چونکہ اُن کی نگاہ مغربی فکشن پر بھی تھی اس لئے اُن کے یہاں کہانی کا سلیقہ ملتا ہے۔عورتوں کے مسائل سے اُن کی بھی دلچسپی رہی ہے۔خصوصاً نچلے طبقے کی عورتوں کو انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ایک افسانہ اُن کا ''چمار ٹولی'' اس سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ (تاریخ اُردو ادب جلد دوم از وہاب اشرفی صفحہ ۳۹_۸۳۸)

مرتب کے سوانحی کوائف

نام : نندکشوردت
قلمی نام : نندکشوروکرم
والدین : شری رام لال دت رشریمتی گومتی دت
ولادت : ۱۷رستمبر ۱۹۲۹ء راولپنڈی شہر (پاکستان)
تعلیم :
- بی اے (۱۹۵۶ پنجاب یونیورسٹی)
- ایم اے فارسی (۱۹۵۸ء پنجاب یونیورسٹی)
- ایم اے اُردو (۱۹۶۶ء دہلی یونیورسٹی)
- ادیب فاضل۔ پنجاب یونیورسٹی

ملازمت : ۳۰ ستمبر ۱۹۸۷ء کو سنٹرل انفارمیشن سروس سے سبکدوش۔
شادی : ۱۱رمئی ۱۹۶۱
اہلیہ : آشادت
بچوں کے نام : تین بچے۔ رتو ملہوترا (بیٹی) وکاس دت (بیٹا) جوہی بالی (بیٹی)
پہلی تخلیق : دسمبر ۱۹۴۷ء میں افسانہ ''ادیب'' ماہنامہ 'نرالا' نئی دہلی میں شائع ہوا۔
صحافت : ۱۹۴۸ء میں کانپور میں میلا رام وفا کی ادارت میں شائع ہونے والے روزنامہ قومی اخبار' اور 'امرت' سے وابستہ رہا۔ ۱۹۴۹ء میں کانپور ہی سے دیویندر اِسر کے اشتراک سے ماہنامہ ارتقاء کا اجراء کیا جو بوجوہ بن ہوگیا، ۵۴۔۱۹۵۳ء میں نئی کہانی کی ادارت کی۔ ۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۹ سرکاری رسالے ''آج کل'' نئی دہلی میں بحیثیت سب ایڈیٹر/اسسٹنٹ یڈیٹر وابستہ رہا۔ اب ۱۹۸۵ء سے اُردو کے واحد حوالہ جاتی مجلّے ''عالمی اُردو ادب'' کی ادارت کر رہا ہوں۔

انعامات و اعزازات:

- ۱۹۷۰ء میں کواپریٹوڈیری پر وزارتِ زراعت، حکومت ہند کا انعام
- ۱۹۷۳ء میں سفید انقلاب مسودے پر وزارتِ زراعت حکومتِ ہند کا انعام
- ۱۹۸۱ء میں ناول یادوں کے کھنڈر پر اُتر پردیش اُردو اکادمی اور مغربی
- بنگال اُردو اکادمی کا انعام

- ۱۹۹۸ء میں افسانوی مجموعے ''آوارہ گرد'' پر دہلی اُردو اکادمی کا انعام
- ۲۰۰۱ء میں تجزیاتی ناول ''انیسواں ادھیائے'' پر دہلی اُردو اکادمی کا انعام جو قبول نہیں کیا۔
- ۲۰۰۶ء میں اُردو اکادمی دہلی نے تخلیقی نثر پر اعزاز عطا کیا۔
- ۲۰۰۸ء میں رائیٹرز فاؤنڈیشن پاکستان کی انٹرنیشنل اُردو کانفرنس کی جانب سے اعزازی شیلڈ
- ۲۰۰۹؛ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی جانب سے مجموعی خدمات پر غالب ایوارڈ۔
- ۲۰۱۳ء میں مجلس فروغِ اُردو ادب دوحہ قطر کا سترہواں عالمی فروغ اُردو ادب ایوارڈ (سند اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ نقد)
- اکتوبر ۲۰۱۵ء میں استنبول یونیورسٹی، ترکی کے شعبۂ اُردو کی جانب سے مجموعی خدمات پر Life Long Achievement Award
- اُردو سے ہندی میں ترجمے پر انوواد پریشد نئی دہلی کا ۹۹۔۱۹۹۸ء کا دوی واگیش پرسکار۔
- ۱۹۹۶ء میں ہندی میں تخلیقی ادب اور صحافت میں نمایاں کارکردگی پر 'سنگھ کی آواز' کی جانب سے فِکّی آڈیٹوریم نئی دہلی میں اعزاز دیا گیا۔

بیرونی ممالک کے اسفار:

فرانس، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا (۶ر اگست ۱۹۸۳ء تا ۲ر فروری ۱۹۸۴ء) اور امریکہ کینیڈا (۲۰۰۵ء) نیز نیپال (۱۹۸۱ء) دوحہ (قطر) ۲۰۱۳ء، استنبول (ترکی) اکتوبر ۲۰۱۵ء اور پاکستان (۳ر دسمبر تا ۱۴ر دسمبر ۲۰۰۸ء۔ اور دسمبر ۲۰۱۳ء)

مطبوعات:

اُردو :

- غالب۔ حیات و شاعری (۱۹۶۹ء) مشورہ بک ڈپو، رام نگر دہلی-۱۱۰۰۵۱
- کواپریٹو ڈیری (۱۹۶۹ء) پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی
- یادوں کے کھنڈر (ناول ۱۹۸۱ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دہلی-۵۱
- محمد حسین آزاد (۱۹۸۲ء) قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی
- آوارہ گرد (افسانے ۱۹۹۸ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی-۱۱۰۰۵۱
- انیسواں ادھیائے (تجزیاتی ناول ۲۰۰۱ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی-۵۱
- آدھا سچ (افسانے (۲۰۰۷ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی-۱۱۰۰۵۱
- شباب للت: شخصیت اور ادبی خدمات (۲۰۰۷ء)، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی
- مصور تذکرے: (۲۰۱۲) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزر، دہلی-۱۱۰۰۵۱
- ہنس راج رہبر کے افسانے (کلیات ۲۰۱۳) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزر، دہلی
- کچھ دیکھے کچھ سنے۔ پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دہلی-۱۱۰۰۵۱

- علی عباس حسینی کی کہانیاں (حصہ اول) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، کرشن نگر، دہلی
- ایک دانشور، ایک مفکر: دیویندر اسر (۲۰۱۳) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزر، دہلی
- کرشن چندر (مونوگراف ۲۰۱۴) دہلی اُردو کادمی، کشمیری گیٹ دہلی۔
- منتخب افسانے ۱۹۸۴ تا منتخب افسانے ۲۰۰۸ء (ہر سال کا انتخاب) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی۔۱۱۰۰۵۱

ھندی :
- یادوں کے کھنڈر (ناول۔۱۹۶۱ء) نویگ پرکاشن، بینگلو روڈ، دہلی۔۱۱۰۰۰۷
- آوارہ گرد (افسانے۔۲۰۰۰) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی۔۱۱۰۰۵۱
- انیسواں ادھیائے (تجزیاتی ناول، ۲۰۰۳ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی
- آدھا سچ (افسانے۔۲۰۱۰ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی۔۱۱۰۰۵۱

نند کشور وکرم پر رسائل کے گوشے اور خاص نمبر

- ماہنامہ 'چہارسُو' راولپنڈی کا صفحۂ قرطاس کے عنوان سے گوشہ
- سہ ماہی 'کاروانِ ادب' بھوپال میں مختصر گوشہ
- ۷۹ویں جنم دن کے موقع پر ماہنامہ 'مکالمات' دہلی کا ستمبر ۲۰۰۸ء کا مکمل شمارہ مختص کیا گیا۔
- ۸۰ویں سالگرہ پر غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی میں منعقدہ تقریب میں "فرہادِ لوح و قلم" "نند کشور وکرم" مرتبہ فاروق ارگلی کی پیشکش۔

تراجم:

اُردو سے ھندی :
- آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر کا ناول ۲۰۰۰) اندر پرستھ پرکاشن، کرشن نگر، دہلی
- تصویریں (سعادت حسن منٹو کے تحریر کردہ خاکوں پر مبنی کتاب کا ترجمہ و تدوین ۲۰۰۱ء)
- پاکستان کی شریشٹھ اُردو کہانیاں پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزر، دہلی۔۱۱۰۰۵۱
- رہبر نامہ (۲۰۱۴) اساکشی پرکاشن شاہدرہ دہلی۔۱۱۰۰۳۱

'اُردو کہانی کار سیریز" کے تحت

پریم چند (۱۹۹۶ء) راجندر سنگھ بیدی (۱۹۹۶ء) عصمت چغتائی (۱۹۹۶ء) احمد ندیم قاسمی (۱۹۹۶ء) غلام عباس (۱۹۹۶ء)، ہنس راج رہبر (۱۹۹۶ء) سعادت حسن منٹو (۱۹۹۷ء) سدرشن (۱۹۹۸ء) قرۃ العین حیدر (۱۹۹۸ء) کرشن چندر (۱۹۹۸ء)، ممتاز مفتی (۱۹۹۹ء) خواجہ احمد عباس (۱۹۹۹ء) علی عباس حسینی (۲۰۰۰ء)، حیات اللہ انصاری، دیویندر ستیارتھی (۲۰۰۰ء) رام لعل (۲۰۰۰ء) اپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ انتظار حسین۔ کشمیری لال ذاکر (۲۰۱۵ء) وغیرہ پر کتابوں کی اندر پرستھ پرکاشن کرشن نگر دہلی ۱۱۰۰۵۱ کے ذریعہ اشاعت۔

"شاعری اور جیون" کے تحت اُردو شعرا کی سیریز:

- حبیب جالب: شاعری اور جیون۔(۲۰۰۶) ساہتیہ بھارتی، کرشن نگر دہلی
- غالب: شاعری اور جیون۔(۲۰۰۶) ساہتیہ بھارتی، کرشن دہلی۔۵۱
- سردار جعفری:: شاعری اور جیون۔(۲۰۰۶) ساہتیہ بھارتی، کرشن نگر دہلی
- ساحرلدھیانوی:: شاعری اور جیون (۲۰۰۶) ساہتیہ بھارتی، کرشن نگر دہلی
- اُردو کی سروشریشٹھ کہانیاں (۲۰۰۲ء) ساکشی پرکاشن دہلی۔۳۲
- اُردو کی سروشریشٹھ ہاسیہ کہانیاں (۲۰۰۲ء) ساکشی پرکاشن دہلی۔۳۲
- منٹو کی سروشریشٹھ کہانیاں (۲۰۰۴) ساکشی پرکاشن، نوین شاہدرہ، دہلی۔۳۲
- پاکستان کی سروشریشٹھ اُردو کہانیاں۔۱ (۲۰۰۷) ساکشی پرکاشن، نوین شاہدرہ، دہلی۔۱۱۰۰۳۲
- عصمت چغتائی کی سروشریشٹھ کہانیاں (۲۰۰۸ء) ساکشی پرکاشن، دہلی۔۳۲
- پاکستان کی سروشریشٹھ کہانیاں۔۲ (۲۰۰۹) ساکشی پرکاشن، نوین شاہدرہ دہلی۔۱۱۰۰۳۲
- سعادت حسن منٹو (2015) ساکشی پرکاشن، نوین شاہدرہ دہلی۔۱۱۰۰۳۲
- وبھاجن کی یادگار کہانیاں۔۲ (2015) مدن لال اینڈ سنز کرشن نگر دہلی۔۱۱۰۰۵۱

ہندی سے اُردو:

- گرہ داہ (شرت چندر چٹرجی کا ناول (۱۹۷۱ء) مشورہ بک ڈپو رام نگر دہلی۔۱۱۰۰۵۱
- گوکھ یاترا (شیلا شرما) نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی۔
- جلیاں والا باغ (بھیشم ساہنی) ۱۹۹۴ء۔ نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی۔

پنجابی سے اُردو:

- نہ رادھا نہ رکمنی (امرتا پریتم کا ناول) ۲۰۰۳ء۔ نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی۔
- جنگی قیدی (کیسر سنگھ کا ناول) ۲۰۰۳ء۔ نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی۔

انگریزی سے اُردو:

- گیانی ذیل سنگھ (۱۹۹۱ء) پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی
- یوسف مہر علی (۲۰۰۴ء) نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی

پتہ : الف ۱۴/۲۱ (ڈی) کرشن نگر، دہلی۔۱۱۰۰۵۱
فون: ۲۲۰۹۴۳۱۹۔ موبائل: ۹۸۱۰۲۹۸۶۶۵
ای-میل: nandkishorevikram@yahoo.co.in

تقسیم کار پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز دہلی